# لغات القرآن

مع فہرست الفاظ

تالیف

مولانا محمد عبدالرشید نعمانی

۳-۴

دار الاشاعت
اردو بازار ایم اے جناح روڈ کراچی

Marfat.com

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ

مکمل

# لغات القرآن

مع فہرستِ الفاظ

جلد سوم — د تا ش

تالیف

مولانا محمد عبد الرشید نعمانی

دار الاشاعت

مقابل مولوی مسافر خانہ ○ اردو بازار، کراچی ۱

Marfat.com

طبع اوّل دارالاشاعت نومبر ۱۹۸۶ء
طباعت احمد پرنٹنگ کارپوریشن
ناظم آباد نمبر ۱ کراچی۔
ناشر:۔ دارالاشاعت کراچی ۱

## حقِ طبع

جناب شاہد نذیر خان یوسفی مجددی و ڈاکٹر منور رشید صاحب مکتبہ حسن سہیل لاہور سے لغات القرآن کامل چھ جلد کی کتابت اب دارالاشاعت کراچی نے خرید لی ہے۔ لہٰذا آئندہ اس کتابت یا اسکے فوٹو لے کر طبع کرنے کا کوئی مجاز نہیں ہے اور اسکے تمام حقوق دارالاشاعت کو حاصل ہیں۔

ملنے کے پتے:

دارالاشاعت اردو بازار کراچی ۱
مکتبہ دارالعلوم۔ کورنگی۔ کراچی ۱۴
ادارۃ المعارف کورنگی۔ کراچی ۱۴
ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی، لاہور ۲

دارالاشاعت متصل اردو بازار کراچی ۱

Marfat.com

# فہرست


| عنوان | صفحہ | عنوان | صفحہ | عنوان | صفحہ |
|---|---|---|---|---|---|
| باب الدال المهملة | ٥ | فصل الباء الموحدة | ٢٩ | فصل الذال المعجمة | ٦٨ |
| فصل الالف | " | فصل الراء المهملة | " | فصل السين المهملة | ٦٩ |
| فصل الباء الموحدة | ٩ | فصل القاف | ٣٢ | فصل الشين المعجمة | ٨٣ |
| فصل الحاء المهملة | " | فصل الكاف | " | فصل الصاد المهملة | ٨٤ |
| فصل الخاء المعجمة | " | فصل اللام | ٣٤ | فصل الضاد المعجمة | " |
| فصل الراء المهملة | ١٠ | فصل الميم | ٣٥ | فصل الطاء المهملة | ٨٥ |
| فصل السين المهملة | ١١ | فصل النون | " | فصل العين المهملة | ٨٦ |
| فصل العين المهملة | " | فصل الواو | " | فصل الغين المعجمة | " |
| فصل الفاء | ١٣ | فصل الهاء | ٣٧ | فصل الفاء | ٨٧ |
| فصل الكاف | " | فصل الياء المثناة | " | فصل القاف | ٩١ |
| فصل اللام | ١٤ | باب الراء المهملة | " | فصل الكاف | ٩٦ |
| فصل الميم | " | فصل الالف | " | فصل الميم | ٩٧ |
| فصل النون | " | فصل الباء الموحدة | ٤٥ | فصل الواو | ٩٨ |
| فصل الواو | ١٦ | فصل التاء المثناة | ٥٥ | فصل الهاء | ١١٦ |
| فصل الهاء | ١٧ | فصل الجيم المعجمة | " | فصل الياء المثناة | ١٢٠ |
| فصل الياء المثناة | ١٨ | فصل الحاء المهملة | ٦٠ | باب الزاء المعجمة | ١٢٧ |
| باب الذال المعجمة | ١٩ | فصل الخاء المعجمة | ٦٦ | فصل الالف | " |
| فصل الالف | " | فصل الدال المهملة | " | فصل الباء الموحدة | ١٢٨ |


مدینتہ العلم دار العلوم مجددیہ
نور آباد - فتح گڑھ - سیالکوٹ

Marfat.com

| عنوان | صفحہ | عنوان | صفحہ | عنوان | صفحہ |
|---|---|---|---|---|---|
| فصل الجیم الموحدة | ۱۳۰ | فصل التاء المثناة | ۱۷۹ | فصل الالف | ۲۶۰ |
| فصل الحاء المهملة | ۔ | فصل الجیم المعجمة | ۱۸۰ | فصل الباء الموحدة | ۲۶۳ |
| فصل الخاء المعجمة | ۱۳۱ | فصل الحاء المهملة | ۱۸۲ | فصل التاء المثناة | ۲۶۴ |
| فصل الدال المهملة | 〃 | فصل الخاء المعجمة | ۱۹۴ | فصل الجیم المعجمة | 〃 |
| فصل الراء المهملة | ۱۳۲ | فصل الدال المهملة | ۱۹۶ | فصل الحاء المهملة | 〃 |
| فصل العین المهملة | ۱۳۳ | فصل الراء المهملة | ۱۹۹ | فصل الدال المهملة | 〃 |
| فصل الفاء | ۱۳۴ | فصل الطاء المهملة | ۲۰۴ | فصل الراء المهملة | ۲۶۵ |
| فصل القاف | 〃 | فصل العین المهملة | 〃 | فصل الطاء المهملة | ۲۷۵ |
| فصل الکاف | ۱۳۵ | فصل الفاء | ۲۰۶ | فصل العین المهملة | 〃 |
| فصل اللام | ۱۳۸ | فصل القاف | ۲۱۰ | فصل الغین المعجمة | ۲۸۳ |
| فصل المیم | ۱۳۹ | فصل الکاف | ۲۱۵ | فصل الفاء | ۲۸۴ |
| فصل النون | 〃 | فصل اللام | ۲۲۰ | فصل القاف | ۲۹۰ |
| فصل الواو | ۱۴۲ | فصل المیم | ۲۲۸ | فصل الکاف | ۲۹۱ |
| فصل الهاء | ۱۴۴ | فصل النون | ۲۳۵ | فصل المیم | ۲۹۴ |
| فصل الیاء المثناة | 〃 | فصل الواو | ۲۴۰ | فصل النون | 〃 |
| باب السین المهملة | ۱۵۲ | فصل الهاء | ۲۵۴ | فصل الواو | 〃 |
| فصل الالف | ۱۵۳ | فصل الیاء المثناة | ۔ | فصل الهاء | ۲۹۵ |
| فصل الباء الموحدة | ۱۶۶ | باب الشین المعجمة | ۲۶۰ | فصل الیاء المثناة | ۳۰۰ |


Marfat.com

# باب الدال المہملۃ

## فصل الالف

**دَأَب** : حال، عادت، رسم، دستور، اس عادتِ مستمرہ کا نام کہ جو ہمیشہ ایک حالت پر رہے دأب ہے یہ اصل میں دأب یدأب کا مصدر ہے جس کے معنی لگاتار کسی کام میں لگنے اور مشقت برداشت کرنے کے ہیں اور اسی سبب سے اس کا استعمال عادت اور طریقہ کے معنی میں ہوتا ہے۔ ۳/۱ ۲/۲ ۱۴/۹

**دَأَبًا** : یہ بھی دَأَبَ یَدأَبُ کا مصدر ہے اور اس کے بھی وہی معنی ہیں ۱۲/۱۶

**دَابِرَ** : جڑ، بیخ، بنیاد، پچھاڑی، پیچھا دُبُوْرٌ سے جس کے معنی پشت پھیرنے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، ہر ایک چیز کے آخر اور تابع کے معنی میں مستعمل ہے، راغب نے لکھا ہے کہ متأخر اور تابع کو دابر کہا جاتا ہے خواہ باعتبار مکان ہو یا باعتبار زمان یا باعتبار مرتبہ ۷/۱۱ ۸/۱۶ ۹/۱۵ ۱۴/۵

**دَآبَّۃٍ** : جانور، چلنے والا، پاؤں دھرنے والا، رینگنے والا دَابٌّ اور دَوَابٌّ سے جس کے معنی رینگنے اور پاؤں چلنے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے مستعمل ہے، اس میں تا وحدت کی ہے دَوَابّ جمع، اگرچہ عرف میں یہ لفظ گھوڑے کے لئے مخصوص ہے مگر سب جانوروں کے لئے استعمال ہوتا ہے اور قرآنِ مجید میں جو "دابّۃ" کا لفظ آیا ہے تو اس میں ہر ایک حیوان داخل ہے آیۂ شریفہ وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْہِمْ اَخْرَجْنَا لَہُمْ دَآبَّۃً مِّنَ الْاَرْضِ تُکَلِّمُہُمْ اَنَّ النَّاسَ کَانُوْا بِاٰیٰتِنَا لَا یُوْقِنُوْنَ (اور جس وقت ان پر بات آن پڑیگی تو ہم ان کیلئے زمین سے ایک جانور نکالیں گے وہ ان سے باتیں کریگا کیونکہ لوگ ہماری نشانیوں پر یقین نہیں کرتے تھے) میں دآبّۃ سے ایک خاص جانور مراد ہے، قیامت سے پہلے کوہِ صفا جو مکہ میں واقع ہے دفعتاً شق ہوگا اور اس سے ایک جانور نکلیگا جو لوگوں سے باتیں کرے گا کہ اب قیامت نزدیک ہے اور نشان لگاکر سچے ایماندار ول

Marfat.com

اور چیپیے سکوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کر دے گا
یہ مضمون احادیثِ صحیحہ میں وارد ہے، پ ۲/۴، پ ۷/۱، پ ۱۲/۱،۳،۵
پ ۱۴/۱۲، پ ۱۸/۱۲، پ ۲۰/۲، پ ۲۱/۱،۲،۱۰، پ ۲۲/۱۷،۲،۱، پ ۲۵/۱۰،۲،۴ ۔

**دَاحِضَةٌ** : باطل گرنے والی، ڈھینے والی،
دَحْضٌ سے جس کے معنی پھسلنے، ٹھوکر کھانے اور
ڈگمگانے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث، پ ۲۵/۴ ۔

**دَاخِرُوْنَ** : ذلیل ہونیوالے، عاجزی کرنیوالے
دَخْرٌ سے جس کے معنی ذلیل وخوار ہونے کے ہیں، اسم
فاعل کا صیغہ، جمع مذکر بحالتِ رفع دَاخِرٌ واحد
پ ۱۴/۱۲، پ ۲۴/۵ ۔

**دَاخِرِیْنَ** : ذلیل، خوار، دَاخِرٌ کی جمع بحالتِ
نصب وجر، پ ۲۰/۳، پ ۲۴/۱۱ ۔

**دَاخِلُوْنَ** : داخل ہونے والے، دُخُوْلٌ سے
اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالت رفع دَاخِلٌ واحد
(ملاحظہ ہو اُدْخُلْ) پ ۶/۸

**دَاخِلِیْنَ** : داخل ہونیوالے، دُخُوْلٌ سے اسم
فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ نصب وجر، پ ۲۸/۲۰ ۔

**دَارٌ** : گھر، دِیَارٌ جمع، یہ لفظ مؤنث ہے اور کبھی مذکر
ہوکر بھی استعمال ہوتا ہے گھر، شہر، دنیا، سب کے لئے
دار کا استعمال ہوتا ہے پ ۱/۱۱، پ ۷/۱۰، پ ۸/۲،۳، پ ۹/۱۱،۱۷، پ ۱۱/۸
پ ۱۳/۶،۹،۱۲،۱۷، پ ۱۴/۱۰، پ ۲۰/۱۱،۱۷،۱۳، پ ۲۱/۲،۳،۳، پ ۲۲/۱۶، پ ۲۳/۱۳
پ ۲۴/۱۰،۱۱،۱۷، پ ۲۵/۴ ۔

**دَارِکُمْ** : تمہارا گھر، دَارٌ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر
حاضر مضاف الیہ، پ ۱۲/۶ ۔

**دَارِہٖ** : اس کا گھر، دَارٌ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب
مضاف الیہ پ ۲۰/۱۱ ۔

**دَارِھِمْ** : ان کا گھر، دَارٌ مضاف ھِمْ ضمیر جمع مذکر
غائب مضاف الیہ پ ۸/۱۲، پ ۹/۱، پ ۱۲/۷، پ ۲۰/۱۶ ۔

**دَاعٍ** : بلانے والا، پکارنے والا، دعا کرنے والا،
دُعَاءٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر بحالتِ رفع وجر،
(ملاحظہ ہو دُعَاءٌ) پ ۲/۷، پ ۲۷/۸ ۔

**دَاعِیَ** : بلانیوالا، پکارنے والا، دُعَاءٌ سے،
اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر بحالتِ نصب پ ۱۶/۱۵، پ ۲۶/۴

**دَاعِیًا**، پ ۲۲/۳ ۔

**دَافِعٌ** : دفع کرنیوالا، ٹالنے والا، ہٹانے والا،
دَفْعٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ
ہو دَفْعٌ) پ ۲۷/۴، پ ۲۹/۷ ۔

**دَافِقٍ** : اچھلنے والا، دَفْقٌ سے جس کے معنی اچھل کر
بہنے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ ۳۰/۱۱ ۔

**دَامَتْ** : وہ ٹھہری رہی (نَصَرَ، ضَرَبَ) دَوَامٌ سے
جس کے معنی ٹھہرے رہنے اور ایک حالت پر برقرار
رہنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، مادامت

Marfat.com

(جب تک کہ ہے) افعال ناقصہ میں سے ہے، ۱۲/۴۔

**دَامُوْا**: وہ ٹھہرے رہے۔ دَوَام سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب۔ مَادَامُوْا (جب تک وہ رہیں) افعال ناقصہ میں سے ہے، ۳/۸۔

**دَانٍ**: جھکنے والا، نزدیک، دُنُوٌّ سے جس کے معنی قریب ہونے کے ہیں خواہ قرب ذاتی ہو یا قربِ حکمی، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، ۲۷/۱۲۔

**دَانِيَةٌ**: نزدیک، جھکنے والی، لٹکنے والی، دُنُوٌّ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث ۷/۱۸، ۲۹/۱۵، ۱۹۔

**دَاوٗد**: داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام مشہور اور جلیل القدر رسول ہیں جن پر زبور نازل ہوئی تھی، داؤد عجمی نام ہے اور علمیت و عجمہ کی بنا پر غیر منصرف ہے آپ ذریتِ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہیں اور آپ کا شمار انبیاء بنی اسرائیل میں ہے حق تعالیٰ نے آپ کو دونوں نعمتوں سے سرفراز فرمایا تھا کہ نبی و رسول بھی تھے اور بادشاہ صاحب تاج و سریر بھی اسی لئے قرآن مجید میں آپ کو خلیفہ کہا گیا ہے اور یہ وہ لقب ہے کہ تمام انبیاء و مرسلین میں بجز آپ کے اور حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اور کسی کو قرآن نے اس لقب سے یاد نہیں کیا۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ

رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا داؤد علیہ السلام پر قراءت اس قدر آسان کر دی گئی تھی کہ آپ اپنی سواریوں کو زین کسنے کا حکم دیتے اور سواریوں کے کسے جانے سے پہلے پڑھ کر فارغ ہو چکتے تھے اور اپنے ہاتھ کے کسب سے کھاتے تھے[۱]۔ قراءت سے مراد اس حدیث میں زبور کی تلاوت ہے، اتنی جلدی زبور کا تمام کرنا حضرت داؤد علیہ السلام کا معجزہ تھا اور باوجودیکہ بادشاہ تھے مگر اپنے کسب و محنت سے کھاتے تھے۔ نیز صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہایت پیارا روزہ اللہ کے نزدیک داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے کہ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن نہ رکھتے تھے اور نہایت پیاری نماز اللہ کے نزدیک حضرت داؤد علیہ السلام کی نماز ہے کہ آدھی رات تک تو وہ سوتے تھے اور تہائی رات تہجد کی نماز پڑھتے تھے اور جب چھٹا حصہ رات کا باقی رہتا تھا تو پھر سو رہتے تھے[۲]۔ اور صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابوموسیٰ تجھ کو داؤد علیہ السلام کی

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب قول اللہ وآتینا داؤد زبورا۔ [۲] صحیح بخاری کتاب الانبیاء باب احب الصلوٰۃ الی اللہ صلوٰۃ داؤد۔

بانسریوں میں سے ایک بانسری دی گئی ہے[1] حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نہایت خوش آواز تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات سفر میں ان کو قرآن پڑھتے سنا، دوسرے روز یہ حدیث بیان فرمائی یعنی تیری آواز ایسی دلکش ہے گویا تیرا گلا بانسری ہے اور تیری آواز میں لحنِ داؤدی کا اثر ہے۔

واضح رہے کہ توراۃ اور اسرائیلی روایات میں حضرت داؤد علیہ السلام اور اوریا کی بیوی کا جو افسانہ مذکور ہے اور جس کو غلطی سے بعض غیر محتاط مفسرین نے بھی سورۂ ص کی تفسیر میں حضرت داؤد علیہ السلام کے ذکر میں نقل کر ڈالا ہے، محض کذب و افترا ہے، علامہ داؤدی نے صاف طور پر تصریح کی ہے:۔

لیس فی قصۃ داؤد و اوریا خبر یثبت
داؤد و اوریا کے قصہ میں کوئی روایت ثابت نہیں۔

اور قاضی عیاض فرماتے ہیں:۔

اما قصۃ داؤد علیہ السلام فلا یجب ان یلتفت الی ما سطرہ الاخباریون عن اھل الکتاب الذین بدلوا
لیکن داؤد علیہ السلام کا قصہ سو ضروری نہیں کہ جو کچھ اخباریوں نے اہل کتاب سے جنہوں نے تبدیل اور تحریف کر ڈالی ہے تحریر کیا ہے اور بعض مفسرین نے اس کو نقل

وغیروا و نقلہ بعض المفسرین ولم ینص اللہ علی شیئ من ذٰلک ولا ورد فی حدیث صحیح
کر ڈالا ہے، اس کی طرف التفات کیا جائے حالانکہ نہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں کچھ بتایا ہے اور نہ حدیثِ صحیح[2] میں کچھ آیا ہے۔

حضرتِ داؤد علیہ السلام کی پیغمبرانہ سیرت اور فضائل و خصائص کا مفصل تذکرہ قرآنِ مجید میں جا بجا اپنے موقع پر تفصیل سے مذکور ہے۔

ب ۲/۱۷، ب ۶/۲۳، ۱۵، ب ۷/۱۶، ب ۱۵/۹، ب ۱۷/۹، ب ۱۹/۱۷، ب ۲۲/۸، ب ۲۳/۱۲، ۱۱۔

**دَآئِبَیْنِ**: پھرنے والے، ایک دستور پر چلنے والے دَأْبٌ اور دَأَبٌ سے اسم فاعل کا صیغہ تثنیہ مذکر، (ملاحظہ ہو دَأْبٌ) ۱۳/۱۷۔

**دَآئِرَۃٌ**: گردش، مصیبت، دَوْرٌ سے جس کے معنی پھرنے کے ہیں، اسمِ فاعل کا صیغہ واحد مؤنث۔ "دائرہ" خطِ محیط کو کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے اس کا استعمال گردش، مصیبت اور چکر کے متعلق ہوتا ہے، ب ۶/۱۲، ب ۱۱/۱، ۲۶/۹۔

**دَآئِمٌ**: ہمیشہ، جاوید، دَوَامٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو دَامَتْ) ۱۳/۱۱۔

**دَآئِمُوْنَ**: قائم، ہمیشہ رہنے والے، دَآئِمٌ کی جمع

[1] مشکوٰۃ باب جامع المناقب۔ [2] الشفاء فی تعریف حقوق المصطفےٰ، ص ۲۸۸ (طبع صدیقی بریلی ۱۳۸۶ھ)

دَوَائِمٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر سالم، ۱۹/۲۔

## فصل الباء الموحدة

**دُبُرٍ**: پشت، پیٹھ پیچھا، پاخانہ کا مقام اَدْبَارٌ جمع، ۱۲/۱۲، ۲۷/۱۔

**دُبُرَهٗ**: اس کی پیٹھ، اس کی پشت، دُبُرٌ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ۹/۱۹۔

## فصل الحاء المهملة

**دُحُوْرًا**: بھگانا، ہانکنا، دھتکارنا، دور کرنا دَحَرَ یَدْحَرُ کا مصدر ہے، ۲۳/۵۔

**دَحٰهَا**: اس کو ہموار کیا، اس کو بچھایا (نَصَرَ) دَحَى دَحْوٌ سے جس کے معنی بچھانے اور ہموار کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ھا ضمیر واحد مؤنث غائب، ۳۰/۴۔

## فصل الخاء المعجمة

**دُخَانٌ**: دھواں، اَدْخِنَةٌ جمع، آیہ شریفہ فَارْتَقِبْ یَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ (سو تو راہ دیکھ اس دن کی کہ آسمان کھلم کھلا دھواں لائیگا) میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ دھواں عہدِ نبوی میں ظاہر ہو چکا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر صحابہ سے مروی ہے کہ ابھی وہ دھواں ظاہر نہیں ہوا بلکہ قیامت کے قریب ظاہر ہوگا[۱] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے قولِ اول کو اختیار فرمایا ہے چنانچہ فتح الرحمٰن میں رقمطراز ہیں:۔

"مترجم گوید ایں وعدہ متحقق شد خدائے تعالیٰ در قریش قحط انداخت تا آنکہ شدتِ جوع یا از کثرتِ جوع دود دیدن شد ایشاں را بخدائے تعالیٰ رجوع کردند پس خدائے تعالیٰ قحط را دور فرمود باز بکفر اصرار کردند خدائے تعالیٰ روز بدر از ایشاں انتقام کشید بعضے کس را از رؤسائے ایشاں کشت و بعضے کس را اسیر ساخت واللہ اعلم[۲]

اور ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر صاحب نے دوسرے قول کو لیا ہے چنانچہ موضح القرآن میں فرماتے ہیں:۔ "اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دھوئیں کا مذکور ہے کہ اس وقت سمجھانا کام نہیں آتا، قیامت میں دھواں گھیر لیگا، نیک آدمی کو زکام سا ہوگا اور بد کو سر میں چڑھے گا، بیہوش ہو کر گر پڑے گا۔" ۲۴/۱۶، ۲۵/۱۴۔

**دَخَلَ**: وہ اندر آیا، وہ داخل ہوا دُخُوْلٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو اُدْخُلْ) ۳/۱۲، ۱۲/۱۵

---

[۱] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو فتح الباری ج ۸ ص ۴۴۴ تفسیر الدخان۔

[۲] فتح الرحمٰن، ص ۲۵۹ (طبع فاروقی دہلی)

Marfat.com

۱۵/۱۷، ۲۰/۵، ۲۹/۱۰ ۔

**دَخَلًا** : بہانہ، دغا، فساد، دراندازی، دَخِلَ یَدْخَلُ کا مصدر ہے اصل میں اس ملاوٹ کو جو فساد کے لئے ہو دَخَلٌ کہتے ہیں اسی لئے قتادہ نے اس کی تفسیر خیانت سے کی ہے جیسا کہ ابن ابی حاتم نے ان سے روایت کیا ہے[۱] اور امام بخاری فرماتے ہیں کل شیئ لم یصح فہو داخل[۲] (جو چیز درست نہ ہو وہ داخل ہے) ۱۴/۱۹ ۔

**دَخَلَتْ** : وہ داخل ہوئی، دُخُولٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، ۱۱/۶ ۔

**دَخَلْتَ** : تو داخل ہوا، دُخُولٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر، ۱۵/۱۷ ۔

**دُخِلَتْ** : وہ داخل کی گئی، وہ آگھسی، دُخُولٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب ۲۱/۱۸ ۔

**دَخَلْتُمْ** : تم داخل ہوئے، تم نے صحبت کی، دُخُولٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، دُخُولٌ کبھی جماع کا کنایہ بھی ہوتا ہے۔ ۴/۵، ۱۵/۱۴ ۔

**دَخَلْتُمُوهُ** : تم اس میں گھس پڑے تم اس میں داخل ہوگئے، اس میں واو اشباع کا ہے اور ہُ ضمیر واحد مذکر غائب ہے۔ ۶/۸ ۔

**دَخَلُوا** : وہ داخل ہوئے، وہ چلے آئے دُخُولٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب۔ ۶/۱۴، ۱۲/۵، ۱۳/۲۱، ۲۲/۲۱، ۴۱/۴۲، ۱۹/۱۶، ۲۳/۱۱، ۲۶/۱۹ ۔

**دَخَلُوهُ** : وہ اس میں داخل ہوئے وہ اس میں گھسے، اس میں ہُ ضمیر واحد مذکر غائب ہے۔ ۱۵/۱ ۔

**دَخَلَهُ** : وہ اس میں داخل ہوا، وہ اس کے اندر آیا، دَخَلَ دُخُولٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ہُ ضمیر واحد مذکر غائب، ۴/۱ ۔

## فصل الراء المہملة

**دِرَاسَتِہِمْ** : ان کا پڑھنا پڑھانا، ان کی تلاوت دِرَاسَةٌ دَرَسَ یَدْرُسُ کا مصدر ہے جس کے معنی پڑھنے پڑھانے کے ہیں مضاف ہے ہِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، ۸/۲ ۔

**دَرَاھِمَ** : پاولیاں، دِرْھَمٌ کی جمع شاہ عبدالقادر صاحب فرماتے ہیں درہم قریب ہے پاولی کے، ۱۲/۱۲ ۔

**دَرَجٰتٌ** : درجے، دَرَجَةٌ کی جمع، ۴/۳، ۷/۲، ۸/۲، ۸/۲۳، ۹/۱۵، ۳/۳، ۵/۲، ۱۶/۱۲، ۲۴/۷، ۴۵/۹، ۲۶/۲، ۲۵/۲ ۔

**دَرَجَةٌ** : درجہ، مرتبہ، بلندی کے اعتبار سے جو مرتبہ ہوتا ہے اس کو درجہ بولتے ہیں ۲/۱۲، ۵/۲، ۹/۱۴، ۲۷/۱۴ ۔

**دَرَسْتَ** : تو نے پڑھا، دَرْسٌ اور دِرَاسَةٌ

سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر، ۲/۱۹۔

دَرَسُوْا: انہوں نے پڑھا، دَرْسٌ اور دِرَاسَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، ۹/۱۔

دَرْکِ: طبقہ، درجہ، اصل میں "درک" مثل درجہ کے ہے لیکن فرق یہ ہے کہ اونچے طبقہ کے لئے درجہ اور نیچے طبقہ کے لئے دَرْک بولا جاتا ہے زیر سمندر کے انتہائی قعر کو بھی دَرْکٌ کہتے ہیں دَرَکَات جمع ہے، ۵/۱۴۸۔

دَرَکًا: پا لینا، پکڑنا، دَرَکٌ کا استعمال دو معنی میں ہوتا ہے ایک تو اس رسی کیلئے جس کے ساتھ دوسری رسی اس غرض سے ملادی جاتی ہے کہ وہ پانی تک پہنچ جائے دوسرے انسان کو جو کچھ خرابی کا نتیجہ پہنچے اس کو دَرَکٌ کہتے ہیں یہاں دوسرے معنی مراد ہیں، ۱۶/۱۲۔

دُرِّیٌّ: درخشندہ، چمکتا ہوا، اس میں ی نسبت کی ہے دُرٌّ کی طرف منسوب ہے جس کے معنی موتی کے ہیں یعنی موتی کی طرح چمکدار، ۱۸/۱۱۔

## فصل السین المہملۃ

دُسُرٌ: کیلیں، میخیں، دِسَارٌ کی جمع، ۲۷/۷۔

دَسّٰہَا: اس کو خاک میں ملایا، اس کو گاڑ دیا۔ دَسٌّ تَدْسِیْسٌ سے جس کے معنی چھپانے اور گمنام کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ھا ضمیر واحد مؤنث غائب، ۳۰/۱۶۔

## فصل العین المہملۃ

دَعْ: تو چھوڑ دے، وَدْعٌ سے جس کے معنی چھوڑنے کے ہیں امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر، ۲۲/۲۔

دَعًّا: دھکیلنا، دھکے دینا، دَعَّ یَدُعُّ کا مصدر ہے، ۲۷/۲۔

دُعَآءٌ: پکار، دعا، بلانا، پکارنا، مانگنا، سوال کرنا دَعَا یَدْعُوْا کا مصدر ہے دعا اور ندا ہم معنی ہیں مگر ندا کبھی بغیر نام لئے بھی یا اور ایا کے ساتھ ہوتی ہے اور دعا میں نام لیا جاتا ہے جیسے یا فلاں اور کبھی دعا کا استعمال ندا کی جگہ اور ندا کا استعمال دعا کی جگہ بھی ہوتا ہے ارشاد ہے کَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً (جیسے مثال ایک شخص کی کہ چلاتا ہے ایک چیز کو جو سنتی نہیں مگر پکارنا اور چلانا) اور کبھی دعا کا استعمال تسمیہ یعنی نام رکھنے اور نام لینے کے معنی میں بھی ہوتا ہے جیسے لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَآءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا (رسولِ اطہر رسول کا نام لینا آپس میں جس طرح کہ ایک دوسرے کا نام لیتے ہو) لوگ یا محمد یا محمد کہتے تھے، اس آیت میں آپ کی تعظیم

کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اَدْعِیَۃٌ جمع، ۵/۲، ۳/۱۲، ۱۳۰/۱۸۶۸
۱۶/۶، ۱۷/۴، ۱۸/۵، ۲۰/۲، ۲۱/۸، ۲۴/۱، ۲۵/۱ ۔

**دَعَا** : اس نے پکارا، اس نے دعا کی، اس نے مانگا، اس نے بلایا دُعَاءٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب
۳/۱۲، ۲۳/۱۵، ۲۴/۱۹، ۲۵/۱۴، ۲۷/۸ ۔

**دَعَاكُمْ** : اس نے تم کو پکارا، اس نے تم کو بلایا۔ اس میں کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر ہے، ۹/۱۷، ۲۱/۶ ۔

**دَعَانِ** : اس نے مجھ کو پکارا، اس نے مجھ سے دعا کی، اس میں نونِ وقایہ ہے اور ی ضمیر واحد متکلم محذوف ہے، ۲/۷ ۔

**دَعَانَا** : اس نے ہم کو پکارا، اس نے ہم سے دعا کی، اس میں نا ضمیر جمع متکلم ہے، ۱۱/۷، ۲۴/۲ ۔

**دَعَاهُ** : اس نے اس کو پکارا، اس نے اس سے دعا کی، اس میں ہ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، ۲/۱ ۔

**دُعَآءَكَ** : تجھ سے دعا کرنا، تجھ کو پکارنا، تیری دعا، تیری پکار، دُعَاءٌ مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ، ۱۶/۴ ۔

**دُعَاؤُكُمْ، دُعَآءَكُمْ** : تمہاری التجا، تمہاری پکار، تمہارا پکارنا، دُعَآءُ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، ۱۹/۴، ۲۲/۱۴ ۔

**دُعَآءَهٗ** : اس کا دعا کرنا، اس کا مانگنا، دُعَآءَ مضاف ہ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ۱۵/۲ ۔

**دُعَآئِهِمْ** : ان کا دعا کرنا، ان کی پکار، دُعَآءِ مضاف هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، ۲۶/۱ ۔

**دُعَآءِی** : میری پکار، میرا بلانا، دُعَآءِ مضاف ی ضمیر واحد متکلم، مضاف الیہ، ۲۹/۹ ۔

**دَعَوْا** : انہوں نے پکارا، انہوں نے دعویٰ کیا، دُعَآءٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، دَعَوْا اصل میں دَعَوُوْا تھا، واؤ متحرک ماقبل اس کا مفتوح اس لئے واؤ کو الف سے بدلا، اب الف اور واؤ دو ساکن جمع ہوگئے اس لئے الف حذف ہوگیا اور دَعَوْا رہ گیا، ۱۵/۱۹، ۱۶/۹، ۱۸/۱۷، ۲۰/۱۰، ۲۱/۷ ۔

**دَعَوَا** : ان دونوں نے پکارا، ان دونوں نے دعا کی، دُعَآءٌ سے ماضی کا صیغہ تثنیہ مذکر غائب، ۹/۱۴ ۔

**دَعَوُا** : انہوں نے پکارا، انہوں نے دعا کی، دُعَآءٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، ۱۱/۸، ۲۱/۱۳ و ۱۳ ۔

**دُعُوْا** : انہیں بلایا گیا، انہیں پکارا گیا، وہ بلائے گئے، وہ پکارے گئے، دُعَآءٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر غائب، ۳/۷، ۱۸/۱۲ و ۱۳ ۔

**دَعَوْتُ** : میں نے بلایا، میں نے دعوت دی، دُعَآءٌ سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم، ۲۹/۹ ۔

**دَعْوَتَكَ** : تیری پکار یا بلاوا، تیرا پکارنا، دَعْوَۃَ مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ (ملاحظہ ہو دَعْوَۃٌ) ۲/۹

**دَعَوْتُکُمْ**: میں نے تم کو بلایا، میں نے تم کو پکارا، دَعَوْتُ صیغہ ماضی، اس میں کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر ہے، ۱۳/۱۶۔

**دَعْوَتُکُمَا**: تم دونوں کی دعا، دَعْوَۃٌ مضاف کُمَا ضمیر تثنیہ مذکر حاضر مضاف الیہ، ۱۱/۱۴۔

**دَعَوْتُمُوْهُمْ**: تم نے ان کو پکارا، تم نے ان کو دعوت دی دَعَوْتُمْ، دُعَاءٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، واؤ اشباع کا اور هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے، ۹/۱۴۔

**دَعَوْتُهُمْ**: میں نے ان کو بلایا، میں نے ان کو پکارا، دَعَوْتُ صیغہ ماضی هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، ۲۹/۹۔

**دَعْوَۃٌ**: دعا، پکار، پکارنا، بلاوا، دَعَا یَدْعُوْ کا مصدر ہے جس طرح قَعْدَۃٌ جَلْسَۃٌ بیٹھک کے لئے آتے ہیں اسی طرح یہ بھی اصل میں حالتِ دعا کو بتاتا ہے ۲/۲۳ ۹/۱۳ ۱۱/[illegible]۔

**دَعَوْهُمْ**: انہوں نے ان کو بلایا، انہوں نے ان کو پکارا، دَعَوْا دُعَاءٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب۔

**دَعْوٰىهُمْ**: ان کی دعا، ان کا پکارنا، دَعْوٰی دَعَا یَدْعُوْ کا مصدر اور مضاف ہے هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، ۸/۲ ۱۱/۶ ۷/۲۔

**دُعِیَ**: وہ پکارا گیا، دُعَاءٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب، ۲۴/۱۲۔

**دُعِیْتُمْ**: تم بلائے گئے، تم پکارے گئے دُعَاءٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر حاضر، ۲۴/۴۔

## فصل الفار

**دِفْءٌ**: جاڑے کی پوشاک گرمی کا اسباب بجز اون اَدْفَاءٌ جمع ۱۴/۱۲۔

**دَفْعٌ**: دور کرنا، دفع کرنا، ہٹانا دَفَعَ یَدْفَعُ کا مصدر ہے جب اس کا تعدیہ بذریعہ الیٰ ہوتا ہے تو اس کے معنی دینے اور حوالہ کرنے کے آتے ہیں جیسے فَادْفَعُوْا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (پس ان کو ان کے مال حوالہ کرو) اور جب عَنْ کے ذریعہ ہوتا ہے تو اس کے معنی دفع کرنے ہٹانے اور حمایت کرنے کے آتے ہیں جیسے وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ (اور اگر دفع نہ کرتا اللہ لوگوں کو ایک کو ایک سے) ۱۷/۱۳ ۲/۱۷۔

**دَفَعْتُمْ**: تم نے حوالہ کیا، تم نے دے دیا، دَفْعٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، یہاں اس کا تعدیہ الیٰ کے ذریعہ ہوا ہے، ۴/۱۲۔

## فصل الکاف

**دَکًّا**: ریزہ ریزہ کرنا، ڈھا کر برابر کرنا، کوٹ کر ہموار کرنا

Marfat.com

دَکَّ یَدُکُّ کا مصدر ہے اصل میں دَکٌّ نرم اور ہموار زمین کو کہتے ہیں اور چونکہ نرم اور ہموار زمین ریزہ ریزہ ہوتی ہے اس لئے اسی مناسبت سے اس کے مصدر کے معنی مقرر ہوئے، ۹/۷، ۳۰/۱۴۔

**دَکَّاءَ:** ہموار، برابر دَکَّاوَاتٌ جمع، ۱۶/۲۔

**دُکَّتْ:** وہ توڑی گئی، وہ ریزہ ریزہ کی گئی دَکٌّ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب، ۳۰/۱۱۔

**دُکَّتَا:** وہ دونوں توڑی گئیں، وہ دونوں ریزہ ریزہ کی گئیں دَکٌّ سے ماضی مجہول کا صیغہ تثنیہ مؤنث غائب ۲۹/۵۔

**دَکًّا:** توڑنا، ریزہ ریزہ کرنا، ڈھا کر ہموار کرنا، دَکَّ یَدُکُّ کا مصدر ہے، ۲۹/۵۔

## فصل اللام

**دُلُوْکِ:** سورج کا ڈھلنا، سورج کا غروب ہونا، امام بغوی لکھتے ہیں:-

"دلوک کے بارے میں اختلاف ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا" دلوک" کے معنی غروب کے ہیں، ابراہیم نخعی، مقاتل بن حیان، ضحاک اور سدی کا بھی یہی قول ہے اور عبداللہ بن عباس، ابن عمر اور جابر رضی اللہ عنہم زوال آفتاب کے معنی بتاتے ہیں اور یہی عطاء، قتادہ، مجاہد اور اکثر تابعین کا قول ہے اور لفظ کے معنی دونوں کو جامع ہیں کیونکہ اصل میں دلوک مائل ہونے یعنی جھکنے کو کہتے ہیں اور آفتاب زوال کے وقت بھی جھکتا ہے اور غروب کے وقت بھی اور زوال پر اس کو حمل کرنا دونوں قولوں میں زیادہ اولیٰ ہے کیونکہ اس کے قائلین زیادہ ہیں نیز جب ہم اس کو زوال پر محمول کریں گے تو آیت نماز کے تمام اوقات کی جامع ہوگی، پس " دُلُوْکِ الشَّمْسِ" ظہر اور عصر کو شامل ہے اور "اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ" مغرب عشاء کو شامل ہے اور "قُرْاٰنَ الْفَجْرِ" نماز صبح ہے۔[۱] ۱۵/۹

**دَلْوَہٗ:** اس کا ڈول، دَلْو بمعنی ڈول مضاف ہے ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ۱۲/۱۲۔

**دَلَّہُمْ:** اس نے ان کو بتایا، اس نے ان کو خبردار کیا (نصر) دَلَّ یَدُلُّ دَلَالَۃٌ سے جس کے معنی راہ بتانے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ہُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، ۲۲/۸۔

**دَلِیْلًا:** نشانی، رہنما، راہ بتانے والا دَلَالَۃٌ سے، بروزن فَعِیْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ بمعنی فاعل ہے اَدِلَّۃٌ جمع، ۱۹/۳۔

**دَلّٰہُمَا:** ان دونوں کو ڈھلا لیا، ان دونوں کو نیچے ڈال دیا، ان دونوں کو کھینچ لیا، دَلّٰی تَدْلِیَۃٌ سے جس کے



Marfat.com

معنی کسی کو حیلہ سے کام میں لگا دینے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، تَدْلِيَۃٌ ادلاء الدلو سے لیا گیا ہے جس کے معنی ڈول ڈالنے کے ہیں اسی کی مناسبت سے نیچے ڈال دینے اور کھینچ لینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، ۹/۸ پ۔

## فصل المیم

دَمٌ : لہو، خون، اصل میں دَمْیٌ تھا اور بعض دَمَوٌ بتاتے ہیں، لام کلمہ محذوف ہے اور کبھی اس کو میم سے بدل کر میم کا میم میں ادغام کر دیتے ہیں جیسے دَمٌ ۲/۵ پ ۹/۶ پ ۱۲/۱۲ ۱۴/۱۵و۲۱ ۔

دَمًا : ۶/۵ پ ۔

دِمَآءٌ : لہو، خون، دَمٌ کی جمع ۱/۳ پ ۔

دِمَآءَ کُمْ : تمہارے لہو، تمہارے خون دِمَآءَ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، ۱/۱ پ ۔

دِمَآؤُهَا : اس کے خون، ان کے لہو، دِمَآءُ مضاف هَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، هَا کی ضمیر جمع کے لئے استعمال ہوتی ہے، ۱۴/۱۲ ۔

دُمْتُ : میں ٹھہرا رہا، دَوَامٌ سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم، مَادُمْتُ (جب تک میں رہا) افعالِ ناقصہ میں سے ہے (ملاحظہ ہو دَامَتْ) پ ۶/۷ ۱۶/۵ ۔

دُمْتَ : تو ٹھہرا رہا، دَوَامٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر مَادُمْتَ (جب تک تو رہا) افعالِ ناقصہ میں سے ہے، ۳/۱۶ پ ۔

دُمْتُمْ : تم ٹھہرے رہے، دَوَامٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، مَادُمْتُمْ (جب تک تم رہے) افعالِ ناقصہ میں سے ہے۔ ۷/۲ پ ۔

دَمْدَمَ : اس نے الٹ مارا، اس نے تباہی ڈالی، اس نے ہلاکت ڈال دی، اس نے غصہ کیا دَمْدَمَۃٌ سے جس کے معنی ہلاک کرنے اور غصہ ہونے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ۳۰/۱۶ پ ۔

دَمَّرَ : اس نے اکھیڑ مارا، اس نے ہلاکت ڈال دی تَدْمِيْرٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو تَدْمِيْرًا) ۲۶/۵ پ ۔

دَمَّرْنَا : ہم نے خراب کر دیا، ہم نے ہلاک کر دیا، ہم نے اکھیڑ مارا، تَدْمِيْرٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، ۹/۶ پ ۱۹/۱۴ ۲۳/۸ ۔

دَمَّرْنَاهَا : ہم نے اس کو اکھیڑ مارا، ہم نے اس کو تباہ کر کے چھوڑ دیا، اس میں هَا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے، ۱۵/۲ پ ۔

دَمَّرْنٰهُمْ : ہم نے ان کو اکھیڑ مارا، ہم نے انکو ہلاک کر دیا اس میں هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے، ۱۹/۲ و ۱۹ ۔

Marfat.com

دَمْعِ: اشک، آنسو، دُمُوع اور اَدْمُع جمع، ۷/۲۰ ۔

## فصل النون

دَنیٰ: وہ نزدیک ہوا، وہ قریب ہوا (نصر) دُنُوٌّ سے، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو دَانٍ) ۲۷/۵ ۔

دُنْیَا: عالم، دنیا، بہت نزدیک، بہت ذلیل، دَانِیَۃٌ اور دَنِیَّۃٌ کا اسم تفضیل ہے، اول صورت میں اس کے معنی بہت قریب اور بہت نزدیک کے اور دوسری صورت میں بہت ذلیل اور بہت حقیر کے ہیں، اس کی جمع دُنیٰ ہے جیسے کُبْریٰ کی جمع کُبَرٌ اور صُغْریٰ کی جمع صُغَرٌ۔ جب دنیا کا استعمال آخرۃ کے مقابلہ میں ہوتا ہے تو اس کے معنی اول اور پہلے کے آتے ہیں اور جب قُصْویٰ کے مقابل ہوتا ہے تو زیادہ قریب کے آتے ہیں ۱/۱۲، ۱۳، ۱۴ ۲/۱، ۶، ۹

۳/۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۴ ۴/۳، ۶، ۱۰ ۵/۷، ۸، ۱۰، ۱۲ ۶/۹، ۱۰ ۷/۹، ۱۰، ۱۲ ۸/۳، ۱۰، ۱۲

۹/۹ اور ۱۰/۵، ۱۲، ۱۳، ۱۵، ۱۶، ۱۷ ۱۱/۲، ۶، ۱۲، ۱۳، ۱۵ ۱۲/۲، ۵

۱۳/۵، ۹، ۱۱، ۱۳، ۱۹ ۱۴/۱۰، ۱۲، ۲۰، ۲۲ ۱۵/۱۹، ۱۸ ۱۶/۳، ۱۲، ۱۶ ۱۷/۸، ۹

۱۸/۳، ۸، ۹، ۱۰ ۲۰/۷، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۵ ۲۱/۳، ۶، ۱۱، ۱۳، ۲۰ ۲۲/۳، ۴ ۲۳/۵، ۹، ۱۶

۲۴/۳، ۱۰، ۱۶، ۱۷ ۲۵/۴، ۵، ۹، ۱۹، ۲۰ ۲۶/۲، ۸ ۲۷/۶، ۱۹ ۲۸/۴ ۲۹/۱ ۳۰/۳، ۱۲ ۔

## فصل الواو

دَوَآبِّ: چلنے والے، جانور، چارپائے، کیڑے، دَآبَّۃٌ کی جمع (ملاحظہ ہو دَآبَّۃٌ) ۹/۱۳ ۱۰/۲ ۱۴/۹ ۲۲/۱۶ ۔

دَوَآئِرَ: گردشیں، مصائب، دَائِرَۃٌ کی جمع (ملاحظہ ہو دَائِرَۃٌ) ۱۱/۱ ۔

دُوْلَۃً: دست گرداں، جو چیز گردش کرتی ہے، کبھی اس کے پاس اور کبھی اس کے پاس، اس کا نام دولت ہے، ۲۸/۴ ۔

دُوْنَ: ورے، سوائے، غیر، جو کسی سے نیچے ہو دُوْنَ کہلاتا ہے بعض کا قول ہے کہ یہ دُنُوٌّ کا مقلوب ہے جس کے معنی نزدیک کے ہیں، امام سیوطی لکھتے ہیں:۔ "دُوْنَ ظرف ہو کر استعمال ہوتا ہے فوق کی نقیض ہے اور مذہب مشہور پر معرب نہیں ہوتا اور بعض کہتے ہیں کہ معرب ہوتا ہے چنانچہ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِکَ دونوں طرح پڑھا گیا ہے، پیش کے ساتھ بھی اور زبر کے ساتھ بھی، اور اسم بھی واقع ہوتا ہے بمعنی غیر کے جیسے اِتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اٰلِھَۃً (اور لوگوں نے پکڑے ہیں اس کے سوائے معبود) کہ دُوْنَ بمعنی غیر یعنی اس کے سوا کے ہے۔ زمخشری نے کہا ہے کہ غیرہ کے معنی کسی چیز کے ورے کے ہیں اور حالت کا فرق بتلانے کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے جیسے زید دون عمرو (زید عمرو سے نیچے ہے یعنی شرافت اور علم میں اس سے

پہنچے ہے اور اس کے معنی میں وسعت سے کام لے کر اس کا استعمال حد سے بڑھنے کے لئے بھی کیا جاتا ہے جیسے اَوْلِیَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ (دینی مسلمانوں کو چھوڑ کر یعنی مسلمانوں کی رفاقت سے کافروں کی رفاقت کی طرف تجاوز نہ کرو)۔[1]

1/(11، 13)، 2/4، 3/(11، 15، 16)، 5/(4، 15، 17، 18)، 6/(4، 13)، 7/(6، 26)، 7/(14، 15، 19)، 8/(14، 17، 18)، 9/(11، 13)، 10/(8، 11)، 11/(4، 7، 9، 12، 16)، 12/(4، 9، 10)، 14/(8، 16، 17)، 15/(17)، 16/(6، 8)، 17/(5، 6، 7، 9، 16، 17)، 18/(4، 17)، 19/(4، 9، 17، 18، 19)، 20/(8، 13، 16)، 21/(15، 18)، 22/(3، 9، 16)، 23/(3، 6، 7)، 24/(11، 12، 13)، 25/(5، 6، 10، 17)، 26/(1، 6، 12)، 27/(4، 7)، 28/(7، 11)، 29/(2، 3، 11)۔

**دُوْنِکَ**: تیرے سوا، تیرے بغیر۔ دُوْنِ مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ 14/7، 4/12۔

**دُوْنِکُمْ**: تمہارے سوا، تمہارے غیر۔ دُوْنِ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ 4/3۔

**دُوْنِنَا**: ہمارے سواے، ہمارے غیر۔ دُوْنِ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ 4/7۔

**دُوْنِہٖ**: اس کے سوا، اس کے غیر، اس کے ورے۔ دُوْنِ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ 7/12، 9/15، 9/14، 12/(5، 15)، 13/8، 14/11، 15/(6، 14، 16، 26)، 17/(2، 15)، 18/19، 20/16، 21/(10، 12، 13)، 22/14، 23/(1، 5، 16)، 24/(1، 2، 7)، 25/(2، 13)، 26/4، 29/12۔

**دُوْنِہَا**: اس کے ورے۔ دُوْنِ مضاف ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ 16/2۔

**دُوْنِہِمْ**: ان کے سوا، ان کے ورے۔ دُوْنِ مضاف ہِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ 1/4، 16/5، 30/6، 22/11۔

**دُوْنِہِمَا**: ان دونوں کے ورے، ان دو کے سوا۔ دُوْنِ مضاف ہِمَا ضمیر تثنیہ مذکر غائب مضاف الیہ، 16/2، 27/13۔

**دُوْنِیْ**: میرے سوا، میرے علاوہ، میرا غیر۔ دُوْنِ مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، 15/(1، 19)، 16/3۔

## فصل الہاء

**دِھَاقًا**: بھرا ہوا، چھلکتا ہوا۔ دَھْقٌ سے جس کے معنی لبالب پُر ہونا اور چھلکنے کے ہیں اسم صفت ہے، 30/2۔

**دِھَانِ**: تیل کی تلچھٹ، وہ تیل جس کی مالش کی جائے، سرخ زمین، اَدْھِنَۃٌ جمع اور دُھْنٌ جمع اور بعض کا قول ہے کہ دُھْنٌ کی جمع ہے جس کے معنی تیل کے ہیں، 27/2۔

**دَھْرِ**: زمانہ، اصل میں تو دہر عالم کے وجود میں آنے سے لیکر اس کے ختم ہونے تک کی مدت کا نام ہے اور پھر اس سے ہر بڑی مدت بھی مراد لے لی جاتی ہے برخلاف زَمَانٌ کے کیونکہ وہ مدتِ قلیلہ اور مدتِ کثیرہ دونوں کے لئے آتا ہے، 25/19، 29/19۔

**دُھْنِ**: تیل، چکنائی، اسم ہے، دِھَانٌ اور اَدْھَانٌ جمع، 18/1۔

[1] الاتقان، ج ۱، ص ۱۶۲، ۱۶۳ (طبع مصر)

Marfat.com

## فصل الیاء المثناة

**دِیَارِ:** شہر، گھر دَارٌ کی جمع، پ ۵/۱۔

**دَیَّارًا:** بسنے والا، رہنے والا دَارٌ سے یا دَوْرٌ جس کے معنی گھومنے کے ہیں فَیْعَالٌ کے وزن پر ہے فَعَّالٌ کے وزن پر نہیں ورنہ دَوَّارٌ ہوتا جیسے کَوَّالٌ اور جَوَّادٌ ہے، پ ۲۹/۱۔

**دِیَارِکُمْ:** تمہارے گھر، تمہارے شہر، تمہارے وطن دِیَارِ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ پ ۱/۱، پ ۵/۹، پ ۲۸/۸۔

**دِیَارِنَا:** ہمارے شہر، ہمارے گھر، ہمارے وطن، دِیَارِ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، پ ۲/۱۶۔

**دِیَارِهِمْ:** ان کے گھر، ان کے وطن، دِیَارِ مضاف هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ پ ۲/۱۶، پ ۷/۱۱، پ ۹/۲، پ ۱۲/۸،۲، پ ۱۷/۱۲، پ ۲۱/۱۹، پ ۲۸/۴۔

**دِیْنٌ:** جزاء، اطاعت، شریعت، بدلہ دینا، اطاعت کرنا، حکم ماننا، "دین کے معنے ملت کے ہیں مگر اس کا استعمال اطاعت اور شریعت کی پابندی کے معنی میں ہوتا ہے دَانَ یَدِیْنُ کا مصدر ہے اَدْیَانٌ جمع پ ۱/۱۹، پ ۲/۸، پ ۳/۱۶،۱۰،۲، پ ۵/۴، پ ۸/۱۰، پ ۹/۱۹، پ ۱۰/۱۱،۱۰،۸،۶، پ ۱۱/۱۹،۱۸،۴، پ ۱۲/۱۵، پ ۱۳/۳، پ ۱۴/۱۳،۲، پ ۱۶/۱۶، پ ۱۷/۷، پ ۱۹/۹، پ ۲۱/۱۷،۱۳،۸،۷،۴، پ ۲۳/۱۶،۱۵،۱۴،۵، پ ۲۴/۱۲،۷، پ ۲۵/۴،۳، پ ۲۶/۱۸،۱۲، پ ۲۷/۱۵، پ ۲۸/۹،۸، پ ۲۹/۱۶،۷، پ ۳۰/۳۵،۳۴،۳۳،۳۲،۲۳،۲۰،۸،۷۔

**دِیْنًا:** پ ۴/۱۷، پ ۵/۱۵، پ ۶/۵، پ ۶/۷۔

**دَیْنٍ:** ادھار، قرض، ادھار، قرض دینا، قرض لینا دَانَ یَدِیْنُ کا مصدر ہے دُیُوْنٌ جمع، پ ۳/۱۲، پ ۴/۱۲۔

**دِیْنَارٍ:** دینار، اشرفی، ایک سونے کا سکہ جو عرب میں مستعمل تھا، دَنَانِیْرُ جمع، علامہ سیوطی نے اتقان میں لکھا ہے کہ "جوالیقی" وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ یہ فارسی ہے[1]، پ ۳/۱۶۔

**دِیْنُکُمْ:** تمہارا دین، دِیْنُ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ پ ۲/۱۱، پ ۳/۱۶، پ ۶/۱۴،۱۳،۵،۳، پ ۸/۸، پ ۱۰/۸، پ ۲۶/۱۴، پ ۳۰/۲۴۔

**دِیْنَهٗ:** اس کا دین، دِیْنِ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۳/۱۱، پ ۴/۱۲۔

**دِیْنَهُمْ:** ان کا دین، دِیْنَ مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ پ ۳/۱۱، پ ۵/۱۸، پ ۶/۱۴، پ ۸/۱۳،۷،۲، پ ۱۸/۱۳،۹، پ ۲۱/۷، پ ۲۲/۳۔

**دِیْنِیْ:** میرا دین، دِیْنِ مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، پ ۱۱/۱۶، پ ۲۳/۱۹۔

**دِیَةٌ:** خون بہا، دیت، اصل میں وَدْیٌ یَدِیْ کا مصدر ہے مقتول کے بدلہ میں جو خون بہا ادا کیا جاتا ہے اس کا نام دیت ہے، دِیَةٌ اصل میں وَدْیٌ تھا، واؤ کو حذف کرکے آخر میں تا لگائی گئی ہے جیسا کہ عِدَةٌ میں ہوا ہے۔ "دیت" میں سو اونٹ یا ایک ہزار دینار یا دس ہزار درہم دینے

[1] اتقان، ج ۱، ص ۱۳۹

Marfat.com

پڑتے ہیں حضرت شاہ عبد القادر صاحب موضح القرآن میں فرماتے ہیں:- "خون بہا مذہب حنفی میں مسلمان کے دو ہزار سات سو چالیس روپے میں تخمیناً اور دو بینے آتے ہیں قاتل کی برادری کو تین برس میں تفریق ادا کریں" ج۔

# باب الذال المعجمة

## فصل الالف

**ذا**: یہ بجو صاحب زوالا پہلے معنی کے اعتبار سے اسمِ اشارہ ہے قریب کے لئے استعمال ہوتا ہے اور جب اس پر ہائے تنبیہ داخل ہوتی ہے تو ھٰذا بولتے ہیں مگر قرآن مجید میں بغیر ہا تنبیہ کے صرف ذا کا استعمال اسم اشارہ کے معنی میں نہیں ہوا ہے دوسرے معنی کے اعتبار سے بمعنی اَلَّذِیْ ہے یہ اس صورت میں ہوتا ہے کہ جب وہ بعد مَا استفہامیہ اور مَنْ استفہامیہ کے واقع ہو اور ما اشارہ کیلئے نہ ہو اور تیسرے معنی کے اعتبار سے اسم ہے بمعنی صاحب کے (ملاحظہ ہوں الفاظ ذو، ماذا، من ذا اور ھذا) ۲: ۱۰، ۱۱، ۱۶؛ ۳: ۲؛ ۴: ۸؛ ۵: ۳؛ ۶: ۵؛ ۷: ۳۰، ۵؛ ۸: ۶؛ ۹: ۴؛ ۱۱: ۹، ۱۰، ۱۵؛ ۱۳: ۳؛ ۱۴: ۹، ۱۰؛ ۱۵: ۳؛ ۱۶: ۲؛ ۱۸: ۴؛ ۱۹: ۱۸؛ ۲۰: ۳، ۱۰؛ ۲۱: ۷، ۱۰، ۱۳، ۱۸؛ ۲۲: ۹، ۱۵، ۱۷؛ ۲۳: ۷، ۱۱، ۱۳؛ ۲۴: ۱، ۹؛ ۲۶: ۱۸؛ ۲۹: ۳۳، ۳۴، ۱۹؛ ۳۰: ۱۵۔

**ذُو الْقَرْنَیْنِ**: ذو القرنین اس جلیل القدر صالح بادشاہ کا لقب ہے جس کا تذکرہ سورۂ کہف میں مذکور ہے واضح رہے کہ قرآن مجید سیرت یا تاریخ کی کوئی کتاب نہیں ہے کہ وہ جس شخصیت کا ذکر کرے اس کے تمام حالات کا استقصا کرتا جائے کیونکہ یہ چیز اس کے موضوع سے خارج ہے وہ جس شخص کا ذکر کرتا ہے اس کی زندگی کے اسی پہلو کو نمایاں کرتا ہے جو دوسروں کیلئے پند و موعظت اور عبرت و نصیحت کا سبق ہو چنانچہ قریش نے جب یہود سے معلومات حاصل کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ذو القرنین کی نسبت سوال کیا تو قرآن مجید نے اس کے جواب میں وہی انداز اختیار کیا۔ جو صالحین کے تذکرہ میں اس کا عام انداز ہے اور وحیِ ربانی کے معجزانہ جواب کے سامنے سائنس کو مجالِ دم زدن نہ رہی لیکن جاہلیتِ کبریٰ کی اس نشأۃِ جدیدہ میں جبکہ بَلْ کَذَّبُوْا بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا بِعِلْمِہٖ کچھ نہیں پر

جس بات کے سمجھنے پر قابو نہ پایا اسے جھٹلانے لگے، کا مکمل دور دورہ ہے۔ حال کے معترضین قرآن نے ذوالقرنین کی شخصیت کو سب سے زیادہ اپنے معاندانہ اعتراضات کا ہدف بنالیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ذوالقرنین کا کوئی تاریخی وجود نہیں بلکہ ایک بے حقیقت افسانہ تھا جو عرب کے یہودیوں میں مشہور تھا اور پیغمبر اسلام علیہ السلام نے نعوذ باللہ خوش اعتقادی کی بنا پر حقیقت سمجھ کر اسے نقل کر ڈالا۔

بلاشبہ مفسرین کے اقوال اس کی شخصیت کے تعین میں سخت مضطرب ہیں کوئی اس کو عرب کا بادشاہ سمجھ کر اذوا یمین میں سے قرار دیتا اور صعب نام بتاتا ہے اور کوئی اسکندر مقدونی کو ذوالقرنین خیال کرتا ہے، سید احمد خاں نے ازالۃ الغین عن ذی القرنین میں اسے "چی وانگ ٹی" بانیٔ دیوارِ چین بنانے کی ناکام کوشش کی ہے، غرض جتنے منہ اتنی باتیں ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان میں سے کوئی بات بھی قابلِ التفات نہیں ہے لیکن بلا تحقیق کے معترضین کا اپنی علمی نارسائی کا اعتراف کرنے کی بجائے سرے سے اسکی شخصیت کا انکار کر بیٹھنا جہلِ مرکب کی کتنی شرمناک مثال ہے؟ آج اکتشافاتِ اثریہ نے جن سینکڑوں چھپی ہوئی حقیقتوں کو بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے انہیں سے ایک ذوالقرنین کی بھی حقیقت ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے "ترجمان القرآن" میں اس بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ زمانہ حال کی نہایت قیمتی اسلامی تحقیقات میں سے ہے، ہم اسی کا اقتباس موصوف ہی کے الفاظ میں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں، مولانا فرماتے ہیں :۔

"قرآن نے ذوالقرنین کی نسبت جو کچھ بیان کیا ہے اس پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے تو حسبِ ذیل امور سامنے آجاتے ہیں :۔

اولاً جس شخصیت کی نسبت پوچھا گیا ہے وہ یہودیوں میں ذوالقرنین کے نام سے مشہور تھا یعنی ذوالقرنین کا لقب خود قرآن نے تجویز نہیں کیا ہے، پوچھنے والوں کا مجوزہ ہے کیونکہ فرمایا وَيَسْئَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ۔

ثانیاً اللہ نے اپنے فضل و کرم سے اسے حکمرانی عطا فرمائی تھی اور ہر طرح کا ساز و سامان جو ایک حکمران کے لئے ہو سکتا تھا اس کے لئے فراہم ہو گیا تھا۔

ثالثاً اس کی بڑی مہمیں تین تھیں، پہلے مغربی ممالک فتح کئے پھر مشرقی پھر ایک ایسے مقام تک فتح کرتا ہوا چلا گیا جہاں پہاڑی درّہ تھا اور اس کی دوسری طرف سے یاجوج اور ماجوج آکر لوٹ مار

مچایا کرتے تھے۔

رابعاً اس نے وہاں ایک نہایت محکم سد تعمیر کر دی اور یاجوج و ماجوج کی راہ بند ہو گئی۔

خامساً وہ ایک عادل حکمران تھا، جب وہ مغرب کی طرف فتح کرتا ہوا دور تک چلا گیا تو ایک قوم نے جس نے خیال کیا کہ دنیا کے تمام بادشاہوں کی طرح ذوالقرنین بھی ظلم و تشدد کریگا لیکن ذوالقرنین نے اعلان کیا کہ بے گناہوں کے لئے کوئی اندیشہ نہیں ہے جو لوگ نیک عملی کی راہ چلیں گے ان کے لئے ویسا ہی اجر بھی ہوگا البتہ ڈرنا انہیں چاہئے جو جرم اور بدعملی کا ارتکاب کرتے ہیں۔

سادساً وہ خدا پرست اور راستباز انسان تھا اور آخرت کی زندگی پر یقین رکھتا تھا۔

سابعاً وہ نفس پرست بادشاہوں کی طرح طامع اور حریص نہ تھا، جب ایک قوم نے کہا یاجوج و ماجوج ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک سد تعمیر کر دیں ہم خراج دیں گے تو اس نے کہا مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ (جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے وہی میرے لئے بہتر ہے میں تمہارے خراج کا طامع نہیں یعنی میں خراج کی طمع سے کام نہیں کرونگا اپنا فرض سمجھکر انجام دونگا۔

تاریخِ قدیم کی جس شخصیت میں یہ تمام اوصاف پائے جائیں وہی ذوالقرنین ہو سکتا ہے سوال یہ ہے کہ یہ کون شخص تھا؟

سب سے پہلا حل طلب مسئلہ جو مفسرین کے سامنے آیا وہ اس کے لقب کا تھا، عربی میں بھی اور عبرانی میں بھی "قرن" کے معنی صاف سینگ کے ہیں پس ذوالقرنین کا مطلب ہوا دو سینگوں والا، لیکن چونکہ تاریخ میں کسی ایسے بادشاہ کا سراغ نہیں ملا جس کا ایسا لقب رہا ہو اس لئے مجبوراً "قرن" کے معنی میں طرح طرح کے تکلفات کرنے پڑے پھر چونکہ فتوحات کی وسعت اور مغرب و مشرق کی حکمرانی کے لحاظ سے سکندرِ مقدونی کی شخصیت سب سے زیادہ مشہور رہی ہے اس لئے متاخرین کی نظریں اسی کی طرف اٹھ گئیں حالانکہ کسی اعتبار سے بھی قرآن کا ذوالقرنین سکندرِ مقدونی نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ خدا پرست تھا نہ عادل تھا، نہ مفتوح قوموں کیلئے فیاض تھا اور نہ ہی اس نے کوئی سد بنائی۔

بہر حال مفسرین ذوالقرنین کی شخصیت کا سراغ نہ لگا سکے، اگر ذوالقرنین کے مفہوم کا کوئی سراغ ملتا تھا تو وہ صرف دور کا ایک اشارہ تھا جو حضرت دانیال کی کتاب میں ملتا ہے یعنی ایک خواب جو

انہوں نے بابل کی اسیری کے زمانے میں دیکھا تھا چنانچہ کتاب دانیال میں ہے :

"میں دیکھتا ہوں کہ ندی کے کنارے ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ ہیں دونوں سینگ اونچے تھے لیکن ایک دوسرے سے بڑا تھا اور بڑا دوسرے کے پیچھے تھا، میں نے دیکھا کہ پچھم، اُتر اور دکھن کی طرف وہ سینگ مارتا ہے یہاں تک کہ کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا نہ رہ سکا اور وہ بہت بڑا ہوگیا۔ میں یہ بات سوچ ہی رہا تھا کہ دیکھوں پچھم کی طرف سے ایک بکرا آ کے تمام روئے زمین پر پھر گیا، اس بکرے کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک عجیب طرح کا سینگ تھا، وہ دو سینگ والے مینڈھے کے پاس آیا اور اس پر غضب سے بھڑکا اور اس کے دونوں سینگ توڑ ڈالے اور مینڈھے کی قوت نہ تھی کہ اس کا مقابلہ کرے۔" (دانیال ۸)

پھر اس کے بعد ہے کہ جبرئیل نمایاں ہوا اور اس نے خواب کی یہ تعبیر بتلائی کہ دو سینگوں والا مینڈھا مادہ (میڈیا) اور فارس کی بادشاہت ہے اور بال والا بکرا یونان کی، جو بڑا سینگ اسکی آنکھوں کے درمیان دکھائی دیتا ہے وہ اس کا پہلا بادشاہ ہوگا (۸: ۱۵) اس بیان سے معلوم ہوا کہ مادہ (میڈیا) اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دی گئی تھی اور چونکہ یہ دونوں مملکتیں مل کر ایک شہنشاہی بننے والی تھیں اس لئے شہنشاہ مادہ و فارس کو دو سینگوں والے مینڈھے کی شکل میں ظاہر کیا گیا پھر اس مینڈھے کو جس نے شکست دی وہ یونان کے بکرے کا پہلا سینگ تھا یعنی سکندر مقدونی تھا جس نے فارس پر حملہ کیا اور کیانی شہنشاہی کا خاتمہ ہوگیا۔

اس خواب میں بنی اسرائیل کے لئے بشارت یہ تھی کہ ان کی آزادی و خوشحالی کا نیا دور اسی دو سینگوں والی شہنشاہی کے ظہور سے وابستہ تھا یعنی شہنشاہِ فارس بابل پر حملہ کرکے فتحمند ہونے والا تھا اور پھر اسی کے ذریعہ بیت المقدس کی از سرِ نو تعمیر اور یہودی قومیت کی دوبارہ شیرازہ بندی ہونیوالی تھی چنانچہ چند برسوں کے بعد سائرس[1] کا ظہور ہوا، اس نے

---

[1] یاد رکھنا چاہئے کہ شاہانِ فارس کے ناموں نے مختلف زبانوں میں مختلف صورتیں اختیار کر لی ہیں، اور اسی کی وجہ سے مؤرخوں نے سخت غلطیاں کی ہیں، سائرس کا اصل نام گوندیا گوردکشس تھا جیسا کہ دارا کے کتبہ بےستون سے معلوم ہوتا ہے لیکن یونانی اسے سائرس کہنے لگا اور یہودیوں نے اس کا تلفظ خورس کی شکل میں کیا چنانچہ یشعیاہ، ارمیاہ اور دانیال کے صحائف میں جا بجا یہ نام آیا ہے اور یہی گوردکشس ہے جس نے فارسی میں خسرو کی شکل اختیار کر لی چنانچہ عرب مؤرخ اسے کیخسرو کے نام سے پکارتے ہیں۔

میڈیا اور فارس کی مملکتیں ملا کر ایک عظیم الشان شہنشاہی قائم کر دی اور پھر بابل پر پے در پے حملے کر کے اسے مسخر کر لیا۔

چونکہ اس خواب میں میڈیا اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دی گئی تھی اس لئے خیال ہوتا تھا کہ عجب نہیں فارس کے شہنشاہ کے لئے یہودیوں میں ذوالقرنین کا تخیل پیدا ہو گیا ہو یعنی دو سینگوں والی شہنشاہی اور وہ اسے اس لقب سے پکارتے ہوں تاہم یہ محض ایک قیاس تھا اس کی تائید میں کوئی تاریخی شہادت موجود نہ تھی، لیکن سنہ ۱۸۳۸ء کے ایک انکشاف نے جس کے نتائج بہت عرصہ کے بعد منظر عام پر آئے، اس قیاس کو ایک تاریخی حقیقت ثابت کر دیا اور معلوم ہو گیا کہ فی الحقیقت شہنشاہ سائرس کا لقب ذوالقرنین تھا اور یہ محض یہودیوں کا کوئی مذہبی تخیل نہ تھا بلکہ خود سائرس کا یا باشندگانِ فارس کا مجوزہ اور پسندیدہ نام تھا۔

اس انکشاف نے ظن و تخمین کے تمام پردے اٹھا دئے۔ یہ خود سائرس کا ایک سنگی تمثال ہے جو اصطخر کے کھنڈروں میں دستیاب ہوا، اس میں سائرس کا جسم اس طرح دکھایا گیا ہے کہ اس کے دونوں طرف عقاب کی طرح پر نکلے ہوئے ہیں اور سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگ ہیں، اوپر خطِ میخی میں جو کتبہ کندہ تھا اس کا بڑا حصہ ٹوٹ کر ضائع ہو چکا ہے مگر جس قدر باقی ہے وہ اس کیلئے کافی ہے کہ تمثال کی شخصیت واضح ہو جائے، اس سے معلوم ہو گیا کہ مادہ اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دینے کا تخیل ایک مقبول اور عام تخیل تھا اور یقیناً سائرس کو ذوالقرنین کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ تمثال میں پروں کا ہونا اس کے ملکوتی صفات و فضائل کی طرف اشارہ ہے کیونکہ نہ صرف پارسیوں میں بلکہ تمام معاصر قوموں میں یہ اعتقاد عام طور پر پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ایک غیر معمولی نوعیت کا انسان ہے۔ اب غور کرو قرآن کی تصریحات نے جو جامہ تیار کیا ہے وہ کس طرح ٹھیک ٹھیک سائرس ہی کے جسم پر راست آتا ہے؟ ہم نے اس مبحث کے آغاز میں تصریحاتِ قرآنی کا خلاصہ دے دیا ہے جو سات دفعات پر مشتمل ہیں، ان پر پھر ایک نظر ڈال لو۔

سب سے پہلے اس بات پر غور کرو کہ ذوالقرنین کی نسبت سوال بالاتفاق یہودیوں کی جانب سے ہوا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی غیر یہودی بادشاہ

Marfat.com

کی شخصیت یہودیوں میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھی جاتی تھی تو وہ صرف سائرس ہی کی تھی، نبیوں کی پیشینگوئیوں کا مصداق دانیال نبی کے خواب کا ظہور، رحمت الٰہی کی واپسی کی بشارت بنی اسرائیل کا نجات دہندہ، خدا کا فرستادہ چرواہا اور مسیح، یروشلم کی تعمیر ثانی کا وسیلہ، پس اس سے زیادہ قدرتی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسی کی نسبت ان کا سوال ہو، علاوہ بریں سائرس کی تمثال کے انکشاف نے قطعی طور پر یہ بات آشکارا کر دی ہے کہ اس کے سر پر دو سینگوں کا تاج رکھا گیا تھا اور یہ فارس اور مادہ کی مملکتوں کے اجتماع اور اتحاد کی علامت تھی۔

اس کے بعد قرآن کی تصریحات سامنے لاؤ سب سے پہلا وصف جو اس کا بیان کیا ہے یہ ہے کہ اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا (ہم نے اسے زمین میں قدرت دی تھی اور ہر طرح کا ساز و سامان مہیا کر دیا) قرآن جب کبھی انسان کی کسی کامرانی و خوشحالی کو براہِ راست خدا کی طرف منسوب کر کے کہتا ہے جیسا کہ یہاں کہا ہے تو اس سے مقصود عموماً کوئی ایسی بات ہوتی ہے جو عام حالات کے خلاف محض اس کے فضل و کرم سے ظہور میں آئی ہو پس ضروری ہے کہ ذوالقرنین کو حکمرانی کا مقام ایسے ہی حالات میں ملا ہو جو بالکل غیر معمولی قسم کے ہوں اور انہیں محض توفیقِ الٰہی کی کرشمہ سازی سمجھا جا سکے کیونکہ اس نے تمکین فی الارض کو براہِ راست خدا کی طرف نسبت دی ہے لیکن اس اعتبار سے سائرس کی زندگی ٹھیک ٹھیک اس آیت کی تصویر ہے اس کی ابتدائی زندگی ایسے حالات میں بسر ہوئی جنہیں حیرت انگیز حوادث نے ایک افسانہ کی شکل دیدی ہے قبل اس کے کہ پیدا ہو خود اس کا نانا اس کی موت کا خواہشمند ہو گیا تھا، ایک وفادار آدمی اسکی زندگی بچاتا ہے وہ وہ شاہی خاندان سے بالکل الگ ہو کر ایک گمنام گڈریے کی طرح پہاڑوں میں زندگی بسر کرتا ہے پھر اچانک نمایاں ہوتا ہے اور بغیر کسی جنگ و مقابلہ کے میڈیا کا تخت اس کے لئے خالی ہو جاتا ہے یقیناً یہ صورتِ حال واقعات و حوادث کی عام رفتار نہیں ہے جو ہمیشہ پیش آتی ہو وہ نوادرِ ہستی کی ایک غیر معمولی عجائب آفرینی ہے اور صاف نظر آ رہا ہے کہ قدرت کا مخفی ہاتھ کسی خاص مقصد سے ایک خاص ہستی تیار کر رہا ہے! زمانہ کی عام رفتار تھم گئی ہے تاکہ اس کی راہ صاف ہو جائے۔

اس کے بعد اس کی تین مہموں کا ذکر آتا ہے ایک مغرب الشمس کی طرف یعنی پچھم کی طرف ایک مطلع الشمس کی طرف یعنی پورب کی طرف تیسری ایک ایسے مقام پر جہاں کوئی وحشی قوم آباد تھی اور یاجوج اور ماجوج وہاں آکر لوٹ مار مچایا کرتے تھے۔ اب دیکھو یہ تمام تفصیلات کس طرح ٹھیک ٹھیک سائرس کی فتوحات پر منطبق ہوتی ہیں۔

سائرس نے ابھی فارس اور میڈیا کا تاج سر پر رکھا ہی تھا کہ ایشیائے کوچک کے بادشاہ کروسس نے حملہ کر دیا۔ اب سائرس مجبور ہو گیا کہ بلا توقف اس حملہ کا مقابلہ کرے وہ میڈیا کے دارالحکومت ہگ متانہ سے (جواب ہمدان کے نام سے پکارا جاتا ہے) نکلا اور اس تیزی کے ساتھ بڑھا کہ صرف دو جنگوں کے بعد جو پٹیریا اور سارڈیس کے قریب واقع ہوئی تھیں، لیڈیا کی تمام مملکت پر قابض ہو گیا اب تمام ایشیائے کوچک بحر شام سے بحر اسود تک اس کے زیر نگین تھا وہ برابر بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ مغربی ساحل پر پہنچ گیا۔ یہ لشکر کشی جو اسے پیش آئی صریح مغرب کی لشکر کشی تھی کیونکہ وہ ایران سے مغرب کی طرف چلا اور خشکی کے مغربی کنارے تک پہنچ گیا، یہ اس کے لئے مغرب الشمس کی آخری حد تھی۔

ایشیائے کوچک کا مغربی ساحل نقشہ میں نکالو تو تم دیکھو گے کہ تمام ساحل اس طرح کا واقع ہوا ہے کہ چھوٹے چھوٹے خلیج پیدا ہو گئے ہیں اور سمرنا کے قریب اس طرح کے جزیرے نکل آئے ہیں جنہوں نے ساحل کو ایک جھیل یا حوض کی شکل دیدی ہے، لیڈیا کا دارالحکومت سارڈیس مغربی ساحل کے قریب تھا اور اس کا محل موجودہ سمرنا سے بہت زیادہ فاصلہ پر نہ تھا، پس جب سائرس، سارڈیس کی تسخیر کے بعد آگے بڑھا ہو گا تو یقیناً بحر ایجین کے اسی ساحلی مقام پر پہنچا ہو گا جو سمرنا کے قرب وجوار میں واقع ہے، یہاں اس نے دیکھا ہو گا کہ سمندر نے ایک جھیل کی سی شکل اختیار کر لی ہے، ساحل کی کیچڑ سے پانی گدلا ہو رہا ہے اور شام کے وقت جھیل میں سورج ڈوبتا دکھائی دیتا ہے، اسی صورت حال کو قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ اسے ایسا دکھائی دیا کہ سورج ایک گدلے حوض میں ڈوب رہا ہے، دوسری لشکر کشی مشرق کی

طرف تھی چنانچہ ہیروڈوٹس اور سیاز دونوں اسکی مشرقی لشکر کشی کا ذکر کرتے ہیں جو لیڈیا کی فتح کے بعد اور بابل کی فتح سے پہلے پیش آئی تھی اور دونوں نے تصریح کی کہ مشرق کے بعض وحشی اور صحرا نشین قبائل کی سرکشی اس کا باعث ہوئی تھی، یہ ٹھیک ٹھیک قرآن کے اس اشارہ کی تصدیق کرتی اذا بلغ مطلع الشمس وجدھا تطلع علیٰ قوم لم نجعل لھم من دونھا ستراً جب وہ مشرق کی طرف پہنچا تو اسے ایسی قوم ملی جو سورج کے لئے کوئی آڑ نہیں رکھتی یعنی خانہ بدوش قبائل تھے۔

یہ خانہ بدوش قبائل کون تھے؟ ان مؤرخین کی صراحت کے مطابق بکٹریا یعنی بلخ کے علاقہ کے قبائل تھے۔ نقشہ پر اگر نظر ڈالو گے تو صاف نظر آجائیگا کہ بکٹریا ٹھیک ٹھیک ایران کیلئے مشرق اقصیٰ کا حکم رکھتا ہے کیونکہ اس کے آگے پہاڑ ہیں اور انہوں نے راہ روک دی ہے۔

تیسری لشکر کشی اس نے ایسے علاقہ تک کی جہاں یاجوج اور ماجوج کے حملے ہوا کرتے تھے یہ یقیناً اس کی شمالی مہم تھی جس میں وہ بحر خزر (کاکیشین) کو داہنی طرف چھوڑتا ہوا کاکیشیا کے سلسلہ کو تک پہنچ گیا تھا اور وہاں سے اسے ایک درّہ ملا تھا جو دو پہاڑی دیواروں کے درمیان تھا، اسی راہ سے یاجوج اور ماجوج آکر اس طرف کے علاقہ میں تاخت و تاراج کیا کرتے تھے اور یہیں اس نے سدّ تعمیر کی۔

اس کے بعد ذوالقرنین کا جو وصف سامنے آتا ہے وہ اس کی عدالت گستری اور خدمتِ انسانی کی فیاضانہ سرگرمی ہے اور یہ اوصاف سائرس کی تاریخی سیرت کی اس درجہ آشکارا حقیقتیں ہیں کہ مؤرخ کی نگاہ کسی دوسری طرف اٹھ ہی نہیں سکتی، قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے مغرب میں جو قوم ملی تھی، اس کی نسبت حکم الٰہی ہوا تھا یاذالقرنین اما ان تعذب واما ان تتخذ فیھم حسناً یعنی قوم اب تیرے بس میں ہے جس طرح چاہے ان کے ساتھ سلوک کر سکتا ہے خواہ سزا دے خواہ انہیں اپنا دوست بنائے یقیناً یہ لیڈیا کی یونانی قوم تھی، اس کے بادشاہ کروسس نے تمام عہد و پیمان اور باہمی رشتہ داریاں بھلا کر بلا وجہ سائرس پر حملہ کر دیا تھا اور صرف خود ہی حملہ آور نہیں ہوا تھا بلکہ وقت کی تمام طاقتور حکومتوں کو بھی اسکے خلاف

Marfat.com

ابجار کر اپنے ساتھ کر لیا تھا۔ تمام یونانی مؤرخ بالاتفاق شہادت دیتے ہیں کہ سائرس نے فتح کے بعد باشندگان لیڈیا کے ساتھ جو سلوک کیا وہ صرف منصفانہ ہی نہ تھا وہ اس سے بھی زیادہ تھا وہ فیاضانہ تھا وہ اگر اپنے دشمنوں کے ساتھ کرتا تو یہ انصاف ہوتا کیونکہ زیادتی ان ہی کی تھی لیکن وہ صرف منصف ہونے پر قانع نہیں ہوا اس نے رحم و بخشش کا شیوہ اختیار کیا، یہ تو صرف اس کی مغربی فتحمندی کی سرگذشت تھی، اب دیکھنا چاہیئے کہ اس کے اعمال کی عام رفتار کیسی رہی اور قرآن کا بیان کردہ وصف کہاں تک اس پر راست آتا ہے؟

بالاتفاق یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ سائرس تاریخ قدیم کی سب سے بڑی شخصیت ہے جس میں بیک وقت فتوحات کی وسعت، فرمانروائی کی عظمت اور اخلاق و انسانیت کی فضیلت جمع ہو گئی تھی اور وہ جس عہد میں ظاہر ہوا اس عہد میں اسکی شخصیت ہر اعتبار سے انسانیت کا ایک پیام اور قوموں کی بخت تھی۔ اس سلسلہ میں آخری وصف جو ذوالقرنین کا سامنے آتا ہے وہ اس کا ایمان باللہ ہے۔ یہودیوں کے صحائف کی واضح شہادت موجود ہے کہ خدا نے اسے اپنا فرستادہ اور "مسیح" کہا اور وہ نبیوں کا موعود و منتظر تھا، ظاہر ہے کہ ایسی ہستی خدا کی نافرمان نہیں ہو سکتی۔"

**ھم** نے اقتباس میں نہایت ہی اختصار سے کام لیا ہے، مولانا کا یہ مقالہ جو ذوالقرنین، یاجوج و ماجوج اور سد کی تحقیق میں سپرد قلم ہوا ہے نہایت باریک خط کے اکتیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے تفصیل کے لئے اس کا مطالعہ از بس مفید ہے۔

واضح رہے کہ ہمارے زمانے میں بھی اور اس سے پہلے بھی ذوالقرنین کی نبوت کا مسئلہ زیر بحث رہ چکا ہے اور ہر فریق اپنے دعوے کے ثبوت میں دلائل پیش کرتا ہے لیکن جس صورت میں کہ حاکم حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کر رہے ہیں کہ لا ادری ذا القرنین کان نبیا ام لا[1] "مجھے نہیں معلوم ذوالقرنین نبی تھے یا نہیں۔"

اس بحث کے فیصلہ کی جرأت کرنا کسقدر لایعنی ہے۔ ۱۶/۲

**ذَاالْکِفْلِ**، ذوالکفل علیہ السلام، قرآن مجید میں آپکا ذکر انبیاء علیہم السلام کے زمرہ میں دو مقام پر آیا ہے، لیکن دونوں جگہ صرف نام لیا گیا ہے، آپ کے حالات کا کوئی اجمالی یا تفصیلی تذکرہ نہیں کیا گیا،

[1] المستدرک علی الصحیحین ج ۲ ص ۴۵۰ طبع دائرة المعارف حیدرآباد) حاکم نے اس کو بخاری مسلم کی شرط پر صحیح کہا اور ذہبی نے تلخیص میں اس کو تسلیم کر لیا ہے۔

Marfat.com

اسی طرح جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس سلسلہ میں کچھ مروی نہیں ہے۔ قرآن پاک نے آپ کے صابرین، صالحین اور اخیار میں سے ہونے کی شہادت اور رحمتِ الٰہی میں داخل کرنے کی بشارت دی ہے، عالمِ انسانی کیلئے اس سے زیادہ کسی کی سیرت میں اور کس چیز کے معلوم کرنے کی ضرورت ہے، پ۱۷/۶ ، ۲۳/۱۲۔

**ذَاالنُّوْنِ** : مچھلی والا، یہ حضرت یونس علیہ السلام کا لقب ہے چونکہ آپ کو مچھلی نگل گئی تھی اس لئے ذوالنون کہلائے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ذا اور یونس) پ۱۷/۶۔

**ذَاتِ** : والی، صاحب، مؤنث ہے ذُوْ کا جو بمعنی صاحب ہے، مگر اس کی جمع (ملاحظہ ہو ذُوْ) پ۴/۲،۷ پ۶/۳ پ۹/۱۵ پ۱۰/۱ پ۱۱/۱۷ پ۱۵/۱۴،۱۶ پ۱۷/۸ پ۱۸/۳ پ۲۰/۱ پ۲۱/۱۲ پ۲۲/۱۷ پ۲۳/۱۵ پ۲۵/۴ پ۲۶/۱۸ پ۲۷/۸،۱۱،۱۷ پ۲۸/۱۵ پ۲۹/۱ پ۳۰/۱۰،۱۱،۱۴،۱۶۔

**ذٰرِیٰتِ** : بکھیرنے والیاں، پراگندہ کرنے والیاں، ذَرْوٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مؤنث، قرآن مجید میں یہ ہواؤں کی صفت بیان کی گئی ہے (ملاحظہ ہو ذَرْوٌ) پ۲۶/۱۸۔

**ذَاقَا** : ان دونوں نے چکھا (نصر) ذَوْقٌ سے جس کے معنی چکھنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ تثنیہ مذکر غائب، پ۸/۹۔

**ذَاقَتْ** : اس نے چکھا، ذَوْقٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، پ۲۸/۱۸۔

**ذَاقُوْا** : انہوں نے چکھا، ذَوْقٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ۸/۹، پ۱۵/۵۔

**ذٰکِرٰتِ** : یاد کرنے والی عورتیں، ذاکرۃ کی جمع ذِکْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مؤنث (ملاحظہ ہو ذکر) پ۲۲/۲۔

**ذَاکِرِیْنَ** : یاد رکھنے والے، یاد کرنے والے ذَاکِرٌ کی جمع، ذِکْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ نصب و جر، پ۱۲/۱۰ پ۲۲/۲۔

**ذٰلِكَ** : یہی، اسماءِ اشارہ میں سے ہے، بعید کے لئے آتا ہے اس میں ذَا اسم اشارہ ہے اور كَ حرفِ خطاب ہے اور اسی لئے مخاطب کے حالات کے اعتبار سے تذکیر، تانیث، تثنیہ اور جمع میں بدلتا رہتا ہے،

۱/۱،۶،۷،۸،۹،۱۰ ۲/۵،۶،۸،۱۲،۱۳،۱۴،۱۶ ۳/۶،۱۰،۱۱،۱۲

۳/۱۴،۱۶،۱۷ ۴/۱،۳،۸،۱۰،۱۲،۱۳ ۵/۱،۲،۳،۴،۵،۹،۱۲،۱۶،۱۷،۱۹

۶/۱،۲،۳،۴،۷،۹،۱۰،۱۲،۱۳،۱۵ ۷/۱،۲،۳،۴،۵،۶،۹،۱۲،۱۴،۱۶ ۸/۱۳

۸/۷،۱۰ ۹/۷،۱۱،۱۲ ۱۰/۳،۷،۱۰،۱۱،۱۲،۱۵،۱۶،۱۷ ۱۱/۲،۳

۱۱/۳،۶،۱۱،۱۲ ۱۲/۶،۹،۱۰،۱۵،۱۶،۱۷ ۱۳/۲،۵،۷،۱۳،۱۵

۱۴/۵،۸،۱۳،۱۵،۱۷،۲۰،۲۱ ۱۵/۳،۹،۱۱،۱۲،۱۴،۱۶،۲۱

۱۶/۱،۳،۵،۷،۱۱،۱۲،۱۶ ۱۷/۲،۶،۸،۹،۱۰،۱۵،۱۶ ۱۸/۱،۲،۴

۱۸/۷،۱۰،۱۲،۱۳،۱۷ ۱۹/۲،۴،۵،۸،۹،۱۰،۱۲،۱۳،۱۵،۱۹

۲۰/۳،۴،۱۴،۱۵،۱۷ ۲۱/۱،۲،۷،۸،۱۱،۱۲،۱۳،۱۴،۱۵،۱۶

۲۱/۱۴،۱۸،۲۰ ۲۲/۳،۵،۷،۸،۱۴،۱۵،۱۶ ۲۳/۲،۶،۱۱،۱۲،۱۳

Marfat.com

۲۳/۱۶،۱۷ ، ۲۴/۱،۲،۸،۹،۱۶،۱۸ ، ۲۵/۲،۳،۵،۷،۹،۱۶،۱۸،۱۹،۲۰
۲۶/۴،۵،۷،۹،۱۰،۱۲،۱۵،۱۶،۱۷،۱۸ ، ۲۷/۴،۶،۱۵،۱۸،۱۹
۲۸/۱،۲،۳،۵،۷،۱۰،۱۱،۱۳،۱۴،۱۵،۱۶،۱۹ ، ۲۹/۳،۴،۷،۸،۱۱،۱۵
۲۹/۱۸،۱۹ ، ۳۰/۲،۳،۴،۸،۱۰،۱۴،۲۳،۲۵،۳۲ -

**ذٰلِكِ**: یہ بھی اسم اشارہ ہے واحد مؤنث کے لئے استعمال ہوتا ہے، پ۱۲/۳ ، ۱۹/۲۶ -

**ذٰلِكُمْ**: یہ بھی، اس میں کُمْ ضمیر جمع خطاب کیلئے ہے، پ۱/۶ ، ۲/۱۲ ، ۳/۷،۱۰،۱۵ ، ۴/۹ ، ۵/۱ ، ۶/۵ ، ۷/۱۸،۱۹ ، ۸/۱۴،۱۸ ، ۹/۹،۱۶ ، ۱۰/۱۲ ، ۱۱/۶،۹ ، ۱۳/۱۲ ، ۱۴/۵،۱۶ ، ۱۵/۱۰ ، ۱۶/۱۲ ، ۲۱/۷،۱۸ ، ۲۲/۴،۱۳ ، ۲۴/۱۵ ، ۲۳/۱۲،۱۳،۱۷ ، ۲۵/۳،۲۰ ، ۲۸/۱،۸،۱۰،۱۲،۱۷ -

**ذٰلِكُمَا**: یہ بھی، اس میں کُمَا ضمیر تثنیہ خطاب کے لئے ہے، پ۱۲/۱۵ -

**ذٰلِكُنَّ**: یہ بھی، اس میں کُنَّ ضمیر جمع مؤنث خطاب کے لئے ہے، پ۱۲/۱۴ -

**ذٰنِكَ**: یہ دو، ذَانِ ذَا کا تثنیہ ہے، اسماءِ اشارہ میں سے ہے اور كَ ضمیر خطاب ہے، پ۲۰ -

**ذَاهِبٌ**: جانے والا، ذَهَابٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو اِذْهَبْ)، پ۲۳/۷ -

**ذَائِقُوا**: چکھنے والے، ذَائِقٌ کی جمع، ذَوْقٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، اصل میں ذَائِقُوْنَ تھا، نون اضافت کے سبب گر پڑا (ملاحظہ ہو ذَاقَا)، پ۲۳/۶ -

**ذَائِقُوْنَ**: چکھنے والے، ذَوْقٌ سے، اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، پ۲۳/۶ -

**ذَائِقَةٌ**: چکھنے والی، ذَوْقٌ سے، اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث، پ۴/۱۰ ، ۱۷/۳ ، ۲۱/۲ -

## فصل الباء الموحدة

**ذُبَابٌ**: مکھی، اَذِبَّةٌ، ذِبَّانٌ، ذُبٌّ جمع، پ۱۷/۱۷ -

**ذُبَابًا**: پ۱۷/۱۷ -

**ذُبِحَ**: وہ ذبح کیا گیا، ذَبْحٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو اَذْبَحُكَ)، پ۶ -

**ذِبْحٌ**: قربانی، جس چیز کو ذبح کیا جائے اس کا نام ذِبْحٌ ہے، پ۲۳/۷ -

**ذَبَحُوْهَا**: انہوں نے اس کو ذبح کیا، ذَبَحُوْا ذَبْحٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، هَا ضمیر واحد مؤنث غائب، پ۱/۸ -

## فصل الراء المهملة

**ذَرْ**: تو چھوڑ دے، (سَمِعَ، فَتَحَ) وَذْرٌ سے جس کے معنی چھوڑ دینے کے ہیں، امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر، اس کی ماضی نہیں آتی ہے، پ۱۲/۶ -

**ذَرَأَ**: اس نے پیدا کیا، اس نے پھیلایا، اس نے

Marfat.com

بکھیرا۔ ذَرْءٌ سے جس کے معنی پیدا کر کے منتشر کرنے اور پھیلانے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ ۸/۱۴۔

**ذِرَاعًا**: گز، بازو، ہاتھ، کہنی سے لیکر بیچ کی انگلی کے سرے تک جو ہاتھ کا حصہ ہے "ذراع" کہلاتا ہے، اَذْرُعٌ اور ذُرْعَانٌ جمع، ۲۹/۵۔

**ذِرَاعَيْهِ**: اس کے دونوں ہاتھ، اس کے دونوں بازو، ذِرَاعَيْنِ، ذِرَاعٌ کا تثنیہ، مضاف ہے اور اضافت کے سبب نون تثنیہ حذف ہو گیا ہے، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ، ۱۵/۱۵۔

**ذَرَأَكُمْ**: اس نے تم کو پیدا کیا، اس نے تم کو پھیلایا، اس نے تم کو بکھیر دیا۔ اس میں کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر ہے، (ملاحظہ ہو ذَرَأَ)، پ ۵/۲۴۔

**ذَرَأْنَا**: ہم نے پیدا کیا، ہم نے پھیلا دیا، ذَرْءٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، ۹/۱۲۔

**ذَرْعًا**: طاقت، گنجائش، ہاتھ کی کشادگی، ذَرْعٌ یہ ذَرَعَ کا مصدر ہے، خازن بغدادی لکھتے ہیں:

"ازہری کا بیان ہے کہ "ذرع" طاقت کی جگہ پر استعمال کیا جاتا ہے اور اس کی اصل یوں ہے کہ اونٹ اپنی رفتار میں اگلے قدموں کو پچھلے قدموں کی وسعت کے اعتبار سے بڑھاتا ہے اور جب اس پر طاقت سے زیادہ بوجھ ڈال دیا جاتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کے اگلے قدم رک جاتے ہیں اور وہ کمزور ہو کر اپنی گردن لمبی کر دیتا ہے، پس "ضیق ذرع" سے گنجائش اور طاقت کا ختم ہو جانا مراد لیا گیا اور ضاق بِهِمْ ذَرْعًا کے معنی ہوئے کہ معاملہ کی خرابی سے رہائی کی کوئی صورت نہ ہو سکی اور ازہری کے علاوہ دوسرے علماء کا بیان ہے کہ اس کے معنی دل تنگی اور کڑھنے کے ہیں اور اس کی اصل کا پتہ نہیں، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ "ذرع" وسعت (گنجائش) سے کنایہ ہے کیونکہ ذراع، ید میں داخل ہے اور عرب والے بولتے ہیں لیس ھذا فی یدی (یہ میرے ہاتھ میں نہیں) اور مراد یہ لیتے ہیں کہ اس کی مجھ میں گنجائش نہیں، اور ضاق فلان ذرعا بکذا اس وقت بولا جاتا ہے جبکہ وہ شخص کسی مصیبت میں گرفتار ہو اور اس سے نکلنے کی طاقت نہ رکھتا ہو"۔[1] پ ۱۲/۲۶۔

**ذَرْعُهَا**: اس کا طول، اس کی درازی، اس کا ناپ، ذَرْعٌ مصدر ہے جس کے معنی پیمائش کرنے اور ناپنے کے آتے ہیں، مضاف ہے ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، ۲۹/۵۔

[1] لباب التاویل، جز ۳ ص ۱۹۸، (طبع مصر ۱۳۱۷ھ)

Marfat.com

**ذَرْنَا**: تو ہم کو چھوڑ دے، اس میں نَا ضمیر جمع متکلم ہے (ملاحظہ ہو ذَرْ)، ۱/۲۱۔

**ذَرْنِیْ**: تو مجھ کو چھوڑ دے، اس میں نون وقایہ اور ی ضمیر واحد متکلم ہے، ۲۹/۱۵، ۱۳، ۱۴۔

**ذَرْوًا**: اڑانا، پراگندہ کرنا، جدا کرنا، ذَرَا یَذْرُوْ کا مصدر ہے، ۱۶/۱۸۔

**ذَرُوْا**: تم چھوڑ دو، وَذْرٌ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر (ملاحظہ ہو ذَرْ) ۳/۶، ۸/۱، ۹/۱۲، ۲۵/۱۲۔

**ذَرُوْنَا**: تم ہم کو چھوڑ دو، اس میں نَا ضمیر جمع متکلم ہے، ۲۶/۱۔

**ذَرُوْنِیْ**: تم مجھے چھوڑ دو، اس میں نون وقایہ ی ضمیر واحد متکلم ہے، ۲۴/۸۔

**ذَرُوْهُ**: تم اس کو چھوڑ دو، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، ۱۲/۱۹۔

**ذَرُوْهَا**: تم اس کو چھوڑ دو، اس میں ھا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے، ۸/۱۷، ۱۲/۹۔

**ذَرَّةٍ**: ذرہ، چھوٹی چیونٹی، ذَرَّاتٌ جمع، ۵/۳، ۱۱/۱۲، ۲۲/۲۴، ۳۰/۹۔

**ذَرْهُمْ**: تو ان کو چھوڑ دے، اس میں ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے (ملاحظہ ہو ذَرْ) ۷/۱۴، ۱۷، ۸/۳، ۱۴/۱، ۱۴/۲، ۱۵/۱۲، ۲۶/۲، ۲۹/۸۔

**ذُرِّیَّتِنَا**: ہماری اولاد، ذُرِّیَّاتِ ذُرِّیَّۃٌ کی جمع، مضاف ہے، نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، ۱۹/۱۱۔

**ذُرِّیّٰتِهِمْ**: ان کی اولاد، ذُرِّیّٰتِ مضاف ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، ۷/۱۶، ۱۳/۹، ۲۴/۶۔

**ذُرِّیَّةٌ**: اولاد، اصل میں چھوٹے چھوٹے بچوں کا نام ذُرِّیَّۃٌ ہے مگر عرف میں چھوٹی اور بڑی سب اولاد کے لئے اس کا استعمال ہوتا ہے اور اگرچہ اصل میں یہ جمع ہے مگر واحد اور جمع دونوں کے لئے مستعمل ہے ذُرِّیَّۃٌ کے بارے میں تین اقوال ہیں (۱) یہ ذَرْءٌ سے مشتق ہے جس کے معنی پیدا کرنے اور پھیلانے کے ہیں اور اس کی ہمزہ متروک ہوگئی ہے جیسے کہ رَوِیَّۃٌ اور بَرِیَّۃٌ میں۔ (۲) اس کی اصل ذُرْوِیَّۃٌ ہے۔ (۳) ذَرٌّ سے جس کے معنی بکھیرنے کے ہیں فُعْلِیَّۃٌ کے وزن پر ہے جیسے قُمْرِیَّۃٌ ہے، ذَرَارِیُّ اور ذُرِّیَّاتٌ جمع، ۳/۶، ۱۲، ۴/۱۲، ۳/۳، ۹/۱۲، ۱۱/۱۲، ۱۲/۱۲، ۱۵/۱، ۱۶/۷۔

**ذُرِّیَّتَنَا**: ہماری اولاد، ذُرِّیَّۃٌ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، ۱/۱۵۔

**ذُرِّیَّتِهٖ**: اس کی اولاد، ذُرِّیَّۃٌ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ۱۲، ۷/۱۹، ۲۰/۱۵، ۲۳/۷۔

**ذُرِّیَّتِهَا**: اس کی اولاد، ذُرِّیَّۃٌ مضاف ھا

ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، پ۳ / ۱۲ ۔

**ذُرِّیَّتَهُمْ**: ان کی اولاد، ذُرِّیَّۃٌ مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، پ۹ / ۱۲، پ۲۳ / ۲، پ۲۶ / ۳ ۔

**ذُرِّیَّتَهُمَا**: ان دونوں کی اولاد، ذُرِّیَّۃٌ مضاف هُمَا ضمیر تثنیہ مذکر غائب مضاف الیہ پ۲۳ / ۷، پ۲۶ / ۲ ۔

**ذُرِّیَّتِیْ**: میری اولاد، ذُرِّیَّۃٌ مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، پ۱ / ۱۵، پ۱۳ / ۱۸ ۔

## فصل القاف

**ذُقْ**: تو چکھ، ذَوْقٌ سے امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر (ملاحظہ ہو ذَاقَا)، پ۲۵ / ۱۶ ۔

## فصل الکاف

**ذِکْرٌ**: ذکر، یاد، پند، نصیحت، بیان ذَکَرَ یَذْکُرُ کا مصدر ہے، امام راغب لکھتے ہیں:۔

"ذکر بول کر کبھی تو اس سے نفس کی وہ ہیئت مراد لی جاتی ہے کہ جس کے ذریعہ انسان کے لئے جو کچھ معرفت حاصل کرے اس کا یاد رکھنا ممکن ہوا اور یہ حفظ ہی کی طرح ہے مگر حفظ باعتبار اس کے حصول کے بولا جاتا ہے اور ذکر باعتبار اس کے استحضار کے (یعنی حفظ یاد کرنے کے لئے) اور کبھی ذکر کسی چیز کے دل میں یا گفتگو میں یاد آجانے کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور اسی لئے کہا گیا ہے کہ ذکر دو ہیں: ذکر قلبی اور ذکر لسانی اور پھر دونوں میں سے ایک کی دو قسمیں ہیں ایک بھولے پیچھے یاد آنا، دوسرے بغیر بھولے یاد رہنا بلکہ دائمی یاد رکھنا، نیز ہر قول یعنی گفتگو اور بیان کو بھی ذکر کہا جاتا ہے۔"

اور بیہقی تاج المصادر میں رقمطراز ہیں:۔

"ذکر کی دو قسمیں ہیں ایک وہ ذکر جو نسیان کی ضد ہے جیسے ارشادِ باری جل وعلا ہے وَمَا اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْکُرَهٗ (اور یہ مجھ کو بھلایا شیطان ہی نے کہ اس کا مذکور کروں) اور ایک وہ ذکر جو کہ قول ہے جس کا ذکر ہوا اس کی برائی نہ ہو جیسا کہ عام طور پر گفتگو میں ہوتا ہے نیز وہ گفتگو بھی جس میں مذکور کا عیب بیان ہو جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کی زبانی بیان فرمایا ہے سَمِعْنَا فَتًی یَّذْکُرُهُمْ (ہم نے سنا ہے ایک جوان ان کو کچھ کہتا ہے یعنی ان کو عیب دیتا ہے۔)"

آیت شریفہ اَءُنْزِلَ عَلَیْهِ الذِّکْرُ مِنْ بَیْنِنَا (کیا ہم سب میں سے اسی پر ذکر اتارا گیا)

Marfat.com

میں ذِکر سے قرآن مجید مراد ہے کیونکہ اس سے بڑھ کر
اور کونسا ذکر ہے ۱۲/۳ ، ۲/۶ ، ۱۵،۱۶،۱۵/۸ ، ۱۲/۱۲ ، ۱۰،۵/۱۳ ، ۱۲،۱/۱۴ ، ۴/۱۶
۱،۲،۳،۴،۵/۱۷ ، ۱۱،۱۶/۱۸ ، ۱،۵/۱۹ ، ۱/۲۱ ، ۱۸/۲۲ ، ۱۴،۲،۳،۱۲،۱۳،۱۴،۱۶/۲۳
۱۹/۲۴ ، ۱۰،۱۶/۲۵ ، ۸،۹،۱۶/۲۶ ، ۲،۱۲،۱۴/۲۸ ، ۴،۱۲/۲۹ ، ۶/۳۰ -
ذِکْرًا ۹/۴ ، ۲۱/۱۵ ، ۲،۱۴،۱۵/۱۶ ، ۴/۱۶ ، ۳/۲۲ ، ۵،۹/۲۳ ، ۱۸/۲۸ ، ۲۱/۲۹ -
ذَکَرٌ: مرد، نر، ذُکُوْرٌ اور ذُکْرَانٌ جمع کبھی اس سے
عضوِ مخصوص کا کنایہ بھی ہوتا ہے ۱۲/۳ ، ۱۱،۱۲/۴ ، ۱۵/۵ ، ۴/۶
۱۹/۱۴ ، ۱۰/۱۴ ، ۱۴/۲۶ ، ۵،۷/۲۷ ، ۱۸/۲۹ ، ۱۷/۳۰ -
ذَکَرَ: اس نے ذکر کیا، اس نے یاد کیا (نصر) ذِکْرٌ
سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ۱۹/۲۱ ، ۱۲/۳۰ -
ذُکِرَ: وہ یاد کیا گیا، وہ ذکر کیا گیا، ذِکْرٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ
واحد مذکر غائب ۱/۸ ، ۱۵/۹ ، ۱۲/۱۰ ، ۲/۲۳ ، ۲/۲۶ -
ذُکِّرَ: اس کو یاد دلایا گیا، اس کو سمجھایا گیا، اس کو
نصیحت کی گئی، تَذْکِیْرٌ سے جس کے معنی یاد دلانے
اور نصیحت کرنے کے ہیں ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر
غائب (ملاحظہ ہو تَذْکِیْرًا) ۲/۱۵ ، ۱۵/۲۱ -
ذَکِّرْ: تو یاد دلا، تو سمجھا، تو نصیحت کر، تَذْکِیْرٌ سے
امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر، ۱۲/۷ ، ۱۴/۲۶ ، ۲،۴/۲۷ ، ۱۲،۱۳/۳۰ -
ذُکْرَانٌ: مرد، ذَکَرٌ کی جمع، ۱۲/۱۹ -
ذُکْرَانًا۔ ۹/۲۵ -
ذَکَرْتَ: تو نے یاد کیا، تو نے ذکر کیا، ذِکْرٌ سے

ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر، ۱۵/۵ -
ذُکِّرْتُمْ: تم کو سمجھایا گیا، تم کو نصیحت کی گئی، تَذْکِیْرٌ
سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر حاضر (ملاحظہ ہو تَذْکِیْرًا)
۱۹/۲۲ -
ذِکْرَكَ: تیرا ذکر، تیری یاد، تیرا مذکور، ذِکْرٌ مضاف
كَ ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ، ۱۹/۳۰ -
ذِکْرِکُمْ: تمہارا ذکر، تمہارا مذکور، تمہارا یاد کرنا،
تمہاری نصیحت، ذِکْرٌ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر،
مضاف الیہ، ۱/۱۷ -
ذِکْرِنَا: ہماری یاد، ذِکْرٌ مضاف، نَا ضمیر جمع متکلم
مضاف الیہ، ۱۶/۱۵ ، ۶/۲۷ -
ذَکَرُوْا: انہوں نے یاد کیا، انہوں نے ذکر کیا،
ذِکْرٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، ۵/۴ ، ۱۵/۱۹ -
ذُکِّرُوْا: ان کو سمجھایا گیا، ان کو نصیحت کی گئی،
ان کو یاد دلائی گئی، تَذْکِیْرٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ
جمع مذکر غائب ۲/۷ ، ۱۱/۸ ، ۱۱/۹ ، ۴/۱۹ ، ۵/۲۱ ، ۲۲ -
ذَکَرَهٗ: اس کو یاد کیا، اس کو ذکر کیا، ذَکَرَ صیغہ
ماضی ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، ۱۶/۲۹ ، ۵/۳۰ -
ذِکْرِهِمْ: ان کا ذکر، ان کی نصیحت، ذِکْرٌ مضاف
هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، ۴/۱۸ -
ذَکِّرْهُمْ: تو ان کو نصیحت کر، تو انکو یاد دلا، ذَکِّرْ

Marfat.com

تَذَکُّرٌ سے، مبیذار، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ۱۳/۱۲۔

**ذِکْرَىٰ**: نصیحت کرنا، ذکر کرنا، یاد دہانی، موعظت، ذَکَرَ یَذْکُرُ کا مصدر ہے، کثرتِ ذکر کے لئے ذِکْرَىٰ بولا جاتا ہے، یہ ذکر سے زیادہ بلیغ ہے ۶/۱۴،۱۶ ۸/۸ ۱۰/۱۲ ۶/۱۴ ۱۵/۱۹ ۱/۲۱ ۱۲،۱۶/۲۳ ۱۱/۲۴ ۱۴/۲۵ ۱۵،۱۷/۲۶ ۲/۲۷ ۱۵/۲۹ ۵،۱۲،۱۴/۳۰۔

**ذِکْرِیْ**: میری نصیحت، میری یاد، میرا ذکر، ذِکْر مضاف ی ضمیر واحد متکلم، مضاف الیہ ۲،۱۰،۱۱،۱۶/۱۶ ۶/۱۸ ۱۰/۲۳۔

**ذَکَرَیْنِ**: دو مرد، دو نر، ذَکَرٌ کا تثنیہ بحالتِ نصب وجر، ۴/۸۔

**ذِکْرِهَا**: اس کی یاد، اس کا مذکور، اس کا ذکر ذِکْرٰی مضاف هَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ ۴/۳۰۔

**ذِکْرِهِمْ**: ان کا نصیحت پکڑنا، ان کا یاد کرنا ذِکْرٰی مضاف، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، ۶/۲۶۔

**ذُکُورٌ**: مرد، ذَکَرٌ کی جمع، ۶/۲۵۔

**ذُکُورِنَا**: ہمارے مرد، ذُکُورِ مضاف، نا ضمیر جمع متکلم، مضاف الیہ، ۴/۸۔

**ذَکَّیْتُمْ**: تم نے ذبح کیا، تَذْکِیَۃٌ سے جس کے معنی ذبح کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، ۵/۶۔

## فصل اللام

**ذُلٌّ**: تواضع، ذلت، عاجزی، ذَلَّ یَذِلُّ کا مصدر ہے، دوسرے کے دباؤ اور قہر کی بنا پر جو ذلت ہو اس کو ذُلٌّ کہتے ہیں اور بغیر کسی کے قہر اور دباؤ کے خود اپنی سرکشی اور سخت گیری کے بعد جو ذلت حاصل ہو وہ ذُلٌّ کہلاتی ہے، ۱۲،۴/۱۵ ۹/۲۵۔

**ذُلُلًا**: مسخر، مطیع، منقاد، ذَلُوْلٌ کی جمع ۱۵/۱۴۔

**ذُلِّلَتْ**: وہ پست کر دی گئی، وہ مسخر کر دی گئی، وہ تابع کر دی گئی، تَذْلِیْلٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب (ملاحظہ ہو تَذْلِیْلًا)، ۱۹/۲۹۔

**ذَلَّلْنٰهَا**: ہم نے ان کو رام کر دیا، ہم نے ان کو فرمانبردار کر دیا، ہم نے ان کو عاجز کر دیا ذَلَّلْنَا تَذْلِیْلٌ سے، ماضی کا صیغہ جمع متکلم، هَا ضمیر واحد مؤنث غائب اَنْعَام (مویشی) کی طرف راجع ہے اس لئے جمع کے معنی دے گی، ۴/۲۳۔

**ذَلُوْلٌ**: رام، نرم، مطیع، ہموار، پست ذُلٌّ اور ذِلٌّ سے صفتِ مشبہ کا صیغہ، ذُلُلٌ جمع، ۸/۱

**ذَلُوْلًا**، ۲/۲۹

**ذِلَّةٌ**: ذلت، خواری، رسوائی ذَلَّ یَذِلُّ کا مصدر ہے ۸/۱ ۴/۲ ۹/۹ ۸/۱۱ ۴،۸/۲۹۔

Marfat.com

## فصل المیم

**ذِمَّةٌ**: عہد، ذِمَمٌ جمع، ۱۰/۸۔

## فصل النون المعجمۃ

**ذَنْبٌ**: گناہ، ذُنُوْبٌ جمع، اصل میں ذَنْبٌ کے معنی کسی چیز کی دم پکڑنے کے ہیں اور دم کے اعتبار سے ہی اس کا استعمال ہر اس فعل کے متعلق ہوتا ہے جس کا انجام بُرا ہو اور اسی وجہ سے بُرے انجام کا نام ذَنْب ہے اور چونکہ گناہ کا انجام بُرا ہے اس لئے اسے ذَنْب کہتے ہیں، ۱۹/۶ ۲۴/۶ ۳۰/۶۔

**ذَنْبِكَ**: تیرا بُرا انجام، تیرا گناہ، ذَنْبِ مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ، ۱۲/۱۲ ۲۳/۱۱ ۲۶/۹،۶۔

**ذَنْبِهٖ**: اس کا گناہ، ذَنْبِ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ، ۳۱/۱۹ ۲۷/۱۲۔

**ذَنْبِهِمْ**: ان کا گناہ، ذَنْبِ مضاف هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، ۴/۱ ۳۰/۱۶۔

**ذَنُوْبٌ**: بھرا ڈول، بطورِ استعارہ حصہ و نصیب کے معنی میں بھی آتا ہے، ذِنَابٌ، ذِنَابٌ اور اَذْنِبَةٌ جمع ۲۷/۲، ذَنُوْبًا ۲۷/۲۔

**ذُنُوْبٌ**: گناہ، ذَنْبٌ کی جمع ۲/۵ ۱۵/۲ ۱۹/۲ ۲۴/۲۔

**ذُنُوْبِكُمْ**: تمہارے گناہ، ذُنُوْبِ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، ۲/۱۲ ۷/۶ ۱۳/۱۴ ۲۲/۶ ۲۶/۴ ۲۸/۱ ۲۹/۹۔

**ذُنُوْبَنَا**: ہمارے گناہ، ذُنُوْبَ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم، مضاف الیہ، ۲/۱۰ ۴/۱۱،۶ ۱۲/۵ ۲۴/۷۔

**ذُنُوْبِهِمْ**: ان کے گناہ، ذُنُوْبِ مضاف هِمْ جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، ۳/۱۰ ۴/۵ ۶/۱۱ ۷/۷ ۹/۲ ۱۰/۳ ۹/۲ ۲۰/۱۱ ۲۴/۸۔

## فصل الواو

**ذُوْ**: والا، صاحب، اسم ہے، اس کے ذریعہ اسماء اجناس و انواع سے موسوم کیا جاتا ہے، یہ اسماء ستہ مکبرہ میں سے ہے یعنی ان چھ اسموں میں سے ہے کہ جب ان کی تصغیر نہ ہو اور وہ غیر یائے متکلم کی طرف مضاف ہوں تو ان کو پیش کی حالت میں واؤ، زبر کی حالت میں الف اور زیر کی حالت میں یا ء آتی ہے جیسے ذُوْ، ذَا، ذِیْ، یہ ہمیشہ مضاف ہو کر ہی استعمال ہوتا ہے اور اسم ظاہر ہی کی طرف مضاف ہوتا ہے، ضمیر کی طرف نہیں اور اس کا تثنیہ بھی آتا ہے اور جمع بھی، علامہ سہیلی کا بیان ہے :۔

ذُوْ کے وصف میں صاحب کے وصف کی

Marfat.com

پر نسبت زیادہ جلالت ہے اور اس کے ذریعہ اضافت
میں زیادہ شرف ہے کیونکہ ذُو تابع کی طرف
مضاف ہوتا ہے اور صاحب متبوع کی طرف
چنانچہ ابو ھریرۃ صاحب النبی بولتے ہو
النبی صاحب ابی ھریرۃ نہیں بولتے
لیکن ذُو کے ساتھ جیسے ذُو المال اور ذو العرش
کہو گے تو پہلا اسم نہیں متبوع ہی ملے گا تابع نہیں
اور یہی فرق ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ
الانبیاء میں فرمایا ہے وَذَا النُّوْنِ اور اسکی اضافت
نون کی طرف کی ہے جس کے معنی مچھلی کے ہیں اور
سورۃ نون میں ارشاد ہے وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ
الْحُوْتِ حالانکہ معنی ایک ہی ہیں لیکن دو مختلف
حالتوں کی طرف جس خوبی کے ساتھ دونوں لفظوں
میں اشارہ کیا ہے بڑا تفاوت ہے کیونکہ تعریف
کے موقع پر جب ان کا ذکر کیا تو ذا لایا گیا کہ اس
ذریعہ اضافت میں زیادہ بزرگی ہے نیز لفظ نون
استعمال کیا کہ وہ لفظ حوت سے اشرف ہے
کیونکہ اوائلِ سورہ میں موجود ہے اور لفظ حوت
میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں جس کے ذریعہ اسکو
یہ شرف حاصل ہو اس لئے اسی کو استعمال
کیا گیا اور جب ایسے مقام پر ان کا ذکر کیا جا
ان کی پیروی سے نہی ہے تو "صاحب" کا
استعمال کیا گیا"۔ [1]

۱/۱۴، ۲/۱۶،۱۷، ۳/۴،۹،۱۶، ۴/۷،۹، ۷/۳، ۸/۳،۵، ۹/۱۸، ۱۱/۱۱،
۱۳/۴،۷،۱۹، ۱۵/۲۰، ۲۰/۲،۱۱، ۲۳/۱۰، ۲۴/۷،۱۲،۱۹، ۲۵/۱، ۲۷/۲،۵،۱۱،
۲۷/۱۲،۱۹،۲۰، ۲۸/۱۱،۱۷، ۳۰/۱۰۔

ذَوَا: والے، صاحب، ذُوْ کا تثنیہ بحالت رفع
۲۷/۸،۱۴۔

ذَوَاتَا: والیاں، صاحب، ذَاتٌ کا تثنیہ بحالتِ
رفع (ملاحظہ ہو ذَاتٌ)، ۲۷/۱۳۔

ذَوَاتَىْ: والیاں، صاحب، ذَاتٌ کا تثنیہ بحالتِ
نصب و جر، ۲۲/۸۔

ذُوْقُوْا: تم چکھو، ذَوْقٌ سے امر کا صیغہ جمع مذکر
حاضر (ملاحظہ ہو ذَاقَ)، ۴/۲،۱۰، ۶/۹، ۸/۱۱، ۹/۱۸، ۱۱/۱۳،۲۰، ۱۱/۱۰،
۹/۱۵،۱۴، ۲۲/۱۶، ۲۳/۱۴، ۲۶/۱۸،۴، ۲۷/۹،۱۰، ۳۰/۱۔

ذُوْقُوْهُ: تم اس کو چکھو، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر
غائب ہے، ۹/۱۶۔

ذَوَىْ: والے، صاحب، ذُوْ کا تثنیہ بحالتِ نصب
و جر، ۲۵/۱۴۔

ذَوِىْ: والے، صاحب، ذُوْ کی جمع، بحالتِ نصب
جر، ۲/۶۔

[1] الاتقان مؤلفہ امام سیوطی، ج ۲، ص ۱۶۳ (طبع مصر)

Marfat.com

## فصل الہاء

**ذَہَاب**: جانا، چلنا، چھوڑنا ذَہَبَ یَذْہَبُ کا مصدر ہے (ملاحظہ ہو ذَہَبَ)، ۱۹/۱ ۔

**ذَہَبَ**: وہ گیا، وہ لے گیا ذَہَابٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ۱/۲، ۱۲/۲،۷، ۱۶/۶، ۱۴،۱۵/۵، ۲۱/۱۸، ۲۹/۱۸ ۔

**ذَہَبٌ**: سونا، زر، اَذْہَابٌ، ذُہُوْبٌ، ذُہْبَانٌ جمع، ۳/۱۰، ۱۱/۱۱، ۱۵/۱۶، ۱۶/۲، ۲۲/۶، ۲۵/۱۱،۱۳ ۔

**ذَہَبًا**: ۳/۱۴ ۔

**ذَہَبَتْ**: وہ گئی، وہ چلی گئی، ذَہَابٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، ۲۸/۸ ۔

**ذَہَبْنَا**: ہم گئے، ہم چلے گئے، ذَہَابٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر متکلم، ۱۲/۱۲ ۔

**ذَہَبُوْا**: وہ گئے، وہ لے گئے، ذَہَابٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، ۱۲/۱۲

## فصل الیاء المثناۃ

**ذِیْ**: والا، صاحب، اسماء ستہ مکبرہ میں سے ہے (ملاحظہ ہو ذُوْ) ۱/۱۰، ۵/۳، ۵/۵، ۱/۱، ۱۱/۱۷، ۱۳/۱۸،۲، ۱۴/۱۹، ۱۵/۵، ۱۶/۲، ۲۳/۱۷،۱، ۲۴/۱۱،۶،۱۳،۲، ۲۹/۲۱،۷، ۳۰/۱۵،۱۴،۶ ۔

**ذِئْبٌ**: گرگ، بھیڑیا، ذِئَابٌ اَذْؤُبٌ، ذُؤْبَانٌ جمع ۱۲/۱۲ ۔

# باب الراء المہملۃ

## فصل الالف

**رَاٰی**: اس نے دیکھا، رُؤْیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، یہ تمام قرآن میں بغیر یاء کے تنہا الف کے ساتھ لکھا ہوا ہے، البتہ سورۃ النجم میں ی کے ساتھ مرقوم ہے (ملاحظہ ہو اَرٰی اور رَاٰنی) ۱/۱۵، ۱۴/۱۲،۱۰، ۱۴/۱۸، ۱۵/۱۹، ۱۶/۱۰، ۲۱/۱۹ ۔

**رَابِطُوْا**: تم دل لگائے رہو، تم لگے ہو، تم آمادہ رہو، رِبَاطٌ اور مُرَابَطَۃٌ سے جس کے معنی حفاظت اور نگہبانی کرتے اور چوکی دینے کے ہیں، امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، علامہ خازن بغدادی لکھتے ہیں:-

• مُرَابَطَۃٌ کی اصل یہ ہے کہ ادھر کے لوگ اپنے گھوڑے اور ادھر کے لوگ اپنے گھوڑے اس طرح باندھ لیں کہ فریقین میں سے ہر ایک دوسرے سے جنگ کے لئے مستعد رہے، بعد میں ہر اس شخص کو جو سرحد پر اقامت گزین ہو کر [illegible] کا

Marfat.com

دفاع کرنے لگا، "مُرَابِطٌ" کہنے لگے گو اس کے پاس کوئی سواری بندھی ہوئی نہ ہو"۔ [1]

شرعاً مرابطت کی دو قسمیں ہیں ایک اسلامی سرحد پر کافروں کے مقابلہ میں دفاع کے لئے چوکی دیتے رہنا، دوسرے نفس کی بندش اور نگرانی کرنا، اسی لئے حدیث میں ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار میں مصروف رہنے کو رباط کہا گیا ہے، ۲۰۰/۳۔

**رَابِعُهُمْ** : ان کا چوتھا، رَابِعُ اسمِ عدد مضاف ہے، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، ۱۵/۱۵ ۲۵/۲۔

**رَابِيًا** : چڑھنے والا، پھولنے والا، بلند، رَبْوٌ سے جس کے معنی پھولنے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، ۱۳/۸۔

**رَابِيَةً** : سخت، زائد، رُبُوٌّ سے جس کے معنی بڑھنے اور زائد ہونے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث، ۲۹/۵۔

**رَأَتْهُ** : اس (عورت) نے اس کو دیکھا، رَأَتْ رُؤْيَةٌ سے، ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو اَرَىٰ اور رَأَىٰ) ۱۹/۱۸۔

**رَأَتْهُمْ** : اس نے ان کو دیکھا، اس میں هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے، ۱۸/۱۲۔

**رَاجِعُونَ** : پھر جانے والے، لوٹنے والے، رُجُوعٌ سے اسمِ فاعل کا صیغہ جمع مذکر، رَاجِعٌ کی جمع بحالتِ رفع (ملاحظہ ہو رُجِعُوا اور رَجَعَ) ۵/۱ ۲/۲ ۱۷/۶ ۱۵/۴۔

**رَاجِفَةُ** : کانپنے والی، رَجْفٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث (ملاحظہ ہو تَرْجُفُ) ۳۰/۲۔

**رَاحِمِينَ** : رحم والے، مہربانی کرنے والے، رُحْمٌ اور رَحْمَةٌ سے اسمِ فاعل کا صیغہ جمع مذکر، رَاحِمٌ کی جمع بحالتِ نصب و جر (ملاحظہ ہو رُحْمًا اور رَحْمَةٌ) ۹/۸ ۱۲/۲،۴ ۱۷/۶ ۱۸/۶۔

**رَادٌّ** : رد کرنے والا، پھیرنے والا، دفع کرنے والا، رَدٌّ سے اسمِ فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو تُرَدُّ) ۱۱/۱۶۔

**رَادِفَةُ** : پیچھے آنے والی، رِدْفٌ سے جس کے معنی پیچھے ہونے اور کسی کے پیچھے سواری پر بیٹھنے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث، ۳۰/۲۔

**رَادُّكَ** : تجھ کو پھیرنے والا، تجھ کو لوٹانے والا، رَادٌّ مضاف، کَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ، ۲۰/۱۲۔

**رَادُّوهُ** : اس کو پھیرنے والے، اس کو لوٹا دینے والے، رَادُّوْہٗ رَدٌّ سے اسمِ فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ رفع، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، رَادُّوْ اصل میں رَادُّوْنَ تھا، نون جمع اضافت کے سبب گر پڑا، ۲/۴۔

**رَادِّي** : پھیرنے والے، لوٹا دینے والے، رَدٌّ

---

[1] تفسیر لباب التاویل، ج۱، ص ۳۹۴، ۳۹۵ (طبع مصر)

Marfat.com

سے، اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ نصب و جر یہ بھی اصل میں رَادِّیْنَ تھا، نونِ جمع اضافت کے سبب سے ساقط ہوگیا ہے، ۲۴/۱۶ ۔

**رَازِقِیْنَ**: رزق دینے والے، روزی دینے والے رِزْقٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر (ملاحظہ ہو اُرْزُقْ اور یَرْزُقُ) پ۷/۵، ۲۴/۲، ۱۴/۱۵، ۳۵/۴، ۱۲/۱۱، ۲۵/۱۲ ۔

**رَأْسِ**: سر، رُءُوْسٌ جمع، پ۷/۴ ۔

**رَاسِخُوْنَ**: ثابت قدم، مضبوط، پکے رُسُوْخٌ سے جس کے معنی کسی شے کے استوار اور مضبوط ہونے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، ۳/۹، ۶/۲ ۔

**رَأْسِہٖ**: اس کا سر، رَأْسٌ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ۸/۸، ۱۲/۱۵، ۲۵/۱۶ ۔

**رَأْسِیْ**: میرا سر، رَأْسٌ مضاف، ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، ۱۲/۱۵، ۱۶/۱۴ ۔

**رٰسِیٰتٍ**: ایک جگہ دھری رہنے والی چولہوں پر قائم رہنے والی، رُسُوْءٌ سے جس کے معنی کسی چیز پر قائم رہنے اور استوار ہونے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ جمع مؤنث، رَاسِیَۃٌ واحد، ۲۲/۸ ۔

**رَاشِدُوْنَ**: بھلائی پانے والے، راہ یافتہ، رَشَدٌ اور رُشْدٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، رَاشِدٌ کی جمع (ملاحظہ ہو رَشَدًا اور رُشْدًا) ۲۶/۱۳ ۔

**رَاضِیَۃً**: پسندیدہ، خوش، من بھاتی، رَاضِیْ، رِضًی سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث (ملاحظہ ہو تَرْضٰی) پ۲۹/۵، ۳۰/۱۳، ۱۴، ۲۶ ۔

**رَاعِنَا**: ہماری رعایت کر، ہمارا خیال کر کہ ہماری طرف کان لگا، رَاعِ مُرَاعَاۃٌ سے جس کے معنی کسی کی بات پر کان رکھنا اور دوسرے کے حق کی رعایت کرنے کے ہیں، امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر، نا ضمیر جمع متکلم، شاہ عبدالقادر صاحب فرماتے ہیں:۔

"یہود پیغمبر کی مجلس میں بیٹھتے اور حضرتؐ کلام فرماتے بعضی بات جو نہ سنی ہوتی چاہتے کہ پھر تحقیق کریں تو کہتے رَاعِنَا یعنی ہماری طرف بھی متوجہ ہوں، ان سے مسلمان بھی سیکھ کر کسی وقت یہ لفظ کہتے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا کہ یہ لفظ نہ کہو اگر کہنا ہو تو اُنْظُرْنَا کہو، اس کے معنی بھی یہی ہیں اور آگے سے سنتے رہو کہ پوچھنا ہی نہ پڑے، یہود کو اس کہنے میں دغا تھی، اس کو زبان دبا کر کہتے تو رَاعِیْنَا ہو جاتا یعنی چرواہا اور ان کی زبان میں رَاعِنَا احمق کو بھی کہتے تھے۔" [۱]

پ۱/۱۳، ۵/۴ ۔

**رَاعُوْنَ**: نباہنے والے، رعایت کرنے والے،

[۱] موضح القرآن، سورۂ بقرہ۔

Marfat.com

خبردار، رِعَایَۃٌ سے جس کے معنی نگہداشت رکھنے اور نگرانی کرنے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر رَاعِی کی جمع بحالتِ رفع، ۲۹ / ۱ ، ۸ / ۱۔

رَاغَ: وہ جاگھسا، وہ پوشیدہ طور سے گیا (نَصَرَ) رَوْغٌ سے جس کے معنی چپکے سے کسی چیز کی طرف ہونے اور خفیہ داؤگھات لگانے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ۲۶ / ۱۹ ، ۲۳ / ۷ ۔

رَاغِبٌ: رغبت کرنے والا، بے رغبتی کرنے والا رَغْبَۃٌ سے، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، جب اس کے صلہ میں عن آتا ہے تو اس کے معنی بے رغبتی کرنے اور منہ پھیرنے کے ہوتے ہیں اور یہاں یہی صورت ہے (ملاحظہ ہو اِرْغَبْ اور رَغَبًا)، ۱۶ / ۶ ۔

رَاغِبُوْنَ: رغبت کرنے والے، رَغْبَۃٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ رفع رَاغِبٌ کی جمع، ۲۹ / ۳ ، ۱ / ۱۲ ۔

رَافِعُكَ: تجھ کو اٹھانے والا، رَافِعٌ رَفْعٌ سے جس کے معنی اٹھانے اور بلند کرنے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر مضاف ہے، ک ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ۔ واضح رہے کہ یہاں رفع سے رافع حقیقی جسمانی مراد ہے، رفع روحانی یا رفع درجات مراد نہیں ہے، جیسا کہ منکرین نزولِ مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خیال ہے کیونکہ یہود مدعیانِ قتلِ مسیح ہیں اور آیت ان کے اس زعمِ باطل کی تردید میں ہے اور ظاہر ہے کہ اگر رفعِ روحانی یا رفعِ درجات مراد لیا جائے تو تردید کے لئے کوئی معنی ہی نہیں رہتے کیونکہ رفعِ روحانی یا رفعِ درجات اور قتل میں باہم کوئی منافات نہیں ہے، پس قتل کی تردید اس بات کے کہنے سے کس طرح ہو سکتی ہے کہ ان کی روح آسمان پر اٹھالی گئی یا ان کے درجے بلند ہو گئے، ہاں اگر رفع حقیقی جسمانی مراد لیا جائے تو بلاشبہ ان کے دعاءِ قتل کی واشگاف تردید ہے کہ انہوں نے تو داؤ لگایا ہی ہے مگر ہم تم کو صحیح و سالم مع جسم کے اٹھالیں گے، آیت کو بغور پڑھئے کہ رفع حقیقی جسمانی یعنی صحیح و سالم، زندہ و سلامت آسمان پر اٹھالینے کے علاوہ دوسرے معنی مناسب ہو ہی نہیں سکتے، ارشاد ہے :-

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ اور خفیہ تدبیر کی انہوں نے اور
وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ خفیہ تدبیر کی اللہ نے اور اللہ تدبیر
إِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى کرنے والوں میں بہتر ہے جس وقت
إِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَ کہا اللہ نے اے عیسیٰ میں تجھ کو
رَافِعُكَ إِلَيَّ ۔ بھر لوں گا اور اٹھا لوں گا اپنی طرف۔

شاہ عبدالقادر صاحب فرماتے ہیں :-

"یہود کے عالموں نے اس وقت کے بادشاہ کو بہکایا کہ یہ شخص ملحد ہے، توریت کے حکم سے خلاف بتلاتا ہے، اس نے لوگ بھیجے کہ ان کو پکڑ لادیں، جب وہ پہنچے، حضرتِ عیسیٰ کے یار سرک گئے، اس شتابی میں حق تعالیٰ نے حضرتِ عیسیٰ کو آسمان پر اٹھا لیا اور ایک صورت ان کی رہ گئی اسی کو پکڑ لائے، پھر سولی پر چڑھایا۔" [1]

غور کیجیے یہود کی خفیہ تدبیر تو یہ تھی کہ انہوں نے مکر و فریب سے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھانا چاہا اور حق تعالیٰ کی خفیہ تدبیر یہ تھی کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو تو زندہ و سلامت آسمان پر اٹھا لیا اور جو شخص سب سے پہلے ان کو گرفتار کرنے آیا تھا اسی پر حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ ڈال دی اور یہود نے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے شبہ میں اسی شخص کو سولی پر چڑھا دیا، اب یہاں کس طرح سے رفع جسمانی حقیقی کے علاوہ کچھ اور مراد لیا جا سکتا ہے، پ ۳/۱۴۔

**رَافِعَۃٌ**: بلند کرنیوالی، اونچا کرنیوالی، رَفْعٌ سے اسمِ فاعل کا صیغہ واحد مؤنث، پ ۲۷/۱۴۔

**رَاْفَۃٌ**: ترس، مہربانی، شفقت، رحمت، نرمی رَأَفَ یَرْأَفُ کا مصدر ہے، پ ۲۷/۲۰۔

**رَاقٍ**: افسوں کنندہ، جھاڑ نے پھونکنے والا، رُقْیَۃٌ سے جس کے معنی افسوں اور جھاڑ پھونک کرنے کے ہیں، اسمِ فاعل کا صیغہ واحد مذکر، پ ۲۹/۱۷۔

**رَاٰکَ**: اس نے تجھ کو دیکھا، رَاٰی رُؤْیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، کَ ضمیر واحد مذکر حاضر (ملاحظہ ہو آرَیٰ اور رَاٰی)، پ ۱۷/۳۔

**رَاکِعًا**: جھکنے والا، عاجزی کرنیوالا، سجدہ کرنے والا، رکوع کرنیوالا، رُکُوْعٌ سے جس کے معنی انحنا یعنی جھکنے کے ہیں، اسمِ فاعل کا صیغہ واحد مذکر، رکوع کا استعمال کبھی تو نماز کی ہیئتِ مخصوصہ کے لیے ہوتا ہے اور کبھی تواضع و تذلل یعنی عاجزی اور گڑگڑانے کیلئے خواہ کسی عبادت میں ہو یا غیر عبادت میں، پ ۲۳/۱۱۔

**رَاکِعُوْنَ**: رکوع کرنیوالے، عاجزی کرنیوالے، جھکنے والے، رُکُوْعٌ سے اسمِ فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ رفع، رَاکِعٌ کی جمع، پ ۶/۱۲، پ ۱۱/۲۔

**رَاکِعِیْنَ**: جھکنے والے، رکوع کرنیوالے، رُکُوْعٌ سے اسمِ فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ نصب و جر، رَاکِعٌ کی جمع، پ ۱/۵، پ ۳/۱۲۔

**رَانَ**: اس نے زنگ پکڑ لیا (ضَرَبَ)، رَیْنٌ سے جس کے معنی زنگ آلود ہونے اور میل پکڑنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ ۳۰/۸۔

[1] موضح القرآن، سورۂ آل عمران۔

Marfat.com

رَاَوْا : انہوں نے دیکھا، رُؤْیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، رَاَوْا اصل میں رَاَیُوْا تھا، ی متحرک ماقبل اس کا مفتوح، اس یاء کو الف سے بدلا، اب الف اور واؤ دو ساکن جمع ہوئے، الف کو حذف کر دیا

پ ۹/۸، ۱۶/۸، ۲۳/۵، ۲۴/۱۴، ۲۵/۶، ۲۶/۱۲، ۲۹/۱۲ -

رَاَوْا : انہوں نے دیکھا، رُؤْیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب پ ۴/۲، ۱۱/۱۱، ۱۲/۱۴، ۲۰/۱۰، ۲۲/۱۰ -

رَاوَدْتُّنَّ : تم نے گفت و شنید کی، تم نے بہلایا، تم نے پھسلایا، مُرَاوَدَۃٌ سے جس کے معنی دوسرے کو کسی کام پر جس کے کرنے کا وہ ارادہ نہ رکھتا ہو، پھسلانے، آمادہ کرنے اور اس کے متعلق گفت و شنید کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ جمع مؤنث حاضر۔

راغب لکھتے ہیں :۔

| | |
|---|---|
| والمراودة ان تنازع | مراودہ یہ ہے کہ تمہاری اپنے غیر |
| غیرک فی الارادة | سے ارادہ میں تنازع ہو اور تم اس بات کی |
| فترید غیر ما یرید | خواہش کرو جو وہ نہیں چاہتا یا تم بسہولت |
| او ترود غیر ما | اس چیز کے طالب ہو جس کا وہ |
| یرود۔ | بسہولت طالب ہو۔" |

پ ۱۲/۱۲ -

رَاوَدَتْنِیْ : اس نے مجھے پھسلایا، اس نے مجھ سے گفت و شنید کی، اس نے مجھ سے خواہش کی، رَاوَدَتْ مُرَاوَدَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، ن وقایہ، ی ضمیر واحد متکلم، پ ۱۲/۱۲ -

رَاوَدْتُّہٗ : میں نے اس کو پھسلایا، میں نے اس سے گفت و شنید کی، رَاوَدْتُّ مُرَاوَدَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، پ ۱۲/۱۴، ۱۲/۱۷ -

رَاوَدَتْہُ : اس (عورت) نے اس کو پھسلایا، اس نے اس کو بہلایا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، پ ۱۲/۱۴ -

رَاوَدُوْہُ : انہوں نے اس سے گفت و شنید کی، انہوں نے اس کو پھسلایا، رَاوَدُوْا مُرَاوَدَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب پ ۲۷/۹ -

رَاَوْکَ : انہوں نے تجھ کو دیکھا، اس میں کَ ضمیر واحد مذکر حاضر ہے (ملاحظہ ہو رَاَوْا) پ ۱۹/۲ -

رَاَوْہُ : انہوں نے اس کو دیکھا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، پ ۲۱/۸، ۲۶/۳، ۲۹/۲ -

رَاَوْھَا : انہوں نے اسکو دیکھا، اس میں ھا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے، پ ۲۹/۲ -

رَاَوْھُمْ : انہوں نے ان کو دیکھا، اس میں ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے، پ ۳۰/۸ -

رَاٰہُ : اس نے اس کو دیکھا، رَاٰی رُؤْیَۃٌ سے

Marfat.com

ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ہ ضمیر واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو رَاٰی) $\frac{۱۹}{۱۸}$، $\frac{۲۳}{۱۲}$، $\frac{۲۳}{۹}$، $\frac{۲۶}{۵}$، $\frac{۳۰}{۲۱۰۶}$۔

**رَاٰهَا**: اس نے اس کو دیکھا، اس میں ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے، $\frac{۱۹}{۱۶}$، $\frac{۳۰}{۷}$۔

**رَاْیِ**: دیکھنا، رَاٰی یَرٰی کا مصدر ہے نیز غلبۂ ظن کی بنا پر نقیضین[۱] میں سے کسی ایک پر نفس کے اعتقاد کا نام "رائے" ہے، اس کی جمع آراء ہے، $\frac{۱۲}{۳}$۔

**رَاٰی**: اس نے دیکھا، رُؤْیَۃٌ اور رَأْیٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب رُؤْیَۃٌ کے معنی ادراک کی کے ہیں اور نفس کے مختلف قویٰ کے اعتبار سے اس کی مختلف قسمیں ہیں، اول آنکھ سے یا ایسی چیز سے جو آنکھ کے قائمقام ہو، دیکھنا جیسے لَتَرَوُنَّ الْجَحِیْمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَیْنَ الْیَقِیْنِ (البتہ تم دیکھو گے دوزخ کو پھر دیکھو گے دوزخ کو یقین کی آنکھ سے) یعنی بچشم سر دیکھو گے اور فَسَیَرَی اللّٰهُ عَمَلَكُمْ (پس اب اللہ دیکھے گا تمہارے کام) آنکھ کے دیکھنے سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ذرہ ذرہ کو دیکھتا ہے مگر اس کو آنکھوں کی احتیاج نہیں، دوسرے بذریعہ وہم و خیال جیسے وَلَوْ تَرٰی اِذْ یَتَوَفَّی الَّذِیْنَ كَفَرُوْا (اور کبھی تو دیکھے جس وقت جان لیتے ہیں کافروں کی) کہ یہاں دیکھنے سے اس وقت کا خیال کرنا مراد ہے، تیسرے بذریعہ تفکر جیسے اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ (میں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے) یعنی میں اس تفکر میں ہوں جس میں تم نہیں ہو، چوتھے بذریعہ عقل جیسے مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی (جھوٹ نہیں کہا دل نے جو دیکھا) کہ یہاں رؤیت بذریعہ عقل ہے نیز جب رَاٰی کا تعدیہ دو مفعولوں کی طرف ہوگا تو علم کے معنی کا مقتضی ہوگا جیسے وَیَرَی الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (اور جانتے ہیں وہ لوگ کہ جن کو علم دیا گیا ہے)[۲]، $\frac{۲۲}{۵}$۔

**رَاَیْتُ**: میں نے دیکھا، رُؤْیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم، یہاں خواب میں دیکھنے کا مذکور ہے، بیداری کی حالت میں دیکھنے اور بحالتِ خواب دیکھنے میں یہ فرق ہے کہ بیداری میں حقیقۃً بذریعہ بصر اس شئے کا ادراک ہوتا ہے اور خواب میں اس شئے کا تصور قلب میں ہوتا ہے، اس توہم پر کہ بذریعہ حاسۂ بصر اس کا ادراک ہو رہا ہے حالانکہ بذریعہ حاسہ ادراک نہیں ہوتا[۳]، $\frac{۱۲}{۱۱}$۔

**رَاَیْتَ**: تو نے دیکھا، رُؤْیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر اَرَاَیْتَ (کیا تو نے دیکھا، بھلا تو نے دیکھا) میں الف اولی لفظاً استفہام تقریر و تنبیہ کیلئے ہے محض استفہام کیلئے نہیں ہے۔[۴]

---

[۱] کلام میں دو ضد باہم کہ اکٹھے نہ ہو سکتے ہوں نہ دونوں جدا ہو سکتے، نقیضین کہلاتے ہیں مثلاً کسی ایک ہی چیز کے متعلق یہ کہنا کہ وہ سفید ہے اور وہ سفید نہیں، باہم نقیضین ہیں۔

[۲] مفردات امام راغب۔ [۳] التحقیقات النظامیہ فی الفروق الاصطلاحیہ شیخ علی اکبر النبیل طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ۱۳۲۰ھ۔ [۴] کتاب اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن الکریم لابن خالویہ ص ۲۰۱ طبع دار الکتب المصریۃ ۱۳۶۰ھ۔

Marfat.com

امام راغب لکھتے ہیں :-

"اَرَاَیْتَ اَخْبِرْنِیْ (تو مجھے بتا) کے قائمقام ہوتا ہے اور اس پر کاف داخل ہوتا ہے اور تا کو تثنیہ جمع اور تانیث میں اسی کی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے[1] اور تغیر و تبدل کاف پر ہوتا ہے تا پر نہیں ہوتا ارشاد ہے اَرَاَیْتَکَ هٰذَا الَّذِیْ، قُلْ اَرَاَیْتَکُمْ۔

۵/۹، ۶/۱۴، ۱۵/۲۱، ۱۶/۸، ۱۹/۱۲،۱۵، ۲۵/۱۹، ۲۶/۷، ۲۶/۷، ۳۰/۲۱،۲۲، ۳۴/۳،۵ -

رَاَیْتَکَ: تونے دیکھا، یہاں اَرَاَیْتَکَ (ا) یا تونے دیکھا، بھلا دیکھ تو) ہے۔ اس میں الف بلفظِ استفہام تنبیہ کے معنی میں ہے اور رَاَیْتَ رُؤْیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر ہے اور کَ ضمیر واحد مذکر حاضر خطاب کے لئے ہے۔ امام اللغۃ علامہ ابنِ خالویہ لکھتے ہیں کہ:

"اس کاف میں جو تا کے بعد ہے تین اقوال ہیں، کسائی کے قول میں موضعِ نصب میں ہے اس کی تقدیراً اَرَاَیْتَ نَفْسَکَ ہے اور فرا کے قول میں موضعِ رفع میں ہے اور تقدیراً اَرَاَیْتَ اَنْتَ نَفْسَکَ ہے اور اہلِ بصرہ کے قول میں کاف کا کوئی موضع نہیں بلکہ تاکید خطاب کے لئے آیا ہے جس طرح کہ ذَاکَ اور ذٰلِکَ کا حال ہے"[1] ۔ ۱۵/۶

رَاَیْتُکُمْ: تم نے دیکھا، یہاں اَرَاَیْتَکُمْ (دیکھو تو، کیا دیکھا ہے تم نے!) ہے، اس میں ہمزہ بلفظِ استفہام تنبیہ کے معنی میں ہے، رَاَیْتَ صیغہ واحد مذکر حاضر ہے اور کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر خطاب جمع کے لئے ہے۔ علامہ ابن الشجری نے امالی میں تصریح کی ہے کہ اَرَاَیْتَکُمْ وغیرہ میں جو تا کو فتحہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ تذکیر، تانیث کی اصل ہے اور توحید تثنیہ اور جمع کی، پس جب صیغہ واحد مذکر حاضر کو فتحہ تا سے مخصوص کر کے تا کو خطاب سے مجرد کر لیا گیا اور کاف اور جو کاف پر زیادہ کیا گیا ہے، مثلاً کُمَا، کُمْ اور کُنَّ خطاب کے لئے مستقل ہو گیا تو تا کیلئے حرکتِ اصلیہ کو لازم کر دیا گیا[2] ۔ ۷/۱۰،۱۱ -

رَاَیْتُمْ: تم نے دیکھا، رُؤْیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر اَرَءَیْتُمْ اور اَفَرَءَیْتُمْ میں ہمزہ بلفظِ استفہام تنبیہ کے معنی میں ہے، ۷/۱۱، ۱۱/۱۰،۱۱، ۱۲/۸،۱۰،۳

۱۹/۹، ۲۰/۱۰، ۲۲/۱۷، ۲۴/۱، ۲۵/۱، ۲۶/۱، ۲۷/۵،۱۵، ۲۹/۲ -

رَاَیْتُمُوْہُ: تم نے اس کو دیکھا، اس میں واؤ اشباع کا اور ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، ۴/۶ -

رَاَیْتَهٗ: تو نے اس کو دیکھا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، (ملاحظہ ہو رَاَیْتَ) ۲۹/۹ -

[1] اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن الکریم، ص ۲۰۲۔
[2] ملاحظہ ہو امالی ابن الشجری ج ۱ ص ۲۹۹، طبع دائرۃ المعارف۔

Marfat.com

رَاَيْتَهُمْ : تو نے ان کو دیکھا، اس میں هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے، ۱۹/۱۴، ۱۲/۴۵، ۱۴/۱۸، ۱۲/۱۷ -

رَاَيْتُهُمْ : میں نے ان کو دیکھا، اس میں هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے (ملاحظہ ہو رَاَيْتُ) ۱۲/۴ -

رَاَيْنَهُ : ان عورتوں نے اس کو دیکھا، رَاَيْنَ رُؤْيَةٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مؤنث غائب، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، ۱۲/۳۱ -

## فصل الباء الموحدة

رَبٌّ : پروردگار، مالک صاحب، یہ اصل میں رَبَّ يَرُبُّ کا مصدر ہے جس کے معنی تربیت کے ہیں اور پھر مبالغہ کے لئے عَدْلٌ کی طرح بطور وصف استعمال کیا جانے لگا اور بعض کا قول ہے کہ نَمٌّ کی طرح صفتِ مشبہ کا صیغہ ہے، امام راغب کا بیان ہے کہ رَبٌّ مصدر ہے جو فاعل کے لئے مستعار ہے۔ تربیت کی تعریف امام موصوف نے ان الفاظ میں کی ہے هو انشاء الشيئ حالا فحالا الى حد التمام[1] یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے ایک حالت سے دوسری حالت میں اس طرح نشو و نما دیتے رہنا کہ حدِ کمال تک پہنچ جائے، اس معنی کے اعتبار سے امام حلیمی نے جو رَبٌّ کی تعریف کی ہے وہ ان ہی کے الفاظ میں درج ذیل ہے

امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں رقمطراز ہیں :-

قال الحليمى رحمه الله حلیمی رحمۃ اللہ نے رب کے
فى معنى الرب هو معنی میں فرمایا ہے کہ ربّ وہ
المبلغ كل ما ابدع ہے جو ہر اس چیز کو جسے اس نے
حد كمالها الذى ایجاد کیا ہے کمال کی اس حد
قدره فهو يسيل تک پہنچا دیتا ہے کہ جو مدّ اس
النطفة من الصلب چیز کیلئے اس نے مقدر فرمائی
ثم يجعلها علقة ثم ہے پس وہ نطفہ کو پشت سے
العلقة مضغة ثم نکالتا، پھر اسکو پھٹکی بناتا
يخلق المضغة عظاما پھر پھٹکی کو بوٹی پھر بوٹی
ثم يكسو العظم لحما سے ہڈیاں پیدا کرتا پھر
ثم يخلق فى البدن ہڈیوں پر گوشت چڑھاتا
الروح ويخرجه پھر بدن میں جان ڈالتا
خلقا آخر وهو اور اسکو ایک نئی صورت
صغير ضعيف فلا میں جبکہ وہ ناتواں بچہ ہوتا
يزال ينميه وتنشيه ہے نکال کھڑا کرتا اور برابر
حتى يجعله رجلا اس کو نشو و نما کرتا رہتا ہے
ويكون فى بدء یہاں تک کہ اسکو پورا مرد کر دیتا ہے
امره شابا ثم اور ابتدائی حال میں وہ جوان ہوتا
يجعله كهلا ثم ہے پھر اسکو ادھیڑ پھر بوڑھا
شيخا وهكذا كل بنا دیتا ہے اور جو چیز بھی اسنے

[1] مفردات -

شیٔ خلقہ فھو — پیدا کی اس کا یہی طور ہے پس
القائم علیہ المبلغ — رب وہ ہے جو اسکا نگراں اور
ایاہ الحد الذی — اس حد پر اسکو پہنچانیوالا ہو جو
وضعہ وجعل — حد کہ اس کے لئے اس نے
نہایتہ و مقدارا — مقرر کی اور اس کی نہایت و
لہ [1] — مقدار قرار دی ہے۔

ابن خالویہ لغوی نے تصریح کی ہے کہ رب کے معنی لغت میں سید اور مالک کے ہیں[2]، امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں امام خطابی سے ناقل ہیں کہ :-

"بہت سے مفسرین سے آیۂ کریمہ اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمِینَ کی تفسیر میں مروی ہے کہ رب کے معنی سید (سردار) کے ہیں اور یہ معنی اس وقت بن سکتے ہیں جب کہ ہم عالمین کے معنی جماد کو چھوڑ کر ممیزین یعنی ذوی العقول کے قرار دیں کیونکہ جس طرح سید الناس کہا جاتا ہے اسی طرح سید الشجر والجبال وغیرہ کہنا درست نہیں ہے اور اسی معنی میں ارشادِ الٰہی ہے اِرجِع اِلٰی رَبِّکَ فَسئَلہُ مَا بَالُ النِّسوَۃِ الّٰتِی قَطَّعنَ اَیدِیَھُنَّ (پھر جا اپنے آقا کے پاس اور اس سے پوچھ کیا حقیقت ہے ان عورتوں کی جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے) کہ یہاں رب بمعنی سید (آقا، خاوند) ہے اور بعض کا قول ہے کہ رب بمعنی مالک ہے اور اس اعتبار سے اضافت بر بنائے عموم درست ہے اور بہت سے علماء اس طرف گئے ہیں کہ اسم عالم تمام کائنات کے لئے بولا جاتا ہے ان کا استدلال اس آیتِ کریمہ سے ہے قَالَ فِرعَونُ وَمَا رَبُّ العٰلَمِینَ ۔ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالاَرضِ وَمَا بَینَھُمَا اِن کُنتُم مُّوقِنِینَ ۔ (بولا فرعون کیا معنی جہان کا صاحب، موسٰی نے کہا صاحب آسمان اور زمین کا اور جو ان کے بیچ میں ہے اگر تم یقین کرو)"[3]

امام راغب نے لکھا ہے :-

"رَبّ' مطلقاً (یعنی جب بغیر کسی شرط کے استعمال ہو) سوائے اللہ تعالٰی کے جو مصالحِ موجودات کا کفیل ہے اور کسی کے لئے نہیں بولا جاتا چنانچہ ارشاد ہے بَلدَۃٌ طَیِّبَۃٌ وَّرَبٌّ غَفُورٌ (دیس ہے پاکیزہ اور رب ہے گناہ بخشتا) اور اسی طرح اللہ کا قول ہے وَلَا یَامُرَکُم اَن تَتَّخِذُوا المَلٰٓئِکَۃَ وَالنَّبِیّٖنَ اَربَابًا (اور نہیں لازم کہ تم کو حکم کرے کہ ٹھہراؤ فرشتوں کو اور نبیوں کو رب) یعنی انہیں معبود قرار دو اور خالق اور مسبب الاسباب اور بندوں کی مصلحتوں کا کفیل سمجھو۔

[1] کتاب الاسماء والصفات ص ۵۶، طبع انوار احمدی الہ آباد۔

[2] کتاب اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن الکریم، ص ۲۱۔

[3] کتاب الاسماء والصفات، ص ۵۶۔

Marfat.com

اور اضافت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور غیر اللہ کے لئے بھی آتا ہے جیسے ارشاد ہے رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (سارے جہان کا صاحب) اور رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِیْنَ (صاحب تمہارا اور صاحب تمہارے اگلے باپ دادوں کا) اور رَبُّ الدار (گھر والا) اور رب الفرس (گھوڑے والا) ان دونوں کے مالک کے لئے بولا جاتا ہے۔ اور اس معنی میں ارشادِ الٰہی ہے اُذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ فَاَنْسٰهُ الشَّیْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ (میرا ذکر کیجو اپنے بادشاہ کے پاس سو بھلا دیا شیطان نے ذکر کرنا اپنے بادشاہ سے) اور ارشاد ہے اِرْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ (پھر جا اپنے بادشاہ کے پاس)۔

آیۂ کریمہ (قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ (اس نے کہا خدا کی پناہ وہ مالک ہے میرا اچھی طرح رکھا ہے مجھ کو) میں بعض کا قول ہے کہ رب سے اللہ تعالیٰ مراد ہے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ بادشاہ مراد ہے جس نے ان کی تربیت کی تھی اور حضرت یوسف علیہ السلام کے قول کے زیادہ مناسب پہلے معنی ہیں۔" اَرْبَابٌ جمع۔

۱ / ۱۱، ۱۵، ۱۶ — ۳ / ۲، ۱۳، ۱۴ — ۶ / ۸، ۹ — ۷ / ۱۰، ۱۵ — ۸ / ۷، ۱۴، ۱۵، ۱۹ — ۹ / ۳، ۴، ۲۷
۹ / ۸، ۹ — ۱۱ / ۵، ۶، ۹ — ۱۲ / ۴، ۴، ۱۳ — ۱۳ / ۵، ۶، ۱۸ — ۱۴ / ۳ — ۱۵ / ۳، ۹، ۱۲، ۱۴ — ۱۶ / ۱۱، ۳۲، ۴۳

۱۶ / ۱۲، ۱۳، ۱۵، ۱۹ — ۱۷ / ۲، ۵، ۶، ۷ — ۱۸ / ۲، ۳، ۵، ۶ — ۱۹ / ۱، ۶، ۷، ۹، ۱۰، ۱۱
۱۹ / ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۹، ۱۶، ۱۸ — ۲۰ / ۳، ۵، ۶، ۷، ۱۵ — ۲۱ / ۱۴ — ۲۲ / ۸ — ۲۳ / ۲، ۵
۲۳ / ۷، ۸، ۹، ۱۲، ۱۴ — ۲۴ / ۵، ۱۲، ۱۹ — ۲۵ / ۱۱، ۱۳، ۱۹، ۲۰ — ۲۶ / ۲، ۱۸ — ۲۷ / ۷، ۱۱
۲۷ / ۱۶ — ۲۸ / ۵، ۱۴، ۲۰ — ۲۹ / ۶، ۸، ۹، ۱۰، ۱۳ — ۳۰ / ۲، ۶، ۸، ۱۰، ۳، ۳۸، ۳۹

رَبًّا ث (ملاحظہ ہو اَرْبَابًا)۔

رِبًا: بیاج، سود۔ امام راغب لکھتے ہیں:۔

"راس المال (اصل سرمایہ) پر جو زیادتی ہو وہ "ربا" ہے لیکن شرع میں وہ اس زیادتی کے ساتھ مخصوص ہے جو ایک خاص ہی طریقہ پر ہو اور دوسری طرح نہ ہو۔"

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:۔

"الربا مقصور ہے اور مد بھی بیان کیا گیا ہے جو شاذ ہے۔ یہ رَبَا یَرْبُوْ سے ہے اور الف کیساتھ لکھا جاتا ہے لیکن قرآن کے رسم الخط میں واؤ کے ساتھ واقع ہے اور رِبا کی اصل زیادت ہے خواہ نفسِ شے میں ہو جیسے ارشادِ الٰہی ہے اِهْتَزَّتْ وَرَبَتْ (وہ لہلائی اور بڑھی) یا مقابلہ میں جیسے دو درہم کے بدلہ ایک درہم، اب بعض کا قول تو یہ ہے کہ یہ دونوں معنی میں حقیقت ہے اور بعض کہتے ہیں کہ پہلے میں حقیقت ہے اور دوسرے میں مجاز۔ ابن سریج کہتے ہیں کہ یہ دوسرے معنی میں حقیقتِ شرعیہ ہے

نیز ربا کا اطلاق ہر بیع حرام پر بھی ہوتا ہے۔" [1]

حضرت الاستاذ فقیہ النفس علامہ محمود حسن خاں صاحب ٹونکی صاحب معجم المصنفین فرماتے ہیں:

"ربا اور بیع لغاتِ عرب سے ہے جب تک کوئی اصطلاحِ شرعی توقیفی خلافِ لغت کے مغیر نہ ہو کتاب و سنت کے معنی لغتِ عرب سے معلوم ہوتے ہیں 'ربا' لغۃً زیادۃ ہے اور لسان العرب وغیرہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ حقیقت 'بیع'، کی معاہدہ فی تعاوض الاموال ہے پس لغوی اعتبار سے ربا کی تعریف یہ ہے کہ تعاوض الاموال کے معاہدہ میں عوضین متماثلین سے ایک عوض کا دوسرے عوض پر زیادۃ مذکور ہونا یا عوضین میں سے عوض دین پر زیادۃ مذکور ہونا اور جب معاہدہ میں زیادۃ مذکور ہوئی تو اس زیادۃ کا نام عرب میں ربا ہے وھو المتعامل فیما بین الناس اور معاہدہ میں مذکور ہونے کی وجہ سے اس کو شرط کہا جائیگا کسائر شروط البیع والمعاوضات۔

باجماعِ امت 'ربا' دو قسم ہے ایک حسی جس کو کتاب اللہ نے لاتاکلوا الربٰوا اضعافا مضاعفۃ میں بیان فرمایا ہے اور حدیث صحیح الفضل ربا میں اسی حسی ربا کو بیان کیا گیا ہے اور حدیث فلا یاخذ الا مثلا بمثل (بروایۃ مسلم عن فضالۃ) اور حدیث لا تاخذوا الدینار بالدینارین ولا الدرھم بالدرھمین (طبرانی عن ابن عمر) بھی بحق ربا کتاب اللہ کی تفسیر ہے اور تضعیفا اضعافا کے تحت داخل ہے، حدیث بخاری بھی ربا حسی کی مفسر ہے الذھب بالذھب مثلا بمثل والورق بالورق مثلا بمثل (رواہ البخاری) یعنی فضل ربا ہے پس اس حسی ربا میں شارع نے لغوی معنی میں اور شرعی معنی میں مغایرت پیدا نہیں فرمائی ہے پس حسی ربا شرعی کی بھی وہی تعریف ہے جس کی عربی عبارت یہ ہے ھو الفضل الخالی عن العوض المشروط فی البیع۔

دوسرا ربا حکمی ہے کہ حسا تفاضل جنسین میں نہیں ہے لیکن شارع نے سدًّا الباب الربا صورتِ تماثل کو بھی ربا حسی کے حکم میں قرار دیا ہے جبکہ معاوضہ یداً بید نہ ہو کیونکہ مادہ ربا کا تاخیر و تاجیل ہے اور بغیر تاخیر کے فضل غیر متعامل ہے اسی معنی پر محمول ہے حدیث مسلم کی لاربا فیما کان یداً بید فضل حسی کا دروازہ اسی ربا حکمی سے مفتوح ہے کہ تجارت حاضرہ میں فضل حسی عادۃً ناممکن ہے اس ربا حکمی کو شارع نے حدیث نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع دینار اور حدیث الذھب بالورق ربا

[1] فتح الباری، ج ۴، ص (طبع میریہ مصر)

Marfat.com

لاھاۃ ولاھاۃ الحدیث فی الاشیاء الستۃ المنصوصۃ میں بیان فرمایا ہے اس ربا شرعی پر لغوی ربا صادق نہیں ہے۔" [1]

حضرت الاستاذ مد ظلہم نے ربٰو کے موضوع پر ایک مستقل رسالہ تصنیف فرمایا ہے جس میں ربا کی حقیقتِ شرعیہ پر نہایت مجتہدانہ اور سیر حاصل بحث ہے اس علمِ ضلالت میں جبکہ ربٰو کی حقیقتِ شرعیہ کے سمجھنے میں عوام تو عوام خواص کو غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں اس رسالہ کا بغور مطالعہ ان تمام غلط فہمیوں کے ازالہ کا ضامن ہے [2]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں رقمطراز ہیں :۔

" ربا وہ قرض ہے جو اس شرط پر ہو کہ قرضدار قرض خواہ کو جتنا لیا ہے اس سے زیادہ یا اس سے اچھا واپس ادا کرے۔" [3]

اور بعد چند سطور کے ارقام فرماتے ہیں :۔

" واضح رہے کہ ربا کی دو صورتیں ہیں حقیقی اور محمول بر حقیقی، لیکن حقیقی ربا تو وہ دیون میں ہوتا ہے اور ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اس میں معاملات جس غرض کے لئے وضع کیے گئے ہیں وہ غرض الٹ جاتی ہے، لوگ زمانۂ جاہلیت میں اس کے اندر بہت منہمک تھے اس کے باعث وسیع جنگیں پیش آئی ہیں اور یہ تھوڑا سا بھی بہت کی دعوت دیتا ہے پس اس کا دروازہ سرے سے مسدود کرنا واجب ہے چنانچہ قرآن میں اس کے بارے میں جو اترنا تھا اتر چکا۔

دوسرے ربا الفضل (یعنی تجارت میں بڑھتی لینا) اور اصل اس بارے میں حدیث مستفیض الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ و البر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل سواء بسواء یداً بید فاذا اختلف الاصناف فبیعوا کیف

---

[1] ملاحظہ ہو "صدارت کے استفتاء کا جواب مسئلہ ربٰو میں" ص ۱۱۳ و ۱۱۴

[2] اس رسالہ کی تصنیف دفتر صدارت عالیہ محکمہ امور مذہبی حیدرآباد دکن سے شائع کئے ہوئے ایک استفتاء کے جواب میں جزیا الفرض کے ضمن بے عمل میں آئی ہے اور چونکہ جواب مجتہدانہ مطلوب تھا اس لئے حسب فرمائش طریقہ اجتہاد پر ہی جواب تحریر کیا گیا۔ حضرت الاستاذ مد ظلہم العالی کی فقہ و اصول میں جو مجتہدانہ شان ہے اس کا اندازہ علماء کرام اس کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے یہ رسالہ ۱۳۴۴ھ پر مشتمل ہے اور ۱۳۴۴ھ میں دکن پریس کے ذریعہ طبع ہو کر حیدرآباد دکن سے شائع ہو چکا ہے۔

[3] حضرت الاستاذ فرماتے ہیں "یہ تعریف ربا کی بالکل صحیح اور جامع تعریف ہے اس لئے کہ قرض لغت عرب میں دین ہے لسان العرب صحاح و مصباح وغیرہ سے ثبت ہو چکا ہے اور جملہ دیون کو لفظ قرض شامل ہے۔" ص ۴۴۔

شئتم اذا کان یدا بید۔ (یعنی سونے کو سونے سے اور چاندی کو چاندی سے اور گیہوں کو گیہوں سے اور جَو کو جَو سے اور کھجور کو کھجور سے اور نمک کو نمک سے جتنا ایک اتنا دوسرا برابر سرابر ہاتھوں ہاتھ، اور جب جنسیں مختلف ہوں تو جس طرح چاہو بیچو بشرطیکہ ہاتھوں ہاتھ ہو) سے یہ ربا الفضل، ربا حقیقی سے مشابہت کی بنا پر تغلیظاً ربا سے موسوم ہے جس طرح کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے منجم کو کاہن فرمایا ہے اور اسی سے لاربا الا النسیئۃ (ربا نہیں مگر نسیئہ یعنی دین میں) کے معنی سمجھے جا سکتے ہیں پھر شریعت میں ربا کا استعمال اس معنی میں کثرت سے ہوا یہاں تک کہ وہ اس معنی میں بھی حقیقتِ شرعیہ بن گیا، واللہ اعلم [۱]

ایامِ جاہلیت میں ربا کا جس طور معمول تھا اس کے متعلق امام مالک، زید بن اسلم سے جو مشہور تابعی ہیں، ناقل ہیں کہ انہوں نے بیان کیا جاہلیت میں ربا یہ تھا کہ ایک شخص کا دوسرے شخص کے ذمہ ایک مدتِ معینہ کے لئے حق (واجب الاداء) ہوتا پس جب مدت پوری ہو چکتی تو کہتا کہ تو ادا کرتا ہے یا زیادہ کرتا ہے، اب اگر وہ ادا کر دیتا تو اس کو لے لیتا ورنہ اپنا حق زیادہ کر دیتا اور مہلت میں تاخیر کر دیتا [۲]

امام طبری نے عطا اور مجاہد سے اسی کے قریب قریب روایت کیا ہے نیز قتادہ سے نقل کیا ہے کہ جاہلیت میں ربا کا یہ دستور تھا کہ ایک شخص مدتِ معینہ پر سودا بیچتا، جب مدت پوری ہو جاتی اور خریدار کے پاس ادا کرنے کے لیے نہ ہوتا تو یہ رقم زیادہ کر دیتا اور مدت کو مؤخر کر دیتا [۳] ب ۲۱۔

**رِباط**: باندھنا، سرحد پر چوکی دینا، یہ باب مفاعلت کا مصدر ہے اور مجرد میں رَبْط کا بھی جس کے معنی مضبوط اور مستحکم باندھنے کے ہیں نیز اسم بھی آتا ہے اس شے کے معنی میں جس کے ساتھ دل یا گھوڑے باندھے جائیں اور اس جگہ کے معنی میں بھی جہاں دشمن کے دفاع کے لئے لشکر کا پڑاؤ ہوتا ہے جیسے مورچہ اور چھاؤنی یہاں اس کا استعمال مصدر ہی کے معنی میں یعنی گھوڑے باندھنے کے ہوا ہے (ملاحظہ ہو رابِطُوا) ن ا۔

**رُبٰعَ**: چار چار، یہ اَرْبَعَۃً اَرْبَعَۃً سے معدول ہے اور چونکہ اس میں دو علل ہیں ایک اس کے صیغہ سے دوسری اس کی تکرار سے اس لئے غیر منصرف ہے یہ علامہ زمخشری کی رائے ہے اور قاضی بیضاوی کے

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ، ج ۲، ص ۸۰ (طبع مصر ۱۳۲۲ھ)

[۲] موطا امام مع شرح تنویر الحوالک، ج ۲، ص ۱۶۳ (طبع دار احیاء الکتب العربیہ، ۱۳۴۳ھ)

[۳] فتح الباری، ج ۴، ص ۲۶۳۔

Marfat.com

خیال میں بنا بر عدل و وصف غیر منصرف ہے، وہ کہتے ہیں، دِیاع مبنی بر صفت ہے اگرچہ اس کی اصل وصف پر مبنی نہیں ہے[۱]، پ ۳/۱۲ ، ۱۳/۱۲ -

**رَبَّانِيُّوْنَ** : زاہد، خدا پرست، درویش، اللہ والے مُربّی، مرشدِ خلق، رَبَّانِيٌّ کی جمع بحالتِ رفع -

امامِ راغب لکھتے ہیں :-

" رَبَّانِيٌّ کے متعلق بعض کا قول ہے کہ وہ رَبَّان کی طرف منسوب ہے اور لفظِ فعلان فَعِلَ (بکسر العین) سے بنایا جاتا ہے جیسے عطشان اور سکران اور قلت کے ساتھ فَعَلَ (بفتح العین) سے بنتا ہے چنانچہ نعسان آیا ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ ربّ کی طرف منسوب ہے جو مصدر ہے اور ربانی وہ ہے کہ جو علم کی پرورش کرے جیسے کہ حکیم ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ منسوب تو اسی کی طرف ہے جو مصدر ہے اور اس کے معنی ہیں اس شخص کے جو اپنے نفس کی علم کے ذریعہ تربیت کرے اور حقیقت میں یہ دونوں معنی باہم متلازم ہیں کیونکہ جس نے بذریعہ علم اپنے نفس کی پرورش کی اور جس نے علم کی پرورش کی اس نے اس کے ذریعہ اپنے نفس کی پرورش کی، اور بعض کا قول ہے کہ یہ ربّ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے پس جیسے الٰہیٌّ ہے اسی طرح رَبَّانِيٌّ ہے اور نون کی زیادتی اس میں ایسی ہے جیسی کہ اہلِ عرب لحیانی اور جسمانی کے بولتے وقت کرتے ہیں، حضرت علیؓ کا قول ہے، انا ربانی ھٰذہ الامۃ (میں اس امت کا ربانی ہوں)، جمع رَبَّانِيُّوْنَ ہے اور بعض کا قول ہے کہ لفظِ رَبَّانِيٌّ اصل میں سریانی ہے اور یہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ اہلِ عرب کے کلام میں قلیل الوجود ہے "۔ ۶/۱۲،۱۳ -

**رَبَّانِيِّيْنَ** : زاہد، خدا پرست، درویش، اللہ والے مربی، مرشدِ خلق، رَبَّانِيٌّ کی جمع بحالتِ نصب و جر، پ ۳/۱۶ -

**رَبَآئِبُكُمُ** : تمہاری جورُوؤں کی لڑکیاں، رَبَائِبُ رَبِيْبَةٌ کی جمع جس کے معنی اس زیرِ پرورش لڑکی کے ہیں جو اگلے شوہر سے ہو، مضاف ہے کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، ربیبہ کو ربیبہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ماں کے دوسرے شوہر کے آغوش [illegible] میں ہوتی ہے، پ ۴/۱۵ -

**رَبَتْ** : وہ بڑھی، وہ پھولی، وہ ابھری، (نصر) رَبْوٌ سے جس کے معنی بڑھنے، پھولنے اور بلند ہونے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، پ ۱۷/۸ ، ۲۵/۱۹ -

**رَبِحَتْ** : وہ سود مند ہوئی، اس نے فائدہ دیا، اس نے نفع دیا (سمع) رِبْحٌ سے جس کے معنی نفع دینے اور

[۱] الکامل علی الجلالین، شیخ سلام اللہ ص ۱۳، ضمیر ص ۶ (طبع نولکشور)

سود مند ہونے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، پ۲۔

**رَبَطْنَا**: ہم نے گرہ دی، ہم نے باندھ دیا، (ضَرَبَ) رَبْطٌ سے جس کے معنی باندھنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ جمع متکلم، پ۱۵/۱۴، پ۲۰/۴۔

**رُبُعُ**: چوتھائی حصہ، چہارم، اسم ہے، اَرْبَاعٌ جمع، پ۴/۲۔

**رَبِّكَ**: تیرا رب، تیرا پروردگار، تیرا مالک، تیرا صاحب، رَبٌّ مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ، آیت شریفہ اِرْجِعْ اِلٰی رَبِّكَ (پھر جا اپنے بادشاہ کے پاس) اور اُذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ (میرا ذکر کیجو اپنے بادشاہ کے پاس) میں رَبّ بمعنی بادشاہ، سردار اور آقا کے ہے،

پ۱/۳،۴،۷،۸، پ۲/۱،۲، پ۳/۱۲،۱۳،۱۴، پ۵/۶، پ۶/۸،۱۳،۱۴، پ۷/۵،۶،۱۶،۱۹، پ۸/۱،۲،۷، پ۸/۳،۵،۷، پ۹/۶،۹،۱۱،۱۲،۱۴،۱۵،۱۶، پ۱۱/۷،۹،۱۲،۱۵، پ۱۲/۲،۶،۷،۹،۱۰، پ۱۲/۱۰،۱۱،۵،۸،۱۷، پ۱۳/۷،۹، پ۱۴/۲،۳،۶،۱۰،۱۵،۲۰،۲۱،۲۲، پ۱۵/۲،۳،۴، پ۱۵/۵،۶،۷،۹،۱۰،۱۶،۱۸،۲۰، پ۱۶/۱،۴،۷،۸،۱۰،۱۱،۱۷، پ۱۷/۳،۴،۱۳، پ۱۷/۱۲،۱۶، پ۱۸/۴،۱۷، پ۱۹/۱،۳،۵،۶،۸،۹،۱۰،۱۱،۱۲،۱۳،۱۴، پ۲۰/۲،۳، پ۲۰/۸،۹،۱۰،۱۲،۱۳، پ۲۱/۴،۱۶،۱۷، پ۲۲/۷،۸، پ۲۳/۹،۱۰،۱۴، پ۲۴/۶،۱۱،۱۴، پ۲۴/۲۰، پ۲۵/۱،۳،۹،۱۱،۱۳،۱۴،۱۶،۱۸، پ۲۶/۱۷،۱۹، پ۲۷/۱،۳،۴،۶،۷، پ۲۷/۱۲،۱۳،۱۵،۱۶، پ۲۹/۳،۴،۵،۶،۱۳،۱۴،۱۵،۱۷،۲۰، پ۳۰/۲،۳، پ۳۰/۴،۷،۹،۱۰،۱۲،۱۴،۱۸،۱۹،۲۱،۲۲،۲۳،۲۴،۳۳،۳۵۔

**رَبِّكِ**: تیرا رب، تیرا پروردگار، تیرا مالک، رَبٌّ مضاف، کِ ضمیر واحد مؤنث حاضر مضاف الیہ، پ۱۶/۵، پ۱۹، پ۱۴۔

**رَبِّكُمْ**: تمہارا رب، تمہارا پروردگار، تمہارا مالک، تمہارا صاحب، رَبٌّ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ،

پ۱/۳،۴،۹،۱۳،۱۶، پ۲/۶،۹،۱۶، پ۳/۳،۱۶، پ۴/۴،۱۰،۱۱،۱۲، پ۶/۳،۴،۱۴، پ۷/۱۲،۱۹، پ۸/۵،۶،۷،۸،۱۲،۱۳،۱۵،۱۶،۱۷،۱۸، پ۹/۳،۶،۷، پ۹/۶،۱۱،۱۲،۱۴،۱۵، پ۱۱/۶،۹،۱۱،۱۶،۱۷، پ۱۲/۳،۵،۸، پ۱۳/۷،۱۳،۱۴، پ۱۴/۷،۹،۱۰،۱۲، پ۱۵/۱،۲،۳،۴،۶،۷،۹،۱۴،۱۵،۱۶، پ۱۶/۵،۱۳،۱۴، پ۱۷/۵،۶،۸،۱۷، پ۱۸/۴، پ۱۹/۶،۱۳، پ۲۱/۱۳،۱۴، پ۲۲/۸،۹،۱۰،۱۴، پ۲۳/۱،۱۰،۱۱،۱۲،۱۶، پ۲۴/۱۲، پ۲۴/۳،۵،۸،۹،۱۰،۱۱،۱۲،۱۷، پ۲۵/۳،۶،۷،۱۲،۱۴،۱۸، پ۲۷/۱۴،۱۹، پ۲۸/۷،۱۷،۲۰، پ۲۹/۹، پ۳۰/۳۔

**رَبِّكُمَا**: تم دونوں کا رب، تم دونوں کا پروردگار، تم دونوں کا مالک، تم دونوں کا صاحب، رَبٌّ مضاف کُمَا ضمیر تثنیہ مذکر حاضر، مضاف الیہ، پ۹/۱۱، پ۱۶/۱۱، پ۲۷/۱۱،۱۲،۱۳۔

**رُبَمَا**: کسی وقت، بہت وقت، رُبَّ حرف جر ہے اور مَا کافہ ہے اور بعض کے خیال میں نکرہ موصوفہ ہے، امام سیوطی لکھتے ہیں:-

• رُبَّ حرف جر ہے اس کے معنی میں آٹھ اقوال ہیں (۱) وہ دائمی طور پر تقلیل کے لئے آتا ہے اکثر علماء اسی پر ہیں (۲) وہ دائمی طور پر تکثیر کے لئے آتا ہے چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ (بہت وقت آرزو کریں گے یہ لوگ جو منکر ہیں کسی طرح ہوتے مسلمان) کیونکہ وہ

Marfat.com

کثرت سے اس کی تمنا کریں گے اور اول قول کے قائل یہ کہتے ہیں کہ وہ احوالِ قیامت کی مدہوشیوں میں اس طرح مشغول ہوں گے کہ بہت کم ہوش میں آئیں گے جب اس کی تمنا کریں گے (۳) وہ تقلیل و تکثیر دونوں کے لئے مساوی طور پر آتا ہے (۴) وہ اکثر تقلیل کے لئے آتا ہے اور نادراً تکثیر کے لئے اور یہ بھی اختیاری ہے (۵) اس کے بالکل برعکس (یعنی تکثیر کے معنی میں کثرت سے اور تقلیل کے معنی میں ندرت سے (۶) ان دونوں معنی میں سے کسی کے لئے اس کی وضع عمل میں نہیں آئی بلکہ حرفِ اثبات ہے جو نہ تکثیر پر دلالت کرتا ہے نہ تقلیل پر اور جو کچھ سمجھا جاتا ہے خارجی طور پر سمجھا جاتا ہے (۷) فخر و مباہات کے موقع پر تکثیر کے لئے اور دیگر مواقع پر تقلیل کے لئے (۸) مبہم عدد کے لئے خواہ تقلیل ہو یا تکثیر اور رُبَّ پر ما کافہ بھی داخل ہوتا ہے جو اس کو عمل جیسے روک کر جملوں پر داخل کرتا ہے اس صورت میں بیشتر اس کا دخول ایسے جملہ فعلیہ پر ہوتا ہے جس کا فعل ماضی ہو خواہ وہ لفظاً موجود ہو یا معناً اور آیتِ سابقہ میں وہ مستقبل پر داخل ہوا ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ اس بنیاد پر ہے گویا صور پھونک دیا گیا اور قیامت آگئی (یعنی مستقبل یہاں معنیٰ ماضی ہی ہے) پ۱۴/۱ -

رَبُّنَا: ہمارا رب، ہمارا پروردگار، ہمارا صاحب، ہمارا مالک، رَبّ مضاف نا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ،

پ۱ ۱۵،۱۶ پ۲ ۹،۱۷ پ۳ ۱۰،۹،۱۰،۱۳ پ۴ ۶،۱۶ پ۵ ۷،۸ پ۶ ۱،۵،۹ پ۸ ۲،۹،۱۱،

پ۸ ۱۲،۱۳ پ۹ ۱،۶،۸ پ۱۱ ۴ پ۱۳ ۱۸،۱۹ پ۱۴ ۱۸ پ۱۵ ۱۲،۱۳،۱۴ پ۱۶ ۸،۱۲،۱۷

پ۱۷ ۴،۱۳ پ۱۸ ۱،۶ پ۱۹ ۱،۱۲،۷ پ۲۰ ۸،۹،۱۰ پ۲۱ ۱۵ پ۲۲ ۵،۸،۹،۱۶،۱۹ پ۲۳ ۱۶،۱۴،۱۷

پ۲۴ ۲،۷،۱۶،۱۸ پ۲۵ ۳،۷،۱۲ پ۲۶ ۲،۴،۱۶ پ۲۷ ۴،۷،۲۰ پ۲۹ ۳،۱۱،۱۹ -

رِبٰوا: سود، بیاج - یہ لفظ تمام قرآن میں با کے بعد واو اور واو کے بعد الف سے مرقوم ہے مگر ایک جگہ سورۃ الروم میں با کے بعد الف سے لکھا ہوا ہے، قاضی بیضاوی اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں :-

"چونکہ ایک لغت پر اس میں تفخیم ہے اس لئے صلوٰۃ کی طرح واو سے اس کو لکھا گیا اور واو کے بعد الف اس لئے زیادہ کر دیا گیا کہ واؤ جمع سے مشابہ ہے" [2]

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو رِبًا) پ۳ ۶ پ۴ ۵ پ۶ ۲ پ۲۱ ۷ -

رَبْوَۃٍ: بلندی، بلند جگہ، ٹیلا، اسم ہے، رِبًا اور رُبُوٌّ سے مشتق ہے، رُبًی اور رُبِیّ جمع (ملاحظہ ہو رَابِیًا) پ۳ ۴ پ۱۸ ۳ -

رَبُّهٗ: اس کا رب، اس کا پروردگار، اس کا صاحب،

[1] الاتقان، ج۱ ، ص ۱۶۳ (طبع مصر)

[2] تفسیر انوار التنزیل، ج۱، ص ۱۰۲ (طبع مصر)

اس کا مالک، رَبّ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، آیت شریفہ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِىْ رَبَّهٗ خَمْرًا (ایک جو ہے تم دونوں میں سو پلا دیگا اپنے بادشاہ کو شراب) اور فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ (سو بھلا دیا اس کو شیطان نے ذکر کرنا اپنے بادشاہ سے) میں رب سے مراد آقا اور بادشاہ ہے ذاتِ باری نہیں،

۱/۴، ۱۳، ۱۵، ۱۹ ۳/۳، ۶، ۷، ۸، ۱۲ ۷/۱۰ ۸/۱۴، ۱۷ ۹/۷ ۱۱/۷ ۱۲/۲، ۴، ۱
۱۲/۱۳، ۱۴، ۱۵ ۱۳/۷، ۱۰ ۱۴/۴ ۱۵/۳، ۹، ۲۰ ۱۶/۲، ۳، ۴، ۷، ۱۲، ۱۶، ۱۷
۱۷/۶، ۱۷ ۱۸/۶ ۱۹/۳ ۲۱/۱، ۱۵ ۲۲/۸ ۲۳/۷، ۱۱، ۱۳، ۱۵، ۱۷ ۲۴/۸ ۲۵/۱۴
۲۶/۶ ۲۷/۵، ۸، ۱۳ ۲۸/۱۹ ۲۹/۴، ۱۱، ۱۳، ۲۰ ۳۰/۲، ۳، ۴، ۹، ۱۲، ۱۴، ۱۷، ۲۳، ۲۵ ۔

**رَبُّهَا**: اس کا رب، اس کا پروردگار، اس کا مالک، اس کا صاحب، رَبّ مضاف ھا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ ۳/۱۲ ۱۳/۱۶ ۲۴/۶ ۲۶/۳ ۲۸/۳، ۱۳ ۲۹/۱۷ ۳۰/۹ ۔

**رَبُّهُمْ**: ان کا رب، ان کا مالک، ان کا پروردگار، ان کا صاحب، رَبّ مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ۔ ۱/۱، ۳، ۵، ۸، ۱۶ ۲/۱، ۳ ۳/۴، ۶، ۱۰، ۱۷ ۴/۵، ۹، ۱۱
۶/۵، ۱۳ ۷/۷، ۹، ۱۰، ۱۲، ۱۹ ۸/۲، ۵، ۶، ۱۷ ۹/۹، ۱۵ ۱۰/۱، ۳، ۹ ۱۱/۶
۱۲/۲، ۳، ۵، ۶ ۱۳/۷، ۸، ۹، ۱۲، ۱۵، ۱۶ ۱۴/۱۲، ۱۳، ۱۹ ۱۵/۶، ۱۴، ۱۵، ۲۰
۱۶/۲ ۱۷/۱، ۴، ۹ ۱۸/۴ ۱۹/۴ ۲۱/۲، ۳، ۴، ۷، ۱۰، ۱۴، ۱۵ ۲۲/۱۰، ۱۵، ۱۷ ۲۳/۲، ۴
۲۳/۱، ۱۷ ۲۴/۱، ۵، ۶ ۲۵/۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۷، ۱۷، ۲۰ ۲۶/۵، ۶، ۱۸ ۲۷/۱، ۲، ۵، ۱۳
۲۹/۱، ۴، ۵، ۷، ۱۱، ۱۲، ۱۳ ۳۰/۸، ۱۶، ۲۲، ۲۳، ۲۵ ۔

**رَبُّهُمَا**: ان دونوں کا رب، ان دونوں کا پروردگار، ان دونوں کا صاحب، ان دونوں کا مالک، رَبّ مضاف هُمَا ضمیر تثنیہ مذکر غائب مضاف الیہ، ۸/۹ ۹/۱۴ ۱۶/۱ ۔

**رَبِّیْ**: میرا رب، میرا پروردگار، میرا مالک، میرا صاحب، رَبّ مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، ۳/۴، ۱۳ ۶/۱۴
۷/۶، ۸، ۱۳، ۱۵ ۸/۷، ۱۰، ۱۱، ۱۵، ۱۶، ۱۷ ۹/۱، ۱۳، ۱۴ ۱۱/۷، ۱۰
۱۲/۳، ۴، ۵، ۸، ۱۴، ۱۵، ۱۷ ۱۳/۵، ۱۰، ۱۸ ۱۵/۱۰، ۱۱، ۱۵، ۱۶، ۱۷
۱۶/۲، ۳، ۵، ۶، ۱۱، ۱۵ ۱۷/۱ ۱۹/۴، ۶، ۸، ۱۰، ۱۳، ۱۶ ۲۰/۴، ۷، ۱۲، ۱۵
۲۲/۷، ۱۰، ۱۱، ۱۲ ۲۳/۱، ۶، ۷، ۱۲، ۱۶ ۲۴/۸، ۹، ۱۲ ۲۵/۱، ۳، ۱۲، ۱۴ ۲۸/۱۵ ۲۹/۱۲
۳۰/۱۴ ۔

**رَبَّیٰنِیْ**: ان دونوں نے مجھ کو پالا، ان دونوں نے میری پرورش کی، رَبَّیَا، تَرْبِیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ تثنیہ مذکر غائب ہے، الف تثنیہ نون سے قبل محذوف ہے، ن وقایہ، ی ضمیر واحد متکلم، ۱۵/۴ ۔

**رِبِّیُّوْنَ**: خدا کے طالب، خدا پرست، اللہ والے، ہزاروں جماعتیں، رِبِّیٌّ کی جمع جو رَبَّانِیٌّ کی طرح ہے، یہ امام راغب کا بیان ہے، امام بخاری نے اس کے معنی جماعتوں کے کئے ہیں اور اس کا واحد رِبِّیٌّ بتایا ہے، یہ معنی اصل میں امام لغت ابو عبیدہ سے منقول ہیں[1] اس صورت میں رِبِّیٌّ حسب تصریح قاضی بیضاوی

[1] دیکھو فتح الباری شرح صحیح بخاری ج ۸، ص ۱۵۱ (المطبعۃ الخیریہ مصر)

رِبِّیٌّ کی طرف بطور مبالغہ منسوب ہے جس کے معنی جماعت کے ہیں۱؎۔

امام بغوی لکھتے ہیں :-

" رِبِّیُّوْنَ کَثِیْرٌ کے معنی حضرتِ ابنِ عباسؓ مجاہد اور قتادہ نے جماعاتِ کثیرہ کے بیان کئے ہیں اور حضرتِ ابنِ مسعودؓ نے ہزاروں بتلائے ہیں، کلبی کا قول ہے کہ ایک 'رِبِّیَہ' دس ہزار کا ہوتا ہے ضحاک ایک ہزار کہتے ہیں اور حسن بصریؒ فقہا و علماء ترجمہ کرتے ہیں اور بعض کا قول ہے کہ ربیون اتباع ہیں، ربانیوں حکام اور ربیون رعیت اور بعض کہتے ہیں کہ 'رب' کی طرف منسوب ہے یعنی وہ لوگ جو رب کی عبادت کرتے ہیں"۲؎

اور ابو حاتم احمد بن حمدان لغوی نے کتاب الزینۃ میں تصریح کی ہے کہ یہ سریانی لفظ ہے۳؎ ۴/۶ -

## فصل التاء المثناۃ

رَتْقًا، منہ بند، ملا ہوا، جڑا ہوا، رَتَقَ یَرْتُقُ کا مصدر ہے "رتق" کے معنی اصل میں بند ہونے اور جڑ جانے کے ہیں خواہ خلقی طور پر ہو یا صناعی طور پر مصدر یہاں پر اسم فاعل یا اسم مفعول کے معنی میں ہے، ۱۷/۴ -

رَتِّلْ : کھول کھول کر پڑھ، آہستہ آہستہ یعنی واضح پڑھ، ترتیلٌ سے امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر (ملاحظہ ہو تَرْتِیْلًا)، ۲۹/۱۲ -

رَتَّلْنٰهُ : ہم نے اس کو تھم تھم کر پڑھا، ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ سنایا، رَتَّلْنَا تَرْتِیْلٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم ہ ضمیر واحد مذکر غائب، ۱۹/۱ -

## فصل الجیم المعجمۃ

رَجًّا : کپکپانا، لرزانا، ہلانا، رَجَّ یَرُجُّ کا مصدر ہے، اس کے معنی کسی چیز کو ہلانے اور جنبش دینے کے ہیں، ۲۷/۱۴ -

رِجَالٌ : مرد، پیادے، پاؤں چلتے، اول معنی کے اعتبار سے رَجُلٌ کی جمع ہے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے رَاجِلٌ کی جیسے رِکَابٌ رَاکِبٌ کی جمع ہے رَاجِلٌ رِجْلٌ سے مشتق ہے جس کے معنی پیر کے ہیں اور اسی مناسبت سے پاؤں پیدل اور پیادہ کو رَاجِلٌ کہتے ہیں۔

واضح رہے کہ مردانِ جن کے لئے بھی رِجَالٌ کا استعمال ہوتا ہے، ارشاد ہے وَّاَنَّہٗ کَانَ رِجَالٌ

۱؎ مدارک التنزیل، ج ۱ ص ۱۳۲
۲؎ معالم التنزیل، ج ۱ ص ۲۶۳ (طبع مصر ۱۳۳۲ھ)
۳؎ الاتقان، ج ۱ ص ۱۳۹

مِّنَ الْجِنِّ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ (اور
بہت سے مرد آدمیوں میں سے پناہ لیتے ہیں
جنوں کے مردوں سے)۔ شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ
نے تصریح کی ہے کہ رجال الغیب جن ہی ہوتے ہیں
اور اسی آیت کو استدلال میں پیش کیا ہے[1] قرآن
مجید میں دو جگہ 'رجال' پیادوں کے معنی میں استعمال
ہوا ہے ایک فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُکْبَانًا (پھر اگر
تم کو ڈر ہو تو پیادہ پڑھ لو یا سوار) اور دوسرے
یَاْتُوْكَ رِجَالًا (آئیں گے تیرے پاس پاؤں چلتے)

۲/۱۲ ، ۴/۱۲ ، ۵/۲،۳،۷،۱۱ ، ۸/۱۲،۱۷ ، ۱۱/۲ ، ۸/۱۰،۱۱ ، ۱۹/۱۹
۲/۱۵ ، ۲۱/۱۹ ، ۲۶/۱۱ ، ۲۹/۱۱ رِجَالًا ۲/۱۵ ، ۴/۱۲ ، ۶/۴
۸/۱۲ ، ۳/۶ ، ۴/۱۲ ، ۱۷/۱،۱۱ ، ۲۳/۱۲ -

**رِجَالِكُمْ**: تمہارے مرد، رِجَالِ مضاف
کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، ۳/۲۳ ۔

**رُجَّتْ**: وہ ہلائی گئی، اس کو جنبش دی گئی
(نَصَرَ) رُجٌّ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث
غائب، ۲۷/۱۴ ۔

**رُجْزٌ**: پلیدی، گناہ، عذاب، بت، امام بغوی
وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"مجاہد، عکرمہ، قتادہ، زہری، ابنِ زید اور
ابوسلمہ کا بیان ہے کہ رُجز سے مراد اوثان یعنی
بُت ہیں، پس اللہ نے فرمایا کہ اس سے
دُور رہ اور قریب نہ جا، اور بعض کا قول ہے
کہ 'ز' اس میں سین سے بدل لی گئی ہے، اہلِ
عرب قربِ مخرج کے سبب سین اور زے
کو ایک دوسرے کی جگہ لے آتے ہیں، اس
تاویل کی دلیل فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ
الْاَوْثَانِ ہے اور ابنِ عباس رضی اللہ عنہما
سے مروی ہے کہ اس کے معنی ہیں گناہوں سے
دور رہ، اور ابوالعالیہ اور ربیع کہتے ہیں کہ
رُجز، را کے پیش سے بمعنی بت اور را کے زیر
سے بمعنی نجاست و معصیت ہے، ضحاک نے اس
کا ترجمہ شرک سے کیا ہے اور کلبی نے عذاب
کے معنی بتائے ہیں۔"[2] ۲۹/۱۵ ۔

**رِجْزٌ**: عقوبت، بلا، عذاب، قاضی بیضاوی
لکھتے ہیں کہ:۔

"رُجز، اصل میں وہ چیز ہے جس سے گھن آئے
اور رجس بھی اسی کی طرح ہے۔"[3]

---

[1] ملاحظہ ہو الصارم المنکی فی الرد علی السبکی للحافظ ابن عبدالہادی المقدسی، ص ۱۳۳ (طبع مصر ۱۳۱۶ھ)۔ امام موصوف کی عبارت یہ ہے:
"و رجال الغیب ہم الجن قال تعالیٰ وانہ کان رجال من الانس یعوذون برجال من الجن فزادوہم رہقا۔"

[2] معالم التنزیل، ج ۷، ص ۱۴۲ [3] انوار التنزیل، ج ۱، ص ۴۴ و ۴۵

Marfat.com

لیکن علامہ زمخشری الفائق فی غریب الحدیث میں رقمطراز ہیں :-

" رجز اور رجس کے معنی عذاب کے ہیں ' ابو تراب کا بیان ہے کہ میں نے ابو السمیدع حصینی سے سنا، وہ کہتے تھے کہ رجز اور رجس وہ سخت مصیبت ہے جو لوگوں پر نازل ہو، یہ اہل عرب کے محاورہ ارتجزت السماء بالرعد و ارتجست (آسمان بجلی کی کڑک سے کانپ اٹھا اور لرز گیا) اور رعد مرتجز و مرتجس (ایک پا دینے اور لرزا دینے والی گرج) سے ماخوذ ہے اور وہ ایسی جنبش ہے جس کے ساتھ شور ہو کیونکہ جو عذاب کہ اترتا ہے اس میں ضروری ہے کہ جن پر اترے وہ ہل جائیں اور چیخ اٹھیں [1]"

اور امام راغب فرماتے ہیں :-

" رجز کی اصل اضطراب (یعنی خوب ہلنا اور جنبش کرنا ہے) اور اسی سے رجز البعیر رجزا فھو ارجز و ناقۃ رجزاء آتا ہے جبکہ اونٹ یا اونٹنی کے قدم قریب قریب پڑنے اور ضعف کے سبب ڈگمگانے لگیں "

آیہ شریفہ عذاب من رجز الیم (بلا کی مار سے دکھ والی) میں رجز یہاں زلزلہ کی طرح ہے "

پ۹ ۱۲۶ ، پ۲۲ ۱۶ ، پ۲۵ ۱۷ ، رِجزًا پ۱ ۶ ، پ۹ ۱ ، پ۲۰ ۱۲ -

**رِجْسٌ** : ناپاک، پلید، گندہ، عقوبت، عذاب، بلا۔ اَرْجَاسٌ جمع، رجس کی چار صورتیں ہیں، (۱) طبیعت کی جہت سے (۲) عقل کی جہت سے (۳) شرع کی جہت سے (۴) ان تینوں جہت سے رجس شرعی جُوا اور شراب، رجس عقلی شرک اور لحم خنزیر، تینوں کا مجموعہ میتہ (مردار) ہے۔ حق تعالیٰ نے سب کے لئے لفظ رجس استعمال فرمایا ہے، بعض کا قول ہے کہ رِجز اور رِجس زور کی چیخ کو کہتے ہیں (ملاحظہ ہو رجن) پ۷ ۲ ، پ۸ ۵ ، ۱۶ ، ۱۲ ، پ۱۱ ۵ ، ۱۵ ، پ۱۱ ۱ ، پ۱۷ ۱۲ ، رِجسًا پ۱۱ ۵ -

**رِجْسِہِمْ** : ان کی نجاست، ان کی گندگی، ان کی پلیدی، رِجْسِ مضاف ھِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، پ۱۱ ۵ -

**رَجْعٌ** : پھر آنا، لوٹ آنا، مینہ، بارش، رَجَعَ یَرْجِعُ کا مصدر ہے متعدی آتا ہے آیت شریفہ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ میں بعض نے ذات الرجع کا ترجمہ پھر کر برسنے والا کیا ہے شاہ عبد القادر صاحب نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور قاضی بیضاوی کا بھی رجحان اسی

[1] الفائق فی غریب الحدیث ، طبع دائرۃ المعارف ، حیدرآباد دکن۔

Marfat.com

طرف ہے اس اعتبار سے آسمان کو "ذات الرجع" اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے ہر دورہ میں جس جگہ سے حرکت کرتا ہے وہیں لوٹ آتا ہے[1] لیکن اکثر مفسرین اور ائمہ لغت کی تصریح کے مطابق یہاں رجع اپنے معنی مصدری میں نہیں بلکہ بارش اور مینہ کے معنی میں اسم ہے، علامہ ابن خالویہ لغوی ابوعبیدہ سے ناقل ہیں کہ رجع مطر یعنی بارش کو کہا جاتا ہے اور ابن الاعرابی روایت کرتے ہیں کہ کل مطر یثبت فی الارض فہو رجع[2] (ہر وہ بارش جو زمین میں ٹھہر جائے، رجع ہے) بارش یا مینہ کا نام رجع کیوں پڑا؟ قاضی بیضاوی نے اس کی دو وجہیں لکھی ہیں: لان اللہ یرجعہ وقتا فوقتا او لما قیل من ان السحاب یحمل الماء من البحار ثم یرجعہ الی الارض[3] (اس لئے کہ اللہ تعالےٰ وقتاً فوقتاً بارش کو لوٹاتا رہتا ہے یا اس لئے کہ کہا گیا ہے کہ ابر سمندروں سے پانی لادلیتا اور پھر زمین کی طرف لوٹا دیتا ہے) حاکم نے بسند صحیح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ رجع کے معنی بارش کے ہیں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب نے بھی اسی ترجمہ کو اختیار کیا ہے، پ ۳۰، ۲۶/۱۵ ۱۱ -

**رَجَعَ**: وہ لوٹا، وہ پھر آیا (ضَرَبَ) رُجُوْعٌ سے جس کے معنی جہاں سے ابتدا ہوئی یا ابتدا کا اندازہ ہوا وہیں لوٹنے کے ہیں خواہ وہ کوئی مکان ہو یا فعل ہو یا قول اور خواہ رجوع بذاتہ ہو، یا کسی جزء کے ذریعہ یا کسی فعل کے ذریعہ غرض رجوع کے معنی عود کرنے اور لوٹنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ واضح رہے کہ رجوع مصدر لازم ہے، پ ۹، ۱۶/۸ ۱۳ -

**رُجِعْتُ**: میں لوٹایا گیا، رَجْعٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد متکلم، پ ۲۵/۱ -

**رَجَعْتُمْ**: تم لوٹے، تم پھرے، رُجُوْعٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، پ ۲، ۱۱/۸ -

**رَجَعَكَ**: تجھ کو واپس لوٹایا، تجھ کو پھیر لایا، رَجَعَ رَجْعٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ک ضمیر واحد مذکر حاضر، پ ۱/۱۴ -

**رَجَعْنَا**: ہم لوٹے، ہم واپس ہوگئے، ہم پھرے رُجُوْعٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، پ ۲۸/۱۳ -

---

[1] انوار التنزیل، ج ۲، ص ۳۶۸ (طبع مصر)

[2] کتاب اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن الکریم، ص ۴۹، ۵۱

[3] انوار التنزیل، ج ۲، ص ۳۶۸

[4] مستدرک، ج ۲، ص ۵۲۰ (طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن)

Marfat.com

**رَجَعْنٰكَ**: ہم نے تجھ کو واپس لوٹایا، ہم تجھے پھیر لائے، رَجَعْنَا رَجْعٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم ک ضمیر واحد مذکر حاضر، ۱۶/۱۱۔

**رَجَعُوْا**: وہ پھرے، وہ واپس لوٹے، رُجُوْعٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، ۱۱/۴، ۱۳/۲، ۱۷/۵۔

**رَجْعِهٖ**: اس کو لوٹانا، اس کو پھیر لانا، رَجْعِ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ ۳۰/۱۱۔

**رُجْعٰی**: پھر جانا، لوٹنا، رَجَعَ یَرْجِعُ کا مصدر ہے، لازم آتا ہے، ۳۰/۲۱۔

**رَجْفَةُ**: زلزلہ، بھونچال، کپکپاہٹ، لرزش اسم ہے، ۸/۱۲، ۹/۹،۱، ۲۰/۱۶۔

**رَجُلٌ**: مرد جس کی مردی و مردانگی ظاہر ہو، رِجَالٌ جمع ۳/۲، ۲/۱۲، ۸/۱۶،۱۵، ۱۱/۶، ۱۲/۲، ۱۴/۲،۳، ۲۰/۵، ۱۱/۱۴، ۲۲/۱۹،۱۸،۱۷، ۲۳/۱۲، ۲۲/۹، ۲۵/۹۔

**رُجَلًا** ۲/۱۶، ۱/۹، ۱۵/۷،۵، ۱۸/۱۲، ۲۳/۱۲، ۲۴/۹۔

**رَجُلٰنِ**: دو مرد، رَجُلٌ کا تثنیہ بحالتِ رفع واضح رہے کہ اسم و فعل کے تثنیہ میں الف جب تک طرف (آخر) میں واقع نہ ہو، قرآن کے رسم الخط میں وہ لکھا نہیں جاتا، صرف فَتَمَثَّلَ یَدَاكَ اس سے مستثنیٰ ہے، ۶/۸۔

**رِجْلِكَ**: تیرا پاؤں، رِجْلِ مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ، ۲۳/۱۴۔

**رَجِلِكَ**: تیرے پیادے، رَجِلِ مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ، رَجِلٌ رَاجِلٌ کی جمع ہے، ۱۵/۷۔

**رَجُلَيْنِ**: دو مرد، رَجُلٌ کا تثنیہ بحالتِ نصب جر، ۲/۷، ۱۴/۱۶، ۱۵/۱۲، ۲۰/۵۔

**رِجْلَيْنِ**: دو پیر، دو پاؤں، رِجْلٌ کا تثنیہ بحالتِ نصب و جر، ۱۸/۱۲۔

**رَجْمًا**: سنگسار کرنا، قتل کرنا، بے سوچے سمجھے منہ سے بات نکال دینا، لعنت کرنا، بُرا بھلا کہنا، پھٹکارنا، دھتکارنا، رَجَمَ یَرْجُمُ کا مصدر ہے، اصل میں رَجْمٌ کے معنی رِجَامٌ (پتھروں) سے مارنے کے ہیں اور بقیہ تمام معانی استعارہ ہیں، ۱۵/۱۵۔

**رَجَمْنٰكَ**: ہم نے تجھ کو سنگسار کیا، ہم نے تجھ پر پتھراؤ کیا، رَجَمْنَا رَجْمٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم کَ ضمیر واحد مذکر حاضر، ۱۲/۸۔

**رُجُوْمًا**: آلاتِ سنگساری، رَجْمٌ کی جمع، رجم اصل میں مصدر ہے اور جس چیز کے ذریعہ سنگسار کیا جائے اس کے لئے بطورِ اسم مستعمل ہے، ۲۹/۱۔

**رَجِيْمٌ**: ملعون، مردود، راندہ ہوا، رَجْمٌ سے

Marfat.com

بروزن فَعِیْلٌ بمعنی مَفْعُوْلٌ یعنی مَرْجُوْمٌ ہے شیطان چونکہ اللہ تعالیٰ کی درگاہ سے راندہ ہوا اور مردود ہے اس لئے یہ اس کی مخصوص صفت ہے اور قرآن مجید میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے اسی کی صفت میں آیا ہے، ۳/۱۲، ۱۴/۲،۱۳،۱۹، ۲۳/۱۴، ۳۰/۶ -

## فصل الحاء المهملة

**رِحَالِهِمْ** : ان کی خرجیں، ان کے کجاوے، رِحَالِ مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ رِحَالِ رَحْلٌ کی جمع ہے، ۱۳/۲ -

**رَحُبَتْ** : وہ کشادہ ہوئی، وہ فراخ ہوئی (کَرُمَ) رُحْبٌ سے جس کے معنی فراخ ہونے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، ۱۰/۳ -

**رَحْلِ** : کجاوہ، خرجیں، تھیلیتہ، اصل میں اونٹ پر سواری کے لئے جو چیز رکھی جاتی ہے یعنی پالان کو رَحْلٌ کہتے ہیں اور مجازاً منزل و مسکن اور سامان سفر خرجیں اور تھیلیتہ وغیرہ کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے رِحَالٌ جمع، ۱۳/۳ -

**رَحْلِهٖ** : اس کا اسبابِ سفر، اس کا پالان، اس کا کجاوہ، رَحْلِ مضاف هٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ۱۳/۳ -

**رِحْلَةَ** : سفر کرنا، کوچ کرنا، کجاوہ کسنا، اصل میں تو اس کے معنی اونٹ پر پالان کسنے کے ہیں اور چونکہ اس کا مقصد کوچ اور سفر ہوتا ہے اس لئے سفر کے معنی میں آنے لگا رَحَلَ یَرْحَلُ کا مصدر ہے، ۳۰/۳۱ -

**رَحِمَ** : اس نے رحم کیا، اس نے مہربانی کی (سَمِعَ) رُحْمٌ اور رَحْمَةٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ۱۲/۴،۱۰، ۱۳/۱، ۲۵/۱۵ -

**رُحْمًا** : شفقت، محبت، مہربانی، رَحِمَ یَرْحَمُ کا مصدر ہے، ۱۶/۱ -

**رُحَمَاءُ** : بڑے نرم دل، بڑے مہربان، رَحِيْمٌ کی جمع، (ملاحظہ ہو رَحِيْمٌ) ۲۶/۱۲ -

**رَحْمَتِكَ** : تیری مہربانی، تیری مہر، تیری بخشش، رَحْمَةِ مضاف كَ ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ (ملاحظہ ہو رَحْمَةٌ) ۹/۸، ۱۱/۱۴، ۱۹/۱۲ -

**رَحْمَتِنَا** : ہماری مہربانی، ہماری رحمت، ہماری بخشش، رَحْمَةِ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، ۱۳/۱، ۱۶/۶،۷، ۱۷/۵،۹ -

**رَحْمَتِهٖ** : اس کی رحمت، اس کی مہربانی، رَحْمَةِ مضاف هٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ ۱/۱۳،۸، ۳/۱۶، ۵/۱۴،۸، ۸/۱۴، ۱۱/۱،۱، ۱۵/۱۴،۶، ۱۸/۷،۸،۹،۱۰ -

Marfat.com

پ۱۹/۳، پ۲۰/۱۰۱، پ۲۱/۸، پ۲۴/۱، س۲۵/۲، ۴، ۲۰، پ۲۶/۱۱، ج۲۷/۳۰، پ۲۹/۳۰ -

**رَحِمْتَهٗ**: تونے اس پر رحم کیا، تونے اس پر مہربانی کی، رَحِمْتَ رُحْمٌ اور رَحْمَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، پ۲۴/۹ -

**رَحْمَتِیْ**: میری رحمت، میری مہربانی، رَحْمَۃ مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، پ۹/۹، پ۲۰/۱۵ -

**رَحْمٰن**: بڑا مہربان، بہت بخشش کرنے والا، چونکہ اس لفظ کے معنی بجز ذاتِ باری کے اور کسی پر صادق نہیں آتے کیونکہ اسی کی رحمت سب پر عام ہے اس لئے سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کے لئے اس لفظ کا استعمال نہیں ہوتا۔ علماء عربیت کا اس میں اختلاف ہے کہ "رحمٰن" عربی زبان کا لفظ ہے یا نہیں؟ اور عربی ہونے کی صورت میں یہ مشتق ہے یا غیر مشتق؟ مبرد اور ثعلب جو لغت عربیت کے امام ہیں، اس طرف گئے ہیں کہ یہ عبرانی لفظ ہے اور اس کی اصل خا معجمہ سے ہے[1]۔ امام خطابی لکھتے ہیں :-

" رحمٰن، کی تفسیر اور اس کے معنی میں نیز اس میں کہ وہ رحمۃ سے مشتق ہے یا نہیں، لوگوں کا اختلاف ہے بعض اس طرف گئے ہیں کہ یہ غیر مشتق ہے کیونکہ اگر یہ رحمۃ سے مشتق ہوتا تو مرحوم کے ذکر کے ساتھ آتا اور جس طرح کہ رحیم لعبادہ کہا جاتا ہے رحمٰن لعبادہ کہنا جائز ہوتا، نیز اس لئے کہ اگر رحمۃ سے مشتق ہوتا تو عرب سننے کے ساتھ ہی اس پر انکار نہ کرتے کیونکہ وہ رحمتِ پروردگار کے منکر نہ تھے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا (جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں رحمٰن کیا ہے؟ کیا تو جس کو کہے گا اس کو ہم سجدہ کریں گے اس سے ان کی نفرت میں اور زیادتی ہوتی جاتی ہے) اور بعض نے یہ خیال کیا ہے کہ یہ عبرانی نام ہے اور جمہور اس طرف گئے ہیں کہ یہ رحمۃ سے مشتق ہے اور مبالغہ پر مبنی ہے، اس کے معنی رحمت والے کے ہیں، اس سلسلہ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ جس طرح رحیم کا تثنیہ اور جمع آتا ہے اس کا تثنیہ اور جمع نہیں آتا، فعلان کا وزن کلامِ عرب میں مبالغہ کا وزن ہے چنانچہ

[1] الاتقان، ج۱، ص ۱۳۹

Marfat.com

شدید الاستلاء کو مَلْآن اور خوب پیٹ بھرے کو شَبْعَان کہتے ہیں۔" [1]

بہرحال یہ واقعہ ہے کہ خدا کے لئے رحمٰن کا لفظ اسلام سے پہلے عام طور پر عربوں میں مستعمل نہ تھا اور صرف یہود و نصاریٰ اور بعض دیگر اربابِ مذاہب اس کو بولتے تھے چنانچہ نجد کے آخری کتبات میں رحمٰن ہی کا نام ملتا ہے۔ سدِ عرم کے عیسائی کتبہ کا آغاز بنعمۃ الرحمٰن الرحیم سے ہوتا ہے اسی لئے اسلام نے جب ابتداءً رحمٰن کا نام لیا تو قریش کو اچنبھا ہوا کہ یہ کون نیا نام ہے۔ صلح حدیبیہ میں جب حضرتِ علیؓ نے عہد نامہ کی پیشانی پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا تو قریش نے ماننے سے انکار کیا کہ ہم رحمٰن کو نہیں مانتے۔ [2]

جو لوگ رحمٰن کو رحمت سے مشتق بتاتے ہیں وہ رحمٰن و رحیم میں نہایت دقیق اور نازک فرق بیان کرتے ہیں چنانچہ ابنِ حجر عسقلانی لکھتے ہیں:-

"اس میں اختلاف ہے کہ آیا رحمٰن اور رحیم کے ایک ہی معنی ہیں جس طرح کہ ندمان اور ندیم کے ہیں اور ان دونوں کو جو ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے وہ تاکید کیلئے ہے یا باعتبار تعلق دونوں میں باہم مغایرت ہے پس رحمٰن ہے دنیا کے لئے اور رحیم ہے آخرت کے لئے کیونکہ دنیا میں اس کی رحمت مومن و کافر سب کے لئے عام ہے اور آخرت میں مومن کے ساتھ مخصوص ہے یا مغایرت کسی اور جہت سے ہے کہ رحمٰن تو اس حیثیت سے زیادہ بلیغ ہے کہ وہ بڑی بڑی نعمتوں اور ان کے اصول پر مشتمل ہے جیسے کوئی غضب میں بھرا ہو تو اسے غضبان کہتے ہیں اور رحیم کو اس کے بعد ہی اس لئے لایا گیا کہ بطور تتمہ ہو کر چھوٹی نعمتوں کو شامل ہو جائے اور بعض کا قول ہے کہ رحیم زیادہ بلیغ ہے کیونکہ فَعِیْلٌ کا صیغہ مبالغہ کا متقضی ہے اور تحقیق یہ ہے کہ مبالغہ کی جہت دونوں میں مختلف ہے" [3]

علامہ ابنِ خالویہ لغوی کا بیان ہے کہ:-

" رحمٰن کو رحیم پر اس لئے مقدم کیا گیا کہ رحمٰن، اللہ تعالیٰ کا اسم خاص ہے اور رحیم

---

[1] کتاب الاسماء والصفات امام بیہقی، ص ۲۷ (طبع انوار احمدی، الٰہ آباد) [2] ارض القرآن، ج ۲، ص ۲۳۹ (طبع معارف پریس، اعظم گڑھ) [3] فتح الباری، ج ۸، ص ۱۱۸ (طبع میریہ، مصر)

اسم مشترک ہے کیونکہ رجل رحیم تو بولتے ہیں مگر رجل رحمٰن نہیں بولتے، پس خاص کو عام پر مقدم کیا گیا۔ ابن عباس (رضی اللہ عنہما) کہتے ہیں کہ رحمٰن اور رحیم دو ایسے اسم ہیں جن میں رقت کے معنی ہیں اور ایک میں بہ نسبت دوسرے سے رقت کا مفہوم زیادہ ہے اور دوسروں کا بیان ہے کہ رحمٰن میں مدح زیادہ ہے اور رحیم میں رقت زیادہ ہے پس رحیم لطیف کی طرح ہے اور ابوعبیدہ کہتے ہیں کہ رحمٰن اور رحیم دونوں نعتیں ہیں پس رحیم تو رحمت سے بروزن فعیل ہے اور رحمٰن بوزن فعلان۔ ابوعبیدہ کا بیان ہے کہ یہ اس بنا پر ہے کہ اہل عرب کے نزدیک زبان میں وسعت ہے جیسے کہ ندیم اور ندمان کے ایک ہی معنی ہیں ابوعبیدہ نے اس شعر کو پیش کیا ہے ؎

وَنَدْمَانٍ تَزِيْدُ الْكَأْسَ طِيْبًا
سَقَيْتُ وَقَدْ تَغَوَّرَتِ النُّجُوْمُ

اور دوسرے علمار کا قول ہے کہ رحمٰن عبرانی کا لفظ ہے، ان لوگوں نے جریر کی یہ بیت استشہاد میں پیش کی ہے:

اَوْ تَتْرُكُوْنَ اِلَى الْقَسَّيْنِ هِجْرَتَكُمْ
وَمَسْحَكُمْ صُلْبَهُمْ رَحْمٰنَ قُرْبَانَا لہ

مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں ایک اور فرق نمایاں کیا ہے، فرماتے ہیں :-

" اگرچہ یہ دونوں اسم رحمت سے ہیں لیکن رحمت کے دو مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں، عربی میں فعلان کا باب عموماً ایسے صفات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو محض صفات عارضہ ہوتے ہیں، فعلی ظہور ان کے لئے ضروری نہیں ہوتا جیسے پیاسے کے لئے عطشان غضبناک کیلئے غضبان مراسیمہ کے لئے حیران، مست کے لئے سکران لیکن فعیل کے وزن میں صفات قائمہ و فاعلہ کا خاصہ ہے یعنی عموماً ایسے صفات کے لئے بولا جاتا ہے جو جذبات و عوارض ہونے کی جگہ صفات قائمہ ہوتے ہیں اور اپنا فعلی ظہور بھی رکھتے ہیں مثلاً کریم کرم کرنے والا عظیم بڑائی رکھنے والا، حکیم حکمت رکھنے والا، پس الرحمٰن کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ذات جس میں رحمت ہے اور الرحیم

لہ کتاب اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن الکریم، ص ۱۳

کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ذات جس میں نہ صرف رحمت ہے بلکہ جس کی رحمت اپنا فعل ظہور بھی رکھتی ہے اور تمام کائنات اسی سے فیض یاب ہو رہی ہے۔" [1]

شاہ عبدالعزیز صاحب تفسیر فتح العزیز میں ایک اور نکتہ واضح فرماتے ہیں :-

"باید دانست کہ از لوازم پرورش دو قسم رحمت ست، قسم اول رحمتے کہ در حین پرورش می باشد و آں رحمت اگر نباشد پرورش متصور نشود و حقیقت آں رحمت توجہ تام بدفع حاجات پرورده خود و تعہدِ ضروریات او در ہر وقت و تفقد بایست و نابایست او در ہر آں ست و ازیں رحمت باسم رحمان تعبیر فرموده اند و قسم دوم از رحمت آنست کہ بعد از پرورش بحصول کمال ثمرات آں کمال را مترتب فرمایند و آں کمال را رائیگاں نسازند و ازیں رحمت تعبیر فرموده اند برحیم" [2]

بہرحال یہ سب نکتہ سنجیاں اس بنیاد پر ہیں کہ رحمٰن کا اشتقاق رحمت سے ہے اور وہ عربی زبان کا لفظ ہے ورنہ اگر اس کو عبرانی لفظ مان لیا جائے تو پھر کسی دقیقہ سنجی کی ضرورت نہیں رہتی، اس صورت میں یہ لفظ اللہ کی طرح ذات باری کا علم ہوگا، قرآنِ مجید میں یہ لفظ ترپن جگہ مذکور ہے اور بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا استعمال بطورِ صفت نہیں بلکہ بطورِ علم ہوا ہے، ۲/۲ ۱۳/۱۰ ۱۵/۱۲

۱۶/۵، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۴، ۱۵ ۱۷/۲، ۳، ۴، ۶ ۱۹/۱، ۲، ۴، ۵، ۱۷

۲۲/۱۸، ۱۹ ۲۳/۱، ۳ ۲۴/۱۵ ۲۵/۸، ۹، ۱۰، ۱۳ ۲۶/۱۷ ۲۷/۱۱ ۲۸/٦

۲۹/۱، ۲ ۳۰/۲ -

**رَحِمَنَا** : اس نے ہم پر رحم کیا، اس نے ہم پر مہربانی کی، اس نے ہم پر رحمت کی، رَحِمَ صیغہ ماضی نا ضمیر جمع متکلم ہے (ملاحظہ ہو رَحِمَ) ۲۹/۲ -

**رَحِمْنٰهُمْ** : ہم نے ان پر مہربانی کی، ہم نے ان پر رحم کیا، ہم نے ان پر بخشش کی، رَحِمْنَا رَحِمَ اور رَحِمْنَا سے، ماضی کا صیغہ جمع متکلم، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، ۱۹/۴ -

**رَحِمَهٗ** : اس پر رحم کیا، اس پر مہربانی کی، اس پر بخشش کی، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے (ملاحظہ ہو رَحِمَ) ۸/۷ -

**رَحْمَةٌ** : رحمت، بخشش، مہربانی، رَحِمَ یَرْحَمُ کا مصدر ہے، امام راغب لکھتے ہیں :-

[1] ترجمان القرآن، ج ۱، ص ۳۹ (طبع دہلی ۱۳۵۰ھ)

[2] تفسیر فتح العزیز، ص ۴ (طبع محمدیہ ۱۲۶۴ھ)

"رحمۃ وہ رقت ہے جو مرحوم کی طرف (یعنی جس پر رحم کیا جائے) احسان کی مقتضی ہو اور کبھی اس کا استعمال مجرد رقت کے معنی میں ہوتا ہے اور کبھی صرف احسان کے معنی میں جو رقت سے خالی ہو جیسے رَحِمَ اللّٰہُ فلانا (اللہ نے فلانے پر رحم کیا) جب اس سے ذاتِ باری کو موصوف کیا جائے گا تو صرف احسان مراد ہوگا، رقت مراد نہ ہوگی اس لئے مروی ہے کہ اللہ کی طرف سے رحمت انعام اور فضل ہے اور آدمیوں کی طرف سے رحمت رأفت و تعطف (شفقت) ہے اور اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد ہے جو آپ نے اپنے رب سے نقل کیا ہے کہ جب اس نے رحم کو پیدا کیا تو اس سے فرمایا میں رحمٰن ہوں اور تو رحم ہے، میں نے تیرے نام کو اپنے نام میں سے نکالا ہے، پس جو تجھے ملائیگا میں اسے ملاؤں گا اور جو تجھے قطع کرے گا میں اسے پارہ پارہ کر دونگا، یہ اسی طرف اشارہ ہے جو سابق میں گزرا کہ رحمت، رقت اور احسان دو معنوں پر مشتمل ہے، پس رقت کو طبائعِ انسانی میں جگہ دی اور احسان کے ساتھ خود منفرد رہا تو یہ ہوا کہ جس طرح لفظِ رحم رحمت سے ہے اسی طرح اس کے جو معنی لوگوں میں موجود ہیں وہ اس معنی سے ہیں جو ذات باری کے لئے پائے جاتے ہیں اور ان دونوں کے معنوں میں بھی وہی تناسب ہے جو ان دونوں کے لفظوں میں ہے۔"

مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو میں رحمت کی اچھی تشریح کی ہے جو ان ہی کے لفظوں میں درج ذیل ہے:

"عربی میں رحمت میں عواطف کی ایسی رقت اور نرمی کو کہتے ہیں جس سے کسی دوسری ہستی کے لئے احسان و شفقت کا ارادہ جوش میں آجائے، پس رحمت میں محبت، شفقت، فضل، احسان سب کا مفہوم داخل ہے اور مجرد محبت لطف اور فضل سے زیادہ وسیع ہے۔" [1]

۲ / ۳، ۱۱، ۱۶۳ — ۳ / ۹ — ۴ / ۲، ۸۲ — ۵ / ۱۰ — ۶ / ۴ — ۷ / ۸، ۱۲۰ — ۸ / ۲، ۵، ۱۶، ۲۷، ۲۷

۸ / ۱۳، ۱۴، ۱۶ — ۹ / ۹، ۱۳ — ۱۰ / ۹، ۱۴ — ۱۱ / ۸، ۱۱ — ۱۲ / ۲، ۳، ۵، ۱۶، ۱۶، ۷، ۸

۱۳ / ۶ — ۱۴ / ۴، ۱۲، ۱۸ — ۱۵ / ۳، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۲۰، ۲۱ — ۱۶ / ۱، ۲

۱۶ / ۴، ۵ — ۱۷ / ۶، ۷ — ۲۰ / ۳، ۸، ۱۲ — ۲۱ / ۱، ۶، ۷، ۸، ۱۰، ۱۸ — ۲۲ / ۱۳

۲۳ / ۴، ۱۰، ۱۳، ۱۵ — ۲۴ / ۱، ۳، ۱۶ — ۲۵ / ۱، ۶، ۹، ۱۴، ۱۸ — ۲۶ / ۲ — ۲۷ / ۱۸، ۲

[1] ترجمان القرآن، ج ۱ ص ۳۹

**رَحِیْقٍ**: شراب، ناب، اسمِ جامد ہے، علامہ ابومنصور ثعالبی فقہ اللغۃ میں ابوعبید سے ناقل ہیں الرحیق صفوۃ الخمر التی لیس فیہا غش[۱] (رحیق وہ شراب صاف ہے جس میں ذرا آمیزش نہ ہو)، ۸۳/۲۵۔

**رَحِیْم**: بڑا مہربان، نہایت رحمت والا، رَحْمَۃٌ سے بروزن فَعِیْلٌ مبالغہ کا صیغہ رُحَمَاءُ جمع رحیم اسمائے حسنٰی میں سے ہے اس کا استعمال غیر کے لئے بھی ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآنِ مجید میں رَءُوْفٌ رَحِیْمٌ کہا گیا ہے، ابنِ مبارک کہتے ہیں رحمٰن وہ ذات ہے کہ جب اس سے مانگا جائے تو عطا فرمائے اور رحیم وہ ذات ہے کہ اس سے نہ مانگا جائے تو غضب میں آئے[۲]، (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو رحمٰن)۔

۱/۱، ۳۴، ۶۴، ۱۵ — ۲/۱، ۲، ۵، ۶، ۸، ۹، ۱۱، ۱۲ — ۳/۱۲، ۱۷ — ۴/۴ — ۵/۱ — ۶/۵، ۸، ۱۰، ۱۴ — ۷/۳، ۱۳ — ۸/۵، ۷ — ۹/۹، ۱۱ — ۱۰/۵، ۶، ۷ — ۱۰/۱۰، ۱۸ — ۱۱/۱، ۲، ۳، ۵، ۱۶ — ۱۲/۴، ۸ — ۱۳/۱، ۵، ۱۸ — ۱۴/۴، ۷، ۸، ۱۲ — ۱۶/۲۰، ۲۱ — ۱۷/۱۶ — ۱۸/۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۵ — ۱۹/۵، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲ — ۱۹/۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷ — ۲۰/۵ — ۲۱/۴، ۱۴ — ۲۲/۷، ۱۸ — ۲۳/۳ — ۲۴/۳، ۱۵ — ۲۴/۱۸ — ۲۵/۲، ۱۵ — ۲۶/۱، ۱۳، ۱۴ — ۲۷/۳، ۷، ۱۷، ۲۰ — ۲۸/۲، ۳، ۴، ۶، ۸ — ۲۸/۱۰، ۱۶ — ۲۹/۱۴۔

**رَحِیْمًا**: ۴/۱۴، ۱۵ — ۵/۲، ۶، ۱۰، ۱۱، ۱۳، ۱۶ — ۶/۱ — ۹/۲ — ۱۶/۱۶ — ۱۹/۴ — ۲۱/۱۷، ۱۹ — ۲۳/۳، ۵، ۹ — ۲۶/۱۰۔

## فصل الخاء المعجمۃ

**رُخَاءً**: ملائم، نرم نرم، اسم ہے رِخْوَۃٌ اور رَخَاوَۃٌ سے جس کے معنی نرم ہونے کے ہیں ماخوذ ہے، ۲۳/۱۲۔

## فصل الدال المہملۃ

**رَدَّ**: اس نے پھیر دیا، اس نے لوٹا دیا، اس نے واپس کر دیا (نَصَرَ) رَدٌّ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو رَدَّدَهَا) ۲۱/۱۹۔

**رِدْأً**: مددگار، مدد دینے والا، جو دوسرے کی مدد کے لئے ساتھ چلے یہ رِدْءٌ کہلاتا ہے یہ رِدْءٌ سے جس کے معنی مدد کرنے کے ہیں صفتِ مشبہ کا صیغہ اَرْدَاءٌ جمع، ۲۰/۴۔

**رُدَّتْ**: وہ واپس کر دی گئی، وہ لوٹا دی گئی، رَدٌّ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب ۳/۱۳۔

[۱] فقہ اللغۃ، باب ۲۴، فصل ۱۵ فی تفصیل اسماء الخمر وصفاتہا۔ [۲] فتح الباری، ج ۸، ص ۱۱۸

**رُدِدْتُّ**: میں لوٹایا گیا، مجھ کو واپس کیا گیا، مجھے پھیرا، رَدٌّ سے، ماضی مجہول کا صیغہ واحد متکلم، پ ۵/۱۲۔

**رَدَدْنَا**: ہم نے پھیر دیا، ہم نے لوٹا دیا، ہم نے واپس کر دیا، رَدٌّ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، پ ۵/۱۔

**رَدَدْنٰهُ**: ہم نے اس کو پھیر دیا، ہم نے اس کو واپس کر دیا، ہم نے اس کو لوٹا دیا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، پ ۲/۴، پ ۳۰/۲۔

**رَدِفَ**: وہ پیچھے لگا، وہ پیچھے ہوا (رَدْفٌ) رَدْفٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو تا دِفَةٌ) پ ۲۰/۲۔

**رَدْمًا**: موٹی دیوار، مضبوط دیوار، سدِ محکم، رَدَمَ يَرْدِمُ کا مصدر ہے جس کے معنی رخنہ کو پتھروں سے بند کر دینے کے ہیں مگر یہاں مصدر بمعنی اسم مفعول ہے، پ ۱۶/۲۔

**رُدُّوْا**: انہوں نے الٹا دیا، انہوں نے لوٹایا، انہوں نے پھیر دیا، رَدٌّ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، آیہ شریفہ رَدُّوْا اَيْدِيَهُمْ فِیْۤ اَفْوَاهِهِمْ (پھر انہوں نے اپنے ہاتھ الٹے دے اپنے منہ میں) کے تین معانی بیان کئے گئے ہیں (۱) غصہ کے مارے پشتِ دست کاٹنے لگے (۲) منہ پر ہاتھ لیجا کر خاموش کرنے لگے (۳) اَفْوَاهِهِمْ میں هِمْ کی ضمیر بجانب انبیاء راجع کی جائے یعنی انبیاء کے منہ پر ہاتھ رکھنے لگے رَدٌّ کے استعمال سے یہاں اس بات پر تنبیہ مقصود ہے کہ انہوں نے بار بار ایسا کیا، پ ۱۳/۱۴۔

**رُدُّوْا**: وہ واپس لائے گئے، وہ لوٹائے گئے وہ پھیرے گئے، رَدٌّ سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ ۵/۹، پ ۷/۱۴، ۹، پ ۱۱/۸۔

**رَدُّوْهُ**: انہوں نے اس کو لوٹا دیا، اس میں ہُ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، (ملاحظہ ہو رَدُّوْا) پ ۵۔

**رُدُّوْهُ**: اس کو رجوع کر دو، اس کو لوٹاؤ، اس کو پھیر دو، رُدُّوْا رَدٌّ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، پ ۵۔

**رُدُّوْهَا**: اس کو پھیر دو، اس کو واپس لاؤ، اس میں هَا ضمیر واحد مذکر غائب ہے، پ ۵/۲۳، پ ۱۲۔

**رَدَّهَا**: اس کا پھیر دینا، رَدَّ مضاف هَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، رَدٌّ رَدَّ يَرُدُّ کا مصدر ہے جس کے معنی کسی شے کے لوٹانے کے ہیں خواہ ذاتِ شے کو لوٹایا جائے یا اس کی کسی حالت کو، پ ۱۷/۲۔

**رَدِّهِنَّ**: ان (عورتوں) کا لوٹانا، ان کا پھیر لینا رَدِّ مضاف هِنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب مضاف الیہ، پ ۲/۱۲

## فصل الزاء المعجمة

**رَزَّاقٌ**: رزق دینے والا، روزی دینے والا، رِزْقٌ سے جس کے معنی روزی دینے کے ہیں، بروزن فَعَّالٌ مبالغہ کا صیغہ، امام حلیمی کہتے ہیں "رزق پر رزق کثرت سے اور وسعت کے ساتھ دینے والا رزاق ہے" امام خطابی کا بیان ہے کہ رزاق وہ ذات ہے جو رزق کی متکفل ہے اور ہر جان کے قیام کے لئے جس قدر قوت کی ضرورت ہے اسکی بہم پہنچانیوالی ہے[1]، یاد رہے کہ اس لفظ کا اطلاق بجز ذاتِ باری کے غیر پر جائز نہیں ہے، 27/2۔

**رِزْقٌ**: روزی، رزق۔ صاحب لکھتے ہیں کہ رزق کبھی تو عطاءِ جاری کو کہا جاتا ہے خواہ دنیوی ہو یا اخروی اور کبھی حصہ کو اور جو پیٹ میں پہنچکر غذا بن جاتی ہے اس کو، عطاءِ دنیوی کی مثال وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ (آسمان میں ہے تمہاری روزی) اور عطاءِ اُخروی کی مثال وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا (اور ان کو ہے ان کی روزی وہاں صبح اور شام) اور حصہ کی مثال وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُونَ (اور اپنا حصہ یہی لیتے ہو کہ تم جھٹلاتے ہو) اور غذا کی مثال فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ (سو وہ تمہارے لئے اس میں سے کھانا لے آئے) اَرْزَاقٌ جمع، 1/4، 3/11، 9/15، 8/6، 11/11، 14/9، 14/16، 15/3،15، 17/17، 18/14، 19/9، 20/11،14، 21/2،7، 22/7،9،10،11، 23/6، 24/2، 25/3،4،17، 27/2۔

**رِزْقًا** 1/2، 7/12، 12/6، 13/17، 14/10،16، 16/17، 17/15، 20/9،14، 22/1، 24/7، 26/15، 28/18۔

**رِزْقُكُمْ**: تمہارا رزق، تمہاری روزی، رِزْقٌ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، 26/18، 27/16۔

**رَزَقَكُمْ**: اس نے تم کو روزی دی، اس نے تم کو رزق دیا، رَزَقَ رِزْقٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر (ملاحظہ ہو اُرْزُقْنَا) 7/2، 8/4،13، 9/17، 14/16،21، 17/7، 23/3، 24/12۔

**رِزْقُنَا**: ہمارا رزق، ہماری روزی، رِزْقٌ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، 23/12۔

**رُزِقْنَا**: ہمیں روزی دی گئی، ہمیں رزق دیا گیا، رِزْقٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع متکلم، 1/2۔

**رَزَقْنٰكُمْ**: ہم نے تم کو رزق دیا، ہم نے تم کو روزی دی، رَزَقْنَا رِزْقٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، 1/6، 5/5، 7/2، 9/10، 16/13، 21/7

[1] کتاب الاسماء والصفات امام بیہقی، ص ۵۰

پ ۲۸/۱۱ -

**رَزَقْنٰهُ**: ہم نے اس کو روزی دی، ہم نے اس کو رزق دیا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، پ ۱۴/۱۶ -

**رَزَقْنٰهُمْ**: ہم نے ان کو روزی دی، ہم نے ان کو رزق دیا، اس میں ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے، پ ۱/۱، پ ۹/۱۵، پ ۱۱/۱۵، پ ۱۳/۹، ۱۷، پ ۱۴/۱۳، پ ۱۵/۷، پ ۱۷/۱۲، پ ۲۰/۹، پ ۲۱/۱۵، پ ۲۲/۱۶، پ ۲۵/۵، ۱۸ -

**رَزَقَنِیْ**: اس نے مجھے رزق دیا، اس نے مجھے روزی دی، ن وقایہ ی ضمیر واحد متکلم (ملاحظہ ہو رِزْقُکُمْ) پ ۱۲/۸ -

**رُزِقُوْا**: وہ روزی دیے گئے، ان کو رزق دیا گیا، رِزْقٌ سے، ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ ۱/۳ -

**رِزْقُهٗ**: اس کا رزق، اس کی روزی، رِزْقٌ مضاف، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ، پ ۲۵/۱۴، پ ۹/۲، پ ۳۰/۱۳ -

**رِزْقُهَا**: اس کا رزق، اس کی روزی، رِزْقٌ مضاف ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، پ ۲/۱، پ ۱۲/۲۱، پ ۲۱/۱ -

**رِزْقُهُمْ**: ان کا رزق، ان کی روزی، رِزْقٌ مضاف، ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۱۶/۱۲، پ ۷/۱۶ -

**رَزَقَهُمُ**: اس نے ان کو رزق دیا، اس نے ان کو روزی دی، اس میں ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے (ملاحظہ ہو رَزَقْکُمْ) پ ۳/۳، پ ۳/۳، پ ۱۷/۱۱، ۱۲ -

**رِزْقُهُنَّ**: ان (عورتوں) کی روزی، ان کا رزق، رِزْقٌ مضاف ھُنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب مضاف الیہ، پ ۲/۱۴ -

## فصل السین المہملۃ

**رَسٌّ**: کنواں، ابن ابی حاتم نے مجاہد سے جو کبار تابعین میں سے مشہور مفسر ہیں، یہی معنی نقل کیے ہیں، امام بخاری نے "رَسٌّ" کے معنی معدن (کان) کے بیان کیے ہیں اور اس کی جمع رِسَاس بتائی ہے، ابوعبیدہ کا بھی یہی قول ہے، خلیل کہتے ہیں ہر وہ کنواں جس کی کوٹھی پختہ نہ تعمیر کی گئی "رس" کہلاتا ہے[1]، راغب لکھتے ہیں:-

• بعض کا قول ہے کہ "رس" ایک وادی ہے شاعر کہتا ہے ع وَهُنَّ لِوَادِی الرَّسِّ کَالْیَدِ لِلْفَمِ اور اصل میں "رس" کسی شے کا تھوڑا سا اثر

[1] فتح الباری، ج ۸ ص ۳۷۷

Marfat.com

جو پایا جاتا ہے اس کو کہتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے سمعت رسا من الخبر (میں نے کچھ یوں ہی سی خبر سنی) رس الحدیث فی نفسی (میرے جی میں کچھ بات پڑی) وجد رسا من حمی (اس نے بخار کا کچھ اثر محسوس کیا) رُسَّ المیتُ (میت دفن کی گئی) یعنی اس کی ذات کے بعد اس کا نشان رکھا گیا۔"

"اصحاب الرس" کے متعلق جو تحقیق تھی سابق میں گزر چکی، پ۹/۲ پ۲۶/۱۵ ۔

**رِسٰلٰتِ**: پیغامات، رِسَالَۃٌ کی جمع، پ۸/۱۵،۱۶ پ۹/۱ پ۲۲/۲ پ۲۹/۱۲ ۔

**رِسٰلٰتِہٖ**: اس کے پیغامات، رِسَالَاتٌ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ، پ۲۹/۱۲ ۔

**رِسٰلٰتِیْ**: میرے پیغامات، رسالات مضاف ی ضمیر واحد متکلم، مضاف الیہ، پ۹/۲ ۔

**رِسَالَۃٌ**: پیغام، اِرْسَالٌ سے جس کے معنی بھیجنے کے ہیں اسم ہے، اس کے معنی پیغام اور خط کے آتے ہیں، رَسَائِلُ اور رِسَالَاتٌ جمع رسالت کی شرعی تعریف علامہ سعد الدین تفتازانی نے ان الفاظ میں کی ہے[1]

"ھو سفارۃ العبد بین اللہ وبین ذوی الالباب من خلیقتہ لیزیح بہا عللہم فیما قصرت عنہ عقولہم من مصالح الدنیا والآخرۃ" (وہ اللہ تعالیٰ اور اس کی ہوشمند مخلوق کے مابین بندہ کی سفارت ہے تاکہ اس کے ذریعہ ان بیماریوں کو زائل کر دیا جائے کہ جن میں ان کی عقلیں دنیا و آخرت کی مصلحتوں سے عاجز ہو چکی ہیں)، پ۳/۱۴ ۔

**رِسَالَتَہٗ**: اس کا پیغام، رِسَالَۃٌ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ۶/۱۴ پ۳/۲ ۔

**رُسُلٌ**: رسول، پیغمبر، رَسُوْلٌ کی جمع ہے پ۱/۱۱ پ۳/۱ پ۴/۱،۶ پ۶/۲،۲،۷،۱۴ پ۷/۵،۷،۱۰ پ۸/۲،۳،۱۱،۱۲،۱۳ پ۱۲/۷،۱۰ پ۱۳/۶،۱۱،۱۹ پ۱۴/۱۱ پ۱۶/۳ پ۱۸/۴ پ۱۹/۲ پ۲۲/۱۳ پ۲۳/۱۰ پ۲۴/۵،۱۶،۱۹ پ۲۶/۱،۱۴،۱۵ پ۲۹/۲۱، رُسُلًا پ۶/۳،۱۴ پ۱۱/۱۳ پ۱۳/۱۲ پ۱۴/۱۲ پ۲۱/۸ پ۲۲/۱۳ پ۲۴/۱۳ ۔

**رُسُلُکَ**: تیرے پیغمبر، تیرے رسول، رُسُلِ مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ، پ۴/۱۱ ۔

**رُسُلُکُمْ**: تمہارے رسول، تمہارے پیغمبر، رُسُلُ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، پ۲۴/۴ ۔

**رُسُلُنَا**: ہمارے بھیجے ہوئے، ہمارے رسول، ہمارے پیغمبر، رُسُلُ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ

[1] شرح عقائد تفتازانی، ص ۹۷ (طبع علوی لکھنؤ)

Marfat.com

پ ۲/۹، پ ۴/۱۴، پ ۶/۱۱، پ ۷/۸، ۵، پ ۱۲/۷، پ ۱۵/۳، پ ۱۸/۱۶، پ ۲۲/۱۰، ۱۴، پ ۲۴/۱۲، پ ۲۵/۱۰، ۱۳، پ ۲۷/۱۹، ۲۰۔

**رُسُلِهٖ**: اس کے رسول، اس کے پیغمبر، رُسُلَ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ، پ ۱/۱۲، پ ۳/۸، پ ۴/۹، پ ۵/۱۷، پ ۶/۱، ۳، پ ۱۲/۵، پ ۱۳/۱۹، پ ۲۷/۱۸، ۱۹، پ ۲۸/۴، ۱۸۔

**رُسُلُهُمْ**: ان کے رسول، ان کے پیغمبر، رُسُلِ مضاف، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، پ ۱/۱۵، پ ۱۱/۷، پ ۱۳/۱۴، ۱۵، پ ۲۱/۴، پ ۲۲/۱۸، پ ۲۵/۳۔

**رُسُلِیْ**: میرے رسول، میرے پیغمبر، رُسُل مضاف، ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، پ ۶/۱۷، پ ۷/۳، پ ۲۲/۱۱، پ ۲۸/۳۔

**رَسُوْل**: پیغمبر، بھیجا ہوا، رسول، رِسَالَۃٌ سے ہے، شیخ شمس الدین قہستانی لکھتے ہیں:-

"فَعُوْلٌ بمعنی مُفْعَلٌ بالفتح کا اور فَعُوْلٌ کا استعمال اس طرح پر نادر ہی ہوتا ہے"[1]

نبی اور رسول کے مابین کیا نسبت ہے[2] اس بارے میں تین مختلف رائیں ہیں:-

(۱) یہ دونوں مساوی ہیں یعنی ہر نبی رسول ہے اور ہر رسول نبی ہے، علامہ تفتازانی نے شرح عقائد

---

[1] جامع الرموز، ص ۵ (طبع نول کشور)

[2] جو کچھ ذہن میں حاصل ہوتا ہے وہ مفہوم ہے، اس کی دو قسمیں ہیں جزئی اور کلی، جزئی وہ مفہوم ہے جس کے ایک ذات سے زیادہ پر صادق ہونے کو عقل روا نہ رکھے جیسے مفہوم ہونے وعیسٰی علیہما الصلوٰۃ والسلام اور کلی وہ مفہوم ہے جس کے ایک ذات سے زیادہ پر صادق ہونے کو عقل روا رکھے جیسے مفہوم نبی اور رسول کا۔

جو دو کلی ہیں ان میں نسبت چار ہی طرح کی متصور ہو سکتی ہے کیونکہ یا تو دونوں میں سے ہر ایک کلی دوسری کلی کے ہر فرد پر صادق آئے گی جیسے انسان اور ناطق کہ انسان ناطق کے ہر فرد پر صادق آتا ہے اور ناطق انسان کے ہر فرد پر، ایسی دو کلیوں کو "متساویین" کہتے ہیں اور ان کی نسبت کو "تساوی" یا دونوں میں سے ہر ایک دوسری کے کسی فرد پر صادق نہ آئے گی جیسے انسان اور گھوڑا، کہ نہ انسان گھوڑے کے کسی فرد پر صادق آتا ہے نہ گھوڑا انسان کے کسی فرد پر، ایسی دو کلیوں کو "متباینین" کہتے ہیں اور ان کی نسبت کو تباین یا دونوں میں سے ایک تو دوسری کے ہر فرد پر صادق آئے گی اور دوسری پہلی کے ہر فرد پر صادق نہ آئے گی بلکہ صرف بعض افراد پر جیسے حیوان اور انسان کہ حیوان تو انسان کے ہر فرد پر صادق آتا ہے اور انسان حیوان کے صرف بعض افراد پر، ایسی دو کلیوں میں سے اول کو اعم کہتے ہیں اور دوسری کو اخص، اور ان کی نسبت کو عموم خصوص مطلق، مثال مذکور میں حیوان اعم ہے اور انسان اخص اور یا ان دونوں میں سے ہر ایک دوسری کے صرف بعض افراد پر صادق آئے گی جیسے حیوان اور سپید کہ حیوان سپید کے صرف بعض افراد پر صادق آتا ہے اور سپید حیوان کے صرف بعض افراد پر چنانچہ بطخ پر دونوں صادق ہیں اور ہاتھی پر صرف حیوان صادق ہے اور ہاتھی دانت پر صرف سپید، ایسی دو کلیوں کو اعم من وجہ اخص من وجہ کہتے ہیں اور ان کی نسبت کو عموم و خصوص من وجہ۔

Marfat.com

نسفی اور شرح مقاصد میں اسی کو اختیار کیا ہے اور امام ابنِ ہمام نے المسائرہ میں اس کو محققین کی طرف منسوب کیا ہے فرماتے ہیں :-

"واما علی ما ذکرہ المحققون من ان النبی انسان بعثہ اللہ لتبلیغ ما اوحی الیہ وکذا الرسول فلا فرق [1] (لیکن محققین نے جو ذکر کیا ہے کہ نبی وہ انسان ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اسلئے مبعوث فرمایا ہو کہ جو کچھ اس کی طرف وحی کی ہے اس کی تبلیغ کردے اور اسی طرح سے رسول اس بنا پر کوئی فرق نہیں ہے ")

لیکن آیہ شریفہ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ الآیۃ (اور نہیں بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول اور نہ نبی) اس قول کی تردید کررہی ہے کیونکہ عطف مغایرت پر دلالت کرتا ہے اور احد المتساویین کی نفی متساوی آخر کی نفی کو مستلزم ہے پس اگر ان کے مابین تساوی مانی جائے تو وَلَا نَبِیٍّ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ نبی تو رسول ہی کے ذکر میں آ گیا اب علیحدہ ذکر کی کیا حاجت؟

(۲) یہ دونوں متباینین ہیں، رسول وہ ہے جو جدید شریعت لے کر آئے اور نبی وہ ہے جو جدید شریعت لے کر نہ آئے پس کوئی رسول نبی نہیں اور کوئی نبی رسول نہیں، لیکن یہ محض غلط ہے کیونکہ حضرتِ اسمٰعیل علیہ السلام کے متعلق قرآنِ مجید میں صاف تصریح ہے وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِیًّا (اور تھا رسول نبی) اور اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق میں وارد ہوا ہے۔

(۳) ان دونوں کے مابین عموم خصوص مطلق ہے اکثر علماء کی یہی رائے ہے، اب بعض تو اس طرف گئے ہیں کہ رسول اعم ہے اور نبی اخص کیونکہ رسول فرشتہ بھی ہوتا ہے اور انسان بھی، ارشاد ہے اَللّٰهُ يَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ (اللہ تعالیٰ چھانٹ لیتا ہے فرشتوں میں پیغام پہنچانے والے اور آدمیوں میں) اور نبی صرف انسان ہی ہوتا ہے فرشتہ نہیں، پس ہر رسول نبی ہوا لیکن ہر نبی رسول نہیں کیونکہ بعض رسول فرشتے ہوتے ہیں اور جمہور کا یہ قول ہے کہ نبی اعم ہے اور رسول اخص [2] پس ہر رسول نبی ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں مگر اس صورت میں نبی اور رسول میں فرق کیا ہوگا اور ان دونوں کی شرعی تعریف کیا ہوگی ؟ اس سلسلہ میں سخت

[1] المسائرہ مع شرحہ المسامرہ، ص ۹۴ (طبع انصاری دہلی ۱۳۲۰ھ)
[2] واضح رہے کہ اس بحث کے سلسلہ میں ہمارے پیشِ نظر نبراس شرح شرح عقائد مصنفہ علامہ عبدالعزیز بن احمد فرہاری ص ۹۰ (طبع ہاشمی میرٹھ)

اختلافِ اقوال ہے جو درج ذیل ہے ، حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نے جمہور کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے :

" جس کو اللہ سے وحی آئی وہ نبی ہے اور ان میں جو خاص ہیں امت رکھتے ہیں یا کتاب ، وہ رسول ہیں " [1]

قاضی ناصر الدین علامہ عبداللہ بن عمر البیضاوی لکھتے ہیں :-

" رسول وہ ہے جس کو اللہ نے شریعتِ جدیدہ دیکر مبعوث فرمایا ہو تاکہ وہ لوگوں کو اس کی طرف دعوت دے اور نبی اس کو بھی عام ہے اور اس کو بھی کہ جس کو شرعِ سابق کے برقرار رکھنے کے لئے بھیجا ہو جیسے وہ انبیاء بنی اسرائیل جو حضرتِ موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کے مابین ہوئے ہیں ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے علماء کو ان انبیاء سے اسی بناء پر تشبیہ دی ہے پس نبی ، رسول سے اعم ہے اور اس پر یہ چیز بھی دلالت کرتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے انبیاء کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار ، عرض کیا گیا ان میں رسول کتنے ہیں ؟ فرمایا تین سو تیرہ کا جم غفیر اور بعض کا قول ہے کہ رسول وہ ہے کہ معجزہ اور کتاب جو اس پر نازل کی گئی ہو ، دونوں کا جامع ہو اور جو نبی ہی ہو ، رسول نہ ہو ، وہ ہے جس کے پاس کتاب نہ ہو اور بعض کہتے ہیں رسول وہ ہے جس کے پاس فرشتہ وحی لیکر آئے اور نبی اس کو بھی کہا جاتا ہے اور نیز اس کو بھی جس کی طرف خواب میں وحی کی جائے " [2]

محدث ملا علی قاری ، المنہج الازہر شرح الفقہ الاکبر میں فرماتے ہیں :-

" زیادہ تر مشہور فرق جو ان دونوں میں منقول ہے یہ ہے کہ نبی رسول سے اعم ہے کیونکہ رسول وہ ہے جو تبلیغ پر مامور ہو اور نبی وہ ہے جس کی طرف وحی کی جائے خواہ وہ تبلیغ پر مامور ہو یا نہ ہو " [3]

شیخ ابنِ ہمام نے المسائرہ میں اس فرق کو بعض اہلِ ظواہر و اصحابِ حدیث کی طرف منسوب کیا ہے [4]

---

[1] موضح القرآن تفسیر سورۂ مریم
[2] تفسیر انوار التنزیل ، ج ۲ ، ص ۶۴
[3] شرح فقہ اکبر ، ص ۵۰ (طبع مصر)
[4] المسائرہ ، ص ۹۴

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی بھی فتوحاتِ مکیہ میں اسی کے قائل ہیں[1] اور علامہ جلال الدین دوانی نے بھی تفسیر جلالین میں اسی کو اختیار کیا ہے[2]۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے کتاب النبوات میں اس سلسلہ میں ایک نفیس بحث سپردِ قلم فرمائی ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے، فرماتے ہیں :-

"نبی وہ ہے جس کو اللہ بتلاتا ہے اور جو کچھ اللہ بتلاتا ہے اس کو بتاتا ہے اب اگر اسی کے ساتھ وہ اس شخص کی طرف بھی بھیجا گیا کہ جو حکمِ الٰہی کا مخالف ہے تاکہ اس کو اللہ کے پیغام کی تبلیغ کرے تو وہ رسول ہے لیکن جس صورت میں کہ وہ پہلی ہی شریعت پر عامل ہے اور کسی کی طرف اس کو بھیجا نہیں گیا کہ جسے وہ اللہ کی طرف سے پیغام پہنچائے تو وہ "نبی" ہوگا، رسول نہیں، اللہ فرماتا ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ (اور ہم نے جو رسول بھیجا تجھ سے پہلے یا نبی سو جب لگا خیال باندھنے شیطان نے ملا دیا اس کے خیال میں) ارسال کا ذکر فرماکر ہر دو نوع کو عام ہے ان میں سے ایک کو باین طور خاص کیا ہے کہ وہ رسول ہے اور یہی وہ رسول مطلق ہے جو اللہ کے مخالفوں کی طرف تبلیغِ رسالت پر مامور ہے جیسے حضرتِ نوح علیہ السلام، صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ وہ پہلے رسول ہیں جو اہلِ زمین کی طرف مبعوث ہوئے اور ان سے پہلے جو تھے، انبیاء تھے جیسے حضرتِ شیث اور حضرتِ ادریس علیہما السلام اور ان دونوں سے بھی پہلے حضرتِ آدم علیہ السلام جو نبی مکلم تھے یعنی ان سے حق تعالیٰ نے کلام فرمایا تھا، حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ حضرتِ آدم اور حضرتِ نوح علیہما السلام کے مابین دس قرن گزرے ہیں جو سب کے سب اسلام پر تھے، ان انبیاء پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی تھی جس پر یہ خود بھی عمل پیرا ہوتے تھے، اور ان مومنوں کو بھی حکم فرماتے تھے جو ان کے پاس تھے کیونکہ وہ سب ان پر ایمان رکھتے تھے، ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ ایک شریعت والے ان تمام باتوں کو مانتے ہیں کہ جن کی علماء رسول کی طرف سے تبلیغ کرتے ہیں اور یہی حال

[1] فتوحاتِ مکیہ باب ۱۴، ص ۱۵۹

[2] تفسیر جلالین سورۂ حج

Marfat.com

انبیاء بنی اسرائیل کا ہے کہ وہ شریعت تورات کے مطابق حکم کرتے تھے اور گر ان میں سے کسی کی طرف ایک معین واقعہ میں خاص وحی بھی کی جاتی تھی تاہم شریعت تورات میں اسکی مثال اسی عالم کی سی ہے جس کو اللہ عزوجل کسی قضیہ میں ایسے معنی سمجھا دیں جو مطابق قرآن ہوں جیسے کہ اللہ عزوجل نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس قضیہ کا حکم سمجھایا جس میں انہوں نے اور حضرت داؤد علیہ السلام نے فیصلہ کیا تھا پس انبیاء کو تو اللہ تعالیٰ بتلاتا اور اپنے امر و نہی اور خبر رسان کو مطلع فرماتا ہے اور وہ ان لوگوں کو کہ جو ان پر ایمان لاتے ہیں اللہ عزوجل نے جو کچھ خبر دی ہے اور امر و نہی سے مطلع فرمایا ہے بتلاتے ہیں، پھر اگر کفار کی طرف بھی رسول ہوئے تو ان کو توحید الٰہی اور اس وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی دعوت دیتے ہیں نیز بہ ضروری ہے کہ رسولوں کی ایک قوم تکذیب کرے اللہ عزوجل فرماتا ہے كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ (اسی طرح ان سے پہلے لوگوں کے پاس جو رسول آیا تو یہی کہا کہ جادوگر ہے یا دیوانہ) اور ارشاد ہے مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ (تجھ سے وہی کہیں گے جو کہہ دیا ہے سب رسولوں سے تجھ سے پہلے) وجہ یہ ہے کہ رسول مخالفوں ہی کی طرف بھیجے جاتے ہیں اس لئے ان کی ایک جماعت ان کو جھٹلاتی ہے، ارشاد ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۭ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔ حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْــــَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَاۗءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ۔ (اور جتنے بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے یہی مرد تھے کہ حکم بھیجتے تھے ہم ان کو بستیوں کے رہنے والے سو کیا یہ لوگ نہیں پھرے ملک میں کہ دیکھ لیتے کیسا ہوا انجام ان کا جو ان سے پہلے تھا اور پچھلا گھر تو بہتر ہے پرہیز کرنیوالوں کو، کیا اب بھی تم نہیں سمجھتے یہاں تک کہ جب نا امید ہونے لگے رسول اور

خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا تھا پہنچی ان کو مدد ہماری، پھر بچا دیا جن کو ہم نے چاہا اور پھیری نہیں جاتی آفت ہماری قوم گنہگار سے) اور فرمایا اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ (ہم مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگانی میں اور جب کھڑے ہوں گے گواہ)

ارشاد ربانی وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اس امر کی دلیل ہے کہ نبی کبھی مرسل ہی ہوتا ہے لیکن اطلاق کے وقت وہ رسول سے موسوم نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ کسی قوم کی طرف ایسی باتیں لے کر نہیں بھیجا گیا کہ جن سے وہ واقف نہ ہوں بلکہ اہل ایمان کو ان باتوں کا حکم دیتا تھا کہ جن کے حق ہونے کو وہ جانتے ہیں جو نوعیت کہ ایک عالم کی ہوتی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لیے ارشاد فرمایا ہے العلماء ورثۃ الانبیاء (علماء انبیاء کے وارث ہیں)۔

نیز رسول کی شرط یہ بھی نہیں ہے کہ وہ نئی شریعت ہی لے کر آئے کیوں کہ حضرت یوسف علیہ السلام باوجود رسول ہونے کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر تھے۔ نیز حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام دونوں کے دونوں رسول تھے اور شریعت تورات پر تھے، حق تعالیٰ مومن آلِ فرعون کی زبانی فرماتے ہیں وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا (اور تمہارے پاس آچکا ہے یوسف اس سے پہلے کھلی باتیں لے کر پھر تم رہے دھوکے ہی میں ان چیزوں سے جو وہ لایا یہاں تک کہ جب مرگیا کہنے لگے ہرگز نہ بھیجے گا اللہ اس کے بعد کوئی رسول) اور فرمایا اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (ہم نے وحی بھیجی

تیری طرف جیسے وحی بھیجی نوح پر اور ان نبیوں پر جو اس کے بعد ہوئے اور وحی بھیجی ابرٰہیم پر اور اسمٰعیل پر اور اسحٰق پر اور یعقوب پر اور اس کی اولاد پر اور عیسٰی پر اور ایوب پر اور یونس پر اور ہارون پر اور سلیمان پر اور ہم نے دی داؤد کو زبور اور بھیجے ایسے رسول جن کا احوال ہم نے سُنایا تجھ کو اس سے پہلے اور ایسے رسول جن کا احوال نہیں سُنایا تجھ کو اور باتیں کیں اللہ نے موسٰی سے بول کر۔

اور ارسال اسم عام ہے جو ارسال ملائکہ ارسال ریاح، ارسال شیاطین اور ارسال نار، سب پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّن نَّارٍ وَنُحَاسٌ (چھوڑے جاتے ہیں تم پر شعلے آگ کے صاف اور دھواں ملے) اور ارشاد ہے جَاعِلِ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا أُولِي أَجْنِحَةٍ (جس نے ٹھہرائے فرشتے پیغام لانے والے جن کے پر ہیں) یہاں سب فرشتوں کو رسول قرار دیا گیا ہے اور ملک لفظ میں اس کو کہتے ہیں جو الوکہ یعنی رسالت کا حامل ہو اور دوسری جگہ فرمایا اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ (اللہ چھانٹ لیتا ہے فرشتوں میں پیغام پہنچانے والے اور آدمیوں میں) اور یہ وہ ہیں جن کو وحی دے کر بھیجتا ہے چنانچہ ارشاد ہے وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ (اور کسی آدمی کی طاقت نہیں کہ اس سے باتیں کرے اللہ مگر اشارہ سے یا پردے کے پیچھے یا بھیجے کوئی پیغام لانے والا پھر پہنچا دے اس کے حکم سے جو وہ چاہے) اور فرمایا هُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ وہی ہے کہ چلاتا ہے ہوائیں خوشخبری لانے والی مینہ سے پہلے) اور ارشاد فرمایا إِنَّا أَرْسَلْنَا الشَّيَاطِينَ عَلَى الْكَافِرِينَ تَؤُزُّهُمْ أَزًّا (ہم نے چھوڑ رکھے ہیں شیطان منکروں پر اچھالتے ہیں ان کو ابھار کر) لیکن لفظ رسول جب کہ اللہ کی طرف مضاف ہو اور رسول اللہ کہا جائے تو اس سے وہی سمجھا جائے گا جو اللہ کی طرف سے پیغام لے کر آئے خواہ فرشتہ ہو خواہ بشر ہو چنانچہ ارشاد ہے اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ اور فرشتے کہتے ہیں

يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ
(اے لوط ہم بھیجے ہوئے ہیں تیرے رب کے
وہ ہرگز نہ پہنچ سکیں گے تجھ تک) اور عام فرشتوں
اور ہواؤں اور جنوں کا ارسال کسی فعل کی
انجام دہی کے لئے ہوتا ہے تبلیغ رسالت
کے لئے نہیں، اللہ فرماتا ہے اُذْكُرُوْا
نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ
فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا
وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا
(یاد کرو احسان اللہ کا جب چڑھ آئیں تم پر
فوجیں پھر ہم نے بھیجدی ان پر ہوا اور وہ
فوجیں جو تم نے نہیں دیکھیں اور ہے اللہ جو
کچھ تم کرتے ہو دیکھنے والا) پس اللہ کے جو
رسول اللہ کی طرف سے امر و نہی کی تبلیغ
کرتے ہیں عند الاطلاق یہی اللہ کے
رسول ہیں۔" [1]

غرض امام موصوف کے نزدیک جس کو اللہ
کی طرف سے وحی آئے اور وہ مومنین ہی کو احکام
الٰہی کی تعلیم دے وہ نبی ہے اور جو اس کی
دعوت کافروں کے لئے بھی عام ہو تو رسول ہے
امام موصوف نے طبقات انبیاء کے سلسلہ میں بھی
ایک اہم فرق واضح کیا ہے جو یاد رکھنے کے
قابل ہے، فرماتے ہیں:-

"جس طرح اولیاء اللہ میں دو طبقے ہیں سابقین
مقربین اور اصحاب یمین مقتصدین) اسی کی
نظیر انبیاء علیہم السلام میں "عبد رسول" اور
"نبی ملک" کی تقسیم ہے، حق سبحانہ تعالیٰ نے
حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو
ان دونوں کے درمیان اختیار عطا فرمایا تھا
کہ خواہ "عبد رسول" بنیں خواہ "نبی ملک"
آپ نے "عبد رسول" بننا اختیار فرمایا
پس نبی ملک" تو جیسے داؤد علیہ السلام اور
ان کے امثال ہیں، اللہ تعالیٰ حضرت سلیمان
پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قصے میں ارشاد
فرماتا ہے قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ
وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ
مِّنْۢ بَعْدِيْ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ
فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً
حَيْثُ اَصَابَ وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ
وَّغَوَّاصٍ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ
فِي الْاَصْفَادِ هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ
اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (اس نے

[1] ملاحظہ ہو کتاب النبوات، ص ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴ (طبع منیریہ مصر، ۱۳۴۶ھ)

کیا کہ اے میرے رب مجھے بخش دے اور مجھ کو عطا فرما ایسی بادشاہی کہ کسی کو سزاوار نہ ہو میرے بعد بیشک تو بہت دینے والا ہے تو ہم نے اس کا تابع بنا دیا ہوا کو کہ چلتی تھی اس کے حکم سے نرم نرم جہاں پہنچنا چاہتا اور شیطان سارے عمارت بنانے والے اور غوطے لگانے والے اور کتنے اور بندھے ہوئے بیڑیوں میں یہ ہے ہماری عطا پس ٹو احسان کر یا رکھ چھوڑ کچھ حساب نہیں" پس "نبی ملک" پر جو کچھ فرض کیا گیا وہ اس کو انجام دیتا ہے اور جس کو اللہ نے اس پر حرام کر دیا اسے ترک کر دیتا ہے اور ولایت و مال میں جس طرح پسند کرتا اور مناسب سمجھتا ہے تصرف کرتا ہے بغیر اس کے کہ اس پر کچھ گناہ ہو۔

لیکن "عبد رسول" بغیر اپنے رب کے حکم کے کسی کو نہیں دیتا اور نہ نہیں کرتا کہ جسے چاہے عطا کر دے اور جسے چاہے محروم رکھے بلکہ جس کو عطا کرنے کا رب حکم دے اسے عطا کرتا اور جس کی تولیت کا امر کرے اسے والی بناتا ہے پس اس کے سارے کے سارے کام اللہ تعالیٰ کی عبادات ہیں چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا انی واللہ لا اعطی احدا ولا امنع احدا انما انا قاسم اضع حیث امرت میں اللہ کی قسم نہ کسی کو عطا کرتا ہوں اور نہ کسی سے روکتا ہوں، میں تو صرف تقسیم کرنے والا ہوں جہاں مجھے حکم دیا گیا، رکھ دیتا ہوں۔

اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اموال شرعیہ کو اللہ اور رسول کی طرف منسوب کرتا ہے چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ (کہہ دو کہ مالِ غنیمت اللہ کا ہے اور رسول کا) اور مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ (جو کچھ دلایا، اللہ نے اپنے رسول کو بستیوں والوں سے سو اللہ اور رسول کے لئے) اور وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ (اور جان رکھو کہ جو غنیمت لاؤ کچھ چیز سو اللہ کے واسطے اس میں سے پانچواں حصہ اور رسول کے واسطے)

اور اسی لئے اقوالِ علماء میں ظاہر ترین قول

ہے کریا سوال ولی الامر کے اجتہاد کے مطابق وہاں خرچ کیے جائیں جہاں اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہو چنانچہ امام مالک اور دیگر سلف کا یہی مذہب ہے اور امام احمد سے بھی یہی مشہور ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے تین حصے کر دیے جائیں چنانچہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ اسی کے قائل ہیں۔

مقصود یہاں یہ ہے کہ "عبد رسول" "نبی ملک" سے افضل ہے چنانچہ ابراہیم، حضرت موسےٰ، حضرت عیسےٰ، حضرت محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام افضل ہیں، حضرت یوسف حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام سے کہ مقربین سابقین ابرار اصحاب الیمین سے افضل ہیں۔" لہ

امام ابن تیمیہ نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ:۔

"اولیاء اللہ میں سب سے افضل مرسلین ہیں اور مرسلین میں سب سے افضل اولوالعزم ہیں، نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اور ان اولوالعزم میں سب سے افضل محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین امام المتقین، سید ولد آدم اور امام الانبیاء ہیں" سلہ

اور محدث ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ:۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے جدِ امجد ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام افضل ہیں اور (بقیہ تینوں حضرات میں) ظاہر یہ ہے کہ نوح علیہ السلام افضل ہیں، پھر موسےٰ علیہ السلام پھر عیسیٰ علیہ السلام اور ہمارے شیخ المشائخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ان تینوں میں کون افضل ہے اس کے متعلق میں کسی روایت پر واقف نہیں ہو سکا۔" سلہ

انبیاء و رسل کی تعداد کے بارے میں جو روایتیں آئی ہیں ان پر تفصیلی بحث لفظ "انبیاء" کے ضمن میں گزر چکی ہے اور چونکہ ان روایتوں کو قطعیت کا درجہ حاصل نہیں، اس لیے علماء کے نزدیک یہ مسلم ہے کہ ان کی تعداد کا مسئلہ ظنی ہے اعتقادی نہیں۔

جن میں بھی رسول ہوئے ہیں یا نہیں؟ علماء اس میں مختلف ہیں، ضحاک سے جب اس کے متعلق سوال ہوا تو کہنے لگے ہاں کیا اللہ کو یہ فرماتے ہوئے نہیں سنا یٰمَعۡشَرَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡکُمۡ (اے جماعت جنوں کی اور آدمیوں

لہ الفرقان بین اولیاء الرحمٰن و اولیاء الشیطان، ص ۴۳ (طبع احمدی لاہور)

سلہ المنح الازہر شرح الفقہ الاکبر ص ۱

کی کیا نہ آئے تھے تمہارے پاس پیغمبر تمہیں میں سے)
یعنی انسانوں میں سے پیغمبر اور جنوں میں سے پیغمبر
کلبی کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
بعثت سے قبل جن وانس دونوں میں رسول
مبعوث ہوتے تھے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ و
سلم جن وانس سب کی طرف مبعوث ہوئے ؎۱

علامہ ابن حزم کہتے ہیں حدیث میں آیا ہے
وکان النبی یبعث فی قومہ (اور نبی اپنی قوم
میں مبعوث ہوتا تھا) اور جن قوم انس میں سے نہیں
لہٰذا ثابت ہوا کہ جن کے لئے بھی جن ہی میں انبیاء
ہوئے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ بجز جناب پیغمبر صلی اللہ
علیہ وسلم کے کہ ان کی بعثت جن وانس کے لئے
بالاتفاق عام ہے انسانوں میں سے کوئی نبی جن
کی طرف مبعوث نہیں ہوا ؎۱

اور اکثر علماء اس طرف گئے ہیں کہ جن میں
کوئی رسول نہیں ہوا، صرف انسانوں میں رسول ہوئے
ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں:-

"جمہور ضحاک کے استدلال کا یہ جواب دیتے
ہیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ "رسل انس" وہ
رسول ہیں جو انسانوں کی طرف اللہ کی جانب
سے بھیجے گئے ہیں اور "رسل جن" کو اللہ نے
زمین پر منتشر فرمایا کہ وہ "رسل انس" کی باتوں
کو سنکر اپنی قوم کو تبلیغ کریں، اسی لئے ان کا
کہنے والا کہتا ہے اِنَّا سَمِعْنَا کِتَابًا اُنْزِلَ
مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی الآیۃ (ہم نے سنی ایک کتاب
جو اتری ہے، موسیٰ کے بعد) ؎۲"

امام بغوی فرماتے ہیں:-

" مجاہد کہتے ہیں کہ انسانوں میں رسول ہوئے
ہیں اور جنوں میں رسول نذیر اور انہوں نے
تلاوت کیا وَلَّوْا اِلٰی قَوْمِہِمْ مُّنْذِرِیْنَ
(پھر گئے اپنی قوم کی طرف ڈر سناتے ہوئے) منذرین
وہ ہیں جو پیغمبروں کی باتیں سنکر جو کچھ سنا
جنوں میں جا کر اس کی تبلیغ کرتے ہیں اور جن
میں پیغمبر نہیں ہوتے۔ اس صورت میں ارشاد
الٰہی رُسُلٌ مِّنْکُمْ میں کُمْ کی ضمیر کی صنف
یعنی صرف انس کی طرف راجع ہوگی جس
طرح کہ ارشاد ہے یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَ
الْمَرْجَانُ (نکلتا ہے ان سے موتی اور مونگا) حالانکہ
کھاری سے نکلتا ہے شیریں سے نہیں اور فرمایا وَجَعَلَ
الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا (اور رکھا چاند ان میں اجالا)

؎۱ معالم التنزیل امام بغوی، ج ۲ ص ۱۵۲

؎۲ فتح الباری، ج ۶ ص ۲۴۵

Marfat.com

حالانکہ وہ صرف ایک ہی آسمان میں ہے"۔[1]

واضح رہے کہ قرآن مجید میں رسول سے کہیں فرشتہ مراد ہے اور کہیں نبی اس لئے حسب موقع و محل معنے لئے جائیں گے، نیز لفظ رسول کا اطلاق واحد اور جمع دونوں کے لئے ہوتا ہے، ارشاد ہے لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (آیا ہے تمہارے پاس رسول تم میں کا) اور اَنَا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (ہم پیغام لائے ہیں جہان کے صاحب کا) رَسُوْلٌ کی جمع رُسُلٌ ہے۔

۱/۱۱،۱۲ ۲/۱،۱۰ ۳/۸،۱۲،۱۳،۱۷ ۴/۵،۶،۷،۹،۱۰ ۵/۳،۵،۶،۸،۱۴ ۶/۲،۳،۱۱،۱۴ ۷/۱،۲،۳،۴ ۸/۱۵،۱۶ ۹/۲،۹،۱۰،۱۵،۱۷ ۱۰/۱،۸،۱۴،۱۷ ۱۱/۱،۴،۵،۱۰ ۱۲/۱۴ ۱۳/۱۲،۱۳ ۱۴/۱،۲ ۱۶/۵،۱۴ ۱۷/۲،۴،۱۷ ۱۸/۱۳،۱۴،۱۵،۱۶ ۱۹/۱،۶،۸،۱۱،۱۲،۱۳،۱۴ ۲۰/۱۴ ۲۱/۱۹ ۲۲/۲،۴ ۲۳/۱ ۲۴/۱۳ ۲۵/۹،۱۱،۱۴ ۲۶/۸،۱۰،۱۱،۱۲،۱۸ ۲۷/۲،۱۴ ۲۸/۲،۴،۷،۹،۱۰، ۲۵/۱۲،۱۶ ۲۹/۵،۶،۱۲،۱۳ ۳۰/۶،۱۶،۲۳ -

رَسُوْلًا ۱/۱۵ ۲/۲ ۳/۱۳ ۴/۸ ۵/۸ ۱۴/۱۱ ۱۵/۲،۱۰،۱۱ ۱۶/۷،۱۴ ۱۸/۱۲ ۱۹/۲ ۲۰/۸،۹ ۲۲/۵ ۲۴/۹ ۲۵/۶ ۲۸/۱۱،۱۸ ۲۹/۱۳ -

رَسُوْلَا: دو بھیجے ہوئے، دو رسول، رَسُوْلٌ کا تثنیہ اصل میں رَسُوْلَانِ تھا، اضافت کے سبب نون تثنیہ حذف ہو گیا۔ ۱۶/۱۱ -

رَسُوْلُكُمْ: تمہارا پیغمبر، تمہارا رسول، رَسُوْلٌ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، ۱/۱۲ ۹/۱۶ -

رَسُوْلِنَا: ہمارا پیغمبر، ہمارا رسول، رَسُوْلٌ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، ۶/۷ ۷/۲ ۲۸/۱۶ -

رَسُوْلُهٗ: اس کا پیغمبر، اس کا پیغمبر، رَسُوْلٌ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ،

۳/۶ ۴/۱،۱۳ ۵/۹،۱۷ ۶/۹،۱۲ ۹/۱۰،۱۵،۱۶،۱۷ ۱۰/۲،۷،۸، ۱۰/۹،۱۰،۱۱،۱۳،۱۴،۱۵،۱۶،۱۷،۱۸ ۱۱/۱،۲ ۱۸/۱۲،۱۳،۱۴ ۲۱/۱۸،۱۹،۲۰ ۲۲/۱،۲،۳،۶ ۲۶/۹،۱۰،۱۱،۱۲،۱۳،۱۴ ۲۷/۱۷،۲۰ ۲۸/۱،۲،۳،۴،۹،۱۰،۱۳،۱۵ ۲۹/۱۲ -

رَسُوْلُهَا: اس کا پیغمبر، اس کا رسول، رَسُوْلٌ مضاف ھَا ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ۱۵/۳ -

رَسُوْلُهُمْ: ان کا پیغمبر، ان کا رسول، رَسُوْلٌ مضاف ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، ۱۱/۱ ۱۸/۴ ۲۴/۶ -

رَسُوْلِیْ: میرا پیغمبر، میرا رسول، رَسُوْلٌ مضاف

---

[1] فتح الباری، ج ۶، ص ۲۴۵

[1] معالم التنزیل، ج ۲، ص ۲۵۲

ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ ، یُ ۔

## فصل الشین المعجمۃ

**رَشَادِ** : نیکی ، راستی ، بھلائی رَشَدَ یَرْشُدُ کا مصدر ہے ، اس کے معنی راہِ راست اختیار کرنے کے ہیں ، ۲۴/۱۰۸ ۔

**رُشْدُ** : ہدایت ، صلاحیت ، راہ یابی ، بھلائی راستی ، ہوشیاری ، حسن تدبیر ، رَشَدَ یَرْشُدُ کا مصدر ہے ، ہدایت کی جگہ استعمال ہوتا ہے ، آیہ شریفہ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْھُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْا اِلَیْھِمْ اَمْوَالَھُمْ (پھر اگر دیکھو ان میں ہوشیاری تو حوالے کر دو ان کے مال ) میں رُشدُ سے مراد صلاحیت ہے دین میں اور مال کے تصرف میں ، صلاح دینی سے مراد یہ ہے کہ ان فواحش و معاصی سے مجتنب رہے جو عدالت کو ساقط کر دیتے ہیں اور مال میں صلاح کا یہ مطلب ہے کہ فضول خرچ نہ ہو یعنی ایسی جگہ مال خرچ نہ کرے کہ جہاں دنیا کی کوئی خوبی اور آخرت کا کوئی ثواب نہ ہو ، نیز مال کا صرف کرنا جانتا ہو کہ لین دین میں غبن نہ اٹھائے ۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر یتیموں سے رشد نہ دیکھا جائے تو ان کو مال سپرد نہ کیا جائے ۔ امام شافعی ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے لیکن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک چونکہ اٹھارہ برس سن بلوغ کی آخری حد ہیں اس لئے سات برس زائد یعنی پچیس برس کے سن تک اور انتظار کیا جائے کیونکہ سات برس کی مدت تغیر احوال کے لئے معتبر ہے ، طفل کو اس مدت میں تمیز ہو جاتی ہے اور اس پر نماز کا حکم کیا جاتا ہے پس اس قدر انتظار کر کے اس کا مال اس کے حوالے کر دیا جائیگا اگرچہ اس سے رشد نہ دیکھا جائے اور مفہوم سے استدلال کرنا ہمارے نزدیک نا تمام ہے اور اگر تسلیم بھی کیا جائے تو آیت میں لفظ رشد نکرہ ہے پس ادنی رشد جس پر بولا جاتا ہے وہ مراد ہوگا اور اس سن پر اس قدر پایا جاتا ہے ، ۳/۲ ، ۹/۷ ، ۲۹/۱۱ ۔

**رُشْدًا** ۴/۱۲ ، ۱۵/۲۱ ۔

**رَشَدًا** : راستی ، بھلائی ، نیکی ، راہ یابی ، رَشَدَ یَرْشُدُ کا مصدر ہے اس کے معنی راہ راست پانے کے ہیں ، امام راغب لکھتے ہیں :-

• بعض علماء کا بیان ہے کہ رَشَدَ یَرْشُدُ سے اخص ہے کیونکہ رشد امور دنیویہ اور اخرویہ دونوں میں استعمال ہوتا ہے اور رَشَدَ صرف

امورِ اخروی میں بولا جاتا ہے اور رَاشِدٌ اور رَشِیْدٌ دونوں کے لئے آتے ہیں ارشاد ہے اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ (وہ لوگ ہی ہیں نیک چال پر) اور مَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ (نہیں بات فرعون کی نیک چال رکھتی) "

پ ۱۵ (۱۳/۱۶)، پ ۲۹ (۱۱/۱۲) -

**رُشْدَهٗ** : اس کی راہ یابی، اس کی نیک راہ، اس کی ہدایت، رُشْدَ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۱۷ (۵) -

**رَشِیْدٌ** : نیک چال والا، بھلائی والا، شائستہ، رُشْدٌ سے بروزن فَعِیْلٌ بمعنی فاعل ہے، پ ۱۲ (۷، ۸، ۹) -

## فصل الصّاد المهملة

**رَصَدًا** : چوکیدار، نگہبان، گھات، رَصَدَ یَرْصُدُ کا مصدر ہے جس کے معنی نگاہ رکھنے اور گھات لگانے کے ہیں واضح رہے کہ مصدر مذکور اسمِ فاعل اور اسمِ مفعول دونوں کے معنی میں مستعمل ہے نیز واحد تثنیہ اور جمع سب کے لئے آتا ہے قرآن مجید میں جہاں لفظِ رَصَد کا استعمال ہوا ہے ان سب معانی کا احتمال ہے۔ پ ۲۹ (۱۱، ۱۲) -

## فصل الضاد المعجمة

**رَضَاعَةً** : دودھ پلانا، شیر خوارگی، مصدر ہے اور اس کا فعل باب ضَرَبَ، سَمِعَ اور فَتَحَ تینوں سے مستعمل ہے لغت میں اس کے معنی تھن یا پستان سے دودھ پینے کے ہیں اور شرعاً بچہ کا حقیقۃً یا حکماً وقت مخصوص میں عورت کے خالص یا ملے ہوئے دودھ کو جبکہ دودھ غالب ہو، پینے کا نام ہے [1] حکماً پینے کا مطلب حلق میں ڈالنا یا ناک کے ذریعہ پیٹ میں اتارنا ہے، پ ۲ (۱۴)، پ ۲۸ (۱۵) -

**رَضُوْا** : وہ راضی ہوئے، وہ خوش ہوئے، انہوں نے پسند کیا، رِضًى سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، راغب لکھتے ہیں :-

" بندے کا اللہ سے راضی ہونا یہ ہے کہ جو کچھ اس پر قضاءِ الٰہی جاری ہو وہ اسے مکروہ نہ سمجھے اور اللہ کا بندہ سے راضی ہونا یہ کہ اس کو اپنے حکم کا فرمانبردار اور اپنی نہی سے پرہیزگار دیکھے "۔

(ملاحظہ ہو تَرْضٰی) پ ۶ (۵)، پ ۱۰ (۱۲، ۱۷، ۱۸)، پ ۱۱ (۲، ۴)، پ ۲۵ (۳)، پ ۳۰ (۲۳) -

[1] جامع الرموز، ص ۲۱۷ (طبع نولکشور)

Marfat.com

**رِضْوَانٌ**: رضامندی، خوشنودی، مرضی، رضا، رَضِیَ یَرْضٰی کا مصدر ہے "رضا رکثیر" یعنی بڑی رضامندی اور نہایت خوشنودی کو "رِضْوان" کہتے ہیں اور چونکہ سب سے بڑی رضا اللہ کی رضا ہے اس لئے قرآنِ مجید میں "رضوان" کا لفظ جہاں بھی استعمال ہوا ہے، رضاءِ الٰہی کے لئے مخصوص ہے،

۳/۱۰ ، ۴/۹،۸ ، ۶/۱۵،۹ ، ۱۱/۲ ، ۲۷/۲۰،۱۹ ۔

**رِضْوَانًا** ۶/۵ ، ۲۶/۱۲ ، ۲۸/۴ ۔

**رِضْوَانَهٗ**: اس کی رضا، اس کی خوشنودی، رِضْوَانَ مضاف ۃ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ ہے ۶/۲۶ ۔

**رَضِیَ**: وہ راضی ہوا، وہ خوش ہوا، اس سے پسند کیا، رَضًی سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو تَرْضٰی) ۶/۷ ، ۱۱/۲ ، ۱۶/۱۵ ، ۲۶/۱۱ ، ۲۸/۳ ، ۳۰/۱۳ ۔

**رَضِيًّا**: پسندیدہ، من مانتا، رِضًی سے صفت مشبہ کا صیغہ، فَعِیْلٌ بمعنی مَفْعُوْلٌ ہے، ۱۶/۴ ۔

**رَضِیْتُ**: میں راضی ہوا، میں خوش ہوا، میں نے پسند کیا، رِضًی سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم (ملاحظہ ہو تَرْضٰی) ۶/۵ ۔

**رَضِیْتُمْ**: تم راضی ہوئے، تم خوش ہوئے، تم نے پسند کیا، رِضًی سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، ۱۰/۱۲ ، ۱۷ ۔

## فصل الطاء المهملة

**رَطْبٌ**: ہرا، تر، یَابِسٌ کی ضد ہے جس کے معنی سوکھا و خشک کے ہیں اور رُطُوْبَۃٌ جس کے معنی تر ہونے کے ہیں، صفتِ مشبہ کا صیغہ ہے، آیتِ شریفہ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (اور نہ ہرا اور نہ سوکھا جو نہیں کھلی کتاب میں) کی تفسیر میں علامہ خازن بغدادی لکھتے ہیں:-

"ابنِ عباس (رضی اللہ عنہما) کا بیان ہے کہ رطب پانی اور یابس صحرا ہے اور عطاء کہتے ہیں کہ اگنے والی اور نہ اُگنے والی چیزیں مراد ہیں، اور بعض کا قول ہے کہ رطب سے زندہ اور یابس سے مردہ مراد ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ہر شے سے عبارت ہے کیونکہ جمیع اشیاء یا رطب یا یابس" [1] ۷/۱۳

**رُطَبًا**: تازہ، خرما، تازہ کھجوریں، پکی کھجوریں، رُطَبَۃٌ واحد اور رِطَابٌ اور اَرْطَابٌ جمع الجمع، ۱۶/۵ ۔

[1] تفسیر لباب التاویل فی معانی التنزیل ، ج ۲ ، ص ۱۱۶ ۔

## فصل العین المھملۃ

**رِعَاءُ**: چرواہے، رَاعِی کی جمع جس کے معنی چرواہے کے ہیں، رَاعِی رَعْیٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو اِرْعَوْا) پ ۲۰/۶۔

**رِعَایَتِھَا**: اس کی نگاہ رکھنا، اس کو نباہنا، اس کی نگہداشت کرنا، رِعَایَۃٌ رَعٰی یَرْعٰی کا مصدر ہے بمعنی حفاظت اور نگرانی کرنے کے، مضاف ہے ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، پ ۲۷/۲۰۔

**رُعْبَ**: رعب، ہیبت، دھاک، دہشت، خوف، ڈر، رَعَبَ یَرْعَبُ کا مصدر ہے، راغب نے اس کے معنی خوف سے بھرپور ہونے کے سبب منقطع ہوجانے کے لکھے ہیں، پ ۷، ۹/۱۶، ۲۱/۱۹، ۲۸/۴۔

**رُعْبًا**، پ ۱۵/۱۵۔

**رَعْدٌ**: کڑک، گرج، گرجنے والا، یہ اصل میں مصدر ہے بمعنی گرجنے اور گرجنے کے، اس کا فعل باب نَصَرَ و فَتَحَ سے آتا ہے اور ابر کی کڑک اور گرج کے لئے بطور اسم مستعمل ہے، امام بغوی نے معالم التنزیل میں تصریح کی ہے کہ اکثر مفسرین کے نزدیک رَعْد اس فرشتہ کا نام ہے جو ابر کو ہانکتا اور چلاتا ہے[1] جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس سلسلہ میں ایک روایت منقول ہے کہ یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ بتائیے رَعْد کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ایک فرشتہ ہے جو ابر پر متعین ہے[2] پ ۱/۲، ۱۳/۸۔

**رَعَوْھَا**: انہوں نے اس کو نباہا، انہوں نے اس کی رعایت کی، انہوں نے اس کی نگہداشت کی، رَعَوْا رِعَایَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب، پ ۲۷/۲۰۔

## فصل الغین المعجمۃ

**رَغَبًا**: رغبت، توقع، رَغِبَ یَرْغَبُ کا مصدر ہے، امام راغب لکھتے ہیں:-

"رَغْبَۃٌ، رَغَبٌ اور رُغْبٰی کے معنی ارادہ یعنی خواہش میں وسعت کے ہیں، اللہ فرماتا ہے وَیَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَھَبًا (اور پکارتے تھے ہم کو توقع اور ڈر سے) پس جب رَغِبَ فِیْہِ اور رَغِبَ اِلَیْہِ کہا گیا تو یہ اس شے پر حرص کو چاہتا ہے، ارشادِ الٰہی ہے اِنَّا اِلٰی رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ (ہم اپنے رب سے آرزو رکھتے ہیں)

[1] معالم التنزیل، ج ۴، ص

[2] الاتقان، ج ۲، ص ۱۴۱

اور جب رَغِبَ عَنْہُ کہا گیا تو یہ اس سے بے رغبتی اور بیزاری کا مقتضی ہے جیسے اللہ کا قول ہے وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّۃِ اِبْرٰھٖمَ (اور کون پسند نہ رکھے دین ابراہیم کا) اور اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِھَتِیْ (کیا تو پھرا ہوا ہے میرے معبودوں سے)" ¹⁄₁۶ -

**رَغَدًا**: بافراغت، وسیع، خوب، اچھی طرح، یہ اصل میں سَمِعَ کا مصدر ہے یعنی بہت نعمت ہونے کے اور صفت مشبہ ہو کر مستعمل ہے نیز رَاغِدٌ کی جمع بھی ہے جیسے خَدَمٌ خَادِمٌ کی، آیت شریفہ فَکُلُوْا مِنْھَا حَیْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا (اور کھاتے پھرو اس میں جہاں چاہو محظوظ ہو کر) میں رَغَدًا بمعنی صفت بھی ہو سکتا ہے اور جمع بھی بمعنی رَاغِدِیْنَ کے، ۱⁄۶،۲ ۱۴⁄۲۱ -

## فصل الفاء

**رُفَاتًا**: بوسیدہ، گلا ہوا، چورا، جو چیز خشک گھاس کی طرح بوسیدہ ہو کر چورا چورا ہو جائے، رُفَات، کہلاتی ہے، رَفْتٌ سے مشتق ہے جس کے معنی چورا چورا کرنے اور ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنے کے ہیں، ۵⁄۱۱ ؁۱۵

**رَفَثَ**: عورتوں سے اختلاط کرنا، عورتوں سے بے پردہ ہونا، عورتوں کی طرف رغبت کرنا، رَفَثَ یَرْفُثُ کا مصدر ہے، اس کے معنی فحش بات کہنے اور جماع کرنے کے ہیں، قاضی بیضاوی "رفث" کے معنی بیان کرتے ہیں :-

ھو الافصاح بما یجب ان یکنی عنہ جس چیز کو کنایہ سے کہنا واجب ہے اس کو کھول کر کہنا"

ان کا بیان ہے کہ جماع سے کنایہ ہے کیونکہ جماع تقریباً رفث سے خالی نہیں ہوتا۔

زجاج نے جو ائمہ لغت میں سے ہیں اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :-

الرفث کلمۃ جامعۃ لکل ما یریدہ الرجال من النساء رفث ایک ایسا کلمہ ہے جو ہر اس چیز پر شامل ہے جس کی مرد عورتوں سے خواہش کرتے ہیں۔

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں :-

" رفث وہ کلام ہے جو جماع اور دواعی جماع یعنی جماع پر برانگیختہ کرنے والی اشیاء کے ذکر پر مشتمل ہو کر جن کا بیان کرنا قبیح سمجھا جاتا ہے

---

۱؎ تفسیر انوار التنزیل، ج ۱، ص ۵ (طبع مصر ۱۳۳۰ھ) ۲؎ تفسیر معالم التنزیل، ج ۱، ص ۱۳۶، (طبع مصر ۱۳۳۲ھ) حافظ ابن حجر نے بھی (زہری) سے یہی نقل کیا ہے الرفث اسم جامع لکل ما یرید الرجل من المرأۃ (فتح الباری، ج ۳، ص ۳۰۲)

Marfat.com

ارشادِ الٰہی أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ (حلال ہوا تم کو روزے کی رات میں بے پردہ ہونا اپنی عورتوں سے) میں رَفَث کو یہ بتلاتے ہوئے کہ اس طرف عورتوں کو بلانا اور اس معاملہ میں ان سے گفتگو کرنا جائز ہے، جماع سے کنایہ قرار دیا گیا ہے اور بذریعہ اِلٰی تعدیہ اس لئے ہوا کہ یہ افضاء کے معنی پر مشتمل ہے اور آیت فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ (تو بے پردہ ہونا نہیں عورت سے اور نہ گناہ کرنا) محتمل ہے کہ جماع کرنے سے ممانعت ہو نیز یہ کہ اس کی گفتگو سے نہی ہو کیونکہ وہ دواعی جماع میں داخل ہے اور احتمالِ اول اصح ہے۔"

حضرتِ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ :-

"حق تعالیٰ حیا والے ہیں کریم ہیں، کنایہ سے کام لیتے ہیں جہاں کہیں قرآن مجید نے مباشرۃ، ملامستہ، افضاء، دخول اور رفث کا ذکر فرمایا ہے اس سے جماع مراد لیا ہے۔" [2]

محی السنہ بغوی آیۂ شریفہ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ کی تفسیر میں رقمطراز ہیں :-

"رفث کے بارے میں علماء مختلف ہیں ابنِ مسعود ابنِ عباس اور ابنِ عمر رضی اللہ عنہم نے اس کو جماع کہا ہے اور یہی قول حسن (بصری) مجاہد عمرو بن دینار، قتادہ، عکرمہ، ربیع اور ابراہیم نخعی کا ہے اور علی بن ابی طلحہ ابنِ عباس سے راوی ہیں کہ "رفث" کے معنی عورتوں سے صحبت کرنے، بوسہ لینے، اشارے کرنے اور فحش بات کے ذریعہ عورت کو چھیڑنے کے ہیں حصین بن قیس کا بیان ہے کہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے اونٹ کی دُم پکڑی، اسے ہانکنے لگے اور ہدی گاتے ہوئے کہنے لگے ؎

وھن یمشین بنا ھمیسا
ان تصدق الطیر ننک لمیسا [3]

میں نے ان سے کہا کہ آپ حالتِ احرام میں رفث میں مبتلا ہیں، کہنے لگے رفث وہ ہے جو

---

[1] علامہ ابوجعفر بیہقی مفتاح المصادر میں تعریح کی ہے کہ یہ اسی اصول کی بنا پر ہے کہ کسی شے کو اسکی نظیر کے قائمقام کر دیا جائے پس جس طرح فضیت کا تعدیہ اِلٰی کے ذریعہ کیا جاتا ہے اسی طرح اس کا بھی تعدیہ اِلٰی کے ذریعہ ہوا۔ عہ ملاحظہ ہو افضی۔

[2] معالم التنزیل، ج ۱، ص ۱۳۶ [3] ہمیس، اونٹ کے قدم اٹھانے کی آواز کا نام ہے اور لمیس مجبور کا۔

عورتوں کے سامنے ہو، طاؤس کہتے ہیں رفث عورتوں سے جماع کی چھیڑ چھاڑ اور ان کے سامنے اس کا ذکر ہے، عطاء کا قول ہے: مرد کا حالت احرام میں عورت سے یہ کہنا کہ جب تو احرام اتاریگی تو میں تجھ سے صحبت کرونگا "رفث" ہے اور بعض کا قول ہے کہ رفث کے معنی فحش اور بیہودہ بات کے ہیں[1]۔

حافظ ابن حجر عسقلانی حدیث من حج للہ فلم یرفث ولم یفسق رجع کیوم ولدتہ امہ (جس نے اللہ کے واسطے حج کیا پھر نہ عورت سے صحبت کی نہ صحبت کی بات کی اور نہ گناہ کیا تو اس طرح واپس ہوتا ہے کہ جس دن ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا) کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

"آیت میں جمہور کے نزدیک رفث سے جماع مراد ہے اور جو ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حدیث میں رفث سے اس سے زیادہ عام مراد ہے اور اسی کی طرف قرطبی مائل ہیں اور یہی اس حدیث سے مراد ہے جو صیام کے بارے میں وارد ہے فاذا کان صوم احدکم فلا یرفث (جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو بیہودہ کلام نہ کرے[2])"۔ $\frac{۲}{۹،۷}$۔

**رِفْدٌ**: بخشش، عطا، انعام، مدد، ارفاد، اور رُفُوْدٌ جمع، $\frac{۱۲}{۹}$۔

**رَفْرَفٌ**: قالین، چاندنیاں، تکیے، علامہ زمخشری الفائق میں لکھتے ہیں:۔

"الرفرف ما کان من الدیباج وغیرہ رقیقا حسن الصبغۃ۔ رفرف دیباج وغیرہ کا باریک خوش رنگ کپڑا ہے۔

علامہ موصوف نے اس کی جامع تعریف کی ہے اور چونکہ اس کپڑے کے گدے، تکیے، چاندنیاں، خیمے اور فرش فروش تیار ہوتے ہیں اس لئے ان سب معانی میں اس کا استعمال ہوتا ہے چنانچہ امام البغوی رقمطراز ہیں:۔

"سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ رفرف جنت کے ہرے بھرے باغیچے ہیں، ابن عباس سے بھی یہی مروی ہے، اس کا واحد رفرفہ ہے اور جمع الجمع رفارف، اور بعض گدے اور فرش کو رفرف بتاتے ہیں حسن (بصری) مقاتل اور

---

[1] معالم التنزیل، ج ۱، ص ۱۵۳

[2] فتح الباری، ج ۳، ص ۳۰۲ و ۳۰۳ (طبع بیروت ۱۳۰۰ھ)

[3] الفائق فی غریب الحدیث، ج ۱، ص ۴۴۶ (طبع دائرۃ المعارف)

Marfat.com

قرطبی کا یہی قول ہے۔ عوفی، ابن عباس سے راوی ہیں کہ رفرف فرشتوں اور گدوں کا زائد حصہ ہے (غالباً جھالر) یا کپڑے کا کنارہ مراد ہے جو تخت کے چاروں طرف لٹکا رہتا ہے۔ ضحاک اور قتادہ کا بیان ہے کہ یہ فرش کے اوپر کی سبز چاندنیاں ہیں۔ ابن کیسان کہتے ہیں کہ یہ گل تکیے (جن پر رخسار سے رکھتے ہیں) ہیں۔ ابن عیینہ نہالچے بتاتے ہیں اور ان کے علاوہ دیگر علماء کی تصریح ہے کہ عرب کے نزدیک ہر بڑے عرض کا کپڑا رفرف ہے[1]"

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

"رفرف بکھرے ہوئے پتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے جو عَلٰی رَفْرَفٍ خُضْرٍ (سبز چاندنیوں پر) فرمایا ہے یہ ایک خاص قسم کے کپڑے ہیں جن کو (سبزی میں) باغات سے تشبیہ دی گئی ہے اور بعض کا قول ہے کہ رفرف میخوں اور طنابوں کے علاوہ خیمہ اور شامیانہ کے وہ کنارے ہیں جو زمین پر لٹکتے رہتے ہیں اور حسن (البصری) سے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ گل تکیے ہیں"۔ ۲۷/۱۳۔

رَفَعَ: اس نے بلند کیا، اس نے اونچا کیا، اس نے چڑھایا (فتح) رَفْعٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو تُرْفَعُ) ۳/۱، ۸/۲، ۱۳/۵ ، ۳۰/۲۔

رُفِعَتْ: وہ بلند کی گئی، رَفْعٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب، عربی میں لفظ سماء (آسمان) مؤنث مستعمل ہوتا ہے۔ ۳۰/۱۳۔

رَفَعْنَا: ہم نے بلند کیا، ہم نے اونچا کیا، ہم نے اٹھایا، رَفَعَ ماضی کا صیغہ جمع متکلم، ۱/۸،۱۱، ۶/۲، ۲۵/۹، ۳۰/۱۹۔

رَفَعْنٰهُ: ہم نے اس کو بلند کیا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے۔ ۹/۱۲

رَفَعَهُ: اس کو اٹھا لیا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے یہاں رفع سے رفع حقیقی جسمانی مراد ہے کیونکہ آیت میں اس کا تعدیہ بذریعہ اِلٰی ہے نیز سیاق اس معنی کو بتلا رہا ہے، اس معنی کا انکار بجز مکابرہ اور جہالت کے اور کوئی معنی نہیں رکھتا (ملاحظہ ہو رَفَعَ و رَافِعُكَ) ۶/۲۔

رَفَعَهَا: اس کو بلند کیا، اس کو اونچا کیا، اس میں ھا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے، ۲۷/۱۱۔

رَفِيْعٌ: بلند کرنے والا، بلند ہونے والا، رَفْعٌ سے بروزن فَعِيْلٌ بمعنے فاعل یعنی رَافِعٌ بھی ہو سکتا

[1] معالم التنزیل، ج ۷، ص ۱۲

Marfat.com

ہے بمعنی بلند ہونے والے اور بلند کرنے والے کے اور بمعنی مفعول یعنی مرفوع بھی بمعنی بلند کئے ہوئے کے رَفِیْعُ الدَّرَجٰتِ اسماءِ حسنیٰ میں سے ہے اس کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں، بلند مرتبوں والے کے بھی اور درجوں کے بلند کرنے والے کے بھی، ۲۴/۲ ۔

**رَفِیْقًا**: رفیق، بِرِفَاقَۃٍ سے جس کے معنی رفیق ہونے اور بلطف پیش آنے کے ہیں بروزن فَعِیْلٌ صفتِ مشبہ کا صیغہ ہے رُفَقَآءُ جمع، خازن بغدادی لکھتے ہیں:۔

"رفیق کے معنی صاحب (ساتھی) کے ہیں صاحب کا نام رفیق اس لئے پڑا کہ ہم اس سے اور اس کی صحبت سے نفع اندوز ہوتے ہیں اور رفیق حالانکہ جمع کی صفت واقع ہے مگر اس کو واحد لایا گیا کیونکہ عرب اسے واحد اور جمع دونوں میں استعمال کرتے ہیں[1]"، ۵/۶

# فصل القاف

**رَقٌّ**: کاغذ، ورق، جھلی۔ راغب لکھتے ہیں:۔

"کاغذ کی طرح جس میں لکھا جائے اس کا نام "رق" ہے، قاضی بیضاوی نے لکھا ہے کہ رق وہ جھلی ہے جس میں لکھا جاتا ہے[2]۔ رُقُوْق جمع، ۲۷/۴۔

**رِقَابٌ**: گردنیں، رَقَبَۃٌ کی جمع ہے ۶/۲۶ ۵/۲۶۔

**رَقَبَۃٌ**: گردن، جان، غلام، رَقَبَۃٌ اصل میں گردن کا نام ہے پھر جملہ بدن انسانی کے لئے اس کا استعمال ہونے لگا اور عرف میں یہ غلاموں کا نام پڑ گیا جس طرح کہ الفاظ رأس اور ظہر کا استعمال سواریوں کے لئے کیا جانے لگا۔ ۵/۱۰ ۷/۲ ۲۵/۱ ۳۰/۱۵۔

**رُقُوْدٌ**: خفتہ، سونے والے، رَاقِدٌ کی جمع ہے جیسے سَاجِدٌ کی سُجُوْدٌ، راقد رقود سے، جس کے معنی سونے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ہے، ۱۵/۱۵۔

**رَقِیْبٌ**: نگہبان، خبر رکھنے والا، محافظ، مطلع، منتظر، راہ دیکھنے والا، رُقُوْبٌ سے جس کے معنی نگاہ رکھنے اور نگرانی کرنے کے ہیں، بروزن فَعِیْلٌ صفتِ مشبہ کا صیغہ، راغب لکھتے ہیں:۔

"رقیب حافظ یعنی نگران کو کہتے ہیں یا تو اس لئے

[1] لباب التاویل، ج۱، ص ۳۰۵ ملاحظہ ہو معالم التنزیل، ج۲، ص ۲۰۶

[2] تفسیر انوار التنزیل، ج۲، ص ۲۸۵، امام بغوی نے بھی یہی لکھا ہے

Marfat.com

کہ وہ شخص محفوظ کی گردن کی حفاظت کرتا ہے، اور یا اس لئے کہ وہ اپنی گردن اٹھائے رہتا ہے“

نیز رقیب، حق تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے جب یہ ذات باری کی صفت واقع ہو تو اس کے معنی ہیں :-

هو الذی لا یغفل — ”رقیب“ وہ ذات ہے جو اپنی
عما خلق فیلحقہ — مخلوق سے غافل نہیں ہوتی اسے
نقصا و یدخل — نقصان پہنچے یا اس سے غفلت
علیہ خلل من قبل — کی بنا پر اس میں خلل واقع
غفلتہ عنہ۔ — ہو جائے۔

یہ امام حلیمی کا بیان ہے، زجاج کہتے ہیں :-

” رقیب وہ نگران ہے جس سے کوئی چیز غائب نہ ہو، ارشادِ الٰہی ہے مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (نہیں بولتا کوئی بات مگر نزدیک اس کے نگہبان ہیں تیار (الدا)) اسی سے ماخوذ ہے “

امام بیہقی نے ان دونوں اقوال کو کتاب الاسماء و الصفات میں نقل کیا ہے [1]۔ پ ۶/۷، ۱۲/۸، ۲۶/۱۶۔

رَقِيبًا ۴/۱۲، ۱/۳۔

رُقِيَّ : تیرا چڑھنا، رُقِيَ رَقِيَ يَرْقَى کا مصدر ہے اس کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں، مضاف ہے ک ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ، پ ۱۵/۱۰۔

رَقِيم : نوشتہ، کتبہ، لکھا ہوا، ایک شہر کا نام جو ملک شام کے اطراف میں بجانب شمال واقع تھا

امام راغب مفردات میں لکھتے ہیں :-

” کہا گیا ہے کہ رقیم مقام کا نام ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ (یعنی اصحاب الکہف والرقیم) اس پتھر کی طرف منسوب ہیں جس پر ان کے نام تحریر تھے “

امام محی السنۃ ابو محمد حسین فراء بغوی معالم التنزیل میں فرماتے ہیں :-

” رقیم کے بارے میں مفسرین مختلف ہیں۔ سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ یہ وہ تختی ہے جس میں ”اصحاب کہف“ کے نام اور ان کے حالات لکھے گئے (بغوی کہتے ہیں) یہ سب اقوال میں ظاہر تر ہے، پھر اس تختی کو لوگوں نے کہف کے دروازہ پر نصب کر دیا، یہ تختی سیسہ کی تھی اور بعض کا قول ہے کہ پتھر کی تھی، اس صورت میں رقیم بمعنی مرقوم یعنی مکتوب (نوشتہ) ہے ،

[1] ملاحظہ ہو کتاب الاسماء والصفات، ص ۵۹ (طبع انوار احمدی، الہ آباد)

اور رقم کے معنے کتابت کے ہیں اور ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے مروی ہے کہ انہوں نے ایسے وادی کا نام بتایا ہے جس میں 'اصحاب الکہف' ہیں، اس صورت میں یہ رقمۃ الوادی سے ماخوذ ہے جس کے معنی وادی کے کنارہ اور جانب کے ہیں اور کعب احبار کا بیان ہے کہ یہ اس بستی کا نام ہے جہاں سے "اصحاب کہف" نکلے تھے اور بعض کا قول ہے کہ اس پہاڑ کا نام ہے جس میں کہف تھا۔[1]

واضح رہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس سلسلہ میں تین اقوال مروی ہیں، ایک تو یہی جس کو امام بغوی نے ذکر کیا اور ابن ابی حاتم بطریق عوفی ان سے راوی ہیں کہ 'رقیم' فلسطین سے ورے عقبان وایلہ کے درمیان ایک وادی ہے[2] دوسرا وہ جس کو عبد بن حمید نے بطریق سعید بن جبیر ان سے روایت کیا ہے کہ رقیم سیسہ کی تختی تھی، جس میں ان کے حکمران نے ان لوگوں کے نام لکھ کر اس کو اپنے خزانہ میں داخل کر لیا تھا، امام بخاری نے بھی اس روایت کو اپنی صحیح میں تعلیقاً ذکر کیا، ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس روایت کی اسناد کو بخاری کی شرط پر صحیح بتایا ہے، تیسرا وہ جس کو ابن مردویہ نے بطریق عکرمہ ان سے نقل کیا ہے کہ میں رقیم سے واقف نہ تھا پھر میں نے اس کے متعلق دریافت کیا تو مجھے بتایا گیا کہ یہ وہ بستی تھی جس سے وہ لوگ نکلے ہیں، حافظ ابن حجر اس روایت کی اسناد کو ضعیف بتاتے ہیں[3] طبری نے قتادہ اور عطیہ عوفی سے روایت کیا ہے کہ 'رقیم' اس وادی کا نام ہے جس میں کہف واقع تھا، ابو عبیدہ کا بھی یہی قول ہے، ابن ابی حاتم حضرت انس رضی اللہ عنہ اور سعید بن جبیر سے راوی ہیں کہ رقیم کتے کا نام ہے[4] اور علامہ سیوطی نے الاتقان میں ابن ابی حاتم ہی کے حوالہ سے انہی سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ یہ ایک وادی ہے[5]، واللہ اعلم۔

واضح رہے کہ اس بارے میں صحیح تر قول حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول اول ہے، انہوں نے جو اس کا جائے وقوع فلسطین سے ورے عقبہ وایلہ کے درمیان بیان

[1] معالم التنزیل، ج ۳، ص ۱۵۰ برحاشیہ خازن
[2] ملاحظہ ہو فتح الباری، ج ۸، ص ۳۰۸
[3] الاتقان، ج ۲، ص ۱۴۲ (طبع مصر)
[4] ایضاً، ج ۶، ص ۳۶۵ [5] الاتقان، ج ۲، ص ۱۴۲ طبع

Marfat.com

فرمایا ہے، موجودہ اکتشافات اثریہ نے اس کی حرف بحرف تصدیق کی ہے، ہم سابق میں اصحاب الکھف والرقیم کی بحث میں لکھ چکے ہیں کہ رقیم اس شہر کا نام ہے جہاں یہ واقعہ پیش آیا مفسرین سلف کی اکثریت اسی طرف گئی ہے اور چونکہ کہف یعنی غار اسی رقیم میں واقع تھا اس لئے قرآن مجید نے ان لوگوں کا ذکر اصحاب الکھف والرقیم کے الفاظ میں کیا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، کعب، احبار، قتادہ، عطیہ عوفی اور ابوعبیدہ کی تصریحات ابھی آپ کی نظر سے گزریں کہ وہ سب اس کو ایک مقام کا نام بتاتے ہیں فرق اتنا ہے کہ کوئی اسے بستی اور شہر کا نام قرار دیتا ہے اور کوئی وادی کا، لیکن درحقیقت یہ کوئی فرق نہیں کیونکہ شہر اور اس کی وادی یعنی حوالی شہر سب ایک ہی نام سے موسوم ہوتے ہیں مگر چونکہ اس شہر کا نام بدل کر بعد میں دوسرا رکھ دیا گیا اور اس کا اصلی نام مشہور نہ رہا اس لئے بعض اہل تفسیر کا ذہن اس جانب منتقل نہ ہو سکا کہ کسی شہر کا نام ہے اور انہوں نے رقیم سے اس کے لغوی معنی نوشتہ اور کتبہ کے مراد لئے یا پھر قیاس سے کام لیکر اسے اصحاب کہف کا کتبہ سمجھ لیا۔ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی فرماتے ہیں :-

"الرقیم" اس کو عبرانی میں "سلاع" اور یونانی میں "پٹرا" کہتے ہیں، یہ شمالی عرب میں پہلے مدیانی حکومت کے ماتحت ایک دارالامارۃ تھا پھر نبطی عربوں کا دارالحکومت ہوا، رومیوں کے عہد میں بھی اس کو خاص اہمیت ملی۔" [1]

اور مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان القرآن میں رقمطراز ہیں :-

"قرآن نے کہف کے ساتھ الرقیم کا لفظ بھی بولا ہے اور بعض ائمہ تابعین نے اس کا یہی مطلب سمجھا تھا کہ یہ ایک شہر کا نام ہے لیکن چونکہ اس نام کا کوئی شہر عام طور پر مشہور نہ تھا اس لئے اکثر مفسرین اس طرف چلے گئے کہ یہاں رقیم کے معنی کتابت کے ہیں یعنی ان کے غار پر کوئی کتبہ لگایا تھا اس لئے کتبہ والے مشہور ہو گئے۔

لیکن اگر انہوں نے تورات کی طرف رجوع کیا ہوتا تو معلوم ہو جاتا کہ رقیم وہی لفظ ہے جسے تورات میں راقیم کہا گیا ہے اور یہ فی الحقیقت ایک شہر کا نام تھا جو آگے چل کر پٹرا کے نام سے

[1] ارض القرآن، ج ۱، ص ۴۲، (طبع معارف اعظم گڈھ ۱۳۴۲ھ)

Marfat.com

مشہور ہوا اور عرب اسے 'بطرا' کہنے لگے۔

عالمگیر جنگ کے بعد آثار قدیمہ کی تحقیقات کے جو نئے نئے گوشے کھلے ہیں ان میں ایک 'پیٹرا' بھی ہے اور اس کے انکشافات نے بحث و نظر کا ایک نیا میدان مہیا کر دیا ہے۔

جزیرہ نمائے سینا اور خلیج عقبہ سے سیدھے شمال کی طرف بڑھیں تو دو پہاڑی سلسلے متوازی شروع ہو جاتے ہیں اور سطح زمین بلندی کی طرف اٹھنے لگتی ہے۔ یہ علاقہ نبطی قبائل کا علاقہ تھا اور اسی کی ایک پہاڑی سطح پر راقیم نامی شہر آباد تھا، دوسری صدی عیسوی میں جب رومیوں نے شام اور فلسطین کا الحاق کر لیا تو یہاں کے دوسرے شہروں کی طرح راقیم نے بھی ایک رومی نو آبادی کی حیثیت اختیار کر لی اور یہی زمانہ ہے جب پیٹرا کے نام سے اس کے عظیم الشان مندروں اور تھیٹروں کی شہرت دور دور تک پہنچی، ۶۳۴ء میں جب مسلمانوں نے یہ علاقہ فتح کیا تو راقیم کا نام بہت کم زبانوں پر رہا تھا، یہ رومیوں کا پیٹرا اور عربوں کا بطرا تھا۔

جنگ کے بعد سے اس علاقہ کی از سر نو اثری پیمائش کی جا رہی ہے اور نئی نئی باتیں روشنی میں آ رہی ہیں، از اں جملہ اس علاقہ کے عجیب و غریب غار ہیں جو دور دور تک چلے گئے ہیں اور نہایت وسیع ہیں، نیز اپنی نوعیت میں ایسے واقع ہوئے ہیں کہ دن کی روشنی کسی طرح بھی ان کے اندر نہیں پہنچ سکتی، ایک غار ایسا بھی ملا ہے جس کے دہانہ کے پاس قدیم عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں اور بے شمار ستونوں کی کرسیاں شناخت کی گئی ہیں، خیال کیا گیا ہے کہ کوئی معبد ہو گا جو یہاں تعمیر کیا گیا تھا۔

اس انکشاف کے بعد قدرتی طور پر یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ اصحاب کہف کا واقعہ اسی شہر میں پیش آیا تھا اور قرآن نے صاف صاف اس کا نام الرقیم بتلا دیا ہے اور جب اس نام کا ایک شہر موجود تھا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ رقیم کے معنی میں تکلفات کئے جائیں اور بغیر کسی بنیاد کے اسے کتبہ پہ محمول کیا جائے۔

علاوہ بریں دوسرے قرائن بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔

قرآن نے جس طرح اس واقعہ کا ذکر کیا ہے

Marfat.com

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی عرب میں شہرت تھی، لوگ اس بارے میں بحثیں کیا کرتے تھے اور اسے ایک نہایت ہی عجیب و غریب بات تصور کرتے تھے، اب یہ ظاہر ہے کہ مشرکینِ عرب کے وسائلِ معلومات محدود تھے، بہت کم امکان ہے کہ دور کی بحثیں ان کے علم میں آئی ہوں، پس ضروری ہے کہ یہ قریب جوار ہی کی کوئی بات ہو اور ان لوگوں کی زبانی سنی جا سکے جن سے عربوں کا ملنا جلنا رہتا ہو ایسے لوگ کون ہو سکتے تھے؟ اگر اسے پیٹرا کا واقعہ قرار دیا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے، اول تو خود یہ مقام عرب سے قریب تھا یعنی عرب کی سرحد سے ساٹھ ستر میل کے فاصلہ پر، ثانیاً نبطیوں کی وہاں آبادی تھی اور نبطیوں کے تجارتی قافلے برابر حجاز آتے رہتے تھے، یقیناً نبطیوں میں اس واقعہ کی شہرت ہوگی اور ان ہی سے عربوں نے سنا ہوگا، خود قریش مکہ کے تجارتی قافلے بھی ہر سال شام جایا کرتے تھے اور سفر کا ذریعہ وہی شاہراہ تھی جو رومیوں نے ساحل خلیج سے لے کر ساحل مارمورا تک تعمیر کر دی تھی[1]۔ پیٹرا اسی شاہراہ پر واقع تھا بلکہ اس نواح کی سب سے پہلی تجارتی منڈی تھی، اس لئے اس سے زیادہ قدرتی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ واقعہ ان کے علم میں آ گیا ہو۔"[2]

(مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اَصْحٰبُ الْکَهْفِ وَالرَّقِیْمِ) $\frac{15}{12}$ -

## فصل الکاف

**رِکَابٌ**: اونٹ سواری، رُکُوْبٌ سے اسم ہے، قاضی بیضاوی نے تصریح کی ہے کہ "رِکاب" اونٹ کی سواری ہے جس طرح راکب کا استعمال شتر سوار کے لئے غالب ہے، اسی طرح اس کا استعمال اونٹ کے معنی میں غالب ہے[3]، اس کا واحد راحِلَۃٌ ہے (علی غیر لفظہٖ) اور رُکُبٌ، رَکَائِبُ اور رِکَابَاتٌ جمع ہے (ملاحظہ ہو ر ک ب) $\frac{25}{4}$ -

[1] جنگ کے بعد اس شاہراہ کا سراغ لگایا گیا تو پوری طرح نمایاں ہو گئی، اب یہ اپنے اصلی خط پر دوبارہ تعمیر کی جا رہی ہے اور عقبہ سے عمان تک تعمیر ہو چکی ہے، آجکل جہاں عقبہ ہے وہاں قدیم زمانہ میں ایسیون جابر آباد تھا جہاں سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے جہاز ہندوستان جایا کرتے تھے اور بحر احمر کے تجارتی بیڑے کا مرکز تھا (حاشیہ ترجمان القرآن)

[2] ترجمان القرآن، ج ۲ ص ۳۹۳، ۳۹۴ (طبع مدینہ پریس بجنور)

[3] انوار التنزیل، ج ۲ ص ۳۱۲ (طبع مصر)

**رُكَامًا**: توبرتو، تہ بہ تہ، رَكْمٌ سے جس کے معنی تہ بہ تہ اکٹھا کرنے کے ہیں، اسم ہے، ۱۵/۱۲ -

**رَكْبٌ**: کارواں، قافلہ، سوار، رَاكِبٌ کی جمع جس کے معنی سوار کے ہیں، رَاكِبٌ رُكُوْبٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ہے عرف میں اس کا استعمال شتر سوار کے لئے مخصوص ہے عرب کا قافلہ چونکہ بیشتر شتر سواروں پر مشتمل ہوتا ہے اس لئے کارواں کے معنی میں بھی مستعمل ہے، ۸/۱ -

**رَكِبَا**: وہ دونوں سوار ہوئے، رُكُوْبٌ سے ماضی کا صیغہ تثنیہ مذکر غائب (ملاحظہ ہو رَكْبٌ) ۱۵/۲۲ -

**رُكْبَانًا**: سوار، رَاكِبٌ کی جمع ہے یہاں عام سوار مراد ہیں، شتر سوار مخصوص نہیں، ۲/۱۵ -

**رَكَّبَكَ**: اس نے تجھے جوڑ دیا، اس نے تیری ترکیب دی، رَكَّبَ تَرْكِيْبٌ سے جس کے معنی ترکیب دینے، ملانے اور جوڑ دینے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ک ضمیر واحد مذکر حاضر، ۳۰/۱ -

**رَكِبُوْا**: وہ سوار ہوئے، رُكُوْبٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب (ملاحظہ ہو رَكْبٌ) ۲۱/۲ -

**رِكْزًا**: بھنک، کھٹکا، پوشیدہ آواز، اسم ہے، ۱۶/۹ -

**رُكَّعٌ**: رکوع کرنے والے، رَاكِعٌ کی جمع (ملاحظہ رَاكِعًا) ۱۱/۲ رُكَّعًا ۲۶/۱۲ -

**رُكْنٍ**: آسرا، زور، قوت، کسی شے کی وہ جانب جس کا آسرا لیا جائے "رکن" کہلاتی ہے، استعارۃً زور و قوت کے لئے اس کا استعمال ہوتا ہے یہاں رکن سے مراد محکم قلعہ یا زوردار قبیلہ ہے، ۱۲/۷ -

**رُكْنِهٖ**: اس کی قوت، اس کا زور، رُكْنِ مضاف ہ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ۲۷/۱ -

**رُكُوْبِهِمْ**: ان کا سوار ہونا، رُكُوْبٌ مضاف ھِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، (ملاحظہ ہو رَكْبٌ) ۲۳/۴ -

## فصل المیم

**رِمَاحُكُمْ**: تمہارے نیزے، رِمَاحُ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، رِمَاحٌ رُمْحٌ کی جمع ہے جس کے معنی نیزے کے ہیں، ۷/۲ -

**رَمَادٍ**: راکھ، خاکستر، اسم ہے، اَرْمِدَةٌ جمع، ۱۳/۱۵

**رُمَّانٌ**: انار، رُمَّانَةٌ مؤنث، ۸/۱۸ ۲۷/۱۳ -

**رَمْزًا**: اشارہ، ایماء، رُمُوْزٌ جمع، امام راغب لکھتے ہیں:-

"رَمز کے معنی ہیں لبوں سے اشارہ کرنے، مخفی

Marfat.com

آواز اور ابرو کے ذریعہ ایما کے نیز ہر وہ بات جو اشارہ کی طرح ہو اسے "رمز" سے تعبیر کیا گیا ہے جس طرح کہ شکایت کی تعبیر "غمز" سے کی گئی ہے ۳/۱۲

**رَمَضَانَ** : رمضان شہر مبارک مہینہ کا نام جو قمری سال کا نواں مہینہ ہے جس میں روزے رکھے جاتے ہیں، ابوالخیر طالقانی نے اپنی کتاب خطائر القدس میں اس ماہ کے ساٹھ نام ذکر کئے ہیں[۱] مجاہد کا قول ہے کہ "رمضان" اسماءِ الٰہی میں سے ہے جس طرح "شہر اللہ" کہتے ہیں، اسی طرح "شہر رمضان" کہا جاتا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ رمضان مہینہ کا نام ہے[۲]، قاضی بیضاوی لکھتے ہیں :-

"رمضان، رمض کا مصدر ہے جو جلنے اور سوختہ ہونے کے لئے آتا ہے پھر اس کی طرف شہر کی اضافت کی گئی اور اسے علم قرار دیا گیا اور بوجہ علمیت و الف نون غیر منصرف ہوا جس طرح کہ ابن دایہ" میں جو کوے کا نام ہے، لفظ "دایہ" بربنائے علمیت و تانیث غیر منصرف ہے اور اس ماہ کو "رمضان" سے یا تو اس لئے موسوم کیا کہ اس ماہ میں بھوک پیاس کی سوزش سے سوختہ ہوتے تھے یا اس لئے کہ گناہ اس میں جل جاتے ہیں اور یا اس لئے کہ جب ان لوگوں نے قدیم زبان سے مہینوں کے نام منتقل کئے تو یہ مہینہ گرمی کی سخت تمازت کے زمانہ میں واقع ہوا[۳]۔ ۲/۷

**رَمٰی** : اس نے پھینکا، رَمْی سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو تحتِ رمی) ۹/۱۶

**رَمَیْتَ** : تو نے پھینکا، رَمْی سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر، ۹/۱۶

**رَمِیْمٌ** : استخوانِ بوسیدہ، گلی ہوئی ہڈی، رِمَّۃ سے جس کے معنی ہڈیوں کے بوسیدہ ہو جانے کے ہیں، صفتِ مشبہ کا صیغہ، آرِمَّاءُ اور رِمَامٌ جمع، ۲۳/۴، ۲۷

## فصل الواو

**رَوَاحُهَا** : اس کی شام کی سیر، اس کی شام کی منزل رَوَاح، رَاحَ یَرُوْحُ کا مصدر ہے جس کے معنی شام کرنے اور شام کے وقت چلنے کے ہیں، راغب نے لکھا ہے کہ رَوَاح کے معنی سہولت اور آسانی کے ہیں اور بطور استعارہ اس کا استعمال نصف النہار کے بعد سے اس وقت کے لئے

---

[۱] فتح الباری ج ۴ ص ۸۷۔ [۲] معالم التنزیل ج ۱ ص ۳۰ برحاشیہ خازن۔ [۳] انوار التنزیل ج ۱ ص ۲۳۷۔

ہوتا ہے جس میں انسان چلتا ہے بہر حال یہ غُدُوٌّ
اور مَسَاءٌ کا مقابل ہے اور اس کا استعمال شام
یا زوال سے لے کر رات تک کے لئے ہوتا ہے یہاں
رواح سے شام کی منزل یعنی زوال سے لے کر
غروبِ آفتاب تک چلنا مراد ہے ۱۲/۳۴

رَوَاسِیَ : بوجھ، پہاڑ، رَاسِیَۃ کی جمع،
"رواسی" کا استعمال ٹھہرے ہوئے پہاڑوں کے
لئے ہوتا ہے (ملاحظہ ہو رَسِیت) [illegible]
[illegible] ۔

رَوَاکِدَ : ایستادہ، ٹھہری ہوئیں، رکتی ہوئیں،
رَاکِد کی جمع جو رُکُود سے ہے جس کے معنی اپنی جگہ پر
برقرار رہنے اور اپنے مقام پر ٹھہر جانے کے ہیں اسم
فاعل کا صیغہ واحد مذکر ہے۔ رُکُود کا استعمال عام
طور پر کشتی، ہوا، پانی اور زلزلہ و آفتاب کے لئے ہوتا
ہے ۲۵

رَوْح : فیض، رحمت، راحت۔ مصدر ہے اس کا
فعل نَصَرَ اور سَمِعَ سے آتا ہے۔ راغب نے اس کے
معنی تنفس یعنی سانس لینے کے بیان کئے ہیں اور
لکھا ہے کہ رَوْح سے وسعت کا تصور پیدا کیا گیا
چنانچہ کہا گیا قصعۃ روحاء یعنی وسیع پیالہ اور

ارشادِ الٰہی ہے وَلَا تَیْأَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ (رحمت) ناامید
ہو اللہ کے فیض سے) یعنی اللہ کی کشائش اور رحمت
سے کیونکہ یہ بھی رَوْح کا ایک جزو ہے۔ بات یہ ہے کہ
چونکہ تنفس باعثِ فرحت و راحت اور سببِ رحمت ہے
اور اسی کے ذریعہ خوشبو کا احساس ہوتا ہے اس لئے
فرحت، تازگی، آسائش، خوشبو، نسیم کی خنکی اور خوش آئند
ہوا کے لئے اس کا استعمال عام ہے چنانچہ امام البغوی
نے مجاہد سے راحت کے اور سعید بن جبیر سے فرحت
کے اور ضحاک سے مغفرت و رحمت کے معنی نقل
کئے ہیں[۱] اور بیہقی نے کتاب الایمان میں مجاہد سے
رَوْح کے معنی جنت اور ہوائے خوش آئند کے
روایت کرتے ہیں[۲] ۱۲/۸۷

رُوْح : روح، جان، جبیب کی بات، فیض غیبی، وحی،
قرآن، فرشتہ۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:-
رَوْح اور رُوْح اصل میں ایک ہیں اور روح
کو نفس یعنی سانس کا نام قرار دیا گیا ہے شاعر
آگ کے بارے میں کہتا ہے ؎

فقلت لہ ارفعھا الیک واحیھا
بروحک واجعلھا لھا قیتۃ قدرا

میں نے اس سے کہا کہ اس آگ کو اپنی طرف

[۱] ملاحظہ ہو معالم التنزیل، ج ۷، ص ۲۳
[۲] فتح الباری، ج ۶، ص ۲۲۸

Marfat.com

اٹھا کر اپنے سانس سے اس کو زندہ کردے اور اس کی مقررہ غذا اسے بہم پہنچا دے۔

یہ اس بنا پر ہے کہ سانس بھی روح ہی کا ایک جزو ہے، تیسرا ایسا ہی ہے جس طرح پر کہ نوع کو اہم جنس سے موسوم کر دینا جیسے انسان کو حیوان کہہ دینا، نیز روح کو اس جزو کا بھی نام قرار دیا گیا جس کے ذریعہ زندگی، حرکت، منفعتوں کا حصول اور مضرتوں کا دفاع حاصل ہوتا ہے ارشادِ الٰہی وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ۖ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي (اور تجھ سے پوچھتے ہیں روح کو، تو کہہ! روح ہے میرے رب کے حکم سے) اور نَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي (اور پھونک دول اس میں اپنی جان سے) میں اسی روح کا مذکور ہے اور اپنی ذات کی طرف اس کی نسبت باعتبار ملکیت ہے اور اس نسبت سے تخصیص اس کی شرافت و عظمت کے لئے ہے جس طرح ارشاد ہے وَطَهِّرْ بَيْتِيَ (اور میرے گھر کو پاک رکھ) اور يَا عِبَادِيَ (اے میرے بندو) نیز اشراف ملائکہ ارواح سے موسوم کئے گئے جیسے يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ (جس دن کھڑا ہو فرشتہ روح نامی اور سب فرشتے صف باندھ کر) اور تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ (اترتے ہیں فرشتے اور روح) یعنی جبرئیل اور نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ (اس کو روح الامین لیکر اترا ہے) جبرئیل اسی نام سے موسوم ہیں اور قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ (تو کہہ اس کو اتارا ہے پاک فرشتے نے) اور أَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ (اور ہم نے زور دیا اس کو روح پاک سے) میں ان کا نام "روح القدس" لیا اور ارشادِ الٰہی وَرُوحٌ مِّنْهُ (اور روح ہے اس کے ہاں کی) میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام "روح" سے موسوم ہوئے کیونکہ وہ مردوں کو جلاتے تھے اور آیت شریفہ وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا (اور اسی طرح ہم نے وحی کی تمہاری طرف قرآن کی اپنے حکم سے) میں قرآن کا نام "روح" رکھا گیا کیونکہ قرآن اس حیاتِ اخروی کا سبب ہے جس کا بیان آیت وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (اور پچھلا گھر جو ہے سو وہی ہے زندگانی) میں ہے۔"

شیخ جلال الدین سیوطی تحریر فرماتے ہیں :-

"لفظِ روح متعدد معانی کے لئے استعمال ہوا ہے :

(۱) امر وَرُوحٌ مِّنْهُ (اور اس کا امر ہے) (۲) وحی يُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ (اتارتا ہے فرشتے وحی لیکر)

(۳) قرآن: اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا
(ہم نے وحی کی تیری طرف قرآن کی اپنے حکم سے)
(۴) رحمت: وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (اور ان کی مدد
کی اپنی رحمت سے) (۵) حیات: فَرَوْحٌ وَّ
رَيْحَانٌ (پس زندگی ہے اور روزی ہے) (۶)
جبرئیل: فَاَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا (پھر بھیجا ہم نے
اس کی طرف اپنا فرشتہ) نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ
(اس کو فرشتہ معتبر لے کر اترتا ہے) (۷) ایک
عظیم المرتبت فرشتہ: يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ (جس
دن کھڑا ہو فرشتہ روح نامی) (۸) ایک خاص
فرشتوں کا لشکر: تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ
فِيْهَا (اترتے ہیں فرشتے اور ان کا خاص لشکر اس
میں) (۹) روح جان: وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ
(اور تجھ سے پوچھتے ہیں جان کے متعلق)[۱]

امام ابوبکر احمد بن الحسین البیہقی کتاب الاسماء والصفات میں
بعض مفسرین سے ناقل ہیں:

روح کبھی بمعنی رحمت آتی ہے فرمایا اللہ عزوجل نے
وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ یعنی اپنی رحمت سے
ان کو تقویت دی، اور ارشاد ہے فَنَفَخْنَا فِيْهِ
مِنْ رُّوْحِنَا، پھر اس میں ہم نے اپنی روح پھونک
دی) یعنی اپنی رحمت اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو
روح اللہ کہا جاتا ہے یعنی جو ان پر ایمان لائے
ان کے لئے رحمت الٰہی ہیں، اور یہ بھی کہا گیا ہے
کہ کبھی "روح" بمعنی وحی ہوتی ہے، اللہ عزوجل
فرماتا ہے يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ
يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (اتارتا ہے وحی اپنے حکم
سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں) اور فرمایا
وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا
(اور اسی طرح وحی کی ہم نے تیری طرف روح کی اپنی
طرف سے) نیز ارشاد ہے يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ
بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ (اتارتا ہے فرشتے وحی لیکر
اپنے حکم سے) کہ یہاں "روح" سے وحی مراد ہے
اور وحی "روح" سے اس لئے موسوم ہے کہ وہ
(مرگ) جہالت کی حیات ہے اور اسی لئے حضرت مسیح
عیسیٰ بن مریم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا نام "روح"
ہوا کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ ان کے متبعین
کو ہدایت فرما کر کفر وضلالت (کی موت) سے
زندگی بخشتا ہے، اور فرمایا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ
رُّوْحِنَا یعنی وہ ہمارے ایک کُن کے کہہ دینے
سے بغیر باپ کے بشر بن گیا، نیز حضرت جبرئیل

[۱] بعض نے روح بالضم پڑھا ہے

[۲] ملاحظہ ہو الاتقان - ج ۱ ص ۱۴۳ (طبع مصر)

علیہ السلام کو روح القدس سے موسوم کیا گیا، ارشاد ہے: قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ، نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ، أَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ، فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا ہر سب جگہ جبریل علیہ السلام مراد ہیں اور فرمایا تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا (اترتے ہیں فرشتے اور روح اس میں) بعض کا قول ہے کہ اس سے جبریل علیہ السلام مراد ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ وہ فرشتہ معظم مراد ہے جو آیہ شریفہ يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا میں مراد ہے۔" ص ۲۶۴[1]

آیت شریفہ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي کی تفسیر میں امام بیہقی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے راوی ہیں کہ یہ ایک فرشتہ ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ یہ فرشتوں میں ایسا فرشتہ ہے جس کے ستر ہزار منہ ہیں، ہر منہ میں ستر ہزار زبانیں ہیں، ہر زبان کی ستر ہزار بولیاں ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتا رہتا ہے، حق تعالیٰ ہر تسبیح سے ایک فرشتہ پیدا کرتے ہیں جو قیامت تک فرشتوں کے ہمراہ اڑتا رہتا ہے[2] امام خطابی فرماتے ہیں:-

"ارواح میں سے جس روح کے متعلق سوال ہوا اس کے بارے میں علماء مختلف ہیں، بعض کہتے ہیں، یہاں جبریل علیہ السلام مراد ہیں اور بعض کا قول ہے کہ وہ فرشتوں میں ایک خاص صنف کا فرشتہ ہے جس کے متعلق ان کا بیان ہے کہ وہ عظیم الخلقت ہے اور اکثر اہلِ تاویل اس طرف گئے ہیں کہ سوال اس روح کے متعلق کیا تھا جس سے حیاتِ جسم وابستہ ہے اور ان میں اہلِ نظر کا یہ بیان ہے کہ روح کی کیفیت کو دریافت کیا تھا کہ کس طرح بدن میں یہ چلتی ہے اور جسم میں اس کے امتزاج اور حیات کے اس سے وابستہ ہونے کی صورت ہے۔"

امام قرطبی لکھتے ہیں:-

"راجح یہی ہے کہ انہوں نے روح انسانی کے متعلق سوال کیا تھا کیونکہ یہود حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے روح اللہ ہونے کے قائل نہیں، اور اس سے ناواقف نہیں کہ جبریل ایک فرشتہ ہے اور ملائکہ ارواح ہیں۔"[3]

علامہ ابن قیم نے کتاب الروح میں اس کو ترجیح دی ہے جس کا آیت شریفہ يَوْمَ يَقُومُ

[1] الاسماء والصفات ص ۲۶۵ [2] الاسماء والصفات، ص ۲۶۵ [3] فتح الباری، ج ۸، ص ۴۰۳

Marfat.com

الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا میں مذکور ہے ان کا بیان ہے کہ ارواحِ بنی آدم کو قرآن میں نفس کے علاوہ اور کسی نام سے موسوم نہیں کیا گیا لیکن حافظ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں کہ یہ چیز ان کے مدعا پر دلالت نہیں کرتی بلکہ راجح قول اول ہی ہے کیونکہ طبری بطریق عوفی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس قصہ میں راوی ہیں کہ انہوں نے روح کے متعلق کہا تھا اسے جسم میں کس طرح عذاب کیا جائیگا[1]، یہ واضح رہے کہ تورات اور انجیل میں "روح" کا لفظ فرشتہ کے لئے آیا ہے اور قرآنِ مجید میں اس کا استعمال جیسا کہ سابق میں گزرا مختلف معانی میں ہوا ہے اب یہاں "الروح" سے مراد جسم انسانی کی روح ہو یا فرشتہ یا وحی، جواب کی جامعیت ہر ایک پر حاوی ہے کہ جو کچھ تمہیں بتلایا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کا حکم کام کر رہا ہے اس سے زیادہ بتلانے کی تمہاری تنگنائے علم میں وسعت نہیں کہ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (تمہیں جو کچھ علم دیا گیا ہے وہ تھوڑا)

آیہ کریمہ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا کی تفسیر میں ابن ابی حاتم بطریق علی بن ابی طلحہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ یہ ایک فرشتہ ہے جو خلقت کے اعتبار سے سب فرشتوں سے بڑا ہے[2] اور بیہقی بطریق عطیہ عوفی ابن عباس سے اس کی تفسیر میں یہ راوی ہیں کہ مراد یہ ہے کہ جب انسانوں کی روحیں فرشتوں کے ساتھ کھڑی ہونگی، یہ دونوں صورتوں کے پھونکے جانے کے درمیان روحوں کو جسموں کی طرف لوٹائے جانے سے پہلے ہوگا اور ابو صالح سے اسی آیت کی تفسیر میں یہ روایت کیا ہے کہ روح انسانوں کی طرح ایک مخلوق ہے پر وہ انسان نہیں ہیں ان کے ہاتھ اور پاؤں ہیں نیز مجاہد سے ناقل ہیں کہ روح انسانوں کے مانند ایک مخلوق ہے اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بطریق مجاہد روایت کی ہے کہ روح اللہ کا ایک امر اور اس کی ایک مخلوق ہے ان کی صورتیں انسانوں کی صورتوں پر ہیں آسمان سے جب کوئی فرشتہ اترتا ہے تو اس کے ساتھ ایک روح ہوتی ہے[3]

روح ایک کیا چیز ہے اور اسکی حقیقت کیا ہے اس بارے میں بڑا اختلاف رہا ہے کہا جاتا ہے کہ اس اختلاف کی تعداد سو اقوال تک جا پہنچتی ہے سلف نے اس قسم

[1] فتح الباری ج ۸ ص ۳۰۴ [2] الاتقان ج ۲ ص ۱۴۱ [3] الاسماء والصفات ص ۲۶۵، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس اخیر روایت کو ابن اسحٰق کی تفسیر سے نقل کر کے کہا ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہے۔ [4] فتح الباری ج ۸ ص ۳۰۵

Marfat.com

کی باتوں میں بحث کرنے سے سکوت اختیار کیا ہے،

حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں :-

وثبت عن ابن عباسؓ حضرت ابن عباسؓ سے یہ ثابت

انه کان لا یفسر ہے کہ روح کی تفسیر نہیں کرتے تھے

الروح ای لا یعین یعنی یہ تعین نہیں کرتے تھے کہ

المراد به [1] یہی مراد ہے۔

عبد اللہ بن بریدہ جو ثقات تابعین میں سے ہیں کہتے ہیں کہ اللہ نے روح پر نہ کسی ملک مقرب کو مطلع فرمایا نہ کسی نبی مرسل کو۔ [2]

عارف ربانی شیخ عبد الوہاب شعرانی نے اپنی نفیس کتاب الیواقیت والجواہر فی بیان عقائد الاکابر میں جس میں انہوں نے ارباب کشف اور اہل کلام کے عقائد میں مطابقت کی کوشش کی ہے اور جیسا کہ خود ان کا بیان ہے اس موضوع پر ان سے پہلے کسی نے قلم نہیں اٹھایا، "روح" پر ایک مستقل بحث سپرد قلم فرمائی ہے جس کا اقتباس ہدیۂ ناظرین ہے۔

ترسیٹھویں بحث اس امر کے بیان میں کہ ساری روحیں مخلوق ہیں اور جیسا کہ وارد ہے اللہ تعالیٰ کے امر (حکم) سے ہیں اور جس نے کبھی اپنی

عقل سے اس کی حقیقت کے پہچاننے پر غور کیا ہے وہ اس بارے میں یقین پر نہیں ہے بلکہ جو کچھ ہے اس کا ظنی تخمینہ ہے :

اور ہم کو یہ نہیں ملا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حقیقت پر کلام فرمایا ہو باوجودیکہ آپ سے اس کے متعلق سوال ہوا تھا پس ہم بھی ادباً اس سے باز رہتے ہیں۔

"روح کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ موجود ہے جیسا کہ ابو القاسم جنید وغیرہ نے کہا ہے چنانچہ جنید رحمہ اللہ کے الفاظ ہیں :-

الروح شئی استأثر روح ایک ایسی شے ہے جس کا
الله تعالیٰ بعلمه علم اللہ تعالیٰ کی ذات کے
ولم یطلع علیه ساتھ مخصوص ہے اور اس نے
احدا من خلقه اپنی مخلوق میں سے کسی کو اس پر
فلا یجوز لاحد مطلع نہیں فرمایا لہٰذا اس کے
البحث عنه باکثر متعلق کسی کو اس سے زیادہ بحث کرنا
من انه موجود۔ جائز نہیں کہ وہ موجود ہے۔

اکثر مفسرین جیسے ثعلبی اور ابن عطیہ بھی اسی طرف گئے ہیں اور جمہور متکلمین کا بیان یہ ہے کہ روح ایک جسم لطیف ہے جو بدن میں اسی طرح گھسی ہوئی ہے جس طرح

[1] فتح الباری [illegible]

[2] معالم التنزیل ج ۴ ص ۱۲۸ (طبع مصر)

Marfat.com

کہ شاخ سبز میں پانی ہوتا ہے اور بہت سے متکلمین کا قول ہے کہ وہ عرض ہے یعنی ایسی حیات کہ جس کے وجود سے بدن انسانی زندہ ہے، قاضی ابوبکر باقلانی اسی طرف مائل ہیں اور احادیث میں جو روح کے اترنے چڑھنے اور برزخ میں چلنے پھرنے کا ذکر آتا ہے وہ قول اول پر دلالت کرتا ہے، یہ سہروردی کا بیان ہے اور یہ اجسام کی صفت جیسا عرض کی نہیں کیونکہ عرض ان اوصاف سے موصوف نہیں ہوتا اور بہت سے صوفیہ نے کہا ہے کہ روح نہ جسم ہے نہ عرض بلکہ جوہر[1] مجرد قائم الذات اور غیر متحیز ہے، بدن کی تدبیر و تحریک کے لئے اس کا بدن سے خاص تعلق ہے وہ نہ بدن میں داخل ہے نہ اس سے خارج، فلاسفہ کی یہی رائے ہے اور یہ ایک گری ہوئی بات ہے۔

اور مجھے جو بات ظاہر ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ بالفرض اگر بندہ کو حقیقت روح پر مطلع بھی کر دیا جائے تو وہ اس کی استطاعت نہیں رکھتا کہ اس کو ایسی عبارت میں بیان کر سکے کہ جو سننے والے کو اسکی حقیقت کی معرفت تک پہنچا دے کیونکہ حق تعالیٰ نے اسکو ہمارے لئے ایسے مرتبہ میں رکھا ہے جو ہمیں عاجز کر دیتا ہے تاکہ ہم میں سے کوئی اپنے دل میں یہ کہنے لگے کہ جب ہم اپنی ذات کی حقیقت کے پہچاننے سے عاجز ہیں تو ذاتِ الٰہی کی معرفت میں کس قدر عاجز بلکہ عاجز تر ہوں گے لہٰذا ہمیں ذاتِ الٰہی کے بارے میں غور و خوض نہ کرنا چاہئے کیونکہ جب ہم اپنی روح ہی کی معرفت سے عاجز ہیں حالانکہ وہ مخلوق ہے اور سب چیزوں سے زیادہ ہم سے قریب ہے تو اپنے خالق کو کیسے پہچان لیں گے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کلام میں وارد ہے من عرف نفسہ فقد عرف ربہ (جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا) بعض عرفا نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے چونکہ کسی کو بھی اپنے نفس کی معرفت کبھی ممکن نہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے نفس کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ ہمارے اور اس کی معرفتِ ذات کے درمیان ایک عاجز کر دینے والا مقام ہے گویا حق تعالیٰ یوں فرما رہے ہیں کہ جب انسان اپنے نفس کی معرفت سے بھی قاصر ہے باوجودیکہ وہ مخلوق ہے اور سب چیزوں میں انسان سے زیادہ قریب ہے تو اس ذات کی معرفت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے جس کی نہ شبیہ ہے نہ نظیر اور نہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ کسی حد میں جمع ہو سکتا ہے نہ کسی حقیقت میں،

[1] جوہر وہ ہے جو بذات خود قائم ہو جیسے کپڑا اور عرض وہ ہے جو بذات خود قائم نہیں ہوتا بلکہ اس کا قیام بواسطہ جوہر ہوتا ہے جیسے رنگ۔

Marfat.com

کمال بن ابی شریف[1] نے اپنے حاشیہ میں کہا ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ لوگوں نے روح کی معرفت میں کیوں خوض کیا حالانکہ شارع نے اس بارے میں خاموشی اختیار کی ہے تو اس کا جواب دو طرح پر ہے، اول یہ کہ تفصیلی جواب اس لئے ترک کر دیا گیا کہ یہود باہم یہ کہتے تھے کہ اگر اس کے متعلق جواب نہیں دیا تو وہ سچے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علاماتِ نبوت میں داخل تھی، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا روح کے متعلق جواب نہ دینا، ان کی کتابوں میں جو یہ وصف مذکور تھا اس کی تصدیق کے لئے تھا، دوم یہ کہ سوال محض تنگ کرنے اور تغلیط و بدگوئی کیلئے تھا اور جب سوال اس طرح پر ہو تو اس کا جواب ضروری نہیں کیونکہ الروح ایک ایسا امر ہے جو روحِ انسانی، جبرئیل اور ایک اور فرشتہ کے درمیان جس کو الروح کہا جاتا ہے مشترک ہے نیز فرشتوں کی ایک خاص صنف اور قرآن اور عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے لہٰذا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی جواب میں فرماتے تو یہود عیب گیری اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اذیت کے لئے ضرور کہہ اٹھتے کہ ہماری تو یہ مراد نہ تھی یہی سبب ہے کہ جواب اجمالی طور پر اس طرح آیا کہ روح کے ہر معنی پر صادق ہے (یہاں تک اہلِ اصول کا کلام ختم ہو گیا)

شیخ محی الدین[2] لواقح الانوار میں فرماتے ہیں روح الکلام سے یوں ہوئی کہ وہ بغیر کسی واسطہ کے حق تعالیٰ کے فرمانے سے وجود میں آئی ہے اس نے روح سے فرمایا کوئی (ہو جا) وہ ہو گئی جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا ہے کہ وہ روح اللہ ہیں کیونکہ بلا واسطہ حق تعالیٰ کے پھونکنے سے (جیسا پھونکنا کہ اس کے جلال کے لائق ہے) وجود میں آئے ہیں اللہ فرماتا ہے اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَا اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ (سوائے اس کے نہیں کہ مسیح جو ہے عیسیٰ مریم کا بیٹا رسول ہے اللہ کا اور اس کا کلام جو ڈال دیا مریم کی طرف اور روح ہے اس کے ہاں کی) اور غزالی اس طرف گئے ہیں کہ ارشادِ خداوندی قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کے معنی من غیبہ کے ہیں یعنی روح ا[illegible] غیب سے ہے کیونکہ عالمِ امر عالمِ غیب ہے اور عا[illegible] خلق عالمِ شہادت ہے، ابنِ عربی کہتے ہیں ہمار[illegible]

[1] ابن عربی مراد ہیں، یہاں سے اہلِ کشف کا کلام شروع ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

نزدیک معاملہ اس کے برخلاف ہے جو غزالی نے کہا ہے کیونکہ ہم کہتے ہیں حق تعالیٰ جس کو بلا واسطہ ایجاد فرمائیں وہ عالم امر سے ہے یعنی جس سے وہ کُنْ فرمائیں اور وہ ہو جائے اس کا بس حق تعالیٰ ہی کی طرف ایک رُخ ہوتا ہے اور ہر وہ چیز جس کو وہ بالواسطہ ایجاد فرمائیں وہ عالم خلق سے ہے اور اس کے دو رُخ ہوتے ہیں ایک حق تعالیٰ کی طرف اور دوسرا اس سبب کی طرف جس سے وہ وجود میں آئی ہے پس کبھی تو حق تعالیٰ اسے خاص رُخ سے دعوت دیتے ہیں اور کبھی تفصیلات اور بالغ حکمتوں کی بنا پر اس رُخ سے دعوت دیتے ہیں جو سبب کا ہے۔

اور فتوحاتِ مکیہ کے بہترویں باب میں فرماتے ہیں روح اس لئے امر رب جل وعلا سے ہے کہ وہ خلق سے وجود میں نہیں آئی بلکہ اسکو اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ ایجاد فرمایا ہے اور اس کی حقیقت پر بجز ان اصفیاء کے جن کو حق تعالیٰ چاہے اور کوئی مطلع نہیں ہوتا۔

اور باب ۲۹۹ میں فرمایا ہے کہ روح کیلئے کیسے ممکن نہیں کہ وہ اپنے جوہرِ ذات میں زیادتی قبول کرے بلکہ وہ فرد ہے اور اگر عاقل بالذات نہ ہوتی تو اخذِ میثاق کے وقت اپنے خالق کی ربوبیت کا اقرار نہ کرتی کیونکہ حق تعالیٰ اسی سے خطاب فرماتے ہیں جس میں ان کے خطاب کی عقل ہو اور فی نفسہٖ انسان کی یہی حقیقت ہے، الشیخ نے اس بارے میں بہت طول سے کام لیا ہے اور پھر فرمایا ہے کہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے روح کو کامل، بالغ، عاقل، توحیدِ الٰہی کا عارف اور اپنی ربوبیت کا معترف پیدا کیا ہے اور یہی وہ فطرت ہے جس پر اللہ نے لوگوں کو بنایا ہے چنانچہ حدیث کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ (ہر بچہ اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی بنا لیتے ہیں یا نصرانی کر لیتے ہیں یا مجوسی کر ڈالتے ہیں) میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے، یہاں اغلب یعنی ماں باپ کے وجود کا ذکر کیا اور جو بھی بچہ کی پرورش کرتا ہے وہ بمنزلہ ماں باپ ہی ہے۔

نیز شیخ باب ۳۶۰ میں رقمطراز ہیں، واضح رہے کہ سارے عالم میں جو بھی کسی صورت سے متقید ہے اس کے لئے ایک روحِ الٰہی ہے جو اس کو لازم ہے اور اسی سے وہ اللہ عز وجل کی تسبیح کرتا رہتا ہے پس بعض ارواح تو ایسی ہیں جو اس صورت کی مدبر ہیں کیونکہ صورت ارواح کی تدبیر کو قبول کرتی ہے اور یہ وہ ہر صورت ہے

جو ظاہری زندگی اور موت سے متصف ہے اور اگر ظاہری زندگی اور موت سے متصف نہیں تو اس کی روح روحِ تسبیح ہے روحِ تدبیر نہیں۔ شیخ نے اس پر طویل بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے ان ارواح میں ان صورتوں کی ارواح سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا کوئی عارف نہیں کہ جو تدبیر سے بے تعلق ہیں یہ ارواحِ جماد ہیں اور ان سے رتبہ میں کم ارواحِ نبات ہیں اور ان سے کم تر ارواحِ حیوان ہیں اور سرکش انسانوں کی روحیں ان سے بھی گئی گزری ہیں لیکن صالحین میں حسب تفاوت طبقات انبیاء اولیاء اور مومنین کی ارواح سے معرفت میں اعلیٰ کوئی نہیں کہ یہ اختصاصِ الٰہی ہے[1]،،

علماء راسخین میں ایک مشہور بزرگ ہیں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو کشف و کلام دونوں وادیوں سے یکساں آشنا ہیں موصوف نے اس سلسلہ میں حجاب حقیقت کے اور چند پردے اٹھائے ہیں بحث یقیناً تشنہ رہیگی، اگر موصوف کے گراں قدر افادہ سے قطع نظر کر لی جائے، موصوف نے اپنی بے نظیر کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں ایک مستقل عنوان "باب حقیقۃ الروح" کے نام سے قائم کیا ہے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے :-

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (اور تجھ سے پوچھتے ہیں روح کو تو کہہ روح ہے میرے رب کے حکم سے اور تم کو جو علم دیا گیا ہے وہ تھوڑا سا ہے اور اعمش نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے وَمَا أُوتُوا مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (اور ان کو جو علم دیا گیا ہے وہ تھوڑا سا ہے) پڑھا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خطاب ان یہود سے ہے جنہوں نے روح کے متعلق سوال کیا تھا اور جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے، آیت اس بارے میں نص نہیں ہے کہ امتِ مرحومہ میں روح کی حقیقت کا کسی کو علم نہیں اور یہ بھی نہیں ہے کہ شریعت جس سے خاموش ہو اس کی معرفت کبھی ممکن ہی نہ ہو بلکہ بسا اوقات شریعت کسی چیز سے اس لئے سکوت اختیار کرتی ہے کہ اس کی معرفت دقیق ہوتی ہے اور گو بعض کے لئے اس کی معرفت ممکن ہو مگر جمہور امت میں اس کے دریافت کی صلاحیت

[1] الیواقیت والجواہر، ج ۲، ص ۱۲۲، ۱۲۳ (طبع میمنیہ مصر ۱۳۱۷ھ)

Marfat.com

نہیں ہوتی۔

واضح ہے کہ سب سے پہلے روح کی جس حقیقت کا ادراک ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ روح حیوان کے لئے مبدا الحیات ہے کہ اس کے اندر روح پھونکنے سے وہ زندہ اور اس سے مفارقت ہو جانے پر مردہ ہو جاتا ہے پھر جب بغور اس میں تامل کیا جائے تو یہ کھلتا ہے بدن میں ایک بخار لطیف ہے جو قلب کے اندر خلاصۂ اخلاط سے پیدا ہوتا ہے جو قوی و حار و محرک اور مدبر و غذا کا حامل ہوتا ہے طب کا حکم اسی پر جاری ہوتا ہے اور تجربہ یہ بتاتا ہے کہ رقت، غلظت، صفائی اور کدورت غرض اس بخار کے تمام احوال کا قویٰ میں اور ان تمام افعال میں جو قویٰ سے سرزد ہوتے ہیں ایک خاص اثر ہوتا ہے اور جو آفت کہ کسی عضو یا اس عضو کے مناسب بخار کی تولید پر طاری ہوتی ہے وہ اس بخار کو فاسد اور اس کے افعال میں تشویش پیدا کر دیتی ہے اس بخار کا وجود حیات کو مستلزم ہے اور اس کا تحلیل ہو جانا موت ہے، بس پہلی نظر میں تو یہی "روح" ہے اور لفظ عام کے اعتبار سے یہ روح کا طبقہ سفلی ہے بدن میں اسکی

مثال ایسی ہی ہے جیسے گلاب کے پھول میں گلاب کا عرق یا کوئلے کے اندر آگ پھر جب اور غور سے دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ یہ روح اس روح حقیقی کی سواری اور اس کے تعلق کا مادہ ہے کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں بچہ جوان ہو رہا ہے بوڑھا ہو رہا ہے اس کے بدن کے اخلاط اور وہ روح جس کی تولید ان ہی اخلاط سے ہوتی ہے ہزار دفعہ سے زیادہ بدل جاتی ہے، وہ کبھی چھوٹا ہے اور کبھی بڑا، کبھی سیاہ ہوتا ہے اور کبھی سپید، کبھی جاہل ہوتا ہے اور کبھی عالم، اسی طرح اور اوصاف ہیں، جو بدلتے رہتے ہیں اور شخص وہ کا وہ ہے اور اگر اس سلسلہ میں کسی بات میں مناقشہ کیا جائے تو ہمیشہ یہ حق حاصل ہے کہ ہم ان تغیرات اور طفل کو موجود فرض کریں اور کہیں کہ ان اوصاف کے بعینہٖ باقی رہنے کا ہم کو یقین حاصل نہیں اور اس طفل کے باقی رہنے کا یقین ہے پس وہ طفل ان اوصاف سے علیحدہ ہے اور وہ شے جس کے ذریعہ وہ وہ ہے نہ یہ روح ہے نہ یہ بدن اور یہ تشخصات جو بنظر ظاہر معلوم ہوتے اور دکھائی دیتے ہیں بلکہ روح حقیقت میں

ایک حیثیت فردانیہ اور نقطۂ نورانیہ ہے جس کا طوران تمام تغیر پذیر متغائرہ اطوار سے کہ جن میں بعض جواہر ہیں اور بعض اعراض ہیں بڑھ چڑھ کر ہے وہ جس طرح کبیر کے ساتھ ہے کسی طرح صغیر کے ساتھ ہے اور جس طرح سپید کے ساتھ ہے اسی طرح سیاہ کے ساتھ ہے لہٰذا اسی طرح دیگر متقابل اشیاء کے ساتھ، اس کو اولاً تو روحِ ہوائی کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے اور ثانیاً بدن کے ساتھ اس حیثیت سے کہ بدن نسمہ (روح ہوائی) کی سواری ہے، اور وہ عالم قدس کا ایک روزن ہے جس سے روح ہوائی پر وہ تمام باتیں نازل ہوتی رہتی ہیں جنکی اس میں استعداد ہوتی ہے پس امورِ متغیرہ میں جو کچھ تغیر واقع ہوا وہ استعداداتِ ارضیہ کی بنا پر ہوا جس طرح کہ آفتاب کی دھوپ ہے کہ کپڑے کو سپید کرتی اور دھوبی کو سیاہ کر دیتی ہے۔

اور ہمارے نزدیک وجدانِ صحیح سے یہ متحقق ہو چکا ہے کہ بدن کے روح ہوائی کو پیدا کرنے کی استعداد کو کھو دینے کے سبب بدن سے روح ہوائی کے جدا ہو جانے کا نام موت ہے، روحِ ہوائی سے روحِ قدسی کے جدا ہو جانے کا نام موت نہیں ہے چنانچہ اسرارِ حکمۃ میں جب روحِ ہوائی تحلیل ہونے لگتی ہے تو حکمتِ الٰہی میں یہ ضروری ہے کہ روحِ الٰہی کا اس قدر حصہ باقی رہے کہ روحِ الٰہی کا ارتباط اس سے قائم رہ سکے جس طرح کہ شیشی سے تم ہوا کو چوسنے لگو تو ہوا اس میں سے خارج ہوتی رہیگی یہاں تک کہ اس حد پر جا پہنچے گی کہ اس کے بعد خالی نہ ہو سکے اب یا تو چوسنے کی تم میں طاقت نہ رہے گی یا شیشی پھٹ جائیگی یہ سب کچھ اس راز کی بنا پر ہے جو ہوا کی طبیعت سے پیدا ہے، اسی طرح روحِ ہوائی میں ایک راز ہے اور اس کی ایک حد ہے کہ ان دونوں سے معاملہ متجاوز نہیں ہو سکتا پھر جب انسان مر گیا روحِ ہوائی کی نشأۃِ ثانیہ ہوئی، اب روحِ الٰہی کا فیض مابقی حسِ مشترک میں ایک خاص قوت پیدا کرے گا جو عالمِ مثال (یعنی وہ قوتِ متوسط جو مجرد و محسوس کے درمیان افلاک میں شئے واحد کی طرح منتشر ہے) کی مدد سے سننے، دیکھنے اور بولنے کے لئے کافی ہو گی اور بسا اوقات روحِ ہوائی اس وقت عالمِ مثال کی مدد سے لباس نورانی یا ظلمانی کے لئے تیار

Marfat.com

ہو جاتی ہے اور یہیں سے عالمِ برزخ کے عجائبات ظاہر ہونے لگتے ہیں پھر جب صور پھونکا گیا یعنی باری صور کی طرف سے اسی طرح کا فیضِ عام آیا جیسا کہ ابتدائے آفرینش میں ہوا تھا جبکہ روحیں جسموں میں پھونکی گئیں اور عالمِ موالید کی تاسیس عمل میں آئی تھی تو روحِ الٰہی کا فیض اس کا موجب ہوا کہ لباسِ جسمانی یا ایسے لباس میں کہ جو عالمِ مثال و عالمِ اجسام کے بین بین ہو ملبوس ہوا اور اب وہ تمام باتیں پوری ہونگی جن کے متعلق صادق و مصدوق علیہ افضل الصلوات و ایمن التحیات نے مطلع فرمایا ہے اور چونکہ روحِ ہوائی روحِ الٰہی اور بدنِ ارضی کے درمیان برزخ متوسط ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کا ایک رُخ اس طرف ہو اور ایک رُخ اس طرف اب جو رُخ کہ عالمِ قدس کی طرف مائل ہے وہ ملکیت ہے اور جو زمین کی طرف مائل ہے وہ بہیمیت ہے۔

حقیقتِ روح کے متعلق یہاں ہی مقدمات پر اکتفا کرتے ہیں تاکہ اس علم میں اس کو تسلیم کر لیا جائے اور اس پر تفریعات قائم کی جائیں قبل اس کے کہ کسی سے اعلیٰ علم میں حجاب منکشف ہو، واللہ اعلم" [1]

شاہ صاحب نے اخیر میں جس علم کا حوالہ دیا ہے وہ "علمِ حقائق" ہے، الطاف القدس فی لطائف النفس علمِ لطائف میں شاہ صاحب کا ایک بے نظیر رسالہ ہے، اس کی فصلِ دوم میں شاہ صاحب نے حقیقتِ روح پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے، حجۃ اللہ البالغہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ اسکی تلخیص ہے۔ بحثِ روح سے پہلے بطورِ تمہید رقمطراز ہیں:۔

بیانِ حقیقتِ ایں لطائف و خواصِ آں موقوف بر بیانِ حقیقتِ روح ست و آں مسئلۂ علمِ حقائق ست نہ از علمِ سلوک و شارع صلوات اللہ علیہ وسلامہ ہیچ رمزے از علمِ حقائق اظہار نہ فرمود بجز علمِ سلوک و تہذیبِ نفس تبلیغ نمود مگر مشہودات چند کہ ہیچ طوائف عرب و عجم ازاں اجنبی نیست و فرقہ نیست کہ آں علم در روز بانش نیست پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم این علوم مشہورہ را اجمالاً بیا و ایشاں داد و از خوض در تفصیل و تصویر آں زجر شدید فرمودہ ہمیں ست سنتِ

[1] حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱، ص ۱۴، ۱۵ (طبع خیریہ مصر ۱۳۲۶ھ)

Marfat.com

انبیاء اللہ اجمعین نہ پنداری کہ حل ایں علوم مقدورِ بشر نیست شد نہ بلکہ اظہارِ ایں علوم موافقِ مصلحتِ جمہورِ مخاطباں نیست ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلسِ رنداں خبرے نیست کہ نیست

اولی واخریٰ درحق ما مردم نیز ہمیں ست کہ ازیں تن زنیم و دیدہ را نادیدہ سازیم لیکن اختلافِ صوفیہ دریں مسئلہ بسیار شد و طبائعِ ایشاں مشوف شدند و علمِ لطائف بریں مسئلہ مبتنی شد پس ضرورت پیش آمد والضرورۃ تبیح المحذورات[1]"

مزید تفصیل کے لیے اس کتاب کا مطالعہ کافی ہے۔ حافظ ابن مندہ اور علامہ ابن القیم نے روح کے متعلق مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں روح پر روایات واحادیث کی روشنی میں بحث کی ہے، دونوں کی تصنیف کا نام کتاب الروح ہے۔ ابنِ مندہ کی تصنیف اس وقت نایاب ہے حافظ ابنِ حجر نے فتح الباری میں اس کا حوالہ دیا ہے[2] اور ابن القیم کی کتاب عرصہ ہوا کہ مصر سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

٦/٣، ١٢/١٧، ١٠/١٠، ١٩/١٥، ٢٢/٧، ٢٥/٣، ١٩/٢، ٣٠/٢٢ -

رُوْحًا ٢٥/٦ -

**رُوْحُ الْقُدُسِ**: رُوحِ پاک، جانِ پاک، پاک فرشتہ، موصوف کی اضافت صفت کی طرف ہے جیسے حاتم الجُوْدِ اور رَجُلُ صِدْقٍ ہے۔ امام بغوی رحمہ اللہ اَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"روح القدس کے بارے میں علماء مختلف ہیں، ربیع وغیرہ کا بیان ہے کہ وہ روح مراد ہے جو حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام میں پھونکی تھی اور قدس اللہ ہے، حق تعالیٰ نے اس کی اضافت اپنی ذات کی طرف تکریم و تخصیص کے لیے کی ہے یعنی وہ روح جو اللہ نے ان میں پھونکی جیسے بیت اللہ اور ناقۃ اللہ ہے چنانچہ ارشاد ہے فَنَفَخْنَا فِیْہِ مِنْ رُّوْحِنَا (پھر ہم نے اس میں اپنی روح کو پھونک دیا) اور رُوْحٌ مِّنْہُ (اور روح ہے ان کے ہاں کی) اور بعض کا قول ہے کہ قدس سے طہارت مراد لی ہے یعنی روحِ طاہر، ان کی روح کو قدس سے اس لیے موسوم کیا کہ وہ نہ مردوں کی پشت میں ہے نہ عورتوں کے رحم میں بلکہ اللہ کے امر میں سے ایک امر تھی، قتادہ، سُدّی اور ضحاک کا قول ہے کہ

[1] الطاف القدس فی لطائف النفس، ص ٦،٥ (طبع احمدی دہلی ١٣٠٧ھ)
[2] فتح الباری ج، ص ٣٠٦

"روح القدس" جبریل علیہ السلام ہیں بعض نے کہا ہے کہ وہ قدس یعنی طہارت سے اس لئے موسوم ہوئے کہ انہوں نے کبھی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا اور حسن کہتے ہیں کہ قدس اللہ اور اس کی روح جبریل ہیں، اللہ فرماتا ہے قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (تو کہہ اس کو اتارا ہے پاک فرشتے نے تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تائید جبریل علیہ السلام کے ذریعہ اس طرح کی گئی کہ ان کا حکم تھا جہاں وہ جائیں انکے ساتھ رہیں یہاں تک کہ ان کو آسمان پر اٹھا لیا گیا اور بعض کا قول ہے کہ جبریل علیہ السلام کو جو روح سے موسوم کیا گیا وہ ان کی لطافت کے سبب اور وحی سے ان کے تعلق کی بنا پر کیا گیا کہ جو دلوں کی زندگانی کا باعث ہے اور ابن عباس اور سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ روح القدس اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم تھا جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو جلاتے اور لوگوں کو عجائبات دکھلاتے تھے اور بعض کا قول ہے کہ وہ انجیل ہے جس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے روح بنایا گیا تھا جس طرح سے کہ قرآن کو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے روح کر دیا گیا تھا کیونکہ وہ قلوب کی زندگانی کا سبب ہے اللہ فرماتا ہے وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (اور اسی طرح ہم نے تیری طرف وحی کی قرآن کی اپنے حکم سے)۔" [1]

ابن ابی حاتم نے باسناد ثقات حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور طبری نے محمد بن کعب قرظی سے روایت کیا ہے کہ روح القدس جبریل ہیں، ابو عبیدہ اور بہت علماء کا اس پر یقین ہے [2] امام بخاری نے بھی سورہ نحل کی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ واضح رہے کہ آیۂ کریمہ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ میں تو بالاتفاق روح القدس سے جبریل علیہ السلام ہی مراد ہیں اور اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ اور اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ میں اگرچہ اختلافِ اقوال ہے مگر صحیح اور راجح یہی ہے کہ یہاں بھی جبریل علیہ السلام ہی مراد ہیں۔

۱۱/۱ ۲/۱ ۵ ۱۴/۲ -

**رُوْحَنَا**: ہماری روح، ہمارا فرشتہ، رُوْحٌ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ قرآن مجید میں یہ الفاظ تین جگہ آئے ہیں جہاں رُوْحَنَا ہے وہاں اصح یہ ہے

---

[1] معالم التنزیل ۱۴۰ ص ۶۸، ۶۹

[2] فتح الباری ج ۸، ۲۹۱

کہ جبریل علیہ السلام مراد ہیں اور جہاں مِنْ رُّوْحِنَا ہے وہاں اصح یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح مراد ہے، ۱۶/۵ ۴/۲ ۳۵/۳۰ -

**رُوْحِهٖ**: اس کی روح، رُوْحٌ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ آیہ کریمہ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (اور پھونکی اس میں اپنی جان میں سے) کی تفسیر میں فرماتے ہیں:-

"اپنی جان میں سے یعنی جو مخلوق ہے اسی کا مال ہے، مگر جس کو عزت دی اس کو اپنا کہا جیسے فرمایا اِنَّ عِبَادِیْ سو انسان کی جان غیب سے آئی ہے مٹی پانی سے نہیں بنی اسکو اپنی کہا اور یہ نہ سمجھے کہ اللہ کی جان، جان ہو تو بدن میں ہو، بدن ہو تو ترکیب بھی ہو، ذات پاک کہاں رہی؟" ۲۱/۱۲ -

**رُوْحِیْ**: میری روح، میری جان، رُوْحٌ مضاف، ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، حضرت شاہ عبدالقادر صاحب زیر آیت وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ (اور پھونکی اس میں اپنی جان سے) سورۂ حجر میں رقم طراز ہیں:-

"اپنی جان یعنی خاص جس میں نمونہ ہے اللہ کی صفات کا علم و ارادہ بیدار و یاد حق کی اور لگاؤ اللہ سے"

اور سورۂ ص میں تحت آیہ مذکورہ فرماتے ہیں:-

"اپنی ایک جان یعنی آب و خاک کی نہیں بنی، غیب سے آئی"

امام بیہقی فرماتے ہیں:-

"جس روح میں سے آدم علیہ السلام کے اندر پھونکا گیا وہ اللہ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے جس سے حق تعالیٰ نے اجسام کی زندگانی کو قرار دیا ہے اور اپنی ذات کی طرف اس کی اضافت بسبب خلق و ملکیت ہے اس بنا پر نہیں کہ ہے کہ روح اس کا جزء ہے یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ ارشاد عزوجل ہے وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (اور مسخر کیا تمہارے واسطے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اسی کی طرف سے ہے یعنی سب اسی کی مخلوق ہے[1]" ۱۳/۳ ۲۳/۱۲ -

**رُءُوْسٌ**: اصل، سر، رَأْسٌ کی جمع ہے، ۳/۲ ۲۳/۹ -

**رُءُوْسِكُمْ**: تمہارے سر، رُءُوْسٌ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، ۶/۷ ۶/۲ ۲۶/۱۲ -

---

[1] کتاب الاسماء والصفات، ص ۳۶۲

Marfat.com

**رُءُوْسِہِمْ**: ان کے سر، رُءُوس مضاف ہُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، ۱۲/۱۴، ۵/۱۵، ۹/۱۶، ۱۵/۱۲، ۲۸/۱۳۔

**رَوْضٰتِ**: باغات، سبزہ زار، رَوْضَۃٌ کی جمع، ۲۵/۵۔

**رَوْضَۃٍ**: باغ، سبزہ زار، اس کی جمع رِیَاضٌ بھی آتی ہے۔ ۲۱/۹۔

**رَوْعُ**: خوف، ڈر، رَاعَ یَرُوْعُ کا مصدر ہے، ۲/۱۲۔

**رَءُوْفٌ**: مہربان، شفقت کرنے والا، رَأْفَۃٌ سے بروزن فَعُوْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ، اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنٰی میں سے ہے، امام بیہقی فرماتے ہیں:۔

"اس کے معنی ہیں اپنے بندوں سے نرم برتاؤ کرنیوالا، کیونکہ حق تعالیٰ نے ان پر ایسی عبادتیں مقرر نہیں فرمائیں جن کی وجہ سے وہ پاہج ہونے یا بیماری یا ضعف کے باعث طاقت نہیں رکھتے بلکہ جن عبادات کی ان میں طاقت تھی ان سے بھی بدرجہا زیادہ کم عبادات کا مکلف فرمایا اور ساتھ ہی شدت قوت کے زمانے میں اپنے فرائض کو سخت فرمایا اور ضعف و قوت کی کمی کے وقت ان کو ہلکا کر دیا، نیز کوان باتوں پر پکڑا جن پر مسافر کو نہ پکڑا اور تندرست کی ان امور پر گرفت کی جن پر بیمار کی گرفت نہ کی، یہ سب کچھ رافت و رحمت ہے" [1]

امام خطابی نے رحمت و رافت کا فرق بیان کیا ہے:

"رحمت تو کسی مصلحت کی بنا پر کبھی ناپسندیدگی میں بھی ہوتی ہے لیکن رافت ناپسندیدگی میں تقریباً نہیں ہوتی" [1]

(ملاحظہ ہو رَأْفَۃٌ) ۱/۹، ۳/۱۱، ۵/۱۲، ۱۴/۱۳،۱۲،۷، ۱۷/۱۹، ۱۸/۸، ۲۷/۱۷، ۲۸/۴۔

**رُوْمُ**: قوم روم، رومی، کبھی تو اس لفظ کا استعمال قوم روم کے لئے ہوتا ہے اور کبھی رُوْمِی کی جمع کے لئے جس طرح کہ عجم ہے، ۲۱/۴۔

**رُوَیْدًا**: تھوڑی سی مہلت، اسم فعل ہے، ابن طاہر کہتے ہیں: یہ اصل میں اِرْوَادٌ ہے رُوَیْدٌ اِرْوَادٌ کی تصغیر ہے رُوَیْدًا کے معنی مہلت دینے اور ٹھہرنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے اِمْشِ مَشْیًا رُوَیْدًا یعنی آہستہ چل جلدی نہ کر، [2]

اور سیوطی نے اتقان میں لکھا ہے کہ رُوَیْد اسم ہے ہمیشہ مصغر اور مامور بہ ہو کر بولا جاتا ہے، یہ

[1] الاسماء والصفات امام بیہقی، ص ۴۲ [2] اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن العظیم ص ۵۳ (طبع دار الکتب المصریۃ قاہرہ ۱۳۶۰ھ)

رُوَیْدٌ کی تصغیر ہے جس کے معنی مہلت کے ہیں[1] ۳۰/۱۱۔

## فصل الهاء

رِهٰنٌ : گرد، رہن، رِهْنٌ کی جمع ہے بمعنی مَرْهُوْنٌ، ۳/۲۔

رَهْبِ : ڈر، رَهِبَ يَرْهَبُ کا مصدر ہے جس کے معنی ڈرنے کے ہیں بعض کا قول ہے کہ حمیری زبان میں رہب آستین کو کہتے ہیں، اصمعی کا بیان ہے کہ میں نے ایک اعرابی کو کہتے ہوئے سنا اَعْطِنِیْ مَا فِیْ رَهْبِكَ (جو تیری آستین میں ہے مجھے دیدے) اس صورت میں آیت وَاضْمُمْ اِلَیْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ کے معنی ہوں گے اپنے ہاتھ کو آستین سے نکال کر اپنی طرف ملالو۔[2] اسی طرح مقاتل کہتے ہیں کہ میں لفظ رہب کی تفسیر کی تلاش میں نکلا تو مجھ سے ایک اعرابیہ کی ملاقات ہوئی میں کھا رہا تھا اس نے کہا اے اللہ کے بندے مجھ پر صدقہ کر، میں نے دونوں لپ بھر کر اسے دینا چاہا تو وہ کہنے لگی هٰهُنَا فِیْ رَهْبِیْ (یہاں ڈال میری آستین میں) لیکن پہلے معنے زیادہ صحیح ہیں[2] ۲۰/۲۔

رَهَبًا : خوف، ڈر، رَهِبَ يَرْهَبُ کا مصدر ہے، ۱۷/۶۔

رُهْبَانِ : زاہدانِ اہلِ کتاب، اہلِ کتاب کے درویش۔ بغوی لکھتے ہیں :-

"رہبان عابدانِ صومعہ نشین ہیں، اس کا واحد رَاهِبٌ ہے جیسے فَارِسٌ اور فُرْسَانٌ اور رَاكِبٌ اور رُكْبَانٌ ہیں اور کبھی رُهْبَانٌ واحد ہوتا ہے اور اس کی جمع رَهَابِيْنُ ہے جیسے قُرْبَانٌ قَرَابِيْنُ"[3]

راغب کہتے ہیں، رُهبان واحد اور جمع دونوں ہوتا ہے جو اس کو واحد قرار دیتے ہیں وہ اس کی جمع رَهَابِيْنُ بناتے ہیں اور رَهَابِنَةٌ جمع کے لئے زیادہ مناسب ہے[3] ۳۱/۱۰۔

رُهْبَانًا ۸۲/۵۔

رُهْبَانَهُمْ : ان کے درویش، رُهْبان مضاف، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، ۳۱/۱۰۔

رَهْبَانِيَّةً : دنیا چھوڑنا، گوشہ نشینی، راغب لکھتے ہیں :-

الرهبانیۃ غلو فی تحمل التعبد من فرط الخوف
خوف سے عبادت کی بجاآوری میں غلو کرنے کا نام

[1] الاتقان، ج۱، ص ۱۶۳ [2] معالم التنزیل ج۵، ص ۱۴۳ [3] مفردات راغب [4] معالم التنزیل ج ۱، ص

من فرط الرهبة رہبانیت ہے۔

علامہ محمود بن عمر زمخشری کہتے ہیں :-

"راہبوں کا فعل رہبانیت ہے، پیا پے بغیر افطار روزے رکھنا، ٹاٹ پہننا، گوشت نہ کھانا وغیرہ وغیرہ، اس کی اصل رہبت سے ہے۔"[1]

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی رہبانیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"یہ فقیری اور تارکِ دنیا بننا نصاریٰ نے رسم نکالی جنگل میں تکیہ بنا کر بیٹھتے، نہ جورو نہ رکھتے نہ بیٹا، نہ کماتے نہ جوڑتے محض عبادت میں رہتے، خلق سے نہ ملتے اللہ نے بندوں پر یہ حکم نہیں رکھا۔"[2]

سننِ ابی داؤد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی جانوں پر سختی نہ کرو کہ اللہ تم پر سختی کریگا، بلا شبہ ایک قوم (راہبوں کی جماعت مراد ہے) نے اپنی جانوں پر سختی کی تو اللہ نے ان پر سختی کی چنانچہ یہ گرجاؤں اور دیروں میں ان ہی کے بقایا ہیں وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ (ایک دنیا چھوڑنا انہوں نے نیا نکالا ہم نے ان پر نہیں لکھا تھا)۔[3] مسند امام احمد بن حنبل میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم ایک سریّہ (چھوٹی لڑائی) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں نکلے پس ایک شخص کا گزر ایک ایسے غار پر ہوا جہاں کچھ پانی اور سبزہ تھا، اس نے اپنے دل میں کہا کہ یہاں پر اقامت گزیں ہو کر دنیا سے کنارہ کش ہو جاؤں، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں اجازت طلب کی، آپ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے یہودیت یا نصرانیت دے کر نہیں بھیجا گیا، میں تو حنیفیت سمحہ (جو تمام کجرویوں سے ہٹ کر توحید کی طرف جھکی ہوئی اور آسان ہے) لے کر مبعوث ہوا ہوں، قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اللہ کی راہ میں ایک صبح نکلنا یا ایک شام نکلنا دنیا اور ما فیہا سے بڑھ کر ہے اور تم میں سے کسی ایک کا صف میں قائم رہنا اس کی ساٹھ سالہ نماز سے بڑھ کر ہے۔[4] بغوی نے اپنی اسناد سے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ

[1] الفائق فی غریب الحدیث، ۱۲ ص ۲۶۹ (طبع دائرۃ المعارف، حیدر آباد دکن)
[2] موضح القرآن، سورہ حدید، تفسیر آیہ وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا
[3] مشکوٰۃ المصابیح، ص ۳۱ (طبع مجتبائی دہلی) [4] ایضاً، ص ۲۲۴

سے نقل کیا ہے کہ جب انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رہبانیت کی اجازت مانگی تو آپ نے ارشاد فرمایا:

ترھب امتی الجلوس فی المساجد وانتظار الصلوٰة۔[۱] — میری امت کی رہبانیت مسجد میں بیٹھنا اور نماز کا انتظار کرنا۔

واضح رہے کہ حدیث لا رھبانیۃ فی الاسلام جو زبان زدِ خاص و عام ہے حافظ ابنِ حجر عسقلانی اس کے متعلق فتح الباری شرح صحیح البخاری میں رقمطراز ہیں:-

واما حدیث لا رھبانیۃ فی الاسلام فلم اراہ بھذا اللفظ لکن فی حدیث سعد بن ابی وقاص عند الطبرانی ان اللہ قد ابدلنا بالرھبانیۃ الحنیفیۃ السمحۃ۔[۲]

اور رہی حدیث لا رھبانیۃ فی الاسلام تو میں نے اس کو بایں لفظ نہیں دیکھا لیکن طبرانی میں سعد بن ابی وقاص کی حدیث میں یوں ہے کہ اللہ نے رہبانیت کے بدلہ میں ہم کو آسان حنیفیت عطا کی ہے۔

۲۷/۲۰

رَھْبَۃ: ڈر، رعب، ایسا خوف جس میں بچاؤ کا خیال اور اضطراب موجود ہو رہبت کہلاتا ہے،[۳] رَھِبَ یَرْھَبُ کا مصدر ہے۔[۴]

رَھْطٌ: نفر، شخص، قبیلہ، برادری، بھائی بند، راغب اور زمخشری دونوں نے لکھا ہے کہ دس سے کم آدمیوں کی جماعت رہط کہلاتی ہے اور بعض کا قول ہے کہ چالیس تک کے لئے رہط استعمال ہوتا ہے، بیضاوی لکھتے ہیں کہ رہط اور نفر میں فرق یہ ہے کہ رہط کا استعمال تین یا سات سے دس تک کے لئے ہوتا ہے اور نفر کا استعمال تین سے نو تک کے لئے۔[۵] قرآن نے اس کا استعمال قوم اور برادری کے معنی میں بھی کیا ہے جس سے اس قول کی تائید ہوتی ہے کہ چالیس اشخاص تک کی جماعت کے لئے اس کا استعمال ہوتا ہے، زمخشری نے لکھا ہے کہ اس کی جمع اَرَاھِطُ آتی ہے جیسے کہ سیبویہ کے نزدیک باطل کی جمع میں اَبَاطِیل آتا ہے اور دوسروں کا بیان ہے کہ رہط کی جمع اَرْھُطٌ آئیگی اور استشہاد میں پیش کیا ہے ع وفاضح مفتضح فی ارھط پھر ارھط کی جمع اراھط ہوگی۔[۶]

۱۹/۱۹

[۱] معالم التنزیل ج ۴ ص ۳۰۰، [۲] فتح الباری ج ۹ ص ۹۶ [۳] انوار التنزیل ج ۲، ص ۱۲۰ (طبع مصر) [۴] الفائق ج ۱ ص ۵۰۷

Marfat.com

**رَهْطُكَ**: تیرا قبیلہ، تیری برادری، تیرے بھائی بند، رَهْطُ مضاف، كَ ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ، ہود ۹۲۔

**رَهْطِيْ**: میرا قبیلہ، میری برادری، میرے بھائی بند، رَهْطِ مضاف ی ضمیر واحد متکلم، مضاف الیہ، ہود ۹۲۔

**رَهَقًا**: سرکشی، تکبر، سر چڑھنا، ستم، زیادتی زبردستی، رَهِقَ يَرْهَقُ کا مصدر ہے۔ اصل میں اس کے معنی ایک شے کے دوسری شے پر زبردستی چھا جانے کے ہیں اور چونکہ اس کا لازمی نتیجہ ہے تباہی، اس لئے تباہ ہونے کے معنی میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے، مبرد نے تصریح کی ہے کہ جب کسی شخص کے متعلق کہا جائے فیہ رھق تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں عقل کی کمی ہے جس کی بنا پر وہ شر میں گھرا ہوا ہے اور برائی ہر طرف سے اس پر چھا رہی ہے۔[1] آیۂ شریفہ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا (پھر ان کو چڑھا اسر چڑھنا) میں سرکشی اور تکبر مراد ہے اور فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا (سو وہ نہ ڈرے گا نقصان سے نہ زبردستی سے) میں تباہی کے معنی مراد ہیں کیونکہ دوسرے کی زبردستی کا نتیجہ اپنی تباہی ہے۔ جن ۱۳۔

**رَهْوًا**: خشک، تھما ہوا، راغب لکھتے ہیں "رھو کے معنی ہیں ساکن یعنی تھمے ہوئے اور ٹھہرے ہوئے کے اور بعض نے کہا ہے کہ راہ کی وسعت مراد ہے اور یہی صحیح ہے" یہ رَهَا يَرْهُوْ کا مصدر ہے جس کے معنی دریا کے تھمنے کے آتے ہیں، امام بخاری سورہ حٰم الدخان کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ "مجاہد نے کہا ہے رھو خشک راستہ ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رھو کے معنی ساکن کے ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

"مجاہد کے قول کو فریابی نے اپنے طریق سے روایت کیا ہے اور اتنا زیادہ کیا ہے کہ اسی ہیئت پر جو کہ ضرب کے دن تھی (یعنی اللہ یہ فرماتا ہے کہ) سمندر کو یہ حکم نہ دو کہ اصلی حالت پر رجوع کرے بلکہ اس وقت تک کے لئے چھوڑ دو کہ (لشکر فرعون) کا آخری (سپاہی) تک داخل ہو جائے اور عبد بن حمید نے دوسرے طریق سے مجاہد سے رھوا کے معنی منفرجًا یعنی کشادہ اور کشادہ کے نقل کئے ہیں اور عبد الرزاق معمر سے وہ قتادہ سے راوی ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے رخ کیا کہ سمندر پر ضرب لگائیں تاکہ وہ باہم مل جائے اور انہیں ڈر تھا کہ مبادا فرعون اپنی فوجوں سے

---

[1] الفائق، ج ۱، ص ۲۵۷

ان کا تعاقب کرے تو ان سے کہا گیا اُتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا (سمندر کو خشک ہی رہنے دو) یہ فرماتے ہیں کہ جو خشک راستہ بن گیا ہے، اسے رہنے دو، کیونکہ یہ لشکر غرق ہونے والا ہے۔"

اور دوسرا قول ابوعبیدہ کا ہے انہوں نے وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا کی تفسیر ساکنًا سے کی ہے، کہا جاتا ہے جارت الخیل رهوا یعنی ساکنة گھوڑے تھمے ہوئے آئے اور اربع علی نفسک (اپنے اوپر نرمی کر) اور عیش راہ (سکون کی زندگی)" [1] $\frac{25}{14}$

**رَهِيْنٌ**: گرو، گرفتار، پھنسا ہوا، رِهْنٌ سے، جس کے معنی گرو ہونے کے ہیں، بروزن فَعِیْلٌ بمعنی مرہون ہے۔ $\frac{27}{3}$ -

**رَهِيْنَةٌ**: گرو، راغب لکھتے ہیں:-

" رھینۃ کے متعلق بعض کا قول ہے کہ یہ فعیل ہے بمعنی فاعل یعنی ثابتة مقیمة ثابت رہنے والی، قیام کرنے والی اور بعض کا قول ہے کہ بمعنی مفعول ہے یعنی ہر جان اپنے گزشتہ اعمال کی پاداش میں رکی ہوئی ہے۔"

بیضاوی لکھتے ہیں:-

" کہ یہ مصدر ہے جیسے شکیمة اور مثل رھن کے مفعول کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور اگر صفت ہو تو رھین کہا جاتا۔" [2] $\frac{29}{16}$ -

## فصل الیاء المثناة

**رِءْيًا**: نمود، منظر، قرآن کریم کے رسم الخط میں یہ ہمزہ ساکن کے ساتھ بغیر مرکز کے خلافِ قیاس لکھا جاتا ہے رُؤْيَةٌ سے مشتق ہے بروزن فِعْلٌ جیسے طحن اور خبز میں، جو چیز نظر آئے اس کا نام رِءْیٌ ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے طبری نے بطریق علی بن ابی طلحہ اور ابن ابی حاتم نے بطریق ابی ظبیان منظر ہی کے معنی نقل کئے ہیں، نیز ابن ابی حاتم نے ابورزین سے کپڑوں کے اور عبدالرزاق نے بروایت معمر قتادہ سے اور ابن ابی حاتم نے حسن بصری سے صورتوں کے معنی روایت کئے ہیں [1]، یہ دونوں مرادی معنی ہیں۔ $\frac{16}{8}$ -

**رِئَاءٌ**: دکھاوا، دکھانا، خود نمائی، بابِ مفاعلت کا مصدر ہے، اس کے معنی ہیں دوسرے کو دکھانے کے لئے کسی کام کا کرنا، یہ لفظ تمام قرآن شریف میں

[1] انوار التنزیل، ج ۲، ص ۳۴۷

[2] فتح الباری، ج ۸، ص ۳۲۴، ۳۲۵

ہمزہ کے ساتھ ؤ ی کے مرکز پر ہوتی ہے لکھا جاتا ہے
اور یا کے نیچے نقطے نہیں دیے جاتے سپ ۳
ص پ ۱۔

**رُؤیا** : خواب، قرآن مجید میں یہ لفظ بغیر واؤ کے ہمزہ کے ساتھ بغیر مرکز ہمزہ کے لکھا جاتا ہے، رُؤیا رَأَی کا مصدر ہے جس کے معنی خواب دیکھنے کے ہیں نیز یہ لفظ خواب کا اسم بھی ہے، بیضاوی لکھتے ہیں :۔

"رُؤیا رُؤیۃ ہی کی طرح ہے مگر وہ خواب میں دیکھنے کے لئے مخصوص ہے ان دونوں میں تانیث کے دو حرفوں کا فرق ہے جیسے کہ قُربَۃ اور قُربیٰ ہے[1]"

واحدی نے تصریح کی ہے کہ یہ اصل میں مصدر ہے جیسے بُشریٰ پھر جب یہ اس چیز کا نام قرار پایا جو سونے والے کے تخیل میں ہوتا ہے تو اسماء کی بجائے استعمال کیا گیا۔ علامہ قرطبی مفہم شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ بعض علماء کا بیان ہے رؤیا کبھی بمعنی رؤیت بھی آتے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ[2] (اور رؤیا جو ہم نے تجھے دکھائی تو اسی لئے دکھلائی کہ لوگوں کے لئے ایک آزمائش ہو) مگر یہ رؤیا بیداری میں تھا اور لوگوں کی آزمائش میں اس لئے ڈالا گیا ہے ان کا بیان ہے کہ رؤیا خواب کیلئے کہا جاتا ہے اور بیداری میں جو ہو اس کو رؤیۃ کہتے ہیں لیکن متنبی ان لوگوں میں سے ہے جس نے رؤیا کا استعمال بیداری کیلئے کیا ہے چنانچہ کہتا ہے ع

ورؤیاک احلیٰ فی العیون من الغمض[3]

(نیم باز آنکھوں کی نسبت تو تیرا (نگاہ بھر کر) دیکھنا آنکھوں کو زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے) نیز ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما آیہ مذکورہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں ھی رؤیا عین اریہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ اسری بہ[4] یہ آنکھ کا دیکھنا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شب اسریٰ میں دکھایا گیا) حافظ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں احتمال ہے کہ اس کو رؤیا سے موسوم کرنے میں یہ حکمت ہو کہ امورِ غیب چونکہ رؤیتِ شہادت کے مخالف ہیں اس لئے وہ عالمِ مثال کے مشابہ قرار دئے گئے[5]۔ $\frac{۱۲}{۱۶،۱۱}$
ص ۱۳ پ ۱۵ ۲۳ $\frac{۲۶}{۱۲}$ ۔

**ریاح** : ہوائیں، ریح کی جمع، واضح رہے کہ قرآن مجید میں جہاں ارسالِ ریح کا تذکرہ ہے اگر لفظ جمع ہے یعنی ریاح کا لفظ استعمال ہوا ہے تو وہاں عام طور

---

[1] انوار التنزیل ج ۱، ص ۳۰۳ [2] فتح الباری، ج ۱۲، ۳۰۹ [3] ایضاً ج ۸، ص ۳۰۲ (طبع میریہ مصر ۱۳۰۰ھ)
[4] صحیح بخاری، کتاب التفسیر باب وما جعلنا الرؤیا التی اریناک الا فتنۃ للناس
[5] فتح الباری، ج ۱۲، ص ۳۰۹ (طبع میریہ مصر)

Marfat.com

پر رحمت کی ہوائیں مراد ہیں اور اگر ریح یعنی واحد کا لفظ
استعمال ہوا ہے تو عذاب کے معنی مراد ہیں امام سیوطی
اتقان میں قرآن مجید کے قاعدہ افراد و جمع کا ذکر کرتے
ہوئے رقمطراز ہیں :-

" اور اسی قاعدہ سے ریح ہے کہ وہ جمع ہو کر بھی
مذکور ہے اور مفرد ہو کر بھی، پس جہاں وہ سیاقِ
رحمت میں ذکر کی گئی ہے، جمع ہو کر مستعمل ہوئی ہے
اور جہاں سیاقِ عذاب میں آئی ہے مفرد لائی گئی
ہے ابن ابی حاتم وغیرہ نے حضرت ابی بن کعب رضی
اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ قرآن مجید میں ریاح
میں سے ہر شے رحمت اور ریح میں سے ہر شے
عذاب ہے اور اسی لئے حدیث میں وارد ہے
اللھم اجعلھا ریاحا ولا تجعلھا ریحا
(اے اللہ اس کو ریاح کر ریح نہ بنا) اور اس کی
حکمت یہ بیان کی گئی ہے کہ رحمت کی ہواؤں کی
صفتیں، ہیئتیں اور منفعتیں مختلف ہیں اور جب بھی
ان میں سے کوئی ہوا چلتی ہے تو ان کے مقابل سے
ایسی چیز ابھار دی جاتی ہے جو اس کی تیزی کو توڑ کر
رکھ دے اور پھر ان دونوں کے درمیان سے ایسی
ہوائے لطیف اٹھتی ہے جو حیوان و نبات دونوں
کو نفع دیتی ہے پس رحمت میں تو کئی ہوائیں
ہوئیں اور عذاب کے اندر ہوا ایک ہی رخ پر آتی
ہے نہ ان کا کوئی روکنے والا ہوتا ہے، نہ دفع
کرنے والا، البتہ سورۂ یونس میں جو ارشادِ الٰہی
وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ (اور لوگوں کو خوش گوار
ہوا کے ساتھ لے کر چلیں) ہے، وہ اس قاعدہ
سے خارج ہے جس کی دو وجہیں ہیں ایک تو
لفظی اور وہ جلنے نہارِ رحمتُ عاصِفًا آیا اس کی
آندھی کی ہوا نے کے مقابلہ میں آتا ہے اور بعض
اوقات ایک شے مقابلہ میں جائز ہوتی ہے
اور استقلالاً ناجائز جیسے وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ
اور دوسری معنوی اور وہ یہ ہے کہ یہاں رحمتِ
تام، وحدتِ ریح سے حاصل ہو گی نہ کہ اختلافِ
ریاح سے کیونکہ کشتی ایک ہی ہوا سے جو ایک ہی
رخ کی ہو، چلتی ہے اور جو اس پر مختلف ہوائیں
چلیں تو تباہی کا سبب ہو پس یہاں ایک ہی ہوا
مطلوب ہے اور اسی لئے اس معنی کی طیب کے
وصف سے تاکید کی گئی ہے اور اسی پر ارشادِ
الٰہی جاری ہوا ہے إِن يَشَأْ يُسْكِنِ الرِّيحَ
فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ (اور اگر چاہے تو تھام دے ہوا کو
تو رہ جائیں سارے دن ٹھہرے) اور ابن المنیر کا بیان
ہے کہ یہ قاعدہ ہی پر ہے کیونکہ ہوا کا تھم جانا

Marfat.com

کشتی بانوں کے لئے سختی اور عذاب ہے۔" سلہ

رَیْبٌ: شک، شبہ، گمان، اَرَابَ یُرِیْبُ کا مصدر ہے اس کے معنی شک اور گمان میں ڈالنے کے ہیں، راغب اصفہانی لکھتے ہیں :-

| | |
|---|---|
| الریب ان تتوھم | ریب یہ ہے کہ کسی شے کے |
| بالشئ امرا ما | متعلق آپ کو ایک بات کا |
| فینکشف عما | وہم ہو اور وہ شے آپ کے وہم |
| تتوھمہ۔ | سے الگ ظاہر ہو |

غرض ریب کا استعمال اس شک یا گمان کے متعلق ہوتا ہے جس کی حقیقت بعد میں اس کے برخلاف منکشف ہو جائے اور چونکہ زمانہ کی گردشوں کے تعین اوقات میں بھی شک ہوتا ہے کہ خدا جانے کب گردش کا وقت آجائے اس لئے جب زمانہ کے ساتھ ریب کا لفظ مستعمل ہوگا تو گردش کے معنی ہونگے ارشاد ہے نَتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (ہم راہ دیکھتے ہیں اس زمانہ کی گردشوں کی)

رِیْبَةٌ: شبہ، شک، ریب سے اسم ہے، رِیَبٌ جمع۔

رَیْبِہِمْ: ان کا شک، ریب مضاف ھم ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ۔

رِیَاحٌ: ہوا، بو، ہوائے متحرک جو آسمان و زمین کے درمیان مسخر ہے ریح کہلاتی ہے، ریح اصل میں رِوْحٌ تھا، دلیل یہ کہ اس کی تصغیر رُوَیْحَۃٌ آتی ہے لیکن ماقبل کے مکسور ہونے کی بنا پر واو کو ی سے بدل لیا گیا ہے، اصل کے اعتبار سے اس کی جمع اَرْوَاحٌ اور کسرہ ماقبل کے اعتبار سے رِیَاحٌ آتی ہے۔ ریح کی چار قسمیں ہیں (۱) شمال (شمالی ہوا) یہ شام کی طرف سے چلتی ہے، موسم گرما میں گرم ہوتی اور خاک اڑاتی ہے (۲) جنوب (جنوبی ہوا) جو اس کے مقابل ہے یہی ریح یمانی ہے (۳) صبا (پروا ہوا) مشرق کی طرف سے چلتی ہے اسی کو قبول بھی کہتے ہیں (۴) دبور (پچھوا ہوا) مغرب کی سمت سے چلتی ہے۔ ریح کا استعمال بیشتر تو مؤنث ہی ہوکر ہے مگر کبھی کبھی مذکر بھی بولا جاتا ہے۔ یہ ابوزید نے نقل کیا ہے اور ابن الانباری کا بیان ہے کہ ریح بلا کسی علامت کے مؤنث ہے اور بجز ایک اعصار (بگولا) کے کہ وہ تو البتہ مذکر ہے، اس کے اور تمام اسماء بھی اسی کی طرح سے ہیں۔ سلہ

سلہ الاتقان ص ۳، ج ۲ (طبع احمدی ۱۲۸۰ھ) سلہ ملخص از المصباح المنیر فی غریب الشرح الکبیر از احمد بن محمد قیومی ج ۱، الراء مع الواو (طبع خیریہ مصر ۱۳۰۵ھ)

Marfat.com

نیز ریح کا استعمال بُو کے معنی میں ہوتا ہے کیونکہ کسی چیز کی بُو جو ناک میں پہنچتی ہے وہ ہوا ہی کے ذریعہ پہنچتی ہے حضرتِ یعقوب علیہ السلام کی زبانی قرآنِ مجید میں منقول ہے اِنِّی لَاَجِدُ رِیۡحَ یُوۡسُفَ (میں پاتا ہوں بُو یوسف کی) اور کبھی کبھی بطورِ استعارہ غلبہ کے لئے بھی ریح کا استعمال ہوتا ہے ارشاد ہے وَتَذۡهَبَ رِیۡحُکُمۡ (اور جاتی رہیگی تمہاری ہوا یعنی غلبہ ختم ہو جا‌ئیگا۔)

۴۲/۳، ۱۱/۸، ۱۳/۱۴۰،۵، ۱۵/۷، ۱۷/۱۱،۶، ۲۲/۸، ۲۳/۱۲، ۲۵/۵، ۲۶/۳

۳۴/۱، ۲۹/۵۔ رِیۡحًا ۲۱/۱۸،۸، ۲۲/۱۶، ۲۷/۸۔

**رَیۡحَانٌ**: خوشبودار پھول، روزی، احمد فیومی المصباح المنیر میں لکھتے ہیں :-

"ریحان ہر اگنے والی خوشبودار شے ہے لیکن عام لوگوں میں جب یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو مخصوص نبات کی طرف پلٹتا ہے نیز اس کے متعلق اختلاف ہے بہت سے یہ کہتے ہیں کہ یہ واوی ہے اور اس کی اصل ریوحان ہے بیاء ساکنہ اور پھر واو مفتوح لیکن اس میں ادغام کر کے تخفیف کر لی گئی ہے باایں دلیل کہ اس کی تصغیر رویحین پر ہے اور ایک جماعت کا یہ بیان ہے کہ یہ یائی ہے بر وزن شیطان اور اس میں تغیر نہیں ہوا ہے باایں دلیل کہ اس کی جمع ریاحین پر ہے جیسے شیطان اور شیاطین ہیں۔" [1]

امام راغب فرماتے ہیں :-

اور فرمانِ ایزدی فَرَوۡحٌ وَّرَیۡحَانٌ میں ریحان تو وہ ہے جس میں رائحہ (بُو) ہو اور روزی کو بھی کہا گیا ہے بہ ارشادِ الٰہی وَالۡحَبُّ ذُو الۡعَصۡفِ وَالرَّیۡحَانُ میں کھانے کے اناج کو ریحان بتایا جاتا ہے۔ ایک اعرابی سے کہا گیا کہ کہاں چلے؟ جواب دیا اطلب من ریحان اللّٰہ میں اللہ کے رزق کی تلاش میں ہوں۔"

محی السنہ بغوی سورۂ الرحمٰن میں ریحان کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :-

"اکثر کے قول میں وہ رزق ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ قرآن میں جہاں ریحان ہے، رزق ہی کے معنی ہیں، حسن بصری اور ابن زید کہتے ہیں کہ یہ وہی تمہارا ریحان ہے جسے سونگھا جاتا ہے۔ ضحاک کا قول ہے کہ عصف بھس اور ریحان اس کا پھل ہے۔" [2]

---

[1] ملاحظہ ہو المصباح المنیر فی غریب الشرح الکبیر از احمد بن محمد فیومی، ۱/۱۲- الراء مع الواو (طبع منیریہ مصر ۱۳۵۲ھ)

[2] تفسیر معالم التنزیل، ج ۴، ص ۱۱۲ (طبع عالمی بمبئی ۱۲۹۱ھ)

Marfat.com

اور سورۂ واقعہ میں ارقام فرماتے ہیں :-

" ریحان استراحت ہے اور مجاہد اور سعید بن جبیر نے رزق کہا ہے، مقاتل کہتے ہیں کہ حمیری زبان میں یہی معنی ہیں، بولا جاتا ہے خرجت اطلب من ریحان اللّٰہ یعنی میں اللہ کے رزق کو طلب کرنے نکلا ہوں ۔ ۔ ۔ دوسرا قول کا بیان ہے کہ ریحان سے وہی ریحان مراد ہے جو سونگھا جاتا ہے، ابو العالیہ کا قول ہے کہ مقربین میں کوئی دنیا سے اس وقت تک رخصت نہیں ہوتا جب تک کہ ریحان جنت سے شاخ لا کر اس کو سنگھا نہ دی جائے، اس کے بعد اس کی روح قبض کی جاتی ہے۔" [1]

علامہ ابن الجوزی نے فنون الافنان میں تصریح کی ہے کہ قرآن میں ہمدان کی زبان میں ریحان بمعنی رزق ہے۔ [2] ۲۷ / ۱۱، ۱۹ -

**رِيْحُكُمْ**: تمہاری ہوا، رِيْحٌ مضاف كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ۔ امام البغوی نے اس کی تفسیر میں حسب ذیل اقوال نقل کئے ہیں :-

" مجاہد کا قول ہے تمہاری نصرت، سدی نے کہا تمہاری جرأت و کوشش، مقاتل کہتے ہیں تمہاری حدت، نضر بن شمیل کا بیان ہے تمہاری قوت، اخفش فرماتے ہیں تمہاری دولت یعنی حکومت۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں :-

" اور "ریح" اس مقام پر حکم کے نافذ ہونے اور اس کے مقصد کے مطابق جاری ہونے سے کنایہ ہے، جب کسی شخص کا معاملہ اس کی مراد کے مطابق آگے بڑھنے لگے تو عرب والے بولتے ہیں ھبت ریح فلان (فلانے کی ہوا آگئی) قتادہ اور ابن زید نے کہا ہے کہ یہ ریح نصر یعنی مدد کی ہوا ہے، کبھی کوئی مدد بغیر اس ہوا کے نہیں ہوتی جس کو حق تعالیٰ اس لئے بھیجتا ہے کہ دشمن کے چہروں پر ضرب لگائے اور اسی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ نصرت بالصبا و اھلکت عاد بالدبور مجھے پروا کے ذریعہ مدد دی گئی اور عاد پچھوا کے ذریعہ ہلاک کئے گئے، اور نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ میں رہا ہوں تو جب کبھی آپ دن کے ابتدائی حصے میں قتال نہ فرماتے تو انتظار کرتے کہ ہوائیں چلنے لگیں اور نمازوں کا وقت آ جائے اور ایک روایت میں یوں ہے کہ یہاں تک انتظار فرماتے کہ آفتاب

[1] تفسیر معالم التنزیل، ج ۴، ص ۱۲۴
[2] الاتقان، السیوطی، ص ۱۸۹ (طبع احمدی)

وصل جائے اور ہوائیں چلنے لگیں اور مدد آنے لگے"۔ ؎۱ پ۸/۲۔

**رِیْشًا**: رونق، لباس، زینت، مال، ریش، اصل میں پرندوں کے پروں کو کہتے ہیں اس کا واحد ریشۃ ہے اور چونکہ پرندوں کی پروں سے رونق ہے اور وہ ان کیلئے ایسے ہی ہیں جیسے انسان کے لئے کپڑے اس لئے بطور استعارہ اس کا استعمال رونق، زیب، زینت اور کپڑوں کے لئے ہوتا ہے نیز رونق اور لباس زینت لازم ہے مال کا اس لئے اس کے معنی مال کے بھی آتے ہیں،

خازنِ بغدادی لکھتے ہیں:-

"آیت میں جو لفظ ریش مذکور ہے اس کے معنی میں علماء مختلف ہیں پس حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما تو مال کے معنی بیان فرماتے ہیں اور یہی قول مجاہد، ضحاک اور سدی کا ہے کیونکہ مال ان چیزوں سے ہے جس کے ذریعہ زینت حاصل کی جاتی ہے چنانچہ جب کوئی شخص مالدار ہو تو کہا جاتا ہے تریش الرجل (وہ مرد مالدار بن گیا) اور ابنِ زید کا قول ہے کہ "ریش" جمال ہے اور یہ معنی بھی زینت ہی کی طرف لوٹتے ہیں اور بیان کیا گیا ہے کہ ریاش عربی زبان میں اثاثہ ہے اور وہ کپڑے اور سامان کہ جس کو ظاہر میں پہنایا جاتا یا بچھایا جاتا ہے اور ریش بھی ان کے نزدیک متاع اور اموال کو کہتے ہیں اور لبا اوقات اہلِ عرب تمام مال چھوڑ کر اس کا استعمال صرف لباس اور کسوت (پہننے کے کپڑے) ہی میں کرتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے انہ لحسن الریش (یعنی اس کے کپڑے عمدہ ہیں) اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ریش اور ریاش کا استعمال فراخی و خوشحالی و خوش عیشی کے لئے بھی ہوتا ہے"۔ ؎۲ پ۸/۱

**رِیْعٌ**: ٹیلا، وہ مکانِ مرتفع جو دور سے ظاہر ہو "ریع" کہلاتا ہے اس کا واحد رِیْعَۃٌ اور جمع رُیُوْعٌ اور اَرْیَاعٌ ہے۔ پ۱۹/۱۱۔

؎۱ معالم التنزیل ج۲، ص۵۲ (طبع بمبئی) ؎۲ تفسیر لباب التاویل المعروف خازن ج۲، ص۸۱ (طبع میمنیہ مصر ۱۳۱۷ھ)

# باب الزاء المعجمة

## فصل الالف

**زَاجِرَاتِ**: ڈانٹنے والیاں، زَجْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مؤنث، مذکر زَاجِرَۃٌ واحد، اکثر مفسرین کے نزدیک یہ فرشتوں کی صفت ہے جو بادل کو ڈانٹ کر ہانکتے اور شیاطین کو جھڑکتے ہیں، چونکہ لفظِ ملائکہ مؤنث ہے اس مناسبت سے صفت بھی مؤنث ہوگئی اور بعض مفسرین کے نزدیک زاجرات سے وہ نواہی مراد ہیں جن سے قرآنِ مجید نے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے (ملاحظہ ہو زَجْرًا)۔ ۲۳/۵۔

**زَادِ**: توشہ، خرچ راہ، فی الوقت جس کی احتیاج ہو اس سے زائد ذخیرہ کو زَادٌ کہتے ہیں یعنی اَزْوَادٌ جمع، پ

**زَادَتْهُ**: اس نے اس کو زیادہ کیا، اس نے اس کو بڑھایا، زَادَتْ زِیَادَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو اَزِیْدُ) ۱۱/۵

**زَادَتْهُمْ**: اس نے ان کو زیادہ کیا، اس نے ان کو بڑھایا، اس میں ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے، ۱۱/۱۵۔

**زَادَکُمْ**: اس نے تم کو زیادہ دیا، اس نے تم کو بڑھایا۔ زَادَ زِیَادَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، ۸/۱۶۔

**زَادُوْکُمْ**: انہوں نے تم کو زیادہ دیا، انہوں نے تم کو بڑھایا، زَادُوْا زِیَادَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، ۱۰/۱۲۔

**زَادُوْهُمْ**: انہوں نے ان کو زیادہ دیا، انہوں نے ان کو بڑھایا، اس میں ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے، پ ۲۶/۱۱ ۱۹/۱۱۔

**زَادَهٗ**: اس نے اس کو زیادہ دیا، اس نے اس کو بڑھایا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے (ملاحظہ ہو زَادَکُمْ) ۲/۱۶۔

**زَادَهُمْ**: اس نے ان کو زیادہ دیا، اس نے ان کو بڑھایا، اس میں ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے، ۲/۱

۴/۹، ۱۹/۳، ۲۱/۱۹، ۲۲/۱۷، ۲۶/۶ ۔

**زَارِعُوْنَ**: کھیتی کرنے والے، زَرْعٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، زَارِعٌ واحد (ملاحظہ ہو تَزْرَعُوْنَ) ۲۷/۱۵ ۔

**زَاغَ**: وہ بہکا، وہ کج ہوا، (ضَرَبَ) زَیْغٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو تَزِغْ)، ۲۷/۵ ۔

**زَاغَتْ**: وہ چوک گئی، وہ بہک گئی، وہ پھری، وہ کج ہوئی، زَیْغٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، ۲۱/۱۸، ۲۳/۱۳ ۔

**زَاغُوْا**: وہ پھر گئے، وہ کج ہوئے، زَیْغٌ سے کا صیغہ جمع مذکر غائب، ۲۸/۹ ۔

**زَالَتْ** وہ زائل ہوئی، زِیَالٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب مَازَالَتْ (یہی رہی، متواتر رہی) افعالِ ناقصہ میں سے ہے فاعل کے ساتھ استمرارِ فعل کے معنی ہوں گے (ملاحظہ ہو تَزَالُ) ۱۷/۲ ۔

**زَالَتَا**: وہ دونوں ٹل گئیں، وہ دونوں اپنے مقام سے ہٹ گئیں، زَوَالٌ سے ماضی کا صیغہ تثنیہ مؤنث غائب (ملاحظہ ہو تَزُوْلُ) ۲۲/۱۴ ۔

**زَانٍ**: زنا کرنے والا مرد، زِنًی سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، اصل میں زَانِیٌ تھا چونکہ اسم منقوص ہے اس لئے رفع اور جر کی حالت میں یٰ جو حرفِ علت ہے، ساقط ہو جاتی ہے (ملاحظہ ہو زنا) ۱۸/۶ ۔

**زَانِیْ**: زنا کرنے والا مرد، زِنًا سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، ۱۸/۶ ۔

**زَانِیَۃٌ**: زنا کرنے والی عورت، زِنًا سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث، ۱۸/۶ ۔

**زَاهِدِیْنَ**: بیزار، زُهْدٌ اور زَهَادَةٌ سے جس کے معنی بے رغبت اور بیزار ہونے اور تھوڑے سے پر راضی ہو جانے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، زَاهِدٌ واحد، ۱۲/۱۲ ۔

**زَاهِقٌ**: مٹ جانے والا، مٹ جانے والا، زائل ہو جانیوالا، زَهْقٌ اور زُهُوْقٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو تَزْهَقُ) ۱۷/۲ ۔

## فصل الباء الموحدة

**زَبَانِیَۃٌ**: سیاست کے پیادے، دوزخ کے فرشتے، زبانیہ عربی زبان میں سیاست کے پیادے یعنی پولیس کے سپاہی کو کہتے ہیں، فریابی نے مجاہد سے اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرشتگان دوزخ کے معنی نقل کئے ہیں، [1] بغوی لکھتے ہیں یہ زِبْنِیٌ کی جمع ہے جو زَبْنٌ سے

[1] فتح الباری، کتاب التفسیر سورۂ علق۔

ماخوذ ہے جس کے معنی دفع کرنے کے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں زبانیہ جہنم کے فرشتے مراد ہیں یہ اس نام سے اس لئے موسوم ہوئے کہ دوزخیوں کو دوزخ کی طرف دھکیلیں گے[1]، اخفش کے نزدیک اس کا واحد زِبْنِیَة ہے[2]، پ ۳۰ ع ۲۱۔

زَبَدُ: جھاگ، اسم ہے، پ ۱۳ ع ۸۔

زَبَدًا پ ۱۳ ع ۸۔

زُبَرَ: لوہے کے تختے لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے زُبْرَۃ کی جمع ہے جیسے کہ غُرْفَۃ کی جمع غُرَف ہے لوہے کے بڑے ٹکڑے کو زُبْرَۃ کہتے ہیں، پ ۱۶ ع ۲۔

زُبُرِ: کتابیں، اوراق، زَبُوْرٌ کی جمع، پ ۴ ع ۱۲، پ ۱۴ ع ۱۵، پ ۲۲ ع ۱۵، پ ۲۷ ع ۱۔

زُبُرًا: ٹکڑے ٹکڑے، پارہ پارہ، امام راغب لکھتے ہیں، کبھی زُبْرَۃ بالوں کے گچھے کے لئے بولا جاتا ہے اور مجازاً اس کا استعمال ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کے لئے ہوتا ہے ارشاد ہے: فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا (پھر پھوٹ کر کر لیا اپنا کام آپس میں ٹکڑے ٹکڑے) علامہ زمخشری نے لکھا ہے کہ یہ زبر الفضة والحدید (چاندی اور لوہے کے ٹکڑے) سے مستعار ہے، قتادہ اور مجاہد نے زُبُرًا کے معنے کتابوں کے بیان کئے ہیں ہر فریق نے اپنا دین اس کتاب کو ٹھہرایا جس کو دوسرے نے دین نہ بنایا[3]، اس صورت میں زَبُوْرٌ کی جمع ہوگا، پ ۱۸ ع ۳۔

زَبُوْرِ: زبور، وہ آسمانی کتاب جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی، زَبْرٌ سے جس کے معنی لکھنے کے ہیں بروزن فَعُوْلٌ ہے بمعنی مفعول یعنی مکتوب کے جیسے رسول ہے زُبُرٌ جمع ہے ابن زید لغوی نے لکھا ہے کہ اصل میں زَبْرٌ چٹان میں کندہ کرنے کو کہتے ہیں اور اہل یمن ہر باب کو زبر بولتے ہیں وہ لوگ شاخ خرما پر لکھا کرتے تھے[4]، علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:۔

"ہر وہ کتاب جس کی کتابت گاڑھی ہو اس کو زَبُور کہا جاتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ زَبُور کتب الٰہیہ میں سے ہر وہ کتاب ہے جس پر واقفیت دشوار ہو، ارشاد ہے: وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ (اور وہ لکھا ہے پہلوں کی کتابوں میں) اور فرمایا: وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ (اور نوشتے اور چمکتی کتاب) اور اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ

فِي الزُّبُرِ دائم کو نار نسخی لکھی گئی ورقوں میں
اور بعض کا قول ہے کہ زبور اس کتاب کا نام ہے
جس میں صرف عقلی حکمتیں ہوں، احکامِ شرعیہ
نہ ہوں اور کتاب اس کو کہتے ہیں جو احکام و
حکم دونوں پر مشتمل ہو اور اس امر پر یہ چیز بھی
دلالت کرتی ہے کہ حضرتِ داؤد علیہ السلام کی
زبور میں احکام میں سے کوئی چیز نہیں ہے۔"

امامِ بغوی لکھتے ہیں:۔

• زبور وہ کتاب ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرتِ
داؤد علیہ السلام کو تعلیم فرمایا تھا، یہ ایک سو پچاس
سورتوں پر مشتمل ہے جو تمام تر دعا و تحمید و تمجید
اور حق تعالیٰ کی ثنا میں ہیں ان میں حلال و حرام
اور فرائض و حدود نہیں ہیں۔[1]

ابن مردویہ نے حضرت جابر بن عبداللہ
رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا زبور رمضان
کی بارہ تاریخ کو نازل ہوئی ہے[2]

یہ واضح رہے کہ موجودہ زبور کے بھی ایک
سو پچاس ہی حصے ہیں جن کو اصطلاحِ اہلِ کتاب میں
مزامیر کہا جاتا ہے مگر یہ وہ اصلی زبور نہیں ہے جو
حضرتِ داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی بلکہ محرفین
اہلِ کتاب نے اس کو بہت کچھ بدل ڈالا ہے چنانچہ
موجودہ زبور خود اس امر کی زندہ شہادت ہے کہ یہ
سب مزامیر حضرتِ داؤد علیہ السلام کے نہیں ہیں
کیونکہ ان میں اگر بعض پر حضرتِ داؤد علیہ السلام کا
نام مذکور ہے تو بعض پر قورح کا جو نغمہ سراؤں کا
استاد تھا اور بعض پر شوشینم کے سرود پر آصف کا
اور بعض پر گتیت کا اور بعض پر کسی کا نام نہیں ہے
نیز بعض مزموروں میں ایسے واقعات کا تذکرہ ہے
جو حضرتِ داؤد علیہ السلام کے صدیوں بعد پیش آئے
ہیں، ١٧/٧ ۔ زَبُوْرًا ٦/١٥/١٦ ۔

## فصل الجیم الموحدہ

**زُجَاجَةٍ**: شیشہ، زُجَاجٌ جمع، ١٨/١١ ۔

**زَجْرًا**: جھڑکنا، ہٹانا، زجر کرنا (لغوی معنی) جج
یَزْجُرُ کا مصدر ہے، ٢٣/٥ ۔

**زَجْرَةٌ**: جھڑکی، ڈانٹ، تہدید، ٢٣/٥ ٤ ۔

## فصل الحاء المہملة

**زُحْزِحَ**: وہ سرکا دیا گیا، وہ ہٹا دیا گیا، وہ دور

[1] معالم التنزیل، ج ٣، ص ١٩٦ (طبع بمبئی ١٢٦٩ھ)

[2] تفسیر ابن کثیر، ج ٢، ص ٢١٦ (طبع مصر ١٣٥٦ھ)

Marfat.com

کردیا گیا، زُحْزِحَ سے جس کے معنے دور کرنے کے ہیں ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے، ۳/۱۸۵۔

**زَحْفًا**: میدانِ جنگ، گھمسان، لشکرِ کثیر (فتح) زَحَفَ یَزْحَفُ کا مصدر ہے، راغب اصفہانی لکھتے ہیں:-

"اصل میں زَحْفٌ کے معنی پاؤں کھینچ کر گھسٹنے کے ہیں جس طرح کہ بچہ چلنے کے قابل ہونے سے پہلے گھسٹتا ہے اور اونٹ تھک کر اپنے پاؤں گھسیٹنے لگتا ہے اور لشکر جب زیادہ ہو تو اس کا چلنا دشوار ہوتا ہے۔"

اور علامہ زمخشری رقمطراز ہیں:-

"زحف وہ انبوہ در انبوہ لشکر ہے کہ جو اپنی کثرت کی بنا پر ایسا معلوم ہونے لگے کہ گویا گھسٹ رہا ہے، یہ زحف الصبی سے ہے جس کا استعمال بچہ کے سرین کے بل ذرا ذرا گھسٹنے کے لئے ہوتا ہے اور مصدر ہی اسم ہو کر مستعمل ہے نہ حروف جمع ہے۔"[1] ۸/۱۵۔

## فصل الخاء المعجمة

**زُخْرُفٍ**: ملمع، سنہری، سونا، آراستہ، زینت اور کسی شے کے کمالِ حسن کو "زخرف" کہتے ہیں اور اسی اعتبار سے سونے کو "زخرف" کہا جاتا ہے لیکن قول کے لئے جب اس کا استعمال ہو تو جھوٹ سے آراستہ کرنے اور ملمع کی باتیں کرنے کے معنے ہوں گے، ارشاد ہے زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (ملمع کی باتیں فریب کی)، ۶/۱۱۲۔ زُخْرُفًا ۴۳/۳۵۔

**زُخْرُفَهَا**: اس کی رونق، اس کی چمک، اس کا سنگار، زُخْرُف مضاف، ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، ۱۰/۲۴۔

## فصل الدال المهملة

**زِدْ**: تو زیادہ کر، زِیَادَةٌ سے امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر (ملاحظہ ہو آیت نیکو و زیادہ) ۷۳/۴۔

**زِدْنٰهُمْ**: ہم نے ان کو بڑھایا، ہم نے ان کو زیادہ دیا۔ زِدْنَا: زِیَادَةٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، ۱۶/۸۸، ۱۸/۱۳۔

**زِدْنِیْ**: مجھے زیادہ دے، مجھے بڑھتی دے، اس میں زِدْ صیغہ امر واحد مذکر حاضر، ن وقایہ اور ی ضمیر واحد متکلم ہے، ۲۰/۱۱۴۔

**زِدْهُ**: اس کو بڑھتی دے، اس کو زیادہ دے، اس

[1] تفسیر کشاف، ج ۱، ص ۲۹۶ (طبع بولاق مصر ۱۲۸۱ھ)

میں صیغہ واحد مذکر حاضر ہے، ۲۳/۱۲ -

## فصل الراء المہملۃ

**زَرَابِیُّ**: مخمل کے بنا لیچے، زِرْبِیٌّ کی جمع ہے جو ایک قسم کا آراستہ کپڑا ہے اور ایک موضع کی طرف منسوب ہے، قرآنِ مجید میں اس کا استعمال بطورِ تشبیہ و استعارہ ہوا ہے، مجدالدین فیروزآبادی قاموس میں لکھتے ہیں:-

"زرابی غالیچے اور فرش میں یا ہر وہ چیز جو بچھائی جائے اور اس پر تکیہ لگایا جائے، اس کا واحد زِرْبِیٌّ ہے زیر کے ساتھ اور کبھی پیش بھی دے دیتے ہیں" ۳۰/۱۲ -

**زُرَّاعَ**: کاشتکار، کھیتی والے، زَارِعٌ کی جمع ہے جو زَرْعٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ہے جس کے معنی کسان اور کاشتکار کے ہیں، ۲۶/۱۲ -

**زُرْتُمُ**: تم نے جا دیکھا، تم نے زیارت کی (نصر) زِیَارَۃٌ سے جس کے معنی زیارت کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، اصل میں زَوْرٌ سینہ کے بالائی حصہ کو کہتے ہیں، اس اعتبار سے زیارت کے معنی سینے کسی کے سامنے ہونے یا کسی کے سینہ کی طرف رُخ کرنے کے ہوتے ہیں، ۳۰/۲۴ -

**زَرْعٌ**: کھیتی، کھیتی کرنا، اگانا، (فتح) زَرَعَ یَزْرَعُ کا مصدر ہے، امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:-

"زرع کے معنی اگانے کے ہیں اور اس کی حقیقت امورِ الٰہیہ کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتی ہے نہ امورِ بشریہ کے ذریعہ نہیں، ارشاد ہے اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ (بھلا دیکھو تو جو تم بوتے ہو کیا تم اس کو اگاتے ہو یا ہم ہیں اگانے والے) پس بونے کو ان کی طرف منسوب کیا اور اگانے کی ان سے نفی کر کے اس کو اپنی ذات کی طرف نسبت دی اور جب بندے کی طرف اس کو نسبت دی جاتی ہے تو اس بنا پر کہ بندہ ان اسباب کو سرانجام دیتا ہے جو اگانے کا سبب ہیں چنانچہ جب تم کسی چیز کے اگنے کا باعث بنو تو کہتے ہو: میں نے یہ اگایا۔

زرع اصل میں مصدر ہے اور مزروع یعنی کھیتی اس سے مراد لی گئی ہے جیسے ارشاد ہے فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا (پھر ہم نکالتے ہیں اس سے کھیتی) اور فرمایا وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ (اور کھیتیاں اور گھر خاصے)"

۴/۴، ۱۳/۱۰، ۱۴/۸، ۲۶/۱۲ -

**زَرْعًا**: ۵/۱۲، ۲۱/۱۶، ۲۳/۱۶ -

**زُرْقًا**: نیلی چشم، کبود چشم، اَزْرَقُ کی جمع جو مذکر

Marfat.com

سے ہے جس کے معنی نیلگوں ہونے کے ہیں۔ صفت مشبہ کا صیغہ ہے جس کی آنکھ کی سیاہی نیلاہٹ یا سبزی یا زردی کی طرف مائل ہو اسے ازرق کہا جاتا ہے۔ علامہ زمخشری لکھتے ہیں :۔

"زُرْقًا کے بارے میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ کبود رنگ عرب کے نزدیک آنکھوں کے بارے میں سب سے مبغوض ترین رنگ ہے کیونکہ رومی جو ان کے دشمن ہیں گربہ چشم ہی ہوتے ہیں اسی لئے انہوں نے دشمن کی صفت یہ بیان کی ہے اسود الکبد اصہب السبال ازرق العین (سیاہ جگر، بھوری مونچھوں والا، کبود چشم) دوسرے یہ کہ اندھے مراد ہیں کیونکہ جس کی آنکھ کی روشنی جاتی رہتی ہے اس کی پتلی نیلی ہو جاتی ہے"

$\frac{16}{14}$ -

**زُرُوْعٍ** : کھیتیاں، زَرْعٌ کی جمع ہے $\frac{19}{12}$، $\frac{25}{14}$ -

## فصل العین المہملۃ

**زَعَمَ** : اس نے دعویٰ کیا، زَعْمٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو زَعَمْتُمْ)، $\frac{25}{15}$ -

**زَعَمْتَ** : تو نے کہا، تو نے خبر دی، زَعْمٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر، $\frac{15}{8}$ -

**زَعَمْتُمْ** : تم نے بتلایا، تم نے سمجھا، تم نے دعویٰ کیا زَعْمٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، $\frac{15}{6}$، $\frac{15}{18}$، $\frac{15}{16}$، $\frac{15}{18}$، $\frac{22}{6}$، $\frac{25}{11}$ -

**زَعْمِهِمْ** : ان کا خیال، ان کا گمان، زَعَمَ، یَزْعَمُ، یَزْعُمُ کا مصدر ہے جو مضاف ہے اور ھم ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ ہے، علامہ احمد فیومی المصباح المنیر میں لکھتے ہیں :۔

"زَعْمٌ میں تین لغتیں ہیں، اہل حجاز کے نزدیک زا کا زبر ہے، قبیلہ اسد کے نزدیک پیش ہے اور قبیلہ قیس کے بعض افراد کے نزدیک زیر ہے اسی سے ہے زعمت الحنفیۃ (حنفیہ نے کہا) زعم سیبویہ (سیبویہ نے کہا) ارشاد الٰہی اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ کَمَا زَعَمْتَ (یا گرائے آسمان ہم پر جیسا کہ کہا کرتا ہے) بھی اسی معنی میں ہے نیز ظن یعنی گمان کے لئے بھی بولتے ہیں فی زعمی کذا (میرا گمان یہ ہے) اور اعتقاد کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے زَعَمَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ یُّبْعَثُوْا (جو لوگ کافر ہیں ان کا اعتقاد ہے کہ ہرگز اٹھائے نہ جائیں گے) ازہری نے کہا ہے کہ زعم بیشتر اس شے میں ہوتا ہے جس میں شک کیا جاتا ہو اور متحقق نہ ہو اور بعض کا قول

Marfat.com

ہے کہ یہ کذب سے کنایہ ہے اور مرزوقی کا بیان ہے
کہ اس کا استعمال اکثر اس شے کے لئے ہوتا ہے
جو باطل ہو یا جس میں شبہ ہو اور ابن القوطیہ کہتے ہیں
زعم زعما کے معنی ہیں ایسی بات کہے جس کے
متعلق پتہ نہیں کہ یہ صحیح ہے یا غلط"[1]۔

زَعِیْمٌ: ذمہ دار، ضامن کہنے والا، قائل، اول
معنی کے اعتبار سے زَعَامَةٌ سے جس کے معنی
ضامن اور کفیل ہونے کے ہیں اور دوسرے معنی
کے لحاظ سے زَعْمٌ سے بروزن فَعِیْلٌ بمعنی اسم
فاعل ہے، راغب لکھتے ہیں:-

" بذریعہ قول یا بسبب ریاست ضمانت دینے
کو زَعَامَةٌ کہا جاتا ہے چنانچہ متکفل اور رئیس
کو زَعِیْمٌ بولتے ہیں کیونکہ ان دونوں کے قول
میں مظنہ کذب ہونے کا یقین موجود ہے۔ ارشاد
ہے وَاَنَا بِهٖ زَعِیْمٌ (اور میں ہوں اس کا ضامن)
اور اَیُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِیْمٌ (کون ان میں اس
کا ذمہ لیتا ہے) یہ زَعَامَةٌ سے بمعنی کفالت
ہے، یا زعم بالقول سے بمعنی زبان سے کہنے
کے ہے"

کلبی کا بیان ہے کہ زعیم اہل یمن کی زبان میں
کفیل کو کہتے ہیں[2]۔ مفسرین نے اس کے معنی ضامن ہی
کے بیان کئے ہیں۔ ۱۲/۷۲، ۶۸/۴۰ -

## فصل الفاء

زَفِیْرٌ: چلانا، زَفَرَ یَزْفِرُ کا مصدر ہے علامہ خازن
بغدادی رقمطراز ہیں:-

" زفیر کی اصل سانس کی اتنی آمد و شد ہے کہ پسلیاں
اس سے پھولنے لگیں اور شہیق سینہ کی
طرف سانس کا لوٹانا ہے یا زفیر سانس کھینچ کر
اس کو سینہ سے نکالنا ہے، حضرت عبداللہ
بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: زفیر
زور کی آواز ہے اور شہیق پست آواز، ضحاک
و مقاتل کا بیان ہے کہ زفیر گدھے کی پہلی آواز
ہے اور شہیق اس کی آخری جبکہ وہ اس کو سینہ
کی طرف لوٹاتا ہے اور ابو العالیہ کہتے ہیں کہ
زفیر حلق میں ہوتی ہے اور شہیق پیٹ میں[3]
۱۱/۱۰۶، ۲۱/۱۰۰، زَفِیْرًا ۲۵/۱۲ -

## فصل القاف

زَقُّوْمٌ: سینہنڈ، تھوہر، جہنم کے ایک درخت

[1] لباب التاویل از علامہ خازن بغدادی، ج ۳، ص ۲۳ (طبع میمنیہ مصر)
[2] ایضاً، ج ۲، ص ۳۳۹، ۳۰۴

کا نام ہے جو دوزخیوں کی غذا بنے گا جب اس کو کھائیں گی گلے میں پھنسے گا، ایک عذاب یہ بھی ہوگا۔ ابن ابی حاتم، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ سے اسی طرح ڈرتے رہو جس طرح کہ ڈرنے کا حق ہے کیونکہ اگر زقوم کا ایک قطرہ بھی دنیا کے سمندروں میں ڈال دیا جائے تو زمین پر بسنے والوں کی زندگیاں خراب کر ڈالے پھر جس کی یہ غذا ہے اس کا تو پوچھنا ہی کیا۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے[1] ۲۳/۶ ۲۵/۱۹ ۲۶/۱۵ ۔

## فصل الکاف

**زکریا:** زکریا علیہ الصلوٰۃ والسلام انبیاء بنی اسرائیل میں مشہور عظیم المرتبت نبی گزرے ہیں، حضرت یحییٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے والد ماجد تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی والدہ ماجدہ حضرت مریم علیہا السلام کی کفالت آپ ہی نے فرمائی تھی۔ مسند احمد بن حنبل، صحیح مسلم اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت زکریا علیہ السلام نجار یعنی بڑھئی تھے[2] تعجب ہے کہ حاکم نے مستدرک میں اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد یہ لکھا ہے:۔

ھٰذا حدیث صحیح علی شرط مسلم ولم یخرجاہ۔ یہ حدیث مسلم کی شرط پر صحیح ہے حالانکہ بخاری و مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا۔

اور امام ذہبی نے بھی تلخیص المستدرک میں اس پر کچھ نہیں کہا[3] حالانکہ صحیح مسلم میں یہ روایت بعینہٖ باب فضائل زکریا صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے[4] اسی طرح حافظ ابن کثیر نے تفسیر سورۂ مریم میں صحیح بخاری کے حوالے سے اس روایت کو نقل کر ڈالا[5] حالانکہ امام بخاری نے سرے سے اس حدیث کی تخریج ہی نہیں کی ہے چنانچہ علامہ عبدالرؤف مناوی نے صاف تصریح کی ہے ولم یخرجہ البخاری[6] (اور بخاری نے اس کو روایت نہیں کیا ہے) اور حافظ بدرالدین عینی لکھتے ہیں انفرد بالاخراجہ مسلم[7] (صرف مسلم نے اس کی روایت کی ہے)

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۱۰ (طبع مصر ۱۳۵۶ھ) [2] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۴۹ (طبع مصر ۱۳۵۱ھ) [3] ملاحظہ ہو المستدرک مع التلخیص ج ۲ ص ۵۹۰ (طبع دائرۃ المعارف ۱۳۳۴ھ) [4] صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۶۸ (طبع اصح المطابع دہلی ۱۳۴۹ھ) [5] ان کے الفاظ یہ ہیں وفی صحیح البخاری ان زکریا کان نجارا یاکل من عمل یدہ فی النجارۃ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۱۱۰) [6] فیض القدیر شرح جامع الصغیر للمناوی ج ۴ ص ۵۹ (طبع مصر ۱۳۵۶ھ) [7] عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری ج ۷ ص ۳۴۴ (طبع دار الطباعۃ العامرہ)

واضح رہے کہ زکریا عجمی نام ہے علاوہ قراءتِ مشہورہ میں مد وقصر دونوں آئے ہیں اور ممدود ہو یا مقصور دونوں صورتوں میں غیر منصرف ہے، پ۳ ع۱۲ پ۱۶ ع۱ پ۱۷ ع۶ (سورتوں کے حوالے)۔

**زکٰوۃ**: ستھرائی، پاکیزگی، زکوٰۃ، تزکیہ سے اسم ہے، علامہ زمخشری تفسیر سورۂ مومنوں میں لکھتے ہیں:۔

"زکوٰۃ ذات اور معنی دونوں کے درمیان مشترک اسم ہے، پس ذات تو نصاب کی وہ مقدار ہے جس کو زکوٰۃ دہندہ فقیر کو نکال کر دیتا ہے اور معنی زکوٰۃ دہندہ کا فعل ہے جس کا نام تزکیہ ہے[1]"۔ اور سورۂ کہف کی تفسیر میں زکوٰۃ کے معنی گناہوں سے پاک و صاف ہونے کے بیان کئے ہیں[2] اور خلیفۂ زمخشری علامہ ناصر بن عبد السید مطرزی المغرب فی ترتیب المعرب میں رقمطراز ہیں:۔

"زکوٰۃ کے معنی تزکیہ کے ہیں ارشاد ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ (اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں) پھر زکوٰۃ مال کی اس مقدار کا نام پڑ گیا کہ جو فقیروں کے لئے نکالی جاتی ہے اور ترکیب (الفاظ) طہارت کو بتا رہی ہے اور بعض کا قول ہے کہ زیادتی اور نمو دپر دلالت کرتی ہے اور یہی ظاہر ہے۔[3]"

اور امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں:۔

"اصل میں زکوٰۃ وہ افزونی ہے جو اللہ تعالیٰ کی برکت سے حاصل ہوتی ہے اور اس کا امورِ دنیویہ و اخرویہ کے ذریعہ اعتبار کیا جاتا ہے چنانچہ جب کھیتی میں افزونی و برکت حاصل ہو تو کہا جاتا ہے زکا الزرع یزکو ارشاد ہے اَيُّهَا اَزْكٰى طَعَامًا کونسا ستھرا کھانا ہے اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو حلال ہو اور انجام کار بدہضمی نہ پیدا کرے اور اسی سے زکوٰۃ اس شے کو کہتے ہیں جسے انسان اللہ تعالیٰ کے حق میں سے فقیروں کو نکالتا ہے اور یہ نام اس لئے ہوا کہ اس میں برکت کی امید ہوتی ہے یا اس لئے کہ نفس کا تزکیہ ہوتا ہے یعنی خیرات و برکات کے ذریعہ اس کا نمو عمل میں آتا ہے یا دونوں سبب سے کیونکہ دونوں خوبیاں اس میں موجود ہیں حق تعالیٰ شانہ نے قرآن مجید میں زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ ساتھ رکھا ہے ارشاد ہے وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (اور نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو) نفس کی پاکیزگی اور طہارت کی بدولت انسان

اس حیثیت میں ہوتا ہے کہ دنیا میں اوصافِ حمیدہ
کا مستحق ہوتا ہے اور آخرت میں اجر و ثواب کا۔ اور
اس کی صورت یہ ہے کہ انسان اس چیز کی کوشش
میں لگ جائے جس میں اس کی پاکیزگی ہے۔
تزکیہ کی نسبت کبھی تو بندہ کی طرف ہوتی ہے
کیونکہ وہ اس کا اکتساب کرتا ہے جیسے قَدْ اَفْلَحَ
مَنْ زَكّٰهَا (مراد کو پہنچا جس نے اس کو درست کیا)
اور کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف اس کو نسبت دی جاتی
ہے کیونکہ حقیقت میں وہی اس کا فاعل ہے
جیسے بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ (بلکہ اللہ پاکیزہ
کرتا ہے جس کو چاہتا ہے) اور کبھی نبی کی طرف
کیونکہ وہی لوگوں کی طرف تزکیہ کے پہنچنے میں واسطہ
ہوتا ہے جیسے تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (اور ان کو
اس کے ذریعہ پاک کر کے اور تربیت دے) اور يَتْلُوْا
عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ (پڑھتا ہے تمہارے
پاس ہماری آیتیں اور تم کو سنوارتا ہے) اور کبھی
عبادت کی طرف کہ جو اس کا ذریعہ ہے جیسے
وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً (اور شوق دیا اپنے
پاس سے اور ستھرائی)"
(ملاحظہ ہو تَزَكّٰى) پ ۵ ع ۱۰، ۱۲ پ ۶ ع ۶ پ ۶ ع ۹ پ ۸ ع ۲، ۸ پ ۱۳ ع ۱۲، ۷
پ [illegible] ع ۱۳، ۱۷ پ ۱۳ ع ۱۱ پ ۱۷ ع ۵، ۱۴، ۱۷ پ ۱۹ ع ۱، ۱۱، ۱۳

پ ۱۶ ع ۱۶، پ ۱۰ ع ۷، پ ۲۳ ع ۱، پ ۱۵ ع ۲۴، پ ۲ ع ۳، پ ۱۲ ع ۱۹، پ ۲۲ ع ۱۲۔
زَكٰى: وہ سنورا، وہ پاک ہوا، وہ درست ہوا۔
(نَصَرَ) زَکَاءٌ سے، جس کے معنے درست ہونے،
سنورنے اور زیادہ ہونے کے ہیں، ماضی کا صیغہ
واحد مذکر غائب، پ ۱۸ ع ۹۔
زَكِيًّا: ستھرا، زَکَاءٌ سے بروزن فَعِيْلٌ صفتِ مشبہ
کا صیغہ واحد مذکر ہے یعنی گناہوں سے پاک کے
باخیر و برکت پر پرورش پانے والے کے۔ اَزْكِيَاءُ جمع۔
امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:-
"زَكِيًّا یعنی مُزَكّٰى بالخلقۃ کہ جس کی خلقت ہی
کو سنوار دیا گیا ہو اور یہ جیسا کہ ہم نے بتایا اجتباء
کے طریق پر ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے کسی بندے
کو عالم اور پاکیزہ اخلاق بنا دیں، سیکھنے اور کوشش
کرنے سے نہیں بلکہ محض توفیقِ الٰہی سے
جس طرح کہ عام طور پر نبیوں اور رسولوں
کے ساتھ ہوتا ہے، نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ
مُزَكّٰى سے موسوم کرنا استقبال میں ہونے کے
اعتبار سے ہو نہ کہ فی الحال اور معنی یہ ہوں کہ جو
مُزَكّٰى ہونے والا ہے۔" پ ۱۶ ع ۵
زَكِيَّةً: ستھرا، گناہوں سے پاک صاف، زَکَاءٌ
سے بروزن فَعِيْلَةٌ صفتِ مشبہ کا صیغہ

واحد مؤنث ہے، ۱۵/۲۲ -

**زَکّٰہَا**: اس کو سنوارا، تَزْکِیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ھا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے (ملاحظہ ہو تُسَنْ کُوْنَ)، ۶/۱۶ -

## فصل اللام

**زِلْتُمْ**: تم الگ رہے، تم علیحدہ رہے، زَیْلٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، مَا زِلْتُمْ تم برابر رہے، تم مسلسل رہے، افعالِ ناقصہ میں سے ہے، اس کا استعمال کسی شے کے مسلسل اور دائمی حالت میں رہنے کے لیے ہوتا ہے (ملاحظہ ہو تَزَال)، ۲۴/۴ -

**زِلْزَالًا**: جھڑ جھڑانا، لرزا دینا، ہلا ڈالنا، زَلْزَلَ یُزَلْزِلُ کا مصدر ہے جس کے معنی ہلانے اور جھڑ جھڑا دینے کے ہیں، راغب نے لکھا ہے کہ اس میں تکرارِ حروف تکرارِ معنی کیلئے ہے یعنی بار بار جھڑ جھڑانا اور ہلا ڈالنا، ۸/۲۱ -

**زِلْزَالَهَا**: اس کا بھونچال، اس کا زلزلہ، اس کا ہلا دینا، زِلْزَالَ مصدر مضاف ھا ضمیر واحد مؤنث غائب، مضاف الیہ، ۱/۳۰ -

**زُلْزِلَتْ**: وہ ہلائی گئی، اس کو لرزایا گیا، اس کو زلزلہ میں ڈالا گیا، زَلْزَلَۃٌ اور زِلْزَالٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب ہے، ۱/۳۰ -

**زُلْزِلُوْا**: وہ جھڑ جھڑائے گئے، وہ زلزلے میں لگرئے، ہلا ڈالے گئے، زَلْزَلَۃٌ اور زِلْزَالٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر غائب، ۲/۱۸ ب -

**زَلْزَلَۃٌ**: بھونچال، زلزلہ، ہلا ڈالنا، زِلْزَالٌ کی طرح یہ بھی زَلْزَلَ یُزَلْزِلُ کا مصدر ہے، ۸/۱۷ -

**زُلَفًا**: رات کی گھڑیاں، ساعاتِ شب، ابوعبیدہ کہتے ہیں، زُلَفُ اللَّیْلِ کے معنی رات کی ساعتوں کے ہیں اس کا واحد زُلْفَۃٌ ہے جس کے معنی ساعت منزلت اور قربت کے ہیں[1] ۱/۱۲ ب -

**زُلْفٰی**: نزدیک، پاس، قریب، درجہ، منزلت، امام بغوی لکھتے ہیں، یہ اسم ہے بوصف مصدر اس میں مذکر، مؤنث، واحد، تثنیہ، جمع سب برابر ہیں[2]۔ امام راغب فرماتے ہیں:-

"زلفتہ کے معنی مرتبہ اور قدم کے ہیں، ارشادِ الٰہی فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَۃً (جب دیکھیں گے وہ پاس لگا) کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں جب وہ مومنوں کے مرتبہ کو دیکھیں گے جس سے وہ محروم ہوگئے اور بعض کا قول ہے کہ زلفتہ کا استعمال عذاب کی جگہ میں اسی طرح ہے جیسے کہ بشارت

[1] عمدۃ القاری، ج ۱۴، ص ۴۶۳

[2] معالم التنزیل، ج ۴، ص ۱۶۹ (طبع بمبئی)

Marfat.com

وغیرہ الفاظ کا استعمال ہوتا ہے۔" ۲۹/۶ ۔

**زُلْفٰی**: درجہ، مرتبہ، مصدر ہے مثل قُربٰی کے جو زُلفۃ کے معنی میں ہیں وہی اس کے ہیں ۲۵/۱۱ ، ۲۳/۱۱،۱۲،۱۵ ۔

**زَلَقًا**: تیز، ایسا صاف کہ جس پر پیر پھسلنے لگے، زَلِقَ یَزْلَقُ کا مصدر ہے، ۱۵/۴۰ ۔

**زَلَلْتُمْ**: تم ڈگمگائے، تم نے لغزش کی، تم نے ٹھوکر کھائی، زَلَّ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر (ملاحظہ ہو تَزِلَّ) ۲/۴ ۔

## فصل المیم

**زُمَرًا**: جتھے جتھے، گروہ در گروہ، جو زُمْرَۃٌ کی جمع جس کے معنی تھوڑی جماعت کے ہیں، ۲۴/۸ ۔

**زَمْهَرِیْرًا**: ٹھر، سخت ٹھنڈ، چاند، آیت شریفہ لَا یَرَوْنَ فِیْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِیْرًا نہیں دیکھتے وہاں دھوپ نہ ٹھر، کی تفسیر میں علامہ زمخشری رقمطراز ہیں :-

"یعنی جنت کی ہوا معتدل ہے نہ وہاں آفتاب کی دھوپ تمازت پہنچاتی ہے نہ سردی کی ٹھر ستاتی ہے، حدیث میں ہے ھواء الجنۃ سجسج لا حر ولا قر (جنت کی ہوا خوشگوار ہے، نہ گرم ہے نہ سرد) اور زمہریر کا ترجمہ ماہتاب بھی کیا گیا ہے، ثعلب کا بیان ہے کہ یہ قبیلہ طے کی لغت میں ہے چنانچہ یہ شعر پیش کیا ہے ؎

ولیلۃ ظلامها قد اعتکر
قطعتها والزمهریر ما زهر

(ایسی رات کہ جس کی اندھیاری چھائی ہوئی تھی اسکو میں نے قطع کیا اور چاند روشن نہ تھا) اور معنی یہ ہوں گے کہ جنت تاباں و درخشاں ہے، وہاں آفتاب کی حاجت ہے نہ ماہتاب کی۔"[1] ۲۹/۱۹ ۔

## فصل النون

**زَنْجَبِیْلًا**: سونٹھ، امام سیوطی الاتقان میں جوالیقی اور ثعالبی سے ناقل ہیں کہ یہ فارسی لفظ ہے[2] اور مولوی غیاث الدین رامپوری غیاث اللغات میں لکھتے ہیں :-

" زنجبیل بالفتح چشمہ ایست در بہشت و نام دوائی معروف و باین معنی معرب زنگویل است از سروری و رسالہ معربات "

[1] تفسیر کشاف ج ۴ ص ۲۴۳ (طبع بولاق مصر ۱۲۸۱ھ)
[2] الاتقان، ص ۱۹۴ (طبع ہندی دہلی ۱۲۸۶ھ)

Marfat.com

علامہ ابنِ دُرَید لغوی جمہرۃ اللغۃ میں رقمطراز ہیں :-

" زنجبیل معرب ہے اور ایک قوم کا بیان ہے کہ زنجبیل کے معنی خمر یعنی شراب کے ہیں " ۔ ؎۱

امام بغوی فرماتے ہیں :-

" سونٹھ ان چیزوں میں سے ہے جن کو عرب گرم ہونے کے اعتبار سے پسند کرتے ہیں اس لئے حق تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا کہ جنت میں ان کو وہ پیالے پلائے جائیں گے جن میں جنت کی سونٹھ کی ملونی ہوگی۔ مقاتل کہتے ہیں یہ دنیا کی سونٹھ جیسی نہ ہوگی۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جنت کی جس چیز کا بھی ذکر کیا اور نام لیا ہے دنیا میں اس کی مثل نہیں ہے اور کہا گیا ہے کہ زنجبیل جنت کا ایک چشمہ ہے جس میں سونٹھ کا مزہ پایا جائے گا، قتادہ کہتے ہیں مقربین تو خالص پئیں گے اور تمام اہلِ جنت کے لئے اس کی ملونی ہوگی " ۔ ؎۲ ۲۹/۱۹ ۔

زِنُوْا : تم زنا کرو (ضَرَبَ) وَ ز ن ی سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر (ملاحظہ ہو و ز ن ی) ۱۵/۱۲ ۔

زِنَانِی : زنا، بدکاری، زَنٰی یَزْنِیْ کا مصدر بغیر عقدِ شرعی کے عورت سے وطی کرنے کا نام زنا ہے ۱۵/۲ ۔

زَنِیْم : بدنام، جو کسی بری علامت سے مشہور ہو وہ شخص جو کسی قوم میں اپنے کو ملائے لیکن ان کے ساتھ ہو نہ ان میں سے ہو۔ ابنِ درید نے جو لغت و عربیت کے امام ہیں جمہرۃ اللغۃ میں یہی دونوں معانی نقل کئے ہیں ؎۳ شاہ عبد القادر صاحب نے موضح القرآن میں پہلے معنی اختیار فرمائے ہیں چنانچہ " زنیم " کا ترجمہ لکھتے ہیں " بدنام یعنی بدی کر مشہور " اور شیخ نور الحق صاحب محدث دہلوی نے دوسرے چنانچہ تیسیر القاری شرح فارسی صحیح بخاری میں رقمطراز ہیں :-

" زنیم، یعنی آنکہ نسبت کردہ شدہ است بقومے کہ از ایشاں نباشد یا خود خواستہ از زنمتی الشاۃ کہ گوشت بر حجم گلوئے آں را پارہ می برند و آویزاں باں می گزارند " ؎۴

حافظ ابنِ کثیر نے سلف صحابہ و تابعین کے متعدد اقوال اس کی تفسیر میں نقل کرنے کے بعد ان

؎۱ جمہرہ، ج ۲، ص ۳۰۰ (طبع دائرۃ المعارف ۱۳۴۵ھ)
؎۲ معالم التنزیل، ج ۴، ص ۱۹۶ (طبع بمبئی)
؎۳ ملاحظہ ہو جمہرہ، ج ۲، ص ۱۹
؎۴ تیسیر القاری، ج ۴، ص ۶۲۵ (طبع علوی لکھنؤ ۱۳۰۵ھ)

Marfat.com

سب کا ملاحظہ الفاظ میں نقل کیا ہے :

والاقوال فی ھٰذا اور اس میں اقوال بہت ہیں
کثیرۃ و ترجع الیٰ ما اور سب اسی طرف لوٹتے ہیں
قلناہ وھو ان الزنیم جو ہم نے بیان کیا کہ زنیم
ھو المشھور بالشر وہ شخص ہے جو برائی میں اتنا
الذی یعرف بہ مشہور ہو کہ اسی کے ذریعہ
بین الناس و لوگوں میں اسے پہچانا جائے
غالبا یکون دعیا اور اکثر ایسا شخص نسب میں
ولد زنا فان فی متہم اور حرام زادہ ہوتا ہے
الغالب یتسلط کیونکہ بیشتر شیطان جتنا
الشیطان علیہ ما لا اس پر مسلط ہوتا ہے دوسرے
یتسلط علیٰ غیرہ پر نہیں ہوتا جیسا کہ حدیث
کما جاء فی الحدیث میں آیا ہے کہ ولد الزنا جنت
لا یدخل الجنۃ ولد میں نہیں جائے گا اور دوسری
زنا وفی الحدیث حدیث میں ہے کہ ولد الزنا
الآخر ولد الزنا شر تینوں میں برا ہے جبکہ
الثلاثۃ اذا عمل اپنے ماں باپ کے عمل سے
بعمل ابویہ سا کرے۔

امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں :-
"زنیم کے بارے میں متعدد اقوال ہیں :

(۱) فراء کا بیان ہے کہ زنیم وہ ہے جس کے نسب میں تہمت ہو قوم میں ملحق ہوا اور ان میں سے نہ ہو، حضرت حسان کہتے ہیں :-

وانت زنیم نیط فی آل ھاشم
کما نیط خلف الراکب القدح الفرد

(اور تو حرام زادہ ہے آلِ ہاشم کے ساتھ میں لٹکایا ہوا جس طرح کہ سوار کے پیچھے اکیلا تیر لٹکایا گیا ہو) اور ہر چیز میں جو زیادتی (یعنی فالتو) ہو وہ زنمۃ ہے اور زنمت الشاۃ بھی اس وقت بولتے ہیں جبکہ بکری کے کان چیرے جائیں اور وہ لٹک کر خشک ہو جائیں اور ایک معلق شے کی طرح باقی رہ جائیں، حاصل یہ کہ زنیم وہ ولد الزنا ہے جو نسب میں قوم کے ساتھ ملحق ہوا اور ان میں سے ہو نہیں، ولید قریش میں نسب کے اندر متہم تھا اور ان کی اصل میں سے نہ تھا، اس کے باپ نے اس کی پیدائش کے اٹھارہ سال کے بعد اس کے متعلق دعویٰ کیا تھا، اور بعض کا قول ہے کہ اس کی ماں نے زنا کیا تھا مگر مشہور نہ تھا یہاں تک کہ آیت نازل ہوئی۔

(۲) شعبی کا قول ہے کہ زنیم وہ ہے جو برائی اور

سلہ تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۵۰۴ (طبع مصر ۱۳۵۶ھ)

علامت ہیں اس طرح مشہور ہو جیسے کہ بکری اپنے زنمہ یعنی کان کے لٹکے ہوئے زائد گوشت سے پہچانی جاتی ہے۔

(۲) عکرمہ، ابن عباس رضی اللہ عنہما سے راوی ہیں کہ زنیم ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس کے گلے میں بھی زائد گوشت تھا جس سے وہ مشہور تھا اور مقاتل نے کہا ہے کہ اس کے کان کی جڑ میں اسی طرح تھا جیسا کہ بکری کے کان کا کٹا ہوا گوشت لٹکا ہوتا ہے [۱] $\frac{۲۹}{۲}$۔

## فصل الواو

**زَوَالٌ**: زائل ہونا، زَالَ یَزُوْلُ کا مصدر ہے، زوال کا استعمال اس شے کے متعلق ہوتا ہے جو پہلے سے قائم ہو، $\frac{۱۳}{۱۹}$ -

**زَوْجٌ**: خاوند، بیوی، جوڑا، بھانت بھانت قسم قسم، علامہ احمد بن علی الفیومی، المصباح المنیر میں رقمطراز ہیں :-

"زوج وہ شکل ہے جس کی کوئی نظیر ہو جیسے کہ اصناف والوان یعنی مختلف قسمیں اور رنگ ہیں اور یا اس کی کوئی نقیض ہو جیسے خشک و تر، نر و مادہ، شب و روز، شیریں و تلخ - ابن درید کہتے ہیں زوج ہر دو کو کہتے ہیں، فرد کی ضد ہے، جوہری کا بھی ان کے اتباع میں یہی بیان ہے کہ ان دو کو جو جفت ہوں زوجان کہا جاتا ہے اور زوج بھی چنانچہ جب تم زوج نعال کہو گے تو دو جوتے مراد لو گے اور زوجان ہو گا تو چار مراد ہوں گے اور ابن قتیبہ کا قول ہے کہ زوج ایک بھی ہوتا ہے اور دو بھی ارشاد الٰہی مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ میں زوج جو یہاں واحد ہی ہے، ابو عبیدہ اور ابن فارس نے بھی یہی کہا ہے۔

اور ازہری کہتے ہیں کہ نحویوں نے دو کے "زوج" ہونے سے انکار کیا ہے، زوج ان کے نزدیک فرد ہے اور یہی درست ہے، ابن الانباری کا بیان ہے کہ عوام خطا کرتے ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ زوج دو ہیں حالانکہ یہ عرب کلام سے نہیں ہے کیونکہ وہ مثلاً زوج حمام (کبوتر کا جوڑا) کہتے وقت زوج کو واحد نہیں بولیں گے بلکہ کہیں گے زوجان من حمام (کبوتر کا ایک جوڑا) زوجان من خفاف (موزوں کا ایک جوڑا) اور پرندوں میں کسی ایک کو زوج نہیں بولتے بلکہ نر کو فرد۔

[۱] تفسیر کبیر، ج ۸، ص ۱۹۸ (طبع خیریہ مصر ۱۳۰۸ھ)

Marfat.com

اور مادہ کو خِرۃ کہتے ہیں اور سجستانی کا قول ہے کہ دو کو زوج نہیں کہا جاتا، نر پرند میں سے نر پرند کے علاوہ کیونکہ یہ جاہلوں کا کلام ہے لیکن ہر دو زوجان ہیں اور بعض نے اس کے لئے خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى (اس نے بنایا جوڑا نر اور مادہ) سے استدلال کیا ہے (کیونکہ اگر زوج دو کے لئے آتا تو زوجین نہ لایا جاتا) ہاں واحد کو زوج کے ساتھ موسوم کرنا اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اس کے ساتھ دوسرا اس کی جنس کا ہو"

**اَزْوَاجٌ** جمع، ۳۰/۱۲، ۱۷/۸، ۱۹/۵، ۲۱/۱۰، ۲۶/۱۵۔

**زَوْجَانِ** (ملاحظہ ہو اَزْوَاجٌ)

**زَوْجَانِ**: قسم قسم، وہ دو شکلیں جن میں سے ہر ایک دوسرے کا نظیر ہو یا نقیض ہو، زَوْجٌ کا تثنیہ بحالتِ رفع، ۲۷/۱۱۔

**زُوِّجَتْ**: اس کا جوڑ ملا دیا گیا تَزْوِیْجٌ سے جس کے معنی ایک کے دوسری شے کے جفت و قرین کرنا اور اسی اعتبار سے مرد و عورت میں عقد کرنے کے معنے آتے ہیں۔ ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب آیتِ شریفہ وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ (اور جب جیوں کے جوڑ بندھیں) کی تفسیر میں امام راغب نے تین قول نقل کئے ہیں (۱) ہر گروہ کو اس کے گروہ کے ساتھ جنت یا دوزخ میں ملا دیا جائے (۲) ارواح کو اجساد کے ساتھ ملا دیا جائے۔ (۳) نفوس کو اپنے اعمال کے ساتھ ملا دیا جائے۔ ۳۰/۶۔

**زَوْجُكَ**: تیری بیوی، تیری جورو، تیری عورت زوج مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ، ۱/۲، ۹/۹، ۱۶/۱۶، ۲۲/۲۔

**زَوَّجْنٰكَهَا**: ہم نے وہ تیرے نکاح میں دی، زَوَّجْنَا تَزْوِیْجٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم کَ ضمیر واحد مذکر حاضر هَا ضمیر واحد مؤنث غائب، ۲۲/۲۔

**زَوَّجْنٰهُمْ**: ہم نے ان کو بیاہ دیا، اس میں هم ضمیر جمع مذکر غائب ہے، ۲۵/۹، ۲۷/۴۔

**زَوْجُهٗ**: اس کی عورت، اس کی بیوی، زوج مضاف ہٗ ضمیر مضاف الیہ ۱/۱۲، ۱۷/۹۔

**زَوْجَهَا**: اس کا جوڑا، اس کا خاوند، زوج مضاف هَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، ۴/۱۲، ۹/۱۴، ۲۳/۱۵، ۲۸/۱۔

**زَوْجَيْنِ**: وہ دو شکلیں جن میں سے ہر ایک دوسرے کا نظیر ہو یا نقیض، جوڑا، زوج کا تثنیہ بحالتِ نصب و جر، آیہ شریفہ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (اور ہر چیز کے بنائے ہم نے جوڑے) میں بعض نے زوجین کے

Marfat.com

معنی نر اور مادہ کے لئے ہیں اور بعض نے مرکب کے اور صحیح، راجح معنوں اور قسموں کے ہیں یعنی ہر شے کی ہم نے دو قسمیں کی ہیں اور قسم سے مراد مقابل ہے یعنی ہر شے میں کوئی نہ کوئی صفت ذاتی یا عرضی ایسی ہے جس سے دوسری شے جس میں اس صفت کی ضد اور نقیض ملحوظ ہے اس کے مقابل شمار کی جاتی ہے جیسے آسمان، زمین، جوہر، عرض، گرمی و سردی، چھوٹی بڑی، خوشنما و بدنما، سفیدی وسیاہی، روشنی و تاریکی وغیرہ وغیرہ، ۴/۱۲، ۳/۱۳، ۱۸/۲، ۲۷/۷، ۴۹/۱۸ ۔

**زُوْرٌ** : جھوٹ، علامہ زمخشری لکھتے ہیں :-

"زور، زَوَرٌ اور اِزْوِرَار سے ہے جس کے معنی انحراف کے ہیں"۔ ؎۱

چونکہ حق جھوٹ سے منحرف ہوتا ہے اس لئے اس کو زور کہا جاتا ہے، ۱۷/۱۱، ۱۹/۴ ۔

**زُوْرًا** ۲۹/۱۹، ۲۹/۱ ۔

## فصل الہاء

**زَهْرَةَ** : رونق، خوبی، تازگی، سرسبزی، زینت، لبا اصل میں کلی جب کھل جاتی ہے تو زَهْرَةٌ کہلاتی ہے اور دنیا کی بہار اور زیب وزینت کیلئے بھی اسی مناسبت سے زھرۃ بولا جاتا ہے، ۱۶/۲۰ ۔

**زَهَقَ** : وہ نکل بھاگا، وہ مٹ گیا، زُهُوْقٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو تزھق)، ۱۵/۸۱ ۔

**زَهُوْقًا** : نکل بھاگنے والا، مٹ جانے والا۔ زُهُوْقٌ سے بروزن فَعُوْلٌ بمعنے اسم فاعل صفتِ مشبہ کا صیغہ ہے، ۱۵/۸۱ ۔

## فصل الیاء المثناۃ

**زِيَادَةٌ** : زیادتی، بڑھتی، زیادہ ہونا، زیادہ کرنا، زَادَ يَزِيْدُ کا مصدر ہے امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں :-

"زیادت کبھی تو مذموم ہوتی ہے جیسے زیادت علی الکفایۃ یعنی کافی سے زائد ہونا مثلاً انگلیوں کا زائد ہونا اور کبھی محمود جیسے ارشادِ ربانی ہے لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ جنہوں نے کی بھلائی ان کو ہے بھلائی اور بڑھتی، متعدد طرق سے مروی ہے کہ یہ زیادت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رخِ انور کی طرف نظر کرنا ہے یا انعامات اور حالات کی جانب اشارہ ہے جن کا دنیا میں تصور کرنا ناممکن ہے اور زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَ

---

؎۱ تفسیر کشاف، ج ۲، ص ۵۴ (طبع بولاق مصر ۱۲۸۱ھ)

Marfat.com

الجسم) اور زیادہ کشائش دی عقل میں اور بدن میں (یعنی
ان کو اہلِ زمانہ کو جو کچھ عطا کیا تھا اس سے زائد مقدار میں ان کو
علم اور جسم میں سے عطا فرمایا) ”اور زیادت بکر و بہر کے
سلسلہ میں ارشاد ہے مَا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا (اور زیادہ
ہوا ان کا بدکنا) اور زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ
(ان کو ہم نے بڑھائی مار پر مار) اور فَمَا تَزِیْدُوْنَنِیْ
غَیْرَ تَخْسِیْرٍ (سو تم کچھ نہیں بڑھاتے میرا سوا نقصان)
اور یہ جو فرمایا فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا (پھر زیادہ کیا
اللہ نے ان کو آزار) تو یہ وہ زیادتی ہے جس پر انسان
کی سرشت بنائی گئی ہے کہ جو شخص کسی فعل کو انجام
دیتا ہے خواہ خیر ہو یا شر، تو اس کی انجام دہی سے
قوت محسوس کر کے دم بڑھتا رہتا ہے۔“
پ۱۱ ب۲۔

**زَیْتُوْنٌ**: زیتون ایک مشہور درخت کا نام ہے پ۱۸ ب۷
پ۳۰ ب۲۴، زَیْتُوْنًا پ۲۴ (ملاحظہ ہو تین)۔

**زَیْتُوْنَةٍ**: درختِ زیتون، اس میں تا وحدت
کی ہے جیسے شَجَرٌ اور شَجَرَةٌ پ۱۸۔

**زَیْتُهَا**: اس کا تیل، زَیْتُ مضاف ھَا ضمیر واحد
مؤنث غائب مضاف الیہ، روغنِ زیتون یعنی
زیتون کے تیل کو زیت کہتے ہیں، پ۱۸۔

**زَیْدٌ**: رضی اللہ عنہ، ایک مشہور صحابی کا اسم گرامی
ہے، حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے الاصابہ میں ان کا مفصل
تذکرہ قلم بند کیا ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے:۔

” زید بن حارثہ بن شراحیل الکلبی
ابنِ سعد کا بیان ہے کہ ان کی ماں سعدیٰ تھیں
ثعلبہ بن عبد عامر کی بیٹی جو بنی معن بن طے میں سے
ہے حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے
ہیں کہ ہم زید بن حارثہ کو زید بن محمد (صلی اللہ علیہ
وسلم) ہی کہا کرتے تھے، یہاں تک کہ یہ آیت نازل
ہوئی اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ (پکارو لے پالکوں کو
ان کے باپ کا کر کر) اس کو بخاری نے روایت
کیا ہے، ہشام بن محمد بن السائب الکلبی اپنے باپ نیز
جمیل بن مرثد الطائی وغیرہ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں
کہ زید بن حارثہ کی والدہ سعدیٰ اپنی قوم میں ملنے
آئیں، زید ان کے ساتھ تھے، زمانہ جاہلیت کی بات ہے،
بنی القین بن جسر کے سواروں نے بنی معن کے گھروں
پر غارتگری کی اور زید کو اٹھا کر لے گئے، یہ اس وقت
نوخیز بچے تھے پھر انہیں بازارِ عکاظ میں لیکر آئے
اور فروخت ہونے کے لئے پیش کیا چنانچہ حکیم
بن حزام (رضی اللہ عنہ) نے اپنی پھوپھی حضرت خدیجہ
رضی اللہ عنہا کے لئے چار سو درہم میں انہیں
خرید لیا اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

Marfat.com

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تو انہوں نے انہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بخش دیا۔

ادھر جب یہ گم ہوئے تو ان کے باپ حارثہ بن شراحیل نے ان کے فراق میں دردناک اشعار کہے جن میں کہا،

بکیت علی زید ولم ادر ما فعل
احی فیرجی ام اتی دونہ الاجل

(میں زید پر رویا حالانکہ مجھے معلوم نہیں اس نے کیا کیا آیا وہ زندہ ہے کہ اس کی آس لگائی جائے یا اس کو موت آ گئی ہے)

ان ہی اشعار کے سلسلہ میں یہ بھی ہے ؎

اوصی بہ عمرا وقیس کلاھما
واوصی یزید اثم بعدھم جبل

(میں اس کے متعلق عمرو اور قیس دونوں کو وصیت کرتا ہوں نیز یزید کو اور ان سب کے بعد جبل کو کرتا ہوں)

عمرو اور قیس سے اس کے دونوں بھائی مراد ہیں اور یزید زید کا ماں شریکی بھائی ہے، یزید ابن کعب بن شراحیل ہے اور جبل سے ان کا بڑا بیٹا مراد ہے۔ راوی کہتا ہے کہ پھر بنی کلب کے کچھ لوگ حج کرنے آئے تو انہوں نے زید کو دیکھا زید انہیں پہچان گئے اور انہوں نے زید کو پہچان لیا تب زید نے کہا کہ میرے گھر والوں کو یہ اشعار پہنچا دینا ؎

احن الی قومی وان کنت نائیا
بانی قطین البیت عند المشاعر

(میں اپنی قوم کا مشتاق ہوں گرچہ دور پڑا ہوا ہوں کیونکہ میں شعائر اللہ کے پاس بیت اللہ میں مقیم ہوں) پھر جب یہ لوگ واپس ہو گئے تو انہوں نے ان کے باپ کو اطلاع دی اور ان کے جائے قیام کو بتلا دیا چنانچہ حارثہ اور ان کا بھائی کعب دونوں زر فدیہ لیکر چل پڑے اور مکہ آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دریافت کیا، کسی نے کہہ دیا آپ مسجد الحرام میں تشریف فرما ہیں۔ بس دونوں آپ کے پاس حاضر ہوئے اور یوں گفتگو شروع کی، اے ابن عبد المطلب! اے سردار قوم کے صاحبزادے! تم لوگ حرم الٰہی کے رہنے والے ہو، مصیبت زدہ کو چھڑاتے ہو، قیدی کو کھانا کھلاتے ہو، ہم تمہارے پاس اپنے لڑکے کے معاملہ میں حاضر ہوئے ہیں جو تمہارا غلام ہے لہٰذا آپ ہم پر احسان فرمائیں اور اس کے زر فدیہ کے بارے میں جو ہم ابھی آپ کے سامنے پیش کئے دیتے ہیں اچھا معاملہ

فرمائیں، آپ نے فرمایا وہ کون ہے؟ کہنے لگے زید بن حارثہ اس پر آپ نے ارشاد فرمایا اس کے علاوہ کوئی اور (بھی ہو) اس کو بلا لو اور اختیار دے دو اگر وہ تمہیں اختیار کرے تو لے لو یہ دے گئے وہ تمہارا ہے اور اگر اس نے مجھے اختیار کیا تو اللہ کی قسم جو مجھے اختیار کرے میں اس پر کسی دوسرے کو پسند کرنے والا نہیں، انہوں نے عرض کیا کہ آپ نے ہمارے ساتھ مزید انصاف فرمایا پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے زید کو بلا کر فرمایا تم ان لوگوں کو جانتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا جی ہاں یہ میرے والد ہیں اور وہ میرے چچا، تب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اور میں جو ہوں تم جانتے ہی ہو اور میری صحبت کو تم دیکھ ہی چکے ہو اب یا تو مجھے اختیار کر لو یا ان دونوں کو، زید نے عرض کیا میں آپ پر کسی کو اختیار کرنے والا نہیں میرے لئے تو آپ ہی بجائے باپ اور چچا کے ہیں، اس پر وہ دونوں بول اٹھے زید تجھ پر افسوس، تو آزادی کے مقابلہ میں غلامی کو اور باپ چچا اور خاندان کے مقابلہ میں انہیں اختیار کرتا ہے، زید نے کہا ہاں میں نے اس ذات میں وہ بات پائی ہے جس کی بنا پر میں اس پر کسی کو پسند نہیں کر سکتا۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب یہ دیکھا تو ان کو حطیم میں لے کر آئے اور ارشاد فرمایا گواہ رہنا کہ زید میرا بیٹا ہے یہ میرا وارث ہو اور میں اس کا وارث (یہ نبوت سے قبل کا واقعہ ہے) ان کے باپ اور چچا نے جب یہ کیفیت دیکھی تو ان کے جی راضی ہو گئے اور واپس لوٹ گئے، جب سے زید بن محمد ہی کہا جاتا تھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو مبعوث کیا اور ابن اسحق نے بھی زید کے والد حارثہ کا ان کی طلب میں آنے کا قصہ اسی کے قریب قریب بیان کیا ہے۔

اور ابن الکلبی اپنے باپ سے، وہ ابو صالح سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے راوی ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید کو متبنّٰی کیا تو زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے ان کا نکاح کر دیا جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پھوپھی حضرت امیمہ بنت عبد المطلب کی صاحبزادی تھیں اور اس سے قبل حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی باندی ام ایمن رضی اللہ عنہا سے ان کا عقد کر دیا تھا چنانچہ حضرت زید کے ام ایمن رضی اللہ عنہا کے بطن سے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے پھر جب انہوں نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دیدی

توآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ام کلثوم بنت عقبہ
رضی اللہ عنہا سے نکاح کر دیا، ام کلثوم کی والدہ
اروی بنت کریز ہیں اور اروی کی ماں بیضاء ہیں جو
عبدالمطلب کی صاحبزادی ہیں چنانچہ اروی کے
بطن سے زید بن زید اور رقیہ پیدا ہوئے پھر
انہوں نے ام کلثوم کو طلاق دیکر درہ بنت
ابی لہب بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہا سے
نکاح کیا، پھر ان کو بھی طلاق دیدی اور حضرت
زبیر رضی اللہ عنہ کی بہن ہند بنت العوام سے
عقد کیا۔

عبدالرزاق، معمر سے، وہ زہری سے روایت
کرتے ہیں کہ ہمیں نہیں معلوم کوئی زید بن حارثہ
رضی اللہ عنہ سے پہلے اسلام لایا ہو، عبدالرزاق
کا بیان ہے کہ زہری کے علاوہ اور کسی نے یہ ذکر
نہیں کیا، حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ واقدی نے
اپنی اسناد کے ساتھ سلیمان بن یسار سے اس
کو جزم کے ساتھ بیان کیا ہے نیز زائدہ کا بھی
یہی قول ہے حضرت زید بن حارثہ بدر اور اس کے
بعد تمام غزوات میں شریک رہے ہیں اور غزوہ موتہ
میں شہید ہوئے ہیں، یہ اس وقت امیر لشکر تھے،
بعض سفروں میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے
ان کو مدینہ میں اپنا خلیفہ کیا ہے حضرت براء بن
عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت
زید بن حارثہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کی خدمت میں عرض کیا تھا، یارسول اللہ
آپ نے میرے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے
درمیان رشتہ مواخاۃ (بھائی چارہ) قائم فرمایا
ہے اس کو ابو یعلیٰ نے روایت کیا ہے حضرت
عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کو جس سریہ
میں بھی بھیجا لوگوں کا امیر بنا کر ہی بھیجا اور اگر وہ
زندہ رہتے تو آپ ان کو خلیفہ بناتے، اس کو
ابوبکر بن ابی شیبہ نے قوی اسناد کے ساتھ روایت
کیا ہے، حضرت سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ کا
بیان ہے کہ میں سات غزوں میں نبی اکرم صلی
اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا اور سات غزوات میں
حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ،
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان ہی کو ہم پر امیر
کرتے رہے، یہ بخاری کی روایت ہے، واقدی نے
کہا ہے کہ زید کا پہلا سریہ قردہ کی طرف ہوا پھر
علی الترتیب جموم، عیص، مطرف، حسمی اور ام قرفہ کی
طرف پھر غزوہ موتہ پر ان کو امیر بنایا گیا اور اسی

Marfat.com

میں شہید ہو گئے، اس وقت ان کی عمر پچپن سال کی تھی، قرآنِ مجید میں ان کے سوا بالاتفاق (صحابہ میں سے) کسی کا ذکر بھی اس کے نام کے ساتھ نہیں ہوا ہے اور اگر ثابت ہو سکے تو پھر سجل میں ہے[1] محمد بن اسامہ بن زید اپنے والد سے راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرتِ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا یا زید انت مولائی ومنی والی واحب الناس الی (اے زید تو میرا آزاد کردہ ہے، مجھ سے ہے اور میری طرف ہے اور مجھ کو سب لوگوں میں زیادہ محبوب ہے) اس کو ابنِ سعد نے اسنادِ حسن سے روایت کیا ہے اور امام احمد کے ہاں بہ طویل روایت ہے اور حضرتِ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کی قسم وہ امارت کے لائق ہے یعنی زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور مجھے سب لوگوں میں زیادہ محبوب ہے، اس کو بخاری نے روایت کیا ہے اور ترمذی وغیرہ نے حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرتِ زید رضی اللہ عنہ مدینہ آئے تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تشریف فرما تھے جب انہوں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر دروازہ پر دستک دی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ان کی طرف کھڑے ہو گئے، تا اینکہ انہیں گلے لگایا اور بوسہ دیا اور حضرتِ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ نے حضرتِ اسامہ رضی اللہ عنہ کا اس سے زیادہ مقرر کیا جتنا میرے لئے مقرر کیا تھا، چنانچہ میں نے ان سے اس کے متعلق دریافت کیا تو فرمانے لگے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھ سے زیادہ محبوب تھے اور ان کے والد تیرے باپ سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیارے تھے، یہ صحیح روایت ہے۔ حضرتِ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے صحیح میں روایت ہے جو حضرتِ انس رضی اللہ عنہ کے واسطے سے ان سے مروی ہے، یہ زینب بنت جحش کے واقعہ میں ہے جس کو ان سے انس، براء بن عازب، ابنِ عباس اور ان کے صاحبزادے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے اور تابعین کی ایک جماعت نے مسلسل روایت

[1] ملاحظہ ہو سجل۔

کیا ہے"۔ ؎ ٣/٢٢ -

**زَیْغٌ** : کجی، اعتدال سے ہٹنا، زاغ یزیغ زَیْغٌ کا مصدر ہے، امام راغب نے اس کے معنے اعتدال سے ہٹنے کے بیان کیے ہیں، ٣/٧ -

**زَیَّلْنَا** : ہم نے جدا کر دیا، ہم نے تفریق کر دی، تَزْیِیْلٌ سے جس کے معنی متفرق اور پراگندہ کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ جمع متکلم، ١١/٢٨ -

**زَیَّنَ** : اس نے سنوارا، اس نے زینت دی، اس نے بھلا کر کے دکھلایا، تَزْیِیْنٌ سے جس کے معنی آراستہ کرنے اور زینت دینے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ٨/١١، ٨/٣، ١٠/٢، ١٣/١٤، ١٩/١٧، ٢٠/١٦ -

**زُیِّنَ** : وہ سنوارا گیا، مزین کیا گیا، اچھا دکھلایا گیا، تَزْیِیْنٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب، ٢/١٠، ٢/١٠، ٨/٢، ١٠/١١، ١١/٧، ١٣/١١، ٢٢/١٤، ٢٤/٩، ٢٦/٢٠،٦ -

**زَیَّنَّا** : ہم نے زینت دی، ہم نے سنوارا، ہم نے رونق دی، تَزْیِیْنٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، ١٤/٦، ١٩/١٦، ٢٣/٣، ٢٣/١٦، ٢٩/١ -

**زَیَّنَّهَا** : ہم نے اس کو رونق دی، ہم نے اس کو زینت دی، اس میں ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے، ١٤/٢، ٢٦/١٥ -

**زِیْنَتَکُمْ** : تمہاری زینت، تمہاری رونق، زِیْنَۃٌ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، یہاں زینت سے لباس مراد ہے، ٨/١ -

**زِیْنَتِهٖ** : اس کی زینت، اس کی آراستگی، زِیْنَۃٌ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ٢٠/٨ -

**زِیْنَتَهَا** : اس کی رونق، اس کی آرائش، زِیْنَۃٌ مضاف ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب، مضاف الیہ، ١١/٢، ١٥/٢، ٢١/١٠ -

**زِیْنَتَهُنَّ** : ان کا سنگار، ان کی زینت، زِیْنَۃٌ مضاف ھُنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب، مضاف الیہ، ١٨/١٠ -

**زَیَّنُوْا** : انہوں نے مزین کر دیا، انہوں نے سنوارا، انہوں نے اچھا کر کے دکھلایا، تَزْیِیْنٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب،

**زَیَّنَهٗ** : اس نے اسے آراستہ کیا، اس نے اسے زینت دی، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے (ملاحظہ ہو زَیَّنَ) ٢٦/١٢ -

**زِیْنَۃٌ** : زینت، زیبائش، آرائش، سنگار، گہنا اسم ہے، امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں :-

" زینتِ حقیقی وہ ہے جو انسان کو کسی حالت میں

؎ ملاحظہ ہو الاصابہ فی تمیز الصحابہ، ج ۱، ص ۵۶۳، ۵۶۴ (طبع السعادہ مصر ۱۳۲۸ھ)

بھی محبوب نہ ہو، نہ دنیا میں، نہ آخرت میں لیکن جو چیز ایک حالت میں تو انسان کو رونق دے اور دوسری حالت میں نہ دے، وہ ایک حیثیت سے معیوب ہے۔

مختصر الفاظ میں زینت کی تین قسمیں ہیں:۔
(۱) زینت نفسی جیسے علم اور عمدہ عقائد (۲) زینتِ بدنی جیسے قوی و بلند و بالا ہونا (۳) زینتِ خارجیہ جیسے مال و جاہ آیت کریمہ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ (اس نے محبت ڈالی تمہارے دل میں ایمان کی اور اچھا دکھایا اس کو تمہارے دلوں میں) زینت نفسی سے متعلق ہے اور مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ (کس نے منع کی ہے رونق اللہ کی) کو زینتِ خارجی پر محمول کیا گیا ہے کیونکہ مروی ہے کہ ایک قوم بیت اللہ کا برہنہ طواف کیا کرتی تھی، اس آیت کے ذریعہ ان لوگوں کو منع کیا گیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ نہیں بلکہ زینتِ مذکورہ سے اس آیت میں کرم مراد ہے جو آیتِ کریمہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (مقرر عزت اللہ کے ہاں اسی کو بڑی ہے جس کو ادب بڑا) میں مذکور ہے اور اسی کو شاعر نے کہا ہے کہ وزینۃ المرء حسن الادب (ادب کی خوبی انسان کی زینت ہے) اور ارشاد الٰہی فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِہٖ فِیْ زِیْنَتِہٖ (پھر نکلا اپنی قوم کے سامنے اپنی تیاری سے) میں زینتِ دنیوی یعنی مال، اثاثہ اور جاہ مراد ہیں۔

آیاتِ کریمات زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ (ہم نے رونق دی ورلے آسمان کو چراغوں سے) اور اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَۃِ ﹰالْکَوَاکِبِ (ہم نے رونق دی آسمان دنیا کو ستاروں کی زیبائش سے) اور زَیَّنّٰہَا لِلنّٰظِرِیْنَ (اس کو رونق دی دیکھنے والوں کے لئے) میں اس زینت کی طرف بھی اشارہ ہے جو نگاہ سے محسوس ہو رہی ہے اور عام و خاص سب اس کو جانتے ہیں اور اس زینت معقولہ کی طرف بھی جس کی معرفت خواص کے ساتھ ہی مخصوص ہے یعنی ستاروں کے احکام اور ان کی رفتار۔

اللہ تعالیٰ کا اشیاء کو زینتِ دنیا کبھی ان کے مزین کر کے ابداع فرماتے اور اسی طرح پیدا کرنے ایجاد کرنے سے ہوتا ہے اور لوگوں کا کسی شے کو مزین کرنا یا تو ان کے آراستہ کرنے سے ہوتا ہے اور یا ان کے قول سے کہ اس کی مدح کرنے لگیں اور بڑھا چڑھا کر اس کا ذکر کریں۔

یوم الزِّینَۃِ کے معنی روزِ عید اور جشن کے دن کے ہیں، ۸/۱۱، ۱۱/۱۲، ۴۶/۷، ۱۵/۱۳،۱۶،۱۸، ۱۸/۱۲،۱۳، ۲۳/۵، ۲۷/۱۹ -

# باب السین المہملۃ

س : اب، ابھی، قریب، عن قریب۔ علامہ سیوطی الاتقان میں لکھتے ہیں :-

"سین حرف ہے جو مضارع کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کو استقبال کے لئے خاص کر دیتا ہے اور مضارع کے بمنزلہ جزو کے ہے اسی لئے اس میں عمل نہیں کیا ہے اہلِ بصرہ اس طرف گئے ہیں کہ سوف کی بہ نسبت مضارع کے ساتھ اس کی نسبت استقبال تنگ تر ہوتی ہے، اہلِ عربیت اس کو حرفِ تنفیس سے تعبیر کرتے ہیں جس کے معنی حرفِ توسیع کے ہیں کیونکہ یہ مضارع کو تنگ زمانہ یعنی حال سے کو سیع زمانہ یعنی استقبال کی طرف پلٹ دیتا ہے اور بعض نے ذکر کیا ہے کہ کبھی استقبال کے استمرار کے لئے آتا ہے جیسے ارشاد ہے سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِیْنَ الآیہ (اب تم دیکھو گے ایک اور لوگ) اور سَیَقُوْلُ السُّفَھَآءُ الآیہ (اب کہیں گے بیوقوف) کیونکہ یہ ان کے اس کہنے کے بعد نازل ہوا ہے کہ وہ کہاب پر پھر گئے تو سین استمرار کو بتانے کے لئے آیا ہے استقبال کے لئے نہیں؛ ابنِ ہشام نے کہا ہے کہ اہلِ نحو اس کو نہیں جانتے بلکہ استمرار تو مضارع سے سمجھا جاتا ہے اور سین استقبال پر آتی ہے کیونکہ استمرار مستقبل ہی میں ہوتا ہے۔

ابنِ ہشام کہتے ہیں کہ زمخشری نے یہ خیال کیا ہے کہ سین جب کسی محبوب یا مکروہ فعل پر داخل ہوتا ہے تو یہ بتاتا ہے کہ وہ ضرور واقع ہوگا اور مجھے نہیں معلوم کہ کسی نے اس کی وجہ سمجھی ہو اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فعل کے ہونے کے وعدہ کو بتاتا ہے پس اس کا اس پر داخل ہونا جو وعدہ یا وعید کو بتائے اس کی تاکید اور اس کے معنی برقرار رہنے کا مقتضی ہے چنانچہ زمخشری نے سورۂ بقرہ میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے چنانچہ

Marfat.com

فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ (سواب کفایت ہے تیری طرف سے ان کو اللہ) میں کہا ہے کہ "سین" کے معنی یہ ہیں کہ یہ لامحالہ ہو کر ہی رہے گا اگرچہ کچھ وقت کی اس کی دیر ہو۔ اور سورۂ براءۃ میں اس کی تصریح ہے چنانچہ آیت اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ (وہ لوگ ان پر رحم کریگا اللہ) میں کہا ہے کہ "سین" لامحالہ وجود رحمت کو بتاتا ہے اور یہ وعدہ کی اسی طرح تاکید کرتا ہے جس طرح تمہارے سَانْتَقِمُ مِنْكَ (بس اب تجھ سے بدلہ لونگا) کہنے میں وعید کی تاکید کرتا ہے۔" ؎

## فصل الالف

**سَآءَ**: برا ہے (نصر، فعل ذم ہے۔ سَوْءٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو اَسْوَءُ)، ۱۴/۱۲ ، ۵/۲ ، ۶/۱۳ ، ۷/۱ ، ۵/۲ ، ۹/۱۲ ، ۲/۸ ، ۹ ، ۱۴/۱۳ ، ۵/۲ ، ۱۶/۱۴ ، ۹/۱۴،۱۹ ، ۲/۱۲ ، ۲/۹ ، ۲۵/۱۸ ، ۲۶/۱۴،۱۳ -

**سَآءَتْ**: بُری ہے، سَوْءٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، ۵/۱۴،۱۱ ، ۵/۱۶ ، ۱۹/۲ ، ۲۶/۹ -

**سٰبِحٰتِ**: تیرنے والیاں، سَبْحٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مؤنث، سَابِحَةٌ کی جمع ہے (ملاحظہ ہو سَبْحٌ)، ۳۰/۲ -

**سٰبِغٰتٍ**: کشادہ زرہیں، سُبُوغٌ سے جس کے معنی وسیع اور فراخ ہونے کے ہیں۔ اسم فاعل کا صیغہ جمع مؤنث، سَابِغَةٌ کی جمع، پوری لمبی چوڑی زرہ کے لئے "سابغہ" کا استعمال ہوتا ہے، ۲۲/۸ -

**سَابِقٌ**: آگے بڑھنے والا، سَبْقٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو تَسْبِقُ اور سَبْقًا)، ۲۲/۱۶ ، ۲۴/۲ -

**سٰبِقٰتِ**: آگے بڑھنے والیاں، سَبْقٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مؤنث، سَابِقَةٌ کی جمع ہے ۳۰/۲ -

**سَابِقُوْا**: دوڑو، سبقت کرو، مُسَابَقَةٌ اور مِسَابَاقٌ سے جس کے معنی دوڑ میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے ہیں، امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، ۲۷/۱۹ -

**سٰبِقُوْنَ**: آگے پہنچنے والے، آگے بڑھنے والے، سَبْقٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالت رفع، سَابِقٌ کی جمع، آیۂ شریفہ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ (اور جو لوگ قدیم میں پہلے وطن چھوڑنے والے اور مدد کرنیوالے) کی تفسیر

؎ الاتقان فی علوم القرآن (طبع احمدی دہلی) ص ۲۲۸، ۲۲۹

Marfat.com

میں حافظ ابن عبدالبر نے اپنی مشہور کتاب الاستیعاب فی اسماء الاصحاب میں حسب ذیل اقوال نقل کئے ہیں:-

(۱) ابن سیرین کہتے ہیں "سابقون اولون" وہ لوگ ہیں جنہوں نے دونوں قبلوں کی طرف نمازیں ادا کی ہیں، محمد بن الحنفیہ اور سعید بن المسیب کا بھی یہی قول[1] ہے۔ امام مالک یحییٰ بن سعید سے وہ سعید بن المسیب سے راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ ماہ تک بیت المقدس کی طرف نماز ادا کی پھر واقعۂ بدر سے دو مہینے پہلے آپ کا رخ کعبہ کی طرف پھیر دیا گیا۔

(۲) محمد بن کعب قرظی اور عطاء بن یسار کا قول ہے کہ یہ اہلِ بدر ہیں، عبیدہ کہتے ہیں کہ اہلِ بدر کی تعداد تین سو تیرہ یا تین سو چودہ تھی۔

(۳) شعبی کا بیان ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے بیعتِ رضوان میں شرکت کی ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ معقل بن یسار اور عبداللہ بن اوفی رضی اللہ عنہم کا بیان ہے کہ ان کی تعداد چودہ سو تھی، یہ تینوں حضرات بھی اس بیعت میں شریک تھے اور ایک روایت میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے پندرہ سو کی تعداد منقول ہے[2]، ۱/۱۰۰، ۴۸/۱۸، ۱۲/۲۷۔

**سَابِقِيْنَ**: آگے بڑھنے والے، سَبْقٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ نصب وجر، سَابِقٌ کی جمع، ۲۹/۳۹۔

**سَاجِدًا**: سجدہ کرنے والا، سُجُوْدٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو اُسْجُدْ)، ۱۵/۲۳۔

**سٰجِدُوْنَ**: سجدہ کرنے والے، سُجُوْدٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ رفع، سَاجِدٌ واحد، ۳/۱۱۔

**سٰجِدِيْنَ**: سجدہ کرنے والے، سُجُوْدٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ نصب وجر، ۹/۴، ۱۲/۱۱، ۱۴/۳،۶، ۱۹/۷،۱۵، ۲۳/۱۴۔

**سَاحَتِهِمْ**: ان کا میدان، ان کا صحن، سَاحَتِ مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، جائے فراخ کو سَاحَةٌ کہتے ہیں اور اسی لئے سَاحَة الدار یعنی صحنِ مکان ہے، ۲۳/۹۔

**سَاحِرٌ**: جادوگر، سِحْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، یہ لفظ صرف سورۂ ذٰریات میں الف کے ساتھ مرقوم ہے اور باقی تمام قرآن میں بغیر الف

[1] حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں حضرت ابو موسیٰ اشعری، حسن بصری اور قتادہ سے بھی یہی نقل کیا ہے ملاحظہ جزء ۲ ص ۳۸۳ طبع مصر ۱۳۵۶ھ

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الاستیعاب، ج ۱ ص ۲ لغایت ص ۷ (طبع مصر ۱۳۲۸ھ) برحاشیہ الاصابہ۔

Marfat.com

ملاحظہ ہو سِحْرٌ) ٩/٢، ٦/١٠، ١١/١٣، ١٦/١٢، ١٩/٧، ٢٣/١٠، ٢٦/٨، ٢٥/١٨، ٢٦/٢١۔

**سٰحِرٰنِ**: دو جادوگر، سِحْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ تثنیہ مذکر بحالتِ رفع، ١٦/١٢۔

**سٰحِرُوْنَ**: جادو کرنے والے، سِحْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ رفع سَاحِرٌ واحد، ١١/١٣۔

**سَاحِلِ**: کنارۂ دریا، ساحلِ سمندر، سَحْلٌ سے جس کے معنی چھیلنے کے ہیں، ماخوذ ہے، چونکہ کنارۂ دریا سے پانی کو جدا کرتا ہے اس لئے ساحل سے موسوم ہوا اور بعض کا خیال ہے کہ یہ بمعنی مسحول ہے کیونکہ پانی اس کو چھیلتا اور کاٹتا ہے لیکن اس کا استعمال بلفظ فاعل ہوا ہے جیسے هَمٌّ نَاصِبٌ بمعنے منصوب ہوتے ہیں، سَوَاحِلُ جمع، ٢٠/١١۔

**سَاخِرِيْنَ**: ہنسی کرنے والے، ٹھٹھا کرنے والے سُخْرِيَّةٌ سے جس کے معنی استہزاء اور مذاق کرنے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ نصب وجر، سَاخِرٌ واحد، ٢٤/٣۔

**سَادَتَنَا**: ہمارے سردار، سَادَةٌ، سَيِّدٌ کی جمع مضاف ہے نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ (ملاحظہ ہو سَيِّدًا) ٢٢/٥۔

**سَادِسُهُمْ**: ان کا چھٹا، سَادِسٌ مضاف

هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، ١٥/٢ ٢٨/٢۔

**سَارِ**: وہ چلا، سَيْرٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، (ملاحظہ ہو تَسِيْرُ) ٢٠/٨۔

**سَارِبٌ**: گلیوں میں پھرنے والا، راہ میں چلنے والا، سُرُوْبٌ سے جس کے معنی اپنے رخ پر چلنے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، سَرْبٌ جمع ہے جیسے رَكْبٌ رَاكِبٌ کی جمع ہے، ١٣/٨۔

**سَارِعُوْا**: جلدی کرو، دوڑو، مُسَارَعَةٌ سے جس کے معنی دوڑنے اور دوڑانے کے ہیں، امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، اس کا تعدیہ بذریعہ اِلٰی ہوتا ہے، ابن جنی نے تصریح کی ہے کہ سَارَعَ متعدی ہے اور سَرُعَ اور أَسْرَعَ دونوں لازم ہیں اور ان دونوں میں باہم فرق یہ ہے کہ سَرُعَ تو پسندیدہ ہے اور أَسْرَعَ کا مطلب اپنی جان کو سرعت کی تکلیف دی،[1] ٤/٦۔

**سَارِقُ**: چور، چوری کرنے والا، سَرِقَةٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، (ملاحظہ ہو سَرَقَ) ٦/١۔

**سٰرِقُوْنَ**: چور، چوری کرنے والا، سَرِقَةٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ رفع سَارِقٌ واحد، ١٣/٢۔

**سَارِقَةُ**: چوری کرنے والی، چرانے والی، سَرِقَةٌ

[1] ملاحظہ ہو تاج المصادر از امام ابوجعفر بیہقی۔

ہے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث، ب۱۔

**سٰرِقِيْنَ**: چرانے والے چوری کرنے والے، یہ اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالت نصب وجر ہے، ۱۲/۴۔

**سَاعَةٌ**: گھڑی، وقت، رات یا دن کا کوئی سا وقت ہو ساعت کہلاتا ہے اہلِ عرب اس کا استعمال وقت ہی کے معنی میں کرتے ہیں چاہے ذرا دیر ہی کے لئے ہو قرآن مجید میں السّاعۃ کا لفظ جہاں کہیں بھی استعمال ہوا ہے اس سے قیامت مراد ہے امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:۔

• زمانہ کے حصوں میں سے کوئی سا بھی حصہ ہو ساعت ہے اور قیامت بھی اس سے مراد لی جاتی ہے، ارشاد ہے اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ (پاس آلگی وہ گھڑی یعنی قیامت) اور يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ (تجھ سے پوچھتے ہیں وہ گھڑی یعنی قیامت) اور عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ (اس کے پاس ہے قیامت کی خبر) اب یا تو حق تعالیٰ شانہ کے جلد حساب لے لینے کے سبب اس کو قیامت سے تشبیہ دی گئی ہے چنانچہ ارشاد ہے وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ (اور وہ شتاب لیتا ہے حساب) اور یا اس وجہ سے کہ جس پر یہ کہہ کر تنبیہ فرمایا ہے كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا (ایسا لگے گا جس دن اس کو دیکھیں گے کہ ان کو دیر نہ لگی مگر ایک شام یا اس کی صبح) اور يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ (اور جس دن ان کو جمع کریگا گویا نہ رہے تھے مگر کوئی گھڑی دن) پس ساعتِ اولیٰ قیامت ہے اور ساعتِ ثانیہ زمانہ کا قلیل وقت۔

اور بعض کا قول ہے کہ وہ ساعات جو قیامت کے معنی دیتی ہیں تین ہیں (۱) الساعۃ الکبریٰ یعنی لوگوں کا حساب دینے کے لئے اٹھنا، اسی کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اشارہ فرمایا ہے لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَظْهَرَ الْفُحْشُ وَالتَّفَحُّشُ وَحَتّٰى يُعْبَدَ الدِّرْهَمُ وَالدِّيْنَارُ (قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ فحش اور بے حیائی کھلم کھلا ہونے لگے اور یہاں تک کہ روپیہ اور اشرفی کی پوجا ہونے لگے) وغیرہ وغیرہ، اور آپ نے بہت سے ان امور کا ذکر فرمایا کہ جو نہ آپ کے زمانہ میں ہوئے اور نہ آپ کے بعد۔ (۲) الساعۃ الوسطیٰ اور یہ ایک قرن کے لوگوں کا مرجانا ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ

Marfat.com

آپ نے عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر فرمایا ان یطل عمر ھذا الغلام لم یمت حتی تقوم الساعۃ (اگر اس لڑکے کی عمر دراز ہوئی تو یہ اس وقت تک نہیں مریگا جب تک قیامت قائم نہ ہو چنانچہ کہا جاتا ہے کہ یہ صحابہ میں سب سے آخری مرنے والے شخص ہیں۔

(۳) الساعۃ الصغرٰی، اور یہ انسان کی موت ہے پس ہر انسان کی ساعت اس کی موت ہے اور اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰہِ حَتّٰی اِذَا جَآءَتْھُمُ السَّاعَۃُ بَغْتَۃً قَالُوْا یٰحَسْرَتَنَا عَلٰی مَا فَرَّطْنَا فِیْھَا (خراب ہوئے جنہوں نے جھوٹ جانا ملنا اللہ کا جب تک کہ آپہنچی ان پر قیامت بے خبر کہنے لگے اے افسوس کیسا قصور کیا اس میں) اور معلوم ہے کہ یہ حسرت انسان کو اس کی موت کے وقت حاصل ہوتی ہے کیونکہ ارشاد ہے وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ (اور خرچ کرو کچھ ہمارا دیا اس سے پہلے کہ پہنچے کسی کو تم میں سے موت تب کہے اے رب کیوں نہ ڈھیل دی مجھ کو ایک تھوڑی مدت کہ میں خیرات کرتا اور رہتا نیک لوگوں میں) اور اسی طرح یہ آیت ہے قُلْ اَرَءَیْتَکُمْ اِنْ اَتٰکُمْ عَذَابُ اللّٰہِ اَوْ اَتَتْکُمُ السَّاعَۃُ (تو کہہ دیکھو تو اگر آوے تم پر عذاب اللہ کا یا آوے تم پر قیامت) اور مروی ہے کہ جب آندھی آتی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا رنگ رو متغیر ہو جاتا اور فرماتے تخوفت الساعۃ (مجھے قیامت کا دھڑکا ہوا) نیز ارشاد ہے ما امد طرفی ولا اغضھا الا والساعۃ قد قامت (میں جب بھی نظر اٹھاتا ہوں یا نیچی کرتا ہوں تو یہ خیال کرتا ہوں کہ قیامت ہو چکی) یعنی موت آ چکی۔"

پ۷/۱۰، پ۸/۱۱، پ۹/۱۳، پ۱۱/۳،۱۰، پ۱۳/۶، پ۱۴/۴،۱۴،۱۷، پ۱۵/۱۵،۱۷، پ۱۶/۱،۸، پ۱۷/۴،۸،۱۴، پ۱۸/۱۷، پ۲۱/۵،۹،۱۳، پ۲۲/۵،۷،۹، پ۲۴/۱۰،۱۱، پ۲۵/۱،۳،۲،۱۳،۲۰، پ۲۶/۴،۹، پ۲۷/۸،۱۰، پ۳۰/۴۔

**سَافِلَھَا**: اس کے نیچے، اس کے تلے، سَافِلَ سُفُوْلٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، مضاف ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ (ملاحظہ ہو اَسْفَلَ) پ۱۲/۷، پ۱۴/۵۔

**سَافِلِیْنَ**: نیچے ہونے والے، سُفُوْلٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالت نصب و جر، پ۳۰/۲

**سَاقٍ**: پنڈلی، علامہ لغوی مجدالدین فیروزآبادی قاموس میں رقمطراز ہیں :-

"ٹخنہ اور گھٹنہ کے جوڑ درمیان ہے، وہ "ساق" ہے، سُوْقٌ سِیْقَانٌ اَوْ اَسْوُقٌ جمع ہو، واؤ کو ہمزہ اس لئے کیا گیا کہ ضمہ کو برداشت کر سکے اور یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ (جس دن کھولی جائے پنڈلی) کے معنی عن شدۃ کے ہیں (یعنی جس دن سختی ظاہر ہو) وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ (اور لپٹ گئی پنڈلی پر پنڈلی) یعنی دنیا کی آخری شدت آخرت کی پہلی شدت سے لپٹ گئی، جب معاملہ کی شدت اور اس کی ہولناکی کی خبر دینا مقصود ہوتا ہے تو ساق کا ذکر کرتے ہیں" ب ۲۹/۱۷،۴ -

**سَاقِطًا**: گرنے والا، سُقُوْطٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو تَسْقُطُ) ب ۲۷/۴ -

**سَاقَيْهَا**: اس کی دونوں پنڈلیاں، سَاقَ مضاف، ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، ساقی اصل میں سَاقَيْنِ تھا سُوْقٌ کا تثنیہ بحالتِ نصب و جر، اضافت کے سبب نٓ ساقط ہو گئی، ب ۱۹/۱۸ -

**سَاكِنًا**: ٹھہرا ہوا، ساکن، سُکُوْنٌ سے جس کے معنی تھمنے اور حرکت کے بعد کسی شے کے ٹھہر جانے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، ب ۱۹/۲ -

**سَالَ**: اس نے مانگا، سُؤَالٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو اِسْئَلْ اور سُؤَالٌ)، ب ۲۹/۷ -

**سَالَتْ**: وہ بہی، وہ جاری ہوئی، (ضَرَبَ) سَیْلَانٌ سے جس کے معنی بہنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، ب ۱۳ -

**سَاَلْتُكَ**: میں نے تجھ سے پوچھا، میں نے تجھ سے سوال کیا، سَاَلْتُ سُؤَالٌ سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم، کَ ضمیر واحد مذکر حاضر، ب ۱۶/۱ -

**سَاَلْتُكُمْ**: میں نے تم سے سوال کیا، میں نے تم سے مانگا، اس میں کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر ہے، ب ۲۲/۱۲ -

**سَاَلْتُمْ**: تم نے مانگا، تم نے سوال کیا، سُؤَالٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، ب ۱ -

**سَاَلْتُمُوْهُ**: تم نے اس کو مانگا، تم نے اس کا سوال کیا، اس میں واؤ اشباع کا، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، ب ۱۳/۱۲ -

**سَاَلْتُمُوْهُنَّ**: تم نے ان (عورتوں) سے مانگا، تم نے ان سے سوال کیا، اس میں واؤ اشباع کا اور ھُنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب ہے، ب ۲۲/۴ -

**سَاَلْتَهُمْ**: تو نے ان سے پوچھا، تو نے ان سے

Marfat.com

سوال کیا، سَاَلْتُ سُؤَالٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، پ۱۴/۱۱، پ۲۱/۱۲،۲ پ۲۴/۱ پ۲۵/۳،۷ -

**سَاَلَكَ**: اس نے تجھ سے پوچھا، اس نے تجھ سے سوال کیا، اس میں کَ ضمیر واحد مذکر حاضر ہے، (ملاحظہ ہو سَاَلَ) پ۲ -

**سَالِمُوْنَ**: چنگے، اچھے بھلے، صحیح سالم، سَلَامَۃٌ سے جس کے معنی آفاتِ ظاہرو باطن سے صحیح سالم رہنے کے ہیں، اسمِ فاعل کا صیغہ جمع مذکر سَالِمٌ کی جمع، پ۲۹/۴ -

**سَاَلُوْا**: انہوں نے مانگا، انہوں نے سوال کیا، سُؤَالٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ۲ -

**سَاَلَهَا**: اس کو پوچھا، اس کا سوال کیا، اس میں ھا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے (ملاحظہ ہو سَاَلَ) پ۷ -

**سَاَلَهُمْ**: ان سے پوچھا، ان سے سوال کیا، اس میں هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے (ملاحظہ ہو سَاَلَ) پ۹ -

**سَامِدُوْنَ**: کھیل کرنے والے، غافل ہونیوالے، تکبر سے سر اٹھانے والے، حیرت میں کھڑے رہنے والے، سُمُوْدٌ سے جس کے معنی کھیلنے، غافل ہونے گانے اور تکبر سے سر اٹھانے اور حیرت میں کھڑے رہ جانے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، سَامِدٌ واحد، ابنِ درید نے تصریح کی ہے کہ یہ یمانی لغت ہے[۱] اور عبد الرزاق بروایتِ عکرمہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے معنی گانے کے نقل کرتے ہیں، عکرمہ کا بیان ہے کہ یہ اہلِ یمن کی زبان ہے جب یمنی تَغَنَّ (تو گا) کہنا چاہیگا تو اس کے لئے اُسْمُدْ بولیگا،[۲] اور امام بخاری اپنی صحیح میں عکرمہ سے ناقل ہیں کہ سَامِدُوْنَ کے معنی حمیری زبان میں گانیوالوں کے ہیں[۳]، نیز عبد الرزاق نے ایک اور طریق سے بروایت عکرمہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے معنی کھیل کرنیوالوں کے، اور بروایت معمر، قتادہ سے، غافل ہونیوالوں کے روایت کئے ہیں اور ابنِ مردویہ بروایتِ سعید بن جبیر حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روگردانی کرنیوالوں کے معنی نقل کرتے ہیں[۴]، پ۲۷ -

**سَامِرًا**: کہانی والا، افسانہ گو، داستان سرا، سَمَرٌ سے جس کے معنی رات میں قصہ گوئی کے ہیں، اسم

---

۱ه جمہرۃ اللغۃ ج ۲ ص ۳۶۵ ۲ه فتح الباری ج ۸ ص ۵۰۶ طبع (الجامع) ص ۳ه صحیح البخاری ج ۲ ص ۷۲۰ (طبع مجتبائی دہلی)
۴ه فتح الباری ج ۸ ص ۴۶۵ (طبع مصر)

فاعل کا صیغہ جمع مذکر، علامہ محمود آلوسی روح المعانی میں رقمطراز ہیں :-

"سامِرًا بربنائے حال منصوب ہے، اور یہ اسم جمع ہے جیسے کہ حاج، حاضر، جامل اور باقر ہیں، اور بعض کا قول ہے کہ یہ مصدر ہے جو بنائے تاویل مشہور حال واقع ہوا ہے اس لئے اپنی اصل کے اعتبار سے قلیل وکثیر سب پر مشتمل ہے مگر مخفی نہ رہے کہ مصدر کا فاعل کے وزن پر آنا نادر ہے اور اسی سے عافیۃ اور عاقبۃ ہے، سمر اصل میں ظلِ قمر (چاند کا سایہ) کو کہتے ہیں اور یہ جیسا کہ مطلع (کتاب کا نام ہے) میں مذکور ہے اپنے دھندلے پن کی وجہ سے اس نام سے موسوم ہے اور بحر میں ہے کہ درختوں پر جو چاندنی پڑتی ہے اسے کہتے ہیں، اور راغب کا بیان ہے کہ یہ رات کی اندھیاری ہے بعد میں رات میں باتیں کرنے کے معنی میں اس کا استعمال ہونے لگا، اور بعض نے سامر کی تفسیر اندھیری رات سے کی ہے اور یہاں اس معنی میں اس کا ہونا اور پھر بربنائے نزع خافض اسے منصوب قرار دینا کچھ نہیں ہے"[1] ع ۱۸

سَامِرِيٌّ ع، سامری، علامہ محمود زمخشری، کشاف میں رقمطراز ہیں :-

"سامری بنی اسرائیل کے ایک قبیلہ کی طرف منسوب ہے جس کو سامرہ کہا جاتا ہے، اور بعض کا قول ہے کہ سامرہ یہود میں ایک قوم ہے جو بعض مذہبی چیزوں میں یہود کی مخالف ہے، اور بعض نے اس کو باجرما کا رہنے والا بتایا ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ کرمان کا ایک دیہاتی کافر تھا، اس کا نام موسیٰ بن ظفر ہے، یہ منافق تھا اور اسلام ظاہر کرتا تھا، اس کی قوم گائے کی پجاری تھی[2]

اور مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں :-

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سامری کون تھا، یہ اس کا نام تھا یا قومیت کا لقب؟ قیاس کہتا ہے کہ یہاں سامری سے مقصود سمیری قوم کا فرد ہے کیونکہ جس قوم کو ہم نے سمیری کے نام سے پکارنا شروع کر دیا ہے، عربی میں قدیم سے اس کا نام سامری چلا آ رہا ہے اور اب بھی عراق میں ان کا بقایا اسی نام سے پکارا جاتا ہے، یہاں قرآن کا "السامری" کہہ کے اسے پکارنا صاف کہہ رہا ہے کہ یہ نام نہیں ہے اس کی قومیت کی طرف اشارہ ہے یعنی وہ شخص اسرائیلی نہ تھا، سامری تھا،

[1] روح المعانی، ج ۱۶، ص ۲۴۵ (طبع منیریہ مصر)

[2] کشاف، ج ۳، ص ۷۹، (طبع بولاق مصر ۱۲۸۱ھ)

Marfat.com

حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً ساڑھے تین ہزار برس پہلے دجلہ و فرات کے دوآبے میں دو مختلف قومیں آباد ہو رہی تھیں اور ایک عظیم الشان تمدن کی بنیادیں اٹھا رہی تھیں، ان میں ایک قوم جو جنوب سے آئی تھی سومری تھی دوسری جس کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ شمال سے آئی سمیری تھی، اسی قوم کے نام سے تاریخ قدیم کا شہر سامرہ اور آباد ہوا تھا جس کا محل تل العبید میں دریافت ہوا ہے اور وہاں سے پانچ ہزار برس پیشتر کے بنے ہوئے زیور اور سنہری ظروف برآمد ہوئے ہیں۔

بہرحال سمیری قبائل کا اصلی وطن عراق تھا مگر یہ دور دور تک پھیل گئے تھے، مصر ان سے تعلقات کا سراغ ایک ہزار سال قبل مسیح تک روشنی میں آچکا ہے پس معلوم ہوتا ہے اسی قوم کا ایک فرد حضرتِ موسیٰ کا بھی معتقد ہو گیا اور جب بنی اسرائیل نکلے تو یہ بھی ان کے ساتھ نکل آیا، اسی کو قرآن نے "السامری" کے لفظ سے یاد کیا ہے گائے بیل اور بچھڑے کی تقدیس کا خیال سمیریوں میں بھی تھا اور مصریوں میں بھی ہے[1]"

پ ۱۶/۱۳،۱۴ -

**سَاوٰی**: اس نے برابر کر دیا، وہ برابر ہو گیا مُسَاوَاۃٌ سے جس کے معنی برابر کرنے اور برابر ہونے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ ۱۶/۲

**سَاهِرَةِ**: میدان زمین، روئے زمین، سَهْرٌ سے جس کے معنی نیند اُڑ جانے کے ہیں اسمِ فاعل کا صیغہ واحد مؤنث مگر اس کا استعمال زمین اور روئے زمین کے معنی میں ہوتا ہے، امام رازی تفسیر کبیر میں رقمطراز ہیں:-

"ساہرہ سفید ہموار زمین کو کہتے ہیں، اس نام سے اس کے موسوم ہونے کی دو وجہیں ہیں،
(۱) اس پر چلنے والا خوف سے سوتا نہیں،
(۲) اس میں سراب رواں ہوتا ہے یہ عرب کے محاورہ عین ساہرۃ (چشمہ رواں) سے ماخوذ ہے اور میرے نزدیک اس میں تیسری وجہ بھی ہے وہ یہ کہ زمین کا ساہرۃ اس لئے نام پڑا کہ شدتِ خوف کے باعث اس میں انسان کی نیند اُڑ جاتی ہے تو وہ زمین کہ جس کے اندر قیامت کے موقع پر کافر جمع ہوں گے نہایت ہی خوف میں ہوں گے لہٰذا اس زمین کا نام ساہرہ اس

[1] ترجمان القرآن، ج ۲، ص ۴۶۴ و ۴۶۵

Marfat.com

بنا پر ہوا۔

پھر ایک اور وجہ سے بھی علماء میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ دنیا کی زمین ہے اور دوسروں کا بیان ہے کہ ارضِ آخرت ہے کیونکہ لوگ زجرہ (جھڑکی) صیحہ (شور) کے وقت جوق در جوق آخرت کی زمین پر منتقل ہو گئے، شاید یہ وجہ زیادہ قریب ہو۔ پ۳۰ ع۲۔

**سَاهَمَ**: اس نے قرعہ ڈلوایا، مُسَاهَمَةٌ سے جس کے معنے کسی کے ساتھ قرعہ ڈالنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ۲۳ ع۹۔

**سَاهُوْنَ**: بے خبر، بھولنے والے، فاعل سَهْوٌ سے جس کے معنی غافل ہونے کے ہیں، اسمِ فاعل کا صیغہ جمع مذکر۔ سَاهُوْنَ اصل میں سَاهِيُوْنَ تھا بروزن فَاعِلُوْنَ، یٰ مضموم ماقبل اس کا مکسور ضمہ یٰ پر ثقیل ہوا، نقل کر کے ماقبل کو دیا، اب وٗ اور یٰ دو ساکن جمع ہوئے، یٰ کو حذف کر دیا۔ امام راغب لکھتے ہیں:۔

"غفلت سے جو خطا ہو وہ "سہو" ہے، اس کی دو قسمیں ہیں، ایک یہ کہ انسان سے ایسی چیزیں سرزد نہ ہوں جو اس خطا کو کھینچتی اور پیدا کرتی ہیں جیسے دیوانہ کسی انسان کو گالی دے، دوسرے یہ کہ اس سے ایسی چیزیں ہوئیں جو اس خطا کو پیدا کرتی ہیں جیسے وہ شخص کہ جس نے شراب پی اور پھر اس سے کوئی برائی بغیر اس برائی کے ارادہ کے ظہور میں آئی تو پہلی خطا تو اس کی معاف ہے اور دوسری پر ماخوذ ہو گا اور دوسری طرح کی خطا پر حق تعالیٰ نے مذمت فرمائی ہے، ارشاد ہے فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ (غفلت میں بھول رہے ہیں) عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (اپنی نماز سے بے خبر ہیں)"

پ۲۶ ع۱۸ پ۳۰ ع۳۲۔

**سَائِبَةٍ**: سائبہ اہلِ جاہلیت مویشی میں سے جو جانور رب کے نام پر آزاد کرتے اور اسے اپنے اختیار پر چھوڑ دیتے، وہ "سائبہ" تھا۔

امام فخر الدین رازیؒ تفسیر کبیر میں رقمطراز ہیں:۔

"سائبہ بروزن فاعلۃ، ساب سے ہے جو سطح زمین پر کسی چیز کے رواں ہونے کے لئے استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے ساب الماء (پانی رواں ہوا) سابت الحیۃ (سانپ رواں ہوا) پس جو جانور اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ جدھر چاہے چلا جائے وہ سائبہ ہے اور یہ بمعنی مسیبۃ (رواں شدہ

ؔ تفسیر کبیر، ج ۸، ص ۳۴۴ (طبع مصر ۱۳۰۹ھ)

اسم فاعل بمعنی اسم مفعول) ہے جیسے کہ عیشۃ راضیۃ بمعنی مرضیۃ ہے اور اس کے متعلق علماء نے متعدد صورتیں بیان کی ہیں:۔

(۱) ابوعبیدہ کا بیان ہے کہ کوئی شخص جب بیمار ہو جاتا یا سفر سے واپس ہوتا یا کوئی منت مانتا یا کسی نعمت کا شکرانہ ادا کرتا تو اونٹ چھوڑ دیتا جو تمام احکام میں بحیرہ[۱] کی طرح ہوتا تھا۔

(۲) فراء کا قول ہے کہ جب ناقہ دس بچے دے چکتی جو سب کے سب مادہ ہوتے تو اسے چھوڑ دیا جاتا نہ اس پر سواری کی جاتی نہ اس کا دودھ دوہا جاتا اور نہ اس کی اون کاٹی جاتی اور نہ بجز بچہ یا مہمان کے کوئی اس کا دودھ پیتا تھا۔

(۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سائبۃ وہ ہے جو بتوں کے لئے لیجائی جاتی یعنی ان کے لئے چھوڑی جاتی تھی، ایک شخص اپنے مال میں سے جو چاہتا چھوڑ دیتا اور اسے لیکر پجاریوں کے پاس جو ان کے بتوں کے خادم تھے آتا تھا اور وہ مسافروں کو اس کا دودھ پلاتے تھے۔

(۴) سائبۃ وہ غلام ہے جو اس طرح پر آزاد کیا جاتا کہ نہ اس پر ولاء ہوگی نہ دیت اور نہ میراث۔"[۲]

شیخ نور الحق محدث دہلوی، تیسیر القاری میں فرماتے ہیں:۔

"ابوعبیدہ گوید سائبہ از سہر انعام می باشد کہ نذر بتاں کردند می گذاشتند و بعضے گویند مخصوص بہ شتر ست۔"[۳]

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے عمرو بن عامر خزاعی کو دیکھا کہ وہ اپنی آنتیں آگ میں کھینچ رہا ہے یہ پہلا شخص ہے جس نے سوائب (سانڈنیاں) کو چھوڑا ہے۔[۴] ۔

**سٰٓئِحٰتٍ**: روزہ دار، سیاحۃ سے جس کے معنی زمین پر چلنے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ جمع مؤنث، سائحۃ واحد، اس اعتبار سے اس کے لغوی معنی زمین پر سیر و سیاحت کرنے والیوں کے ہیں لیکن سلف کی اکثریت نے اس کی تفسیر صائمات یعنی روزہ رکھنے والیوں سے کی ہے حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں

---

[۱] وضاحت ہو لفظ بحیرہ [۲] تفسیر کبیر، ج ۳، ص ۴۵۷، ۴۵۸ [۳] تیسیر القاری شرح صحیح البخاری ج ۳، ص ۳۱ (طبع نولکشور)
[۴] صحیح البخاری، ج ۲، ص ۶۶۵ (طبع مجتبائی دہلی)

صحابہ میں سے حضرتِ ابوہریرہ حضرت عائشہ، حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہم اور تابعین اہلِ تفسیر میں سے عکرمہ، مجاہد، سعید بن جبیر، عطار، محمد بن کعب قرظی، ابوعبدالرحمٰن سلمی، ابومالک، ابراہیم نخعی، حسن، قتادہ، ضحاک، ربیع بن انس اور سدی وغیرہم کا یہی قول نقل کیا ہے اور زید بن اسلم اور ان کے صاحبزادے عبدالرحمٰن نے اس کی تفسیر مہاجرات (ہجرت کرنے والیاں) سے کی ہے مگر پہلا قول اولیٰ ہے۔[1]

علامہ زمخشری، کشاف میں سورہ التحریم میں اس لفظ کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

صائم کو سائح کہا گیا کیونکہ اس کے پاس توشہ نہیں ہوتا اس لئے جب تک کھانے کو نہ ملے رکا رہتا ہے پس روزہ دار کو افطار کا وقت آجانے تک رک جانے میں اس سے تشبیہ دی گئی ہے۔" ۲۸/۱۹

**سَآئِحُوْنَ**: بےتعلق رہنے والے، یہ شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ ہے فرماتے ہیں:-

"بےتعلق رہنا روزہ ہے یا ہجرت ہے یا دل نہ لگا دینا دنیا کے مزوں میں" (موضح القرآن)

سِیَاحَۃٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر سَآئِحٌ واحد، علامہ خازن بغدادی لکھتے ہیں:-

"سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ صائم کا سائح اس لئے نام پڑا کہ سیاحت کرنے والا کھانا پینا نکاح کرنا سب لذتوں کو ترک کر دیتا ہے اور ازہری کا بیان ہے کہ جو شخص عابدانہ طریق پر زمین میں سیاحت کرتا ہے اس کے ساتھ توشہ نہیں رہتا اس لئے وہ کھانے سے کا رہتا ہے اور اسی طرح روزہ دار بھی کھانے سے رک جاتا ہے اور بعض کا قول ہے کہ سیاحت اصل میں زمین پر برابر چلتے رہنے کا نام ہے جیسے کہ بہتا پانی ہوتا ہے اور روزہ دار بھی برابر طاعت کی بجا آوری اور امرِ ممنوع کے ترک میں مشغول رہتا ہے عطا کہتے ہیں کہ "سائحون" سے مراد راہِ خدا کے غازی اور مجاہد ہیں اور اس پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جو حضرتِ عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) مجھے سیاحت کی اجازت عطا فرمائیے، تو آپ نے ارشاد فرمایا میری امت کی سیاحت اللہ کی راہ میں جہاد ہے۔ بغوی نے اس روایت کو بغیر سند کے ذکر کیا ہے

[1] ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر ج ۴، ص ۳۹۰ (طبع مصر ۱۳۵۶ھ)

Marfat.com

عکرمہ نے کہا ہے کہ "سائحون" سے طالب علم مراد ہیں کہ جو طلبِ علم میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں پھرتے رہتے ہیں اور بعض کا قول ہے کہ کہ نفس کی درستگی اور اخلاق کی خوبی میں سیاحت کو بڑا دخل ہے کیونکہ ضرور ہے کہ سیاحت کرنے والے کو طرح طرح کی تکلیفات اور مشقتوں سے سابقہ پڑے جن پر صبر کرنا اسے لابدی ہے، دوران سیاحت میں علماء و صلحاء سے ملاقات ہوگی اور ان سے استفادہ کرکے ان کی برکتوں کو لے کر واپس ہوگا نیز قدرتِ الٰہی کے آثار و عجائبات نظر پڑیں گے اور ان پر غور کریگا تو حق تعالٰی کی وحدانیت اور اس کی عظمت قدرت کیطرف رہنمائی کریں گے۔" [1]

امام راغب "مفردات القرآن" میں تحریر کرتے ہیں :-

"بعض نے کہا ہے کہ روزہ کی دو قسمیں ہیں ایک حقیقی یعنی کھانے پینے اور جماع کو ترک کرنا دوسرے حکمی یعنی جوارح کان، آنکھ، زبان وغیرہ کی معاصی سے حفاظت کرنا، پس سائح وہ ہے جو پہلی قسم کا روزہ نہیں بلکہ یہ روزہ رکھے اور بعض کا قول ہے کہ سائحون وہ ہیں جو اس آیت کے مقتضی کی تلاش میں رہتے ہیں أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا (کیا پھرے نہیں ملک میں جو ان کے دل ہوتے جن سے بوجھتے یا کان ہوتے جن سے سنتے۔")

حافظ ابن کثیر نے مفسرین سلف صحابہ و تابعین سے اس کی تفسیر میں روزہ داروں کے معنی نقل کرکے لکھا ہے کہ اس بارے میں حدیث مرفوع بھی وارد ہوئی ہے، ابن جریر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سائحون روزہ دار ہیں مگر یہ موقوفاً اصح ہے نیز ابن جریر نے عبید بن عمیر سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سائحین کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا وہ روزہ رکھنے والے ہیں۔ ابن کثیر کہتے ہیں یہ مرسل جید ہے اور یہ معنی سب اقوال میں اصح اور زیادہ مشہور ہیں اور ایسی روایت بھی آئی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ سیاحت سے مراد جہاد ہے، اس کے بعد لکھتے ہیں مگر سیاحت سے مراد وہ نہیں ہے جو بعض متعبدین سمجھ بیٹھے ہیں کہ بس محض زمین میں پھر لینا اور پہاڑ کی چوٹیوں اور کھوؤں اور جنگلوں میں تنہا بسر کرنا سیاحت ہے کیونکہ یہ چیز بجز اس زمانہ کے جب کہ

[1] لباب التاویل فی معانی التنزیل، ج ۲، ص ۲۶۹ (طبع مصر)

Marfat.com

فتنوں کا زمانہ ہو اور مذہب پامال ہو رہا ہو اور کسی وقت مشروع نہیں ہے[1]۔ پ ۳ ۔

سَائِغٌ: خوشگوار، رچتا پچتا، سَوْغٌ سے جس کے معنی آسانی کے ساتھ کھانے پینے کے حلق سے نیچے اتر جانے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ۔ ۲۲/۱۴ ۔ سَائِغًا پ ۱۴/۱۵ ۔

سَائِقٌ: ہانکنے والا، سَوْقٌ سے جس کے معنے ہانکنے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، یہاں وہ فرشتہ مراد ہے جو حشر میں کھینچ کر لائے گا ۔ پ ۲۶/۱۶ ۔

سَائِلٌ: مانگنے والا، سوال کرنے والا، سُؤَالٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، آیت شریفہ سَاَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ کی تفسیر میں ابن ابی حاتم نے ابن زید سے یہ روایت کی ہے کہ جہنم کی ایک وادی ہے جسے سائل کہا جاتا ہے[2]، حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ قول ضعیف اور مراد سے دور ہے، صحیح پہلے ہی معنی ہیں کیونکہ سیاق اسی کو بتا رہا ہے[3] (ملاحظہ ہو اِسْئَلْ اور سُؤَالٌ)، پ ۲۶/۱۸، پ ۲۹/۷، ۲۰/۱۸ ۔

سَائِلِیْنَ: مانگنے والے، سوال کرنے والے، پوچھنے والے، سُؤَالٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ نصب و جر، پ ۶/۶، پ ۱۳/۱۲، پ ۲۴/۱۶ ۔

## فصل الباء الموحدہ

سَبَا: ایک قوم کا نام جن کا وطن عرب میں تھا یمن کی طرف (موضح القرآن) امام ابن جریر طبری حضرت فروہ بن مسیک غطیفی رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے سبا سے مطلع فرمائیے وہ کیا ہے؟ آیا وہ کوئی ملک ہے یا کوئی عورت ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہ تو وہ کوئی ملک ہے اور نہ کوئی عورت بلکہ ایک شخص ہے جس کے دس اولادیں ہوئیں چھ نے یمن کی سمت کو اختیار کیا اور چار نے شام کو جو لوگ کہ ملک شام میں ہیں وہ لخم، جذام، عاملہ اور غسان ہیں اور جنہوں نے یمن کی سمت کو اختیار کیا وہ کندہ، اشعریین، ازد، مذحج، حمیر اور انمار ہیں، تب اس شخص نے دریافت کیا انمار کون ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ لوگ جن میں خثعم اور بجیلہ ہیں، امام ترمذی نے بھی اس حدیث کو اپنی جامع میں اس سے زیادہ بسط کے ساتھ روایت کیا ہے اور اس کو حسن غریب بتایا ہے[4]، زجاج کہتے ہیں کہ سبا و

---

[1] تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۳۹۲

[2] تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۴۱۸ (طبع مصر ۱۳۵۶ھ)

[3] الاتقان فی علوم القرآن از سیوطی، ص ۳۹۰ (طبع احمدی)

[4] ایضاً، ج ۳، ص ۵۳۱ (طبع مصر ۱۳۵۶ھ)

Marfat.com

شہر ہے جو مارب کے نام سے مشہور ہے، یہ صنعاء سے تین شب کی مسافت پر ہے[1]۔ یاقوت حموی لکھتے ہیں کہ یہ سرزمین اس نام سے اس لئے موسوم ہوئی کہ یہی اولادِ سبا بن یشجب بن یعرب بن قحطان کی سکونت گاہ تھی، یاقوت نے اس کا طول البلد ۶۴ درجہ اور عرض البلد ۱۷ درجہ بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ اقلیم اول میں ہے[2]۔ ابن درید نے کتاب الاشتقاق میں لکھا ہے کہ سبا بن یشجب بن یعرب کا لقب ہے اس کا نام عبدِ شمس ہے، یہ لفظ یمن کے تمام قبائل کو جامع ہے[3]۔

مولانا سید سلیمان ندوی "ارض القرآن" میں لکھتے ہیں:-

"توراۃ میں شبا ایک جدِ قبیلہ کا نام ہے، عرب روایت کے مطابق اس جدِ قبیلہ کا نام عمر یا عبدِ شمس اور لقب سبا تھا، محققینِ جدید بھی زیادہ تر اس کو لقب خیال کرتے ہیں، لغویینِ عرب کی رائے ہے کہ "سبی" سے مشتق ہے جس کے معنی غلام بنانے کے ہیں، چونکہ عبدِ شمس بہت بڑا فاتح تھا اور اس نے بہت سے لوگوں کو گرفتار کر کے غلام بنایا اس لئے اس کا لقب سبا قرار دیا گیا، تحقیقِ جدید یہ ہے کہ "سبی" اور "سبا" اس معنی سے ماخوذ ہے جس کا مفہوم تجارت ہے، کتبات میں عموماً سبا کا مادہ تجارتی سفر کے معنی میں مستعمل ہوا ہے، عربی زبان میں یہ اب تک شراب کی تجارت اور خرید و فروخت اور اس کے سفر کے معنی میں مستعمل ہے، سبا چونکہ تاجر قوم تھی اس لئے اس لقب سے مشہور ہوئی،،[4] پ۱۹/۱۷ ۲۲/۲۸۔

**سُبَاتًا**: آرام، راحت، تکان کا دفع کرنا، اصل میں اس کے معنی راحت کے ہیں، اسی سے سَبَتَ یَسْبُتُ (نَصَرَ) بمعنی مضارع آتا ہے، آیتِ شریفہ وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا (اور بنایا نیند کو تمہاری تکان دفع کرنے کے لئے) میں ابن الاعرابی نے سُبات کو بمعنی قطع کرنے کے لیا ہے اور سبت کے معنی قطع کرنے کے ہیں گویا جب سو گیا لوگوں سے منقطع ہو گیا۔ زجاج کہتے ہیں، سبات یہ ہے کہ حرکت سے منقطع ہو جائے اور روح بدن میں موجود ہو پس معنی یہ ہیں، ہم نے تمہاری نیند کو تمہارے لئے راحت بنایا۔[5]

راغب لکھتے ہیں سبات بمعنی قطعِ عمل ہے، یہ رات کی اس صفت کی طرف اشارہ ہے جس کا آیت لِتَسْكُنُوا فِيهِ (تاکہ اس میں چین پکڑو) میں بیان ہے۔ پ ۳/۱ ۳۰/۱۔

[1] تاج العروس [2] معجم البلدان، جزء ۵، ص ۳۴ (طبع مصر ۱۳۲۴؁ھ) [3] تاج العروس
[4] ارض القرآن، ج ۱، ص ۲۳۶، ۲۳۷ (طبع معارف اعظم گڑھ ۱۳۳۴؁ھ) [5] تاج العروس

Marfat.com

**سَبَبٌ** : رسی، سامان، ذریعہ، ابو عبیدہ کہتے ہیں، ہر وہ رسی جو اوپر سے ڈالی جائے "سبب" ہے خالد بن عیینہ کا بیان ہے کہ جو مضبوط اور لمبی رسی ہو وہ "سبب" ہے اور جب تک اس کے ذریعہ اترا چڑھا نہ جائے سبب نہیں کہلاتی اور بعض کا قول ہے کہ اس وقت تک "سبب" سے موسوم نہیں ہوتی جب تک کہ وہ ایک طرف سے چھت یا اسی قسم کے کسی مقام میں لٹکی ہوئی نہ ہو۔ ۱؎ (ملاحظہ ہو اَسْبَاب) $\frac{۱۶}{۹}$ -

**سَبَبًا** $\frac{۱}{۲}$ -

**سَبْتٌ** : کام، کاج سے قطع تعلق کر لینا، سنیچر کی تعظیم کرنا، سنیچر کا دن، یوم شنبہ، اول معنی کے اعتبار سے مصدر ہے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے اسم جس کی جمع اَسْبُتٌ اور سُبُوْتٌ آتی ہے، علامہ زمخشری نے پہلے معنی اختیار کئے ہیں اور علامہ ابو حیان اندلسی نے دوسرے، چنانچہ زمخشری کشاف میں لکھتے ہیں :-

"سبت مصدر ہے سبتت الیھود کے معنی ہیں یہود نے سنیچر کے دن کی تعظیم کی" ۲؎

اور ابو حیان "بحر المحیط میں فرماتے ہیں :-

"السبت یوم معلوم (روز شنبہ) کا نام ہے اور یہ سَبْتٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی قطع کرنے کے ہیں اور یا سبات سے ہے جس کے معنی آسائش و راحت کے ہیں اور ابو الفرج ابن الجوزی نے کہا ہے کہ یہ خطاب ہے، کلام عرب میں سَبَتَ بمعنی اِسْتَرَاحَ کے معروف نہیں

ابن جریج کا بیان ہے کہ "یوم السبت" اس لئے نام پڑا کہ وہ زمانہ کا ایک قطعہ (ٹکڑا) ہے۔" ۳؎

علامہ مرتضٰی زبیدی لغوی تاج العروس شرح قاموس میں رقمطراز ہیں :-

"السبت ہفتہ کا ایک مشہور دن ہے اور وہ ہفتہ کا ساتواں روز ہے ۴؎ اور سبت اس کا اس لئے نام پڑا کہ اللہ تعالٰی نے اس دن میں پیدائش کی ابتدا فرمائی اور زمین کی پیدائش کے ایک حصہ کو اسی دن میں قطع یعنی تمام کیا اور کہا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کو اس دن کام کاج کے قطع کرنے اور چھوڑ دینے کا حکم تھا اور محکم میں ہے کہ سبت اس لئے نام رکھا گیا کہ پیدائش کی ابتدا یکشنبہ کے دن سے ہوئی تھی جو جمعہ کے دن تک جاری رہی

۱؎ تاج العروس ۲؎ تفسیر کشاف، ج ۱، ص ۳۷ (طبع مصر) ۳؎ البحر المحیط، ج ۱، ص ۲۴۰ (طبع سعادت مصر ۱۳۲۸ھ)
۴؎ اردو میں اسی لئے اسے ہفتہ کہا جاتا ہے۔

Marfat.com

اور شنبہ کو کسی چیز کی پیدائش عمل میں نہیں آئی، اہلِ لغت نے کہا ہے لہٰذا یوم السبت مسبتہ ہوا یعنی تمام شدہ، بایں طور کہ اس دن میں عمل منقطع ہو گیا۔" ؎۱

علامہ موصوف نے سبت کی وجہ تسمیہ کے سلسلہ میں تین توجیہیں ذکر فرمائی ہیں جن میں پہلی تو یقیناً پوچ ہے کیونکہ اولاً تو اس میں اختلاف ہے کہ ہفتہ کے دن کسی چیز کی پیدائش عمل میں بھی آئی یا نہیں اور بر تقدیر صحت ہفتہ ہی کو سبت سے موسوم کرنا کیا معنی جبکہ بقیہ چھ دنوں میں سے ہر ایک دن میں کسی نہ کسی شے کی تخلیق تکمیل کو پہنچی ہے البتہ دوسری توجیہ قابل قبول ہے لیکن اصل میں سبت کی وجہ تسمیہ وہی ہے جو علامہ موصوف نے امام اللغۃ ابنِ سیدہ کی کتاب المحکم سے نقل کی ہے، ائمہ لغت کی تصریحات اسی کی تائید میں ہیں، ابو عبیدہ کہتے ہیں:-

انما سمی سبتا لانہ — سبت اس لئے نام رکھا گیا کہ
سبت فیہ خلق کل — اس میں ہر شے کی پیدائش
شیئ و عملہ ؎۲ — کا کام قطع ہو چکا۔

امام راغب مفردات میں لکھتے ہیں:-

"حق تعالیٰ نے زمین و آسمان کی پیدائش کی ابتدار یوم الاحد یعنی یک شنبہ کے دن سے فرمائی اور جیسا کہ ارشاد ہے چھ دن میں ان کو خلق فرما کر ہفتہ کو اپنا کام ختم فرما دیا لہٰذا اس دن کا نام "یوم السبت" پڑ گیا۔"

جوہری کا بیان ہے:-

وسمی یوم السبت — چونکہ دن اس پر ختم ہو جاتے ہیں
لانقطاع الایام — اس لئے اس کا نام "یوم السبت"
عندہ ؎۳ — قرار دیا گیا۔

غرض آفرینش عالم کی ابتدار چونکہ اتوار کے دن سے عمل میں آتی ہے اس لئے وہ عالم کا پہلا دن یعنی یوم الاحد قرار پایا اور ہفتہ کے دن چونکہ پیدائش کا کام منقطع ہو گیا اس لئے انقطاع کے دن یعنی یوم السبت سے موسوم ہوا، یہود و نصاریٰ دونوں فرقوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق ہفتہ کے ایک دن کو عید قرار دیا، یہود نے سنیچر کو پسند کیا اور نصاریٰ نے اتوار کو اور حق تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے یوم جمعہ کو شروع فرمایا۔ صحیحین میں حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم پچھلے ہیں قیامت کے اگلے بس کتاب ان یہود و نصاریٰ کو پہلے مل گئی اور یہ یعنی جمعہ ان کا دن ہے جو ان پر مقرر

؎۱ تاج العروس من جواہر القاموس ج ۱ ص ۵۴۷ (طبع خیریہ مصر ۱۳۰۶ھ، مادہ سبت) ؎۲ تاج العروس ؎۳ ایضاً

Marfat.com

کیا گیا تھا تو انہوں نے اس میں اختلاف کیا اور اللہ نے ہمیں اس کی طرف رہنمائی فرمائی اب لوگ اس میں ہمارے پیچھے ہیں، یہودی کل اور نصاریٰ پرسوں ؎۱ اور صحیح مسلم میں حضرتِ ابوہریرہؓ اور حضرتِ حذیفہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جمعہ سے اللہ نے اگلوں کو بے خبر رکھا، یہودیوں کے لئے تو سنیچر ہوا اور نصرانیوں کیلئے اتوار اور اللہ ہمیں لایا تو ہمیں جمعہ کے دن کی ہدایت فرمائی اور جمعہ، سنیچر اور اتوار مقرر ہوئے اور اسی طرح وہ لوگ قیامت کے دن ہمارے پیچھے ہوں گے، ہم دنیا والوں میں آخیر میں اور قیامت کے دن اول کہ خلائق سے پہلے ہمارا ہی فیصلہ ہوگا ؎۲

امام رازی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں:۔

"اگر کوئی کہنے والا یہ کہے کہ آیا عقل میں کوئی ایسی وجہ ہے جو یہ بتلاتی ہو کہ جمعہ کا دن ہفتہ کے دن سے افضل ہے کیونکہ اہلِ ملل اس پر متفق ہیں کہ حق تعالےٰ نے چھ روز میں عالم کی تخلیق فرمائی یکشنبہ سے پیدائش و آفرینش کی ابتدا فرمائی اور جمعہ کے دن میں تکمیل ہوگئی، سنیچر کا دن فراغت کا دن ہوا، یہود تو یہ کہتے ہیں کہ ہم ترکِ اعمال میں اپنے پروردگار کی موافقت کرتے ہیں بدیں وجہ انہوں نے سبت کو معین کیا ہے اور نصاریٰ یہ کہتے ہیں کہ خلق و تکوین کی ابتدا تو ایک شنبہ سے ہوئی ہے اس لئے ہم اس دن کو عید قرار دیتے ہیں لہٰذا یہ دونوں وجہیں تو معقول ہیں پھر جمعہ کو ہمارے لئے عید مقرر کرنے کی کیا وجہ ہے؟ تو ہم کہیں گے کہ جمعہ کا دن کامل ہونے اور تمام ہونے کا دن ہے اور تمام و کمال کا حاصل ہونا فرحِ کامل اور سرورِ عظیم کا موجب ہے لہٰذا اس بنا پر جمعہ کے دن کو عید قرار دینا اولیٰ ہے، واللہ اعلم" ؎۳

واضح رہے کہ اس امر میں علماء کا اختلاف ہے کہ آفرینشِ عالم کی ابتدا کس دن میں عمل میں آئی بعض شنبہ بتاتے ہیں اور بعض یکشنبہ اور اسکی وجہ اختلافِ روایات ہے، حافظ ابنِ کثیر البدایہ والنہایہ میں فرماتے ہیں:۔

"ابنِ جریر نے اولِ ایام کے بارے میں تین اقوال نقل کئے ہیں اور محمد بن اسحاق سے ان کا بیان روایت کیا ہے کہ اہلِ توراۃ کہتے ہیں اللہ

---

؎۱ صحیح بخاری، ج ۱، ص ۱۲۰ (طبع مصطفائی ۱۳۰۷ھ) - صحیح مسلم ج ۶، ص ۱۴۳ (طبع مصر ۱۳۳۴ھ) ؎۲ صحیح بخاری ج ۱، ص ۱۲۶، (طبع مصر ۱۳۴۷ھ) ؎۳ تفسیر کبیر، ج ۷، ص ۳۶۳-

Marfat.com

نے آفرینش کی ابتدار یکشنبہ کو فرمائی اور اہل انجیل کہتے ہیں دوشنبہ کو اللہ نے تخلیق شروع کی اور ہم مسلمان جیسا کہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچا ہے یوں کہتے ہیں کہ اللہ نے شنبہ کو پیدائش کا آغاز فرمایا۔

اور یہ قول جس کی ابن اسحٰق نے مسلمانوں سے حکایت کی ہے فقہار شافعیہ وغیرہم کی ایک جماعت اسی طرف مائل ہے اور ابھی اس بارے میں ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کی حدیث خلق اللہ التربۃ یوم السبت (اللہ نے مٹی کو شنبہ کے دن پیدا فرمایا) آنے والی ہے۔

اور یکشنبہ کے قول کو ابنِ جریر نے بروایتِ سدی، ابومالک (رضی اللہ عنہ) اور بروایتِ ابی صالح، ابنِ عباس (رضی اللہ عنہما) سے اور بروایت مرہ ابنِ مسعود (رضی اللہ عنہ) اور صحابہ کی ایک جماعت نیز عبداللہ بن سلام (رضی اللہ عنہ) سے بھی روایت کیا ہے اور اسی کو ابنِ جریر نے اختیار کیا ہے اور یہی توراۃ کی تصریح ہے اور اسی کی طرف فقہار کا دوسرا گروہ مائل ہے اور یہی لفظِ احد سے زیادہ مشابہ ہے اور اسی بنا پر چھ دن میں پیدائش کی تکمیل ہوئی اور جمعہ ان کا آخری دن ہوا اور مسلمانوں نے ہفتہ میں اسے اپنے لئے عید قرار دیا۔[1]

حدیثِ مذکور جس کی طرف حافظ ابنِ کثیر نے اشارہ کیا ہے، مسندِ احمد بن حنبل، صحیح مسلم اور نسائی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا اللہ نے مٹی کو شنبہ کے دن پیدا فرمایا اور پہاڑوں کو یکشنبہ کے دن اور درختوں کو دوشنبہ کے دن اور مکروہ یعنی ناپسند امور کو سہ شنبہ کے دن اور نور کو چہارشنبہ کے دن خلق فرمایا اور پنجشنبہ کے دن جانوروں کو منتشر فرمایا اور روز جمعہ بعد عصر حضرتِ آدم علیہ السلام کو پیدا کیا جو آخری مخلوق ہیں اور جمعہ کی آخری ساعت میں عصر سے لیکر رات کے درمیان ان کی تخلیق عمل میں لائی گئی ہے

یہ روایت ان تینوں کتابوں میں بروایت ابن جریج بایں اسناد مروی ہے ابن جریج اخبرنی اسماعیل بن امیۃ عن ایوب بن خالد عن عبداللہ بن رافع مولیٰ ام سلمۃ عن ابی ہریرۃ نیز امام نسائی نے تفسیر میں بروایت ابن جریج عن عطار بن ابی رباح عن ابی ہریرہ روایت کیا ہے۔[2] حافظ ابن کثیر اس روایت کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :-

"ابنِ جریج پر اس حدیث میں اختلاف ہے"

[1] البدایہ والنہایہ، ج ۱، ص ۱۵ (طبع مطبع کردستان العلمیہ ۱۳۴۸ھ)
[2] ایضاً ج ۱، ص ۱۷

Marfat.com

علی بن المدینی، بخاری اور بیہقی وغیرہ حفاظ نے اس حدیث میں کلام کیا ہے، البخاری نے تاریخ میں کہا ہے کہ "بعض نے اس کو کعب سے بیان کیا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے" یعنی یہ حدیث ان روایتوں میں سے ہے جس کو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کعب سے سنا اور ان سے لیا ہے کیونکہ وہ دونوں حدیث کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے اور اٹھتے بیٹھتے تھے، یہ تو انہیں اپنے صحیفوں سے بتاتے اور وہ انہیں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے وہ باتیں نقل کرتے جو اس کی تصدیق میں ہوتیں پس یہ حدیث وہ ہے جس کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کعب سے ان کے صحیفوں سے لی ہے پھر کسی راوی کو وہم ہوا اور اس نے اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع کر دیا اور یہ کہہ کر "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ" اس کے رفع کی اور تاکید کر دی۔

نیز اس کے متن میں سخت غرابت ہے منجملہ اس کے یہ کہ اس میں آسمانوں کے پیدا کرنے کا ذکر تک نہیں اور زمین اور زمین میں جو کچھ ہے سات روز میں اس کے پیدا ہونے کو بیان کیا ہے، اور یہ قرآن مجید کے خلاف ہے کیونکہ زمین چار دن میں پیدا ہوئی ہے پھر دو دن میں آسمانوں کو دھوئیں سے پیدا کیا گیا۔" [1]

اور دوسرے قول یعنی یکشنبہ کو آغاز آفرینش ہونے کے بارے میں وہ حدیث ہے جو مستدرک حاکم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ نے زمین کو یکشنبہ اور دوشنبہ کے دن پیدا فرمایا اور پہاڑوں کو نیز ان منافع کو جو پہاڑوں میں ہیں سہ شنبہ کے روز بنایا اور درخت، پانی، شہر، آبادی اور ویرانہ کی چہارشنبہ کے روز تخلیق فرمائی، یہ چار روز ہوئے، ارشاد عز وجل ہے قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَندَادًا ذَٰلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ ۝ "تو کہہ کیا تم منکر ہو اس سے جس نے بنائی زمین دو دن میں اور برابر کرتے ہو اس کے ساتھ اوروں کو وہ رب ہے

[1] ملاحظہ ہو البدایہ والنہایہ، ج۱، ص۱۷

Marfat.com

جہان کا اور رکھے اس میں بھاری پہاڑ اوپر سے اور برکت رکھی اس کے اندر اور ٹھہرائیں اس میں خوراکیں اس کی چار دن میں، پورا ہوا پوچھنے والوں کو) اور پنجشنبہ کے دن آسمان پیدا کیا اور جمعہ کے دن ستارے، آفتاب و ماہتاب اور فرشتے پیدا فرمائے، اب تین ساعتیں جمعہ کی باقی رہی تھیں کہ ان تین ساعتوں میں سے پہلی ساعت میں اجلیں پیدا فرمائیں کہ وقت پر مرتا ہے جسے موت آئی اور دوسری ساعت میں ہر اس شئے پر کہ جس سے لوگ منتفع ہوتے ہیں، آفت ڈالی اور تیسری میں حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرما کر انہیں جنت میں بسایا اور ابلیس کو انہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا اور آخری ساعت میں وہاں سے ان کا اخراج کر دیا یہود نے کہا پھر کیا ہوا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ نے فرمایا پھر وہ عرش پر قائم ہوا بولے اگر پوری بات کہتے تو ٹھیک تھا، کہنے لگے پھر آپ نے آرام لیا، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت غصہ آیا اور آیت نازل ہوئی وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ۝ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ (اور ہم نے بنائے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے چھ دن میں اور ہم کو نہ ہوا کچھ تکان، سو تو سہتا رہ جو کچھ وہ کہتے ہیں)۔

حاکم نے لکھا ہے:۔

ھٰذا صحیح الاسناد یہ حدیث صحیح الاسناد ہے مگر بخاری و مسلم نے اس کو ولم یخرجاہ[1] روایت نہیں کیا۔

مگر حاکم کی تصحیح میں اہلِ فن کو کلام ہے حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں اس حدیث میں غرابت ہے[2] اس حدیث کا ایک راوی ابو سعید بقال ہے، اس کے متعلق حافظ ذہبی تلخیص المستدرک میں ابن معین سے جو فنِ جرح و تعدیل کے امام ہیں ناقل ہیں کہ لا یکتب حدیثہ[3] (اس کی حدیث نہ لکھی جائے)۔

غرض آفرینش عالم کے متعلق دنوں کی ترتیب و تعیین میں تو کوئی صحیح حدیث موجود نہیں البتہ سلف صحابہ و تابعین کی اکثریت اسی پر ہے کہ ابتداء آفرینش

---

[1] مستدرک حاکم، ج ۲، ص ۵۴۳ (طبع دائرۃ المعارف) واضح رہے کہ اس حدیث کو حاکم کے علاوہ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اور نحاس نے ناسخ و منسوخ میں اور ابو الشیخ نے کتاب العظمۃ اور ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں نیز بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں روایت کیا ہے (ملاحظہ ہو الدر المنثور فی تفسیر الماثور، از سیوطی، ج ۵، ص ۱۳۶)۔

[2] تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۹۴

[3] تلخیص المستدرک، ج ۲، ص ۵۴۳

یکشنبہ کے دن سے عمل میں آئی بلکہ امام جریر طبری نے تو اس پر سلف کا اجماع نقل کیا ہے[1]۔

پ۱/۸ ، پ۵/۴ ، پ۶/۲ ، پ۹/۱۱ ، پ۱۴/۲۲ -

**سَبْتِهِمْ** : ان کا شنبہ منانا، ان کا سنیچر منانا، ان کا کام چھوڑ دینا، سبت مضاف ھم ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، یہود سنیچر کے دن کام چھوڑ دیتے اور اس دن کی تعظیم کرتے ہیں۔ پ۹/۱۱ -

**سَبَّحَ** : اس نے پاکی بیان کی، تَسْبِیْحٌ سے جس کے معنی سُبْحَانَ اللہ کہنے اور اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، امام راغب لکھتے ہیں:

"سب چیزیں حق تعالیٰ شانہ کی تسبیح کرتی ہیں بعض کا سجدہ تسخیری ہوتا ہے اور بعض کا اختیاری، آسمان، زمین اور رینگنے والے جانوروں کے متعلق اس بارے میں تو کوئی اختلاف نہیں کہ وہ بالتسخیر تسبیح گذار ہیں کیونکہ ان کے احوال اللہ تعالیٰ کی حکمتِ کاملہ پر دال ہیں البتہ اس میں اختلاف ہے کہ آسمان و زمین آیا اپنے اختیار سے بھی اللہ کی پاکی بولتے ہیں اور آیت اسی کی مقتضی ہے۔"

علامہ لغوی سید محمد مرتضیٰ زبیدی، تاج العروس شرح قاموس رقمطراز ہیں:-

"اور کبھی تسبیح بول کر اس سے نماز اور ذکر اور تحمید اور تمجید مراد لی جاتی ہے اور نمازِ تسبیح سے اس لئے موسوم ہوئی کہ تسبیح کے معنی اللہ کی تعظیم کرنا اور ہر برائی سے اس کی تنزیہ یعنی پاکی بیان کرنے کے ہیں اور ارشادِ الٰہی فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ (سو پاک اللہ کی یاد کرو جب شام کرو اور جب صبح کرو) کی اسی معنی پر تفسیر کی گئی ہے کہ ان دونوں وقتوں میں اللہ ان کو نماز کا حکم فرماتا ہے اور فراء نے کہا ہے کہ حِیْنَ تُمْسُوْنَ مغرب و عشاء اور حِیْنَ تُصْبِحُوْنَ نمازِ فجر اور عَشِیًّا نمازِ عصر اور حِیْنَ تُظْهِرُوْنَ نمازِ اولیٰ یعنی ظہر ہے اور ارشاد ہے وَسَبِّحْ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْكَارِ (یعنی نماز پڑھ شام اور صبح)" (ملاحظہ ہو تَسْبِیْحَةٌ) پ۲۱/۱۷ ، پ۲۸/۹،۴ -

**سَبِّحْ** : تو تسبیح کر، تو پاکی بیان کر، تو عبادت کر، تَسْبِیْحٌ سے امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر، پ۳/۱۲ ، پ۱۴/۶ ، پ۱/۷ ، پ۹/۳ ، پ۱۴/۱۱ ، پ۲۶/۱۷ ، پ۲۷/۱۴،۱۵،۱۶ ، پ۲۹/۶ ، پ۳۰/۱۲،۲۵

[1] تاریخ طبری، ج ۱، ص ۲۳ (طبع مصر)

Marfat.com

**سَبْحًا**: مشغول ہونا، تیزی سے تیرنا، یہ سَبَحَ يَسْبَحُ کا مصدر ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں:۔
"سَبْحٌ کے معنی پانی اور ہوا میں تیز گزرنے کے ہیں بولا جاتا ہے سَبَحَ، سَبْحًا وسَبَاحَةً اور حسب ذیل معانی میں بطور استعارہ استعمال ہوا ہے۔ (۱) آسمان میں ستاروں کی گردش کے لئے جیسے وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (اور ہر کوئی ایک چکر میں پھرتے ہیں۔ (۲) گھوڑے کے دوڑنے کے لئے جیسے وَالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا (اور قسم ہے پیرنے والے گھوڑوں کی تیزی سے) (۳) کام میں جلد لگ جانے کے لئے جیسے اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا (البتہ تجھ کو دن میں جلد شغل رہتا ہے لمبا)"
علامہ محمود آلوسی آیت اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔
"کہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں دن کو اپنے مشاغل اور حوائج میں مصروف ہونے کیلئے فراغت اور گنجائش ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اگر رات میں کچھ چھوٹ جائے تو تمہیں دن میں فراغت ہے تم اس کی تلافی کر سکتے ہو" پس سبح بمعنی فراغ ہے اور لغت میں یہ اس معنی میں مستعمل ہے لیکن پہلے معنی (یعنی کام میں جلدی مشغول ہو جانا) عرب کے محاورہ سبح فی الماء کے زیادہ موافق اور موقع کے زیادہ مناسب ہیں۔[1] پ ۲۹ ع ۱۳ ن ۳۔

**سُبْحٰنَ**: پاک ہے، امام سیوطی الاتقان میں رقمطراز ہیں:۔
"سبحان مصدر ہے بمعنی تسبیح (یعنی پاکی بیان کرنے کے)، نصب نیز مفرد کی طرف اضافت اس کو لازم ہیں خواہ مظہر اسم ظاہر ہو جیسے سُبْحٰنَ اللّٰهِ (اللہ پاک ہے) اور سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى (پاک ذات ہے جو لے گیا) یا اسم ضمیر سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ (اس کے لائق نہیں ہے کہ اس کے اولاد ہو) اور سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا (پاک ہے تو ہم کو معلوم نہیں) اور یہ ان مصادر میں سے ہے جن کے فعل کو مردہ کر دیا گیا ہے (یعنی کبھی استعمال نہیں کیا گیا) اور کرمانی کی عجائب میں ہے کہ "یہ غریب (یعنی اوپری سی بات) ہے جو مفضل نے بیان کی ہے کہ سبحان سَبَحَ کا مصدر ہے جب کہ دعا اور ذکر کے

[1] روح المعانی، ج ۲۹، ص ۱۰۵ (طبع منیر یہ مصر)

اپنی آواز بلند کرے اور یہ شعر پیش کیا ہے ؎

قبح الالٰہ وجوہ تغلب کلما
سبح الحجیج و کبروا اھلالا

(اللہ تغلب کے مونہوں کو بگاڑے جب بھی حاجی زور سے دعا مانگیں اور چلا کر تکبیر کہیں)

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ سبحان اللہ کے معنی ہیں اللہ کی ذات کی ہر برائی سے پاکی بیان کرنا،، [1]

علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے قاموس میں سبحان کو معرفہ لکھا ہے یعنی وہ اس کی تسبیح کا علم جنس بتاتے ہیں جیسے بُرّۃ (ایک گیہوں) بُرّ (گندم) کا علم جنس ہے اور اسی طرح دوسرے اعلام اجناس کہ جو معانی کے لئے وضع کئے گئے ہیں اور صاحب قاموس نے جو اس کا علم ہونا بیان کیا ہے یہی مختار جماہیر، قاضی بیضاوی، زمخشری، دمامینی اور بہت سے علماء بھی اسی کے مُقِر ہیں، زجاج نے سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْریٰ کی تفسیر میں کہا ہے کہ یہ مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے یعنی مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے اور اس کا نصب ایک پوشیدہ فعل کی بنا پر ہے جس کا اظہار متروک ہے

اصل یوں ہے اُسَبِّحُ اللّٰہَ سُبْحٰنَہٗ تَسْبِیْحًا (میں اللہ کی تسبیح کرتا ہوں) شیخ محمود فاسی لکھتے ہیں کہ پھر سبحان فعل کا قائم مقام ہو کر تنزیہ بلیغ یعنی ان برائیوں سے جن کو مشرکین حق تعالٰے شانہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، پاک ہونے کو بتانے لگا، نضر بن شمیل کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ گویا ایک شخص نے مجھ سے سبحان اللہ کی تفسیر بیان کی اس نے کہا کہ کیا تم محاورہ الفرس یسبح فی عنانہ (گھوڑا اپنی تیزی میں دوڑ رہا ہے) پر غور نہیں کرتے کہنے لگا سبحان اللہ کے معنی ہیں اللہ کی طرف لپکنا اور اس کی اطاعت میں چست رہنا۔

یہ واضح رہے کہ امام سیوطی نے جو یہ کہا ہے کہ سبحان کے فعل کو مردہ کر دیا گیا ہے اور مفصل نے جو اس سے فعل کے آنے کا ذکر کیا ہے تو تعجب کے ساتھ اسے کرمانی کی عجائب سے نقل کیا ہے اور اسی طرح ابن یعیش وغیرہ شارحین مفصل نے بھی لکھا ہے سو اس کا اعتبار نہیں کیونکہ اس کا فعل مشہور ہے اور ارباب افعال اور دیگر علماء اس کو لائے ہیں ان کا بیان ہے کہ یہ سَبَّحَ مخفف سے ہے جیسے کہ شکّر شکرانگ ہے اور ایک جماعت نے اس کو بھی جائز

[1] الاتقان فی علوم القرآن، ج ۱، ص ۱۶۳ (طبع مصر ۱۳۴۳ھ)

رکھا ہے کہ اس کا فعل مَسَبِّحَ ہو شتد گر تعبیر تو ضرور کرتے ہیں کہ یہ بعید از قیاس ہے کیونکہ اس کی کوئی نظیر نہیں، برخلاف اول کے کہ اس کی نظیریں بہت سی ہیں اگرچہ وہ بھی غیر مقیس ہے یعنی قاعدہ کے مطابق نہیں ہے۔[1] 13/6، 15/1،10،12، 14/2، 18/5، 19/16، 20/10، 21/5، 23/2،4،9، 25/7،13، 27/4، 28/6، 29/3۔

**سُبْحٰنَكَ**: تو پاک ہے، سبحان مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ، 1/6، 4/11، 7/6، 9/14، 11/6، 17/6، 18/8،17، 22/11۔

**سُبْحٰنَهٗ**: وہ پاک ہے، سبحان مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، 1/14، 11/7، 7/18، 10/11، 11/7،2، 14/7،13، 15/5، 16/5، 17/2، 21/7، 23/15، 24/4۔

**سَبَّحُوْا**: انہوں نے تسبیح کی، انہوں نے پاکی بیان کی، تَسْبِيْحٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب (ملاحظہ ہو تَسْبِيْحًا اور سَبِّحْ) 21/15۔

**سَبِّحُوْا**: تم تسبیح پڑھو، تم پاکی بیان کرو، تم عبادت کرو، تَسْبِيْحٌ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، 16/4۔

**سَبِّحُوْهُ**: اس کی پاکی بولتے رہو، اس کی یاد کرتے رہو، اس میں ہُ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، 22/2۔

**سَبِّحْهُ**: تو اس کی تسبیح کر، اس کی پاکی بول، اس میں ہُ ضمیر واحد مذکر غائب ہے۔ (ملاحظہ ہو سَبِّحْ) 26/17، 27/4، 29/20۔

**سَبُعٌ**: درندہ، اَسْبُعٌ اور سِبَاعٌ جمع، امام راغب نے مفردات میں لکھا ہے :۔

"درندہ کو سَبُعٌ اس لئے کہا گیا کہ اس کی قوت پوری ہوتی ہے اور سَبْعٌ بھی اعدادِ تامہ میں سے ہے۔" 6/5۔

**سَبْعَ**: سات، ہفت، اسم عدد ہے، مؤنث کے لئے آتا ہے، 1/3، 3/4، 12/16، 15/5، 18/1،15، 24/16، 26/18، 29/1،5،9، سَبْعًا 14/6، 30/1۔

**سَبْعُوْنَ**: ستر، اسم عدد ہے بحالت رفع سبعون ہوگا، 29/5۔

**سَبْعَةٌ**: سات، ہفت، اسم عدد ہے جو مذکر کے لئے آتا ہے، 2/8، 14/3، 15/15، 21/12۔

**سَبْعِيْنَ**: ستر، اسم عدد ہے بحالت نصب و جر، سَبْعِيْنَ ہوگا۔ 9/9، 10/16۔

**سَبَقَ**: وہ پہلے ہو چکا، وہ پہلے گزر چکا، اس نے

[1] اس بحث کے تمام حوالوں کے لئے ملاحظہ ہو، تاج العروس شرح قاموس۔

Marfat.com

سبقت کی، سَبَقَ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، مِنَ اللّٰہِ سَبَقَ کا مطلب ہے اللہ کی طرف سے پہلے سے ٹھہر چکا اور ہو چکا، ۹/۱۹ ۱۰/۵ (ملاحظہ ہو تَسْبِقُ) ۱۲/۴ ۱۶/۴ ۲۲/۲ ۲۳/۲ ۲۵/۲۔

**سَبْقًا**: آگے ہونا، پہلے ہونا، مقدم ہونا، سَبَقَ یَسْبِقُ کا مصدر ہے، ۳۰/۲۔

**سَبَقَتْ**: پہلے سے ہو چکی، پہلے سے ٹھہر چکی، سَبَقَ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، ۱۱/۲۰ ۱۲/۱۲ ۱۷/۷ ۲۳/۹ ۲۴/۲۰ ۲۵/۳۔

**سَبَقَکُمْ**: اس نے تم سے پہلے کیا، اس نے تم سے سبقت کی، سَبَقَ اس میں کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر ہے (ملاحظہ ہو سَبَقَ) ۸/۱۷ ۲۰/۱۵۔

**سَبَقُوْا**: انہوں نے سبقت کی، وہ آگے نکل گئے، سَبَقَ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، ۱۰/۴۔

**سَبَقُوْنَا**: وہ ہم سے پہلے دوڑے، انہوں نے ہم سے سبقت کی، وہ ہم سے آگے ہوئے، اس میں نا ضمیر جمع متکلم ہے، ۲۶/۲ ۲۵/۴۔

**سُبُلَ**: راہیں، راستے، سَبِیْلٌ کی جمع ہے ۱۴/۱۵ ۶۔

**سُبُلَنَا**: ہماری راہیں، ہمارے راستے، سُبُلَ مضاف، نا جمع متکلم مضاف الیہ، ۱۳/۱۴ ۲۱/۲۔

**سُبُلًا**: ۱۲/۷ ۱۶/۱۱ ۱۷/۲ ۲۵/۷ ۲۹/۹۔

**سَبِیْلٌ**: راستہ، راہ، سَبِیْلٌ اصل میں اس راہ کو کہتے ہیں جو واضح ہو اور اس میں سہولت ہو، امام راغب لکھتے ہیں:۔

"سَبِیْلٌ کا استعمال ہر اس شے کیلئے ہوتا ہے جس کے ذریعہ کسی شے تک پہنچا جا سکے خواہ وہ شے شر ہو یا خیر، نیز واضح راستہ بھی اس سے مراد لیا جاتا ہے، یہ لفظ مذکر بھی استعمال ہوتا ہے اور مؤنث بھی، ابن الاثیر نے کہا ہے کہ اس کی تانیث زیادہ غالب ہے[1] اس کی تذکیر کا شاہد ارشادِ الٰہی وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْہُ سَبِیْلًا وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الْغَیِّ یَتَّخِذُوْہُ سَبِیْلًا ہے (کہ اس میں سبیل کے لئے مذکر کی ضمیر لائی گئی ہے) اور تانیث کا شاہد قُلْ ھٰذِہٖ سَبِیْلِیْۤ اَدْعُوْۤا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ ہے کہ ھٰذِہٖ کے ذریعہ اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے (جو مؤنث کے لئے استعمال ہوتا ہے)

آیت شریفہ لَیَصُدُّوْنَھُمْ عَنِ السَّبِیْلِ (اور ان کو روکتے رہتے ہیں راہ سے) میں "سبیل" سے راہِ حق مراد [illegible] ہے کیونکہ اسم جنس کا جب مطلق ہو کر استعمال ہو تو وہ [illegible]

---

[1] النہایۃ فی غریب الحدیث والاثر، ج ۲، ص ۱۵۶ (طبع خیریہ مصر)

اس کے ساتھ مخصوص ہو گا جو حق ہو اور ایسے ہی ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ (پھر راہ آسان کر دی اس کو) ہے آیت کریمہ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ (اور اللہ تک پہنچتی ہے سیدھی راہ اور بعضی راہ کج بھی ہے) میں سبیل سے کوئی ایک معین راستہ مراد نہیں کہ جو کج بھی ہو بلکہ یہاں یہ اسم جنس ہے۔ سبیل

پ۱/۱۳، پ۲/۶،۱۰، پ۳/۱۶، پ۵/۳،۴،۹،۱۱،۱۴، پ۶/۷،۱۳،۱۴، پ۷/۱۲، پ۹/۷، پ۱۰/۱،۱۸، پ۱۱/۱۳، پ۱۳/۱۱، پ۱۴/۵،۷،۱۲، پ۱۵/۳، پ۱۸/۱۷، پ۱۹/۱۷، پ۲۰/۶،۱۵،۱۶، پ۲۱/۷،۱۱،۱۷، پ۲۴/۷،۹،۱۰، پ۲۵/۵،۶،۷، پ۲۸/۴،۷، پ۲۹/۱۹۔

**سَبِيْلًا**: پ۴/۱،۱۴، پ۵/۳،۵،۹،۱۱،۱۷،۱۸، پ۶/۱، پ۹/۷،۸، پ۱۵/۴،۵،۸،۹،۱۲، پ۱۸/۱۹، پ۱۹/۱،۲،۳، پ۲۲/۵، پ۲۹/۱۳،۲۰۔

**سَبِيْلِ اللّٰهِ**: راہِ خدا، اللہ کی راہ، سَبِيْلِ مضاف اللہ مضاف الیہ، حافظ ابوالسعادات ابن الاثیر الجزری لکھتے ہیں:۔

"سبیل اللہ لفظ عام ہے جو ہر اس خالص عمل کیلئے آتا ہے جس کی بدولت حق کے تقرب کے راستہ پر فرائض، نوافل اور انواع عبادات کی ادائیگی کے ذریعہ گامزن ہوا جا سکے اور جب یہ مطلق استعمال ہو تو بیشتر جہاد کے معنی میں آتا ہے حتّٰی کہ کثرتِ استعمال کی بنا پر ایسا ہو گیا کہ گویا اسی معنی میں منحصر ہو"[1]

پ۲/۳،۸،۱۱،۱۶، پ۳/۴،۵،۱۰، پ۴/۱،۶،۸، پ۵/۴،۸،۱۰، پ۶/۲،۳،۱۲، پ۸/۱،۱۲،۱۸، پ۹/۱۸، پ۱۰/۲،۴،۶،۹،۱۱،۱۲،۱۴،۱۷، پ۱۱/۳،۴، پ۱۲/۲، پ۱۳/۱۳، پ۱۴/۸،۱۸،۱۹، پ۱۷/۸،۱۰، پ۱۸/۹، پ۲۱/۱۰، پ۲۳/۱۱، پ۲۶/۵،۸،۱۴، پ۲۷/۱۷، پ۲۸/۲،۱۰،۱۳، پ۲۹/۱۴۔

**سَبِيْلِكَ**: تیری راہ، تیرا راستہ، سبیل مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ، پ۱۱/۱۴، پ۲۴/۶۔

**سَبِيْلَنَا**: ہماری راہ، ہمارا راستہ، سَبِيْلَ مضاف نا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، پ۲۰/۱۴۔

**سَبِيْلِهٖ**: اس کی راہ، ان کا راستہ، سبیل مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ۷/۱، پ۸/۱،۶، پ۱۰/۸،۹، پ۱۳/۱۷، پ۱۴/۲۲، پ۱۵/۲۱، پ۲۳/۱۵، پ۲۷/۶، پ۲۸/۹، پ۲۹/۳۔

**سَبِيْلِهِمْ**: ان کی راہ، ان کا راستہ، سَبِيْلِ مضاف ھم ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، پ۹/۲۔

**سَبِيْلِىْ**: میری راہ، میرا راستہ، سَبِيْل مضاف ى ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، پ۹/۱۴، پ۱۳/۶، پ۲۴/۷۔

## فصل التاء المثناة

**سِتْرًا**: حجاب، پردہ، سُتُوْرٌ اور اَسْتَارٌ جمع، پ۱۶/۲

[1] النہایہ فی غریب الحدیث والاثر

**سِتَّةِ** : چھ، اسمِ عدد ہے، مذکر کے لئے استعمال ہوتا ہے سِتّۃ اصل میں سِدْسَۃ تھا، سین کو تا سے بدلا اور پھر دال کا اس میں ادغام کر دیا گیا، ب ۸/۱۴ ب ۱۱/۶ ب ۱۲/۱ ب ۱۹/۲ ب ۲۱/۱۴ ب ۲۶/۱۷ ب ۲۷/۱۷ ۔

**سِتِّيْنَ** : ساٹھ، اسمِ عدد ہے، سِتَّۃ سے مشتق ہے، ب ۲۸/۱ ۔

## فصل الجیم المعجمہ

**سَجَدَ** : اس نے سجدہ کیا، سُجُوْدٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، حضرتِ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کے متعلق بعض نے تو یہ کہا ہے کہ فرشتوں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ حضرتِ آدم علیہ السلام کو قبلہ قرار دیں اور بعض کا قول ہے کہ حضرتِ آدم علیہ السلام کے سامنے فروتنی کرنے اور ان کی اولاد کی مصالح کا بندوبست کرنے کا ان کو حکم ہوا تھا، سو بجز ابلیس کے سب نے حکم مانا۔[1] (ملاحظہ ہو اُسْجُدْ) ب ۱۴/۲ ب ۲۳/۱۴ ۔

**سُجَّدًا** : سجدہ کرنے والے، ساجِدٌ کی جمع، آیتِ شریفہ اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا (اور داخل ہو دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے) میں جھکتے ہوئے اطاعت شعارانہ داخل ہونا مراد ہے، امام سیوطی واسطی سے اس آیت کی تفسیر میں ناقل ہیں کہ سریانی میں سجدًا کے معنی ہیں سر جھکانے والا اور وَخَرُّوْا لَہٗ سُجَّدًا (اور سب گرے اس کے آگے سجدہ میں) میں سجدۂ تعظیمی مراد ہے، سجدۂ عبادت نہیں اور اخفش نے جو نحو و لغت کے امام ہیں، فرمایا ہے کہ یہاں خَرُّوْا بمعنی مَرُّوْا (یعنی گزرنے) کے ہے، گرنے اور زمین پر پڑنے کے معنی میں نہیں، ان کے قول پر آیت کا ترجمہ یوں ہوگا "وہ ان کے لئے جھکے ہوئے گزرے" ب ۱/۶ ب ۹/۱۰ ب ۱۲/۲ ب ۱۳/۵ ب ۱۴/۱۲ ب ۱۵/۱۲ ب ۱۶/۱۲،۷ ب ۱۹/۴ ب ۲۱/۱۵ ب ۲۶/۱۲ ۔

**سَجَدُوْا** : انہوں نے سجدہ کیا، سُجُوْدٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، ب ۱/۴ ب ۸/۱۲ ب ۹/۹ ب ۱۵/۱۹،۷ ب ۱۶/۱۶ ۔

**سُجِرَتْ** : وہ آگ سے پر کی گئی، اس کا پانی بہا دیا گیا، وہ خالی کی گئی، وہ پُر کی گئی، تَسْجِيْرٌ سے جس کے معنی زور سے آگ بھڑکانے اور بہانے، خالی کرنے اور پُر کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، امام فخرالدین رازی آیۂ شریفہ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (اور جب دریا جھونکے جائیں گے) کی تفسیر میں رقمطراز ہیں :۔
"یہ بالتخفیف بھی پڑھا گیا ہے اور بالتشدید بھی یعنی سُجِرَتْ بھی اور سُجِّرَتْ بھی) اور اس میں

[1] الاتقان، ج ۱، ص ۱۳۸ [2] تاج العروس

Marfat.com

مختلف وجہیں ہیں۔

(۱) اصل کلمہ سجرت التنور سے ہے جو تنور جھونکنے اور اس میں آگ بھڑکانے کے لئے آتا ہے اور کسی چیز میں جب آگ بھڑکائی جاتی ہے تو جو کچھ رطوبت اس میں ہوتی ہے وہ خشک ہو جاتی ہے تو اس وقت سمندروں میں ذرا سا پانی بھی نہیں بچے گا، پھر چونکہ حسب تصریح وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ (اور چلائے جائیں گے پہاڑ) پہاڑ چلائے جائیں گے اس لئے اس آن سمندر اور زمین انتہائی حرارت اور سوزانی میں ایک شے بن جائیں گے اور یہ بھی احتمال ہے کہ جب سمندروں کے پانی سوکھ جائیں تو زمین ابھر کر اور مرتفع ہو کر پہاڑوں کی چوٹیوں کے برابر ہو جائے اور یہ بھی احتمال ہے کہ جب پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر ان کے اجزاء منتشر ہوں اور وہ مٹی کی طرح ہو جائیں تو وہ مٹی سمندروں کی تہ میں جا پہنچے اور سطح زمین سمندروں کے ساتھ برابر ہو جائے اور سب مل کر ایک دہکتا ہوا سمندر بن جائے۔

(۲) سجرت بمعنی فجرت ہو جو پانی کے رواں ہونے کے لئے آتا ہے اور یہ اس طرح کہ چونکہ حسب ارشاد مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ (چلائے دو دریا مل کر چلنے والے، ان دونوں میں ہے ایک پردہ جو ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرے) سمندروں کے مابین آڑ ہے پس جب اللہ اس آڑ کو ہٹا دیگا، ایک دوسرے میں رواں ہونے لگے گا اور سارے سمندر ایک سمندر بن جائیں گے، کلبی کا قول یہی ہے۔

(۳) سجرت بمعنی اوقدت یعنی آگ بھڑکانے کے ہو تفال نے کہا ہے کہ اس کی تاویل میں مختلف وجوہ کا احتمال ہے اول یہ کہ جہنم سمندروں کی تہوں میں ہو اس لئے سمندر اس وقت تو اس لئے نہیں دہکتے کہ دنیا کو قائم رکھنا ہے لیکن جب دنیا کی مدت ختم ہو جائیگی، حق تعالیٰ شانہ اس آگ کی تاثیر کو سمندروں تک پہنچا دیگا اور اس لئے وہ پورے طور پر کھولنے لگ جائیں گے۔ دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ آفتاب ماہتاب اور ستاروں کو سمندر میں ڈال دیگا اور سمندر کھول اٹھیں گے۔ سوم یہ کہ اللہ تعالیٰ سمندروں میں آتشِ عظیم پیدا فرمائیگا کہ پانی اُبل جائینگے، میں (یعنی امام رازی) کہتا ہوں کہ ان سب وجہوں میں تکلف سے کام لیا گیا ہے، ان میں سے کسی کی بھی حاجت نہیں کیونکہ جو دنیا کی تخریب اور

قیامت کے قائم کرنے پر قادر ہے یقیناً وہ اس پر بھی قادر ہے کہ سمندروں کے ساتھ جو چاہے کرے، ان کو کھولا دے یا ان کے پانیوں کو آگ کی شکل میں بدل ڈالے بغیر اس کے کہ اسے ان میں آفتاب و ماہتاب ڈالنے کی حاجت ہو یا ان کے نیچے جہنم کی آگ ہو۔"[1] ۳۰ ۶ -

**سِجِلّ**: کاغذ کا طومار، صحیفہ، محضر، وثیقہ، لکھنے والا مرد، ایک شخص کا نام، سِجِلّات جمع، یہ ان اسماء میں ہے کہ باوجود مذکر ہونے کے ان کی جمع الف تا کے ساتھ آتی ہے[2] جو جمع مونث سالم کا وزن ہے۔

علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں :-

"اس میں اختلاف ہے کہ آیا یہ لفظ عربی ہے یا معرب (یعنی دوسری زبان سے عربی میں لایا گیا ہے) پس بصرہ والے تو اس طرف گئے ہیں کہ یہ عربی ہے، اور ابو الفضل رازی نے کہا ہے کہ اصح یہ ہے کہ یہ فارسی سے معرب ہے۔"[3]

ابن جنی نے جو نحو و عربیت کے امام ہیں المحتسب میں سجل کے معنی کتب یعنی نوشتہ کے نقل کئے ہیں اور لکھا ہے کہ ایک قوم نے اس کو فارسی سے معرب کہا ہے[4]، امام راغب مفردات میں لکھتے ہیں کہ :-

"اس کی اصل جیسا کہ بیان کیا گیا ہے فارسی ہے جس کو عربی کر لیا گیا ہے اور سجل کو پتھر بتایا گیا ہے جس پر تحریر کیا جاتا تھا بعد میں ہر وہ شے جس پر لکھا جانے لگا اس کا نام سجل پڑ گیا۔"

اس لحاظ سے سجل فارسی لفظ سنگ کا معرب ہے اور ابن مردویہ نے بطریق ابی الجوزاء حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ حبشی زبان میں اس کے معنی شخص کے ہیں[5]، امام لغت زجاج کا بھی یہی بیان ہے۔[6]

امام ابن جریر طبری اپنی مشہور تفسیر جامع البیان فی تفسیر القرآن میں رقمطراز ہیں :-

"جس سجل کا حق تعالیٰ نے یہاں ذکر فرمایا ہے اہل تاویل اس کے معنی میں مختلف ہیں، بعض کا قول ہے کہ وہ ایک فرشتہ کا نام ہے، کچھ لوگوں کا بیان ہے کہ وہ ایک کاتب تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کتابت کی خدمت انجام دیا کرتے تھے[7]، دیگر حضرات

---

[1] تفسیر کبیر ج ۳۰، ص ۳۸۳، ۳۳۹ (طبع شرفیہ مصر ۱۳۲۴ھ) [2] تاج العروس [3] روح المعانی ج ۱۷ ص ۹۰ (طبع منیریہ مصر)
[4] اتقان از سیوطی ج ۱ ص ۱۳۸ (طبع مصر ۱۳۱۷ھ) [5] ایضاً [6] غرائب القرآن و رغائب الفرقان از نظام الدین نیشاپوری ج ۱۷ ص ۱۲۰ بر حاشیہ تفسیر طبری

یہ کہتے ہیں کہ سجل وہ صحیفہ ہے جس میں لکھا جاتا ہے (پہلے قول کو ابن جریر نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور سدی سے اور دوسرے کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور تیسرے کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد سے روایت کیا ہے اور اس کے بعد فرمایا ہے کہ) اور اس بارے میں ہمارے نزدیک سب اقوال میں صحت کے اعتبار سے اولیٰ اس شخص کا قول ہے جس نے سجل کو اس جگہ بمعنی صحیفہ بیان کیا ہے کیونکہ یہی معنے کلام عرب میں معروف ہیں اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کسی ایسے کاتب کا پتہ نہیں چلتا کہ جس کا نام سجل ہو اور نہ فرشتوں میں کوئی ایسا فرشتہ ہے کہ جس کا یہ نام ہو[1]

واضح رہے کہ ابن مندہ، ابونعیم، ابن مردویہ، خطیب اور ابن عساکر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک کاتب تھا جس کو سجل کہا جاتا تھا سو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا یَوْمَ نَطْوِی السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ (جس دن ہم لپیٹ دیں گے آسمان کو جس طرح کہ سجل کا لپیٹنا ہے نوشتوں کو)[2]

خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں اس حدیث کو روایت کر کے بروایت برقانی حافظ ابوالفتح ازدی سے نقل کیا ہے کہ اگر یہ روایت صحیح ہو تو ابن نمیر اس میں منفرد ہیں[3]۔ حافظ ابن حجر عسقلانی الاصابہ میں لکھتے ہیں کہ "ابن نمیر کبار ثقات میں سے ہیں اور یہ حدیث ان طرق سے صحیح ہے اور اس سے غفلت ہوئی جس نے یہ زعم کیا یہ حدیث موضوع ہے"[4] لیکن حافظ صاحب کا یہ فرمانا اسناد کے اعتبار سے تو ممکن ہے اسے تسلیم کر لیا جائے لیکن متن بہرحال نکارت سے خالی نہیں، حافظ ابن کثیر نے صاف تصریح کی ہے :-

وھذا منکر جدا یہ انتہائی منکر حدیث ہے
من حدیث نافع نافع سے منقول
عن ابن عمر ہرگز صحیح نہیں ہے"
لا یصح اصلا[5]

اسی طرح ابوداؤد اور نسائی وغیرہ کی وہ روایت جو انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ کی ہے کہ سجل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

[1] جامع البیان المعروف تفسیر ابن جریر طبری، ج ۱۷، ص ۱۰۰، ۱۰۱ (المطبعۃ المیمنیۃ مصر) [2] تفسیر فتح القدیر، ج ۳، ص ۴۱۶ (طبع مصر سنہ ۱۳۵۰ھ)
[3] تاریخ بغداد ج ۸، ص ۱۷۵ (طبع سنۃ مصر ۱۳۴۹ھ) [4] الاصابہ فی معرفۃ الصحابہ، ج ۳، ص ۶۵ (طبع شرفیہ مصر ۱۳۲۵ھ)
[5] الدر المنثور فی تفسیر الماثور از امام سیوطی، ج ۴، ص ۳۴۰ (طبع مصر)

Marfat.com

کے کاتب تھے اور بیہقی نے اس کی تصحیح بھی کی ہے صحیح نہیں بلکہ موضوع ہے چنانچہ حافظ ابن کثیر اپنی تفسیر میں رقمطراز ہیں :

"اور اسی طرح ابنِ عباس سے بروایت ابی داؤد وغیرہ جو گزرا وہ بھی صحیح نہیں حفاظ کی ایک جماعت نے اس کے موضوع ہونے کی تصریح کی ہے اگرچہ وہ ابوداؤد کی سنن میں موجود ہے منجملہ ان کے ہمارے شیخ حافظ کبیر ابوالحجاج مزی ہیں اور بحمداللہ اس حدیث پر ایک مستقل جزء لکھا ہے اور امام ابوجعفر ابن جریر اس روایت پر انکار کے درپے ہیں، انہوں نے اس کا پورے طور پر تردید کی ہے ان کا بیان ہے کہ صحابہ میں کسی ایسے شخص کا پتہ نہیں چلتا کہ جس کا نام سجل ہو حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کاتب معروف ہیں، ان میں کوئی ایسا شخص نہیں کہ جسکا نام سجل ہو، اللہ ان پر رحم فرمائے! انہوں نے اس بارے میں بالکل صحیح فرمایا ہے اور یہ اس حدیث کی نکارت پر سب سے قوی دلیل ہے اور جس نے بھی اسمارِ صحابہ میں سجل کا ذکر کیا ہے اس نے اسی حدیث پر اعتماد کیا ہے کسی اور چیز پر نہیں، واللہ اعلم۔ اور صحیح ابنِ عباس سے یہی ہے کہ سجل صحیفہ ہی ہے، علی بن ابی طلحہ اور عوفی ان سے یہی روایت کرتے ہیں۔ مجاہد، قتادہ اور بہت سے علماء نے اسی کی تصریح کی ہے اور ابنِ جریر نے اسی کو اختیار کیا ہے کیونکہ لغت میں یہی مشہور ہے پس اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ جس دن کہ ہم لپیٹ لیں آسمان کو جیسے لپیٹتے ہیں صحیفہ میں نوشتے۔"

قاضی شوکانی نے تفسیر فتح القدیر میں لکھا ہے کہ یہ کہنا کہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے بس یہی صحیح ہے (یعنی سجل کا بمعنی صحیفہ ہونا) درست نہیں

کیونکہ علی بن ابی طلحہ اور عوفی دونوں ضعیف ہیں لہٰذا اولیٰ یہ ہے کہ معنی لغوی ہی پر اعتماد کیا جائے۔"[1] لیکن واضح رہے کہ علی بن ابی طلحہ وہ ہیں جن پر حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی روایات کے باب میں امام بخاری نے اپنی صحیح میں اعتماد کیا ہے اور عوفی کی روایات کی امام ترمذی نے تحسین کی ہے [2]

علاوہ ازیں سجیل کو اگر کسی کاتب کا نام مانا جائے تو تشبیہ میں حسن نہیں رہتا۔[3] بہرحال لغت کے اعتبار سے بھی اور روایت کے اعتبار سے بھی اولیٰ یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنے صحیفہ کے لئے جائیں پ ۱۷/۷۔

**سِجْنٌ**: قید خانہ، محبس، سُجُوْن کی جمع پ ۱۲/۱۴ ۱۹ پ ۱۳/۵۔

**سُجُوْدٌ**: سجدہ کرنا، سر زمین پر رکھنا، فروتنی کرنا، یہ سَجَدَ یَسْجُدُ کا مصدر ہے امام راغب نے لکھا ہے کہ کبھی سجود کی تعبیر نماز سے بھی کی جاتی ہے ارشاد ہے وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ (اور نماز کے پیچھے) اور صلاۃ الضحیٰ کو سجدۃ الضحیٰ اور سجود الضحیٰ بھی کہتے ہیں، پ ۲۶/۱۲ پ ۱۹/۴۔

**سُجُوْدٌ**: سجدہ کرنے والے، ساجد کی جمع پ ۱/۱۵ پ ۱۷/۱۱ پ ۲۶/۱۲۔

**سَجٰی**: وہ چھا گیا، اس نے آرام لیا، اس نے قرار پکڑا (نفس) سُجُوْنٌ سے جس کے معنی سکون پانے اور قرار پکڑنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، علامہ حسین بن محمد معروف بابن خالویہ لکھتے ہیں کہ:-

"جب رات میں ہوا تھم جائے اور اس کی اندھیاری سخت بڑھ جائے تو کہا جاتا ہے لیل ساج اسی طرح جب سمندر تھم جاتا ہے تو بحر ساج بولتے ہیں۔"[1] پ ۳۰/۱۸۔

**سِجِّیْلٌ**: کنکر، یہ وہی فارسی کا سنگ و گل ہے جو عربی میں آکر سجیل بن گیا ہے۔ فریابی نے مجاہد سے یہی نقل کیا ہے[2] پ ۱۲/۷ پ ۱۴/۵ پ ۳۰۔

**سِجِّیْنٌ**: سجین، قید خانہ، ابو حاتم نے کتاب الزینۃ میں ذکر کیا ہے کہ یہ لفظ غیر عربی ہے، امام فخرالدین رازی تفسیر کبیر میں رقمطراز ہیں:-

"سجین آیا شئے معین کے لئے اسم علم ہے یا کسی معنی سے اسم مشتق ہے، اس بارے میں دو قول ہیں۔

اول جمہور مفسرین کا قول ہے کہ یہ شئے معین کا علم ہے پھر اس شئے معین میں اختلاف ہے اکثر تو اس طرف ہیں کہ ساتویں زمین زیر زمین ہے حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما

---

[1] اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن الکریم ص ۱۱۷ (طبع دار الکتب المصریۃ)

[2] الاتقان ج ۱، ص ۱۳۸ (طبع مصر)

Marfat.com

دکا بروایت عطا ربن) قتادہ، مجاہد، ضحاک اور ابن زید کا یہی قول ہے، حضرت برار رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا سجین ساتوں زمینوں میں سب سے نیچے ہے، عطار خراسانی کا بیان ہے کہ ابلیس اور اس کی ذریت اسی میں ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سجین جہنم میں ایک گڑھا ہے، کلبی اور مجاہد نے کہا ہے کہ سجین ساتویں زمین کے نیچے ایک چٹان ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ مشتق ہے اور سجین بروزن فِعّیل سَجْنٌ سے جس کے معنی حبس اور تضییق (یعنی روکنے، قید کرنے اور تنگ کرنے) کے ہیں، اسی طرح اسم قرار دیا گیا ہے جس طرح کہ فسق سے فِسِّیقٌ بولا جاتا ہے، ابوعبیدہ، مبرا اور زجاج کا یہی قول ہے، واحدی کا بیان ہے کہ یہ قول ضعیف ہے اور اس امر کی دلیل کہ اہل عرب سجین کو نہیں جانتے آیہ شریفہ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ (اور تجھ کو کیا خبر ہے کیا ہے سجین) ہے یعنی سجین اس میں سے نہیں جسے تم اور تمہاری قوم جانتی ہو (امام رازی کہتے ہیں) اور میں اس کو ضعیف نہیں بتاتا کیونکہ شاید یہ سجین کے معاملہ کی عظمت کے لئے بیان کیا گیا ہو جیسے ارشادِ الٰہی وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (اور تجھ کو کیا خبر ہے کیا ہے دن انصاف کا) میں ہے۔" [1]

شیخ اسمٰعیل حقی بروسوی لکھتے ہیں :-

"سجین اس جامع کتاب کا علم ہے جو شر کا دفتر ہے جس میں شیاطین نیز کافران و فاسقانِ جن و انس کے اعمال مدون ہیں، یہ لفظ حاتم کی طرح صفت سے نقل کر لیا گیا ہے اور منصرف ہے کیونکہ اس میں صرف ایک ہی سبب ہے یعنی معرفہ ہونا اور اس کی اصل فِعّیلٌ ہے سَجْنٌ سے سَاجِنٌ کا مبالغہ ہے [a] یا چونکہ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے اسے ساتویں زمین کے نیچے تاریک اور وحشتناک مقام پر ڈال دیا گیا ہے نیز ابلیس اور اس کی ذریت کا ان کی تذلیل اور تحقیر کی بنا پر مسکن ہے اور وہاں راندہ درگاہ شیاطین

[1] تفسیر کبیر مسمّٰی بہ مفاتیح الغیب، جزء ۸، ص ۳۵۲ (طبع مصر)

[a] یعنی بہت روکنے اور قید کرنے والے کے کیونکہ یہ دوزخیوں کو جہنم میں روکنے اور قید کرنے کا سبب ہے۔

Marfat.com

پہنچتے رہتے ہیں جس طرح کہ نیکوں کے نوشتوں پر فرشتگانِ مقرب حاضر ہوتے ہیں لہٰذا سجّین سجّون کا مبالغہ ہے۔" [1]

قاضی محمد بن علی شوکانی فرماتے ہیں:۔

"سجّین کے نون میں علماء نے اختلاف کیا ہے بعض کے کہتے ہیں کہ اصلی ہے اور اس کا اشتقاق سَجْنٌ سے ہے جس کے معنی حبس کے ہیں اور یہ مبالغہ کا وزن ہے جیسے حِتِّیْرٌ، سِکِّیْرٌ اور فِسِّیْقٌ، خمر، سکر اور فسق سے یہیں ابوعبیدہ مبرد اور زجاج نے ایسا ہی بیان کیا ہے، واحدی نے کہا ہے کہ یہ کمزور بات ہے کیونکہ عرب سجّین سے واقف نہ تھے اور اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ ان ائمہ کا بیان کرنا خود دلیل قائم کرنا اور یہ بتلاتا ہے کہ یہ لفظ عربی زبان کا ہے اور اسی میں سے ابن مقبل کا شعر ہے ؎

و رفقة یضربون البیض ضاحیة
ضربا تواصت به الابطال سجینا

اور بعض کا قول ہے کہ نون لام کے بدلہ میں ہے اصل میں سجّیل تھا جو سجّل سے مشتق ہے جس کے معنی نوشتہ کے ہیں۔" [2] [3]

## فصل الحاء المہملۃ

**سَحَابٌ**: بادل، سحاب ابر کو کہتے ہیں خواہ اس میں پانی ہو یا نہ ہو اور کبھی لفظِ سحاب ذکر کر کے بطور تشبیہ اس سے سایہ اور اندھیرا بھی مراد لیا جاتا ہے ارشاد ہے اَوْكَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ (یا جیسے اندھیرے گہرے دریا میں کہ چھا رہی ہے اس پر ایک لہر اس پر ایک اور لہر اس کے اوپر بادل (یعنی اندھیرا بادل) اندھیرے ہیں ایک پر ایک) اصل میں سَحْبٌ کے معنی کھینچنے کے ہیں اسی سے سحاب ہے کیونکہ ہوا اس کو کھینچ کے چلتی ہے یا اس لئے کہ یہ پانی کو کھینچ کر لاتا ہے یا اس بنا پر کہ یہ خود اپنی روانی میں کھنچا چلا آتا ہے۔ اصمعی نے جو لغت عربیت کے امام ہیں کتاب السحاب میں لکھا ہے کہ:۔

"سحاب اسم جنس جمعی ہے اس کا واحد سحابۃ

[1] تفسیر روح البیان، جز ۳۰، ص ۳۶۶ (طبع استنبول)
[2] تفسیر فتح القدیر، ج ۵، ص ۳۸۸ (طبع مصر)
[3] یعنے محبوس و مقید کیونکہ ساتویں زمین میں مقید پڑا ہوا ہے۔

ہے، یہ مذکر بھی آتا ہے اور مؤنث بھی، مفرد بھی استعمال ہوتا ہے اور جمع بھی۔" [1]

فرید وجدی لکھتے ہیں :-

"لفظ کی رعایت سے اس کی صفت مفرد آتی ہے جیسے ارشادِ الٰہی وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ (اور بادل جو کرتا بعدار ہے اس کے حکم کا درمیان آسمان اور زمین کے) اور معنی کی رعایت سے جمع بھی لائی جاتی ہے جیسے وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ (اور اٹھاتا ہے بادل بھاری)" [2]

اسی طرح تذکیر کی مثال آیتِ مذکورہ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ اور تانیث کی حَتّٰىٓ اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا ہے، تانیث جمع ہونے ہی کی وجہ سے ہے، اس کی جمع سُحُبٌ آتی ہے، لسان العرب میں ہے مناسب یہ ہے کہ سُحُبٌ سَحَابٌ کی جمع ہو جو سَحَابَةٌ کی جمع ہے پس سُحُبٌ جمع الجمع ہے۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمامۂ مبارک کا نام سحاب تھا جو ہوا میں (شملہ کے) اڑنے کے سبب بادل سے تشبیہ کی بنا پر اس نام سے موسوم ہوا، ۳۵/۹، ۲۴/۴۳، ۲۷/۸۸، ۷/۵۷، ۲/۱۶۴۔ سَحَابًا ۱۳/۱۲، ۴۰/۲۱، ۳۰/۴۸، ۲۴/۴۳۔

**سَحَّارٌ** : بڑا جادوگر، سِحْرٌ سے بروزن فَعَّالٌ مبالغہ کا صیغہ ہے، ۲۶/۳۷۔

**سُحْتٌ** : حرام، اصل میں وہ چھلکا جسے جڑ سے اکھیڑ لیا جائے سحت ہے اور اسی سے سحت کا استعمال اس ممنوع فعل کے لئے ہوتا ہے کہ جس کے مرتکب کو عار دامن گیر ہو، گویا وہ اپنے دین و مروت کی جڑ کاٹتا ہے، مرتضٰی زبیدی لکھتے ہیں :-

"گفتگو میں یہ کبھی مکروہ کے لئے آتا ہے اور کبھی حرام کے لئے اور قرآن سے اس کا پتہ چلتا ہے۔" [3]

ارشادِ الٰہی ہے اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (بڑے حرام کے کھانے والے ہیں) یہاں سحت بمعنی حرام ہے یعنی وہ چیز جو ان کے دین کا ناس کرنے والی ہے اور حدیث کسب الحجام سحت (پچھنے لگانے والے کی کمائی سحت ہے) یعنی سحت بمعنی مکروہ ہے یعنی یہ کمائی مروت کو ختم کرنے والی ہے دین کو نہیں کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو اونٹنی کے چارہ اور

---

[1] تاج العروس شرح قاموس

[2] دائرۃ المعارف، فرید وجدی، مادہ سحب

[3] تاج العروس شرح قاموس

Marfat.com

غلاموں کو کھانا کھلانے میں صرف کرنے کی اجازت دی ہے[۱] $\frac{۶}{۱۳،۱۰}$۔

**سِحْرٌ**: جادو، جادو کرنا، سَحَرَ یَسْحَرُ کا مصدر ہے یہ مصادرِ شاذہ میں ہے[۲]، علامہ ابنِ خالویہ لغوی نے کتاب لیس میں تصریح کی ہے کہ عربی زبان میں فَعَلَ یَفْعَلُ فِعْلاً کے وزن پر سوائے سَحَرَ یَسْحَرُ سِحْرًا اور کوئی مصدر نہیں ہے[۳]، لیکن علامہ ابوحیان نے البحر المحیط میں اتنا اور زیادہ کیا ہے کہ بجز سِحْرٌ اور فِعْلٌ کے اور کوئی مصدر بروزن فِعْلٌ فَعَلَ یَفْعَلُ کا نہیں پایا جاتا[۴]۔ شیخ سلیمان نے بھی یہی کہا ہے[۵]۔

امام ابوبکر جصاص رازی احکام القرآن میں رقمطراز ہیں:۔

"اہلِ لغت ذکر کرتے ہیں کہ سحر کی اصل لغت میں اس شے کے لئے ہے جو لطیف ہو اور جس کا سبب مخفی ہو اور سَحَران کے نزدیک بالفتح بمعنی غذا کیونکہ وہ مخفی ہوتی ہے اور اس کے مجاری لطیف ہوتے ہیں، لبید کہتے ہیں (رضی اللہ عنہ) ؎

ارانا موضعین لامر غیب

و نسحر بالطعام و بالشراب

یہاں شعر میں دو جملیں بیان کی گئی ہیں ہم سحر زدہ کی طرح مشغول و فریفتہ تھے، دوسرے یہ کہ ہم غذا حاصل کر رہے تھے اور جو وجہ بھی ہو اس کے معنی خفا کے ہوتے ہیں، ایک اور شاعر کہتا ہے ؎

فان تسئلینا فیم نحن فاننا

عصافیر من هٰذا الانام المسحر

اس بیت کے معنی میں بھی وہی احتمال ہیں جو اول میں ہیں اور یہ بھی احتمال ہے کہ مُسَحَّر سے ذو سحر (پھیپھڑے والا) مراد لیا ہو، سحر پھیپھڑے کو اور جو حلق سے لگا ہوا ہے کہتے ہیں، اسی سے حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما بین سحری ونحری (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے پھیپھڑے اور سینے کے بالائی حصے کے مابین وفات پائی) اور ارشادِ الٰہی ہے اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ (یعنی تم اس مخلوق سے ہو جو کھاتی پیتی ہے) و اسی کو آیتِ شریفہ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (اور تو بھی ایک آدمی ہے جیسے ہم) بتلاتی ہے جس طرح کہ فرمایا ہے مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْکُلُ

[۱] ملاحظہ ہو مفرداتِ امام راغب [۲] روح المعانی، ج۱، ص۳۰۵ [۳] تاج العروس شرح قاموس
[۴] البحر المحیط، ج۱، ص۲۱۹ [۵] الفتوحات الالٰہیہ بتوضیح تفسیر الجلالین للدقائق الخفیہ مشہور بہ حاشیہ جمل علی الجلالین ج۱، ص۸۰ (طبع مصر ۱۳۵۲ھ)

Marfat.com

الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْأَسْوَاقِ (یہ کیسا رسول ہے کھاتا ہے کھانا اور پھرتا ہے بازاروں میں) نیز یہ بھی احتمال ہے کہ ہماری طرح تُو سَحر (پھیپھڑے والا) ہے اور اس قسم کے معاملات پر لفظِ سحر کا ذکر ان اجسام کے ضعف ولطافت اور رقت کے سبب کیا جاتا ہے، نیز بایں ہمہ اس کے ذریعہ انسان کا قوام ہے لہٰذا جس کی یہ صفت ہو وہ ضعیف و محتاج ہے، یہ ہیں وہ معنی جو لغت میں سحر کے آتے ہیں، پھر یہ اسم منقول ہو کر ہر اس امر کے لئے استعمال ہونے لگا جس کا سبب مخفی ہو اور اپنی حقیقت کے خلاف اس کا تخیل ہونے لگے نیز ملمع اور دھوکہ بازی کے قائم مقام ہو اور جب بھی یہ لفظ مطلق بلا کسی قید کے استعمال ہوگا اپنے فاعل کی مذمت کو بتائے گا ہاں قید کے ساتھ قابلِ مدح وستائش کے بارے میں بھی استعمال ہوا ہے، مروی ہے ان من البیان لسحرا (بعض بیان تو جادو ہے"۔)[1]

امام راغب فرماتے ہیں:۔

"سحر طرف حلقوم اور پھیپھڑے کو کہتے ہیں اور کہا گیا ہے کہ اس سے سحر کا اشتقاق کیا گیا ہے اور وہ سحر یعنی گلے اور پھیپھڑے کو نشانہ بنانا ہے، سحر مختلف معانی کے لئے بولا جاتا ہے

(۱) دھوکہ دینا اور بے حقیقت خیالات کا پیدا کرانا جیسے شعبدہ باز کہ جو کچھ بھی کرتا ہے ہاتھ کی صفائی کی بنا پر نظریں بچا کر کرتا ہے اور جیسے کہ چغلخور ملمع کی باتوں کے ذریعہ جو (دوسری طرف سے) کانوں کو بند کر دیتی ہیں، کیا کرتا ہے ارشادِ الٰہی سَحَرُوْا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ (انہوں نے باندھ دیا لوگوں کی آنکھوں کو اور ان کو ڈرایا) اسی کے متعلق ہے، نیز فرمایا ہے يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ (اس کے خیال میں آئیں ان کے جادو سے) اور اسی لفظ سے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ساحر (جادوگر) سے موسوم کیا، وَقَالُوْا يٰاَيُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ (اور کہنے لگا اے جادوگر پکار ہمارے واسطے اپنے رب کو)

(۲) شیطان سے کسی طرح کے تقرب کے ذریعہ اس کی معاونت کا حاصل کرنا، جیسا کہ ارشاد ہے هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ (میں بتلاؤں تم

[1] احکام القرآن، ج ۱، ص ۴۸ (طبع مصر ۱۳۳۲ھ)

کرکس پر اترتے ہیں شیطان ہر جھوٹے گنہگار پر) اور اسی کے متعلق فرمایا ہے وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (لیکن شیطانوں نے کفر کیا کہ سکھلاتے تھے لوگوں کو جادو)۔

(۳) جس کی طرف اُن سمجھ (جو بات تک کے نا نہیں جانتے) جاتے ہیں کہ وہ ایک ایسے فعل کا نام ہے جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ اس کی قوت سے صورتوں اور طبیعتوں کو بدلا اور انسان کو گدھا بنایا جاتا ہے حالانکہ اہل علم کے نزدیک اس کی کچھ حقیقت نہیں ہے اور کبھی سحر سے اس کی خوبی کا تصور ہوتا ہے چنانچہ کہا گیا ہے ان من البیان لسحرًا اور کبھی کام کی باریکی کا چنانچہ اطبار طبیعت کو ساحرۃ کہتے اور غذا کو سحر سے موسوم کرتے ہیں کیونکہ اس کا فعل دقیق اور اسکی تاثیر لطیف ہوتی ہے۔

حافظ ابوحیان اندلسی لکھتے ہیں :-

"سحر کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں ؛

اول یہ کہ وہ اعیان (حقائق) کا قلب واختراع اور لوگوں کی صورتوں کو بدل ڈالنا ہے جو کہ معجزات وکرامات کے مشابہ ہے جیسے کہ ہوا میں اڑنا اور ایک رات میں مسافتوں کا قطع کر ڈالنا،

دوم یہ کہ دھوکہ بازیاں بازی گریاں طلسم سازیاں اور شعبدہ بازیاں ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى (اس کے خیال میں آئیں ان کے جادو سے کہ دوڑ رہی ہیں) اسی کو بتلا رہا ہے اور حدیث میں ہے کہ لبید بن الاعصم نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر کیا تھا تو آپ کے خیال میں یوں آتا تھا کہ آپ کسی چیز کو انجام دے رہے ہیں حالانکہ آپ اس کو انجام دیتے نہ تھے اور یہ معتزلہ کا قول ہے جن کی رائے میں سحر کی کوئی حقیقت نہیں ہے شافعیہ میں ابو اسحٰق استرابازی بھی انہی کے موافق ہیں۔

سوم یہ کہ وہ حیلہ کے طور پر ایسا معاملہ ہے جو نظر بندی کر دیتا ہے اسی سے ہے سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ (انہوں نے نظر بندی یا لوگوں کی آنکھوں کو) حیلہ گروں اور ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا دینے والوں اور شعبدہ بازوں میں اس طرح کی چیزیں ہوتی ہیں جن میں سے بہت سی باتیں کتاب کشف الدک وایضاح الشک اور کتاب ارخاء الستور والکلل فی الشعوذہ

دلائل میں مذکور ہیں اور حدیث میں ہے کہ جب مکہ میں چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے تو ابو جہل (علیہ اللعن) کہنے لگا ذرا اتنا صبر کرو کہ بادیہ نشیں لوگ آلیں اگر وہ اس کی خبر نہ دیں تو محمد (صلوات اللہ علیہ وسلامہ) نے ہماری آنکھوں پر سحر کیا ہے (یعنی ہماری نظر بندی کر دی ہے) جب انہوں نے بھی اس کی خبر دی تو بولا کہ یہ تو بڑا جادو ہے۔

چہارم یہ کہ وہ خدمت جن کی ایک قسم ہے اور انہوں نے ہی اسے اپنے اجسام کی جنس لطیف اور اس کی ہیئتوں سے نکالا ہے چنانچہ وہ لطیف دقیق اور مخفی ہی ہے۔

پنجم یہ کہ وہ ان اجسام سے مرکب ہے جن کو جمع کر کے جلایا جاتا اور ان کی راکھ اور سیاہیاں بنا کر ان پر اسماء اور عزیمتیں پڑھی جاتی ہیں اور پھر جہاں سحر کی ضرورت پڑتی ہے وہاں انہیں استعمال کیا جاتا ہے۔

ششم یہ کہ اس کی اصل طلسمات اور قلفطریات ہیں جو ستاروں کی خاصیتوں کی تاثیر پر بنائے جاتے ہیں جیسے کہ فرعونی لاٹھیوں کے پارہ میں دھوپ کی تاثیر تھی یا جو چیز مشکل ہو اس کی سہولت کے لئے شیطانوں سے خدمت لینا۔

ہفتم یہ کہ وہ ان کلمات سے مرکب ہے جو کفر پر مشتمل ہیں۔

ہمارے ایک معاصر کا بیان ہے کہ یہ سب اقوال جو سحر کی حقیقت کے متعلق لوگوں نے بیان کئے ہیں سحر کے اقسام میں سے بعض قسمیں ہیں اس نے ان کے ساتھ دوسرے انواع شعبدہ، دک (ایک چیز کو دوسری چیز سے ملا دینا) نیز نیرنجات، اوفاق، عزائم اور رومالوں کا ڈالنا اور اختلالِ حواس کی قسموں کو بھی شامل کیا ہے (یہاں تک معاصر کا بیان ختم ہوا)

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سحر موجود تھا، کیونکہ قرآن اور حدیث صحیح اس پر ناطق ہیں لیکن اب ہمارے زمانہ میں تمام وہ باتیں جن پر ہم نے کتابوں کے ذریعہ واقفیت حاصل کی ہے کذب و افترا ہیں جن سے کچھ نہیں بنتا اور قطعی کوئی شے اس میں سے صحیح نہیں اور یہی حال عزیمتوں اور رومال ڈالنے کا ہے پر وہ لوگ جن کے متعلق یہ اعتقاد کیا جاتا ہے کہ وہ عقلمند ہیں، ان باتوں کی تصدیق کرتے

Marfat.com

ان پر کان دھرتے ہیں حالانکہ میں نے
بعض ان لوگوں کو کہ جو اپنے کو عالم بتلاتے ہیں
یہ دیکھا ہے کہ جب مفلس ہوئے، چند کتابیں
بنائیں اور اپنے دماغ سے کچھ باتیں ان میں
ذکر کر کے بازار میں اچھے داموں انہیں فروخت
کر ڈالا۔

اور بعض علماء نے سحر کے اسم کا اطلاق
لوگوں کے درمیان چغلخوری کے ذریعہ ادھر
کی باتیں ادھر لگانے پر بھی کیا ہے کیونکہ اس
میں بھی دوست کو دشمن سے اور محبوب کو
مبغوض سے بدل دیتا ہے۔" ۱

سحر کی حقیقت پر امام ابو بکر جصاص رازی
نے احکام القرآن میں اور امام فخر الدین رازی
نے تفسیر کبیر میں اور علامہ ابن خلدون نے مقدمہ
میں اور شاہ عبد العزیز صاحب نے تفسیر فتح العزیز
میں اور شیخ طنطاوی جوہری نے تفسیر الجواہر
میں بڑی سیر حاصل بحثیں لکھی ہیں، تفصیل کے
لئے ان کا مطالعہ کافی ہے۔

پ ۱/۱۲، ۶/۷،۶، ۹/۴، ۱۱/۱۳، ۱۳/۱، ۱۶/۱۲، ۱۷/۱، ۱۹/۱۶،۷، ۲۰/۷، ۲۴/۱۱
۲۳/۵، ۲۵/۹، ۲۶/۱، ۲۷/۸،۳، ۲۸/۹، ۲۹/۱۵۔

**سَحَرٍ**: پچھلی رات، سحر کا وقت۔ سحر کے معنی اصل میں
پھیپھڑے کے ہیں، مجازاً اس کا استعمال صبح سے
کچھ پہلے رات کے اس آخری حصہ کے لئے ہوتا ہے
جبکہ پچھلی رات کی سیاہی دن کی روشنی سے مل جاتی
ہے، علامہ زمخشری کا بیان ہے:۔

"سحر اس کا نام بطور استعارہ پڑا کیونکہ
وہ رات کے جانے اور دن کے آنے کا وقت
ہے اس لئے وہ صبح کے سانس لینے کا
مقام ہے۔" ۲

اَسْحَارٌ جمع (ملاحظہ ہو اَسْحَارِ) پ ۲۷/۹۔

**سِحْرَانِ**: دو جادو، سِحْرٌ کا تثنیہ
بحالتِ رفع، پ ۲۰/۸۔

**سِحْرُكَ**: تیرا جادو، سحر مضاف ک ضمیر
واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ، پ ۱۶/۱۲۔

**سَحَرُوْا**: انہوں نے جادو کیا، انہوں نے
نظر بندی کی (فَتْحٌ) سِحْرٌ سے ماضی کا صیغہ جمع
مذکر غائب، پ ۹/۴۔

**سَحَرَةٌ**: جادوگر، سَاحِرٌ کی جمع پ ۹/۴، پ ۱۱/۱۲
پ ۱۶/۱۲، پ ۱۹/۷۔

**سِحْرِهٖ**: اس کا جادو، سِحْرٌ مضاف ہٖ ضمیر

۱ البحر المحیط، ج ۱، ص ۳۲۷، ۳۲۵ (طباعی)

۲ تاج العروس، فصل السین، باب الراء

واحد مذکر غائب، مضاف الیہ، ۱۹/۴۔

**سِحْرِهِمَا**: ان دونوں کا جادو، سحر مضاف
**هما** ضمیر تثنیہ مذکر غائب، مضاف الیہ، ۱۶/۱۲۔

**سِحْرِهِمْ**: ان کا جادو، سحر مضاف ہم ضمیر جمع مذکر
غائب مضاف الیہ، ۱۶/۱۲۔

**سُحْقًا**: دفع ہونا، دور کرنا، مصدر ہے اور اس کا
فعل ثلاثی ہے سَحِقَ کَرُمَ دونوں سے آتا ہے[۱] یعنی
سَحِقَ یَسْحَقُ بھی اور سَحُقَ یَسْحُقُ بھی،
زجاج نے اس باب افعال کا مصدر بتایا ہے یعنی أَسْحَقَ
سُحْقًا، ابو علی فارسی کا بیان ہے کہ قیاس سِحَاقًا
ہے مصدر بحذف زوائد آیا ہے جیسے کہ کہا گیا ہے
ع وان اهلك فذلك كان قدری (اگر میں ہلاک
ہوا تو یہی میری تقدیر میں تھا) کہ یہاں قدری بمعنی
تقدیری کے ہے، ابو حیان لکھتے ہیں کہ:
"مصدر میں ادعا رحذف کی احتیاج نہیں کیونکہ
اس کا فعل ثلاثی آیا ہے[۲]" ۱۹/۱

**سَحِيقٍ**: دور، بعید، سُحق سے بروزن فَعِيلٌ
بمعنی فاعل ہے۔ ۱۴/۱۱

## فصل الخاء المعجمہ

**سَخِرَ**: اس نے ٹھٹھا کیا (سَخِرَ) سُخْرٌ سے جس کے معنی
ٹھٹھا کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب:
آیت شریفہ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ اللہ نے ان کو ٹھٹھا
کرنے کی سزا دی، میں سُخْرٌ کا استعمال حق تعالیٰ شانہ
کے لئے بسبب مشاکلت ہے۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:-
"یہ ان کی بد اطواری اور اہل ایمان سے استہزاء
کے مقابلہ کے طور پر ہے کیونکہ جیسا کام ویسا
بدلہ"[۳]

امام رازی نے اصم سے اس کے معنی کی تشریح نقل
کی ہے:
"مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان منافقین سے جو
نیکی کے کام بظاہر انجام دئے تھے انہیں قبول
تو رکھا مگر ان پر انہیں ثواب نہیں عطا فرمائیگا تو یہ
سخریہ (ٹھٹھے) ہی کی طرح ہوا[۴]" ۱۰/۱۶

**سَخَّرَ**: اس نے کام میں لگا دیا، اس نے بس میں
کر دیا، تسخیر سے جس کے معنی بس میں کرنے اور
زبردستی کسی کام میں لگا دینے کے ہیں، ماضی کا صیغہ
واحد مذکر غائب، ۱۳/۱۰، ۲، ۱۴/۸، ۱۴/۱۶، ۲۱/۱۲، ۲،
۲۲/۱۴، ۲۳/۱۵، ۲۵/۱۸، ۷

[۱] کاری [۲] ابو محیط ج ۸، ص ۳۰۰ [۳] تفسیر ابن کثیر ج ۳، ص ۷۱، ۳ (طبع مصر ۱۳۶۵ھ) [۴] تفسیر کبیر ج ۴، ص ۹۴ ملاحظہ ہو

**سَخَّرْنَا**: ہم نے تابع کر دیا، ہم نے بس میں کر دیا، تَسْخِیْرٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، پ ۱۷/۶، ۲۳/۱۱، ۱۲

**سَخَّرْنٰهَا**: ہم نے اس کو بس میں کر دیا، اس میں ھا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے، پ ۱۷/۱۲

**سَخِرُوْا**: انہوں نے ہنسی کی، انہوں نے ٹھٹھا کیا، سُخْرٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ ۱۲/۴، پ ۱۷/۲

**سَخَّرَهَا**: اس نے اس کو مقرر کر دیا، اس نے اس کو کام میں لگا دیا، اس میں ھا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے (ملاحظہ ہو سَخَّرَ) پ ۲۵/۱۲، ۲۹/۵

**سِخْرِيًّا**: ٹھٹھا، ہنسی، دل لگی، اسم ہے، واضح رہے کہ یہ سُخْرٌ سے جس کے معنی ٹھٹھا کرنے کے ہیں، اسم بھی ہو سکتا ہے اور سَخَّرَ یُسَخِّرُ کا مصدر بھی جس کے معنی مسخر ہونے اور بس میں آنے کے ہیں اور علامہ زمخشری تفسیر سورہ مومنوں میں رقمطراز ہیں:۔

"سِخْرِيًّا پیش کے ساتھ اور زیر کے ساتھ بھی سخر کا مصدر ہے سُخْرٌ کی طرح سے گویا نسبت کی یا ء فعل کی قوت میں زیادتی ہو جاتی ہے جس طرح کہ خصوص میں خصوصیت کہا گیا ہے اور کسائی و فراء سے منقول ہے کہ مکسور تو ٹھٹھے سے ہے اور مضموم سخر کرنے اور غلام بنانے سے یعنی انہوں نے ان کو مسخر رکھا اور غلام سمجھا۔ اور پہلا مذہب خلیل اور سیبویہ کا ہے،،[1]

علامہ محمود آلوسی، روح المعانی میں فرماتے ہیں:۔

"نافع، حمزہ اور کسائی نے سُخْرِيًّا بضم سین پڑھا ہے اور باقی سبعہ نے بکسر سین اور معنی صورتوں میں ایک ہی ہیں یعنی ٹھٹھا کرنا، یہ خلیل، ابو زید انصاری اور سیبویہ کے نزدیک سب ہے اور ابو عبیدہ، کسائی اور فراء نے مضموم السین کو معنی بلا اجرت خدمت لینے کے اور مکسور السین کو معنی استہزاء کے بیان کیا ہے اور یونس نے کہا ہے کہ جب خدمت لینا مراد ہو تو سین پر ضمہ (پیش) کے سوا اور کچھ نہ آئیگا اور جب ہنسی ٹھٹھا کرنا مراد ہو تو ضمہ بھی روا ہے اور کسرہ (زیر) بھی اور دونوں حالتوں میں یہ مصدر ہے جس میں یاء نسبت مبالغہ کے لئے بڑھا دی گئی ہے جیسے کہ احمری میں"[2]

ابو علی فارسی کہتے ہیں کہ:۔

"قرات کسر سین کی زیادہ مناسب ہے کیونکہ وہ بمعنی استہزاء ہے اور کسرہ اس میں اکثر ہے اور

[1] تفسیر کشاف عن حقائق غوامض التنزیل، ج ۳، ص ۵۷ (طبع مصر)

[2] روح المعانی، ج ۱۸، ص ۶۲ (طبع منیریہ مصر)

یہی آیت کے زیادہ لائق ہے، دیکھئے نہیں ارشاد ہے وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ (اور تم ان سے ہنستے تھے)۔[1] پ ۱۸، ۶، ۲۳/۱۳

**سُخْرِیًّا**: خدمت گار، تابعدار، علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں :-

"سُخْرِیًّا جیسا کہ آپ نے ساخرہ کی طرف نسبت ہے جس کے معنی بس میں کرنے اور کام میں لگانے کے ہیں، راغب کہتے ہیں کہ سخری وہ ہے کہ جس پر زبردستی کی جائے اور وہ اپنے ارادہ سے مسخر ہو جائے اور بعض نے خیال کیا ہے کہ یہ یہاں سُخْر سے ہے بمعنی استہزاء کے یعنی تاکہ تونگر فقیر پر ٹھٹھا کرے اور ابوحیان نے اس کو بعید بتایا ہے اور سمین نے کہا ہے کہ یہ موقع کے مناسب نہیں"۔[2] پ ۲۵/۹

**سَخَطٍ**: غصہ، وہ سخت غصہ جو عقوبت کا مقتضی ہو، سَخَطٌ ہے۔ پ ۳/۸

**سَخِطَ**: وہ غصہ ہوا (ن ع) سَخَطٌ سے جس کے معنی غصہ ہونے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب۔ پ ۶/۱۵

## فصل الدال المهملة

**سَدًّا**: آڑ، حائل، دیوار، دو چیزوں کے درمیان آڑ اور حائل کو سد کہا جاتا ہے، اصل میں یہ سَدَّ یَسُدُّ کا مصدر ہے جس کے معنی رخنہ کو استوار کرنے اور خلل کو بند کرنے کے ہیں، دیوار، پہاڑ اور بند میں چونکہ یہ صفت موجود ہے اس لئے ان کے لئے بھی سد کا لفظ استعمال ہوتا ہے، سد ذوالقرنین کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی جو تحقیق ہے اس کا اقتباس درج ذیل ہے، فرماتے ہیں :-

"بحر خزر کے مغربی ساحل پر ایک قدیم شہر دربند آباد ہے، یہ ٹھیک اس مقام پر واقع ہے جہاں کاکیشیا کا سلسلہ کوہ ختم ہوتا اور بحر خزر سے مل جاتا ہے، اس مقام پر قدیم زمانہ سے ایک عریض و طویل دیوار موجود ہے جو سمندر سے شروع ہو کر تقریباً تیس میل تک مغرب میں چلی گئی ہے اور اس مقام تک پہنچ گئی ہے جہاں کاکیشیا کا مشرقی حصہ بہت زیادہ بلند ہو گیا ہے۔ اس طرح اس دیوار نے ایک طرف بحر خزر کا ساحلی مقام بند کر دیا تھا دوسری طرف پہاڑ کا وہ تمام حصہ بھی روک دیا تھا جو ڈھلوان ہونے کی وجہ سے

---

[1] البحر المحیط، ج ۶، ص ۴۲۳ (طبع مصر ۱۳۲۸ھ)
[2] روح المعانی، ج ۲۵، ص ۲۷

قابل عبور ہو سکتا تھا، ساحل کی طرف یہ دیوار دوہری ہے یعنی اگر آذربائیجان سے ساحل ہوتے ہوئے آگے بڑھیں تو پہلے ایک دیوار ملتی ہے جو سمندر سے برابر مغرب کی طرف چلی گئی ہے اس میں پہلا ایک دروازہ تھا، دروازے سے جب گزرتے تھے تو شہر دربند ملتا تھا، اب یہ صورت باقی نہیں رہی، دربند سے آگے پھر اسی طرح کی ایک دیوار ملتی ہے لیکن یہ دوہری دیوار صرف دو میل تک گئی ہے، اس کے بعد اکہری دیوار کا سلسلہ ہے، دونوں دیواریں جہاں جا کر ملی ہیں وہاں ایک قلعہ ہے قلعہ تک پہنچ کر دونوں کا درمیانی فاصلہ سو گز سے زیادہ نہیں رہتا لیکن ساحل کے پاس پانچ سو گز ہے اور اسی پانچسو گز کے عرض میں دربند آباد ہے اس دوہری دیوار کو ایرانی قدیم سے "دوبارہ" کہتے آئے ہیں یعنی دوہرا سلسلہ۔

اس مقام سے جب مغرب کی طرف کاکیشیا کے اندرونی حصوں میں اور آگے بڑھتے ہیں تو ایک اور مقام ملتا ہے جو درّہ داریال کے نام سے مشہور ہے اور موجودہ زمانہ کے نقشہ میں اس کا محل ولاڈی کیوکز (یونانی کاکیشیا، روسی کیوکز) اور فارسی قفقاز ایک ہی لفظ ہے) اور تفلس کے درمیان دکھایا جاتا ہے، یہ کاکیشیا کے نہایت بلند حصوں سے ہو کر گزرا ہے اور دو رنگ بلند چوٹیوں سے گھرا ہوا ہے، یہاں بھی قدیم زمانے سے ایک دیوار موجود ہے اور ارمنی روایتوں میں اسے "آہنی دروازہ" کے نام سے پکارا گیا ہے، ارمنی زبان میں اس کا قدیم نام "بھاک کورائی" اور "کاپان کورائی" چلا آتا ہے، دونوں ناموں کا مطلب یہ ہے کہ "کورہ درہ" سوال یہ ہے کہ کور سے مقصود کیا ہے؟ کیا یہ گورش کی بدلی ہوئی شکل نہیں ہے جو سائرس (ذوالقرنین) کا اصلی نام تھا جیسا کہ دارا کے کتبہ اصطخر میں پڑھا جا چکا ہے۔

اب ایک سوال اور غور طلب ہے، ذوالقرنین نے جو سد تعمیر کی تھی وہ درّہ داریال کی سد ہے یا دربند کی دیوار یا دونوں؟

قرآن میں ہے کہ ذوالقرنین دو پہاڑی دیواروں کے درمیان پہنچا، اس نے آہنی تختیوں سے کام لیا، اس نے برابر کا حصہ پاٹ کے برابر کر دیا، اس نے پگھلا ہوا تانبا استعمال کیا، تعمیر کی یہ تمام خصوصیات کسی طرح بھی دربند کی دیوار

پر صادق نہیں آتیں، یہ پتھر کی بڑی بڑی سلوں کی دیوار ہے اور دو پہاڑی دیواروں کے درمیان نہیں ہے بلکہ سمندر سے پہاڑ کے بلند حصے تک چلی گئی ہے، اس میں آہنی تختیوں اور پگھلے ہوئے تانبے کا کوئی نشان نہیں ملتا، پس یہ قطعی ہے کہ ذوالقرنین والی سد کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا۔

البتہ درہ داریال کا مقام ٹھیک ٹھیک قرآن کی تصریحات کے مطابق ہے، یہ دو پہاڑی چوٹیوں کے درمیان ہے اور جو سد تعمیر کی گئی ہے اس نے درمیان کی راہ بالکل مسدود کر دی ہے، چونکہ اس کی تعمیر میں آہنی سلوں سے کام لیا گیا تھا اسلئے ہم دیکھتے ہیں کہ جارجیا میں "آہنی دروازہ" کا نام قدیم سے مشہور چلا آتا ہے اسی کا ترجمہ ترکی میں "دامرکپو" مشہور ہو گیا، بہرحال ذوالقرنین کی اصلی سد یہی ہے،، [1]

(ملاحظہ ہو ذَا الْقَرْنَيْنِ) ۱۶/۲ ، ۲۳/۱۸

**سِدْرٍ**: بیری کا درخت، راغب لکھتے ہیں:۔

"سطا لیا درخت ہے جو کھانے میں ناکافی ہوتا ہے اس لئے ارشاد ہوتا ہے وَّ اَثْلٍ وَّ شَیْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِیْلٍ (اور جھاؤ اور کچھ بیر تھوڑے سے) اور چونکہ اس کے کانٹے جھاڑ کر اس کے ذریعہ سایہ حاصل کیا جاتا ہے اس لئے یہ ارشاد الٰہی فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ (بیری کے درختوں میں جن میں کانٹا نہیں ہے) میں یہ جنت کے سایہ اور اس کی مثال قرار دیا گیا کہ سایہ حاصل کرنے کے لئے بہت کافی ہوتا ہے۔ ۲۲/۸ ، ۲۷/۱۴

**سِدْرَةَ**: بیری کا درخت، واحد ہے، سِدْرٌ جمع، ۲۷/۵

**سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى**: سدرۃ المنتہیٰ، پرے حد کی بیری، سدرۃ المنتہیٰ کیا ہے، انسانی فہم و ادراک کی اخیر سرحد پر ایک درخت، اکابر تابعین سے یہی روایت طبری نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کی ہے [2] یہی وہ مقام ہے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فیوضِ رحمانی اور نعمائے صمدانی سے مخصوص فرمایا گیا تھا۔ ۲۷/۵

**سُدُسُ**: چھٹا حصہ، اسم عدد ہے، اَسْدَاس جمع، ۴/۱۲

---

[1] ملاحظہ ہو ترجمان القرآن، ج ۲، ص ۴۲۷ و ۴۲۸ و ۴۲۹ (طبع مدینہ پریس بجنور)

[2] سیرۃ النبی، ج ۳، ص ۴۳۵ (طبع معارف پریس اعظم گڑھ ۱۳۶۲ھ)

**سُدًی**: بے قید، مہمل کہ نہ کسی بات پر مامور ہو اور نہ کسی چیز سے اسے روکا جائے، اَسْدَاءٌ سے جس کے معنی مہمل چھوڑ دینے کے ہیں، اسم ہے واحد و جمع دونوں کے لئے مساوی طور پر مستعمل ہے، $\frac{۲۹}{۱۸}$

**سَدِیْدًا**: سیدھا، سَدَادٌ سے جس کے معنی درست و راست ہونے کے ہیں بروزن فَعِیْلٌ صفتِ مشبہ کا صیغہ، $\frac{۴}{۱۲}$ $\frac{۲۲}{۶}$

**سَدَّیْنِ**: دو پہاڑ، دو آڑ، سَدٌّ کا تثنیہ بحالت نصب و جر (ملاحظہ ہو سَدٌّ) $\frac{۱۶}{۲}$

## فصل الراء المهملة

**سِرًّ**: چھپی ہوئی بات، بھید، راز، دل میں جو بات چھپی ہو اسے سِرّ کہتے ہیں اَسْرَارٌ جمع۔ واضح رہے بطور کنایہ اور مجاز کے لفظِ سِرّ کا استعمال جماع، نکاح، نکاح کرنے کا اظہار کرنے، نیز زنا کے لئے بھی ہوتا ہے چنانچہ آیتِ شریفہ لَا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا (ان سے نکاح کا وعدہ نہ کرو چھپ کر) میں سِرّ کو ابن السیدہ نے نکاح کا کنایہ بتایا ہے اور مجاہد و فراء نے زمانۂ عدت میں نکاح کی بات چیت کرنے کے معنی لئے ہیں اور ابو الہیثم، حسن بصری، ابو مجلز نے زنا سے تفسیر کی ہے[1] $\frac{۲}{۱۶}$ $\frac{۱۵}{۱۹}$

[1] تاج العروس

**سِرًّا**: $\frac{۲}{۱۲}$ $\frac{۷}{۶}$ $\frac{۱۳}{۹،۷}$ $\frac{۱۴}{۱۶}$ $\frac{۲۲}{۱۶}$

**سَرَّآءَ**: نعمت، فراخی، خوشی، اصل میں حالتِ شادمانی کا نام سَرَّاء ہے، $\frac{۴}{۵}$ $\frac{۹}{۲}$

**سَرَابٌ**: چمکتی ہوئی ریت، سراب، شدتِ گرما میں دوپہر کے وقت دھوپ کی تیزی سے میدان میں جو ریت پانی کی طرح چمکتی ہوئی نظر آتی ہے اور دور سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پانی بہ رہا ہے، اور مکانات اور درختوں کا عکس اس میں دکھائی دے رہا ہے اسے سَرَاب کہتے ہیں۔ چونکہ اکثر اس کے نظر پڑنے سے پانی کا دھوکا ہو جاتا ہے اس لئے سَرَاب دھوکا اور فریب کے لئے ضرب المثل ہے۔ $\frac{۱۸}{۱۵}$ **سَرَابًا** $\frac{۳۰}{۱}$

**سَرَابِیْلَ**: کرتے، قمیصیں، پیراہن، سِرْبَالٌ کی جمع، سِرْبَال قمیص کو کہتے ہیں، وہ کسی قسم کی بھی ہو۔ $\frac{۱۴}{۱۷}$

**سَرَابِیْلُهُمْ**: ان کے کرتے، ان کے پیراہن سَرَابِیْلُ مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، $\frac{۱۳}{۱۹}$

**سِرَاجًا**: چراغ، دیا، مجازاً آفتاب اور ہر روشن چیز کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے، سُرُجٌ جمع، $\frac{۱۹}{۴}$ $\frac{۲۲}{۳}$ $\frac{۲۹}{۹}$ $\frac{۳۰}{۱}$

Marfat.com

**سَرَاحًا**: رخصت کرنا، چھوڑنا، تَسْرِیْحٌ سے جس کے معنی طلاق دینے کے ہیں، اسم ہے، جیسے تَبْلِیْغٌ سے بَلَاغٌ ہے، ابو جعفر بیہقی نے تاج المصادر میں لکھا ہے کہ:

"اس مقام پر تحقیق یہ ہے کہ سَرَاحٌ، سَلَامٌ، کَلَامٌ اسماء ہیں، بروزن فَعَالٌ جو مصدر کے معنی دیتے ہیں۔"

راغب لکھتے ہیں کہ:-

"ارشادِ الٰہی وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا (اور رخصت کر دو بھلی طرح سے) "تسریحِ ابل" (اونٹوں کو چرنے کے لئے چھوڑنا) سے مستعار ہے جیسے کہ طَلَاقٌ "اطلاقِ ابل" (اونٹوں کے پائے بند کھولنے) سے مستعار ہے۔"

(ملاحظہ ہو تَسْرِیْحٌ) ب۲۱/۲ ب۲۲/۲۔

**سُرَادِقُهَا**: اس کی قناتیں، سُرَادِقُ مضاف ھا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، علامہ ابوالسعادات مبارک بن الاثیر جزری نے لکھا ہے کہ ہر وہ شے جو کسی شے کا احاطہ کئے ہوئے ہو خواہ چار دیواری ہو یا شامیانہ یا خیمہ وہ سرادق ہے [1]

امام سیوطی الاتقان میں فرماتے ہیں:-

"جوالیقی کا بیان ہے کہ یہ فارسی ہے معرب اصل میں سرادر تھا یعنی (در سرا) دہلیز کہا اور دیگر حضرات یہ کہتے ہیں یہ فارسی کا "سراپردہ" ہے۔" [2]

اور علامہ زبیدی نے تاج العروس میں جوالیقی سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ "سرادر" یا "سراطاق" کا معرب ہے لیکن طاق خود معرب ہے۔

راغب اصفہانی مفردات میں رقمطراز ہیں:-

"سُرَادِقُ فارسی ہے معرب اور کلامِ عرب میں کوئی ایسا مفرد اسم نہیں ہے کہ جس کا تیسرا حرف الف ہو اور الف کے بعد دو حرف ہوں۔"

علامہ محمود آلوسی نے لکھا ہے کہ:-

"اس کے معرب ہونے کے بارے میں تو راغب نے صحیح کہا کیونکہ عامۂ اہلِ لغت اسی پر ہیں لیکن یہ جو کہا ہے کہ کلامِ عرب میں الخ تو علابط، قرامص، جنادف، حلاحل کا آنا اس کی تکذیب کرتا ہے، حالانکہ سب کے سب سرادق کے وزن پر ہیں اور ایسے الفاظ بہت، باوجود اس کثرت کے ایسے فاضل سے غفلت ہو جانا بعید ہے اس لئے غور کرنا چاہئے کہ ان کی مراد کیا ہے۔" [3]

امام احمد، امام ترمذی اور امام ابنِ جریر طبری نے حضرتِ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت

---

[1] النہایہ فی غریب الحدیث والاثر [2] الاتقان، ج ۱، ص ۱۳۸ (طبع مصر ۱۳۴۳ھ) [3] روح المعانی، ج ۱۵، ص ۲۴۶

کی ہے کہ سرادق نار "سراپردۂ آتش) کی چار دیواریں ہیں اور ہر دیوار کی موٹائی چالیس سال کی مسافت کے بقدر ہے[1] سُرَادِقَاتٌ جمع ہے سیبویہ کا بیان ہے کہ جب اس کو کسرہ نہ دیا گیا تو باوجود مذکر ہونے کے اس کی جمع تاء کے ساتھ لائے[2] $\frac{15}{16}$

**سِرَاعًا**: دوڑتے ہوئے، جلدی کرتے ہوئے، دوڑنے والے، جلدی کرنے والے سَرِیْعٌ کی جمع جو کہ سُرْعَۃٌ سے جس کے معنی جلدی کرنے کے ہیں بروزن فَعِیْلٌ بمعنے فاعل ہے جس طرح کہ کِرَام کَرِیْم کی جمع ہے[3] $\frac{26}{17}$ $\frac{29}{8}$

**سَرَائِرُ**: بھید، راز، پوشیدہ باتیں، سَرِیْرَۃٌ کی جمع علامہ ابن خالویہ لکھتے ہیں:۔

"یار کو جمع میں ہمزہ کر لیا گیا حالانکہ واحد میں ہمزہ نہ تھی اس کی وجہ یہ ہے کہ جمع میں یار سے قبل الف ہے جو ساکن ہے اب دو ساکن جمع ہوئے تو انہوں نے یار کو ہمزہ سے بدل کر التقاءِ ساکنین کی بنا پر اس کو کسرہ دے دیا اور اسی طرح سے ہے قَبِیْلَۃٌ اور قَبَائِلُ اور اگر "یار" اصلی ہوتی جیسے کہ مَعِیْشَۃٌ میں ہے تو جمع میں اسے ہمزہ نہ کیا جاتا ہے ارشاد ہے وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ[4] $\frac{30}{11}$

**سَرَبًا**: سرنگ، اَسْرَابٌ جمع، $\frac{15}{21}$

**سَرِّحُوْهُنَّ**: تم ان عورتوں کو رخصت کر دو، تم ان عورتوں کو چھوڑ دو، سَرِّحُوْا تَسْرِيْحٌ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر هُنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب، (ملاحظہ ہو تَسْرِيْحٌ) $\frac{2}{12}$ $\frac{22}{3}$

**سَرْدٌ**: کڑیاں جوڑنا، زرہیں بنانا، سَرَدَ يَسْرُدُ کا مصدر ہے نیز کڑیوں کے لئے بطورِ اسم بھی مستعمل ہے، $\frac{23}{18}$

**سُرُرٌ**: تخت، سَرِيْرٌ کی جمع ہے، راغب لکھتے ہیں:۔

"سَرِيْرٌ یعنی جس پر سرور سے بیٹھا جائے کیونکہ یہ ارباب نعمت کے ہی پاس ہوتا ہے اس کی جمع اَسِرَّۃٌ اور سُرُرٌ ہے۔

$\frac{14}{4}$ $\frac{23}{6}$ $\frac{27}{14,3}$ $\frac{30}{13}$ سُرُرًا $\frac{25}{9}$

**سَرَقَ**: اس نے چوری کی (ضَرَبَ) سَرِقَۃٌ سے جس کے معنی چوری کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، راغب لکھتے ہیں:۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۸۱ (طبع مصر ۱۳۵۶ھ) [2] تاج العروس [3] تفسیر کبیر سورۂ ق ج ۷، ص ۶۲۴
[4] اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن العظیم، ص ۴۹ (طبع دار الکتب المصریۃ)

مَسْرِقَةٌ کے معنی ہیں پوشیدہ طور پر اس چیز کا لینا جس چیز کو لینے کا حق نہ ہو، اور شرع میں کسی شے کے مخصوص جگہ سے اور مخصوص مقدار میں لے لینے کے لئے مستعمل ہے۔"

۱۳/۴۲

**سِرَّكُمْ**: تمہارا بھید، تمہارا چھپا، سِرٌّ مضاف كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ (ملاحظہ ہو سِرٌّ) ۲/۷

**سَرْمَدًا**: ہمیشہ، دائم۔ علامہ زمخشری کشاف میں رقمطراز ہیں:-

"سرمد کے معنی دائم و متصل کے ہیں، سَرْدٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی متابعت یعنی پے بہ پے اور لگاتار ہونے کے ہیں، اس سے ماہ ہائے حرام کے بارے میں عرب کا محاورہ ہے ثلاثة سرد و واحد فرد (تین یعنی ذی قعدہ، ذی حجہ، محرم، پے بہ پے ہیں اور ایک یعنی رجب یکہ ہے) اور میم زائد ہے، اس کا وزن فَعْمَلٌ ہے اور اس کی نظیر دلامص ہے دلاص سے[1]"۔ اور بعض نحویوں کا مختار یہ ہے کہ میم اس میں اصلی ہے اور اس کا وزن فَعْلَلٌ ہے کیونکہ درمیان میں میم کی زیادتی قیاس سے نہیں کی جاتی ہے[2]۔ قاضی شوکانی نے اسی کو ظاہر بتایا ہے[3]۔ ۲۰/۱۰

**سُرُوْرًا**: سرور، جو خوشی اندر چھپی ہو اس کا نام سرور ہے، یہ سَرَّ يَسُرُّ کا مصدر ہے، علامہ مرتضیٰ زبیدی، بعض اہل لغت سے ناقل ہیں کہ "سرور" کی حقیقت یہ ہے کہ فقط قلب میں التذاذ (مزہ پانا) و انشراح (کھلنا) حاصل ہوتا ہے بغیر اس کے کہ ظاہر میں اس کا کوئی اثر ہو اور "حبور" وہ ہے جس کا اثر ظاہر میں دکھائی دیتا ہے[4]۔ ۲۹/۱۹

**سِرَّهُمْ**: ان کا بھید، ان کا راز، سِرٌّ مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، ۱۶/۱۰ ۲۵/۱۳

**سَرِيًّا**: ایک چشمہ، اَسْرِيَةٌ اور سِرْيَانٌ جمع، جیسے کہ رَغِيْفٌ کی جمع اَرْغِفَةٌ اور رُغْفَانٌ ہیں، تاج العروس میں ہے،

"سَرِيٌّ غَنِيٌّ کی طرح ہے یعنی نہر ہے، ثعلب نے یہی کہا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یعنی جدول ہے یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے اور یہی اہل لغت کا قول ہے چنانچہ انہوں نے

[1] تفسیر کشاف، ج ۳، ص ۱۷۷ (طبع مصر ۱۳۵۴ھ)
[2] روح المعانی، ج ۲۰، ص ۹۳
[3] فتح القدیر، جلد سوم ص ۱۱ (طبع مصر ۱۳۵۰ھ)
[4] روح المعانی، ج ۱۶، ص ۴۲

Marfat.com

اس کی تفسیر اس چھوٹی نہر سے کی ہے جو نخلستان کی طرف رواں ہو۔"

علامہ آلوسی لکھتے ہیں :۔

"جدول کو سری سے اس لئے موسوم کیا کہ پانی اس میں سیر کرتا یعنی رواں ہوتا ہے اس معنی کے اعتبار سے اس کا لام کلمہ یاء ہے، حسن بصری، ابن زید اور جبائی سے مروی ہے کہ سری سے عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں اور یہ سرو بمعنی رفعت ہے جیسا کہ راغب نے کہا ہے اس صورت میں آیہ شریفہ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا کے معنی ہوں گے یعنی تیرے رب نے تیرے نیچے ایک رفیع الشان، بلند مرتبت لڑکا کر دیا اور صحاح میں اس کے معنی مروت کے ساتھ سخاوت کے مرقوم ہیں، پر رفعت مراد لینا قدر کے اعتبار سے زیادہ اونچا ہے اور اس معنے کے لحاظ سے لام کلمہ واو ہے۔"[1]

س ر ع

سَرِيْعٌ : جلد کرنے والا، سُرْعَۃٌ سے جس کے معنی جلدی کرنے کے ہیں بروزن فَعِيْلٌ بمعنے فاعل صفت کا صیغہ ہے، قاموس میں ہے :۔

"اللہ عزوجل کے سریع الحساب" ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس کا حساب لینا لامحالہ واقع ہو کر رہے گا یا ایک حساب اس کو دوسرے حساب سے اور ایک شے اس کو دوسری شے سے ہٹا کر اپنی طرف مشغول نہیں کر سکتی یا اس کے افعال جلد ظہور میں آتے ہیں اور جو وہ ارادہ فرماتے ہیں اس میں کسی بات کی دیر نہیں لگتی، کیونکہ اس کا ہر فعل بغیر کسی چیز کے ارتکاب اور کوشش کے واقع ہوتا ہے پس حق سبحانہ تمام خلق سے ان کے جی اٹھنے اور جمع ہو جانے کے بعد ایک لحظہ میں بغیر کسی قسم کے شمار لگائے اور رکاوٹ کے حساب فرما لیں گے وَهُوَ اَسْرَعُ الْحَاسِبِيْنَ اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔

راغب لکھتے ہیں :۔

"فرمانِ الٰہی اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (اور بیشک اللہ جلد لیتا ہے حساب) اور سَرِيْعُ الْعِقَابِ (جلد عذاب کرنے والا ہے) یہ تنبیہ ہے اس پر جس کے متعلق ارشاد ہے اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ

[1] روح المعانی ج ۱۶، ص ۷۶

اس کا حکم یہی ہے کہ جب کرنا چاہے کسی چیز کو تو کہے اس کو ہو ا وہ اسی وقت ہو جائے"۔

پ ۲/۹ پ ۳/۱ پ ۴/۱۱ پ ۵/۶ پ ۶/۲ پ ۹/۱۱ پ ۱۳/۱۲ ، ۱۹ پ ۱۸/۱۱ پ ۲۴/۷

## فصل الطاء المهملة

**سُطِحَتْ** : وہ بچھائی گئی، (فتح) سَطْحٌ سے جس کے معنی بچھانے کے ہیں، ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب، پ ۳۰/۱۲

## فصل العين المهملة

**سَعَتِهٖ** : اس کی وسعت، اس کی گنجائش، سَعَةٌ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ (ملاحظہ ہو سَعَتِهٖ) پ ۵/۱۶ پ ۲۸/۱۷

**سُعِدُوْا** : وہ نیک بخت بنائے گئے (فتح) سَعْدٌ سے جس کے معنی نیک بخت کرنے کے ہیں، ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر غائب، علامہ ابوجعفر بیہقی تاج المصادر میں لکھتے ہیں:-

"سَعْدٌ اور سُعُوْدٌ کے معنی مبارک ہونے کے ہیں کہا جاتا ہے سَعَدَ يَوْمُنَا (ہمارا دن مبارک ہوا) نیز سَعْدٌ کے معنی ہیں نیک بخت کرنے کے اور اس معنی میں اہل لغت نے اختلاف کیا ہے، زجاج، ازہری اور فارابی نے تو اس کو جائز رکھا ہے اور ارشادِ الٰہی وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا (اور لیکن جو لوگ نیک بخت کئے گئے) سے جو بضم سین ہے استدلال کیا ہے اور سیبویہ نیز محققین اہل لغت نے اس سے انکار کیا ہے ان کا بیان ہے کہ (اس معنی میں) عرب کا محاورہ اَسْعَدَهُ اللّٰهُ ہے اور یہ روا نہیں کہ سُعِدُوْا سَعَادَةٌ سے بمعنی نیک بخت ہونا ہو کیونکہ سَعَادَةٌ شَقَاوَةٌ کی طرح سے لازم ہے اور اس قرارت کے بارے میں سیبویہ نے کہا ہے کہ یہ لغت قیاس سے خارج ہے یا باب فعل اور فعلتہ سے ہوگی (یعنی لازم بھی اور متعدی بھی) جیسے کہ غاض (وہ گھٹ گیا) اور غِضْتُهٗ (میں نے اس کو گھٹا دیا) ہے اور اسی طرح سے سَعَدَ (وہ نیک بخت ہوا) اور سَعَدْتُهٗ (میں نے اس کو نیک بخت کیا) ہیں اور مَسْعُوْدٌ میں ان کے لئے کوئی دلیل نہیں کیونکہ جائز ہے یہ مثل اَجَنَّهُ اللّٰهُ فَهُوَ مَجْنُوْنٌ کے ہو (یعنی باب اَسْعَادٌ سے مستعمل ہو)" پ ۱۲/۹

**سُعُرٍ** : سودا، جنون، بے عقلی، علامہ سمین لکھتے ہیں [illegible]

"سُعُرٌ مفرد بھی ہو سکتا ہے یعنی جنون کے کہا جاتا ہے نَاقَةٌ مَسْعُوْرَةٌ یعنی اپنی رفتار میں دیوانی سی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سَعِیْرٌ کی جمع ہو جس کے معنی نار یعنی آگ کے ہیں اور دونوں احتمال منقول ہیں " [1]

اصل میں سَعْرٌ کے معنی آگ بھڑکانے کے ہیں جب انسان کے دماغ میں گرمی بھڑک اٹھتی ہے تو وہ پاگل ہو جاتا ہے سُعْرٌ کا استعمال سودا اور جنون کے معنی میں اسی اعتبار سے ہے، پ ۲۷ ع ۹ ر ۱۰

**سُعِّرَتْ** : وہ دہکائی گئی، وہ بھڑکائی گئی تَسْعِیْرٌ سے جس کے معنی سخت آگ دہکانے کے ہیں، ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب، پ ۳۰ ع ۶

**سَعَوْا** : وہ لپکے انہوں نے کوشش کی، سَعْیٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب (ملاحظہ ہو سَعْیٌ) پ ۱۷ ع ۱۲ ، ۲۲ ع ۷

**سَعَةٍ** : کشائش، فراخی، وسعت، طاقت، پہنچ، یہ وَسِعَ یَسَعُ کا مصدر ہے جس کے معنی فراخ ہونے کے ہیں، اس کی تاء واو کے بدلہ میں ہے جِدَةٌ اور زِنَةٌ کی طرح اول سے واو کو حذف کر کے آخر میں اس کے عوض تاء لے آئے ہیں راغب لکھتے ہیں "سَعَةٌ کا استعمال امکنہ (مقامات) کے لئے بھی آتا ہے اور حالت کے لئے بھی اور فعل کے لئے بھی جیسے کہ قُدْرَةٌ اور جُوْدٌ وغیرہ الفاظ ہیں، چنانچہ مکان کے بارے میں جیسے ارشاد ہے اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ (میری زمین کشادہ ہے) اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً (کیا نہیں تھی زمین اللہ کی کشادہ) اور حالت کے بارے میں فرمانِ الٰہی ہے لِیُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ (چاہیے خرچ کرے وسعت والا اپنی وسعت کے موافق) اور ارشاد ہے عَلَی الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ (اور مقدور والے پر اس کے موافق ہے)۔

آیتِ کریمہ وَمَنْ یُّهَاجِرْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا کَثِیْرًا وَّسَعَةً (اور جو کوئی وطن چھوڑے اللہ کی راہ میں پائیگا اس کے مقابلہ میں جگہ بہت اور کشائش) کے بارے میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما، ربیع بن انس اور ضحاک سے مروی ہے کہ اس سے وسعتِ رزق مراد ہے اور قتادہ سے روایت کیا گیا ہے کہ اظہارِ دین کی طاقت مراد ہے کیونکہ ان کو مشرکین کی جانب سے دین کے

[1] حواشی سلیمان جمل علی الجلالین، ج ۴، ص ۲۴۷ (طبع مصر ۱۳۵۲ھ)

معاملہ میں سخت تنگی رتبی تھی کہ اظہارِ دین سے روکتے تھے۔ ؎ ۲/۱۶ ۵/۱۱ ۱۸/۹ ۲۵/۱۷

**سَعْیٌ**: قصد کرنا، کام کرنا، چلنا، دوڑنا، کمانا، سَعٰی یَسْعٰی کا مصدر ہے یہ سب معانی قاموس میں منقول ہیں اور امام راغب مفردات میں فرماتے ہیں:-
"سَعْیٌ کے معنی مَشْیٌ سَرِیْعٌ (تیز روی، لپکنے) کے ہیں جو عَدْوٌ (دوڑنے) سے کم ہے اور کسی معاملہ میں کوشش کے لئے استعمال کیا جاتا ہے خواہ خیر ہو یا شر اور بیشتر سعی کا استعمال اچھے کاموں کے بارے میں ہوتا ہے" ۱۵/۲ ۲۳/۷،

**سَعْیًا** ۳/۲-

**سَعٰی**: اس نے کوشش کی، وہ دوڑا، اس نے کمایا، سَعْیٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ۱/۱۴ ۲/۹ ۱۵/۲ ۲۷/۷ ۳۰/۴-

**سَعِیْدٌ**: نیک بخت، سَعَادَۃٌ جس کے معنی نیک بخت ہونے کے ہیں، بروزن فَعِیْلٌ صفتِ مشبہ کا صیغہ ۱۲/۹-

**سَعِیْرٌ**: دہکتی ہوئی آگ، دوزخ سَعْرٌ سے جس کے معنی آگ بھڑکانے کے ہیں بروزن فَعِیْلٌ بمعنی مفعول ہے (ملاحظہ ہو جَحِیْمٌ) ۱۷/۸ ۲۱/۱۲ ۲۳/۱۳،۸ ۲۵/۲ ۲۹/۱

**سَعِیْرًا** ۳/۱۲ ۵/۵ ۱۵/۱۱ ۱۸/۱۷ ۲۲/۵ ۲۶/۱۰ ۲۹/۱۹ ۳۰/۹-

**سَعْیُکُمْ**: تمہاری کمائی، تمہاری کوشش، سَعْیٌ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ ۲۹/۱۹ ۳۰/۱۷

**سَعْیُہٗ**: اس کی کمائی، اس کی کوشش، سَعْیٌ مضاف، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ ۱۷/۷ ۲۷/۷-

**سَعْیُھَا**: اس کی کمائی، اس کی دوڑ، سَعْیٌ مضاف ھا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ ۱۵/۲ ۳۰/۱۳

**سَعْیُھُمْ**: ان کی دوڑ، ان کی کوشش، سَعْیٌ مضاف ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، ۵/۲ ۱۶/۲-

## فصل الفاء

**سَفَاھَۃٌ**: بے عقلی، بیوقوفی، جہالت، سَفِہَ یَسْفَہُ کا مصدر ہے، ۸/۱۶

**سَفَرٌ**: سفر، دور کی مسافت قطع کرنے کا نام "سفر" ہے اَسْفَارٌ جمع، اصل میں سَفْرٌ کے معنی پردہ ہٹانے اور متفرق کرنے کے ہیں، سفر کو سفر اسی اعت

؎ احکام القرآن از امام جصاص رازی ج ۱۲، ص ۳۰۶ (طبع مصر ۱۳۴۷ھ)

Marfat.com

سے کہا جاتا ہے کہ اس میں یہ دونوں معانی محفوظ ہیں
علامہ ابن سیدہ محکم میں لکھتے ہیں :-

"اس نام سے یہ اس لئے موسوم ہوا کہ جس طرح ہوا سوکھے پتوں کو لاتی اور لیجاتی، متفرق کرتی ہے اسی طرح سفر میں بھی آمد و رفت ہوتی ہے"۔ لہ

اور امام ابو منصور ازہری تہذیب میں رقمطراز ہیں :-
"سفر کا نام سفر اس لئے پڑا کہ وہ مسافروں کے رخ اور ان کے اخلاق کو ظاہر کرتا ہے اور جو باتیں ان میں چھپی ہوتی ہے اسے کھول دیتا ہے"۔ ٹے

اور اصطلاحِ شرع میں سفر سے خاص قسم کی قطع مسافت مراد ہے جس سے احکام شرعیہ متغیر ہو جاتے ہیں جنؔ ائمہ احناف کے نزدیک جس سفر سے احکام متغیر ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ انسان تین دن رات کی مسافت کا ارادہ کرے، مسافت اونٹ کی رفتار سے ہو یا پیادہ روی سے پر چال درمیانی ہو"۔ ٹے

اور یہی قول امام سفیان ثوری اور امام حسن بن صالح کا ہے۔ امام ابوبکر احمد بن علی جصاص رازی فرماتے ہیں :-

"لغت میں سفر کی کوئی حد معلوم نہیں کہ جس سے فرق ہو سکے کہ کم سے کم سفر یہ ہے اور اس کے علاوہ یہ ہے پس لغت کا معاملہ یہ ٹھہرا، اور علماء اس پر متفق ہیں کہ جو سفر افطار کو مباح کرتا ہے اس کی مقدار شرع میں معلوم ہے، ہاں اس مقدار کے بارے میں وہ باہم مختلف ہیں، ہمارے اصحاب (حنفیہ) تین دن اور تین رات کی مسافت بتاتے ہیں اور دوسرے دو دن کی مسافت اور اور لوگ ایک ہی دن کی مسافت اور لغت کا اس بارے میں کوئی حصہ نہیں کیونکہ اس میں کم سے کم سفر کی کسی وقت کے ساتھ اس طرح تحدید ہے ہی نہیں کہ جس سے کم کرنا جائز نہ ہو کیونکہ وہ ایسا اسم ہے جو عادت سے ماخوذ ہے اور ہر وہ چیز جس کا حکم عادت سے ماخوذ ہو اقل قلیل سے اس کی تحدید ناممکن ہے نیز یہ بیان کیا گیا ہے کہ سفر، تسفر سے

لہ ان امور میں سے سفر سے جو احکام متغیر ہوتے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں: نماز کا قصر کرنا، روزہ کے افطار کا مباح ہونا، موزوں پر مسح کی عادت کی مدت کا تین دن تک بڑھ جانا، جمعہ عیدین اور قربانی کے وجوب کا ساقط ہو جانا، بغیر محرم کے آزاد عورت کے نکلنے کا حرام ہونا (ملاحظہ ہو عنایہ شرح ہدایہ از علامہ اکمل الدین بابرتی ج ۱ ص ۳۹۳) ٹے ہدایہ باب صلاۃ المسافر
سکہ احکام القرآن از جصاص ج ۱ ص ۳۱۷ (طبع مصر ۱۳۴۷ھ)

Marfat.com

مشتق ہے جس کے معنی کھولنے کے ہیں عرب کے اس محاورہ سے ہے سفرت المرأۃ عن وجہھا (عورت نے اپنا چہرہ کھولا) اور اسفر الصبح (صبح روشن ہوئی) اور سفرت الریح السحاب (ہوا نے بادل کھول دیا) اور مسفرۃ (جھاڑو) کے معنی میں ہے کیونکہ وہ مٹی کو جھاڑ کر زمین کو کھول دیتی ہے اور اسفر وجھہ اس کا چہرہ تابناک اور روشن ہوا اور اسی سے ارشاد الٰہی ہے وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَۃٌ (کتنے چہرے اس دن روشن ہیں) یعنی تاباں و درخشاں ہیں پس کسی دور مقام کی طرف جانے کو سَفَر سے موسوم کیا گیا کیونکہ وہ مسافر کے اخلاق و احوال کو کھولتا ہے۔

اور معلوم ہے کہ جب سفر کے معنی وہ ہوئے جو ہم نے بیان کئے تو یہ تھوڑے سے وقت اور ایک دن اور دو دن میں واضح نہیں ہوتے کیونکہ اکثر اس قسم کی مسافت کا ارتکاب کیا جاتا اور اس میں اس کے اخلاق کی وہ باتیں ظاہر نہیں ہو پاتیں کہ جن کو دور کا سفر کھول کر رکھ دیتا ہے۔

پھر اگر عادت کا اعتبار کیا جائے تو ہم یہ جانتے ہیں کہ قریب کی مسافت کو سفر نہیں کہا جاتا اور دور کی مسافت کا نام سفر ہے ہاں اس پر سب متفق ہیں کہ تین دن رات کی مسافت سفر صحیح ہے کہ جس کے بارے میں احکام شرع متعلق ہیں، پس تین دن رات کی مسافت کا سفر ہونا تو ثابت ہو گیا اور اس سے کم کا سفر ہونا ثابت نہیں کیونکہ سفر کے معنی اس میں معدوم اور توقیف (اس سے واقف کرانا) اور اس کی تحدید پر اتفاق مفقود ہے۔

نیز نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایسی حدیثیں مروی ہیں جو چاہتی ہیں کہ احکام شرع میں سفر کے ہونے میں تین دن کی مسافت کا اعتبار ہو من جملہ ان کے ابن عمر سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی عورت بغیر اپنے محرم کے تین دن کا سفر کرے"۔ [1]

بے ۳ بے ۶ ش ۴ ۵/۲۱

سَفَرًا ۱/۱۲

سَفَرِنَا: ہمارا سفر، سَفَر مضاف نا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، ۵/۲۱

سَفَرَۃٍ: لکھنے والے، سافر کی جمع ہے جیسے کتبۃ

[1] احکام القرآن، ج ۲، ص ۲۰۴

کاتِبٌ کی ہے، واضح رہے کہ سَفَرٌ کے معنی لکھنے کے بھی آتے ہیں جو اسی اعتبار سے ہیں کہ لکھنے میں وہ شے کھلتی ہے، سَافِرٌ اسی سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ہے، تفسیر کبیر میں ہے کہ:-

"گتبۃ کو سَفَرَۃٌ اور کاتِبٌ کو سَافِرٌ اس لئے کہا گیا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس شے کو بیان کرنے والا اور واضح کرنے والا ہے۔" سلہ

ابن ابی حاتم نے بروایت ابن جریج حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بِاَیْدِیْ سَفَرَۃٍ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ نبطی زبان میں اس کے معنی قرار یعنی قرارت کرنے والوں کے ہیں۔ سلہ پ ۳۰

**سَفَرِنَا** : ہمارا سفر، سَفَرِهِمْ نا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، پ ۲۱/۱۶

**سُفْلٰی** : پست، نیچی، سُفُوْلٌ سے اسم تفضیل کا صیغہ واحد مؤنث، عُلْیَا کی نقیض ہے (ملاحظہ ہو اَسْفَلَ) پ ۱۰/۱۲

**سَفِهَ** : وہ بیوقوف ہوا، اس نے احمق بنایا، اس نے ہلاک کیا (رجح) علامہ محمود آلوسی زیر آیہ شریفہ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ گر جو بیوقوف ہوا اپنے جی سے یا گر وہی کہ جس نے احمق بنایا اپنے آپ کو، تحریر فرماتے ہیں:-

"اور سَفِهَ بالکسر (بروزن سَمِعَ) جیسا کہ مبرد و ثعلب کا بیان ہے متعدی بنفسہٖ بطور نفسہ، مفعول بہ لیکن سَفُهَ بالضم (بروزن کَرُمَ) سو وہ لازم ہے اور حدیث میں جو آتا ہے کہ الکبران تسفه الحق و تغمط الناس (کبر یہ ہے کہ تو حق کا استخفاف کرے اور لوگوں کو خوار رکھے) وہ اس کے متعدی ہونے کا شاہد ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ بھی لازم ہے اور مفعول کی طرف اس کا تعدیہ اس بنا پر ہے کہ وہ اس معنی جھل یا اھلاک پر مشتمل ہے جس کی طرف تعدیہ ہوتا ہے یعنی خفتِ عقل اور عدم تفکر کی بنا پر اس نے اپنے آپ کو نادان بنایا اور یہ زجاج کا قول ہے یا اس نے اپنے آپ کو ہلاک کیا' یا ابو عبیدہ کا قول ہے" سلہ پ ۱/۱۶

**سَفَهًا** : نادانی، کم عقلی، بیوقوفی سَفِهَ یَسْفَهُ کا مصدر ہے، واضح رہے کہ سَفَهٌ کا استعمال امور اُخروی اور دنیاوی دونوں کے بارے میں ہوتا ہے چنانچہ سفہ دنیوی کے متعلق ارشاد ہے وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاۗءَ اَمْوَالَكُمُ (اور مت پکڑا دو

بے عقلوں کو اپنے حال ہا اور سفہ اخروی کے متعلق فرمایا ہے
وَاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا
اور یہ کہ ہم میں کا بیوقوف اللہ پر بڑھا کر باتیں کیا کرتا
تھا، یہ دین کے بارے میں سفاہت و بیوقوفی
کا بیان ہے، پ۲۹

**سُفَهَآءُ**: بے وقوف، کم عقل، بے سمجھ، احمق،
سَفِيْهٌ کی جمع، ۱/۲، ۱/۲، ۱۲/۳، ۹/۹

**سَفِيْنَةٌ**: کشتی، جہاز، سَفْنٌ سے جس کے معنی
پوست اکھیڑنے اور کسی شے کو اوپر سے چھیلنے کے ہیں
بروزن فَعِيْلَةٌ بمعنے فَاعِلَةٌ ہے چونکہ کشتی سطح آب کو
چیرتی جاتی ہے اس لئے اس کا نام "سفینہ" ہوا، سَفَائِنُ
اور سُفُنٌ جمع، ۱۵/۲۲، ۱۶/۱، ۲۰/۱۴

**سَفِيْهًا**: بیوقوف، بے عقل سَفَهٌ اور سَفَاهَةٌ
سے بروزن فَعِيْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ واحد
مذکر، پ۳

**سَفِيْهُنَا**: ہم میں کا بیوقوف، سَفِيْهٌ مضاف
نا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، ۲۹/۱۱

## فصل القاف

**سِقَايَةَ**: پانی پلانا، پلانے کی جگہ، پینے کا برتن۔
"سقایہ" کے بارے میں مفسرین و اہل لغت کے اقوال
سخت پریشان ہیں کوئی اس کو مشتق يَسْقِیْ کا مصدر
بتاتا ہے اور کوئی اَسْقٰی کا اور کوئی مصدر کو بمعنے اسم
فاعل بیان کرتا ہے اور کوئی کہتا ہے اس مکان کا
نام ہے جہاں حاجیوں کو پینے کے لئے پانی دیا جاتا
تھا، علامہ سید محمد رشید رضا مصری نے تفسیر المنار
میں اس پر بڑی عمدہ تحقیقی بحث لکھی ہے جو درج
ذیل ہے فرماتے ہیں:-

"سقایہ لغت میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی
وغیرہ پلایا جاتا ہے اسی معنی میں ہے جَعَلَ السِّقَايَةَ
فِىْ رَحْلِ اَخِيْهِ (رکھ دیا پینے کا پیالہ اسباب میں
اپنے بھائی کے) اسے سِقَايَة سے اس لئے موسوم
کیا گیا کہ اس سے پلایا جاتا تھا اور صواع اس لئے
کہا گیا کہ صاع کی طرح اس سے ناپا جاتا تھا، یہ
مؤنث بھی استعمال ہوتا ہے اور مذکر بھی لسان
میں (اسی طرح دوسری کتابوں میں) مذکور ہے،
اور سقایۃ وہ مقام ہے جس میں حج کے مواقع وغیرہ
پر شراب (پینے کی چیز شربت، پانی وغیرہ) تیار
کیا جاتا ہے (اس کے بعد کہا ہے) کہ حدیث میں
آتا ہے ماثر الجاھلیۃ تحت قدمی الا
سقایۃ الحاج وسدانۃ البیت (جاہلیت کے
قابل ذکر کارناموں میں سے ہر کارنامہ میرے

Marfat.com

قدموں تک ہے بجز حاجیوں کے پانی پلانے کے انتظام اور خانہ کعبہ کی خدمت گزاری اور پاسبانی کے کہ قریش حاجیوں کو پانی میں کشمش ڈال کر پلایا کرتے تھے اور حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ جاہلیت اور اسلام دونوں میں اس کے متولی رہے ہیں اور جس حدیث کو صاحب لسان نے بیان کیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کی بعض روایات میں وارد ہوئی ہے۔

اور نووی نے الاسماء واللغات میں (اس عنصر میں) جو فرمایا ہے حسب ذیل ہے :-

سقایۃ العباس رضی اللہ عنہ مسجد حرام (زادہ اللہ شرفا) میں ایک مقام ہے جس میں لوگوں کے پینے کے لئے پانی کھینچا جاتا ہے، اس کے اور زمزم کے درمیان چالیس ہاتھ کا فاصلہ ہے، ازرقی نے اپنی کتاب "تاریخ مکہ میں" نیز علماء نے بیان کیا ہے کہ سقایہ چمڑے کے حوض تھے جو قصی بن کلاب کے زمانہ میں مکہ کے صحن میں رکھے جاتے تھے اور ان میں اونٹوں کے ذریعہ کنوؤں سے شیریں پانی کھینچا جاتا تھا، پھر قصی نے مرتے وقت سقایہ کا منصب اپنے بیٹے عبد مناف کے سپرد کیا اور وہ برابر عبد مناف کے ہی پاس رہا وہ اسے سرانجام دیتے رہے یہاں تک کہ ان کا انتقال ہوگیا۔

میں (یعنی علامہ رشید رضا) کہتا ہوں اس مقام پر جو سقایۃ العباس سے موسوم ہے ایک عمارت تعمیر کردی گئی تھی جو اب تک قائم چلی آتی ہے، یہ چاہِ زمزم کی جانب جنوب ایک بڑا حجرہ ہے، مؤرخینِ مکہ نے اس کی پیمائش نیز زمزم اور کعبہ مشرفہ سے اس کے فاصلہ کا حال بیان کیا ہے۔

اور اس لفظ کے استعمال سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ اسم حرفہ بن گیا ہے اور اسی طرح حجابۃ جو بیت اللہ کی کلید برداری اور پاسبانی تھی اور یہ دونوں حرفے قریش کے نہایت شاندار کارنامے تھے اور اسی بنا پر اسلام نے ان دونوں کو برقرار رکھا اور یہ بالبداہۃ معلوم ہے کہ حضرتِ عباس رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا کہ انا صاحب السقایۃ اور لوگوں کا بھی ان کے متعلق یہی کہنا اس سے یہ مراد نہیں لیا جائیگا کہ وہ اس مقام کے مالک تھے جہاں وہ پانی رکھا جاتا تھا جو کشمش یا اس میں خرما ڈال کر

شیریں کیا جاتا تھا اور نہ سقایہ سے وہ پانی مراد ہوگا، بلاشبہ اس سے مراد یہی ہے کہ وہ اس کام کے انتظام کے متولی ہیں یعنی کشمش اور خرما لاکر انہیں پانی میں ڈالنا اور اس کے بعد تبرکًا ان مقامات پر رکھنا جہاں کہ حاجی اس کو پیتے ہیں اور عجیب بات ہے کہ لغوی اور مفسر اس معنی سے غفلت کر گئے اور کوئی تو یوں کہے کہ وہ اس مکان کا نام ہے جہاں پانی پلایا جاتا تھا اور کوئی سقی یا استقی کا مصدر بتاگئے (وغیرہ وغیرہ)" [1]

آگے چل کر سید صاحب موصوف لکھتے ہیں:-

"موجودہ زمانہ میں حکومت سعودیہ کی توجہ ہر سال لاکھوں حاجیوں کے لئے پانی کی وافر مقدار مہیا کرنے اور اسے صاف ستھرا رکھنے کی طرف بڑھتی جاتی ہے لیکن شربت کا پلانا بہت زمانوں سے چھوٹ گیا ہے کیونکہ حجاج کی کثرت کی بنا پر یہ دشوار بن گیا ہے اور اگر حرمین کے اوقاف کے چوتھائی حصہ بھی جو اسلامی اطراف میں موجود ہیں انتظام کر کے حکومت حجاز کی طرف روانہ کیا جائے تو حکومت کے لئے اس کا اعادہ اور مکہ یا منیٰ میں اس کے لئے عام انتظام کرنا ممکن ہے۔" [2]

## سَقَرَ: آگ، دوزخ کے ایک طبقہ کا نام ہے۔

علامہ سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس من جواہر القاموس میں رقمطراز ہیں:-

"سَقَر کے بارے میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ آتش کا نام سَقَر رکھ دیا گیا ہے، اس لفظ کے اشتقاق کا پتہ نہیں لگ سکا، اور معرفہ اور عجمہ ہونا سَقَر ہونے سے مانع ہے اور بعض کا قول ہے کہ دوزخ کو سَقَر اس لئے کہا گیا کہ وہ جسم روح کو تحلیل کر ڈالتی ہے اور یہ عربی نام ہے اہل عرب کے محاورہ سقرتہ الشمس سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں دھوپ نے اسے تحلیل کر دیا اور اسے لو لگ گئی اور جو اسے عربی اسم بتاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس کے غیر منصرف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ معرفہ مؤنث ہے۔"

علامہ ابو حیان اندلسی نے البحر المحیط میں لکھا ہے:-

---

[1] تفسیر المنار، ج ۱ ص ۲۱۶، ۲۱۷ (طبع مصر ۱۳۲۶ھ)

[2] امام سیوطی نے الاتقان میں جوالیقی سے نقل کیا ہے کہ عجمی لفظ ہے (الاتقان، ج ۱ ص ۱۳۸)

[3] ایضاً ص ۲۱۸، ۲۱۹

"سَقَرُ علمیت اور تانیث کی بنا پر غیر منصرف ہے اس کے وسط کی حرکت "زینب" کے حرف رابع کے قائم مقام ہے۔" (ج ۸ ص ۱۷۲)

راغب اصفہانی مفردات میں لکھتے ہیں :-

"چونکہ سَقَر اصل میں جلانے کو چاہتا تھا اس لئے یہ فرما کر وَمَا اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ (اور تو کیا سمجھا کیسی ہے وہ آگ نہ باقی رکھے اور نہ چھوڑے، جلا دینے والی ہے آدمیوں کو) متنبہ کر دیا گیا کہ شعلہ میں جو سَقَر کا احوال تم جانتے ہو اس سے معاملہ جداگانہ ہے۔" پ ۲۹ ع ۱۵

سُقِطَ : وہ گرا دیا گیا (نصر) سُقُوْطٌ جس کے معنی گر پڑنے کے ہیں۔ ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب

امام ابو جعفر احمد بن علی مقری بیہقی اپنی کتاب تاج المصادر میں رقمطراز ہیں :-

"اور ارشاد الٰہی وَلَمَّا سُقِطَ فِیْٓ اَیْدِیْهِمْ یعنی وہ نادم ہوئے اس کے معنی ہوتے ہیں سقط الندم فی ایدیہم (ندامت ان کے ہاتھوں میں گر پڑی) اور ندامت کو ذکر نہیں کیا گیا ہے اور بعض کا قول ہے کہ سُقِطَ سقول ملم یسم فاعلہ بنایا ہے جس طرح کہ رغب فی فلاں بولا جاتا ہے اور سُقِطَتْ نہیں بولا جاتا جس طرح کہ رُغِبَتْ نہیں بولا جاتا بلکہ کہا جاتا ہے رُغِبَ فی اور سقط فی یدہ یعنی ندم کے اور سقط فی ایدیہم اور اسقط بھی مگر سقط کا استعمال زیادہ بھی ہے اور عمدہ بھی اور بعض نے اُسْقِطَ کا انکار کیا ہے اور اس طرز استعمال کو نہ قرآن سے پہلے سنا گیا، اور نہ عرب اس سے واقف تھے اور یہ ترکیب کسی شے کے اوپر سے نیچے کی طرف آنے اور اس کے زمین پر گرنے کو بتاتی ہے پھر اس کے معنی میں وسعت کی گئی چنانچہ غلط بات کو سَقَطٌ (پڑی گری چیز) کہا جانے لگا کیونکہ انہوں نے اس کو بے ضرورت چیز کے مشابہ قرار دیا۔

اور ہاتھ کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ ندامت دل میں پیدا ہوتی ہے اور اس کا اثر ہاتھوں میں ظاہر ہوتا ہے جیسے ارشاد الٰہی ہے فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا (پھر صبح کو وہ گیا ہاتھ نچاتا اس مال پر جو اس میں لگایا تھا) اور فرمایا وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ (اور جس دن کاٹ کاٹ کھائے گا گنہگار اپنے ہاتھوں

کو) چنانچہ لبسا اوقات ہاتھ کی طرف اس فعل کی نسبت کر دی جاتی ہے جو اس سے سرزد نہیں ہوتا جیسے ارشادِ الٰہی ہے ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدَاكَ (یہ اس کی وجہ سے ہے جو آگے بھیج چکے تیرے دو ہاتھ) پ ۹/۸

**سَقَطُوا**: وہ گر پڑے، سُقُوطٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ ۱/۱۳

**سَقْفٌ**: چھت، سُقُوفٌ جمع اَلسَّقْفُ الْمَرْفُوْعُ (اونچی چھت) سے مراد آسمان ہے جو زمین کے لئے چھت کی بجائے ہے اور یا عرش عظیم جو تمام آسمانوں کے اوپر ہے، پ ۲۷/۳ سَقْفًا پ ۱۷/۲

**سُقُفًا**: چھتیں، اخفش نے اس کو سَقْفٌ کی جمع بتایا ہے جیسے کہ رَهْنٌ اور رُهُنٌ ہیں اور فراء نے سَقِيْفٌ (اس کے معنی بھی چھت ہی کے ہیں) کی جمع بیان کیا ہے جس طرح سے کہ كَثِيْبٌ اور كُثُبٌ بولتے ہیں۔ فراء نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر چاہو تو جمع الجمع بھی قرار دے سکتے ہو کہ سَقْفٌ کی جمع سُقُوْفٌ اور سُقُوْفٌ کی جمع سُقُفٌ ہے۔ [1] پ ۲۵/۹

**سُقْنٰهُ**: ہم نے اس کو ہانک دیا، ہم اس کو ہانک لے گئے، (لُغَہ) سُقْنَا سَوْقٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو سَائِقٌ) پ ۲۲/۱۲

**سُقُوْا**: ان کو پلایا گیا، (ضَرَبَ) سَقْيٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر غائب (ملاحظہ ہو سَقْيٌ) پ ۲۶/۶

**سَقٰى**: اس نے پلایا، سَقْيٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ ۲۰/۶

**سُقْيٰهَا**: اس کو پانی پلانا، سُقْيَا سَقْيٌ سے اسم ہے مضاف ہے اور ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب، مضاف الیہ سُقْيَا کی جمع سُقْيَاتٌ ہے جیسے حُبْلٰی کی حُبْلَيَاتٌ ہے، پ ۳۰/۱۶

**سَقَيْتَ**: تو نے پلایا، سَقْيٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر، پ ۲۰/۶

**سَقِيْمٌ**: دکھی، بیمار، سُقْمٌ سے جس کے معنی بیمار ہونے کے ہیں، بروزن فَعِيْلٌ صفتِ مشبہ کا صیغہ ہے، امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:۔

"سَقَمٌ اور سُقْمٌ اس مرض کو کہتے ہیں جو بدن کے ساتھ مخصوص ہو اور "مرض" کبھی بدن میں ہوتا ہے اور کبھی نفس میں جیسے فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (ان کے دلوں میں بیماری ہے) اور ارشادِ الٰہی اِنِّيْ سَقِيْمٌ (میں دکھی ہوں)

---

[1] تاج العروس

Marfat.com

یہ تعریض ہے یا زمانۂ ماضی اور مستقبل کی طرف اشارہ ہے یا اس تھوڑے سے دکھ کی طرف جو فی الحال موجود رہتا ہے کیونکہ انسان کو کوئی نہ کوئی خلل لگا ہی رہتا ہے اگرچہ وہ اسے محسوس نہ کرے۔ ۲۳/۹،۷

**سَقٰهُمْ**: اس نے ان کو پلایا، اس میں ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے، (ملاحظہ ہو سَقٰی) ۲۹/۱۹

## فصل الکاف

**سُکَارٰی**: نشہ میں مست، سکراں سے جس کے معنی مست ہونے کے ہیں یا جمع مکسر ہے یا اسم جمع، امام تاج الدین ابو محمد بن مکتوم قیسی حنفی نحوی الدر اللقیط میں لکھتے ہیں:-

"سُکَارٰی مضموم کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، کہ آیا وہ جمع تکسیر ہے؟ سیبویہ نے تکسیر صفات کے بیان میں کہا ہے" اور کبھی بعض صفات کی فعالی پر بھی تکسیر کرتے ہیں چنانچہ بعض سُکَارٰی اور عُجَالٰی بولتے ہیں فعالٰی کے جمع ہونے پر یہ سیبویہ کی صاف تصریح ہے اور استاذ ابو الحسن بن الباذش کو وہم ہو گیا جو انہوں نے سیبویہ کی طرف یہ نسبت کر دی کہ یہ اسم جمع ہے نیز یہ کہ ابنیہ کے سلسلہ میں سیبویہ نے اس کو بیان بھی کیا ہے ابن الباذش کا بیان ہے کہ قیاس بھی یہی ہے کیونکہ یہ ایسے وزن پر آیا ہے جس پر کبھی کوئی جمع آئی ہی نہیں حالانکہ ابنیہ کے سلسلہ میں سیبویہ کی اس کے سوا کوئی تصریح ہی نہیں کہ وہ جمع تکسیر ہے چنانچہ انہوں نے یہ کہا ہے کہ فعالٰی کا وزن اسم میں ہوتا ہے جیسے حبارٰی سمانٰی، لُبادٰی اور صفت نہیں ہوتا ہاں صرف اس صورت میں کہ اس کے وزن پر واحد کی تکسیر کر لی جائے جیسے عجالٰی، سکارٰی اور کسالٰی ہیں اور سیرافی نے اس کے بارے میں دونوں قول بیان کئے ہیں اور اسی کو ترجیح دی ہے کہ یہ جمع تکسیر ہے نیز یہ کہ سیبویہ کا کلام اسی پر دلالت کرتا ہے"۔[1]

اور امام ابن جنی المحتسب میں فرماتے ہیں:-

"سُکَارٰی بالضم اس کا ظاہر یہ ہے کہ یہ اسم مفرد غیر مکسر ہے جیسے کہ حبارٰی، سمانٰی اور سلامٰی ہیں، نیز یہ بھی جائز ہے کہ مکسر ہو اور ان الفاظ میں سے ہو کہ جو فعالٰی کے وزن پر

[1] الدر اللقیط من البحر المحیط، ص ۲۵۵ (طبع مصر ۱۳۲۸ھ) برحاشیہ البحر المحیط

پڑتے میں جیسے طُلُوَاءُ، عُرَاقِیُّ اور دُخَالٌ میں مگر اتنی بات ہے کہ الف سکے فرلیا اسے مونث کر لیا گیا ہے جیسے کہ نُقَاوَةٌ کے استعمال میں ھا کے ذریعہ تانیث کر لی گئی ہے ابو علی نے اس کو نَقْوَةٌ کی جمع کہا ہے نیز جس طرح کہ جمارۃ، ذکارۃ اور عبارۃ میں فعال کی تانیث کر لی گئی ہے اسی طرح اس کی بھی تانیث عمل میں آئی ہے۔[1]

امام ابو بکر جصاص آیتِ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی کی تفسیر میں رقمطراز ہیں کہ:۔

اس بارے میں اختلاف کیا گیا ہے کہ سکر سے اس آیت میں کیا مراد ہے؟ حضرتِ ابن عباس رضی اللہ عنہا، مجاہد، ابراہیم، قتادہ نے شراب کا نشہ بیان کیا ہے، مجاہد، ابراہیم، قتادہ نے یہ بھی کہا ہے کہ شراب کی حرمت نے اس حکم کو منسوخ کر دیا ہے اور ضحاک نے کہا ہے کہ اس سے خاص طور پر نیند کا نشہ مراد ہے۔

امام ابو بکر فرماتے ہیں کہ سکر میں صحیح تاویل یہ ہے کہ شراب کا نشہ ہے اس کی دو وجہیں ہیں ایک یہ کہ سونے والے کو اور جس کی آنکھوں میں نیند بھری ہو اسے سکران نہیں کہا جاتا اور جو شراب میں مست ہو اس کو حقیقت میں سکران کہا جاتا ہے اس لئے لفظ کو حقیقت پر محمول کرنا ضروری ہے اور بغیر کسی دلالت کے مجاز کی طرف پھیرنا روا نہیں دوسری وہ روایت جو سفیان نے عطاء بن السائب سے بواسطہ ابو عبد الرحمٰن حضرتِ علی رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ ایک انصاری نے کچھ لوگوں کی دعوت کی اور پھر انہوں نے مے نوشی کی، پھر حضرتِ عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نمازِ مغرب کے لئے کھڑے ہوئے اور قُلْ یٰاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ کی تلاوت کی تو متشابہ لگنے لگا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی (نزدیک جاؤ نماز کے جس وقت کہ تم نشہ میں ہو)۔[2] ش ک ت

**سَکَتَ**: وہ تھم گیا، اس نے خاموشی اختیار کی۔ (نصر) سُکُوْتٌ سے جس کے معنی خاموش ہونے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب۔

راغب لکھتے ہیں:۔

"سکوت ترک کلام کے ساتھ مخصوص ہے اور چونکہ سکوت بھی سکون ہی کی ایک قسم ہے اس لئے

[1] ج العروس
[2] احکام القرآن، ج ۲، ص ۲۲۳ و ۲۲۵

ارشادِ الٰہی وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوسَى الْغَضَبُ (اور جب ختم گیا موسیٰ کا غصہ) میں سکوت بطورِ استعارہ سکون ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

**س ک ر**

**سَكَرًا**: جس چیز کا نشہ ہو، نبیذ، امام ابوبکر جصاص فرماتے ہیں :-

"سلف نے سکر کی تاویل میں اختلاف کیا، چنانچہ حسن اور سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ کھجور اور انگور کی جو چیز حرام ہو چکی ہے، سکر ہے اور جو اس میں حلال ہے، رزقِ حسن ہے، اور ابراہیم شعبی اور ابو رزین سے روایت ہے کہ سکر خمر ہے اور جریر نے حضرت عبداللہ (بن مسعود) رضی اللہ عنہ سے بھی یہ روایت مغیرہ عن ابراہیم یہی روایت کیا ہے اور ابن شبرمہ، ابو زرعہ بن عمرو بن جریر سے راوی ہیں کہ سکر شراب خرما ہے اور ان سب نے کہا ہے کہ اس کی اباحت تحریمِ خمر سے منسوخ ہو چکی ہے۔

اس کے بعد امام جصاص رازی اپنی سند سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سکر کے معنی نبیذ کے اور رزقِ حسن کے معنی کشمش کے نقل کر کے یہ فرماتے ہیں :-

"جب کہ سلف نے اس کے معنی خمر اور نبیذ نیز خرما یا انگور کی اس چیز کے لئے ہیں کہ جس کا استعمال حرام ہے تو یہ ثابت ہوا کہ یہ اسم سب کے لئے استعمال ہوتا ہے اور ان کا یہ کہنا کہ تحریمِ خمر سے یہ حکم منسوخ ہے، اس بات کو بتاتا ہے آیت اباحتِ سکر کی مقتضی ہے اور سکر خمر اور نبیذ ہے اور جس کا نسخ ثابت ہے وہ خمر ہے اور نبیذ کی حرمت ثابت نہیں لہٰذا ظاہر آیت سے نبیذ کی تحلیل ثابت ہے کیونکہ اس کا نسخ ثابت نہیں۔" [1]

ابن مردویہ نے بطریق عوفی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حبشی زبان میں سکر کے معنی سرکہ کے ہیں۔[2] $\frac{۱۴}{۱۵}$

**سُكِّرَتْ**: اس کی نظر بندی کر دی گئی۔ سَكَّرَ سے جس کے معنی نظر بندی کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، $\frac{۱۴}{۱}$

**سَكْرَتِهِمْ**: ان کی مستی، ان کا نشہ، ان کی مدہوشی

[1] احکام القرآن، ج ۲، ص ۲۴۴ و ۲۴۵

[2] الاتقان، امام سیوطی، ج ۱، ص ۱۳۸ (طبع مصر)

[3] ملاحظہ ہو احکام القرآن، ج ۳، ص ۲۲۷ و ۲۲۸

Marfat.com

سکرتہم۔ معاف ہم ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ ۔

۱۵/۳ سَکْرَۃٌ : بے ہوشی، مدہوشی، مستی، راغب لکھتے ہیں کہ :-

" سکر وہ حالت ہے جو انسان اور اس کی عقل کے درمیان پیش آتی ہے اور اکثر اس کا استعمال شراب کے بارے میں ہوتا ہے اور کبھی غضب و عشق کی بنا پر بھی یہ حالت طاری ہو جاتی ہے شاعر کہتا ہے ع

سکران سکر ھوی وسکر مدام

نشۂ محبت اور شراب کی مستی سے مدہوش ہے

سکرات الموت اسی سے ماخوذ ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ (اور آگئی بیہوشی موت کی)"

علامہ مجدالدین فیروز آبادی بصائر ذوی التمیز فی لطائف کتاب اللہ العزیز میں فرماتے ہیں :-

" نزع کی سختی کے باعث عقل کے گڑبڑ ہو جانے کا نام "سکرۃ الموت" ہے[1]

۲۶/۱۶ سَکَنَ : وہ ٹھہرا، وہ بسا، وہ رہا، اس نے آرام پکڑا، سکون سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب۔

علامہ محمد مرتضیٰ زبیدی النحوی تاج العروس میں ابن الکمال سے ناقل ہیں :-

" سکون جس میں حرکت کی صلاحیت ہو اس کے حرکت نہ کرنے کا نام ہے، پس جس میں متحرک ہونے کی صلاحیت نہ ہو اس سے حرکت کا نہ ہونا سکون نہیں ہوگا اور جو ایسا ہوگا وہ نہ متحرک ہوگا نہ ساکن "

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ :-

" ارشاد الٰہی وَلَهُ مَا سَكَنَ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ میں ابن الاعرابی نے سکن کے معنی حَلّ (وہ فروکش ہوا) کے لئے ہیں اور ثعلب نے کہا ہے کہ ساکن کا استعمال انسان اور بہائم ہی کے لئے خاص ہے، سکن کا ترجمہ ہے حرکت کے بعد ٹھہر گیا اور یہاں اس کے معنی (اور اللہ تعالیٰ دانا تر ہے) پیدا کرنے کے ہیں "

غرض ابن الاعرابی کے قول پر آیت کا ترجمہ ہوگا اور اسی کا ہے جو بستا ہے رات میں اور دن میں اور ثعلب کے قول پر یہ معنی ہوں گے " اور اسی کا ہے جو پیدا کیا رات میں اور دن میں " (ملاحظہ ہو اُسْکُنْ) ۹/۸

سَکَنٌ : تسکین، آرام، رحمت، برکت، جس سے

[1] تاج العروس، ج ۳، ص ۲۷۵، مادہ سکر

سکون حاصل ہو، بسنے کی جگہ سَکَنٌ علم ہے پ ۱۱/۲ ۔ سَکَنًا پ ۷ پ ۱۴/۱۴

**سَکَنْتُمْ**: تم بسے، تم آباد ہوئے، تم رہے، سُکُوْنٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، پ ۱۳/۱۹ پ ۲۵/۱۷

**سِکِّیْنًا**: چھری، چاقو، سَکَاکِیْن جمع، لفظ سکین مذکر بھی استعمال ہوتا ہے اور مؤنث بھی اور غالب اس پر تذکیر ہی ہے، راغب لکھتے ہیں کہ اس کا نام سکین اس لئے ہوا کہ مذبوح کی حرکت کو زائل کر دیتی ہے، یہ سُکُوْنٌ سے بروزن فِعِّیْلٌ اسم مشتق ہے، پ ۱۲/۱۲

**سَکِیْنَتَہٗ**: اس کی طرف کی تسکین، اس کی طرف کا اطمینان سَکِیْنَۃٌ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۱۰/۱۲، پ ۲۶/۱۱

**سَکِیْنَۃٌ**: تسکین، تسلی خاطر، اطمینان، سُکُوْنٌ سے بروزن فَعِیْلَۃٌ مصدر ہے جو اسم کی جگہ استعمال ہوا ہے جیسے کہ عَزِیْمَۃٌ ہے [1]

علامہ لغوی سید محمد مرتضیٰ زبیدی لکھتے ہیں:۔

"سَکِیْنَۃٌ وہ اطمینان، چین، قرار اور سکون ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندہ کے قلب میں اس وقت نازل فرماتا ہے جب کہ وہ ہولناکیوں کی شدت سے مضطرب ہو جاتا ہے پھر اس کے بعد جو کچھ بھی اس پر گزرے وہ اس سے گھبراتا نہیں، یہ اس کے لئے ایمان کی زیادتی، یقین میں قوت اور استقلال کو ضروری کر دیتا ہے، اسی وجہ سے حق سبحانہ نے "یوم الغار" اور "یوم حنین" جیسے قلق و اضطراب کے مواقع پر اپنے رسول اور مؤمنین پر اس کے نازل کرنے کی خبر دی ہے۔" [2]

واضح رہے کہ قرآنِ مجید میں سکینۃ کا لفظ چھ جگہ استعمال ہوا ہے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ بجز سورۂ بقرہ کے قرآنِ مجید میں جہاں کہیں بھی "سکینہ" آیا ہے، اس کے معنی اطمینان کے ہیں۔ [3] سورہ بقرہ کی جس آیت کا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے استثنا فرمایا ہے وہ آیۂ کریمہ اِنَّ اٰیَۃَ مُلْکِہٖٓ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ التَّابُوْتُ فِیْہِ سَکِیْنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ (طالوت کی سلطنت کی نشانی یہ ہے کہ آئے تمہارے پاس ایک صندوق کہ جس میں تسلی خاطر ہے تمہارے رب کی طرف سے) یہاں "سکینہ" سے کیا مراد ہے، ابنِ ابی حاتم اور ابو الشیخ نے تو یہاں بھی حضرت عبد اللہ بن عباس

---

[1] مفردات القرآن در غریب القرآن معروف بہ تفسیر نیشاپوری، ج ۲۲، ص ۲۷۷ (طبع مصر بر حاشیہ تفسیر ابن جریر) [2] تاج العروس

رضی اللہ عنہما سے اطمینان ہی کے معنی روایت کئے ہیں[1]۔ اور یہی صحیح ہیں، اس کے علاوہ اس بارے میں تفسیر کی کتابوں میں جو بہت سی بے سر وپا روایتیں منقول ہیں نہ عقلاً صحیح ہیں نہ نقلاً اور پھر سخت متعارض کہ ان کا باہم جمع کرنا غیر ممکن ہے[2]۔ ۲۶ / ۲ ، ۹ / ۱۱

## فصل اللام

**سَلْ**: تو پوچھ، تو دریافت کر، سُؤَالٌ سے امر صیغہ واحد مذکر حاضر (ملاحظہ ہو اسْئَلْ اور سُؤَالٌ)
۲ / ب

**سَلٰسِلَ**: زنجیریں، سِلْسِلَةٌ کی جمع، ۲۳ / ۱۲

**سَلٰسِلَا** ۲۹ / ۱۹

**سُلٰلَةٍ**: چنی ہوئی، نچوڑی ہوئی، نچوڑ، خلاصہ سَلٌّ سے جس کے معنی کسی چیز کو کسی چیز سے کھینچنے، سونتنے اور نچوڑنے کے ہیں، اسم مشتق ہے، ۱۸ / ب، ۲۱ / ۱۴

**سَلْمٌ**: سلامتی، امان، سلام، سالم، یہ سَلِمَ یَسْلَمُ کا مصدر ہے، اس کے معنی عیوب و آفات سے سلامت رہنے، ان سے چھٹکارا پانے اور بری ہونے کے ہیں، امام راغب مفردات القرآن میں رقمطراز ہیں :-

● سَلْمٌ اور سَلَامَةٌ کے معنی ہیں ظاہری اور باطنی آفتوں سے الگ رہنے کے، ارشاد ہے بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ یعنی ایسا دل جو دغا سے خالی ہو، یہ باطن کے بارے میں ہے اور مُسَلَّمَةٌ لَّاشِيَةَ فِيْهَا (بے عیب ہے کوئی داغ اس میں نہیں) یہ ظاہر کے بارے میں ہے سَلِمَ يَسْلَمُ سَلَامًا وَسَلَامَةً وسلمہ اللہ فرمایا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ (اور لیکن اللہ نے بچا لیا) ہو ارشاد ہے اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ (جاؤ ان میں سلامتی سے بے کھٹکے) یہاں سلامتی مراد ہے، اسی طرح اِهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا (اتر سلامتی کے ساتھ ہماری طرف سے) ہے اور حقیقی سلامتی جنت کے سوا اور کہیں نہیں کیونکہ وہاں بقا ہے فنا نہیں، غنا ہے احتیاج نہیں، عزت ہے ذلت نہیں، صحت ہے بیماری نہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ (ان ہی کے لئے ہے سلامتی کا گھر اپنے رب کے ہاں) یہاں

---

[1] الدر المنثور، امام سیوطی، ج ۱، ص ۳۱۷ (طبع مصر) مصر) اور تفسیر فتح القدیر، ج ۱، ص ۲۳۹

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر المنار، ج ۲، ص ۳۴۳ (الطبع

• سلام یعنی سلامتی ہے اور وَاللّٰهُ يَدْعُوْا اِلٰی دَارِ السَّلَامِ اور اللہ بلاتا ہے سلامتی کے گھر کی طرف) اور يَهْدِي بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلَامِ (جس سے اللہ ہدایت کرتا ہے اس کو جو تابع ہوا اس کی رضا کا سلامتی کی راہیں) ان سب جگہ سلامتی کے معنی ہو سکتے ہیں اور بعض کا قول ہے کہ السلام اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے اور اسی طرح لھم دار السلام کے بارے میں کہا گیا ہے[1] اور اَلسَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ (سب عیبوں سے سالم، امان دینے والا، پناہ میں لینے والا) کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سلام ہے اس لئے موصوف کیا گیا کہ جس طرح خلق کو عیوب و آفات ہوتی ہیں اس کو لاحق نہیں ہوتیں اور فرمایا سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ (سلام، بولنا ہے رب مہربان سے) سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (سلامتی تم پر بدلے اس کے کہ تم نے صبر کیا سو خوب ملا عاقبت کا گھر) سَلَامٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ (سلام ہے الیاس پر) یہ سب (یعنی سلام علیکم) لوگوں کی جانب سے تو بذریعہ قول ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے فعل یعنی جنت میں جس سلامتی کے ہونے کا سابق میں مذکور ہوا ہے اس کو عطا فرمانا۔

اور آیہ شریفہ وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (اور جب بات کرنے لگیں ان سے بے سمجھ لوگ تو کہیں صاحب سلامت) کا مطلب یہ ہے کہ ہم تم سے سلامتی چاہتے ہیں اس صورت میں سَلٰمًا کو نصب اضمار فعل کی بنا پر ہوگا (اور نطلب کو مضمر مانا جائے گا) اور بعض نے کہا ہے کہ قَالُوْا سَلٰمًا کے معنی میں اچھی بات کہنے کے، اس صورت میں یہ مصدر محذوف (یعنی قَوْلًا) کی صفت ہوگا اور آیہ شریفہ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ (جب اندر پہنچے اس کے پاس تو بولے سلام وہ بولا سلام ہے) میں ثانی پر رفع (پیش) اس لئے ہے کہ دعا کے باب میں رفع زیادہ بلیغ ہے، گویا اس ادب کا لحاظ رکھا جس کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ (اور جب تم کو دعا دے کوئی تو تم بھی دعا دو

[1] سلامتی مصنف میں دار السلام کے معنی اللہ کے گھر اور تہ سبل السلام کے معنی اللہ کی راہوں کے ہوں گے۔

اس سے بہتر)۔

اور آیۂ شریفہ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (نہیں سنیں گے وہاں بکواس اور نہ گناہ کی بات مگر ایک بولنا سلام سلام) تو یہ جنت والوں کے واسطے صرف قول ہی قول سے نہیں ہوگی بلکہ قول اور فعل دونوں کے ذریعہ ہوگی اور اسی طرح آیۂ کریمہ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ (تو سلامتی پہنچے تجھ کو دہنے والوں سے) ہے۔

اور آیۂ شریفہ وَقُلْ سَلٰمٌ (اور کہہ سلام) اس کا ظاہر مطلب تو یہ ہے "تو ان پر سلام کر" اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا ان کفار سے مطالبہ ہے اور یہ جو فرمایا ہے سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ (سلام ہے نوح پر سارے جہان والوں میں) سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ (سلام ہے موسیٰ اور ہارون پر) سَلٰمٌ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ (سلام ہے ابراہیم پر) یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس امر کا بیان ہے کہ ان کو اس حیثیت کا بنایا ہے کہ ان کی ثنا کی جاتی رہے گی اور ان کے لئے دعا ہوتی رہے گی"۔

امام سہیلی الروض الانف میں فرماتے ہیں:۔

"اکثر اہل لغت اس طرف گئے ہیں کہ رضاع اور رضاعۃ کی طرح سلام اور سلامۃ کے بھی ایک ہی معنی ہیں اور اگر وہ کلام عرب میں تامل کرتے اور ہائے تانیث اس میں جس قسم کی تحدید پیدا کرتی ہے اور اس پر غور کرتے تو ان کا نظر آتا کہ ان دونوں کے درمیان بڑا فرق ہے۔

اور اللہ جل جلالہ کو سلام کہا جاتا ہے کہ تمام خلق کے لئے اختلال اور تفاوت سے سالم رہنے کو اس نے وسیع اور عام کر دیا ہے کیونکہ ہر چیز نظام حکمت پر چل رہی ہے اسی طرح جن و انس حق سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے کسی ظلم یا جور کے ہونے سے سلامت ہیں پس اللہ تعالیٰ اپنے تمام افعال میں سلام ہے کہ نہ زیادتی ہے نہ ظلم، نہ فرق ہے نہ خلل۔

اور مفسرین میں سے جس نے اس اسم کے متعلق یہ دعویٰ کیا کہ حق سبحانہ کو اس سے اس لئے موسوم کیا جاتا ہے کہ عیوب و آفات سے سالم ہے تو اس نے نامناسب بات کی، سلام وہ ہے جس سے دوسرا سلامت رہے اور سالم وہ ہے جو دوسرے سے سلامت رہے، دیوار

کو یہی نہیں کہا جاتا کہ وہ نکمان سے سالم ہے اور دھچر کو کہا جاتا ہے کہ وہ زکام سے سالم ہے سالم اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جس پر آفت کا آنا ممکن اور متوقع ہو اور پھر وہ اس سے سلامت رہے اور حق سبحانہٗ آفتوں کے واقع ہونے اور نقائص کے آنے سے منزہ ہیں اور جس کی یہ صفت ہو اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جائیگا کہ وہ ان سے سلامت رہا اور نہ اسے سالم سے موسوم کیا جائیگا۔ ان لوگوں نے سلام کو سالم کے معنی میں کر دیا جو چیز ہم نے پہلے ذکر کی اکثر سلف کے قول سے وہی مراد ہے اور سلامۃ سلام کے خصائل میں سے صرف ایک خصلت ہے [۱]۔"

امام ابن جریر طبری نے قتادہ سے سلام کے معنی یہی نقل کئے ہیں السلام ھو الذی یسلم خلقہ من ظلمہ [۲] سلام وہ ذات ہے کہ جس کے ظلم سے اس کی مخلوق سالم رہے۔

۱۳/۱۶،۹ ۱۲/۴،۳ ۱۱/۸،۶ ۳/۱۲،۲ ۶/۷ ۵/۱۰

۱۴/۱۰،۲ ۱۶/۱۱،۴،۵،۶ ۱۹/۲۰ ۲۰/۹ ۲۲/۳ ۲۳/۹،۸،۷،۳ ۲۴/۵

۲۵/۱۲ ۲۶/۱۹،۷ ۲۷/۱۶ ۲۸/۶ ۳۰/۲۲

سَلٰمًا ۱۲/۷ ۱۴/۲ ۱۶/۷ ۱۶/۵ ۱۹/۳ ۲۶/۱۹ ۲۷/۱۴

سَلْسَبِیْلًا سلسبیل جنت کے ایک چشمہ کا نام ہے [۳] جس کے معنی ہیں "بہتا ہوا صاف پانی" جوالیقی کا بیان ہے کہ عجمی لفظ ہے [۴]۔ ابن الاعرابی کہتے ہیں کہ میں نے سلسبیل کو قرآن کے سوا اور کہیں نہیں سنا اس صورت پر اس کے اشتقاق کا پتہ نہیں لگایا جا سکا [۵] اور زمخشری کشاف میں لکھتے ہیں :-

"شراب، سلسل، سلسال و سلسبیل بولا جاتا ہے اس میں ترکیب کے اندر بار زائد کر دی گئی ہے جس سے کلمہ خماسی ہو گیا ہے اور انتہائی خوش گواری پر دلالت کرتا ہے، زجاج کا بیان ہے کہ سلسبیل لغت میں اس چیز کی صفت ہے جس میں انتہائی خوشگواری ہو" [۶]

علامہ ابوحیان، زمخشری کے بیان کو نقل کر کے لکھتے ہیں :-

"اگر زمخشری کی مراد یہ ہے کہ بار حقیقت میں زائد کر دی گئی تو درست نہیں کیونکہ علم نحو کے اندر ب ان حروف میں سے نہیں ہے کہ جو زیادت کے لئے مقرر ہیں اور اگر یہ مطلب ہے

[۱] تاج العروس [۲] جامع البیان فی تفسیر القرآن معروف بہ تفسیر ابن جریر، ج ۲۸، ص ۳۴ (طبع میمنیہ مصر) [۳] الاتقان، ج ۱، ص ۱۳۵ (طبع مصر) [۴] ابن ابی حاتم نے عکرمہ سے یہی روایت کیا ہے (ملاحظہ ہو فتح الباری، ج ۸، ص ۲۲۵) [۵] تفسیر کبیر، ج ۸، ص ۳۰۱ (طبع عامرہ مصر) [۶] کشاف، ج ۳، ص ۱۷۰ (طبع مصر)

Marfat.com

کو حرفِ بار اشتار کلام میں لگ گیا ہے اور سلسل کو
سلسال میں نہیں ہے تو صحیح ہے اور یہ ان الفاظ
میں سے ہوگا کہ جو معنی میں متفق ہیں اور مادہ میں
مختلف ہیں[1] ۲۹/۱۹

سِلْسِلَةٍ : زنجیر، سلاسل جمع، "سلسلہ" کے معنی
اصل میں ایک شے کے دوسری شے سے اتصال کے ہیں
زنجیر میں بھی چونکہ کڑیاں ایک دوسرے سے
ملی جلی ہوتی ہیں اس لئے اس کو سلسلہ کہتے
ہیں۔ ۲۹/۵

سُلْطٰنٍ : زور، قوت، حجت، برہان، سند،
حکومت، تاج العروس میں ہے:-

"سلطان" کے معنی حجت و برہان کے ہیں اسی معنی
میں ارشادِ الٰہی ہے لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ
(نہیں نکل سکتے کے بدوں سند کے) اور کبھی
اس سے معجزہ بھی مراد لیا جاتا ہے چنانچہ فرمایا
ہے اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ
مُّبِيْنٍ (جب بھیجا ہم نے اس کو فرعون کے پاس
دیکر کھلی سند (یعنی معجزہ) اور جب "سلطان" کے
معنی حجت ہوں تو اس کی جمع نہیں آتی کیونکہ
اس صورت میں وہ مصدر کا قائم مقام ہوتا ہے

محمد بن یزید نے کہا ہے کہ سلیط سے جس کے
معنی زیتون کے تیل کے ہیں، اس کے روشن
کرنے کی بنا پر ماخوذ ہے کیونکہ دلیل ایسی ہونی
چاہیے جو روشن ہو حضرت ابن عباس رضی اللہ
عنہما نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں ہر جگہ سلطان
بمعنی حجت (دلیل) ہے اور بصائر میں ہے کہ
حجت کو سلطان اس لئے کہا گیا ہے کہ دلوں پر
اس کا دباؤ ہوتا ہے لیکن اکثر اس کا تسلط اہلِ علم و
حکمت ہی پر ہوتا ہے اور لیث نے کہا ہے کہ
سلطان کے معنی بادشاہ کی طاقت نیز اس
شخص کی طاقت کے ہیں جو گو بادشاہ نہ ہو مگر
اس کو شاہی طاقت حاصل ہو جیسے کہتے ہیں قد
جعلت لك سلطانا على اخذ حقي من
فلان (فلاں سے میرا حق لینے کے لئے میں نے
تیرے لئے سند کر دی ہے) اور اس کے لام کو نحو
بھی دیا جاتا ہے، یہ لفظ مذکر و مؤنث دونوں طرح
استعمال ہوتا ہے ابن السکیت کا بیان ہے کہ
سلطان مؤنث ہے بولا جاتا ہے قضیت بہ
علیہ السلطان اور قد آمنت السلطان
الزہری نے کہا ہے کہ چونکہ سلطان کا لفظ

[1] البحر المحیط، ج ۸، ص ۳۹۰

Marfat.com

مذکر ہے اس لئے کبھی مذکر بھی استعمال ہوا ہے
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ
۱۱/۱۶، ۱۱/۱۲، ۱۲/۹،۱۵، ۱۳/۱۴،۱۶، ۱۴/۳،۹، ۱۵/۱۴،۱۰، ۱۸/۳، ۱۹/۱۷
۲۲/۸، ۲۳/۶،۹، ۲۴/۱۰،۹،۱۱، ۲۵/۱۴، ۲۷/۱،۴،۵،۱۲

**سُلْطٰنًا** پ ۲/۷، ۵/۹،۱۸، ۶/۲، ۷/۱۵، ۸/۱۱
۱۵/۹،۶، ۱۷/۱۶، ۲۰/۷، ۲۱/۷۔

**سُلْطٰنُهٗ**: اس کا زور، سُلْطَانٌ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ۱۴/۱۹

**سُلْطٰنِيَهْ**: میری حکومت۔ سُلْطَانِ مضاف یؔ ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، ہٗ سکتہ کی ہے، ۲۹/۸

**سَلَّطَهُمْ**: اس نے ان کو زور دیا، اس نے ان کو مسلط کیا، سَلَّطَ تَسْلِيْطٌ سے جس کے معنی مسلط کر لینے اور غلبہ دینے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، ۵/۹

**سَلَفَ**: وہ ہو چکا، وہ گزر گیا (نَصَرَ) سَلَفٌ سے جس کے معنی گزرنے اور ہو چکنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ۴/۶، ۴/۱۴،۱۵، ۷/۳، ۹/۱۹

**سَلَفًا**: گیا گزرا، اصل میں مصدر ہے اور بطور اسم کے متقدم یعنی گزرے ہوئے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، ۲۵/۱۱

**سَلَقُوْكُمْ**: وہ تم سے چڑھ چڑھ بولے، وہ تم سے بڑھ بڑھ کے بولے (ضَرَبَ) سَلَقُوْا سَلْقٌ سے جس کے معنی زبان سے ستانے کے ہیں، ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، ۲۱/۱۸

**سَلَكَ**: اس نے چلایا (نَصَرَ) سَلْكٌ سے جس کے معنی چلانے اور داخل کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ۱۶/۱۱

**سَلَكَكُمْ**: اس نے تم کو چلایا، اس نے تم کو داخل کیا، اس میں کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر ہے، ۱۹/۱۶

**سَلَكْنٰهُ**: ہم نے اس کو گھسا دیا، ہم نے اس کو داخل کر دیا، ہم نے اس کو چلایا، سَلَكْنَا سَلْكٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، ۱۹/۱۵

**سَلَكَهٗ**: اس نے اس کو چلایا، اس نے اس کو داخل کیا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے۔ ۲۳/۱۶

**سَلَمٌ**: صلح، اسم ہے، مذکر بھی استعمال ہوتا ہے اور مؤنث بھی، ۵/۴، ۲۶/۸

**سِلْمٌ**: اسلام، اسم ہے، مذکر و مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، ۲/۹

**سَلَمٌ**: صلح، انقیاد، فرمانبرداری و اطاعت، عاجزی، تسلیم سے بمعنی سپرد کرنے کے، اسم ہے،

Marfat.com

(ملاحظہ ہو تَسْلِیْمًا) پ ۱۴/۱۰، ۱۸

**سَلَمًا**: پورا، سالم، سَلِمَ یَسْلَمُ کا مصدر ہے جس کے معنی خالص اور پورے طور پر کسی دوسرے کے ہو جانے کے آتے ہیں، پ ۲۳/۱۷

**سَلَّمَ**: اس نے بچا لیا، تَسْلِیْمٌ سے معنی بچانے کے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تَسْلِیْمًا پ ۱

**سُلَّمٌ**: سیڑھی، زینہ، سیڑھی کے ذریعہ چونکہ آدمی سلامتی کے ساتھ اوپر پہنچ جاتا ہے اس لئے اس کا نام سُلَّمٌ ہوا، سَلَالِمُ اور سَلَالِیْمُ جمع، پ ۲۷/۴

**سُلَّمًا** پ ۱

**سَلَّمْتُمْ**: تم نے حوالہ کر دیا، تم نے سپرد کر دیا، تم نے سونپ دیا، تَسْلِیْمٌ سے معنی سپرد کرنے کے، ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر (ملاحظہ ہو تَسْلِیْمًا) پ ۲/۱۴

**سَلِّمُوْا**: تم سلام کرو، تم سلام بھیجو، تَسْلِیْمٌ سے معنی سلام کرنے کے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، پ ۲۲/۴

**سَلْوٰی**: سلویٰ ایک پرندہ ہے جس کو بٹیر کہتے ہیں قاموس میں اس کا واحد سَلْوَاةٌ مرقوم ہے اور صحاح میں اخفش سے منقول ہے کہ میں نے اس کا واحد نہیں سنا، ان کا بیان ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا واحد جمع دونوں کی طرح ہے، پ ۱/۶، پ ۹/۱۰، پ ۱۶/۱۳

**سَلْهُمْ**: ان سے پوچھ، اس میں هُمْ ضمیر جمع ... غائب ہے (ملاحظہ ہو سَلْ) پ ۲۹/۴

**سَلِیْمٌ**: چنگا، بے روگ، ستھرا، نروگا، سَلَا... سے صفت مشبہ کا صیغہ (ملاحظہ ہو سَلَامٌ) ...

پ ۱۹/۹، ۲۳/۷

**سُلَیْمَانَ**: سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام مش... جلیل القدر نبی کا اسم گرامی جو حضرت داؤد علیہ ال... کے فرزند ارجمند تھے اور ان کی وفات کے بعد ... کے جانشین ہوئے، اللہ تعالےٰ نے اپنے فض... کرم سے آپ کی ذاتِ بابرکات میں نبوت ... سلطنت دونوں کو مکمل طور پر جمع فرمایا اور ا... بادشاہی عطا فرمائی جو اگلوں پچھلوں میں سے ک... نصیب ہوئی، جن، ہوا اور پرندوں کو آپ ... لئے مسخر فرمایا، سب جانوروں کی بولیاں جا... ننھے چیونٹی تک کی بات سمجھ لیتے، آپ کے فض... کمالات اور آپ کی پیغمبرانہ سیرت کا تذکرہ ح... قرآن مجید میں تفصیل سے مذکور ہے، حافظ ابو ح... اندلسی، البحر المحیط میں لکھتے ہیں :-

• سلیمان عجمی نام ہے علمیت اور عجمہ کی بنا پر غ... منصرف ہے عجمیت میں اس کی نظیر اس امر ... اس کے بھی آخر میں الف اور نون ...

لے تاج العروس

ھامان، ماھان اور سامان میں اُن اسم کا غیر منصرف ہونا، علمیت اور الف ونون کی زیادت کی بنا پر نہیں کیونکہ الف ونون کا زیادہ ہونا اشتقاق وتصرف پر موقوف ہے اور عجمی ناموں میں اشتقاق وتصریف کا دخل نہیں ہوتا"[1]

آپ کی والدہ ماجدہ بھی بڑی عابدہ وصالحہ تھیں سنن ابن ماجہ میں حضرتِ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرتِ سلیمان بن داؤد علیہما السلام کی ماں نے حضرتِ سلیمان علیہ السلام سے کہا تھا کہ بیٹا رات میں زیادہ نہ سونا کیونکہ رات میں زیادہ سونا مرد کو قیامت کے دن محتاج کرکے چھوڑتا ہے[2]

فصل خصومات میں اصابت رائے کا ملکہ بچپن ہی سے آپ کو عطا ہوا تھا، صحیح بخاری میں حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دو عورتیں تھیں جن کے ساتھ ان کے دو بیٹے تھے بھیڑیا آیا اور دونوں میں سے ایک کے لڑکے کو لیکر چلتا بنا جس کو یہ حادثہ پہنچا تھا وہ کہنے لگی تیرے لڑکے کو اٹھا کر لے گیا ہے دوسری بولی نہیں تیرے لڑکے کو لے گیا ہے چنانچہ حضرتِ داؤد علیہ السلام کے پاس فیصلہ کے لئے پہنچیں آپ نے بڑی کے حق میں فیصلہ صادر فرمایا پھر وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے آئیں اور ان سے اس واقعہ کا ذکر کیا، آپ نے فرمایا کہ میرے پاس چھری لاؤ میں اسے کاٹ کر دونوں کو دے دوں تب چھوٹی کہنے لگی اللہ آپ پر رحم کرے ایسا تو نہ کیجئے یہ اسی کا بیٹا ہے اس پر آپ نے چھوٹی کے حق میں فیصلہ فرما دیا[3]

نیز صحیح بخاری میں حضرتِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ ایک زبردست جن گذشتہ شب اچانک ظاہر ہوا تاکہ میری نماز میں خلل ڈالے حق تعالیٰ شانہ نے مجھے اس پر قابو عطا فرمایا، میں نے اسے پکڑ لیا اور ارادہ کیا کہ اسے مسجد کے ستونوں میں سے کسی ستون سے باندھ دوں کہ تم سب اسے دیکھ لو پھر مجھے اپنے بھائی سلیمان کی دعا یاد آئی ربّ هَبْ لِي مُلْكًا لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِنْ بَعْدِي (اور بخش مجھ کو وہ بادشاہی کہ نہ پھبے کسی کو میرے پیچھے) تو میں نے اس کو ذلیل کرکے لوٹا دیا[3]، امام احمد، نسائی، ابن ماجہ، ابن خزیمہ، ابن حبان اور حاکم نے حضرتِ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت کیا

---

[1] المعجم المفید، ج ۱، ص ۳۱۸، ۳۱۹ (طبع مصر ۱۳۵۱ھ) [2] سنن ابن ماجہ، ص ۹۵ (طبع فاروقی دہلی)

[3] ان دونوں روایتوں کے لئے ملاحظہ ہو صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، قول اللہ تعالیٰ ووھبنا لداؤد سلیمان۔

سلیمان علیہ السلام نے جب بیت المقدس کی تعمیر کی تو اللہ عز و جل سے تین چیزیں مانگیں، دو چیزیں تو اللہ نے ان کو عطا فرمائیں اور ہمیں امید ہے کہ تیسری ہمارے لیے ہو، وہ حکم مانگا جو اس کے حکم کے موافق ہوا ور اللہ نے عطا فرمایا، وہ بادشاہی مانگی جو آپ کے بعد کسی کے لئے مناسب ہو اور اللہ نے عطا فرمائی، یہ مانگا کہ جو شخص بھی گھر سے چلے اور اس کا ارادہ اس مسجد میں نماز ادا کرنے کے سوا اور کچھ نہ ہو تو وہ اپنے گناہ سے اس طرح نکل جائے جیسا کہ اس دن جب کہ اس کی ماں نے اسے جنا تھا، ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ یہ چیز اللہ نے ہمیں عطا فرمادی۔[1] انگشتری سلیمان کا جو قصہ مشہور ہے وہ اسرائیلی فسانہ ہے جس کی کوئی اصل و حقیقت نہیں ہے۔ ١/١٢

٦/٣ ٧/١٢ ١٧/٦ ١٩/١٧،١٨ ٢٢/٨ ٢٣/١٢

## فصل المیم

سَمّ: ناکہ، سوراخ، ہر تنگ سوراخ کو سَمّ کہتے ہیں جیسے کہ سوئی کا ناکہ اور ناک اور کان کا بیندھا ہوا سوراخ ہوتا ہے، سُمُوْمٌ جمع، ٨/١٢

سَمَآء: آسمان، ابر، بارش، امام راغب مفردات میں لکھتے ہیں:۔

"ہر شے کا جو بالا ہے وہ سماء ہے، بعض نے کہا ہے کہ ہر سماء اپنے نیچے کی نسبت سے سما[ء] اور اپنے اوپر کی نسبت سے ارض ہے بجز سما[ء] عُلیا کے کہ وہ سماء ہی ہے، ارض نہیں ہے اور آیت شریفہ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ (اللہ وہ ہے جس نے بنائے سات آسمان اور زمین بھی اتنی ہی) کو ا[س] پر محمول کیا ہے۔

نیز مطر (بارش، مینہ) کو سماء سے موسو[م] کیا گیا کیونکہ وہ اسی سے نکلتا ہے، بعض نے ک[ہا] ہے کہ جب تک زمین پر نہ گرے سماء ہے[...] ہے، یا اسی اعتبار سے ہے جو سابق میں مذکو[ر] ہوا اور نبات (ہر اگنے والی چیز) کا نام سما[ء] تو اس بنا پر رکھ گیا کہ وہ مطر سے جو کہ سما[ء] وجود میں آتا ہے اور یا اس لئے کہ زمین [سے] مرتفع ہوتا ہے۔

اور وہ سماء جو ارض کے مقابل ہے مو[...] ہے اور کبھی مذکر بھی آتا ہے اور واحد اور جمع د[ونوں] کے لئے استعمال ہوتا ہے کیونکہ ارشاد ہے [...]

---

[1] البدایہ والنہایہ، ج ۲ ص ۳۶ (طبع مصر ۱۳۵۱ھ)

اِسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ (پھر قصد کیا آسمان کی طرف سو ٹھیک کر دیا ان کو) اور کبھی اس کی جمع میں سمٰوٰتٌ بھی کہا جاتا ہے فرمایا خَلَقَ السَّمٰوٰتِ (پیدا کیا آسمانوں کو) قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ (پوچھ کون ہے رب ساتوں کو) اور اَلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ (آسمان پھٹ جائیگا اس دن میں) فرمایا تو مذکر استعمال کیا اور اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ (جب آسمان پھٹ جائے) اور اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ (جب آسمان چر جائے) کہا تو مؤنث استعمال کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نخل اور شجر اور ان کے قائم مقام دیگر اسماء اجناس کی طرح ہے کہ مذکر بھی استعمال کئے جاتے ہیں اور مؤنث بھی[1] اور واحد نیز جمع کے لفظ سے ان کی تعبیر کی جاتی ہے۔

جو سماء کہ بمعنی مطر (یعنی بارش) ہے وہ مذکر ہی استعمال ہوتا ہے اور اس کی جمع اَسْمِيَةٌ آتی ہے۔"

اور ابن خالویہ لغوی لکھتے ہیں:۔

"ہر وہ شے جو تم پر بلند ہو سماء ہے اور اسی لئے گھر کی چھت سماء سے موسوم ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ یعنی ان کافروں میں سے جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حسد کرنے میں جس کو بھی یہ خیال ہو کہ اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد نہ فرمائے گا، فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ (اسے چاہئے کہ ایک رسی تان لے) اِلَى السَّمَآءِ یعنی گھر کی چھت میں ثُمَّ لْيَقْطَعْ (پھر گلا گھونٹ ڈالے) فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ اب دیکھے کچھ جاتا رہا اس کی اس کی اس تدبیر سے اس کا غصہ"[2]

امام نووی تہذیب الاسماء والصفات میں رقمطراز ہیں:۔

"سماء یعنی سقف معروف (آسمان) ہے، سُمُوٌّ سے مشتق ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں اس میں دونوں لغتیں ہیں، تذکیر بھی اور تانیث بھی،

[1] واضح رہے کہ مفردات راغب کے مطبوعہ نسخہ میں کتابت کی غلطی کی وجہ سے عبارت اس طرح چھپ گئی ہے وجہ ذلک انها کالنخل فی الشجر و یجری مجراہ من اسماء الجنس الذی یذکر و یؤنث لیکن تاج العروس میں یہ عبارت اس طرح منقول ہے و وجہ ذلک انه کالنخل و الشجر و ما یجری مجرہما من اسماء الاجناس التی تذکر و تؤنث ہم نے اسی عبارت کو سامنے رکھ کر ترجمہ کیا ہے۔

[2] کتاب اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن الکریم ص ۳۰۸، ۳۰۷ (طبع دار الکتب المصریہ ۱۳۶۰ھ)

ابوالفتح ہمدانی نے کہا ہے تذکیر تین وجوہ میں سے کسی ایک وجہ کی بنا پر ہوتی ہے، اول یہ کہ چھت کے معنی ہوں، دوسرے باعتبار لفظ کے تیسرے اس بنا پر کہ وہ جمع مذکر ہے خواہ جمع واقع ہوئی ہو یا نہ ہو، اس صورت میں یہ سماءۃ کی جمع ہوگا جیسے عطا عطاءۃ کی جمع ہے، ابوالفتح نے اس کو جمع سے ہی موسوم کیا ہے جو اہلِ لغت کی اصطلاح ہے لیکن اہلِ نحو وصرف اس کو اسمِ جمع یا اسمِ جنس سے موسوم کرتے ہیں اور اس کو جمع نہیں کہتے، ابوالفتح کا بیان ہے کہ تانیث دو وجہوں سے ہوتی ہے ایک یہ کہ وہ ان اسماء کے باب سے ہے جو تانیث کے لئے موضوع ہیں جیسے اتان اور عناق ہیں، دوسرے یہ کہ وہ اہلِ حجاز کی لغت پر سمارۃ کی جمع ہے کیونکہ وہ اس قسم کو مؤنث استعمال کرتے ہیں چنانچہ ھٰذہ الصخر ھٰذہ التمر اور ھٰذہ الشعیر کو یعنی صخور اور تمور بولتے ہیں۔" [1]

۱/۲،۳،۴ ۲/۱،۴ ۳/۹ ۶/۲ ۷/۵،۷،۱۷،۱۸ ۸/۲،۱۲
۹/۲،۱۰،۱۶،۱۸ ۱۱/۸،۹،۱۲ ۱۲/۴،۵ ۱۳/۸،۱۶،۱۷،۱۸
۱۴/۲،۸،۱۴،۱۷ ۱۵/۱۰،۱۱،۱۷،۱۸ ۱۶/۱۱ ۱۷/۱،۲،۳،۷،۹،۱۱
۱۸/۱۵،۱۶ ۲۰/۱،۲،۱۴،۱۶ ۲۱/۲،۶،۸،۱۰،۱۴ ۲۳/۱۶ ۲۴/۷،۲۰،۲۱
۲۵/۷،۱۳،۱۴،۱۶ ۲۶/۱۵،۱۸ ۲۷/۲،۳،۴،۸،۱۰،۱۲،۱۴،۱۹
۲۹/۱،۲،۵،۷،۹،۱۱،۱۳،۲ ۳۰/۱،۳،۶،۷،۹،۱۰،۱۱
۳۰/۱۳،۱۶

**سٰمِعُوْنَ**: خوب کان لگا کر سننے والے جاسوس، سَمْعٌ سے مبالغہ کا صیغہ جمع مذکر سَمّاعٌ کی جمع، واضح رہے کہ خوب کان لگا کر سننا کبھی تو جاسوسی کے لئے ہوتا ہے اور کبھی قبول کرنے اور ماننے کے لئے، چنانچہ سَمّاعٌ کا استعمال جاسوس اور مطیع دونوں کے لئے ہوتا ہے، یہاں بھی دونوں معنی بن سکتے ہیں، بعض مفسرین نے پہلے معنی اختیار کئے ہیں اور بعض نے دوسرے، ۶/۱۴

**سِمَانٌ**: موٹی، سَمِیْنٌ کی جمع (ملاحظہ ہو سَمِیْنٌ) ۱۲/۶

**سَمْعٌ**: قوتِ سامعہ، کان، سننا، پہلے دونوں معنی کے اعتبار سے اسم ہے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے سَمِعَ یَسْمَعُ کا مصدر، امامِ راغب مفردات میں تحریر فرماتے ہیں:۔
"کان کی وہ قوت کہ جس سے آوازیں دریافت کی جاتی ہیں، سَمْعٌ ہے اور اس کے فعل کو بھی

[1] تہذیب الاسماء واللغات، ج ۱، ص ۱۵۶ (طبع منیریہ مصر)

Marfat.com

سَمْعٌ کہتے ہیں سَمِعَ سَمْعًا آتا ہے اور کبھی سمع سے کان مراد لیا جاتا ہے جیسے خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ (اللہ نے مہر کردی ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر) اور کبھی لفظ سِمَاع کی طرح اس کا فعل (یعنی سننا) مراد ہوتا ہے جیسے اِنَّھُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ (وہ تو سننے سے برطرف کر دیئے گئے ہیں) اور ارشاد ہے اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ (یا قوت سماعت سے کام لے دل لگا کر) اور کبھی سمجھنا اور کبھی ماننا اس سے مراد لیا جاتا ہے بولتے ہو اِسْمَعْ مَا اَقُوْلُ لَکَ (سن جو میں تجھ سے کہتا ہوں) اور لَمْ تَسْمَعْ مَا قُلْتُ (تو نے نہیں سنا جو میں نے کہا) تمہارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تو سمجھا نہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْھِمْ اٰیٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا (اور جو کوئی پڑھے ان پر ہماری آیتیں تو کہیں ہم سن چکے اگر ہم چاہیں تو ہم بھی کہہ لیں) اور فرمایا سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا (سنا ہم نے اور نہ مانا) یعنی ہم نے تیری بات کو سمجھا اور تیرے حکم کو نہ مانا اور اسی طرح ارشاد سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (ہم نے سنا اور قبول کیا) ہے، یعنی ہم نے سمجھا اور حکم مانا اور آیت شریفہ وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَھُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ (اور ان جیسے مت ہو جنہوں نے کہا ہم نے سن لیا اور وہ سنتے نہیں) میں یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ "ہم نے سمجھا حالانکہ وہ سمجھتے نہیں" اور یہ بھی کہ "ہم نے سمجھا حالانکہ وہ اس کے مطابق عمل نہیں کرتے" اور جب کسی نے اس کے مطابق عمل نہ کیا تو وہ گویا اس شخص کے حکم میں ہوا کہ جس نے سنا ہی نہیں اور اس کے بعد ارشاد فرمایا وَلَوْ عَلِمَ اللّٰہُ فِیْھِمْ خَیْرًا لَّاَسْمَعَھُمْ وَلَوْ اَسْمَعَھُمْ لَتَوَلَّوْا (اور اگر اللہ جانتا ان میں کچھ بھلائی تو ان کو سنا دیتا اور اگر ان کو اب سنا دے تو ضرور بھاگیں) یعنی ان کو سمجھا دیتا بایں طور کہ ان میں وہ قوت کہ جس سے وہ سمجھ لیتے عطا فرما دیتا۔

اور ارشاد وَاسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ (کہتے ہیں سن نہ سنایا جائیو) یہ دو طرح پر بولا جاتا ہے ایک انسان پر بہرا ہونے کی بددعا کے لئے، دوسرے اس کے لئے دعا کے واسطے[1] پس اول کی مثال تو جیسے اَسْمَعَکَ اللّٰہُ ہے یعنی اللہ تجھے بہرا کر دے اور دوسرے کی یہ کہ کہا جاتا ہے

[1] پہلی صورت میں غَیْرَ مُسْمَعٍ کے معنی ہوں گے "کچھ سنائی نہ دے" اور دوسری صورت میں "گالی نہ سنائی جائے"

اِسْمَعْتُ فُلَانًا (میں نے فلاں کو سنائی) جب کہ تم نے اس کو گالیاں دی ہوں، اور اس کا استعمال گالی دینے کے بارے میں متعارف ہے اور یہی ہے کہ اہلِ کتاب نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہی کہا کرتے تھے اس گمان میں ڈالنے کے لئے کہ وہ آپ کی تعظیم کرتے اور آپ کے حق میں دعا کرتے تھے۔

اور ہر وہ مقام کہ جہاں اللہ نے اہلِ ایمان کے لئے سمع کا اثبات فرمایا ہے یا کافروں سے اس کی نفی کی ہے یا سننے پر رغبت دلائی ہے، وہاں مقصود معنی پر دھیان کرنا اور اس میں غور و فکر کرنا ہے جیسے اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا (یا ان کے کان ہیں جن سے سنتے ہیں) اور صُمٌّ بُكْمٌ (بہرے ہیں گونگے) اور فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ (ان کے کانوں میں ہے بوجھ)

اور جب اللہ تعالیٰ کو آپ سمع سے موصوف کیجئے گا تو اس سے مراد اللہ کا مسموعات کا علم اور ان کو جزا دینے کا ارادہ فرمایا ہے جیسے قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا (سن لی اللہ نے بات اس عورت کی جو جھگڑتی تھی تجھ سے اپنے خاوند کے حق میں) اور لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا (بے شک اللہ نے سنی ان کی بات جنہوں نے کہا)

اور آیہ شریفہ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ (البتہ تو نہیں سنا سکتا مردوں کو اور نہیں سنا سکتا بہروں کو اپنی پکار) یعنی تم انہیں سمجھا نہیں سکتے کیونکہ وہ اپنی بدعملی کی بنا پر قوتِ عاقلہ کو جو کہ انسانیت کی مخصوص حیات ہے گم کر دینے میں مردوں کی طرح سے ہیں۔

اور ارشاد ہے اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ (کیا عجیب دیکھتا اور سنتا ہے) یعنی اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ اس شخص کی زبان سے نکلے گا جو اس کی عجائبِ حکمت پر مطلع ہوگا اور اس کے بارے میں مَاۤ اَبْصَرَهٗ وَمَاۤ اَسْمَعَهٗ نہیں کہا جائیگا کیونکہ سابق میں یہ مذکور ہو چکا کہ حق تعالیٰ شانہٗ کو صرف اسی صفت سے موصوف کیا جا سکتا ہے جو ذکر یا سمع میں وارد ہوا ہو۔

اور کفار کے بارے میں جو ارشاد ہے اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا (کیا خوب سنتے اور دیکھتے ہوں گے جس دن آئیں گے ہمارے پاس) اس کے معنی یہ ہیں کہ جو چیزیں اپنی جانوں پر ظلم کرنے

Marfat.com

اور غور و فکر کے ترک کر دینے کی بنا پر آج ان سے مخفی اور گم ہیں اس دن ان کو سن رہے ہوں گے اور دیکھ رہے ہوں گے "

سَمْعٌ (بمعنی کان) کا استعمال واحد اور جمع دونوں کے لئے ہوتا ہے ارشاد ہے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ (اللہ نے مہر کر دی ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر) کیونکہ حسب تصریح صحاح یہ اصل میں مصدر ہے جمع اَسْمَاعٌ اور جمع قلت اَسْمُعٌ اور جمع الجمع اَسَامِعُ ہے پ ۱/۹ پ ۱۲/۲ پ ۱۴/۲،۱۷ پ ۱۵/۴ پ ۱۸/۵ پ ۱۹/۱۵ پ ۲۶/۱۷ پ ۲۹/۲،۱۱

**سَمْعًا** پ ۱۶/۲ پ ۲۶/۳

**سَمِعَ** : اس نے سنا، سَمْعٌ اور سَمَاعَةٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ ۲۸/۱

**سَمِعَتْ** : اس (عورت) نے سنا، سَمْعٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، پ ۱۲/۱۴

**سَمِعْتُمْ** : تم نے سنا، سَمْعٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، پ ۱۸/۷

**سَمِعْتُمُوْهُ** : تم نے اس کو سنا، اس میں واؤ اشباع کا ہے اور ہ ضمیر واحد مذکر غائب، پ ۱۸/۷

**سَمْعُكُمْ** : تمہارے کان، تمہاری قوت سماعت، سَمْعٌ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ۔

پ ۷/۱۱ پ ۲۴/۱۷

**سَمِعْنَا** : ہم نے سنا، ہم نے سمجھا، سَمْعٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، پ ۱/۱۱ پ ۳/۸ پ ۴/۱۱ پ ۵/۲ پ ۶/۶ پ ۹/۱۷،۱۸ پ ۱۶/۵ پ ۱۸/۲،۱۳ پ ۲۰/۷ پ ۲۱/۱۵ پ ۲۳/۱۰ پ ۲۶/۴ پ ۲۹/۱۱

**سَمِعُوْا** : انہوں نے سنا، سَمْعٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ ۷/۱ پ ۱۸/۱۲ پ ۲۰/۹ پ ۲۳/۱۴ پ ۲۹/۱،۴

**سَمْعِهٖ** : اس کا کان، اس کی قوت سماعت سَمْعٌ مضاف، ہ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۲۵/۱۹

**سَمِعَهٗ** : اس نے اسے سنا، سَمِعَ صیغہ ماضی ہ ضمیر واحد مذکر غائب، پ ۲/۶

**سَمْعُهُمْ** : ان کے کان، سَمْعٌ مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۱/۱،۲ پ ۱۴/۲۰ پ ۲۴/۱۷

پ ۲۶/۳

**سَمْكَهَا** : اس کا ابھار، اس کی چھت، اس کی بلندی، سَمْكٌ مضاف ھا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، سَمْكٌ اصل میں سَمَكَ يَسْمُكُ کا مصدر ہے اس کے معنی بلند کرنے کے ہیں چھت بھی چونکہ بلند ہوتی ہے اس لئے اس کو بھی سَمْكٌ کہتے ہیں، پ ۳۰/۴

**سَمٰوٰتٍ** : آسمان، سَمَآءٌ کی جمع (ملاحظہ ہو

سَمَآء: ۱/ ۳، ۲، ۱۲، ۱۴ ، ۲/ ۴ ، ۳/ ۲، ۸، ۱۱، ۱۷ ، ۴/ ۲، ۴، ۵، ۹، ۱۰، ۱۱ ، ۵/ ۱۵، ۱۶ ، ۶/ ۳، ۷، ۱۰ ، ۷/ ۳، ۶، ۷، ۸، ۱۵، ۱۹ ، ۸/ ۱۴ ، ۹/ ۱۰، ۱۳ ، ۱۰/ ۱۱ ، ۱۱/ ۳، ۶، ۷، ۱۱، ۱۲، ۱۵ ، ۱۲/ ۱، ۹، ۱۰ ، ۱۳/ ۵، ۶، ۷، ۸، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۷، ۱۹ ، ۱۲/ ۶، ۷، ۱۲، ۱۳، ۱۶ ، ۱۴/ ۱۷ ، ۱۵/ ۵، ۶، ۱۱، ۱۲، ۱۴، ۱۶، ۱۹ ، ۱۶/ ۷، ۹، ۱۰ ، ۱۷/ ۲، ۳، ۵، ۹، ۱۵ ، ۱۸/ ۴، ۵، ۱۱، ۱۲، ۱۵، ۱۶ ، ۱۹/ ۳، ۶، ۱۷ ، ۲۰/ ۱، ۳، ۱۷ ، ۲۱/ ۲، ۴، ۵، ۶، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۴ ، ۲۲/ ۶، ۷، ۹، ۱۳، ۱۷ ، ۲۳/ ۴، ۵، ۱۰، ۱۴، ۱۵ ، ۲۴/ ۱، ۲، ۳، ۶، ۹، ۱۱، ۱۲ ، ۲۵/ ۲، ۳، ۴، ۶، ۷، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰ ، ۲۶/ ۱، ۴، ۹، ۱۰، ۱۴، ۱۷ ، ۲۷/ ۴، ۶، ۱۲، ۱۷ ، ۲۸/ ۲، ۴، ۶ ، ۲۸/ ۹، ۱۱، ۱۳، ۱۵، ۱۸ ، ۲۹/ ۱، ۹ ، ۳۰/ ۲، ۱۰

**سَمُوْم**: لُو، تیز بھاپ، وہ گرم ہوا جو زہر کا سا اثر کرے سموم کہلاتی ہے، مؤنث ہے، سَمَائِم جمع، ۱۴/ ۳ ، ۲۷/ ۳، ۱۵

**سَمُّوْهُمْ**: تم ان کا نام لو، سَمُّوْا تَسْمِیَۃٌ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، راغب اصفہانی مفردات میں لکھتے ہیں :-

"آیتِ شریفہ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ قُلْ سَمُّوْهُمْ (اور مقرر کرتے ہیں اللہ کے لئے شریک کہہ ان کا نام لو) سے یہ مراد نہیں ہے کہ لات، عزیٰ وغیرہ ان کے ناموں کا ذکر کردیں بلکہ معنی یہ ہیں کہ جن کو تم معبود کہتے ہو ان کے متعلق تحقیق بتاؤ نیز یہ کہ ان اسماء کے معانی آیا ان میں موجود بھی ہیں؟ اسی لئے بعد میں ارشاد ہے اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ (یا اللہ کو بتلاتے ہو جو وہ نہیں جانتا زمین میں یا کرتے ہو اوپر ہی اوپر باتیں؟"

(ملاحظہ ہو تَسْمِیَۃٌ) ۱۲/ ۴

**سَمِیًّا**: ہمنام، نظیر، امام راغب لکھتے ہیں :-

"آیتِ کریمہ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا (کسی کو پہچانتا ہے تو اس کے نام کا) یعنی اس کی کوئی نظیر جانتے ہو جو اس کے نام کا مستحق ہو یا اس کی صفت سے متصف کہ حقیقۃً اس کا استحقاق رکھتا ہو اور یہ معنی نہیں کہ "آیا کسی کو پاتے ہو جو اس کے نام سے موسوم ہو" کیونکہ اللہ کے بہت سے اسماء ہیں جن کا غیر پر بھی اطلاق ہوتا ہے لیکن اللہ کے لئے جب ان کا استعمال ہو تو وہ معنی نہیں ہوتے جو غیر کے لئے استعمال کرتے وقت ہوتے ہیں" ۱۶/ ۷، ۱۴

**سَمَّيْتُمُوْهَا**: تم نے ان کا نام رکھ لیا ہے، سَمَّيْتُمْ تَسْمِیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، واو اشباع کا اور ھا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے،

جو جمع کے لئے استعمال کی گئی ہے، راغب لکھتے ہیں :۔
" آیتِ کریمہ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَا (کچھ نہیں پوجتے ہو سوائے اس کے مگر نام ہیں جو رکھ لئے ہیں تم نے) کے معنی یہ ہیں کہ جن ناموں کا تم ذکر کرتے ہو ان کے مسمیات نہیں ہیں بلکہ یہ اسماء ایسے ہیں جو بغیر مسمّٰی کے ہیں کیونکہ ان ناموں کے اعتبار سے بتوں کے بارے میں جو وہ اعتقاد رکھتے ہیں اس کی حقیقت ان میں پائی نہیں جاتی "

پ ۲۷/۵، ۱۲/۱۵، ۸/۱۶

**سَمَّیْتُهَا** : میں نے اس کا نام رکھا۔ سَمَّیْتُ تَسْمِیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم، ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب (ملاحظہ ہو تَسْمِیَۃٌ) ۳/۱۲

**سَمِیْعٌ** : سننے والا، سَمْعٌ سے بروزن فَعِیْلٌ صفتِ مشبہ کا صیغہ، اسمائے حسنیٰ میں سے ہے، جب یہ حق تعالیٰ شانہ کی صفت واقع ہو تو اس کے معنی ہیں " کہ سماعت ہر شے پر حاوی ہے "

۱۶،۱۷/۱۲ ۱۶/۱۲،۱۴ ۱۲،۲/۵ ۴/۶ ۱۴/۶ ۷/۹ ۱/۸
۹/۱۶،۱۴ ۱۰/۱،۳،۴ ۱۱/۱،۲،۱۲ ۱۲/۲،۱۴ ۱۳/۱۸ ۱۵/۱
۱۷/۱،۵،۱۷ ۱۸/۱۹،۱۴ ۱۹/۱۵ ۲۰/۱۳ ۲۱/۲،۱۲ ۲۲/۱۲ ۲۴/۱۷،۱۸،۱۹

پ ۲۵/۴،۱۴ ۲۶/۱۳ ۲۸/۱

**سَمِیْعًا** پ ۵/۵،۱۶ ۶/۱ ۲۹/۱۹

**سَمَّٰکُمْ** : اس نے تمہارا نام رکھا، سَمّٰی تَسْمِیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر۔ (ملاحظہ ہو تَسْمِیَۃٌ) ۱۷/۱۷

**سَمِیْنٍ** : فربہ، موٹا تازہ، سِمَنٌ سے جس کے معنی فربہ ہونے کے ہیں، بروزن فَعِیْلٌ صفتِ مشبہ کا صیغہ، سِمَانٌ جمع ۲۶/۱۹

## فصل النون

**سِنٌّ** : دانت، اَسْنَانٌ جمع، ۱/۱۲

**سَنَا** : چمکدار روشنی، بعض اہلِ لغت نے اس کو " بجلی کی چمک " کے ساتھ مخصوص کیا ہے[1] لیکن صحیح یہی ہے کہ لفظ عام ہے، بجلی کی کوند ہو یا آگ کی چمک ہر تیز روشنی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے[2]، حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے ایک نظم کہی ہے جن میں ان الفاظ کو شمار کرایا ہے جن کو معرب بنایا گیا ہے اس میں سنا بھی مذکور ہے[3] لیکن امام سیوطی نے لکھا ہے کہ مجھے یہ پتہ نہیں چلا کہ کسی اور نے بھی ایسا کہا ہو[4] ۱۸/۱۲

[1] تفسیر ... [2] العروس [3] نظم فتح ابدی، ج ۱، ص ۲۰۳، ۲۰۲، ۲۰۴، طبع مصر میں مذکور ہے [4] الاتقان، ج ۱، ص ۱۳۸

سَنَابِلَ : بالیں، خوشے، سُنْبُلٌ کی جمع ۳/۲

سُنْبُلٰتٍ : بالیں، خوشے۔ سُنْبُلَۃٌ کی جمع، ۱۲/۱۶

سُنْبُلَۃٍ : بال، خوشہ، ۳/۴

سُنْبُلِہٖ : اس کی بال، اس کا خوشہ، سُنْبُلِ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ، ۱۲/۱۶

سُنَّتِنَا : ہمارا دستور، سُنَّۃ مضاف، نا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ (ملاحظہ ہو سُنَّۃٌ) ۱۵/۸

سُنْدُسٍ : باریک ریشم، لاہی، باریک دیبا، علامہ سیوطی الاتقان میں لکھتے ہیں:۔

"جوالیقی نے کہا ہے کہ فارسی میں اس کے معنی باریک دیبا کے ہیں اور لیث کہتے ہیں کہ اربابِ لغت اور مفسرین میں کسی کا اس میں اختلاف نہیں کہ یہ معرب ہے شیدلہ نے اس کو ہندی بتایا ہے۔"[1] ۱۵/۱۶ ۲۵/۱۶ ۲۹/۱۹

سُنَنٌ : راہیں، طریقے، سُنَّۃٌ کی جمع ۴/۵

سَنَۃٌ : سال بھر، سِنُوْنَ، سَنَہَاتٌ، سَنَوَاتٌ جمع سَنَۃٌ کی اصل سَنْہَۃٌ تھی جَبْہَۃٌ کی طرح پھر اس کا لام کلمہ حذف کر کے اس کی حرکت نون کی طرف نقل کر دی گئی تو سَنَۃٌ باقی رہ گیا اور بعض کا قول ہے کہ اس کی اصل سَنَوَۃٌ تھی، واو کے ساتھ (اور جس طرح کہ ہا کو حذف کیا گیا) واو کو حذف کر دیا گیا ہے علامہ مجدالدین فیروزآبادی نے قاموس میں اس کو بابِ ہا میں تو اس بنا پر ذکر کیا کہ اس کا لام کلمہ ہا ہے اور معتل میں دوبارہ اس لئے بیان کیا کہ اس کا لام کلمہ واو ہے اور دونوں وجہیں صحیح ہیں مگر بعض نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے، کیونکہ تصریف لفظی دونوں کی شاہد ہے[2] امام راغب مفردات میں لکھتے ہیں:۔

"السَّنَۃ" اس کی اصل کے بارے میں دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ اس کی اصل سَنْہَۃٌ ہے کیونکہ وہ بولتے ہیں سانہت فلانا یعنی میں نے فلاں سے سال کے سال معاملہ کیا، نیز (تصغیر میں) سُنَیْہَۃٌ کہتے ہیں بعض نے کہا ہے کہ اسی سے لَمْ يَتَسَنَّہْ ہے یعنی سالوں کے اس پر گزر جانے سے نہیں بدلا اور اس کی طراوت نہیں گئی، اور کہا گیا ہے کہ اس کی اصل سَنْوٌ

[1] الاتقان، ج ۱، ص ۱۳۸ (طبع مصر)

[2] ج القاموس، باب الہاء، فصل السین

Marfat.com

سے ہے کیونکہ سَنَوَات بولتے ہیں اور اسی سے سَانَیْتُ ہے اور ہَا وقف کے لئے ہے جیسے کہ کِتَابِیَہْ اور حِسَابِیَہْ میں ہے۔"

ابن السکیت جو لغت کے امام ہیں فرماتے ہیں:۔

"اہل عرب کے ہیاں سَنَۃ بارہ مہینوں کا نام ہے انہوں نے سَنَۃ کو دو حصوں (شتاء اور صیف) میں تقسیم کر دیا ہے اور سنہ کی ابتدا اول شتاء (ابتداء سرما) سے شروع کی کیونکہ وہ مذکر ہے اور صیف (گرما) مؤنث ہے، پھر شتاء کے بھی دو حصے کئے، نصفِ اول کا نام شتوی ہے اور نصفِ آخر کا ربیع، پس شتوی بھی تین مہینے کا ہوا اور ربیع بھی تین مہینے کا، اور تین مہینے صیف کے رکھے اور تین قیظ کے۔" [1]

سنہ کی دو قسمیں ہیں ایک قمری یا ہلالی، دوسرے شمسی، قمری سال کا شمار رویتِ ہلال سے ہے سال میں بارہ مرتبہ چاند ہلال بن کر افقِ آسمان پر نمودار ہوتا ہے جس سے سنہ قمری کے بارہ مہینے شمار ہوتے ہیں اور شمسی سنہ آفتاب کے بارہ بروج کو قطع کرنے کی مدت کا نام ہے[2]، احکامِ شرعیہ میں سنہ قمری معتبر ہے۔

عَامٌ اور سَنَۃٌ میں آیا کوئی فرق ہے یا نہیں تو واضح رہے کہ قاموس میں عَامٌ کی تشریح میں لفظ سَنَۃٌ اور سَنَۃٌ کی تشریح میں لفظِ عَامٌ مذکور ہے۔

علامہ سید مرتضیٰ زبیدی اللغوی اپنے شیخ (محمد بن الطیب فاسی اللغوی شارح قاموس) سے ناقل ہیں کہ "ان دونوں کے اتحاد پر ہی مصنف (قاموس) گئے ہیں لہٰذا انہوں نے ان میں سے ہر ایک کی تفسیر دوسرے لفظ سے کی ہے" لیکن دیگر علماءِ عربیت نے ان دونوں کے باہم فرق بیان کیا ہے چنانچہ علامہ موہوب بن احمد جوالیقی فرماتے ہیں کہ:۔

"عوام الناس عَامٌ اور سَنَۃٌ میں باہم فرق نہیں کرتے اور دونوں کے ایک ہی معنی قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ غلط ہے اور صحیح وہ ہے جس کے متعلق مجھے احمد بن یحییٰ سے اطلاع ملی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ سَنَۃٌ جس دن

[1] تاج العروس فصل السین من باب الواو والیاء

[2] بطرس بستانی نے دائرۃ المعارف میں قاموس کے حوالے سے سنہ شمسی کی مذکورہ بالا تحدید نقل کی ہے لیکن مجھے قاموس میں نہیں ملی (ملاحظہ ہو دائرۃ المعارف، لفظ سَنَۃ، ج۱، ص ۱۳۳ (طبع الہلال مصر ۱۸۹۶ء)

سے ہی تم شمار کرو (آئندہ سال کے) اسی دن تک ہے اور عام بغیر شتاء اور صیف کے نہیں ہوتا، سنۃ عام ایک شے سے مشتق نہیں ہیں لہٰذا جب تم آج سے لے کر آج ہی دن تک شمار کرو گے تو وہ سنۃ ہوگا، اس میں نصف شتاء اور نصف صیف داخل ہو جائے گا اور عام جب تک کہ صیف اور شتاء (دونوں موسم کامل طور پر) نہ ہوں، نہیں ہوتا، چنانچہ اول میں تو چوتھائی (اس برس کا) اور چوتھائی (اگلے برس کا) اور نصف (اس سال کا) اور نصف (اس سال کا) آجائیگا، اور جب یہ قسم کھائے کہ لا یکلمہ عاماً (اس سے ایک عام کے لئے بات نہ کرے گا) تو کچھ اس میں کا اور کچھ اس میں کا شامل نہیں ہوگا بلکہ شتاء اور صیف ہی مراد ہوں گے پس لفظِ عام، سنۃ سے اخص ہے اس بنا پر تم کہو گے کہ ہر عام سنۃ ہے اور ہر سنہ عام نہیں ہے۔"

اور علامہ ازہری کہتے ہیں:-

"عام وہ سال ہے جو موسم سرما اور موسم گرما کے ساتھ آتا ہے اور اس بنا پر عام، سنۃ کی نسبت سے اخص مطلق ہے اور جب کسی دن سے لے کر اسی دن تک (سال کا) شمار کرو تو وہ سنۃ کہلائے گا اور اسی میں کبھی نصف گرما اور نصف سرما بھی ہوگا اور عام میں صیف و شتاء لگاتار ہوتے ہیں۔"

اور امام سہیلی الروض الانف میں ان کے باہمی فرق میں یہ رقمطراز ہیں:-

"سنہ، عام سے لمبا ہوتا ہے یہ آفتاب کے دوروں میں سے ایک دور ہے اور برخلاف سنۃ کے عام کا استعمال عربی مہینوں کے لئے ہوتا ہے۔" [1]

اور امام راغب اصفہانی نے ایک اور فرق بیان کیا ہے:-

"عام سنہ کی طرح ہی سے ہے لیکن بسا اوقات سنہ کا استعمال اس سال کے لئے ہوتا ہے جس میں سختی یا قحط ہو اور اسی لئے قحط کی تعبیر لفظِ سنہ سے کی جاتی ہے اور عام کا استعمال اس برس کے لئے ہوتا ہے جس میں فراخی اور سرسبزی ہو، ارشاد ہے فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَ

عـه اہل عرب نے سال کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے اس کا بیان ہے شتاء سے موسم سرما نصف اول مراد ہے اور صیف (موسم گرما) سے نصف ثانی۔

عـه اس اصطلاح کے لئے [illegible] منظور ہوں۔ [1] [illegible] المکوس، فصل العین من باب المیم۔

فِيْهِ يَعْصِرُوْنَ (ایک برس اس میں مینہ برسے گا لوگوں پر اور اس میں رس نچوڑیں گے۔)

پ ۱۱/۶، پ ۸/۱۷، پ ۱۲/۲۰، پ ۱۴/۲۱، پ ۱۴/۲۶، پ ۲/۲۹، پ ۷

سِنَةٌ: اونگھ، غفلت، غنودگی، وَسِنَ يَوْسَنُ کا مصدر ہے۔ اس کے معنی غنودگی سے بیہوش ہونے کے آتے ہیں۔ سِنَةٌ اصل میں وَسْنٌ تھا عِدَةٌ کی طرح سے، اس کی ہار واؤ محذوف کے بدلہ میں ہے، پ ۳/۱

سُنَّةٌ: راہ، رسم، دستور، طریقہ جاریہ، اسم ہے سُنَنٌ جمع، سَنَّ کا استعمال متعدد معانی میں ہوتا ہے منجملہ ان کے دستور جاری کرنے کے معنی بھی ہیں چنانچہ تاج المصادر میں مرقوم ہے :-

"السن و نهادی نهادن و منه الحديث سَنَّ لَكُمْ مُعَاذٌ"

سنۃ اسی معنی کے اعتبار سے اس کا اسم ہے۔ راغب اصفہانی لکھتے ہیں :-

"سنۃ النبی سے مراد وہ طریقہ ہے جس کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انتخاب فرماتے تھے اور سنۃ اللہ کا استعمال حق تعالیٰ کے دستور حکمت اور طریقہ طاعت کے لئے ہوتا ہے جیسے سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (رسم پڑی ہوئی اللہ کی جو چلی آتی ہے پہلے سے اور تو ہرگز نہ دیکھے گا اللہ کی رسم کو بدلتے) اور وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (اور ہرگز نہ پائے گا اللہ کا دستور ٹلتا) یہ اس پر تنبیہ ہے کہ شریعتوں کے احکام فروعی گرچہ صورتیں مختلف ہیں لیکن جو غرض کہ ان سے مقصود ہے یعنی نفس کی پاکیزگی اور اللہ تعالیٰ کے ثواب اور اس کے قرب تک رسائی کے لئے آراستگی، وہ مختلف و متغیر نہیں ہوتی۔"

پ ۹/۱۹، پ ۱۴/۱، پ ۱۵/۸،۱۰، پ ۲۳/۲،۵،۱۷، پ ۲۴/۱۴، پ ۲۶/۱۱

سِنِيْنَ: سال، برس، قحط، سَنَةٌ کی جمع، مصباح میں ہے کہ :-

"سَنَةٌ کی جمع، جمع مذکر سالم کی طرح آتی ہے چنانچہ سِنُوْنَ اور سِنِيْنَ بولا جاتا ہے اور اضافت کے لئے نون حذف ہو جاتا ہے اور ایک لغت (بولی) میں تمام حالتوں میں یار برقرار رہتی ہے اور نون کو حرفِ اعراب قرار دیا جاتا ہے جس کو نکرہ ہونے کی حالت میں تنوین دی جاتی ہے اور اضافت میں حذف نہیں کیا جاتا گویا کہ وہ اصول کلمہ میں ہے اور اسی لغت پر یہ حدیث ہے، اللّٰھم اجعلھا سِنِيْنَ كَسِنِيْنِ يُوسُفَ

سابق میں راغب کی تصریح گزر چکی ہے کہ سَنَۃٌ کا استعمال بسا اوقات سالِ قحط کے لئے ہوتا ہے لَقَدْ اَخَذْنَا اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ (اور ہم نے پکڑ لیا فرعون والوں کو قحطوں میں) میں سنین سے سالہائے قحط ہی مراد ہیں۔ تاج العروس میں تصریح ہے کہ یہ اس کے مجازی معنی ہیں، ۹/۶ ، ۱۱/۶ ، ۱۲/۱۵،۱۶ ، ۱۵/۲،۱۳،۱۶

۱۶/۱۱ ، ۱۸/۶ ، ۱۹/۶،۱۵ ، ۲۱/۴

## فصل الواو

سُوْٓءٌ : برائی، آفت، گناہ، برا کام، عیب، سَوْءٌ سے اسم ہے، علامہ سید مرتضیٰ زبیدی نے لکھا ہے کہ یہ آفات و امراض کا ایک جامع نام ہے[1] امام راغب فرماتے ہیں :-

"سُوْٓءٌ ہر وہ چیز ہے جو انسان کو غم میں ڈال دے خواہ دنیوی امور میں سے ہو یا اخروی امور سے احوالِ نفسیہ میں سے ہو یا احوال بدنیہ میں سے یا ان حالات میں سے ہو کہ جو جاہ مال کے چھوٹ جانے اور دوست کے بچھڑ جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔"

قرآن مجید میں اس کا استعمال جن معانی میں ہوا ہے امام سیوطیؒ نے ان کو تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا ہے، فرماتے ہیں :-

"سُوْٓءٌ کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے، شدت کے لئے یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ (وہ کرتے تھے تم پر سخت عذاب کو بچیں کاٹنے کے لئے) وَلَا تَمَسُّوْھَا بِسُوْٓءٍ (اور اس کو ہاتھ نہ لگاؤ بری طرح یعنی ناقہ کی کونچیں نہ کاٹ ڈالنا) زنا کے لئے مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَھْلِکَ سُوْٓءً (اور کچھ سزا نہیں ہے ایسے شخص کی جو چاہے تیرے گھر میں برائی یعنی زنا) برص کے لئے بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ (سفید بغیر عیب یعنی برص کے) عذاب کیلئے اِنَّ الْخِزْیَ الْیَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ (بیشک رسوائی آج کے دن اور برائی منکروں پر ہے) شرک کے لئے مَا کُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ (ہم تو کرتے نہ تھے کچھ برائی یعنی شرک) گالی گلوچ کے لئے لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ (اللہ پسند نہیں کرتا کسی بری بات کو یعنی کسی کی دشنام طرازی کو) وَ اَلْسِنَتَھُمْ بِالسُّوْٓءِ (اور دکھویں اپنی زبانیں برائی کے ساتھ) گناہ کے لئے یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَھَالَۃٍ (کرتے ہیں برا

[1] تاج العروس، فصل السین من باب الھمزۃ

کام جہالت سے) یمَسَّ (برا ہے) کے معنی میں: وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ (اور ان کے لئے ہے برا گھر) ضرر کے لئے وَیَکْشِفُ السُّوٓءَ (اور دور کر دیتا ہے سختی) وَمَا مَسَّنِیَ السُّوٓءُ (اور مجھ کو برائی کبھی نہ پہنچتی) قتل و ہزیمت کے لئے لَمْ یَمْسَسْهُمْ سُوٓءٌ (نہ پہنچی ان کو کچھ آنچ)؛ [1]

پ۱ ۶ پ۲ ۵ پ۳ ۱۱ پ۴ ۹، ۱۴ پ۵ ۳، ۱۵ پ۶ ۱ پ۷ ۱۲ پ۸ ۷، ۱۷ پ۹ ۱۶، ۱۱، ۱۳

پ۱۰ ۱۱ پ۱۲ ۵، ۶، ۱۳، ۱۷ پ۱۳ ۱، ۸، ۹، ۱۲ پ۱۴ ۱۰، ۱۳، ۱۹، ۲۱

پ۱۶ ۱۰ پ۱۹ ۱۲، ۱۶ پ۲۰ ۱، ۷ پ۲۱ ۱۸ پ۲۲ ۱۴ پ۲۳ ۱۷ پ۲۴ ۲، ۳، ۵، ۱۰، ۱۱

پ۲۴ ۶ پ۲۵ ۷

**سَوْءٌ**: برا ہونا، سَاءَ یَسُوْءُ کا مصدر ہے۔

پ۱۲ ۵ پ۱۴ ۵، ۶ پ۱۹ ۲ پ۲۶ ۹، ۱۰

**سَوَآءٌ**: برابر، اسم مصدر ہے بمعنی استوا یعنی دونوں طرف سے بالکل برابر ہونے کے، اس کا تثنیہ بنایا جاتا ہے نہ جمع، [1]

امام سیوطی اتقان میں لکھتے ہیں:۔

"(سواء) بمعنی ستوی (برابر) ہوتا ہے کسرہ کے ساتھ اس میں قصر ہوگا جیسے مَکَانًا سُوًی (جگہ برابر یعنی صاف اور ہموار) اور فتحہ کے ساتھ جیسے سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ (برابر ہے ان کو تو ڈرائے یا نہ ڈرائے) اور بمعنی وسط بھی آتا ہے اس صورت میں بھی فتحہ کے ساتھ ہوگا جیسے فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ (بیچوں بیچ دوزخ کے) اور بمعنی تام کے بھی، اس صورت میں بھی ایسا ہی ہوگا جیسے فِیْ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ سَوَآءً (چار دن میں پورا ہوا) اور وَاهْدِنَآ اِلٰی سَوَآءِ الصِّرَاطِ (اور بتلا دے ہم کو سیدھی راہ) بھی اس معنی میں ہو سکتا ہے، قرآن مجید میں یہ لفظ بمعنی غیر (سوائے) کے نہیں آیا ہے اور کہا گیا ہے کہ آیا ہے چنانچہ البرہان [2] میں آیت فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ (وہ بہک گیا غیر راستہ کو) کو اسی سے قرار دیا ہے، حالانکہ یہ وہم ہے اور اس سے بہتر تو کلبی کا قول ہے جو ارشاد الٰہی وَلَآ اَنْتَ مَکَانًا سُوًی (اور نہ تو سوائے اس جگہ کے) کے بارے میں ہے کہ سُوًی استثنائیہ ہے اور مستثنیٰ محذوف ہے ای مکانا سوی هذا المکان، کرمانی نے اس کو اپنی کتاب عجائب میں بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں بُعد ہے

[1] الاتقان، ج۱، ص ۱۴۲ (طبع مصر ۱۳۱۸ء) [3] روح المعانی، ج۱۶، ص ۱۱۹ (طبع مصر)
[2] البرہان فی مشکلات القرآن، علامہ ابو المعالی عزیزی بن عبد الملک المعروف بہ شیذلہ کی مشہور تصنیف ہے۔

کیونکہ سوئی استثنائیہ بغیر مضاف ہوئے استعمال ہی نہیں ہوتا۔"[1]

پ۱/۱۳،۱ پ۳/۱۵ پ۴/۳ پ۵/۹ پ۶/۱۳،۷، ۱۴ پ۹/۱۴ پ۱۰/۳ پ۱۳/۱۵،۸
پ۱۴/۱۶ پ۱۷/۱۰،۷ پ۱۹/۱۱ پ۲۰/۶ پ۲۱/۷ پ۲۲/۱۸ پ۲۳/۱۱،۲ پ۲۴/۱۶ پ۲۵/۱۸،۱۲
پ۲۷/۳ پ۲۸/۱۳،۷

**سَوْاٰتِکُمْ**: تمہاری شرمگاہیں، سَوْاٰتِ، سَوْاَۃٌ کی جمع مضاف ہے، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ۔ (ملاحظہ ہو سَوْاَۃٌ) پ۸/۱

**سَوْاٰتِہِمَا**: ان دونوں کی شرمگاہیں، سَوْاٰتِ مضاف ھُمَا ضمیر تثنیہ غائب، مضاف الیہ،

پ۸/۱۰،۹ پ۱۶/۱۶

**سُوَاعًا**: ایک بت کا نام، مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:-

"اس لفظ کا مشتق منہ کلام عرب میں نہیں ملتا ممکن ہے کہ سوع سے مشتق ہو جس کے معنی زمانہ کے ہیں۔"[2]

قرآنِ مجید میں سورۂ نوح کے اندر وَدّ، سُوَاع، یَغُوث، یَعُوق اور نَسْر کے نام آئے ہیں۔ ابنِ جریر طبری اور ابنِ المنذر نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ یہ وہ بت تھے جن کی حضرت نوح علیہ السلام کے عہد میں پرستش کی جاتی تھی[3]، بعد میں زمانہ جاہلیت کے اندر عرب کے مختلف قبیلوں میں بھی ان کی پوجا کا سلسلہ جاری تھا، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی ارض القرآن میں اصنام عرب پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"ایک غیر مرفوع روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بت گزشتہ بزرگوں کے مجسمے تھے جن کو اہلِ عرب نے بعد میں پوجنا شروع کر دیا تھا، ممکن ہے کہ ان میں بعض ایسے بھی ہوں لیکن زیادہ صحیح خیال یہ ہے کہ اصل میں یہ مختلف ستاروں کی خیالی صورتیں تھیں، نسر کے متعلق تو بہ تحقیق ثابت ہے کہ وہ ایک آسمانی شکل کا نام ہے، اسی پر دوسرے بتوں کو بھی قیاس کرنا چاہیے، بعد میں مرورِ زمانہ سے ان کی اصلیتیں ذہنوں سے اتر گئیں اور وہ صرف پتھر اور مٹی کا ڈھیر بن کر رہ گئے چنانچہ لات، عزیٰ اور منات کی یہی صورت تھی، لات گول سپید پتھر تھا اور اس پر ایک عمارت بنی تھی، عزیٰ ایک درخت تھا، اس کے نیچے ایک بت تھا، چاروں طرف چہار دیواری تھی، منات پتھر کی ایک چٹان تھی

[1] الاتقان ج۱ ص ۱۶۲ (طبع مصر) [2] ارض القرآن ج۲ ص ۲۳۶ (طبع معارف پریس) [3] تفسیر امام ابن جریر طبری ج۲۹ ص ۵۳، الدر المنثور امام سیوطی ج۶ (طبع میمنیہ مصر)

دوسرے بتوں کی مختلف صورتیں تھیں۔

وَدّ دراز قد مرد کی صورت ایک تہبند کمر میں لپیٹے، ایک چادر اوڑھے، گلے میں تلوار حمائل، کمان لٹکی ہوئی، ایک طرف ترکش پڑا ہوا، سامنے نیزہ، اس میں جھنڈا بندھا ہوا، ستارہ جبار کی تقریباً یہی شکل ہے۔ سواع کی شکل عورت کی تھی، آسمان میں مرأۃ مسلسلہ، ذات الکرسی وغیرہ عورت کی شکلیں ہیں۔ یغوث (فریادرس) کی شکل شیر کی تھی، ستارہ اسد ہوگا، ایک فریادرس اور مددگار کی صورت شیر سے بہتر کیا خیال کی جاسکتی ہے؟ یعوق (مصیبتوں کو روکنے والا) کی صورت گھوڑے کی تھی، ستاروں کی ایک شکل فرس بھی ہے، عربوں کے نزدیک تو فرس حقیقۃً ان کے مصائب کا چارہ گر ہے، نسر ایک پرندہ کی شکل پر تھا، نسر طائر اور واقع ستاروں کی دو مشہور شکلیں ہیں، بابل میں نسرک کی جو سنگی صورت ملی ہے وہ بالکل گدھ کی شکل ہے۔"[1]

لیکن ہمارے نزدیک اس سارے بیان میں اتنی حقیقت تو بلاشبہ صحیح ہے کہ نسر طائر اور نسر واقع آسمان میں ستاروں کی دو مشہور شکلوں کے نام ہیں، باقی اس سے زیادہ جو کچھ ہے اس کے پیچھے جب تک تاریخی شواہد نہ ہوں قیاس آرائی سے زیادہ اس کی کیا وقعت ہے؟ چنانچہ سید صاحب نے بھی اس کو "زیادہ صحیح خیال" ہی فرمایا ہے نیز اس کے قیاس ہونے کی بھی بایں الفاظ تصریح کردی ہے کہ:-

"نسر کے متعلق تو بہ تحقیق ثابت ہے کہ وہ ایک آسمانی شکل کا نام ہے اسی پر دوسرے بتوں کو بھی قیاس کرنا چاہیے۔"

گویا یہ قیاس بھی سطرد نہیں کہ بعض میں تو بہ تکلف چلتا ہے اور بعض میں سرے سے اس کی گنجائش ہی نہیں رہتی، ہوا یہ کہ اولاً نسر سے ذہن نسر واقع اور نسر طائر کی طرف منتقل ہوا پھر وَدّ اور سواع کے بارے میں قیاس سے کام لیا تو تیر نشانہ پر بیٹھتا نظر آیا، چونکہ یہاں زمینی مورتوں اور آسمانی شکلوں میں مشابہت نظر آئی اس لیے ان دونوں کے بارے میں معنوی مناسبت کو نظر انداز کیا گیا، یغوث اور اسد، یعوق اور فرس میں بہ تکلف معنوی مناسبت پیدا کی گئی اور شیر کو جو حیوان مفترس اور حقیقت میں ایک خونخوار درندہ ہے فریادرس بنا کر ستارۂ اسد کی خیالی صورت کا بت قرار دیا گیا، لات، عزیٰ اور منات میں

[1] ارض القرآن، ج ۲، ص ۲۳۷، ۲۳۸

قیاس کیا کام دیتا اس لئے یہ کہہ دیا کہ مرورِ زمانہ سے ان کی اصلیتیں ذہنوں سے اتر گئیں اور وہ صرف پتھر اور مٹی کا ڈھیر بن کر رہ گئے۔" ہم پوچھتے ہیں کہ اگر عرب کے بت اصل میں مختلف ستاروں کی خیالی صورتیں تھیں، تو بتایا جائے کہ لات، عزّٰی اور منات کن ستاروں کی خیالی صورتیں ہیں؟ نیز ستارہ جبار کی خیالی صورت کی مورت کا نام وَدّ کس مناسبت سے پڑ گیا؟ تاریخی چیزوں میں محض قیاس کیسے کام چل سکتا ہے پھر یہ امر خود اپنی جگہ ثبوت طلب ہے کہ یغوث کی شکل شیر کی اور یعوق کی صورت گھوڑے کی اور نسر کی مورت پرندہ کی تھی، سید صاحب نے لکھا ہے "ان بتوں کی یہ شکلیں فتح الباری تفسیر سورۂ نوح میں مذکور ہیں[۱]۔" لیکن دشواری یہ ہے کہ حافظ ابنِ حجر عسقلانی جو فتح الباری کے مصنف ہیں وہ خود اس بات پر اعتماد نہیں کرتے چنانچہ حافظ صاحب نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے درج ذیل ہے فرماتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| وحکی الواقدی قال | اور واقدی نے بیان کیا ہے |
| کان ود علی صورۃ | کہ وَدّ مرد کی شکل پر تھا اور |
| رجل وسواع علی | سواع عورت کی شکل پر |
| صورۃ امرأۃ و | اور یعوق گھوڑے کی شکل پر |
| یغوث علی صورۃ | اور نسر پرندہ کی شکل پر اور |
| فرس ونسر علی صورۃ | یہ بیان شاذ ہے اور مشہور |
| طائر وھذا شاذ و | یوں ہے کہ یہ سب بت |
| المشہور انہم کانوا | انسانی شکل کے تھے اور |
| علی صورۃ البشر وھو | یہی ان آثار کا مقتضٰی ہے |
| مقتضی ما تقدم من | جو ان کی پوجا کی وجہ |
| الآثار فی سبب | کے سلسلہ میں گزر چکے |
| عبادتہا[۲] | ہیں۔ |

ایسی حالت میں واقدی کے بیان کی خصوصاً آثار کی سلف کی موجودگی میں جو وقعت ہو سکتی ہے، ظاہر ہے۔

اور بالفرض اگر واقدی کا بیان صحیح بھی تسلیم کیا جائے تب بھی اس کے معارض نہیں کہ یہ بت گزشتہ بزرگوں کے مجسمے تھے کیونکہ ممکن ہے کہ یہ معنوی طور پر ان کی صفات کے مجسمے ہوں، وَدّ مردانگی میں کامل شخص کا مجسمہ اور سواع عبادت میں کامل عورت کی مورت اور یغوث مردِ شجاع کی صورت اور یعوق سبقت لے جانے والے اور توانا کی شکل، اور نسر بڑی عمر والے بزرگ کی

---

[۱] ماخوذ از ارض القرآن، ج ۲، ص ۲۳۸

[۲] فتح الباری شرح صحیح بخاری، ج ۸، ص ۴۴۳ (طبع مصر ۱۳۲۵ھ)

شبیہ، چنانچہ علامہ بقاعی کی یہی رائے ہے۔[1] علاوہ ازیں یہ خیال زیادہ صحیح اس وقت قرار دیا جاسکتا ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ بت پرستی کے شروع ہونے سے پہلے ستاروں کی خیالی صورتیں متعین ہو چکی تھیں اور بحیثیت دیوتا کے ان کی پرستش کی جاتی تھی حالانکہ خود سید صاحب ابتدائے بحث میں فرما چکے ہیں کہ:-

"مذہب کی ابتدائی تاریخ کا منظر، عالم پرستی"

عرب میں موجود تھی، صحیح بخاری میں عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ عرب کے مشہور بت لات، ود، یغوث وغیرہ پہلے زمانہ کے بزرگوں کے نام ہیں، بعد میں اہل عرب ان کی مورتیں بنا کر پوجنے لگے، قرآن مجید ذیل کی آیت پاک میں اسی مذہب کی تردید کرتا ہے:-

اَلَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ (اعراف) — خدا کے سوا اور جنکو پکارتے ہو تمہاری ہی طرح مخلوق ہیں۔

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا (مریم) — آسمان اور زمین میں جو چیز بھی ہے وہ خدا کے سامنے غلام بن کر آنے والی ہے۔[2]

صحیح بخاری کی جس روایت کا حوالہ سید صاحب نے دیا ہے وہ بروایت عطا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس طرح مروی ہے کہ وہ بت جو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں تھے بعد میں عرب میں رائج ہو گئے چنانچہ ود دومۃ الجندل میں کلب کا بت تھا، ہذیل کا سواع تھا، یغوث پہلے مراد کا تھا، پھر سبا کے نزدیک جرف میں بنی غطیف کا ہوا، یعوق ہمدان کا تھا اور نسر حمیر میں سے آل ذی الکلاع کا، یہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے نیک مردوں کے نام تھے، جب وہ مر گئے تو شیطان نے ان کی قوم کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ جن مجالس میں یہ لوگ بیٹھے تھے وہاں ان کے مجسمے کھڑے کر کے ان مجسموں کو ان ہی کے نام پر موسوم کر دیا جائے چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا، اس وقت ان کی پرستش ہوئی نہیں تا آنکہ یہ لوگ مر کھپ گئے اور ان مجسموں کے متعلق خصوصی معلومات جاتی رہی تب ان کی پوجا ہونے لگی[3]
گو حسب تصریح ائمہ بخاری کی یہ روایت منقطع ہے[4]

---

[1] الفتوحات الالٰہیہ بتوضیح تفسیر الجلالین، معروف بحاشیہ جمل علی الجلالین ج ۴ ص ۳۱۲ (طبع مصر ۱۳۰۳ھ)
[2] ارض القرآن ج ۲ ص ۱۹۰ [3] صحیح بخاری کتاب التفسیر سورۂ نوح باب ودا ولا سواعا ولا یغوث ویعوق۔
[4] ملاحظہ ہو ارشاد الساری مقدمہ فتح الباری ج ۲ ص ۳۴، ۱۵۰ (طبع منیریہ مصر ۱۳۴۸ھ) اور عمدۃ القاری ج ۹ ص ۲۳۰ (طبع مصر)

Marfat.com

لیکن مفسرین سلف میں سے عکرمہ، ضحاک، قتادہ اور ابن اسحاق سے بھی اسی کے قریب قریب منقول ہے۱؎ ابن ابی حاتم نے عروہ بن زبیر سے جو مشہور تابعی ہیں، روایت کیا ہے کہ یہ پانچوں حضرت آدم علیہ السلام کی صلبی اولاد میں سے تھے۲؎ ابو الشیخ نے کتاب العظمة۳؎ میں اور عمر بن شیبہ نے کتاب مکہ میں محمد بن کعب قرظی کا بھی یہی قول نقل کیا ہے۴؎

ابو عبیدہ کا بیان ہے کہ لوگوں کا خیال ہے یہ مجوسی تھے ان کے مجسمے طوفان میں غرق ہو گئے تھے، جب پانی خشک ہوا تو ابلیس نے ان کو نکال کر زمین میں پھیلایا لیکن حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ان کو مجوس کہنا غلط ہے کیونکہ مجوسیت اس کے زمانۂ دراز کے بعد پیدا ہوئی ہے۵؎

امام سہیلی التعریف والاعلام فیما ابہم فی القرآن من الاسماء والاعلام میں لکھتے ہیں کہ :-

"مجھے یہ پتہ نہیں کہ یہ نام عربوں تک کس طرح پہنچے، آیا ہندوستان کی طرف سے آئے کیونکہ یہ کہا گیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد بت پرستی کا مبدا یہی لوگ تھے یا شیطان نے عرب کو اس کا الہام کیا۔"

علامہ محمد بن علی معروف با بن عسکر نے اس کتاب پر ایک ذیل لکھا ہے جس کا نام ہے التکمیل والاکمال اس میں انہوں نے تصریح کی ہے کہ امام موصوف کا یہ بیان تفسیر شیخ الاسلام بقی بن مخلد سے ماخوذ ہے اس میں مذکور ہے کہ "یہ نام ہندوستان پہنچے تو اہلِ ہند نے اپنے بتوں کو ان اسماء سے موسوم کیا، پھر عرب کی سرزمین میں عمرو بن لحی نے ان ناموں کو داخل کیا ہے۔"۶؎

ابو المنذر ہشام بن محمد بن السائب الکلبی المتوفی سنہ ۲۰۴ھ کی کتاب الاصنام استاذ احمد زکی پاشا کی تصحیح و تحشیہ کے ساتھ مصر میں شائع ہو چکی ہے جو عرب کی بت پرستی کی تاریخ پر دو رِ اول کے مسلمان مؤرخین کی قدیم یادگار ہے ہشام بن الکلبی اگرچہ حدیث میں معتبر نہیں لیکن تاریخ و نسب کا بڑا علامہ تھا، اس نے اپنے باپ محمد بن السائب الکلبی سے نقل کیا ہے کہ عمرو بن لحی کا ہن تھا اسے جن نظر آتا تھا، جن نے اس سے کہا تھا کہ تہامہ سے جدہ کے ساحل پر جا، وہاں تجھے تیار شدہ بت ملیں گے انہیں وہاں سے

۱؎ تفسیر حافظ ابن کثیر ج ۴، ص ۴۲۶ (طبع مصر ۱۳۵۶ھ)　۲؎ الاتقان، از امام سیوطی، ج ۱، ص ۱۴۲ (طبع مصر)

۳؎ روح المعانی، ج ۲۹، ص ۷۷ (طبع مصر)　۴؎ فتح الباری ج ۸، ص ۵۴۲　۵؎ ایضاً　۶؎ ایضاً

لاکر عرب کو ان کی پرستش کی دعوت دے، اہلِ عرب تیری دعوت کو مان لیں گے چنانچہ وہ جدہ پہنچا، بتوں کو کھود کر اپنے ساتھ لیا اور حج کے موقع پر سارے عرب کو ان کی پرستش کی طرف دعوت دی، عوف بن عذرہ لے جو بنی کلب میں سے تھا اس کی دعوت کو قبول کیا اور عمرو نے اسے وَدّ دے دیا، عوف اسے اپنے ساتھ لیکر دومۃ الجندل آیا، بنو مضر بن نزار نے بھی عمرو کی بات مانی تو اس نے ہذیل کے ایک شخص کو جسے حارث بن تمیم بن سعد بن ہذیل بن مدرکہ بن الیاس بن مضر کہا جاتا تھا، سواع کو سپرد کیا چنانچہ سواع بطنِ نخلہ میں اس مقام پر تھا جس کو رہاط کہا جاتا ہے، مضر کے آس پاس جو لوگ بستے تھے اس کی عبادت کرتے تھے، چنانچہ عرب کے ایک شاعر نے کہا ہے ؎

تراهم حول قيلهم عكوفا

كما عكفت هذيل على سواع

(تو ان کو اپنے بادشاہ کے گرداگرد اس طرح جھکا ہوا دیکھے گا جس طرح کہ ہذیل سواع کے آگے جھکے ہوں)[1]

۲۹
۱

**سُؤَالٌ**: مانگنا، پوچھنا، سَأَلَ یَسْأَلُ کا مصدر ہے، امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں :۔

"سوال کے معنی ہیں معرفت کی استدعا، یا اس چیز کی استدعا جو معرفت تک پہنچا دے نیز مال کی استدعا یا اس چیز کی استدعا جو مال تک پہنچا دے، معرفت کی استدعا کا جواب زبان سے ہوتا ہے اور ہاتھ بذریعہ کتابت یا اشارت اس کا قائم مقام ہوتا ہے اور مال کی استدعا کا جواب ہاتھ سے ہوتا ہے اور زبان وعدہ کی صورت میں یا انکار کی شکل میں اس کی قائم مقام ہوتی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ کہنا کس طرح صحیح ہے کہ سوال معرفت کے لئے ہوتا ہے حالانکہ یہ بات معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے سوال کریگا جیسے وَ إِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ (اور جب کہیگا اللہ اے عیسیٰ مریم کے بیٹے) تو کہا جائیگا کہ یہ لوگوں کو بتلانے اور ان کو سرزنش دینے کے لئے ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں لانے کے لئے کیونکہ وہ تو علام الغیوب ہے لہٰذا یہ بھی معرفت کے سوال سے خارج نہیں رہتا۔

معرفت کے لئے سوال کبھی تو آگاہی حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے اور کبھی سرزنش کے لئے

[1] ملاحظہ ہو کتاب الاصنام، ص ۳۴، ۵۷، (طبع دار الکتب المصریہ ۱۳۴۳ھ)

جیسے ارشادِ الٰہی ہے وَإِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ (اور جب زمین میں جیتی گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائیگا) اور کبھی سوال کو جتلانے اور تنبیہ کرنے کے لئے نہ کہ خود اپنی علم و اطلاع کے لئے۔

سوال جب کہ معلوم کرنے کے لئے ہو تو مفعول ثانی کی طرف اس کا تعدیہ کبھی تو بنفسہٖ ہوگا اور کبھی بواسطہ حرفِ جر، چنانچہ کہو گے سالتہ کذا و سالتا عن کذا و بکذا اور عن کے ذریعہ تعدیہ زیادہ ہے۔ ارشاد ہے وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ (وہ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں) يَسْأَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ (اور تجھ سے پوچھتے ہیں ذوالقرنین کو) وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْأَنْفَالِ (تجھ سے پوچھتے ہیں حکم غنیمت کا) وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي (اور جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے مجھ کو) اور فرمایا سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ (مانگا ایک مانگنے والے نے عذاب پڑنے والا)

اور جب سوال مال کی استدعا کا ہو تو تعدیہ بنفسہٖ بھی ہوتا ہے اور بذریعہ مِنْ بھی جیسے وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ (اور جب مانگنے لگو بیبیوں سے کچھ چیز کام کی تو مانگو پردہ کے باہر سے) اور وَاسْأَلُوا مَا أَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْأَلُوا مَا أَنْفَقُوا (اور تم مانگ لو جو تم نے خرچ کیا اور وہ کافر مانگ لیں جو انہوں نے خرچ کیا) اور فرمایا وَاسْأَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ (اور مانگو اللہ سے اس کا فضل)

فقیر کو بھی جب وہ کسی چیز کی استدعا کرے تو سائل کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسے وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ (اور سائل کو مت جھڑک) اور لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ۔

اور امام ابوجعفر بیہقی، تاج المصادر میں رقمطراز ہیں:۔

"سَأَلْتُ کے بارے میں دو لغتیں ہیں، ہمزہ کی تحقیق یعنی اس کو ثابت رکھنا اور یہی لغت شائع ہے اور اس سے إِسْأَلْ ہوگا اور اس کی تخفیف اور اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ اس کو اس باب سے (یعنی فَتَحَ يَفْتَحُ ہی سے رہنے دیجئے، دوسرے باب کی طرف نقل نہ کیجئے اور دوسری یہ کہ اسے باب فَعَلَ يَفْعَلُ سے قرار دیجئے اور خِفْتُ أَخَافُ کی طرح سِلْتُ أَسَالُ کہئے اس قول پر عین کلمہ واؤ ہوگا اور امر دونوں سے سَلْ آئے گا۔

سَأَلَ ایسا فعل ہے جس کا تعدیہ دو مفعولوں کی طرف ہوتا ہے اور مفعول ثانی تین طرح پر ہوتا ہے،

اول یہ کہ اس کی طرف تعدیہ بغیر کسی حرف ظاہر یا مضمر کے ہو جیسے کہ راجز (رجز خواں) کا قول ہے
ع سَأَلْتُ عمروا بعد بکر خفا، دوم یہ کہ فعل کا اس کی طرف تعدیہ کسی حرف کے اضمار کے ساتھ ہو جیسے حق تعالیٰ کا قول ہے وَلَا يَسْئَلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا (اور نہ پوچھے گا دوست دوست کو) کہ معنی عن حمیم ہے (عن مضمر ہے) اور اظہار بھی جائز ہے جیسے وَاسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ (اور پوچھو ان سے حال بستی کا) سوم یہ کہ مفعول ثانی کے موقع پر استفہام واقع ہو جیسے سَلْ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ (پوچھ بنی اسرائیل سے کس قدر عنایت کیں ہم نے ان کو) اور وَاسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَا اَجَعَلْنَا (اور پوچھ دیکھ جو رسول بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے کبھی ہم نے رکھے ہیں)
نیز اس میں ایک مفعول پر بھی اقتصار جائز ہے اور یہ دو طرح پر ہوتا ہے ایک یہ کہ متعدی بنفسہ ہو جیسے وَاسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ دوسرے یہ کہ (باء اور عن) دو حرف کے ذریعہ اس کا تعدیہ ہو باء کے ذریعہ جیسے سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ اور عن کے ذریعہ جیسے سال عن زید۔

علامہ ابوالسعادات مبارک ابن محمد معروف بابن الاثیر جزری ارقام فرماتے ہیں کہ:۔
کتاب اللہ اور حدیث میں دو طرح کا سوال ہے ایک تو وہ جو ان چیزوں کی وضاحت کرنے اور سیکھنے کے لئے ہے کہ جن کی ضرورت پیش آتی ہے ایسا سوال مباح ہوگا یا مستحب یا مامور بہ اور دوسرا وہ کہ جو تکلف و تعنت (غلطیاں ڈھونڈنا) کے طریق پر ہے۔ ایسا سوال مکروہ اور ممنوع ہے اور ہر وہ سوال جو اس قسم کا ہو اور اس کے جواب سے سکوت واقع ہو وہ سائل کے لئے سرزنش و زجر ہے اور اگر اس کا جواب آیا تو عقوبت اور سخت گرفت ہے[1] $\frac{۲۳}{۱۱}$

**سُوْاٰى**: برا فعل، بروزن فُعْلٰى اَسْوَءُ کی تانیث ہے جس طرح سے کہ اچھے عمل کا نام حُسْنٰى ہے اسی طرح فعلِ بد کا نام سُوْاٰى ہے، یہ بسبب صفت ہونے کے افعل التفضیل پر محمول ہے[2] اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ مصدر ہو بروزن فُعْلٰى جیسے کہ رُجْعٰى ہے اس سے مراد جہنم ہے[3] $\frac{۲۱}{۴}$

**سَوْءَةٌ**: لاش، عیب، فضیحت، علامہ زمخشری

[1] النہایہ فی غریب الحدیث والاثر فصل السین مع الہمزۃ [2] تاج العروس [3] ملاحظہ ہو البحر المحیط ج ۷، ص ۱۰۲ (طبع مصر)

فرماتے ہیں کہ سَوْآۃٌ کے معنی فضیحت کے ہیں کیونکہ اس میں برائی ہوتی ہے۔[1] امام راغب نے لکھا ہے فرج (شرمگاہ) کا سَوْآۃٌ سے کنایہ کیا گیا ہے اور علامہ ابن الاثیر کا بیان ہے کہ :-

" اصل میں سَوْءَۃٌ کے معنی فرج (شرمگاہ) کے ہیں بعد میں اس کو ہر اس شے کے معنی میں نقل کر لیا گیا کہ جب وہ ظاہر ہو تو اس سے حیا آنے لگے خواہ قول ہو یا فعل"۔[1]

لیث کہتے ہیں کہ :-

"اس کا اطلاق مرد کی شرمگاہ پر بھی ہوتا ہے اور عورت کی شرمگاہ پر بھی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا (کھل گئیں ان پر شرمگاہیں ان کی) اور سوءۃ ہر وہ عمل یا امر ہے کہ عیبناک ہو"۔[3]

یہاں سَوْءَۃٌ سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق علامہ ابوحیان لکھتے ہیں :-

"یہاں سوءۃ سے مراد بعض نے کہا ہے کہ عورت ہے اور اہتمام کے لئے خاص طور پر اسے ذکر کیا گیا۔ گو سارے جسم کا چھپانا مقصود ہے نیز اس کے ستر کی زیادہ تاکید ہے اور کہا گیا ہے کہ پوری لاش مراد ہے کیونکہ میت سب کی سب عورت ہے اور اسی بنا پر اسے کفن میں لپیٹا جاتا ہے، ابن عطیہ نے کہا ہے کہ یہ بھی احتمال ہے کہ سوءۃ سے یہی حالت مراد لی جائے جو کہ مجموعی طور پر دیکھنے والے کو بری لگتی ہے"۔[4]

ج

**سُوْدٌ** : کالے، اَسْوَدَ کی جمع (ملاحظہ ہو اَسْوَدَ) ۲۲/۱۶

**سُوَرٍ** : سورتیں، سُوْرَۃٌ کی جمع، باجماعِ علمائِ معتبرین قرآن مجید کی کل سورتوں کی تعداد ایک سو چودہ ہے۔

واضح رہے کہ اول کی سات سورتیں بقرہ سے لیکر براۃ تک سبع طوال کہلاتی ہیں کیونکہ یہ لمبی سورتیں ہیں، ان کے بعد کی سورتیں مئین سے موسوم ہیں کہ ان میں سے ہر سورت سو آیت سے زیادہ کی یا اس کے قریب قریب ہے، پھر جو سورتیں ہیں ان کو مثانی کہا جاتا ہے یا تو اس لئے کہ یہ مئین کے بعد ہیں لہٰذا مئین ثانی (پہلی) ہوئیں اور یہ

[1] لغت کشاف، ج ۱، ص ۳۳۴ (طبع مصر ۱۳۵۴ھ)
[3] تاج العروس
[2] نہایہ، ج ۲، ص ۲۰۵ (طبع مصر، فصل السین مع الواو)
[4] البحر المحیط، ج ۳، ص ۲۶۵-۲۶۶

ثوانی (دو دسری) ہیں اور یا اس لئے کہ ان کے مضامین مکرر ہیں، یہ وہ سورتیں ہیں جن کی تعداد سو سے کم ہے، مثانی کے بعد جو چھوٹی سورتیں ہیں انہیں مفصل کہتے ہیں کیونکہ ان سورتوں میں بسم اللہ کے ذریعہ کثرت سے فصل واقع ہے نیز محکم بھی ہیں کہ ان کی تفصیل کر دی گئی ہے [1]

پھر مفصل بھی طوال، اوساط اور قصار تین ٹکڑوں میں منقسم ہیں اور ان کی تعیین میں علماء باہم مختلف ہیں، علامہ زین بن نجیم مصری بحر الرائق شرح کنز الدقائق میں لکھتے ہیں کہ :۔

"ہمارے اصحاب (فقہاء حنفیہ) جس پر ہیں وہ یہ ہے کہ سورۃ الحجرات سے لیکر والسماء ذات البروج تک طوال ہیں اور وہاں سے لیکر لم یکن تک اوساط اور لم یکن سے آخر قرآن تک قصار ہیں نقایہ میں اسی کی تصریح کی ہے [2]" ۱۲

**سُوْرٌ**: دیوار، فصیل شہر پناہ، شہر کی چار دیواری کو سُوْرٌ کہتے ہیں، اَسْوَارٌ اور سِیْرَانٌ جمع جیسے نُوْرٌ کی جمع اَنْوَارٌ اور کُوْزٌ کی جمع کِیْزَانٌ ہے، ۱۸/۴

**سُوْرَۃٌ**: سورت، علامہ زمخشری کشاف میں رقمطراز ہیں :۔

"سورۃ، قرآن کے متعینہ حصہ کا نام ہے، یہ کم سے کم تین آیت کا ہے، اور اس کا واو اگر اصلی ہے تو یا سورۃ المدینہ پر موسوم ہے جس کے معنی شہر کی چار دیواری کے ہیں کیونکہ یہ بھی قرآن کا ایک محدود ٹکڑا ہے جو مستقل طور پر احاطہ کئے ہوئے ہے جیسے وہ شہر کہ جس کے گرد فصیل کھینچی ہوتی ہے، اور یا اس لئے کہ فنونِ علم اور انواعِ اقسام کے فوائد پر حاوی ہے جس طرح کہ شہر پناہ اپنے اندرون کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے۔

اور یا اس سورۃ سے موسوم ہے جس کے معنی رتبہ کے ہیں، یہ دو معنی کی بنا پر ہو سکتا ہے :

(۱) اس لئے کہ سورتیں بھی بمنزلہ درجوں اور مرتبوں کے ہیں کہ جن پر قاری ترقی کرتا جاتا ہے نیز خود سورتیں طوال، اوساط اور قصار پر مرتب ہیں۔

(۲) اور یا اس لئے کہ دین میں ان کی رفعتِ شان اور جلالتِ رتبت مسلم ہے۔

اور اگر اس کے واو کو ہمزہ سے بدلا ہوا قرار دیا جائے تو جس طرح کہ سُؤْرَۃٌ کے معنی کسی شے کے بقیہ اور بچے ہوئے حصہ کے ہیں، یہ بھی قرآن کا ایک ٹکڑا اور حصہ ہے [3]

[1] ملاحظہ ہو الاتقان، ج ۱، ص ۶۳، ۶۴ (طبع مصر ۱۳۲۳ھ)
[2] البحر الرائق، ج ۱، ص ۳۶۰ (طبع مصر)
[3] تفسیر کشاف ص ۴۵

پ ۱/۳ پ ۱۰/۱۲،۱۴،۱۰ پ ۱۱/۹،۵ پ ۱۸/۷ پ ۲۶/۷

**سَوْط** : چمڑے کا کوڑا، اَسْوَاطٌ اور سِیَاطٌ جمع

سَوْطٌ کے معنی اصل میں کسی شے کے باہم خلط ملط ہونے کے ہیں کوڑے کو سوط اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کے تسمے آپس میں بٹے ہوئے ہوتے ہیں[1]۔ ابنِ درید کا بیان ہے کہ جب کوڑے لگائے جاتے ہیں تو کوڑا چونکہ گوشت کو خون سے خلط ملط کر دیتا ہے اس لئے اس کا نام سوط ہوا[2]۔ پ ۳۰/۱۴

**سَوْفَ** : عنقریب، جلد اب، آخر، امامِ راغب مفردات میں فرماتے ہیں :-

"سوف حرف ہے جو افعال مضارع کو استقبال کے ساتھ خاص کر کے حال سے علیحدہ کر دیتا ہے جیسے سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَکُمْ رَبِّیْ (میں تو بخشواؤں گا تم کو اپنے رب سے) اور ارشاد الٰہی فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (اب آگے جان لوگے) اس پر تنبیہ ہے کہ جو چیز وہ طلب کر رہے ہیں گو فی الوقت حاصل نہیں مگر بعد میں وہ لامحالہ ہو کر رہے گی اور یہ ڈھیل اور تاخیر کے معنی کا مقتضٰی ہے۔"[3]

اور امامِ سیوطی لکھتے ہیں :-

"سوف سین کی طرح ہے بعض لوگوں کے نزدیک زمانہ کے لحاظ سے سین سے زیادہ وسیع ہے کیونکہ حروف کی کثرت معنی کی کثرت پر دلالت کرتی ہے اور دیگر علماء کے نزدیک یہ سین کا مرادف (ہم معنی) ہے البتہ لام کے داخلہ کے سلسلہ میں سین اس سے علیحدہ ہے جیسے لَسَوْفَ یُعْطِیْكَ (اور آگے دیگا تجھ کو) ابو حیان نے کہا ہے کہ حرکات کے پے در پے نامناسب ہونے کے باعث سین پر لام کا آنا ممتنع ہے جیسے کہ سیندحرجہ ہے پھر باقی میں بھی یہی قاعدہ جاری ہو گیا۔ ابن بابشاہ کا بیان ہے کہ سوف کا غالب استعمال وعید اور تہدید میں ہے اور سین کا وعدہ میں، اور کبھی سوف وعدہ میں استعمال ہوتا ہے اور سین وعید میں۔"[4]

پ ۵/۲،۵،۷،۱۴،۱۸ پ ۶/۱،۷،۱۲ پ ۷/۷،۱۴ پ ۸/۳ پ ۹/۶،۷ پ ۱۱/۳،۱۰ پ ۱۲/۸
پ ۱۳/۵ پ ۱۴/۱،۶،۱۳ پ ۱۶/۲،۷،۸ پ ۱۹/۲،۳،۷ پ ۲۱/۳،۷ پ ۲۳/۹ پ ۲۴/۱،۱۳
پ ۲۵/۱،۳ پ ۲۷/۷ پ ۳۰/۹،۱۷،۱۹،۲۰،۲۷

**سُوْق** : پنڈلیاں، سَاقٌ کی جمع۔ پ ۲۳/۱۲

**سُوْقِہٖ** : کھیتی کی نالیں، اس کی جڑیں اس کے تنے۔ سُوْقِ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ

[1] تفسیر کشاف ج ۱، ص ۴۸ (طبع مصر ۱۳۵۴ھ) [2] تاج، القرطس [3] مفردات راغب [4] الاتقان، ج ۱، ص ۱۶۳ (طبع مصر)

پ ۲۶/۱۲

**سَوَّلَ**: اس نے بات بنائی، اس نے اچھا کر کے دکھایا، تَسْوِیْلٌ سے جس کے معنی نفس کے اس چیز کو کہ جس پر وہ حریص ہے مزین کرنے اور بُری کو اچھی شکل میں پیش کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب

پ ۲۶/۷

**سَوَّلَتْ**: اس نے بات بنائی، اس نے اچھا کر کے دکھایا، تَسْوِیْلٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مونث غائب، پ ۱۲/۱۲ پ ۱۳/۴ پ ۱۶/۱۴

**سُؤْلَكَ**: تیری تمنا، تیرا سوال، سُؤْلٌ اس حاجت کو کہتے ہیں جس کی طبیعت کو حرص ہو، سُؤْلَ مضاف ك ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ، امام راغب لکھتے ہیں :-

"سُؤْلٌ، اُمْنِیَّۃٌ کے قریب قریب ہے لیکن اُمْنِیَّۃٌ (تمنا) اس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو کوئی نفس نے ٹھہرالیا ہو، اور سُؤْلٌ اس تمنا کو کہا جاتا ہے جو طلب بھی کی جاچکی ہو گویا سُؤْلٌ اُمْنِیَّۃٌ کے بعد ہوتا ہے۔"

علامہ جار اللہ زمخشری، رقمطراز ہیں :-

"سُؤْلٌ بروزن فُعْلٌ بمعنی مَفْعُوْلٌ ہے جیسے کہ خُبْزٌ بمعنے مَخْبُوْزٌ اور اُکُلٌ بمعنی مَاکُوْلٌ ہے لہ"، پ ۱۶/۱۱

**سُوًی**: صاف، درمیانی، راغب لکھتے ہیں :-

"جس کی دونوں طرفیں برابر ہوں، وہ سوًی ہے یہ وصف ہو کر بھی مستعمل ہے اور ظرف ہو کر بھی اور اصل میں یہ مصدر ہے۔" پ ۱۶/۱۲

**سَوِیّ**: سیدھا، درست، صحیح، بروزن فَعِیْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ ہے، امام راغب لکھتے ہیں :-

"سَوِیٌّ اس کو کہا جاتا ہے جو مقدار اور کیفیت دونوں حیثیت سے افراط و تفریط سے محفوظ ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا (تین رات تک بھلا چنگا) اور فرمایا مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِیِّ (کون ہیں سیدھی راہ والے) او رجل سوی وہ ہے جس کے اخلاق بھی اور خلقت بھی افراط و تفریط کے اعتبار سے معتدل ہوں۔"

ابو الہیثم کا بیان ہے کہ یہ بروزن فَعِیْلٌ بمعنی مُفْتَعِلٌ یعنی مُسْتَوِی ہے جو کہ خلق اور عقل میں انتہا کو پہنچا ہوا ہو۔ لہ

اَسْوِیَاءُ جمع، پ ۱۶/۱۴

**سَوِیًّا** پ ۱۶/۴، ۵، ۶ پ ۲۹/۲

**سَوّٰی**: اس نے پورا پورا بنایا، اس نے برابر کیا،

لہ تفسیر کشاف، ج ۲، ص ۳۴۴ (طامر ۱۳۵۳ھ)

لہ تاج العروس

Marfat.com

تَسْوِیَۃٌ سے جس کے معنی کسی چیز کے بلندی یا پستی میں برابر بنانے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب،

۲۹/۱۸ ۴/۱۲

**سَوَّیْتُهٗ**: میں نے اس کو پورا پورا بنایا، میں نے اس کو برابر کیا، سَوَّیْتُ تَسْوِیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، ۱۴/۳ ۲۳/۱۴

**سَوّٰكَ**: اس نے تجھ کو پورا پورا بنایا، اس نے تجھ کو برابر کیا، اس میں کَ ضمیر واحد مذکر حاضر ہے،

۱۵/۱۲ ۳/۷

**سَوّٰهُ**: اس کو برابر کیا، اس کو پورا پورا بنایا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، ۲۱/۱۴

**سَوّٰهَا**: اس کو برابر کیا، اس کو پورا پورا بنایا اس میں ھا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے، امام راغب لکھتے ہیں:-

"آیہ شریفہ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا (اور قسم ہے جی کی اور جیسا کہ اس کو ٹھیک بنایا) میں ھا سے ان قوتوں کی طرف اشارہ ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے نفس کا قائم رکھنے والا بنایا، چنانچہ فعل کو ان ہی کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور یہ دوسرے مقام پر مذکور ہے کہ فعل کی نسبت جس طرح فاعل کی طرف درست ہے اسی طرح آلہ، نیز ان تمام اشیاء کی طرف بھی کہ جن کی فعل کو احتیاج ہوتی ہے، منسوب کرنا صحیح ہے جیسے کہ سیف قاطع (شمشیر برندہ) ہے اور یہ وجہ اس کے قول سے بہتر ہے جس نے یہ کہا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ مراد ہیں کیونکہ مَا کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے تعبیر نہیں کی جاتی کہ وہ جنس کے لئے وضع کیا گیا ہے اور نہ صحیح روایت میں اللہ تعالیٰ کے لئے اس کا استعمال سننے میں آیا ہے" ۳۰/۱۶ ۴

**سَوّٰهُنَّ**: اس نے ان کو ٹھیک کر دیا، اس نے ان کو پورا پورا بنایا، اس میں ھُنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب ہے

۱/۳

## فصل الهاء

**سُهُوْلِهَا**: اس کے نرم مقامات، سُهُوْلٌ سَهْلٌ کی جمع جس کے معنی نرم زمین کے ہیں، مضاف ہے ھا ضمیر واحد مؤنث غائب، مضاف الیہ، ۸/۱۶

## فصل الیاء المثناۃ

**سِیْٓءَ**: وہ غمگین ہوا، اسے برا معلوم ہوا، وہ ناخوش سُوْءٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب واحد ہو سُوْءٌ ۲۰ ۱۲/۷ ۲۰/۱۶

**سَیِّئٌ**: بد، برا، سُوْءٌ سے صفت مشبہ کا صیغہ، ۲۲/۱۷ . **سَیِّئًا** ۱۱/۲

**سَیِّاٰتِ**: برے کام، گناہ، سَیِّئَۃٌ کی جمع (ملاحظہ ہو سَیِّئَۃٌ) ۵/۴ ۹/۱۱،۹ ۱۱/۸ ۱۲/۷،۱۰،۲ ۱۴/۱۰،۱۲ ۲۰/۱۲،۱۳ ۲۲/۱۴ ۲۴/۱،۴،۲ ۲۵/۴،۱۸،۲۰

**سَیِّاٰتِکُمْ**: تمہارے گناہ، تمہارے اعمالِ بد، سَیِّاٰتِ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، ۳/۵ ۵/۲ ۶/۷ ۹/۱۸ ۲۶/۲۰

**سَیِّاٰتِنَا**: ہماری برائیاں، ہمارے گناہ، سَیِّاٰتِ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم، مضاف الیہ، ۴/۱۱

**سَیِّاٰتِہٖ**: اس کی برائیاں، اس کے گناہ، سَیِّاٰتِ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ۲۸/۱۵،۱۷

**سَیِّاٰتِھِمْ**: ان کی برائیاں، ان کے گناہ، سَیِّاٰتِ مضاف ھِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، ۴/۱۱ ۶/۱۲ ۱۹/۲ ۲۰/۱۳ ۲۶/۲،۵،۹

**سَیَّارَۃٌ**: کارواں، قافلہ، چلنے والے مسافر، سَیَّارٌ کا مونث جو کہ سَیْرٌ سے صفت کا صیغہ ہے اس کی تانیث جمع کے معنی کے لحاظ سے ہے، ۱۲/۱۲

**سِیْٓئَتْ**: وہ بری کردی گئی، ان کو برا معلوم ہوا سُوْءٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب (ملاحظہ ہو یُسِیْٓئَتْ) ۲۹/۲

**سِیْحُوْا**: تم پھرلو، تم سیاحت کرو، (ضَرَبَ) سَیْحٌ سے جس کے معنی زمین پر چلنا اور سفر کرنے کے ہیں، امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، ۱۰/۵

**سَیِّدًا**: سردار، سِیَادَۃٌ سے جس کے معنی سرداری کرنا اور سردار ہونے کے ہیں صفتِ مشبہ کا صیغہ سَادَۃٌ جمع، راغب اصفہانی رقمطراز ہیں :۔

"سَیِّدٌ کے معنی "متولی سواد" یعنی جماعت کے متولی کے ہیں، اور اسی کی طرف اس کی نسبت ہوتی ہے چنانچہ سید القوم بولا جاتا ہے اور سید الثوب یا سید الفرس نہیں بولا جاتا، اور کہا جاتا ہے القوم لیس دھم اور چونکہ تہذیب النفس ہونا متولی جماعت کی شرط ہے اس لئے ہر اس شخص کو کہ جو اپنی ذات کے اعتبار سے بزرگ ہو سَیِّد کہا جاتا ہے، اسی معنی میں ارشاد ہے وَسَیِّدًا وَّحَصُوْرًا (اور سردار ہوگا اور عورت کے پاس نہ جائے گا) اور فرمایا وَاَلْفَیَا سَیِّدَھَا (اور دونوں نے پایا اس کے خاوند کو) یہاں شوہر کو اپنی بیوی کا نگران ہونے کے باعث سَیِّد سے موسوم کیا گیا ہے۔"

Marfat.com

٣/٢٠

**سَیِّدَهَا**: اس کا شوہر، اس کا خاوند، سَیِّدَ مضاف هَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ۔

١٢/٣

**سَیْرَ**: چلنا۔ سَیْر کے معنی زمین پر چلنے کے ہیں۔ یہ سَارَ یَسِیْرُ کا مصدر ہے جو ضَرَبَ یَضْرِبُ سے آتا ہے۔ ٢٢/٨ ۔ سَیْرًا ٢٧/٣

**سُیِّرَتْ**: وہ چلائی گئی، وہ چلائے گئے۔ تَسْیِیْرٌ سے جس کے معنی چلانے کے ہیں۔ ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، راغب لکھتے ہیں :۔

"تَسْیِیْرٌ کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو سائر یعنی جو چلنے والے کے امر و اختیار اور ارادے سے ہو جیسے هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ (وہ تو ہے جو تم کو پھراتا ہے) اور دوسرے وہ جو بذریعہ قہر و تسخیر ہو جیسے کہ پہاڑوں کی تسخیر ہے وَاِذَا الْجِبَالُ سُیِّرَتْ (اور جب پہاڑ چلائے جائیں)"

(ملاحظہ ہو بُسَّتْ) ٢١/٢٠ ٢١

**سِیْرَتَهَا**: اس کی چال، اس کی سیرت، اس کی حالت، جس حالت پر کہ انسان یا غیر انسان ہوتا ہے خواہ وہ اس کی طبعی ہو یا اکتسابی، اس کا نام سیرۃ ہے سَیْرٌ سے اسم ہے، سِیْرَۃ مضاف، هَا ضمیر واحد مؤنث غائب، مضاف الیہ، ١٦/١

**سِیْرُوْا**: تم پھرو، تم چلو، تم سیر کرو، سَیْرٌ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، راغب نے لکھا ہے کہ :۔

"ارشادِ الٰہی سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ (سیر کرو ملک کی) میں کہا گیا ہے کہ زمین پر سیاحت جسمی مراد ہے اور بعض نے فکر کو جولاں کرنے اور اس کے احوال کی نگرانی کرنا بیان کیا ہے جس طرح کہ خبر میں مروی ہے کہ اولیاء کے وصف میں کہا گیا ہے ابدانہم فی الارض سائرۃ وقلوبہم فی الملکوت جائلۃ (ان کے بدن تو زمین پر رواں ہیں اور ان کے دل ملکوت میں جولاں ہیں) اور بعض نے اس کو بہ قوت تمام اس طرح عبادت میں لگنے پر محمول کیا ہے کہ جو ثواب تک رسائی کردے"

٢٣/٨ ٢١/٨ ٢٠/١٣، ١٣/١١ ٢٤/٨ ٢٤/٥

**سِیْقَ**: وہ ہانکا گیا (نَصَرَ) سَوْقٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو سَائِقٌ)

٢٤/٣

**سَیْلُ**: بہاؤ، سیلاب، یہ اصل میں سَالَ یَسِیْلُ کا مصدر ہے جس کے معنی بہنے کے ہیں، پھر مصدر بطور اسم سیلاب کے معنی میں استعمال ہونے لگا،

Marfat.com

اس کی جمع مُسُوْلٌ آتی ہے قرآن مجید میں اس کا استعمال بطور اسم ہی ہوا ہے، پ ۱۳ ع ۷ پ ۲۷ ع ۱۶

**سُئِلَ**: (اس مرد سے) پوچھا گیا، سوال کیا گیا، سُؤَالٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب۔ پ ۱ ع ۱۴

**سُئِلَتْ**: (اس عورت سے) پوچھا گیا، سوال کیا گیا، سُؤَالٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب۔ پ ۳۰

**سُئِلُوْا**: ان سے سوال کیا گیا، سُؤَالٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ ۲۱ ع ۱۸

**سِیْمَاهُمْ**: ان کا چہرہ، ان کی نشانی، سِیْمَا کے معنی نشانی اور علامت کے ہیں، یہ اصل میں وِسْمَی تھا، واو کو فا کلمہ کی بجائے عین کلمہ کی جگہ پر رکھا گیا جس طرح کہا اطیبلو اور یطب بولتے ہیں تو سِوْمَی ہوا پھر واو کے ساکن اور ماقبل کے مکسور ہونے کی وجہ سے واو کو یار کر لیا گیا اور سِیْمَی ہو گیا سِیْمَی مضاف ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۳ ع ۵ پ ۸ ع ۱۲، ۱۳ پ ۲۶ ع ۱۲، ۸ پ ۲۷ ع ۱۲

**سِیْنَاءُ**: سینا مشہور پہاڑ ہے، علامہ یاقوت حموی معجم البلدان میں لکھتے ہیں:۔

"سِیْنَا بکسر اول اور فتح بھی آتا ہے شام میں ایک موضع کا نام ہے جس کی طرف طُور کی نسبت کی جاتی ہے اور طُورِ سِیْنَاء کہا جاتا ہے یہ وہی پہاڑ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام سے کلام فرمایا تھا اور اسی مقام پر ان کو ندا کی گئی تھی یہ گھنے درختوں کا ہے۔

ہمارے شیخ ابو البقار کا بیان ہے کہ یہ مشہور پہاڑ کا نام ہے جب سین کو فتحہ دیا جائیگا تو اس کی ہمزہ قطعی طور پر تانیث کے لئے ہوگی کیونکہ الحاق اور تکثیر کے لئے ہمزہ کا ہونا باطل ہے اس لئے فَعْلَاء غیر مضاعف میں نہیں آیا جیسے کہ زَلْزَالٌ اور قَلْقَالٌ ہے اور سین کا کسرہ بھی جائز ہے اس صورت میں یار اس میں زائد ہوگی اور فیعال کے وزن پر ہوگا جیسے کہ دِیْبَاج اور دِیْمَاس ہیں اور ممکن ہے کہ یا اصلی ہی ہو علیار کی طرح ہوا اور اس صورت میں ہمزہ کے بجائے الحاق ہونے کی بنا پر اسے علیار کی طرح رکھا گیا ہے۔

اور اگر تم یہ دریافت کرو کہ پھر منصرف کیوں نہیں ہوا؟ تو ہم کہیں گے کہ یہ تعریف اور تانیث کے اجتماع کی وجہ سے ہے کیونکہ یہ ایک جگہ کا نام ہے اور یا اس امر میں کہ اس کی تانیث بغیر علامت

کے بے شل دمشق کے ہے اور اس مقام کے نام کے لئے سِینِیْنَ بھی آیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ طُوْرِ سِیْنِیْنَ (اور قسم ہے طور سینین کی)۔

عربی زبان میں کوئی ایسا اسم کہ جو س ی ن سے مرکب ہو بجز اس حرف کے کہ جس کا نام سین ہے نہیں ہے۔" [1]

علامہ سید محمود آلوسی بغدادی تحریر کرتے ہیں:۔

"اکثر اس پر ہیں کہ سینا عربی نہیں ہے بلکہ یا تو نبطی ہے یا حبشی اور اس کے اصل معنی اچھے یا مبارک کے ہیں، بعض اس کا عربی ہونا بھی تجویز کرتے ہیں، یا تو سَنَاءٌ بالمد سے کہ جس کے معنی رفعت کے ہیں یا سَنَا بالقصر سے کہ جس کے معنی نور کے ہیں، ابو حیان نے اس پر یہ ریمارک کیا ہے کہ دونوں مادے مختلف ہیں کیونکہ سَنَاءٌ ہو یا سَنَا (دونوں) کا عین کلمہ نون ہے اور سیناء کا عین کلمہ یاء ہے، مگر یہ اس طرح رد کر دیا گیا ہے کہ جو اس کا قائل ہے وہ اس کا وزن فَیْعَالٌ بتاتا ہے اور عین کلمہ نون اور یاء کو زائد اور ہمزہ کو واو سے تبدیل شدہ قرار دیتا ہے۔" [2]

اور شیخ سلیمان جمل، علامہ سہیلی سے ناقل ہیں کہ ...

"صحیح یہی ہے کہ سِیْنَاء عجمی نام ہے عرب جب اس کو بولنے لگے تو ان کے تلفظ مختلف ہو گئے چنانچہ انہوں نے سِیْنَاءٌ کو حَمْرَاءُ کی طرح سے اور سِیْنَاءٌ عِلْبَاءٌ کی طرح سے اور سِیْنِیْنَ قِنْدِیْل کی طرح سے کہا۔" [3]

واضح رہے کہ جس طرح اس کے تلفظ میں اختلاف ... اسی طرح اس کے معنی میں بھی اختلاف ہے بعض ... اس کے معنی مبارک کے، بعض نے حسن یعنی اچھے ... کے، بعض نے گھنے درختوں والے کے بیان ... ہیں اور بعض نے اس کو مشہور پہاڑ کا نام ... امام ابن جریر طبری ان سب اقوال کو اپنی تفسیر ... نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:۔

"صحیح قول اس بارے میں یہ ہے کہ یوں ... جائے کہ سینا اسم ہے، طور کی طرف ... کی اضافت ہے جس کے ذریعہ وہ مشہور ... جس طرح سے کہ جبل اُحد کہا گیا ہے کہ اُحد کی ... طرف ان کی اضافت ہے اور اگر اس بارے ... میں بات وہ ہوتی جو کہ ان لوگوں نے بیان ...

---

[1] معجم البلدان، ج ۵، ص ۲۰۱ (طبع مصر ۱۳۲۴ھ)

[2] روح المعانی، ج ۱۸، ص ۲۰ (طبع مصر)

[3] حاشیۃ الجمل علی الجلالین، ج ۳، ص ۱۸۷ (طبع مصر ...)

Marfat.com

ہے جنہوں نے اس کے معنی جبل مبارک (کوہِ مبارک) کے بیان کئے ہیں یا جنہوں نے کہا اس کے معنی حسن (اچھا) کے بتائے ہیں تو طور پر تنوین ہونی چاہیے تھی اور سینا اس کی صفت ہوتی علاوہ ازیں سینا بمعنے مبارک یا حسن کلامِ عرب میں مشہور نہیں کہ اس کو پہاڑ کی صفت قرار دیا جائے لیکن بات اس سلسلہ میں فیصلہ کن وہی ہے جو حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمائی ہے کہ سینا پہاڑ ہے جو اس نام سے مشہور ہے، حضرتِ موسیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی پر خطاب کیا گیا تھا اور یاں ہر وہ پہاڑ مبارک بھی ہے نہ کہ سینا کے معنی مبارک کے ہیں۔[1] پ ۱۸/۲

**سِيْنِيْنَ**: سینین، کوہِ سینا کو سینین بھی کہا جاتا ہے۔ پ ۳۰/۲

**سَيِّئَةٌ**: برائی، گناہ، فعلِ بد، حَسَنَةٌ کی ضد ہے سَيِّئَةٌ اصل میں سَيْوِئَةٌ تھا، واو کو یٰ سے بدل کر یاء کا یاء میں ادغام کر دیا گیا ہے، راغب لکھتے ہیں:-

"حَسَنَةٌ اور سَيِّئَةٌ دو قسم پر ہیں ایک باعتبارِ عقل و شرع جیسے وہ کام کہ جن کا مذکور آیتِ شریفہ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا (جو کوئی لاتا ہے ایک نیکی تو اس کے لئے اس کا دس گنا ہے اور جو کوئی لاتا ہے ایک برائی سو سزا پائیگا اسی کے برابر) میں ہے، دوسرے حسنہ اور سیئہ باعتبارِ طبع کہ طبیعت پسند کرے یا گراں جانے جیسے ارشاد ہے فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ (پھر جب پہنچی ان کو بھلائی کہنے لگے یہ ہے ہمارے لائق اور اگر پہنچی برائی تو نحوست بتلانے لگے موسیٰ کی اور اس کے ساتھ والوں کی)"

پ ۱/۹، پ ۴/۳، پ ۵/۸، پ ۶/۷، پ ۹/۶،۲، پ ۱۱/۸، پ ۱۳/۹،۷، پ ۱۶/۶، پ ۱۹/۱۹، پ ۲۰/۱۲،۹،۳، پ ۲۱/۷، پ ۲۴/۱۹،۱۰، پ ۲۵/۶،۵۔

**سَيِّئُهٗ**: اس کی بری چیز، سَيِّئُ مضاف ہ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ (ملاحظہ ہو سَيِّئُ) پ ۱۵/۴

---

[1] تفسیر امام ابن جریر، ص ۱۰، ص ۱۸ (طبع مصر)

# باب الشین المعجمة

## فصل الالف

**شَآءَ**: اس نے چاہا، اس نے ارادہ کیا (مَشِیْئَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب' شَآءَ اصل میں شَیِءَ تھا، یٰ متحرک، ماقبل مفتوح، اس لئے یٰ کو اٰ سے بدل لیا گیا۔

امام راغب لکھتے ہیں :۔

اکثر متکلمین کے نزدیک مَشِیْئَۃٌ بالکل اِرَادَۃٌ کی طرح ہے، اور بعض کے نزدیک مشیئۃ نام ہے، اصل میں کسی شے کے ایجاد کرنے اور چاہنے کا گو عرف میں اس کا استعمال ارادہ ہی کی جگہ ہوتا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مشیئۃ کے معنی ایجاد کرنے کے ہیں اور لوگوں کی طرف سے مشیت کے معنی چاہنے کے' ان کا بیان ہے کہ (کسی شے کے متعلق) اللہ تعالیٰ کی مشیت ہونا اس امر کا مقتضی ہے کہ (اس) شے کا وجود عمل میں آجائے اور اللہ کے ارادہ کا ہونا اس کا مقتضی نہیں کہ مراد لامحالہ وجود پذیر ہو کر ہی رہے دیکھئے نہیں ارشاد ہے یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ (اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں چاہتا تم پر دشواری) اور وَمَا اللّٰہُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (اور اللہ بے انصافی نہیں چاہتا بندوں پر) حالانکہ معلوم ہے کہ کبھی کبھی تنگی بھی ہوتی ہے اور لوگوں کے مابین ظلم بھی۔

یہ لوگ ان دونوں کے مابین یہ فرق بتاتے ہیں کہ انسانی ارادہ کبھی بغیر ارادہ الٰہی کے تقدم کے بھی حاصل ہو جاتا ہے چنانچہ انسان کا ارادہ ہوتا ہے کہ اسے موت نہ آئے اور اللہ تعالیٰ اس سے اِبا فرماتا ہے لیکن مشیتِ انسانی بغیر مشیتِ الٰہی کے وجود میں نہیں آتی کیونکہ ارشاد ہے وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ (اور تم نہیں چاہو گے مگر جو چاہے اللہ) مروی ہے کہ جب یہ آیت اتری لِمَنْ شَآءَ مِنْکُمْ اَنْ یَّسْتَقِیْمَ (جو کوئی چاہے تم میں سے کہ سیدھا چلے) تو کافر کہنے لگے معاملہ تو ہمارے

اختیار میں ہے چاہیں سیدھے چلیں چاہیں نہ چلیں اس پر اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ۔

اور بعض علماء نے کہا ہے کہ اگر امور تمام تر اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف نہ ہوتے اور ہمارے افعال کی اس پر تعلیق و انحصار نہ ہوتا تو لوگ اپنے تمام کاموں میں ان شاء اللہ کے ذریعہ استثناء کی تعلیق پر متفق نہیں ہو سکتے تھے جیسے سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ، سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا، يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ، اُدْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ، قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ، وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا، وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ"

۱/۹،۲ ، ۲/۱۱ ، ۳/۲،۱ ، ۴/۹ ، ۶/۱۱ ، ۷/۱۰،۱۹ ، ۸/۱،۲،۳،۵ ، ۹/۸
۱۰/۷ ، ۱۱/۷،۱۰،۱۵ ، ۱۲/۳،۹،۱۰ ، ۱۳/۵ ، ۱۴/۷،۱۱،۱۹ ، ۱۵/۱۶،۱۷،۲۱ ، ۱۹/۲،۱۶
۱۷/۱۳ ، ۲۰/۳،۶ ، ۲۱/۱۹ ، ۲۳/۷ ، ۲۴/۶،۱۶ ، ۲۵/۲،۸ ، ۲۶/۱۲ ، ۲۹/۳،۱۱،۱۶،۲۰
۳۰/۲،۵،۷،۱۲

**شَاخِصَةٌ**: کھلی کی کھلی رہ جانے والی۔ شُخُوْصٌ سے جس کے بحیثیت معنی آنکھوں کے کھلے کے کھلے رہ جانے کے ہیں، اسمِ فاعل کا صیغہ واحد مؤنث غائب (ملاحظہ ہو تَشَخَّصُ) ۱۷/۷

**شَارِبُوْنَ**: پینے والے، شُرْبٌ سے اسمِ فاعل کا صیغہ جمع مذکر، شَارِبٌ کی جمع بحالتِ رفع (ملاحظہ ہو اِشْرَبُوْا اور شُرْبٌ) ۱۷/۱۵

**شَارِبِيْنَ**: پینے والے، شُرْبٌ سے اسمِ فاعل کا صیغہ جمع مذکر، شَارِبٌ کی جمع بحالتِ نصب و جر ۶/۱۴، ۲۳/۲

**شَارِكْهُمْ**: تو ساجھا کر ان سے، تو ان کا شریک ہو جا، شَارِكْ مُشَارَكَةٌ سے جس کے معنی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہونے کے ہیں، امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب،

راغب لکھتے ہیں :-

"شِرْكَةٌ اور مُشَارَكَةٌ کے معنی دو ملکوں کے ملجانے کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ کسی ایسی شے کا پایا جانا جو دو یا دو سے زائد کے لئے ہو خواہ وہ شے ذات ہو یا وصف جیسے کہ حیوان ہونے میں انسان اور گھوڑے کا باہم شریک ہونا یا ایک گھوڑے کا دوسرے گھوڑے کے ساتھ کمیت یا شکل میں شریک ہونا" ۱۵/۷

شَاطِئٌ: کنارہ، شَوَاطِئُ جمع، ۳۰/۲

شَاعِرٌ: شاعر، شعر کہنے والا، شِعَارَۃٌ سے جس کے معنی شاعر ہونے کے ہیں، اسمِ فاعل کا صیغہ واحد مذکر، شُعَرَآءُ جمع، (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو شِعْر) ۱/۱۷ ۶/۲۳ ۴/۲۷ ۶/۲۹

شَافِعِیْنَ: سفارش کرنے والے، شَفَاعَۃٌ سے اسمِ فاعل کا صیغہ جمع مذکر، شَافِعٌ کی جمع بحالتِ نصب و جر، (ملاحظہ ہو شَفَاعَۃ) ۹/۱۹ ۱۶/۲۹

شَاقُّوْا: وہ مخالف ہوئے، مُشَاقَّۃٌ شِقَاقٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب (ملاحظہ ہو تُشَاقُّوْنَ اور شِقَاقٌ) ۱۶/۹ ۸/۲۶ ۴/۲۸

شَاكِرٌ: قدر دان، حق ماننے والا، شُکْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، امامِ راغب لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو جب شکر سے متصف کیا جائے تو اس سے اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر انعام فرمانا اور جو کچھ عبادت کہ انہوں نے دا کی ہے اس کی جزا دینا مراد ہوتا ہے (ملاحظہ ہو شُکْرٌ اور شُکُوْرٌ) شَاكِرًا ۱۸/۵ ۲۲/۱۷ ۱۹/۲۹

شَاكِرُوْنَ: حق ماننے والے، شکر گزار، شُکْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، شَاكِرٌ کی جمع بحالتِ رفع، ۶/۱۴

شَاكِرِيْنَ: شکر گزار، شکر کرنے والے، احسان ماننے والے، شُکْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر شَاكِرٌ کی جمع بحالتِ نصب و جر، ۲/۴ ۱۲/۱۴ ۹/۶ ۱۴/۷ ۸/۱۱ ۴/۲۴

شَاكِلَتِهٖ: اس کا ڈھنگ، شَاكِلَۃٌ شَکْلٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث مضاف ہے، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، علامہ ابوحیان اندلسی لکھتے ہیں:-

"شاکلہ کے معنی اس طریقہ اور روش کے ہیں کہ جو اس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے، فراء کا بیان یہی ہے اور یہ شکل سے ماخوذ ہے، کہا جاتا ہے لست علی شکلی و لا شاکلتی (تو میرے طریقہ اور روش پر نہیں ہے) شکل کے معنی مثل اور نظیر کے ہیں اور شکل بالکسر کے معنی ہیئت کے ہیں، بولتے ہیں جاریۃ حسنۃ الشکل (اچھی شکل کی لڑکی)" [۱]

راغب اصفہانی رقمطراز ہیں:-

"ارشادِ الٰہی کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاكِلَتِهٖ (ہر ایک کام کرتا ہے اپنے ڈھنگ پر) یعنی ہر کسے آں کند کز و شاید یعنی اس سجیۃ (طبیعت) پر کہ جس کا تم نے اسے پابند کیا ہے، کیونکہ سجیۃ کا غلبہ

---

[۱] البحر المحیط، ج ۶، ص ۶۸

انسان پر چھائے رہتا ہے جیسا کہ میں نے الذریعۃ الیٰ مکارم الشریعہ میں بیان میں کیا ہے، یہ آیت بھی اسی طرح کی ہے جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد کُلٌّ میسّرٌ لما خلق لہ (ہر ایک کے لئے وہی چیز آسان ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے") ۱۵/۹

**شٰمِخٰتٍ** : اونچے، بلند، شُمُوْخٌ سے جس کے معنی بلند ہونے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ جمع مؤنث شَامِخَۃٌ کی جمع، ۲۹/۲۱

**شَاْنٍ** : دھندا، فکر، حال، کسی اہم معاملہ یا حال کو خواہ بُرا ہو یا بھلا شَاْن کہتے ہیں، شُئُوْنٌ جمع، ۱۱/۱۲ ۲۷/۱۲ ۳۰/۵

**شَاْنِھِمْ** : ان کا کام، ان کا معاملہ، شَاْن مضاف ھِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، ۱۸/۱۵

**شَانِئَكَ** : تیرا دشمن، شَانِئٌ شَنْأٌ سے جس کے معنی دشمن رکھنے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر مضاف ہے، کَ ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ، ۳۰/۲۳

**شَاوِرْھُمْ** : تو ان سے مشورہ کر، شَاوِرْ مُشَاوَرَۃٌ سے جس کے معنی باہم مشورہ کرنے کے ہیں امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر، ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ۴/۸

**شَاھِدٌ** : گواہ، حاضر ہونے والا، بتانے والا، شَھَادَۃٌ اور شُھُوْدٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء گرامی میں سے ہے کیونکہ آپ قیامت میں امت کے گواہ اور دنیا میں تعلیم ربانی کے بتانے والے ہیں (ملاحظہ ہو شَھَادَۃٌ) ۱۲/۱۳،۱۲ ۲۶/۱ ۳/۱۰، شَاھِدًا ۲۲/۲ ۲۶/۹ ۲۹/۱۳

**شَاھِدُوْنَ** : گواہ، حاضر ہونے والے، شَھَادَۃٌ اور شُھُوْدٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، شَاھِدٌ کی جمع بحالت رفع، ۲۳/۹

**شَاھِدِیْنَ** : گواہ، ماننے والے، شہادت دینے والے، شَھَادَۃٌ اور شُھُوْدٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، شَاھِدٌ کی جمع بحالت نصب و جر، ۳/۱۳،۱۲ اور ۷/۵ ۱۰/۹ ۱۷/۶،۵ ۲۰/۸

## فصل الباء الموحدۃ

**شُبِّهَ** : وہی صورت بنادی گئی، مانند کر دیا گیا، تَشْبِیْہٌ سے جس کے معنی کسی چیز کو کسی چیز کے مانند کر دینے کے ہیں، ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب۔ ۶/۲

Marfat.com

## فصل التاء المثناة

**شِتَاۤءِ**: جاڑا، موسم سرما، اَشْتِیَۃٌ جمع بعض علماء نے شِتَآء کو شَتْوَۃٌ کی جمع بتلایا ہے (ملاحظہ ہو سَنَۃ) ۳۰/۱۴

**شَتّٰی**: طرح طرح، جدا جدا، مختلف، متفرق، پراگندہ، بعض کے نزدیک یہ لفظ مفرد ہے اور بعض نے اس کو شَتِیْتٌ کی جمع بیان کیا ہے۔

۱۶/۱۱ ۲۸/۵ ۳۰/۱۷

## فصل الجیم المعجمۃ

**شَجَرٌ**: درخت۔ اَشْجَارٌ جمع۔ ۱۴/۸

۱۴/۹ ۲۳/۴ ۲۷/۱۵،۱۱

**شَجَرَ**: اختلاف ہوا، جھگڑا ہوا (نصر) شُجُوْرٌ سے جس کے معنی آپس میں جھگڑنے اور اختلاف کرنے کے ہیں۔ ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ۵/۶

**شَجَرَۃٌ**: درخت، واحد مونث ہے، اس کی جمع شَجَرَاتٌ آتی ہے۔ ۱/۲ ۵/۹ ۱۳/۱۶ ۱۵/۶

۱۶/۶ ۱۸/۱۱،۱ ۲۰/۷ ۲۱/۱۲ ۲۳/۹،۶ ۲۵/۱۶ ۲۶/۱۱

**شَجَرَتِہَا**: اس کا درخت۔ شَجَرَۃَ مضاف ھا ضمیر واحد مونث غائب مضاف الیہ، ۲۷/۱۵

**شَجَرِھَا**: اس کا درخت، شَجَر مضاف ھا ضمیر واحد مونث غائب، مضاف الیہ، ۳۰

## فصل الحاء المہملۃ

**شُحَّ**: خود غرضی، کنجوسی، بخل، حرص، راغب لکھتے ہیں کہ "شح وہ بخل ہے جس میں حرص ہو اور عادت بن گیا ہو" اردو میں اس کے لئے خود غرضی کا لفظ موزوں ہے، یہ مصدر ہے، اس کا فعل باب عَلِمَ، ضَرَبَ اور نَصَرَ تینوں سے آتا ہے، ۵/۱۶ ۲۸/۹،۱۶

**شُحُوْمَہُمَا**: ان دونوں کی چربی، شُحُوْمٌ شَحْمٌ کی جمع جس کے معنی چربی کے ہیں، مضاف ہے، ھُمَا ضمیر تثنیہ مونث غائب، مضاف الیہ، ۸

## فصل الدال المہملۃ

**شِدَادٌ**: سخت، زبردست، مضبوط، شَدِیْدٌ کی جمع (ملاحظہ ہو اَشِدَّاۤءُ اور شَدِیْدٌ)

۱۲/۱۶ ۲۹/۱۹ **شِدَادًا** ۳۰

**شَدَدْنَا**: ہم نے قوت دی، ہم نے مضبوط کیا، (نصر و ضرب) شَدٌّ سے جس کے معنی مضبوط باندھنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ جمع متکلم، راغب نے لکھا ہے کہ شِدَّۃٌ کا استعمال باندھنے کے لئے بھی

ہوتا ہے اور بدن کے بارے میں بھی اور نفس کی قوتوں کے متعلق بھی اور عذاب کے واسطے بھی، ۲۳/۱۱ ۲۹/۲

**شُدُّوْا**: تم مضبوط باندھو، شَدٌّ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، ۲۶/۴

**شَدِیْدٌ**: سخت، مستحکم، پکا، شَدٌّ سے بروزن فَعِیْلٌ صفتِ مشبہ کا صیغہ، واضح رہے کہ شَدِیْدٌ کے معنی بخیل کے بھی آتے ہیں جیسے وَاِنَّہٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ (اور آدمی مال کی محبت میں بخیل ہے) اس صورت میں فَعِیْلٌ بمعنے مَفْعُوْلٌ بھی ہو سکتا ہے گویا مَشْدُوْدٌ یعنی بندھا ہوا ہے اور بمعنی فاعل بھی کہ اس نے اپنی تھیلی باندھ رکھی ہے۔

۱/۴،۸،۱۰ ۳/۹،۱۰ ۶/۵ ۷/۳ ۸/۲ ۹/۱۶،۱۷ ۱۰/۲،۳
۱۱/۱۲ ۱۲/۷،۱۹ ۱۳/۷،۸،۱۳،۱۴ ۱۵/۱ ۱۷/۸ ۱۸/۴ ۱۹/۱۸
۲۲/۱۲،۱۳،۱۴ ۲۳/۱۱ ۲۴/۴،۸ ۲۵/۳،۴ ۲۶/۱۰،۱۲ ۲۷/۵،۱۹
۲۸/۴،۵ ۳۰/۱۰،۲۵

**شَدِیْدًا** ۳/۱۴ ۹/۱۱ ۱۵/۶،۱۲ ۱۹/۱۷ ۲۱/۱۸ ۲۴/۱۸
۲۸/۳،۱۸ ۲۹/۱۱

## فصل الراء المھملۃ

**شَرٌّ**: برائی، شر جس سے سب کو نفرت ہو وہ شر ہے، اس کی تحقیق سابق میں لفظِ خیر کے ضمن میں گزر چکی ہے اور وہیں اس کے انواع کا بھی مذکور ہو چکا ہے، شُرُوْرٌ جمع، ۲/۱۰ ۴/۹ ۶/۱۳ ۹/۱۷ ۱۰/۳ ۱۱/۷
۱۳/۳ ۱۵/۲،۹ ۱۶/۸ ۱۷/۳،۱۶ ۱۹/۱ ۲۳/۱۳ ۲۵/۱
۲۹/۷،۱۹ ۳۰/۲۳،۲۸،۲۹

**شَرًّا** ۱۸/۸ ۳۰/۲۴

**شَرَابٌ**: پینے کی چیز، ہر وہ چیز کہ جس کو چبانا نہ پڑے بلکہ پیا جائے عربی میں اس کے لئے شراب کا لفظ استعمال ہوتا ہے، اَشْرِبَۃٌ جمع، ۷/۱۴ ۱۱/۶
۱۴/۸،۱۵ ۱۵/۱۶ ۲۳/۱۲ **شَرَابًا** ۲۹/۱۹ ۳۰/۱

**شَرَابِکَ**: تیرے پینے کی چیز، شَرَابٌ مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ، ۳/۲

**شَرَابُہٗ**: اس کے پینے کی چیز، شَرَابٌ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ۲۲/۱۴

**شَرِبَ**: اس نے پیا، شُرْبٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، (ملاحظہ ہو اِشْرَبُوْا) ۲/۱۷

**شُرْبٌ**: پینا، شَرِبَ یَشْرَبُ کا مصدر ہے ۲۷/۱۵

**شِرْبٌ**: پانی پینے کی ایک باری، پانی کا ایک حصہ، شُرْبٌ سے اسم ہے، اَشْرَابٌ جمع، ۱۹/۱۲
۲۷/۹

**شَرِبُوْا**: انہوں نے پیا، شُرْبٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، ۲/۱۷

Marfat.com

شَرَحَ: اس نے دل کھولا شَرْحٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، اصل میں شَرْحٌ کے معنی گوشت وغیرہ کے پھیلانے کے ہیں "شرح صدر" کا مطلب سینہ کا نورِ الٰہی سے کشادہ ہونا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسکین و تقویت کا پانا ہے (ملاحظہ ہو اِشْرَحْ) ۲۰/۱۴ ۱۷/۲۳

شَرِّدْ: تو ایسی سزا دے کہ دوسرے دیکھ کر بھاگ جائیں، تَشْرِیْدٌ سے جس کے معنی ایسی سزا دینے کے ہیں کہ دوسرے دیکھ کر بھاگ جائیں، امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، ۲/۱۰

شِرْذِمَةٌ: تھوڑے سے آدمی، قلیل جماعت شَرَاذِمُ اور شَرَاذِیْمُ جمع، ۸/۱۹

شَرَرٍ: شرارے چنگاریاں، شَرَرَةٌ واحد، ۲۱/۲۹

شَرَعَ: اس نے راہ ڈالی، (فتح) شَرْعٌ سے جس کے معنی صاف راستے پر چلنے اور راہ ڈالنے کے آتے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب،

راغب لکھتے ہیں:-

"ارشادِ الٰہی شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ (راہ ڈال دی تمہارے لئے دین میں) میں ان اصول کی طرف اشارہ ہے کہ جن میں ساری ملتیں برابر ہیں اور جن کا نسخ صحیح نہیں جیسے حق تعالےٰ شانہ کی معرفت اور اسی طرح کے وہ امور کہ جن کو آیہ کریمہ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (اور جو کوئی یقین رکھے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور کتابوں پر اور رسولوں پر اور قیامت کے دن پر) بتلا رہی ہے۔"

حضرت الاستاذ علامہ محمود حسن خاں ٹونکی مدظلہم نے اسی آیت سے یہ نکالا ہے کہ شریعتِ سماویہ کی ابتدار حضرتِ نوح علیہ السلام کے عہد سے ہوئی ہے، اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:-

"نوح علیہ السلام کے عہد سے شریعتِ سماویہ یعنی اسلام کی ابتداء ہوئی ہے قال سبحانہ تعالیٰ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا الآية، یہ آیت جو پچیسویں پارے میں ہے صاف تاریخ ہے ابتداء شریعت اسلام کی۔ نوح علیہ السلام سے پہلے دین و مذہب محض فطری تھا یعنی خالق عالم ذاتِ واحد ہے اور بس، اسی کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیان فرمایا ہے وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا یہ اختلاف بعثِ انبیاء علیہم السلام کے بعد خلق اللہ نے پیدا کیا ہے:" ۲/۵

**شُرَّعًا**: پانی کے اوپر ظاہر ہونے والے شَارِعٌ کی جمع، جو شَرَعَ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ہے، شَرَعَ کے معنی ظاہر ہونے اور پانی کے اندر آنے کے بھی آتے ہیں، ۹/۱۱

**شَرَعُوْا**: انہوں نے راہ ڈالی، شَرَعَ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، ۲۵/۲

**شِرْعَةً**: دستور، شَرَعَ سے اسم ہے امام راغب لکھتے ہیں:۔

"شَرَعَ کے معنی ہیں صاف راستہ پر چلنے کے، کہا جاتا ہے شرعت طریقا اور شرع مصدر ہے بعد میں اسے طریق واضح (صاف راستہ) کا اسم قرار دیا گیا، چنانچہ شِرْعٌ، شَرْعٌ اور شَرِیْعَةٌ استعمال ہونے لگا نیز طریقہ النبیہ کے لئے اس کا استعارہ کر لیا گیا ارشاد ہے شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا، یہ دو باتوں کی طرف اشارہ ہے ایک تو وہ راہ کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو مسخر فرما رکھا ہے کہ وہ اسی طریق کا طالب ہے جو بندوں کی مصلحتوں اور شہروں کی آبادی کی طرف عائد ہو ارشاد الٰہی وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (اور ہم نے بلند کر دئے درجے بعض کے بعض پر کہ ٹھہراتا ہے ایک دوسرے کو خدمتگار) میں اسی کی طرف اشارہ ہے، دوسرے وہ دین کہ جس کا اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا اور حکم دیا ہے کہ انسان اپنے اختیار سے اس کا قصد کرے جس میں شرائع کا اختلاف اور نسخ واقع ہوتا ہے آیۂ شریفہ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰی شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا (پھر تجھ کو رکھا ہم نے ایک رستہ پر دین کے کام کے تو اسی پر چل) نے اسی کو بیان کیا ہے۔"

اور علامہ سید مرتضٰی زبیدیؒ "تاج العروس" میں رقمطراز ہیں:۔

"مفسرین کے اقوال شرعۃ اور منہاج کی تفسیر میں مختلف ہیں بعض نے کہا ہے کہ شرعۃ دین اور منہاج طریق ہے، اور بعض کا قول ہے کہ دونوں کے معنی طریق ہی کے ہیں اور طریق سے مراد یہاں دین ہی ہے لیکن جب لفظ مختلف ہوں تو متعدد الفاظ کو اس لئے لایا جاتا ہے تاکہ اس قصہ اور معاملہ کی تاکید ہو جائے، عنترہ کہتا ہے ؏

اقوی واقفر بعدام الهیثم

کہ اقوی اور اقفر دونوں کے معنی ایک ہی

ہیں خلوت کے، لیکن دو لفظوں کا ہونا خلوت کے معنی کی تاکید کرتا ہے، حضرتِ ابنِ عباس (رضی اللہ عنہما) نے کہا ہے کہ شرعۃ اور منہاج کے معنی سبیل اور سنت (راہ اور طریقے) کے ہیں اور مفردات میں آپ سے یہ منقول ہے کہ شرعۃ وہ ہے جس کو قرآن لیکر آیا اور منہاج وہ ہے جو سنت میں وارد ہوا، قتادہ نے شرعۃ و منہاجا کی تفسیر میں کہا ہے کہ دین ایک و شریعت مختلف۔[1]

۶ ب ۱۱

شَرْقِيًّا: شرقی، مشرق کی سمت والا، شرق کے معنی جانب مشرق کے ہیں جس طرف سے سورج نکلتا ہے اور ی اس میں نسبت کے لئے ہے، ۱۶ ب

شَرْقِيَّةً: شرقی، مشرق کی سمت والی اس میں تاء تانیث کی ہے، ۱۸ ب ۱۱

شِرْكٌ: شرک ساجھا، ساجھی بنانا شریک ٹھہرانا، شِرْكَةٌ اور اِشْرَاكٌ سے اسم ہے۔

مولانا شاہ عبد القادر صاحب دہلوی موضح القرآن میں سورہ بقرہ میں زیر آیہ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ رقطراز ہیں :-

"شرک یہ کہ اللہ کی صفت کسی اور میں جانے مثلاً کسی کو سمجھے کہ اس کو ہر بات معلوم ہے یا وہ جو چاہے کر سکتا ہے، یا ہمارا بھلا یا برا کرنا اس کے اختیار میں ہے اور یہ کہ اللہ کی تعظیم کسی اور پر خرچ کرے مثلاً کسی چیز کو سجدہ کرے اور اس سے حاجت مانگے اس کو مختار جان کر۔"

اور سورہ نساء میں زیر آیہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ ب ۱ یہ تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"اوپر سے ذکر تھا منافقوں کا جو پیغمبر کے حکم پر راضی نہ ہوا اور جدی راہ چلے یہ آیت فرمائی کہ اللہ شرک نہیں بخشتا تو شرک فرمایا حکم میں شریک کرنے کو یعنی سوائے دین اسلام کے اور دین پسند رکھے اور اس پر چلے پس جو دین ہے سوائے اسلام کے سب شرک ہے اگرچہ پوجنے میں شرک نہ کرتے ہوں۔"

اور سورہ انعام میں زیر آیہ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ فرماتے ہیں :-

"شرک فقط یہی نہیں کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجئے بلکہ شرک کے حکم میں ہے کہ اور کا مطیع ہو جائے۔"

اور اسی سورۃ میں زیر آیۃ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ

[1] فصل الشین من باب العین

مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا لکھتے ہیں:۔

"اب جاننا چاہیے کہ اللہ کی نیاز دینی یہ کہ اس کی راہ میں جن کو دلوا دے ان کو دینا اس کا فائدہ اس کو نصیب پہنچنا اس کی حکم برداری ہے اور چیز سے فقیر کو فائدہ اور ثواب سے فائدہ دینے والے کو، پھر جو کسی بزرگ کے واسطے کچھ دے اگر اسی وضع پر دے شرک ہے جس پر اللہ نے الزام دیا مگر اس بزرگ کو اپنی جگہ ٹھہرا دے کہ اس کی طرف سے اللہ کی راہ میں جن کو کہا ہے ان کو دے تو حکم برداری اللہ کی اور چیز فقیر کو اور ثواب اس شخص کے بدلے اس بزرگ کو"،

اور سورۂ یونس میں زیر آیۃ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ ارقام فرماتے ہیں کہ:۔

"اللہ ہی کی طرف سب آخر کو کھینچے جائیں گے تو بس اللہ ایک ہے اس کے سوائے کی طرف رجوع کرنا حماقت سے شرک کرنا ہے"

اور سورۂ نحل میں زیر آیۃ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ، فرماتے ہیں کہ:

"مشرک کہتے ہیں کہ مالک اللہ ہی ہے یہ لوگ اس کی سرکار میں مختار ہیں"

اور سورۂ حج میں زیر آیۃ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا مرقوم ہے:۔

"یعنی مواشی ذبح کرنے نیاز اللہ کی ہر دین میں عبادت رکھا ہے اس کے سوائے اور کی نیاز ذبح کرنا اس کی عبادت ہو گئی تو شرک ہوا"

شاہ صاحب موصوف نے شرک کے متعلق متفرق مقامات پر مختصر الفاظ میں جو کچھ فرمایا ہے ان کے بھتیجے مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے "تقویۃ الایمان" میں اسی کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، فرماتے ہیں:۔

"سمجھنا چاہیے کہ شرک اسی پر موقوف نہیں کہ کسی کو اللہ کے برابر سمجھے اور اس کے مقابل جانے بلکہ شرک کے معنی یہ ہیں کہ جو چیزیں اللہ نے اپنے واسطے خاص کی ہیں اپنے بندوں کے ذمہ نشان بندگی کے ٹھہرائے ہیں، وہ چیزیں کسی اور کے واسطے کرنی، اب یہ بات تحقیق کی چاہیے کہ اللہ صاحب نے کون کونسی چیزیں اپنے واسطے خاص کر رکھی ہیں کہ اس میں کسی کو شریک نہ کیا چاہیے سو وہ باتیں بہت ساری ہیں مگر کئی باتوں کا ذکر کر دینا ضروری ہے تا اور باقی باتیں ان سے لوگ سمجھ لیں۔

Marfat.com

سو اول بات یہ کہ ہر جگہ حاضر و ناظر رہنا اور ہر چیز کی خبر ہر وقت رکھنی، دور ہو یا نزدیک چھپی ہو کھلی، اندھیرے میں ہو یا اجالے میں، آسمانوں میں ہو یا زمینوں میں، پہاڑوں کی چوٹی پر ہو یا سمندر کی تہ میں، یہ اللہ ہی کی شان ہے اور کسی کی یہ شان نہیں، سو جو کوئی کسی کا نام اٹھتے بیٹھتے لیا کرے اور دور و نزدیک سے پکارا کرے اور بلا کے مقابلہ میں اس کی دہائی دیوے اور دشمن پر اس کا نام لے کر حملہ کرے اور اس کے نام کا ختم پڑھے یا شغل کرے یا اس کی صورت کا خیال باندھے اور یوں سمجھے کہ جب میں اس کا نام لیتا ہوں زبان سے یا دل سے یا اس کی صورت کا یا اس کی قبر کا خیال باندھتا ہوں تو وہیں اس کو خبر ہو جاتی ہے اور اس سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی اور جو مجھ پر احوال گزرتے ہیں جیسے بیماری، تندرستی، کشائش و تنگی، مرنا جینا، غم و خوشی سب کی ہر وقت اسے خبر ہے اور جو بات میرے منہ سے نکلتی ہے وہ سب سن لیتا ہے اور جو خیال و وہم میرے دل میں گزرتا ہے وہ سب سے واقف ہے ان باتوں سے مشرک ہو جاتا ہے اور اس قسم کی باتیں

شرک ہیں، اس کو اشراک فی العلم کہتے ہیں یعنی اللہ کا سا علم اور کو ثابت کرنا، سو اس عقیدہ سے آدمی البتہ مشرک ہو جاتا ہے خواہ یہ عقیدہ انبیا اولیاء سے رکھے خواہ پیر شہید سے رکھے خواہ امام و امام زادہ سے خواہ بھوت و پری سے پھر خواہ یوں سمجھے کہ یہ بات ان کو اپنی ذات سے خواہ اللہ کے دینے سے، غرض اس عقیدہ سے ہر طرح شرک ثابت ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ عالم میں ارادہ سے تصرف کرنا اور اپنا حکم جاری کرنا اور اپنی خواہش سے مارنا اور جلانا اور روزی کی کشائش او تنگی کرنی اور تندرست اور بیمار کرنا، فتح و شکست دینی، اقبال و ادبار دینا، مرادیں پوری کرنی، حاجتیں برلانی، بلائیں ٹالنی، مشکل میں دست گیری کرنی، برے وقت میں پہنچ یہ سب اللہ ہی کی شان ہے اور کسی نبی ولی کی، پیر و شہید کی، بھوت و پری کی یہ شان نہیں، جو کوئی کسی کو ایسا تصرف ثابت کرے اور اس سے مرادیں مانگے اور اس توقع نذر و نیاز کرے اور اس کی منتیں مانے اس کو مصیبت کے وقت پکارے، وہ مشرک

Marfat.com

ہو جاتا ہے اور اس کو "اشراک فی التصرف" کہتے ہیں یعنی اللہ کا سا تصرف ثابت کرنا، سو یہ محض شرک ہے پھر خواہ یوں سمجھے کہ ان کاموں کی طاقت ان کو خود بخود ہے، خواہ یوں سمجھے کہ اللہ نے ان کو ایسی قدرت بخشی ہے، ہر طرح شرک ثابت ہوتا ہے۔

تیسری بات یہ کہ بعضے تعظیم کے کام اللہ نے اپنے لئے خاص کئے ہیں کہ ان کو عبادت کہتے ہیں جیسے سجدہ اور رکوع اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا اور اس کے نام پر مال خرچ کرنا اور اس کے نام کا روزہ رکھنا اور اس کے گھر کی طرف دور دور سے قصد کر کے سفر کرنا اور ایسی صورت بنا کر چلنا کہ ہر کوئی جان لیوے کہ یہ لوگ اس گھر کی زیارت کو جاتے ہیں اور راستے میں اس مالک کا نام پکارنا اور نامعقول باتیں کرنے اور شکار سے بچنا اور اسی قید سے جا کر طواف کرنا اور اس کی طرف سجدہ کرنا اور اس کی طرف جانور لیجانے اور وہاں منتیں ماننی اس پر غلاف ڈالنا اور اس کی چوکھٹ کے آگے کھڑے ہو کر دعا مانگنی اور التجا کرنی، اور دین و دنیا کی مرادیں مانگنی اور ایک پتھر کو بوسہ دینا اور اس کی دیوار سے اپنا منہ اور چھاتی ملنی اور اس کا غلاف پکڑ کر دعا کرنی اور اس کے گرد روشنی کرنی اور اس کا مجاور بن کر اس کی خدمت میں مشغول رہنا جیسے جھاڑو دینی روشنی کرنی فرش بچھانا، پانی پلانا۔ وضو غسل کا لوگوں کے لئے سامان درست کرنا اور اس کے کنوئیں کے پانی کو تبرک سمجھ کر پینا، بدن پر ڈالنا، آپس میں بانٹنا، غائبوں کے واسطے لیجانا، رخصت ہوتے وقت الٹے پاؤں چلنا اور اس کے گرد و پیش کے جنگل کا ادب کرنا یعنی وہاں شکار نہ کرنا، درخت نہ کاٹنا، گھاس نہ اکھاڑنا، مویشی نہ چگانا، یہ سب کام اللہ نے اپنی عبادت کے لئے اپنے بندوں کو بتائے ہیں پھر جو کوئی کسی پیر و پیغمبر کو یا بھوت و پری کو یا کسی سچی قبر کو یا جھوٹی قبر کو یا کسی کے تھان کو یا کسی چلے کو یا کسی کے مکان کو یا کسی کے تبرک کو یا نشان کو یا تابوت کو سجدہ کرے یا رکوع کرے یا اس کے نام کا روزہ رکھے یا ہاتھ باندھ کر کھڑا ہووے یا جانور چڑھاوے یا ایسے مکانوں میں دور دور سے قصد کر کے جاوے یا وہاں روشنی کرے، غلاف ڈالے، چادر چڑھاوے، ان کے نام

Marfat.com

کی چیزوں کی گھڑے رخصت ہوتے وقت الٹے پاؤں چلے، ان کی قبر کو بوسہ دے، مورچھل جھلے، اس پر شامیانہ کھڑا کرے، چوکھٹ کو بوسہ دیوے، ہاتھ باندھ کر التجا کرے، مراد مانگے، مجاور بن کر بیٹھ رہے، وہاں کے گرد وپیش کے جنگل کا ادب کرے اور اسی قسم کی باتیں کرے تو اس پر شرک ثابت ہوتا ہے، اس کو "اشراک فی العبادت" کہتے ہیں، یعنی اللہ کی سی تعظیم کسی کی کرنی، پھر خواہ یوں سمجھے کہ یہ آپ ہی اس تعظیم کے لائق ہیں یا یوں سمجھے کہ ان کی اس طرح کی تعظیم کرنے سے اللہ خوش ہوتا ہے اور اس کی تعظیم کی برکت سے اللہ مشکلیں کھول دیتا ہے، ہر طرح شرک ثابت ہوتا ہے۔

چوتھی بات یہ کہ اللہ صاحب نے اپنے بندوں کو سکھلایا ہے کہ اپنے دنیا کے کاموں میں اللہ کو یاد رکھیں اور اس کی تعظیم کرتے رہیں تاکہ ایمان بھی درست رہے اور ان کاموں میں بھی برکت ہووے جیسے اڑے کام پر اللہ کی نذر ماننی اور مشکل کے وقت اس کو پکارنا اور ہر کام کا شروع اس کے نام سے کرنا اور جب اولاد ہو تو اس کے شکر میں اس کے نام کا جانور ذبح کرنا اور اس کا نام عبداللہ، عبدالرحمن، خدا بخش، اللہ دیا، امۃ اللہ، اللہ دی رکھنا اور کھیت اور باغ میں تھوڑا بہت اس کے نام کا رکھنا اور دھن اور ریوڑ میں سے کچھ اس کی نیاز کا رکھنا اور جو جانور اس کے نام کے اس کے گھر کی طرف لیجائے ان کا ادب کرنا یعنی نہ ان پر سوار ہونا نہ لادنا، اور کھانے پینے پہننے میں اس کے حکم پر چلنا یعنی جس چیز کے برتنے کو اس نے فرمایا برتنا اور جو منع کیا اس سے دور رہنا اور برائی بھلائی جو دنیا میں پیش آتی ہے جیسے قحط اور ارزانی، صحت و بیماری، فتح و شکست، اقبال و ادبار، غمی و خوشی یہ سب اس کے اختیار میں سمجھنا اور اپنا ارادہ جس کام کا بیان کرنا تو پہلے اس کے ارادہ کا ذکر کر دینا جیسا یوں کہنا کہ اگر اللہ چاہے تو ہم فلانا کام کرینگے اور اس کے نام کو ایسی تعظیم سے لینا کہ جس میں اس کی مالکیت نکلے اور اپنی بندگی جیسے یوں کہنا کہ ہمارا رب، ہمارا مالک، ہمارا خالق اور کلام میں جب کہنے کی حاجت ہو تو اسی

کے نام کی قسم کھانی، سو اس قسم کی چیزیں اللہ نے
اپنی تعظیم کے واسطے بتائی ہیں پھر جو کوئی کسی
انبیاء و اولیاء کی، اماموں اور شہیدوں کی بھوت
پری کی اس قسم کی تعظیم کرے جیسے اٹکے کام پر
ان کی نذر ماننے مشکل کے وقت ان کو پکار
بسم اللہ کی جگہ ان کا نام لیوے جب اولاد ہو
ان کی نذر و نیاز کرے اپنی اولاد کا نام عبدالنبی،
امام بخش، پیر بخش رکھے، کھیت اور باغ
میں ان کا حصہ لگادے جو کھیتی باڑی سے
آئے پہلے ان کی نیاز کر دے جب اپنے کام
میں لاوے اور دھن اور ریوڑ میں سے ان کے
نام کے جانور ٹھہرا وے اور پھر ان جانوروں
کا ادب کرے پانی دانے پر سے نہ ہانکے، لکڑی
پتھر سے نہ مارے اور کھانے پینے میں رسول
کی سند پکڑے کہ فلانے لوگوں کو چاہیے کہ
فلانا کھانا نہ کھاویں، فلانا کپڑا نہ پہنیں حضرت
بی بی صحنک مرد نہ کھاویں، لونڈی نہ کھاوے
جس عورت نے دوسرا خصم کیا ہو وہ نہ کھاوے
شاہ عبدالحق کا توشہ حقہ پینے والا نہ کھاوے
اور برائی بھلائی جو دنیا میں پیش آتی ہے اس کو
ان کی طرف نسبت کرے کہ فلانا ان کی پھٹکار

میں آکر یعنی دیوانہ ہو گیا اور فلانے کو انہوں
نے لیا راندا کہ محتاج ہو گیا اور فلانے کو
نواز دیا تو فتح و اقبال مل گیا اور قحط فلانے
ستارے کے سبب سے پڑا، فلانا کام جو فلانے
دن شروع کیا تھا یا فلانی ساعت میں سو پورا
نہ ہوا یا یوں کہے کہ اللہ و رسول چاہے گا تو میں
آؤں گا یا پیر چاہے گا تو یہ بات ہو جائیگی یا اس
کے تئیں بولنے میں یا معبود، داتا، بے پروا
خداوند خدائیگاں، مالک الملک، شہنشاہ
بولے یا جب حاجت قسم کھانے کی پڑے
تو پیغمبر کی یا علی کی یا امام کی یا پیر کی یا ان کی
قبروں کی قسم کھاوے سو ان سب باتوں سے
شرک ثابت ہوتا ہے اور اس کو "اشراک فی
العادۃ" کہتے ہیں یعنی اپنی عادت کے کاموں
میں جو اللہ کی تعظیم کرنی چاہیے سو غیر کی کرے
سو ان چاروں طرح کے شرک کا صریح قرآن و
حدیث میں ذکر ہے۔"
شرک کی تفصیل و توضیح کے لئے مولانا اسمٰعیل شہید
کی "تقویۃ الایمان" اور مولانا خرم علی بلہوری کی "نصیحۃ المسلمین"
سے بہتر اور مفید کتابیں اردو میں موجود نہیں
شرک کی حقیقت کے سمجھنے اور اچھی طرح ذہن نشین

کرنے کے لئے عام لوگوں کیواسطے ان کا مطالعہ ازبس ضروری ہے (ملاحظہ ہو اَشْرَکَ

شَارِکْهُمْ، ۲۱/۱۱، ۲۳/۹،۱۷، ۲۶/۱

شُرَكَآءَ: شریک، ساجھی، شَرِیْکٌ کی جمع، تمام قرآنِ مجید میں یہ لفظ دو مقام پر اس طرح مرسوم ہے شُرَکٰٓؤُا، کاف کے بعد واو ہے اور واو کے بعد ہمزہ اور الف ایک تو سورۂ انعام میں اور دوسرے سورۂ شوریٰ میں لیکن واو تلفظ میں نہیں آتا ہے۔

۴/۱۲، ۷/۱۷،۱۸، ۸/۳، ۹/۱۴، ۱۱/۱۲،۱۳، ۱۳/۸،۱۱، ۲۰/۱۰، ۲۳/۹،۱۷
۲۳/۱۷، ۲۵/۲۴، ۲۹/۲۴

شُرَكَآؤُكُمْ: تمہارے شریک، شُرَکَآءُ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، ۸/۹، ۸/۱۱

شُرَكَآئِكُمْ ۱۱/۹، ۲۱/۷

شُرَكَآؤُنَا: ہمارے شریک، شُرَکَآءُ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، ۱۴/۱۸

شُرَكَآئِنَا ۸/۲

شُرَكَآؤُهُمْ: ان کے شریک، شُرَکَآءُ مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، ۸/۲، ۱۱/۱۱

شُرَكَآئِهِمْ: ۸/۲، ۲۱/۵، ۲۹/۴

شُرَكَآءِيَ: میرے شریک، شُرَکَآءُ مضاف ی ضمیر واحد متکلم، مضاف الیہ، ۱۰/۱۰، ۱۵/۱۹، ۲۰/۱۰، ۲۵/۱

شِرْكِكُمْ: تمہارا شرک، شِرْکٌ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، ۲۳/۱۴

شَرَوْا: انہوں نے بیچا (ضَرَبَ) شِرَاءٌ سے جس کے معنی خرید و فروخت کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، واضح رہے کہ گو شِرَاءٌ کے معنی خریدنے اور بیچنے دونوں کے ہیں لیکن بشتر اس کا استعمال بیچنے ہی کے لئے ہوتا ہے۔ ۱/۱۲

شَرَوْهُ: انہوں نے اس کو بیچ ڈالا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، ۱۲/۱۲

شَرَّهٗ: اس کی شر، اس کی برائی، شَرٌّ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ، ۲۹/۱۹

شَرِيْعَةٍ: راستہ، شریعت، الٰہی طریقہ، شَرْعٌ سے اسم ہے، راغب لکھتے ہیں:-

"بعض علماء کا بیان ہے کہ شریعت کا شریعت نام پڑا شریعۃ الماء (پانی کا گھاٹ) سے تشبیہ کی بناء پر اس حیثیت سے کہ جو اس کی سچی حقیقت پر مطلع ہوا سیراب ہو گیا اور پاک ہوا اور میری مراد سیرابی سے وہ ہے جس کو کسی حکیم نے بیان کیا ہے کہ کنت اشرب فلا اروی فلما عرفت اللہ تعالیٰ رویت بلا شرب (میں پیتا تھا اور سیراب نہ ہوا پھر جب اللہ تعالیٰ کی معرفت

ہوئی تو بلا پے سیراب ہو گیا) اور پاک ہونے سے مراد وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا (اللہ یہی چاہتا ہے کہ دور کرے تم سے گندی باتیں اے نبی کے گھر والو اور ستھرا کر دے تم کو ایک ستھرائی سے، ۲۵/۲۲

شَرِیْكٌ: شریک ساجھی، شَرِکَۃٌ سے بروزن فَعِیْلٌ بمعنے فَاعِلٌ ہے شُرَکَآءُ جمع، پ ۵/۱۲ پ ۱۵/۱۶

## فصل الطاء المہملۃ

شَطْأَہٗ: اس کی سوئی، اس کا پٹھا، اس کا پتہ، شَطْءٌ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، شَطْءٌ کے معنی پودے کی سوئی کے ہیں جو اس کی دونوں جانب پھوٹ نکلتی ہے، اس کی جمع شُطُوْءٌ اور اَشْطَآءٌ ہے، پ ۲۶/۱۲

شَطْرَ: طرف، سمت، جہت، اسم ہے، جب یہ اس معنی میں آتا ہے تو اس سے فعل کا استعمال نہیں ہوتا، امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں کہ "اہلِ لغت کا بیان ہے کہ شطر اسم مشترک ہے جو دو معانی کیلئے آتا ہے ایک بمعنی نصف کے اور دوسرے بمعنی طرف سامنے اور طرف کے" پ ۲/۱

شَطْرَہٗ: اس کی سمت، اس کی جانب اس کی طرف، شَطْرَ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۲

شَطَطًا: جو بات حق سے دور، شَطَّ یَشُطُّ اور شَطَّ یَشِطُّ کا مصدر ہے جس کے معنی اصل میں اِفْرَاطِ بُعد یعنی حد سے زیادہ دور ہونے کے ہیں اور چونکہ حد سے بڑھنا جور وستم ہے اس لئے ان معنوں میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے اور اسی لئے اس بات کو جو حق سے دور ہو شَطَط کہتے ہیں، پ ۱۵/۱۴ پ ۱۹/۱۱

## فصل العین المہملۃ

شَعَآئِرَ اللّٰهِ: اللہ کی نشانیاں اللہ کے نام کی چیزیں، یعنی وہ چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے ذمہ نشان بندگی ٹھہرائے ہیں، امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں:۔

"معلوم رہے کہ شعائر جمع ہے اکثر علماء اس پر ہیں کہ شعیرۃ کی جمع ہے اور ابنِ فارس نے اس کا واحد شِعَارَۃٌ بتایا ہے شَعِیْرَۃٌ بروزن فَعِیْلَۃٌ بمعنی مَفْعَلَۃٌ (یعنی مَشْعَرَۃٌ) ہے

Marfat.com

اور مَشْعَرَۃٌ کے معنی نشانی کے اور اِشْعَار کے معنی علم میں لانے کے ہیں جس شے کے متعلق اشعر آئیگا اَعْلَمَہٗ (وہ علم میں لایا، اس نے اطلاع دی) کے معنی ہوں گے اور ہر وہ شے کہ جو کسی چیز کا نشان مقرر ہو یا جو کسی علامت کو بتلائے اسے شَعِیْرَۃٌ سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔" [1]

اور امام ابوبکر احمد بن علی جصاص رازی حنفی رقمطراز ہیں :-

"اہلِ لغت کا بیان ہے کہ شَعَائِرُ شَعِیْرَۃٌ کی جمع ہے شَعِیْرَۃٌ وہ نشانی ہے جو اس چیز کو بتاتی ہے جس کے لئے وہ مقرر کی گئی ہے، اشعار بدن کے یہ معنی ہیں کہ تم اس پر ایسی نشانی مقرر کر دو جس سے یہ پتہ چلے کہ وہ ھدی (قربانی کا جانور) ہے اور اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ شعائر تمام مناسک حج کی تمام علامات کا نام ہے جن میں رمی جمار اور سعی بین الصفا والمروہ داخل ہیں اور حبیب معلم عطار سے راوی ہیں کہ ان سے شعائر اللہ کے متعلق سوال ہوا تو کہنے لگے "حرمات اللہ" (اللہ کا ادب) اس کی طاعت کا اتباع اور معصیت سے اجتناب یہ "شعائر اللہ" ہیں اور شریک نے بروایت جابر عطار سے آیت وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ کی تفسیر میں قربانی کا فربہ اور بڑے ڈیل ڈول کا کرنا بیان کیا ہے اور ابن ابی نجیح نے بھی بروایتِ مجاہد حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے آیۃ مذکورہ کی تفسیر میں یہی نقل کیا ہے کہ تعظیم کا مطلب قربانی عمدہ، فربہ اور بلند بالا کرنا ہے، عکرمہ سے بھی یہی مروی ہے اور یہی مجاہد کا قول ہے اور حسن (البصری) نے کہا ہے کہ شعائر اللہ سے مراد اللہ کا دین ہے، ابوبکر کہتے ہیں کہ آیۃ مذکورہ میں یہ سب وجوہ مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ آیت میں سب کا احتمال موجود ہے۔" [1]

اور سورۂ مائدہ میں آیت لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰہِ (اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو) کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ :-

"شعائر اللہ، اللہ کے دین کے تمام نشانات پر حاوی ہے یعنی دین کے وہ فرائض اور نشانات کہ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتلا دیا ہے کہ ان کے حدود سے تجاوز نہ کریں اور ان کے

[1] تفسیر کبیر، ج ۲۳، ص ۲۵۳ (طبع مصر بہیہ)

[1] احکام القرآن، ج ۳، ص ۲۹۰ (طبع مصر ۱۳۴۷ھ)

حقوق میں کوتاہی نہ ہو اور انہیں ضائع نہ ہونے دیں۔ یہ معنی ان تمام معانی کو جامع ہیں کہ جو سلف سے اس کی تشریح میں مروی ہیں۔" ؎۱

شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی ارقام فرماتے ہیں :-

" شعائر در اصل جمع شعیرۃ است یا جمع شعارہ است یعنی علامت و شعائر اللہ در عرف دین مکانات و ازمنہ و علامات و اوقات عبادت را گویند، اما مکانات عبادت پس مثل کعبہ و عرفہ و مزدلفہ و جمار ثلثہ و صفا و مروہ و منا و جمیع مساجد اند و اما ازمنہ پس مثل رمضان و اشہر حرم و عید الفطر و عید النحر و جمعہ و ایام تشریق اند۔ اما علامات پس مثل اذان و اقامت و ختنہ و نماز جماعت و نماز جمعہ و نماز عیدین اند و در ہمہ ایں چیزہا معنی علامت بودن متحقق ست زیرا کہ مکان و زمان عبادت نیز از عبادت بلکہ از معبود یاد میدہد۔" ؎۲

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے اپنی بے نظیر کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں ایک مستقل باب باندھا ہے باب تعظیم شعائر اللہ "شعائر اللہ" کی مزید تشریح و تفصیل کے سمجھنے کے لئے اہل علم کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

$\frac{۲}{۴}$ پ $\frac{۶}{۵}$ ، $\frac{۱۷}{۱۲}$ ، ۱۱
**شُعَبٌ** : پھانکیں، شاخیں، حصے شُعْبَۃٌ کی جمع جس کے معنی شاخ اور حصہ کے ہیں۔ $\frac{۲۹}{۲۱}$ پ

**شِعْرَ** : شعر، شعر کہنا، شَعَرَ یَشْعُرُ کا مصدر ہے جس کے معنی شعر کہنے کے ہیں نیز ادب کی اصطلاح میں شعر نام ہے اس کلام کا جو موزون ہو اور متکلم نے بہ ارادہ موزون کیا ہو۔

راغب اصفہانی لکھتے ہیں :-

" شَعْرٌ کے معنی معروف ہیں (بال کو کہتے ہیں) جمع ہے ارشاد ہے وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَا (اور بھیڑوں کی اون سے اور اونٹوں کی پشموں سے اور بکریوں کے بالوں سے) اور شَعَرْتُ کے معنی ہیں میں نے بالوں کو حاصل کر لیا (یعنی گھنے بال کر لئے) اور اسی سے استعارہ کیا گیا ہے شَعَرْتُ کَذَا یعنی میں نے علم حاصل کیا جو باریکی میں ایسا ہے جیسے بال کا پتہ چلانا، اور شاعر کو شاعر اسی کی فطانت اور دقت معرفت ہی کی بنا پر

؎۱ احکام القرآن، ج ۲، ص ۳۶۶

؎۲ تفسیر فتح العزیز، ص ۳۶۹ (مطبع مجتبائی دہلی)

کہا گیا ہے پس شعر اصل میں علم دقیق کا نام ہے عرب کا محاورہ ہے لیت شعری (کاش مجھے اس کا گہرا پتہ ہوتا) اور عرف میں جو کلام موزون اور مقفٰی ہو اس کا نام شعر ہے اور جو صنعت شعر گوئی سے مخصوص ہو اس کا نام شاعر ہو گیا ہے۔

قرآن مجید میں کفار کی زبانی مذکور ہے بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ (نہیں جھوٹ باندھ لیا ہے نہیں شعر کہتا ہے) اور لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ (ایک شاعر دیوانہ کے لئے) اور شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (یہ شاعر ہے ہم منتظر ہیں اس پر گردش زمانہ کے) بہت سے مفسرین نے تو اسے اس پر محمول کیا ہے کہ کفار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام لگایا تھا کہ آپ (نعوذ باللہ) منظوم و مقفٰی شعر پیش کرتے ہیں حتٰی کہ انہوں نے قرآن میں جہاں کہیں بھی ایسے الفاظ آئے ہیں جن میں وزن کا شبہ ہوتا ہے جیسے کہ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ اور تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ میں ان سب کی تاویل کی ہے۔

اور بعض حقیقت شناسوں نے کہا ہے کہ اس الزام سے کافروں کا یہ مقصد تھا ہی نہیں کیونکہ کلام اللہ سے ظاہر ہے کہ وہ اسالیب شعر پر نہیں ہے اور یہ بات ایسی ہے کہ عجم کے غیر فصیح لوگوں پر بھی مخفی نہیں، فضلاء عرب کا تو ذکر ہی کیا، بلکہ انہوں نے (نعوذ باللہ) آپ کو کذب سے منسوب کیا تھا کیونکہ شعر کی تعبیر کذب سے کی جاتی ہے اور شاعر بمعنی کاذب ہے حتٰی کہ ایک قوم نے تو ادلۂ کاذبہ کا نام ہی ادلۂ شعریہ رکھا ہے اور اسی لئے حق تعالیٰ شانہ نے عام شعراء کا یہ وصف بیان فرمایا ہے وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ (اور شاعروں کی بات پر چلیں وہی جو بے راہ ہیں، تو نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر میدان میں سر مارتے پھرتے ہیں اور یہ کہ وہ کہتے ہیں جو نہیں کرتے اور اسی باعث کہ شعر جھوٹ کا ٹھکانہ ہے کہا گیا ہے احسن الشعر اکذبہ۔ (احسن اوست اکذب او) اور بعض حکماء کا بیان ہے کہ کوئی متدین صادق اللہجہ شاعری میں نادرہ کار نہیں دیکھا گیا۔

بہر حال یہ ایک امر واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم ترجمانِ حقیقت تھے شاعر نہ تھے، نہ شاعری آپ کے لئے زیبا تھی، پیغمبرانہ صداقت اور شاعرانہ تخیلات میں زمین آسمان کا فرق ہے البتہ کسی موقع پر کسی شاعر کا شعر پڑھا دینا یا رجز کے وقت بے ساختہ مقفٰی عبارت زبان مبارک سے نکل جانا، یہ ایک الگ بات ہے، اسے شاعری نہیں کہتے۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ:۔

"اس امر میں اختلاف کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کسی شعر کا بطورِ مثال بیان کرنا یا کسی دوسرے کا شعر بطورِ حکایت نقل کرنا روا تھا تو صحیح یہ ہے کہ ایسا کرنا آپ کے لئے جائز تھا۔" [1]

علامہ احمد قسطلانی، مواہب اللدنیہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"آیا شعر کی ممانعت صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خاص تھی یا نوعِ انبیاء کے لئے تھی، بعض علماء کا بیان ہے کہ یہ ممانعت عام تھی کیونکہ ارشاد ہے وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِیْ لَهٗ (اور ہم نے نہیں سکھایا اس کو شعر کہنا اور یہ اس کے لائق نہیں) اور اس میں خصوصیت کی کوئی وجہ ظاہر نہیں ہے۔" [2] 23/4

**شُعَرَآءُ**: شاعر لوگ، شَاعِرٌ کی جمع ہے خلافِ قیاس، علامہ احمد فیومی ابن خالویہ سے ناقل ہیں کہ:۔

"شاعر کی جمع شعراء اس لئے آئی کہ بعض عرب شُعَرَاء بالضم بولتے ہیں اس لئے قیاس یہ ہے کہ اس سے صفت کا صیغہ فَعِیل کے وزن پر آئے جیسے شُرَفَاء کہ شریف کی جمع ہے پر اس طرح کہا جاتا تو شعیر سے التباس ہوتا جس کے معنی جَو کے ہیں لہٰذا انہوں نے شاعر کہا اور اس کے اصلی وزن کو ملحوظ رکھا، ہاں عُلَمَاء اور حُلَمَاء وغیرہ جو ہیں سو علیم اور حلیم کی جمع ہیں۔" [3] 19/15

**شِعْرٰی**: شعریٰ ایک مشہور ستارہ کا نام ہے، خاص طور پر اس کا ذکر اس لئے کیا کہ عرب کی ایک قوم کا یہ معبود تھا، شیخ سلیمان جمل لکھتے ہیں:۔

"عربی زبان میں شعریٰ نام کے دو ستارے ہیں ان میں سے ایک الشعری العبور کہلاتا ہے اور وہی آیہ کریمہ میں مراد ہے کیونکہ قبیلہ خزاعہ

---

[1] فتح الباری، ج ۱۰، ص ۴۴۵ (طبع مصر ۱۳۰۱ھ)
[3] تاج العروس
[2] مواہب اللدنیہ مع شرح زرقانی، ج ۵، ص ۲۵۵ (طبع مصر)

اس کی پرستش کیا کرتا تھا، قبیلے کے سرداروں میں ایک شخص ابو کبشہ نامی تھا، اس نے اس کی پوجا کا طریق قائم کیا، کہنے لگا کہ سارے ستارے تو آسمان کو عرض میں قطع کرتے ہیں اور شعریٰ طول میں قطع کرتا ہے اس لئے یہ ان سے جدا ہے چنانچہ اس نے اس کی پوجا شروع کر دی اور خزاعہ و حمیر بھی اسے پوجنے لگے، ابو کبشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ناناؤں میں سے کوئی ہوا ہے، اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مشرکین قریش کو اللہ کی طرف دعوت دی اور ان کے مذاہب کی مخالفت کی تو وہ آپ کو اس شخص سے مشابہت دے کر کہ اس نے ان کے دین کے سوا نیا دین نکالا تھا ابن ابی کبشہ کہتے تھے۔

یہ ستارہ جوزاء کے بعد سخت گرما کے زمانہ میں طلوع ہوتا ہے اور شعریٰ یمانیہ سے موسوم ہے اور دوسرا ستارہ الشعریٰ الغمیصا (بغین معجمہ مضموم و میم مفتوح و صاد مہملہ) غمیصٰی سے ہے بمعنی تین جس کے معنی آنسوؤں کے جاری ہونے کے ہیں ۔[1]

رسالہ زینتِ آسمان میں مرقوم ہے :۔

"شعریٰ یمانی" تمام آسمان میں اس کے برابر کوئی روشن ستارہ نہیں، نیلگوں سفید رنگ ہے اور جب ٹمٹماتا ہے، رنگ بدلتا نظر آتا ہے اس کی روشنی "الدبران" سے بارہ گنی ہے، اس کی ضیاءِ حقیقی ہمارے آفتاب سے ۲۶ گنی ہے، یہ ہمارے آفتاب سے بہت زیادہ گرم ہے، اس کا فاصلہ ½۸ سال نوری ہے۔[2] یعنی ان ستاروں میں سے ہے جو ہم سے قریب ہیں، یہ ہماری طرف ۳۰۰ میل فی منٹ بڑھ رہا ہے، چونکہ کلب اکبر کا مشہور ستارہ شعریٰ ہی ہے اس لئے اسے "کلب الجبار" بھی کہتے ہیں، ۲۵ جولائی سے ۵ ستمبر تک آفتاب اور کلب الجبار کا طلوع تقریباً ایک ہی وقت پر ہوتا ہے ان دنوں کو ایام الکلب کہتے ہیں۔[3] ۲۷

---

[1] حاشیہ جمل علی الجلالین، ج ۴، ص ۲۳۸ (طبع مصر ۱۳۵۳ھ) [2] زمین روشنی کی رفتار فی سکنڈ ۱۸۶۰۰۰ میل ہے ایک سال نوری کا مطلب یہ ہے کہ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے کسی ستارے کی روشنی ایک سال کی مدت میں ہم تک پہنچتی ہے۔

[3] زینتِ آسمان، از برکت علی و مناج الدین پروفیسران اسلامیہ کالج پشاور، ص ۲۹ (طبع اول)

**شُعُوبًا**: ذاتیں، شاخیں، شَعْبٌ کی جمع، جس کے معنی قبائل کے اس جدِ اعلیٰ کے ہیں جہاں سب قبیلے جاکر مل جاتے ہوں یا شعب وہ ایک برادری ہے جو شاخ در شاخ پھیل گئی ہو۔ عرب میں قبیلہ کی تدریجی تقسیم کثرت سے قلت کی طرف حسب ترتیب ذیل ہے:۔

پہلے شعب پھر قبیلہ پھر عمارہ پھر بطن پھر فخذ پھر فصیلہ۔ ابواسامہ نے تصریح کی ہے کہ یہ طبقات انسانی خلقت کی ترتیب پر ہیں، شعب سب سے عظیم تر ہے، شعب الرأس (جہاں دماغ کے چاروں حصے جڑتے ہیں) سے مشتق ہے پھر قبیلہ اپنے اجتماع کی بنا پر قبیلۃ الرأس (کھوپری کا وہ حصہ جو شاخ در شاخ ہوتا ہے) سے ہے، پھر عمارہ ہے جس کے معنی سینہ کے ہیں، پھر بطن (پیٹ) ہے، پھر فخذ (ران) ہے، پھر فصیلہ ہے جس کے معنی پنڈلی کے ہیں[1] ۲۶/۱۴

**شُعَيْبٌ**: شعیب علیہ السلام مشہور پیغمبر ہیں ابن الکر بطرانی اسحٰق بن بشر و شرقی بن القطامی سے جو علم انساب کے بڑے ماہر تھے، ناقل ہیں کہ آپ عبرانی کے یثروب ہیں اور عربی کے شعیب[2]، صغانی نے کہا ہے کہ عربی نام ہے، ممکن ہے کہ شعب کی تصغیر ہو یا شعب (بہت چوڑے سینہ والا) کی جس طرح کہ اہلِ عرب اسود کی تصغیر میں سُوَید کہتے ہیں، یہ تصغیر ترخیم ہے[3]، راغب لکھتے ہیں کہ شعیب یا تو شَعْبٌ مصدر کی تصغیر ہے (جس کے معنی فراہم کرنے اور پراگندہ کرنے کے ہیں) اور یا شَعْبٌ اسم کی (جس کے معنی بڑے قبیلہ کے آتے ہیں) اور یا شِعْبٌ کی (جس کے معنی پہاڑ کی گھاٹی کے ہیں) بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اسے مصغر بتانا غلط ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے ناموں کی تصغیر جائز نہیں ہے، لیکن یہ امر قابلِ بحث ہے کیونکہ یہ حکم نام کے وضع ہوجانے کے بعد ہے نہ کہ نام رکھتے وقت علاوہ ازیں مختار یہ ہے کہ یہ اسم مرتجل[ع] ہے اور اسی طرح اس کی وضع عمل میں آئی ہے[4]

صحیح ابنِ حبان میں حضرتِ ابوذر رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث مرفوعًا وارد ہے کہ چار پیغمبر عرب سے ہیں، ہود، صالح، شعیب اور تمہارے نبی اے ابوذر![5]

---

[1] تاج العروس، فصل الشین من باب الباء۔ [2] الدر المنثور، جز ۳، ص ۱۰۲ [3] تاج العروس فصل الشین من باب الباء۔

[4] لوسٹر بحوالہ روح المعانی، جز ۸، ص ۱۵۳ [5] پوری حدیث لفظ انبیاء کے ضمن میں گزر چکی ہے۔

[ع] مرتجل وہ اسم ہے جس کو وضع کرتے وقت پہلے معنی کی مناسبت ملحوظ نہ ہو۔

Marfat.com

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی رو سے حضرت شعیب علیہ السلام عرب عاربہ سے ہیں[1] بعض کا خیال ہے کہ آپ عرب کے قبیلہ بنو عنزہ بن اسد سے ہیں کیونکہ طبرانی اور ابن قانع نے حضرت سلمہ بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب وہ اپنے قبیلہ بنو عنزہ کا وفد لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قبیلہ عنزہ کی طرف اپنا انتساب ظاہر کیا تو آپ کی زبانِ مبارک سے ارشاد ہوا مرحبا بقوم شعیب واختان موسٰی[2] (شعیب کی قوم اور موسٰی کے سسرال والوں کو مرحبا) لیکن حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں کہا ہے کہ اس کی اسناد میں مجہول راوی ہیں[3]، اور حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس کا پتہ دیتی ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام حضرت موسٰی علیہ السلام کے اقربا میں سے ہیں اور عرب عاربہ کے اس قبیلے سے ہیں جس کو عنزہ کہا جاتا ہے یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ عنزہ بن اسد بن ربیعہ بن نزار بن معد بن عدنان سے ہیں

کیونکہ یہ لوگ حضرت شعیب علیہ السلام کے زمانۂ دراز کے بعد ہوئے ہیں[4]

آپ نے جس حسنِ اسلوب کے ساتھ قوم کے سامنے دعوتِ حق رکھی تھی اور پھر اس سلسلہ میں جو کچھ باہمی سوال و جواب ہوئے اس کے لفظ لفظ سے آپ کی فصاحت و بلاغت اور حسنِ خطابت کے جوہر ٹپکتے ہیں اسی لئے علمائے سلف آپکو خطیب الانبیاء کہتے تھے۔

ایک مرسل حدیث میں جس کو طبری، حاکم اور ابن ابی حاتم نے یعقوب بن ابی سلمہ سے بروایت ابن اسحٰق نقل کیا ہے وارد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر کرتے تو فرماتے ذاک خطیب الانبیاء (وہ خطیب الانبیاء ہیں[5]) اسحٰق بن بشر نے اس روایت کو باں سند عن جویر و مقاتل عن الضحاک عن ابن عباس مرفوعاً بھی روایت کیا ہے[6] لیکن سلسلہ سند سخت ضعیف ہے۔

مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن عباس

---

[1] فتح الباری ج ۶، ص ۳۴۹ [2] یہ حدیث مجمع الزوائد ج ۱۰، ص ۵۱ (طبع مصر ۱۳۵۳ھ) میں منقول ہے اور ابن قانع کا حوالہ کنز العمال ج ۶، ص ۲۰۹ (طبع دائرۃ المعارف) میں ہے [3] فتح الباری ج ۶، ص ۳۴۹ [4] البدایہ والنہایہ ج ۱، ص ۱۸۵ (طبع مصر ۱۳۵۱ھ) [5] ملاحظہ ہو تاریخ الامم والملوک ج ۱، ص ۱۶۷ (طبع حسینیہ مصر) اور الدر المنثور ج ۳، ص ۱۰۳ (طبع مصر) [6] البدایہ والنہایہ ج ۱، ص ۱۸۵ (طبع مصر ۱۳۵۱ھ)

رضی اللہ عنہا سے آیہ کریمہ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا کی تفسیر میں مروی ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نابینا تھے۔ حاکم نے اس کو مسلم کی شرط پر صحیح بتایا ہے، اور ذہبی نے تلخیص میں حاکم کی تصحیح کو برقرار رکھا ہے[1]۔ ابوالشیخ اور ابن عساکر نے سعید بن جبیر سے جو مشہور جلیل القدر تابعی ہیں روایت کی ہے کہ اللہ کی محبت میں روتے روتے آپ کا یہ حال ہو گیا تھا، یہ مضمون ایک مرفوع روایت میں بھی آیا ہے[2]، چنانچہ خطیب اور ابن عساکر نے حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام محبتِ الٰہی میں اتنے روئے کہ نابینا ہو گئے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپکو دوبارہ بینائی عطا فرمائی اور وحی کی کہ اے شعیب یہ گریہ کیسا ہے، جنت کے شوق میں ہے یا دوزخ کے ڈر سے۔ عرض کیا اے میرے معبود، میرے مولیٰ، تو جانتا ہے کہ نہ تیری جنت کے شوق میں روتا ہوں، دوزخ کے ڈر سے لیکن تیری محبت کو اپنے دل میں جما رکھا ہے جب تیری طرف نظر پڑتی ہے تو پھر مجھے پروا نہیں کہ میرے ساتھ کیا ہو، اللہ تعالیٰ نے ان کی جانب وحی فرمائی کہ شعیب اگر یہ حق ہے تو تمہیں میری لقا مبارک ہو اور اسی لئے تو میں نے اپنے کلیم موسیٰ بن عمران کو تمہاری خدمت کے لئے کھڑا کر دیا ہے، خطیب نے تاریخ بغداد میں اس حدیث کو منکر کہا ہے[3] اور ذہبی نے میزان میں تصریح کی ہے کہ "یہ حدیث باطل ہے بے اصل"[4]، اور ابن کثیر سخت غریب[5] بتلاتے ہیں، آپ کی پیغمبرانہ سیرت اور دعوتِ حق کا تذکرہ قرآن مجید میں جابجا مذکور ہے (ملاحظہ ہو اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ اور مَدْيَنَ) $\frac{9}{1}$ $\frac{12}{8}$ $\frac{19}{14}$

شُعَيْبًا $\frac{9}{1}$ $\frac{12}{8}$ $\frac{20}{16}$

## فصل الغین المعجمہ

**شَغَفَهَا**: اس نے اس کو فریفتہ کر لیا، وہ اس کے دل میں اتر گیا، اس نے اس کے دل میں جگہ پکڑ لی (فتح) شَغَفَ شَغْفٌ سے جس کے معنی محبت کے دل کے پردوں میں اتر جانے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ھا ضمیر واحد مؤنث غائب۔ شَغَافٌ کے معنی پردہ دل کے ہیں اس لئے پردہ دل میں اتر جانے کیلئے

[1] مستدرک حاکم مع تلخیص ذہبی ج ۲ ص ۵۶۸ (طبع دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن) [2] الدر المنثور، ج ۳، ص ۳۴۸ [3] تاریخ البغداد ج ۶، ص ۳۱۵ (طبع مصر ۱۳۴۹ھ) [4] کنز العمال ج ۶، ص ۱۲۵ [5] البدایۃ والنہایۃ، ج ۱، ص ۱۸۸

Marfat.com

شَغَفَ آتا ہے، پ ۱۲/۱۴

**شُغُلٍ**: دھندا، شغل، شُغُل، اَشْغَال اور شُغُول ہے جمع، پ ۲۳/۳

**شَغَلَتْنَا**: ہمیں مشغول کرلیا، ہمیں دھندے میں لگالیا، (فتح) شَغَلَتْ شَغُلٌ سے جس کے معنی مشغول کرلے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، نا ضمیر جمع متکلم، پ ۲۶/۱۰

## فصل الفار

**شَفَا**: کنارہ، یہ لفظ ہلاکت سے قریب ہونے کے لئے ضرب المثل ہے، اَشْفَاءٌ جمع ہے، پ ۴/۲ پ ۱۱/۲

**شِفَاءٌ**: بیماری سے اچھا ہونا، اصل میں شَفٰی یَشْفِیْ کا مصدر ہے اور مرض سے صحت پا جانے کے لئے بطور اسم مستعمل ہے، اَشْفِیَۃٌ جمع ہے جیسے کہ سِقَاءٌ کی جمع اَسْقِیَۃٌ ہے، پ ۱۱/۱۱ پ ۱۴/۱۵ پ ۱۵/۱۹ پ ۲۴/۱۹

**شَفَاعَۃٌ**: سفارش کرنا، شفاعت کرنا، شَفَعَ یَشْفَعُ کا مصدر ہے، مولانا شاہ اسمٰعیل شہید نے تقویۃ الایمان میں شفاعت پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے، فرماتے ہیں:-

"کان رکھ کر سن لینا چاہئے کہ اکثر لوگ انبیاء اولیاء کی شفاعت پر بہت بھول رہے ہیں اور اس کے معنی غلط سمجھ کر اللہ کو بھول گئے ہیں، سو شفاعت کی حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے، سو سننا چاہئے کہ شفاعت کہتے ہیں سفارش کو اور دنیا میں سفارش کئی طرح کی ہوتی ہے جیسے ظاہر کے بادشاہ کے ہاں کسی کی چوری ثابت ہو جائے اور کوئی امیر وزیر اس کو اپنی سفارش سے بچا لیوے تو ایک صورت تو یہ ہے کہ بادشاہ کا جی تو اس چور کے پکڑنے ہی کو چاہتا ہے اور اس کے آئین کے موافق اس کو سزا پہنچتی ہے مگر اس امیر سے دب کر اس کی سفارش مان لیتا ہے اور اس چور کی تقصیر معاف کر دیتا ہے کیونکہ وہ امیر اس کی سلطنت کا بڑا رکن ہے اور اس کی بادشاہت کو بڑی رونق دے رہا ہے سو بادشاہ یہ سمجھ رہا ہے کہ ایک جگہ اپنے غصہ کو تھام لینا اور ایک چور سے در گزر کر جانا بہتر ہے اس سے کہ اتنے بڑے امیر کو ناخوش کر دیجیے کہ بڑے بڑے کام خراب ہو جاویں اور سلطنت کی رونق گھٹ جائے اس کو "شفاعت وجاہت" کہتے ہیں یعنی اس امیر کی وجاہت کے سبب سے اس کی سفارش قبول کی، سو اس قسم کی سفارش

Marfat.com

اللہ کی جناب میں ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی اور جو کوئی نبی و ولی کو یا امام اور شہید کو یا کسی فرشتہ یا کسی پیر کو اللہ کی جناب میں اس قسم کا شفیع سمجھے سو وہ اصلی مشرک ہے اور بڑا جاہل کہ اس نے خدا کے کچھ معنی ہی نہیں سمجھے اور اس مالک الملک کی قدر کچھ بھی نہ پہچانی، اس شہنشاہ کی تو یہ شان ہے کہ ایک آن میں ایک حکم کُن سے چاہے تو کروڑوں نبی اور ولی اور جن اور فرشتے جبرئیل اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر پیدا کر ڈالے اور ایک دم میں سارا عالم عرش سے فرش تک الٹ پلٹ کر ڈالے اور ایک اور ہی عالم اس جگہ قائم کرے کہ اس کے تو محض ارادے ہی سے ہر چیز ہو جاتی ہے کسی کام کے واسطے کچھ اسباب اور سامان جمع کرنے کی کچھ حاجت نہیں اور سب لوگ پہلے اور پچھلے اور آدمی اور جن بھی سب مل کر جبرئیل اور پیغمبر ہی سے ہو جاویں تو اس مالک الملک کی سلطنت میں ان کے سبب کچھ رونق نہ بڑھ جاوے گی اور جو سب شیطان اور دجال ہی سے ہو جاویں تو اس کی کچھ رونق گھٹنے کی نہیں، وہ ہر صورت سے بڑوں کا بڑا ہے اور بادشاہوں کا بادشاہ اس کا نہ کوئی کچھ بگاڑ سکتا ہے اور نہ کچھ سنوار سکے،

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی بادشاہ زادوں میں سے یا بیگماتوں میں سے یا کوئی بادشاہ کا معشوق اس چور کا سفارشی ہو کر کھڑا ہو جاوے اور چوری کی سزا نہ دینے دیوے اور بادشاہ اس کی محبت سے لاچار ہو کر اس چور کی تقصیر معاف کر دے تو اس کو شفاعتِ محبت کہتے ہیں یعنی بادشاہ نے محبت کے سبب سے سفارش قبول کر لی اور یہ بات سمجھی کہ ایک بار غصہ پی جانا اور ایک چور کو معاف کر دینا بہتر ہے اس رنج سے کہ جو اس محبوب کے روٹھ جانے سے مجھ کو ہوگا اس قسم کی شفاعت بھی اس دربار میں کسی طرح ممکن نہیں اور جو کوئی کسی کو اس جناب میں اس قسم کا شفیع سمجھے وہ بھی ویسا ہی مشرک ہے اور جاہل جیسا کہ اول مذکور ہو چکا، وہ مالک الملک اپنے بندوں کو بہتیرا ہی نوازے اور کسی کو حبیب کا اور کسی کو خلیل کا اور کسی کو کلیم کا اور کسی کو روح اللہ وجیہ کا خطاب بخشے اور کسی کو رسول کریم اور

Marfat.com

امین اور روح القدس اور روح الامین فرمادے مگر پھر مالک مالک ہے اور غلام غلام، کوئی بندگی کے رتبے سے قدم باہر نہیں رکھ سکتا اور غلامی کی حد سے زیادہ نہیں بڑھ سکتا، جیسا اس کی رحمت سے ہر دم خوشی سے جھکتا ہے ویسا ہی اس کی ہیبت سے رات دن نہرہ پھٹتا ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ چور پر چوری ثابت ہوگئی مگر وہ ہمیشہ کا چور نہیں اور چوری کو کچھ اس نے اپنا پیشہ نہیں ٹھہرایا مگر نفس کی شامت سے قصور ہوگیا سو اس پر شرمندہ ہے اور رات دن ڈرتا ہے اور بادشاہ کے آئین کو سر آنکھوں پر رکھ کر اپنے تئیں قصوروار سمجھتا ہے اور لائق سزا کے جانتا ہے اور بادشاہ سے بھاگ کر کسی امیر و وزیر کی پناہ نہیں ڈھونڈتا اور اس کے مقابلہ میں کسی کی حمایت نہیں جتاتا اور رات دن اسی کا منہ دیکھ رہا ہے کہ دیکھئے میرے حق میں کیا حکم فرماوے، سو اس کا یہ حال دیکھ کر بادشاہ کے دل میں اس پر ترس آتا ہے مگر آئین بادشاہت کا خیال کر کے بے سبب درگزر نہیں کرتا کہ کہیں لوگوں کے دلوں میں اس آئین کی قدر گھٹ نہ جاوے سو کوئی امیر وزیر اس کی مرضی پا کر اس تقصیروار کی سفارش کرتا ہے اور بادشاہ اس امیر کی عزت بڑھانے کو ظاہر میں اس کی سفارش کا نام کر کے اس چور کی تقصیر معاف کر دیتا ہے سو اس امیر نے اس چور کی سفارش اس لئے نہیں کی کہ اس کا قرابتی ہے یا آشنا یا اس کی حمایت اس نے اٹھائی بلکہ محض بادشاہ کی مرضی سمجھ کر کیونکہ وہ تو بادشاہ کا امیر ہے چوروں کا تھانگی جو چور کا حمایتی بن کر اس کی سفارش کرتا ہے تو آپ بھی چور ہو جاتا ہے اس کو شفاعت بالاذن کہتے ہیں یعنی یہ سفارش خود مالک کی پروانگی سے ہوتی ہے سو اللہ کی جناب میں ایسی قسم کی شفاعت ہو سکتی ہے اور جس نبی و ولی کی شفاعت کا قرآن و حدیث میں مذکور ہے سو اس کے معنی یہی ہیں۔" [1]

پ ۶، ۱/۱۵ ۲/۳ ۸/۵ ۹، ۱۵/۱۶ ۹/۲۴ ۲/۲۲ ۱۳/۲۵

۱۶/۲۹ شَفَاعَتُهُمْ ان کی شفاعت ان کی سفارش شَفَاعَةُ مضاف، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، ۲۶/۱۲

[1] ملاحظہ ہو تقویۃ الایمان، فصل [illegible]

**شَفَتَيْنِ**: دو ہونٹ، شَفَةٌ کا تثنیہ بحالتِ نصب و جر، شَفَةٌ کے معنی ہونٹ کے ہیں بعض کے نزدیک اس کا لام کلمہ ہٓ ہے اور اصل شَفْهَةٌ ہے پھر ہٓ اصلیہ حذف کردی گئی اور دوسری ہا جو تانیث کی علامت تھی باقی رکھی گئی اور بعض کے نزدیک اس کی اصل شَفَوَةٌ ہے، واؤ کو حذف کر کے اس کا فتحہ ماقبل کو دے دیا گیا ہے، شِفَاهٌ اور شَفَوَاتٌ جمع ہے، ۳۰/۱۵

**شَفْعِ**: جفت (جو طاق کی ضد ہے) جوڑا ایک چیز کا اپنی ہی جیسی چیز کے ضم ہونا، واضح رہے کہ لغت میں تو "شفع" کے یہی معنی ہیں لیکن یہاں اس سے کیا کوئی متعین شے مراد ہے تو اس بارے میں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں، صنعانی نے کہا ہے کہ شَفع و وَتر کے بارے میں بیس قول ہیں،[1] تفسیر کبیر کے تکملہ میں یہ سب اقوال درج ہیں،[2] حافظ ابو حیان اندلسی البحر المحیط میں لکھتے ہیں کہ "شفع و وتر" کے بارے میں کتاب التحریر والتحبیر میں چھتیس قول ذکر کئے جن کے پڑھنے ہی سے ہم تنگ آگئے اپنی کتاب میں درج کرنا تو بڑی بات ہے[3] امام محمد بن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں خوب فیصلہ کیا ہے کہ :-

"اس بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے شَفع و وَتر کی قسم کھائی ہے اور روایت سے یا عقل سے شفع و وتر کی کسی نوع کی تخصیص نہیں ہوئی کہ یہی نوع ہے اور نوع نہیں اور ہر شفع و وتر کی اللہ نے قسم کھائی ہے تو جس شے کے متعلق بھی اہلِ تفسیر کا بیان ہے کہ اللہ کے اس عموم کی قسم میں داخل ہے تو اللہ نے اس کی قسم کھائی ہے۔"[4]

(ملاحظہ ہو وتر) ۳۰/۱۴

**شُفَعَآءُ**: سفارشی، سفارش کرنے والے، شفاعت کنندہ، شَفِيعٌ کی جمع، واضح رہے کہ تمام قرآن مجید میں اس کی املاء اسی طرح عین الف کے ساتھ ہے مگر سورۂ روم میں یہ عین واؤ کے ساتھ اس طرح مرقوم شُفَعٰٓؤُا، پہلے عین ہے پھر واؤ پھر ہمزہ اور پھر الف اور واؤ اور الف کا تلفظ نہیں ہوتا ہے، ۲۱/۱۳ ۲۱/۵ ۲۴/۲

[1] تاج العروس، فصل الشین، باب العین
[2] ملاحظہ ہو تفسیر کبیر، ج ۸، ص ۳۹۳ و ۳۹۴ (طبع مصر ۱۳۲۴ھ)
[3] البحر المحیط، ج ۸، ص ۴۶۸ (طبع مصر ۱۳۲۸ھ)
[4] تفسیر جامع البیان معروف بتفسیر ابن جریر، ج ۳۰، ص ۱۹۴ (طبع مصر)

Marfat.com

**شُفَعَآؤُکُمْ**: تمہارے سفارشی، شُفَعَآءُ مضاف، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، پ ۷ ع ۱۷

**شُفَعَآؤُنَا**: ہمارے سفارشی، شُفَعَآؤُ مضاف، نَا ضمیر جمع متکلم، مضاف الیہ، پ ۱۱ ع ۷

**شَفَقَ**: شفق ہو واضح رہے کہ شفق کے معنی میں اختلاف ہے، بعض شام کے وقت افق کی سرخی کو شفق کہتے ہیں اور بعض اس کی سپیدی کو، راغب نے جو شفق کے معنی بیان کئے ہیں وہ ان کی امامتِ فن کے شایانِ شان ہے، فرماتے ہیں "سورج کے ڈوب جانے پر دن کی روشنی اور رات کی سیاہی کی باہمی آمیزش "شفق" ہے" یہ معنی کنارہ آسمان کی سرخی اور سپیدی دونوں پر مشتمل ہیں، علامہ ابو سعادات ابن الاثیر جزری لکھتے ہیں:۔

"شفق اضداد میں سے ہے، اس سرخی کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے کہ جو مغرب میں آفتاب غروب ہونے پر نظر آتی ہے اور امام شافعی نے اسی کو لیا ہے اور اس سپیدی کے لئے بھی آتی ہے جو سرخی کے بعد مغربی افق پر باقی رہتی ہے اور امام ابو حنیفہ نے اسی کو اختیار کیا ہے"۔ [1]

شوکانی نے تفسیر فتح القدیر میں ابو حنیفہ کے قول کو نقل کر کے لکھا ہے کہ:۔

ولا وجہ لھذا القول اس قول کی کوئی وجہ نہیں ولا متمسک لہ لامن اور نہ اس کے لئے زبان لغۃ العرب ولا من عرب سے کوئی سند ہے الشرع (ج ۵ ص ۳۶۹) اور نہ شرع سے۔

لیکن یہ شوکانی کی خیرہ چشمی ہے، امام ابو بکر جصاص فرماتے ہیں:۔

"شفق کے بارے میں ائمہ مختلف ہیں، ابو حنیفہ سپیدی کو شفق بتاتے ہیں اور ابو یوسف، محمد، ابن ابی لیلیٰ، مالک، ثوری، حسن بن صالح اور شافعی کہتے ہیں کہ شفق سرخی ہے۔ اور سلف نے بھی شفق کے متعلق اختلاف کیا ہے کہ بعض نے سپیدی کو بتلایا ہے اور بعض نے سرخی کو جو لوگ سرخی بتاتے ہیں ان میں حضرتِ ابن عباس، ابنِ عمر، عبادہ بن الصامت اور شداد بن اوس (رضی اللہ عنہم) ہیں اور جن سے یہ مروی ہے کہ شفق سپیدی ہے ان میں حضرتِ عمر بن الخطاب، معاذ بن جبل

---

[1] النہایہ فی غریب الحدیث والاثر، باب الشین مع الفاء

اور عمر بن عبد العزیز ہیں[1] (رضی اللہ عنہم)
آگے چل کر لکھتے ہیں :-
"جب لوگوں نے شفق میں اختلاف کیا اور بعض
کہنے والوں نے سرخی کہا اور دوسروں نے
سپیدی؛ تو ہمیں معلوم ہوا کہ یہ نام دونوں معنی
کو شامل ہے اور لغت میں دونوں کے لئے آتا
ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ لوگ شفق کی تفسیر ان دونوں
معنی سے نہ کرتے کیونکہ وہ لوگ اسمار لغویہ اور شرعیہ
کے معانی کے عالم تھے، دیکھتے نہیں جب علمار نے
قرء کے معنی میں اختلاف کیا اور بعض نے حیض
کے معنے بتائے اور بعض نے طہر کے تو اس سے
یہ ثابت ہوا کہ یہ لفظ دونوں معنی کے لئے آتا ہے
ہاں اس کے بعد یہ ضرورت پڑتی ہے کہ آیت
میں ان میں سے جو مراد ہے اس کی دلیل معلوم
کریں، اور ہم سے ابو عمرو غلام ثعلب نے بیان
کیا کہ ثعلب سے شفق کے بارے میں سوال کیا
گیا کہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا سپیدی، سائل نے
کہا کہ شواہد سرخی کے زیادہ ہیں، ثعلب نے جواب
دیا کہ جو غیر حاضر ہو اس کے لئے شاہد کی ضرورت
پیش آتی ہے، بیاض (سپیدی) تو لغت میں
اس سے زیادہ مشہور ہے کہ اس کے لئے
کسی شاہد کی ضرورت ہو۔
ابوبکر کہتے ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ شفق کی
اصل رقت ہے اور اسی سے ثوب شفق
(رقیق کپڑا) بولا جاتا ہے نیز اسی سے شفقۃ
ہے جس کے معنی رقتِ قلب کے ہیں اور جب
اس کی اصل یہ ٹھہری تو سپیدی کو شفق سے
زیادہ خصوصیت ہونی چاہئے کیونکہ شفق سے
مراد آفتاب کی روشنی کے باقیماندہ اجزا رقیقہ
ہیں اور یہ اجزا سرخی کی بہ نسبت سپیدی میں
زیادہ رقیق ہوتے ہیں " [2]
اخیر بحث میں ایک اور دلیل پیش کی ہے فرماتے ہیں:
"ایک اور چیز جس سے اس پر استدلال ہوتا
ہے کہ شفق سے مراد بیاض ہے یہ ہے کہ ہم آفتاب
کے طلوع ہونے سے پہلے سرخی اور اس سے قبل
سپیدی کو پاتے ہیں اور سب ایک ہی نماز کا
وقت ہے کیونکہ دونوں کی دونوں بغیر قرص
آفتاب کے ظاہر ہوئے اسی کی روشنی سے
ہوتی ہیں اسی طرح یہ ضروری ہے کہ غروب
آفتاب کے بعد بھی سرخی و سپیدی ایک ہی

---

[1] احکام القرآن، ج ۲، ص ۳۴۴ (طبع مصر ۱۳۴۷ھ)
[2] ایضاً، ج ۲، ص ۳۳۶

نماز کا وقت ہوں، اسی علت کی بنا پر جسے ہم نے بیان کیا ہے[1] تو ۳۰/۹

**شَفِیْعٌ**: شفاعت کنندہ، سفارشی، سفارش کرنیوالا، شَفَاعَۃٌ سے بروزن فَعِیْلٌ بمعنی فَاعِلٌ ہے

۷/۱۲،۱۴ ۱۱/۶ ۲۱/۱۴ ۲۴/۷

## فصل القاف

**شِقٌّ**: مشقت، جانکاہی، راغب لکھتے ہیں کہ شِقٌّ وہ مشقت اور تکان ہے جو انسان کے نفس اور بدن کو لاحق ہوتی ہے بعض نے اس کو شَقَّ یَشُقُّ کا مصدر بتایا ہے یعنی دشواری میں پڑنے اور دشواری میں ڈالنے کے اور بعض نے اسم قرار دیا ہے، ۱۴/۷

**شَقًّا**: چیرنا، پھاڑنا، شَقَّ یَشُقُّ کا مصدر ہے، ۳۰/۵

**شِقَاقٌ**: ضد، مخالفت، مقابلہ، اپنے دوست کی شق کو چھوڑ کر دوسری شق میں ہونا، باب مفاعلت کا مصدر ہے، علامہ ابوحیان اندلسی البحر المحیط میں لکھتے ہیں :-

"شِقَاقٌ مصدر ہے، شَاقَّہٗ کا جس طرح کا ضارب ضِراباً اور خالف خِلافاً ہوتے ہیں اور اس کے معنی عداوت رکھنے اور مخالفت کرنے کے ہیں اس کی اصل شَقٌّ سے ہے یعنی یہ ایک شق میں جا اور وہ ایک شق میں شِقٌّ طرف کو کہتے ہیں چنانچہ شاعر کہتا ہے ؎

اذا ما بکی من خلفها انحرفت لہ
بشق وشق عندنا لم یحول

(جب بچہ اس کی پشت پر سے روتا ہے تو وہ ایک جانب سے اس کی طرف مڑ جاتی ہے اور اس کی ایک طرف ہماری جانب رہتی ہے جو نہیں بدلتی)

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مَشَقَّۃٌ سے ماخوذ ہے کیونکہ دونوں میں سے ہر ایک اس چیز کا خواہشمند ہوتا ہے کہ جو دوسرے کو شاق ہو"۔[2]

۱/۱۶ ۷/۵ ۵/۴ ۱۷/۱۴ ۲۳/۱ ۲۵/۱

**شِقَاقِیْ**: میری مخالفت، میری عداوت، شِقَاقٌ مضاف، ی ضمیر واحد متکلم، مضاف الیہ، ۱۲/۸

**شَقَقْنَا**: ہم نے چیرا، ہم نے پھاڑا، شَقٌّ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، ۳۰/۵

**شَقُوْا**: وہ بدبخت ہوئے، شَقَاوَۃٌ سے ماضی

---

[1] احکام القرآن، ج ۲، ص ۳۳۹

[2] البحر المحیط، ج ۱، ص ۳۹۸

صیغہ جمع مذکر غائب (ملاحظہ ہو تَشْقٰی)، ۱۲/۹

**شِقْوَتُنَا**: ہماری کمبختی، شِقْوَۃٌ مضاف، نَا ضمیر جمع متکلم، مضاف الیہ، شِقْوَۃٌ، شَقِیَ یَشْقٰی کا مصدر ہے جس کے معنی بدبخت ہونے کے ہیں، ۱۸/۶

**شُقَّۃٌ**: مسافت، راغب نے شُقَّۃ کے معنی اس سمت کے لکھے ہیں جہاں پہنچنے تک مشقت لاحق ہو جائے، یہاں غزوۂ تبوک کی مسافت مراد ہے، ۱۰/۱۲

**شَقِیٌّ**: بدبخت محروم، شَقَاوَۃٌ سے بروزن فَعِیْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ ہے، اَشْقِیَاءُ جمع، ۱۲/۹

**شَقِیًّا** ۱۶/۴، ۵، ۶

## فصل الکاف

**شَکٌّ**: شک، شَکَّ یَشُکُّ کا مصدر ہے جس کے معنے شک کرنے کے ہیں نیز بطور اسم بھی مستعمل ہوتا ہے اور شُکُوْکٌ جمع آتی ہے، راغب اصفہانی لکھتے ہیں:-

"انسان کے نزدیک دو نقیضوں کے برابر اور مساوی ہونے کا نام شک ہے، یہ یا تو اس بنا پر ہوتا ہے کہ دونوں نقیضوں کی علامتیں مساوی طور پر پائی جاتی ہیں اور یا اس بنا پر کہ دونوں میں علامت نہیں ہوتی۔

شک کبھی تو اس شے ہی میں ہوتا ہے کہ موجود بھی ہے یا نہیں اور کبھی اس کی جنس میں کہ کس جنس سے ہے اور کبھی اس کی کسی صفت میں اور کبھی اس کی غرض کے بارے میں کہ جس کے لئے وہ شے وجود میں لائی گئی۔

شک جہل ہی کی ایک قسم ہے لیکن جہل سے اخص ہے کیونکہ جہل میں کبھی سرے سے نقیضین کا علم ہوتا ہی نہیں پس ہر شک جہل ہے لیکن ہر جہل شک نہیں، ارشاد ہے فِیْ شَکٍّ مُرِیْبٍ (ایسے تردد میں جو چین نہ لینے دے) بَلْ هُمْ فِیْ شَکٍّ یَّلْعَبُوْنَ (کوئی نہیں وہ دھوکے میں ہیں کھیلتے) فَاِنْ کُنْتَ فِیْ شَکٍّ (سو اگر تو ہے شک میں)۔

شَکٌّ کا اشتقاق یا تو شَکَکْتُ الشَّیْءَ سے ہے جس کے معنی ہیں میں نے اس کو چاک کر ڈالا شاعر کہتا ہے ؎

وشککت بالرمح الاصم ثیابہ
لیس الکریم علی القنا بمحرم

(اور میں نے ٹھوس نیزے سے اس کے کپڑے

دزرہ وغیرہ جنگ کا لباس کا مراد ہے) پھاڑ کر ڈالے نیزے پر باعزت آدمی حرام نہیں ہے)۔

گویا "شک" کسی شے کا چاک ہونا اور اس طرح ہوجانا ہے کہ رائے اس میں جمنے کے لئے اپنا کوئی ٹھکانہ نہ بنا سکے اور یہ بھی صحیح ہوسکتا ہے کہ اس شک سے مستعار ہو جس کے معنی بازو کے پہلو سے چپکنے کے ہیں۔ یہ اس طرح کہ (شک میں) دونوں نقیضیں باہم اس طرح مل جاتی ہیں کہ سمجھ اور رائے کو ان کے درمیان گھسنے کا موقع نہیں ملتا۔ اہلِ عرب جو التبس الامر (معاملہ مشتبہ ہوگیا) اختلط الامر (معاملہ گڈمڈ ہوگیا) اشکل الامر (معاملہ مشکل ہوگیا) وغیرہ استعارات استعمال کرتے ہیں وہ بھی اسی معنی کے شاہد ہیں"

٦/٢ ، ٩/١٥،١٦ ، ١٢/١٠،٦ ، ١٣/١٤ ، ٢٠/١ ، ١٤/١٢،٨ ، ٢٣/١٠ ، ٢٤/٢،٩

٢٥/١٤،٢

**شَكَرَ**: اس نے شکر کیا، اس نے قدر جانی۔ اس نے حق مانا، شُکْرٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ١٩/١٨ ، ٢٧/٩

**شُكْرًا**: شکر کرنا، احسان ماننا۔ قدر پہچاننا شَكَرَ يَشْكُرُ کا مصدر ہے۔ امام راغب لکھتے ہیں:

"شکر نعمت کے تصور اور اس کے اظہار کو کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ کُشْرٌ سے مقلوب ہے جس کے معنی کھولنے کے ہیں اور کُفْرٌ اس کی ضد ہے جس کے معنی نعمت کے بھلانے اور اس کے چھپانے کے ہیں، دابۃ شکور وہ جانور ہے جو اپنی فربہی سے اپنے مالک کی رکھوالی کا پتہ دے رہا ہو۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اس کی اصل عین شکری ہے یعنی وہ چشمہ جو کہ پُر ہو اس اعتبار سے اپنے منعم کے ذکر سے اوقات کے پُر ہوجانے کا نام شکر ہے"

علامہ لغوی مجدالدین فیروزآبادی بصائر ذوی التمییز فی لطائف کتاب اللہ العزیز میں رقمطراز ہیں کہ:-

"شکر پانچ قاعدوں پر مبنی ہے اول شاکر کی مشکور کے لئے فروتنی، دوسرے اس سے محبت کرنا، تیسرے اس کی نعمت کا معترف ہونا، چوتھے اس نعمت کی بنا پر اس کی ثنا کرنا، پانچویں اس نعمت کو ایسی جگہ استعمال میں نہ لانا جہاں وہ ناپسند کرے۔ یہ پانچ باتیں شکر کی اساس ہیں اور ان ہی پر اس کی بنیاد ہے

Marfat.com

اگر ان میں سے ایک بھی معدوم ہوئی تو شکر کے قواعد میں سے ایک قاعدہ مختل ہوگیا۔ شکر کے بارے میں جس نے بھی کلام کیا ہے اس کا کلام ان ہی امور کی طرف راجع اور ان ہی میں دائر ہے[1]"۔

آیۂ کریمہ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا (کام کرو اے داؤد کے گھر والو احسان مان کر) کے متعلق امام راغب نے لکھا ہے کہ "بعض نے کہا ہے کہ شُکْرًا بربنائے تمیز منصوب ہے یعنی جو کچھ بھی تم عمل کرتے ہو اس کو اللہ تعالیٰ کے شکر کے لئے کرو اور بعض نے کہا ہے کہ شُکْرًا، اِعْمَلُوْا کا مفعول ہے اور اِعْمَلُوْا فرمایا گیا اُشْکُرُوْا نہیں فرمایا گیا، یا اس لئے کہ شکر کے انواع سہ گانہ (شکر قلبی، شکر لسانی اور شکر جمیع اعضا جوارح) کے التزام پر متنبہ کردیا جائے۔ (ملاحظہ ہو اَشْکُرْ اور حَمْد) ۳۴/۸

**شَکَرْتُمْ**: تم نے شکر کیا، تم نے حق مانا، تم نے احسان مانا۔ شَکَرَ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، ۵/۹ ۱۴۷/۱۴

**شَکْلِهٖ**: اس کی شکل، شَکْلِ مضاف، ہ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، شَکْل کے معنی مثل اور مانند کے ہیں، اَشْکَال جمع، واضح رہے کہ شکل کا استعمال ہیئت و صورت کے بارے میں ہوتا ہے اور نِدّ کا جنسیت میں اور شِبْہ کا کیفیت میں۔ ۲۳/۱۲۔

**شَکُوْرٌ**: بڑا شکر گزار، بڑا احسان ماننے والا، بڑا قدردان، شُکْرٌ سے بروزن فَعُوْلٌ صفت کا صیغہ ہے، مبالغہ کے اوزان میں سے ہے، مذکر و مؤنث دونوں کے لئے یکساں استعمال ہوتا ہے، شُکُرٌ جمع ہے، شکور وہ بندہ ہے کہ جو اطاعتِ الٰہی اور اس عبادت کی بجا آوری کے ذریعہ کہ جو اس پر مقرر کی گئی ہے، حق تعالیٰ کی شکر گزاری میں خوب کوشاں ہو، یہ بھی واضح رہے کہ شَکُوْرٌ اسمائے حسنٰی میں سے ہے جب اللہ سبحانہ کی صفات میں اس کا استعمال ہوگا تو اس کے معنی بڑے قدردان یعنی تھوڑے کام پر بہت ثواب دینے والے کے ہوں گے، ۱۳/۱۲ ۲۱/۱۳ ۳۲/۱۶،۸ ۳۵/۵،۳ ۳۸/۱۶

**شَکُوْرًا** ۱۵/ب

**شُکُوْرًا**: شکر گزاری شکر کرنا۔ شَکَرَ یَشْکُرُ کا مصدر ہے۔ ۱۹/۴ ۲۹/۱۹

---

[1] تاج العروس، فصل الشین، باب الراء

## فصل المیم

**شِمَال**: جانبِ شمال، بائیں طرف، یمینٌ کا مقابل ہے، اسم ہے اَشْمُلٌ اور شُمُلٌ جمع، ۱۴/۱۵،۱۴ ۱۲/۸ ۲۶/۱۶ ۲۷/۱۵ ۲۹/۹

**شِمَالِہٖ**: اس کی بائیں طرف، شِمَالِ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ۲۹/۵

**شَمَآئِل**: بائیں طرف، بائیں جانب شِمَالٌ کی جمع خلافِ قیاس۔ ۱۴/۱۲

**شَمَآئِلِھِمْ**: ان کے بائیں سے، شَمَآئِلِ مضاف ھِمْ ضمیر مذکر غائب مضاف الیہ ۸/۹

**شَمْس**: سورج کو بھی کہتے ہیں اور دھوپ کو بھی، شُمُوْسٌ جمع، ۳/۳ ۷/۱۸،۱۵ ۸/۱۴ ۱۱/۶ ۱۲/۱۱ ۱۳/۱۷،۷ ۱۴/۸ ۱۵/۱۴،۹ ۱۶/۱۷،۲ ۱۷/۹،۱۳ ۱۹/۱۷،۳ ۲۱/۱۲،۲ ۲۲/۱۴ ۲۳/۱۵،۲ ۲۴/۱۹ ۲۶/۱۷ ۲۷/۱۱ ۲۹/۱۷،۹ ۳۰/۱۶،۲

**شَمْسًا** ۲۹/۱۹

## فصل النون

**شَنَاٰنُ**: دشمنی کرنا، بغض رکھنا۔ یہ مصدر سماعی ہے خلافِ قیاس، اس کا فعل فَتَحَ اور سَمِعَ دونوں سے آتا ہے۔ ۶/۶،۵

## فصل الواو

**شُوَاظٌ**: شعلے، آنچ جس میں دھواں نہ ہو، اسم ہے، ۲۷/۱۲

**شَوْبًا**: ملونی، ملاوٹ، آمیزش۔ شَابَ یَشُوْبُ کا مصدر ہے، ۲۳/۶

**شُوْرٰی**: مشورہ کرنا۔ قاضی شوکانی لکھتے ہیں کہ :-

• شورٰی، شاورتہ (بابِ مفاعلت) کا مصدر ہے جیسے کہ بُشْرٰی ذِکْرٰی ہے۔[1] ۲۵/۵

**شَوْکَۃ**: کانٹا، شوکت، شوکت کے معنی اصل میں تو کانٹے کے ہیں اور مجازاً اختیار اور سختی کے معنی میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے، ۹/۱۵

**شَوٰی**: کلیجہ، منہ کی کھال، سر کی کھوپڑی [...] میں اس کا استعمال تینوں معانی میں ہوتا ہے [...] لکھتے ہیں کہ شَوٰی کے معنی اطراف البدن کے [...] جیسے کہ ہاتھ اور پیر، یہ شَوَاۃٌ کی جمع ہے جیسے کہ [...] نَوَاۃٌ کی ہے علامہ ابوحیان اندلسی نے اس [...] حسبِ ذیل معانی نقل کئے ہیں: سر کی کھال، [...]

[1] فتح القدیر، ج ۴، ص ۵۲۶ (طبع مصر ۱۳۵۰ھ)

Marfat.com

کی کھال، حیوان کے ہاتھ پاؤں ہر عضو کہ جہاں سے قتل نہ کیا جاتا ہو[1]، اور سر کی کھوپڑی وغیرہ کے معنی کتب لغت میں مذکور ہیں، ۲۹/۵

## فصل الھاء

**شِہَابٌ**: انگارا، فضا میں جو تارا ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے، ابن السکیت اور ابوالہیثم سے انگارے ہی کے معنی منقول ہیں اور راغب نے شہاب کے معنی اس چمکدار شعلے کے بتائے ہیں جو بھڑکتی ہوئی آگ میں یا فضا میں ابر کے اندر ہوتا ہے، شُہُبٌ، شُہْبَانٌ، شِہْبَانٌ، اَشْہُبٌ جمع، ۳۷/۲، ۱۹/۱۶، ۷۲/۵

**شِہَابًا** ۲۹/۱۱

**شَہٰدٰتٌ**: گواہیاں، شَہَادَۃٌ کی جمع ہے، (ملاحظہ ہو شَہَادَۃٌ) ۵/۱

**شَہٰدٰتِہِمْ**: ان کی گواہیاں، شَہَادَاتِ مضاف ہِمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ، ۲۹/۷

**شَہَادَتُنَا**: ہماری گواہی، شَہَادَۃ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم، مضاف الیہ، ۷/۵

**شَہَادَتُھُمْ**: ان کی گواہی، شَہَادَۃُ مضاف ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ۔ ۲۵/۸

**شَہَادَتِہِمَا**: ان دونوں کی گواہی، شَہَادَۃِ مضاف ہِمَا ضمیر تثنیہ مذکر غائب، مضاف الیہ، ۵/۴

**شَہَادَۃٌ**: گواہی، قطعی خبر، ظاہر، کھلا، اصل میں تو یہ شَہِدَ یَشْہَدُ کا مصدر ہے لیکن اسم ہو کر بھی استعمال ہوتا ہے، شَہَادَاتٌ جمع، امام راغب لکھتے ہیں :

"شُہُوْدٌ اور شَہَادَۃٌ کے معنی اس کے حضور (موجود رہنا، سامنے ہونا) کے ہیں جو مشاہدہ کے ساتھ ہو، خواہ مشاہدہ بصر کے ساتھ ہو یا بصیرت کے ذریعہ اور کبھی صرف حضور کو بھی کہتے ہیں جیسے عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّہَادَۃِ (دانائے غیب وظہور ہے) لیکن شُہُوْد کا استعمال حضور مجرد کے ساتھ اولیٰ ہے اور شَہَادَۃ کا اس حضور کے لئے کہ جو مشاہدہ کے ساتھ ہو، نیز شہادۃ وہ بیان ہے جو اس علم کی بنا پر سرزد ہو کہ جو مشاہدہ بصیرت یا مشاہدہ بصر کے ذریعہ حاصل ہوا ہو۔"

۱/۱۶، ۳/۷، ۶/۴،۸،۱۵، ۱۱/۱،۲، ۱۳/۸، ۲۲/۵،۷، ۲۱/۱۴، ۲۴/۲، ۲۵/۶،۱۱،۱۶،۱۷

[1] دیکھو البحر المحیط، ج ۸، ص ۳۳۰

Marfat.com

**شُهُبًا**: انگارے، شِهَاب کی جمع جس طرح کہ کُتُب کِتَاب کی جمع ہے، ۲۹/۱۱

**شَهِدَ**: اس نے پایا، اس نے گواہی دی، پہلے معنی کے اعتبار سے شُهُود سے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے شَهَادَة سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب
راغب لکھتے ہیں:-

"شَهِدَ کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے ایک تو علم کی جگہ آتا ہے اور اسی لفظ سے شہادت قائم ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے اشہد بکذا (میں گواہی دیتا ہوں) اور گواہ کا اَعْلَمُ کہنا قبول نہیں بلکہ اشہد کہنے کی ضرورت ہے، اور دوسرے قسم کے مقام پر چنانچہ اشہد باللہ ان زیداً منطلق (میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ زید چل رہا ہے) کہے گا تو قسم ہو جائیگی، اور بعض نے کہا ہے کہ اگر اَشْهَدُ ہی کہا بِاللّٰہِ نہ کہا تب بھی قسم ہو جائے گی"

۲/۷ ۳/۱۰ ۱۴/۱۳ ۱۴/۱۷ ۲۵/۱۳ ۲۶/۱

**شَهَدَآءَ**: موجودین، حاضرین، شاہد لوگ، گواہ بنانے والے، شہادت پانے والے، شہید، علامہ ابوحیان اندلسی لکھتے ہیں:-

"شُهَدَآءُ شَهِيْدٌ کی جمع ہے جو مبالغہ کے لئے ہے جیسے کہ علیم اور علماء، یہ بھی بعید نہیں کہ شاہد کی جمع ہو جیسے کہ شاعر اور شعرآء، پر فُعَلَآءُ فَاعِل کا باب نہیں ہے۱"
اور آگے چل کر لکھا ہے کہ:-
"اس کا شہید کی جمع ہونا شاہد کی جمع ہونے سے زیادہ بہتر ہے کہ فعیل کی جمع کے قاعدہ پر جاری ہے۲"

۱/۱۶ ۲/۱ ۳/۷ ۴/۱،۷ ۵/۱۷،۶ ۶/۱۱،۶ ۸/۹ ۱۴/۱۴
۱۸/۸،۷ ۲۲/۳ ۲۷/۱۸

**شُهَدَآءَكُمْ**: تمہارے مددگار، تمہارے گواہ، شُهَدَآءَ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، مضاف الیہ، آیۂ کریمہ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ کی تفسیر بر اس شے سے کی گئی ہے کہ شہادت کے معنی جس کے متقضی ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مددگار کے معنی لئے ہیں، مجاہد نے کہا ہے کہ جو لوگ تمہاری گواہی دیں، بعض کا قول ہے کہ جن کے موجود ہونے کا اعتبار ہو، ۱/۲۳

**شَهِدْتُمْ**: تم نے بتلایا، تم نے گواہی دی، شَهَادَة سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، ۲۲/۱۷

۱ البحر المحیط، ج ۱ ص ۱۰۲

۲ ایضاً، ص ۱۰۶

شَہِدْنَا: ہم نے اقرار کر لیا، ہم نے بیان کیا، ہم موجود تھے، ہم نے دیکھا، شُھُوْدٌ اور شَھَادَۃ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، راغب نے لکھا ہے کبھی شہادت سے اقرار کرنا بھی مراد ہوتا ہے، ۷/۲ ۹/۱۲ ۱۳/۲ ۱۹/۱۹

شَہِدُوْا: انہوں نے گواہی دی، انہوں نے اقرار کیا، وہ موجود تھے، انہوں نے دیکھا، شُھُوْدٌ اور شَھَادَۃ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، ۳/۱۷ ۷/۱۱ سورہ ۱۱/۳ ۲۵/۸

شَہْرٌ: مہینہ، اَشْھُرٌ اور شُھُوْرٌ جمع، مہینہ کی دو قسمیں ہیں قمری جس کا شمار چاند کے دیکھنے سے ہوتا ہے اور شمسی جس کا شمار آفتاب کے ایک برج سے دوسرے برج میں داخل ہونے سے ہوتا ہے۔ احکام شرعی میں قمری ماہ کا اعتبار ہے، مہینہ کا نام شہر اس لئے ہوا کہ لوگوں میں اس کے شروع ہونے اور گزر جانے کی شہرت ہوتی ہے۔ ۲/۱۱ ۵ ۷/۲ ۳/۸ ۳۰/۲۲، شَہْرًا ۱/۱۱ ۲۶/۲

شَہْرَیْنِ: دو مہینے، شَہْرٌ کا تثنیہ بحالت نصب و جر، ۵/۱ ۲۸/۲

شَہَوَاتِ: مرغوب چیزیں، مزے شَہْوَۃ کی جمع، ۳/۱ ۵/۲ ۱۱/۲

شُہُوْدٌ: اپنی آنکھوں سے دیکھنے والے، حاضرین، موجودین، شاہد، شَاھِدٌ کی جمع ہے جیسے کہ سُجُوْدٌ سَاجِدٌ کی، ۲۹/۱

شُہُوْدًا ۱۱/۱۲ ۲۹/۱۵

شُہُوْرِ: مہینے، شَہْرٌ کی جمع ہے، ۱۱/۱۱

شَہْوَۃٌ: شہوت، للچانا، خواہش کرنا، آرزو کرنا، مصدر ہے، اس کا فعل باب نَصَرَ اور سَمِعَ دونوں سے آتا ہے، مصباح میں ہے کہ شہوۃ کسی شے کی طرف نفس کے اشتیاق کا نام ہے، اس کی جمع شَہَوَاتٌ آتی ہے، امام راغب لکھتے ہیں:-

" شہوۃ، اصل میں جس چیز کی تمہیں خواہش ہو اس کی طرف جی کے للچانے کو کہتے ہیں، دنیا میں اس کی دو قسمیں ہیں، ایک سچی، دوسرے جھوٹی، شہوتِ صادقہ تو وہ ہے جس کے بغیر بدن مختل ہو جائے جیسے بھوک کے وقت کھانے کی اشتہار ہوتی ہے، اور شہوتِ کاذبہ وہ ہے جس کے بغیر بدن میں اختلال نہ ہو اور کبھی مشتہی (جس چیز کی چاہت ہو) اس کو بھی شہوت سے موسوم کرتے ہیں، نیز اس قوت کو بھی جو کسی شے کی اشتہار کرتی ہے شہوت کہا جاتا ہے، آیۂ شریفہ زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّہَوَاتِ (بناوٹ رکھ دی گئی ہے

لوگوں کے لئے مزوں کی چاہت ہیں) دونوں شہوتوں کی محتمل ہے اور ارشاد اِتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ (پیچھے ہو لئے مزوں کے) یہ جھوٹی شہوتیں اور ایسی مشتہیات ہیں کہ جن سے استغنار ہونا چاہئے۔

**شَہِیْدٌ**: گواہ، شاہد، نگران احوال کرنے والا، اقرار کرنے والا، امام راغب نے لکھا ہے کہ شہید[1] شاہد کو بھی کہا جاتا ہے اور کسی چیز کے مشاہدہ کرنے والے کو بھی، علامہ ابو السعادات مبارک ابن الاثیر جزری، النہایہ فی غریب الحدیث والآیہ میں رقمطراز ہیں:-

"حق تعالیٰ کے اسماء میں شہید وہ ذات ہے جس کے علم سے کوئی چیز غائب نہ ہو اور شاہد کے معنی حاضر کے ہیں، فعیل فاعل کے معنی میں مبالغہ کے اوزان سے ہے، جب مطلق علم کا اعتبار ہو تو اللہ علیم ہے اور امور باطنہ کا خیال کیا جائے تو خبیر ہے اور امور ظاہرہ کی طرف نسبت ہو تو شہید ہے اور کبھی اس معنی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ ہوتا ہے کہ وہ قیامت میں خلق پر گواہ ہوگا۔"[2]

اور شرع میں شہید وہ شخص ہے جو اللہ کی راہ میں قتل کیا گیا ہو، شاہ عبد القادر صاحب دہلوی موضح القرآن سورۂ نساء میں زیر آیۃ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ الآیۃ فرماتے ہیں:-

"نبی وہ لوگ جن کو اللہ کی طرف سے وحی آوے یعنی فرشتہ ظاہر میں پیغام کہہ جاوے اور صدیق وہ کہ جو وحی میں آوے ان کا جی آپ ہی اس پر گواہی دے اور شہید وہ جن کو پیغمبر کے حکم پر ایسا صدق آیا کہ اس پر جان دیتے ہیں اور نیک بخت (صالح) وہ جن کی طبیعت نیکی ہی پر پیدا ہوئی ہے۔"

اس معنی میں شہید کا اشتقاق آیا شَہَادَۃٌ سے ہے یا مُشَاہَدَۃٌ سے یا شُہُوْدٌ سے نیز فَعِیْلٌ بمعنی فَاعِلٌ ہے یا مَفْعُوْلٌ ہے اس پر علامہ ابو القاسم عبد الرحمٰن سہیلی نے الروض الانف میں نفیس بحث لکھی ہے جس کا اقتباس ہدیۂ ناظرین ہے، فرماتے ہیں:-

"یہ اسم شَہَادَۃٌ سے ماخوذ ہے یا مُشَاہَدَۃٌ سے اگر شَہَادَۃٌ سے ہے تو شَہِیْدٌ بمعنی مَشْہُوْدٌ ہے یعنی اس کے حق میں جنت کی

---

[1] ابن سیدہ کہتے ہیں یعنی وہ جاننے والا کہ جو جانے بیان کردے، (تاج العروس)

[2] النہایہ باب الشین مع الیاء

شہادت دی گئی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شَهَادَةٌ ہی سے ماخوذ ہو اور فَعِيلٌ بمعنے فَاعِلٌ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ یعنی تم لوگوں پر گواہی دو گے اور یہ چیز گو ساری امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کے بارے میں عام ہے پر شہداء کے لئے یہ نام اولیٰ ہے کیونکہ وہ صدیقین وانبیاء کے پیچھے ہی ہیں اللہ سبحانہ فرماتا ہے فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَآءِ سو شہید کے معنی میں یہ دو وجہیں تو جب ہیں کہ اس کو شَهَادَة سے مشتق قرار دو۔"

اور اگر مُشَاهَدَة سے ماخوذ ہو تب بھی فَعِيلٌ بمعنی فَاعِلٌ ہے کہ شہید ملکوتِ الٰہی کا شاہدہ کرتا اور اللہ کے ان فرشتوں کا معائنہ کرتا ہے جنہیں اور کوئی نہیں دیکھتا اور مُشَاهَدَة سے بمعنی مَفْعُولٌ بھی ہو سکتا ہے یعنی باین معنی کہ فرشتے اس کے فیض اور اس کی روح کے عروج کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

ان سب وجہوں میں صحت کے اعتبار سے اولیٰ یہی ہے کہ فَعِيلٌ بمعنی مَفْعُولٌ ہو اور معنی یہ ہوں گے کہ اس کے لئے جنت کی شہادت دی گئی ہے یا نبی علیہ السلام کی اس کے لئے شہادت ہو گی چنانچہ آپ کا ارشاد ہے کہ هٰؤُلَآءِ الذین اشهد علیهم (یہ وہ لوگ ہیں جن پر میں گواہی دوں گا) پس یہ وجہ بحیثیت حدیث کے بھی قوی ہے اور بلحاظ عربیت ایک اور وجہ سے بھی، وہ یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب شہداء کا ذکر کیا تو فرمایا والمرأة تموت بجمع شهيد (اور عورت کی زچگی سے مرے شہید ہے) اور شَهِيدَة نہیں فرمایا، اور دوسری روایت میں ہے کہ والنفساء شهيد يجرها جنينها بسرره الى الجنة (نفاس والی عورت شہید ہے اسے اس کا بچہ اپنے نال سے جنت کی طرف کھینچے گا) پر شَهِيدَة نہیں فرمایا اور فَعِيل جب مؤنث کی صفت ہو تو تا اسی وقت میں نہ ہو گی جبکہ وہ بمعنے مَفْعُولٌ ہو جیسے امرأة قتيل اور جرحیٰ ہیں اور اگر بمعنے فاعلٌ ہو تو مؤنث تا کے ساتھ آئے گی جیسے امرأة علیمة اور رحیمة وغیرہ ہیں اس سے پتہ چلا کہ شہید بمعنی مشهود (جس کے لئے گواہی دی گئی ہو) اور مشهود علیہ (جس پر گواہی دی گئی ہو) ہوتا ہے اور یہ لغت سے تو

Marfat.com

استقراء صحیح اور حدیث سے استنباط بدیعہ ہے

سو علم میں ہے،، لہ

**شُهَدَآءَ**: جمع، ٢/٧ ، ٤/١ ، ٥/٢ ، ٦/٨،٦ ، ١١/١٠ ، ١٤/٩ ، ٢٣/١٢
٢٥/١ ، ٢٦/١٦،١٧ ، ٢٩/١ ، ٣٠/٢٥،١٠

**شَهِيدًا**: ٢/١ ، ٥/٢،٣،٧،٨ ، ٦/٢،٣ ، ٧/٦ ، ١١/٨
١٣/١٢ ، ١٤/١٨ ، ١٥/١١ ، ١٦/١٧ ، ٣٠/١٠ ، ٢١/٢ ، ٢٢/٤ ، ٢٦/١١،١٢

**شَهِيدَيْنِ**: دو گواہ، دو شاہد، شَهِيدٌ کا تثنیہ بحالت نصب و جر، ٣/٦

**شَهِيقٌ**: دھاڑنا، چلانا، سائیں سائیں کرنا، گدھے کا آواز کرنا، مصدر ہے، اس کا فعل باب ضَرَبَ، سَمِعَ اور فَتَحَ تینوں سے استعمال ہوتا ہے۔ ١٢/٩ ، **شَهِيقًا** ٢٩/١

## فصل الیاء المثناة

**شَيْءٌ**: چیز، کچھ، علامہ ابو السعود بن محمد العمادی اپنی مشہور تفسیر ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم میں رقمطراز ہیں:-

" لفظِ شَيْءٌ اپنے مفہومِ لغوی کے اعتبار سے ہر اس چیز کے لئے آتا ہے کہ جس کو معلوم کیا جا سکے اور اس کے متعلق خبر دی جا سکے، خواہ کچھ ہی ہو، یہ اصل میں شَآءَ کا مصدر ہے جو ایک مفہوم کے لئے بولا جاتا ہے اور اس مفہوم میں صرف اس پر اکتفاء کی گئی ہے کہ اس سے مشیئت کے تعلق کا اعتبار ہو، خواہ علم کی حیثیت سے خواہ خبر دینے کی حیثیت سے "

علامہ حسن بن محمد نظام نیشاپوری تفسیر غرائب القرآن و رغائب الفرقان میں لکھتے ہیں:-

" لفظِ شَيْءٌ اعم العام ہے جس طرح کہ اللہ اخص الخاص ہے، یہ جوہر و عرض، قدیم و حادث بلکہ محال و معدوم تک کے لئے آتا ہے۔" لہ

١/٢،٣،١٣،١٤ ، ٢/٢،٣،٦،١٣ ، ٣/٢،٣،٤،٧،١٠،٩،١١
٤/١،٤،٧،٨،١٠،١٢ ، ٥/٢،٥،٨،١٤،١٥
٦/٦،٧،١٠،١٤ ، ٧/٣،٦،٨،١٠،١١،١٢،١٤،١٥،١٨،١٩
٨/١،٥،٦،٧ ، ٩/١،٧،٩،١٣ ، ١٠/١،٤،٩،١٢
١١/٣،١٧ ، ١٢/٢،٥،٧،٩،١٥ ، ١٣/٢،٦،٨،١٥،١٨
١٤/٢،١١،١٢،١٦،١٧،١٨ ، ١٥/٢،٥،١٦،١٨،٢٠،٢١
١٦/١،٢،١١،١٣ ، ١٧/٣،٦،٨،٩ ، ١٨/٥،١١،١٢،١٥،١٦
١٩/٦،٧ ، ٢٠/٣،٩،١٢،١٣،١٤،١٦ ، ٢١/٢،٧،٨،١٤،١٩
٢٢/٢،٣،٤،٨،١٠،١٢،١٣،١٥،١٧،١٨،١٩ ، ٢٣/٤،١٠
٢٤/٣،٤،٧،١٢،١٧،١٩ ، ٢٥/١،٢،٣،٥ ، ٢٦/٣،٤،١١

لہ الروض الانف، ج ٢، ص ١٥١ (طبع جمالیہ مصر ١٣٣٢ھ)

۲۶/۱۴،۱۵ ، ۲۷/۱،۲،۳،۴،۸،۱۰،۱۷،۲۰ ، ۲۸/۱،۲،۳،۴ ، ۲۹/۷،۸،۱۵،۱۶،۱۷،۱۸،۲۰ ، ۲۹/۱،۲،۱۲ ، ۳۰/۱،۵،۱۰

**شَیْئًا** ۱/۵۳ ، ۲/۵،۱۰،۱۳ ، ۳/۷،۱۰،۱۵ ، ۴/۶،۹،۱۴ ، ۵ ، ۶/۷،۱۰ ، ۷/۴،۱۱ ، ۸/۶ ، ۹/۱۴،۱۶ ، ۱۰/۷،۱۰،۱۲ ، ۱۱/۹،۱۰ ، ۱۲/۵ ، ۱۳/۸،۱۵،۱۶،۱۷ ، ۱۵/۸،۱۷،۲۲ ، ۱۶/۴،۵،۶،۷،۸،۹ ، ۱۷/۴،۸،۱۱،۱۷ ، ۱۸/۱،۱۳،۱۶ ، ۲۱/۱۳ ، ۲۲/۴ ، ۲۳/۱،۳،۴ ، ۲۳/۲،۱۳ ، ۲۵/۵،۱۷،۱۸ ، ۲۶/۱،۸،۱۰،۱۴ ، ۲۷/۴،۶ ، ۲۸/۲،۱۳ ، ۲۸/۸،۲۰ ، ۲۹/۱۹ ، ۳۰/۷

**شَیَاطِیْنُ**: شیاطین، شَیْطَانٌ کی جمع مکسر ہے (ملاحظہ ہو شَیْطَانٌ) ۱/۱۲ ، ۷/۱،۱۰ ، ۸/۱۵ ، ۱۵/۳ ، ۱۶/۸،۹ ، ۱۷/۹ ، ۱۸/۹ ، ۱۹/۱۵ ، ۲۳/۶،۱۲ ، ۲۹/۱۱

**شَیَاطِیْنِہِمْ**: ان کے شیطان، شَیَاطِیْنِ مضاف ہِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، ۱/۲

**شَیْبًا**: بڑھاپا، سر کے سپید ہونے کو شَیب کہتے ہیں، شَابَ یَشِیْبُ کا مصدر ہے، ۲۱/۴

**شِیْبًا**: بوڑھے، اَشْیَبُ کی جمع جیسے بِیْضٌ اَبْیَضُ کی جمع ہے۔ ۲۹/۱۳

**شَیْبَۃً**: بڑھاپا، بالوں کا سپید ہونا، یہ بھی شَابَ یَشِیْبُ کا مصدر ہے، ۲۱/۹

**شِئْتَ**: تو نے چاہا، مَشِیْئَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر (ملاحظہ ہو شَآءَ) ۹/۹ ، ۱۶/۱ ، ۱۸/۱۵

**شِئْتُمْ**: تم نے چاہا، مَشِیْئَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، ۱/۶ ، ۸/۱۲ ، ۹/۱۰ ، ۲۳/۱۶ ، ۲۴/۱۹

**شِئْتُمَا**: تم دونوں نے چاہا، مَشِیْئَۃٌ سے ماضی کا صیغہ تثنیہ مذکر حاضر، ۱/۴ ، ۸/۹

**شَیْخٌ**: بوڑھا، ابن سیدہ نے المخصص میں اور قزاز نے جامع میں لکھا ہے کہ پچاس سے لے کر اسی برس کے بوڑھے کو شیخ کہتے ہیں[۱]، شُیُوْخٌ اور اَشْیَاخٌ جمع ہے آیہ شریفہ وَاَبُوْنَا شَیْخٌ کَبِیْرٌ (اور ہمارا باپ بوڑھا ہے بڑی عمر کا) میں شیخ کبیر سے کون مراد ہیں، اس کے متعلق حافظ عماد الدین بن کثیر لکھتے ہیں کہ:

"اس بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے کہ یہ شیخ کون ہیں؟ چنانچہ بیان کیا گیا ہے حضرت شعیب علیہ السلام ہیں، اکثر کے نزدیک یہی مشہور ہے اور حضرت حسن بصری اور امام مالک بن انس نے اسی کی تصریح کی ہے اور ایک حدیث میں بھی یہ مصرح آیا ہے لیکن اس کی اسناد میں نظر ہے"[۲]

اس سلسلہ میں حضرت سعد بن سلمہ عنزی رضی اللہ عنہ کی روایت کا ذکر حضرت شعیب علیہ السلام کے تذکرہ

---

[۱] تاج العروس، فصل الشین من باب الخاء

[۲] البدایہ والنہایہ، ج ۱، ص ۲۲۴ (طبع مصر ۱۳۴۸ھ)

Marfat.com

گزر چکا ہے اور ابن ماجہ، بزار، ابن المنذر، ابن ابی حاتم طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت عتبہ بن الندر سلمی سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ایک طویل روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی نقل کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آٹھ یا دس برس تک تو اپنے کو اجرت پر رکھا پھر جب مدت پوری کر چکے تو حضرت شعیب سے جدا ہونے کا ارادہ کیا تو اپنی اہلیہ کو حکم دیا کہ اپنے والدِ بزرگوار سے کچھ بکریاں مانگ لیں کہ جن سے گزران کریں[1]، اس روایت میں بھی حضرت شعیب علیہ السلام کے نام کی تصریح کی ہے لیکن حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس حدیث کا دار و مدار عبداللہ بن لہیعہ مصری پر ہے اور اس کے حافظہ میں خرابی ہے، مجھے یہ ڈر ہے کہ اس کا مرفوع ہونا غلط ہے[2] ۲۰/ ۹

**شَیْخًا**، ۱۱/ ۷۲، ۲۸/ ۲۳

**شَیْطَان**: شیطان، سرکش، شریر، امام محمد ابن جریر طبری فرماتے ہیں:-

"عربی زبان میں ہر سرکش شیطان ہے جن میں سے ہو انسانوں میں سے ہو چوپایوں میں سے ہو غرض ہر شے سے ہو اور اسی طرح ارشاد ہے پروردگار جل شانہ کا وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ (اور اسی طرح کر دیا ہم نے ہر نبی کے لئے دشمن شریر آدمیوں کو اور جنوں کو) تو انسانوں میں سے بھی اسی طرح شیاطین قرار دئے ہیں جس طرح کہ جنوں میں سے قرار دئے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ جب آپ ایک ترکی گھوڑے پر سوار ہوئے، وہ لگا اٹھکھیلیاں کرنے، آپ نے اسے مارنا شروع کیا پر اس کی اٹھکھیلیاں اور بڑھتی ہی گئیں، تب آپ اس پر سے اتر آئے اور فرمانے لگے کہ تم نے تو مجھے شیطان ہی پر سوار کر دیا، میں اس سے اس وقت تک نہیں اترا جب تک میں نے اپنے آپ میں تبدیلی محسوس نہ کی۔"[3]

سیبویہ نے جو لغت عربیت کے امام اہل الکتاب میں کبھی اس کے نون کو زائد لکھا ہے اور کبھی اصلی[4]، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے اشتقاق

[1] الدر المنثور، ج ۵، ص ۱۲۶ (طبع مصر)
[2] تفسیر ابن کثیر، ج ۳، ص ۳۸۶ (طبع مصر)
[3] تفسیر ابن جریر، ج ۱، ص ۳۶، ۳۷ (طبع مصر)
[4] تاج العروس فصل الشین من باب الطاء

میں اختلاف ہے بصریوں کے نزدیک اس کا وزن فَیْعَالٌ ہے لہٰذا اس کا نون اصلی ہے اور شَطَنَ سے مشتق ہے جس کے معنی دور ہونے کے ہیں اور اسم فاعل شَاطِنٌ ہے اور کوفیوں کے نزدیک اس کا وزن فَعْلَانٌ ہے اور نون زائد ہے اور شَاطَ یَشِیْطُ سے مشتق ہے جس کے معنی ہلاک ہونے کے آتے ہیں اس کی مؤنث شَیْطَانَۃٌ ہے اور شَیْطَانٌ کی جمع شَیَاطِیْنُ ہے جس طرح کہ غَرْثَانٌ کی جمع غَرَاثِیْنُ۔ فرّاء نے یہی مثال بیان کی ہے، علامہ ابو حیان نے کہا ہے کہ غَرْثَانٌ کی طرح سے یہ اسی صورت میں ہوگا جب کہ اس کا نون زائد ہو[1]، امام ابو جعفر طبری فرماتے ہیں کہ :-

"ہر شے کو جو سرکش ہو، شیطان سے اس لئے موسوم کیا گیا کہ اس کے اخلاق اور افعال اپنے تمام ہم جنسوں کے اخلاق اور افعال سے جدا ہوتے ہیں اور وہ خیر سے بعید ہوتا ہے اس معنی کے اعتبار سے شَیْطَانٌ شَیْطَنَ سے بروزن فَیْعَالٌ ہے[2]۔"

اور جن لوگوں کے نزدیک کہ شیطان بروزن فعلان ہے اور اس کا اشتقاق شاط سے ہے چونکہ شَیْط کا استعمال جلنے، ہلاک ہونے، جانے، باطل ہونے، غرض کئی معنوں میں ہوتا ہے اور سرکش و متمرد میں یہ ساری صفتیں یکجائی موجود ہیں، وہ دنیا میں غصہ اور حسد سے جیا کرتا ہے اور آخرت میں دوزخ میں جلے گا اور ہلاک ہوگا، خود غلط راہ پر جاتا اور اوروں کو لیجاتا ہے، باطل پر ہے یعنی غلط کار ہوتا ہے اس لئے کسی نے کسی معنی کے اعتبار سے اس کی وجہ تسمیہ بیان کی ہے اور کسی نے کسی معنی کے لحاظ سے، بہر حال اتنا یاد رہے کہ جلنے کے معنی تو حقیقی ہیں اور اور معنی مجازی۔[3]

عرف میں شیطان سے مراد ابلیس علیہ اللعنۃ ہے اور جب الشیطان الف لام کے ساتھ کہا جائیگا یہی مراد ہوگا جس طرح کہ ابلیس اس کا نام اس لئے ہوا کہ اِبْلَاسٌ کے معنی نا امید ہونے کے ہیں اور وہ رحمتِ حق سے نا امید ہے اسی طرح شَطَنٌ کے معنی دور ہونے کے ہیں اور شیطان نیکی سے دور ہے[4] اور شَاطَ یَشِیْطُ کا استعمال غصہ میں جلنے بھننے کے لئے ہوتا ہے اور شیطان آگ سے پیدا ہوا ہے

[1] پوری بحث کے لئے ملاحظہ ہو البحر المحیط، ج ۱، ص ۶۲ (طبع مصر) [2] تفسیر ابن جریر، ج ۱، ص ۴۷ [3] ملاحظہ ہو تاج العروس فصل الشین من باب الطاء،
[4] ابن خالویہ النحوی نے یہی وجہ لکھی ہے ملاحظہ ہو "اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن العظیم، ص ۲۷

Marfat.com

چنانچہ آیۂ شریفہ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (اور بنایا جن کو آگ کی لپٹ سے) اس پر دلالت کرتی ہے اور اسی بنا پر وہ فرطِ قوتِ غضبیہ اور حمیتِ مذمومہ سے مخصوص ہوا اور حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے باز رہا (ملاحظہ ہو اِبْلِیْس)

۱/۴، ۲/۵،۹، ۳/۵،۶،۱۲، ۴/۷،۹، ۵/۳،۶،۷،۸،۱۵، ۷/۲،۱۱،۱۴، ۸/۴،۹،۱۰، ۹/۱۲،۱۴،۱۶، ۱۰/۱، ۱۲/۱۱،۱۴، ۱۳/۱۵،۱۶، ۱۴/۲،۱۴،۱۹، ۱۵/۳،۶،۷،۲۱، ۱۶/۶، ۱۷/۹،۱۴، ۱۸/۹، ۱۹/۱۱،۱۷، ۲۰/۱۵،۱۶، ۲۱/۱۲، ۲۲/۱۳، ۲۳/۳،۵،۱۳، ۲۴/۱۹، ۲۵/۱۲، ۲۶/۷، ۲۸/۲،۳،۵، ۳۰/۶

شَیْطَانًا، ۵/۱۵، ۲۵/۱۰

شِیَع : فرقے، گروہ، شِیْعَۃٌ کی جمع، ۱۴/۱

شِیَعًا ۷/۱۴، ۸/۷، ۲۰/۴، ۲۱/۷

شِیْعَتِہٖ : اس کے رفیق، اس کا گروہ، شِیْعَۃٌ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ۲۰/۵، ۲۳/۷

شِیْعَۃٌ : فرقہ، گروہ، اصل میں شِیَاعٌ کے معنی انتشار اور تقویت کے ہیں جس سے انسان کو تقویت ہو اور جو اس سے نکلا اور پھیلے ہوں وہ اس انسان کے شیعہ[1] یعنی اس کا فرقہ اور پارٹی ہیں، شیعہ کا اطلاق واحد تثنیہ جمع، مذکر، مؤنث سب پر ہوتا ہے، شِیَعٌ اور اَشْیَاعٌ جمع، ۱۶/۸

شِئْنَا : ہم نے چاہا، مَشِیْئَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم (ملاحظہ ہو شَآءَ) ۹/۱۲، ۱۵/۱۰، ۱۹/۲، ۲۱/۱۵، ۲۹/۲۲

شُیُوْخًا : بوڑھے، شَیْخٌ کی جمع (ملاحظہ ہو شَیْخٌ) ۲۴/۱۲

شِیَۃٌ : داغ، جانور جس رنگ کا ہو اس کے علاوہ دوسرے رنگ کا دھبہ، شِیَۃٌ اصل میں وِشْیَۃٌ تھا، وَشْیٌ یَشِیْ کا مصدر ہے عِدَۃٌ اور زِنَۃٌ کی طرح، اس کی ہٖ، واؤ محذوف کے عوض میں ہے، شِیَاتٌ جمع ہے، ۱/۸

[1] راغب کا یہی بیان ہے۔

Marfat.com

إنّ في ذلك لآيات لقوم يتفكرون

مکمّل

# لغات القرآن

## مع فہرستِ الفاظ

جلد چہارم — ص تا ع

تالیف

مولانا محمد عبدالرشید نعمانی

دارالاشاعت

اردو بازار ایم اے جناح روڈ ○ کراچی ۱

Marfat.com

طبع اوّل دارالاشاعت نومبر ۱۹۸۶ء
طباعت: احمد پرنٹنگ کارپوریشن
ناظم آباد نمبر ۱۔ کراچی۔

## حق طبع

جناب شاہد نذیر خان یوسفی مجددی و ڈاکٹر خورشید صاحب مکتبہ حسن سہیل لاہور سے لغات القرآن کامل چھ جلد کی کتابت اب دارالاشاعت کراچی نے خریدلی ہے۔ لہٰذا آئندہ اس کتابت یا اسکے فوٹو لے کر طبع کرنے کا کوئی مجاز نہیں ہے اور اسکے تمام حقوق دارالاشاعت کو حاصل ہیں۔

ملنے کے پتے:

دارالاشاعت اردو بازار کراچی ۱
مکتبہ دارالعلوم۔ کورنگی۔ کراچی ۱۴
ادارۃ المعارف کورنگی۔ کراچی ۱۴
ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی، لاہور ۲

دارالاشاعت متصل اردو بازار کراچی ۱

# فہرست ابواب و فصول لغات القرآن جلد چہارم


| | صفحہ |
|---|---|
| فصل الالف | ۵ |
| فصل الباء الموحدہ | ۱۴ |
| فصل الحاء المہملۃ | ۱۷ |
| فصل الخاء المعجمۃ | 〃 |
| فصل الدال | 〃 |
| فصل الراء المہملۃ | ۲۴ |
| فصل العین المہملۃ | ۲۸ |
| فصل الغین المعجمۃ | ۳۱ |
| فصل الفاء | ۳۲ |
| فصل الکاف | ۳۳ |
| فصل اللام | ۳۴ |
| فصل المیم | ۴۰ |
| فصل النون | ۴۳ |
| فصل الواو | 〃 |
| فصل الہاء | ۴۹ |
| فصل الیاء التحتانیۃ | ۵۰ |
| **باب الضاد المہملۃ** | ۵۱ |
| فصل الالف | 〃 |
| فصل الباء الموحدۃ | ۵۳ |
| فصل الحاء المہملۃ | 〃 |
| فصل الدال المہملۃ | ۵۵ |
| فصل الراء المہملۃ | ۵۶ |
| فصل العین المہملۃ | ۶۰ |
| فصل الغین المعجمۃ | ۶۴ |
| فصل الفاء | ۶۵ |
| فصل اللام | 〃 |
| فصل النون | ۶۹ |
| فصل الیاء | 〃 |
| **باب الطاء المہملۃ** | ۷۳ |
| فصل الالف | 〃 |
| فصل الباء الموحدۃ | ۸۷ |
| فصل الحاء المہملۃ | ۹۰ |
| فصل الراء المہملۃ | ۹۱ |
| فصل السین المہملۃ | ۹۳ |
| فصل العین المہملۃ | 〃 |
| فصل الغین المعجمۃ | ۹۵ |
| فصل الفاء | |


Marfat.com

| | | | |
|---|---|---|---|
| فصل اللام | ۹۸ | فصل الدال المہملۃ | ۲۴۷ |
| فصل المیم | ۱۰۰ | فصل الذال المعجمۃ | ۲۶۱ |
| فصل الواو | ۱۰۱ | فصل الراء المہملۃ | ۲۶۶ |
| فصل الہاء | ۱۱۹ | فصل الزاء المعجمۃ | ۲۸۸ |
| فصل الیاء المثناۃ | ۱۲۳ | فصل السین المہملۃ | ۳۰۵ |
| باب الظاء المعجمہ | ۱۲۶ | فصل الشین المعجمۃ | ۳۱۳ |
| فصل الالف | 〃 | فصل الصاد المہملۃ | ۳۱۷ |
| فصل العین | ۱۲۸ | فصل الضاد المعجمۃ | ۳۲۳ |
| فصل الفاء | ۱۲۹ | فصل الطاء المہملۃ | ۳۲۵ |
| فصل اللام | 〃 | فصل الظاء المعجمۃ | ۳۲۷ |
| فصل المیم | ۱۳۹ | فصل الفاء | ۳۲۹ |
| فصل النون | ۱۴۰ | فصل القاف | ۳۳۳ |
| فصل الہاء | ۱۵۱ | فصل اللام | ۳۴۰ |
| باب العین المہملہ | ۱۵۸ | فصل المیم | ۳۵۸ |
| فصل الالف | 〃 | فصل النون | ۳۶۳ |
| فصل الباء الموحدۃ | ۲۱۴ | فصل الواو | ۳۷۳ |
| فصل التاء المثناۃ | ۲۲۸ | فصل الہاء | ۳۷۵ |
| فصل الثاء المثلثۃ | ۲۳۶ | فصل الیاء | ۳۷۶ |
| فصل الجیم المعجمۃ | ۲۳۹ | | |


Marfat.com

# بابُ الصّاد المُهملة

## فصل الالف

**صٓ** ۔ صاد حروف مقطعات میں سے ہے اور جس سورت کے ابتداء میں آیا ہے وہ بھی اسی نام سے موسوم ہے (ملاحظہ ہو الٓو)

**صَابِرًا** ۔ صبر کرنے والا، ٹھہرنے والا، جھیلنے والا، سہارنے والا، صَبْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو اصبر اور صَبْرٌ) ١٥/٢١ ٢٣/١٣

**صَابِرَاتِ** ۔ صبر کرنے والی عورتیں، صَبْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مؤنث۔ صَابِرَۃٌ کی جمع ٢٢/٢

**صَابِرُوْا** ۔ مقابلہ میں مضبوط جمے رہو۔ مُصَابَرَۃٌ سے جس کے معنے صبر کے ساتھ کسی سے جنگ کرنے کے ہیں۔ امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر۔ امام راغب نے اس کے معنی یہ لکھے ہیں کہ عبادت پر اپنے آپ کو جمائے رکھو اور اپنی خواہشات سے جنگ کرتے رہو۔ ٤/١٢

**صَابِرُوْنَ** ۔ ثابت قدم رہنے والے، سہنے والے صبر کرنے والے۔ صَبْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالت رفع۔ صَابِرٌ کی جمع ١/٥ ٢٠/١١ ٢٣/١٦

**صَابِرَۃٌ** ۔ ثابت قدم رہنے والی، صبر کرنے والی۔ صَبْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث ١٠/٥

**صَابِرِیْنَ** ۔ صبر کرنے والے ثابت قدم رہنے والے صَبْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالت نصب و جر۔ صَابِرٌ واحد ٢/١٤،٦،٤ ٣/١٠ ٤/٦،٥ ١٠/٥،٢ ١٤/٢٢ ١٤/١٢،٦ ٢٢/٢ ٢٣/٤ ٢٦/٨

**صَابِئُوْنَ** ۔ فرقہ صابی۔ دینِ حنیف یعنی ملتِ ابراہیم کے متبع یعنی حنفاء کے مقابل فرقہ کا نام ہے صابی کی جمع بحالت رفع۔ اس لفظ کے عربی ہونے میں اختلاف ہے۔ امام سہیلی نے روض الانف میں اس کو عجمی نام بتایا ہے[1]۔ عربی ہونے کی صورت میں یہ صَبَأَ سے جس کے معنی صابی ہونے اور ایک دین سے دوسرے دین میں ہونے کے ہیں۔ اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ہے۔ قاضی

---

[1] علامہ مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں اپنے شیخ کے حوالہ سے اس کو نقل کیا ہے۔

Marfat.com

شوکانی تفسیر فتح القدیر میں رقمطراز ہیں :

" صابئین صابی کی جمع ہے، اور بعض نے صاب کی جمع کہا ہے، اور قاریوں نے اس میں اختلاف کیا ہے چنانچہ بجز نافع کے سب نے اس کو ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے، سو جس نے اسے مہموز پڑھا اس نے اسے صبأت النجوم سے قرار دیا جو ستاروں کے طلوع ہونے کیلئے استعمال ہوتا ہے اور جس نے مہموز نہیں کیا اس نے صبا یصبو سے قرار دیا جس کے معنی مائل ہونے اور جھکنے کے ہیں۔ لغت میں صابی وہ ہے جو ایک دین سے نکل کر دوسرے دین کی طرف مائل ہو۔ اسی لیے جب کوئی شخص اسلام لاتا تھا تو کفار عرب کہتے تھے قد صبأ وہ دین سے پھر گیا، فرقہ صابئہ اس نام سے اس لیے موسوم ہوا کہ وہ یہود و نصاریٰ کے دین سے نکل کر ستاروں کی پرستش کرنے لگے۔"[1]

اور مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں :-

" لفظ صابی کی لغوی تشریح بھی کسی قدر تفصیل طلب ہے۔ کہتے ہیں کہ صبا عبری لفظ صبع کا آرامی تلفظ ہے۔ صبع عربی لفظ صبغ کے ہم معنی ہے جس سے عربی میں دوسرا لفظ اصطباغ بنا ہے اس کے اصلی معنی نہانے دھونے کے ہیں اور اصطلاحاً بپتسمہ کے معنی میں بولا جاتا ہے چونکہ یہ فرقہ خود ہر روز دن میں کئی مرتبہ غسل کرتا ہے اس لیے ان کا آرامی نام صابئی پڑا، اور اسی سے عربی میں آیا لیکن ہمارے سامنے ایک اور لغوی تشریح اس سے زیادہ سہل اور با معنی موجود ہے اصل یہ ہے کہ ہماری زبانوں میں صبا کا لفظ ستاروں کے مفہوم میں عام طور سے مستعمل ہے عبرانی میں اس کے معنی جماعت ستارگان کے ہیں عربی میں صبا کے معنی ستارے کے طلوع ہونے اور نکلنے کے ہیں چنانچہ قاضی بیضاوی نے صابی کا اشتقاق اسی لفظ سے کیا ہے[2] یہاں تک تو اس لفظ کی لغوی تشریح کا تعلق تھا باقی رہی تاریخی تشریح کہ صابئین کون تھے کہاں تھے اور ان کے عقائد کیا ہیں۔ اس کے متعلق سید صاحب موصوف رقمطراز ہیں کہ -

" علامہ ابن تیمیہ نے صابئین کی تحقیق پر الرد علی المنطقیین " میں جو کچھ لکھا ہے وہ محققانہ ہے ہم اسی کا لفظی ترجمہ کر دیتے ہیں -

ان صابئین کا خاص مرکز حران تھا، حضرت

---

[1] فتح القدیر۔ ج ۱ ص ۸۰، طبع مصر ۱۳۴۹ھ [2] ارض القرآن ج ۲ ص ۲۱۰۔ طبع مطبعہ معارف اعظم گڑھ ۱۳۶۲ھ

Marfat.com

ابراہیم یہیں پیدا ہوئے تھے یا عراق سے یہاں آئے تھے دونوں قول ہیں. یہاں علت اولیٰ عقل اوّل اور نفس کلیہ کے ہیکل تھے. نیز زحل، مشتری، مریخ، شمس، زہرہ عطارد اور قمر کے ہیکل تھے. عیسائیت سے پہلے یہاں کا یہی مذہب تھا. عیسائیت کے بعد ان مشرک صابئین کی بقا کے ساتھ ساتھ ان میں عیسائیت پھیلی، یہاں تک کہ اسلام آیا اور وہاں یہ صابئین اور فلاسفہ حکومت اسلامی میں آخر وقت تک موجود رہے انہی میں سے وہ صابئین تھے جو بغداد میں طبیب یا منشی تھے. ان میں سے بعض اسلام لائے، چوتھی صدی میں فارابی جب حران گیا ہے تو انہی سے فلسفہ سیکھا. اہل دمشق وغیرہ کا مذہب بھی عیسائیت سے پہلے یہی تھا. ان کی نماز کا قبلہ "قطب شمال" تھا اسی لیے دمشق میں بہت سی کہنہ مسجدیں ہیں جن کا ایک قبلہ قطب شمال کی طرف بھی ہے. دمشق کی جامع مسجد کے نیچے ایک بہت بڑا معبد ہے.

علامہ موصوف نے اس کے بعد صابئین کی دو قسمیں کی ہیں ایک موحدین یہ وہ ہیں جنہوں نے حضرت ابراہیم کی ملت کی پیروی کی دوسری جماعت وہ تھی جو مشرک تھی، قرآن شریف نے دو حیثیتوں سے صابئین کا ذکر کیا ہے ایک میں اوّل کا ذکر ہے اور دوسرے میں دوم کا.

امام ابوبکر احمد بن علی جصاص رازی احکام القرآن میں فرماتے ہیں[1] :-

"صابئین کے بارے میں اختلاف ہے کہ آیا وہ اہل کتاب میں سے ہیں یا نہیں. امام ابوحنیفہ سے مروی ہے کہ وہ اہل کتاب ہیں اور امام ابو یوسف اور امام محمد کا قول ہے کہ اہل کتاب نہیں ہیں. ابوالحسن کرخی کہتے تھے کہ امام صاحب کے نزدیک جو صابی اہل کتاب میں داخل ہیں وہ لوگ ہیں جو دین مسیح کے قائل ہیں اور انجیل کو پڑھتے ہیں. لیکن جو صابی کہ ستارہ پرست ہیں اور حران کے اطراف میں یہی لوگ ہیں. وہ سب کے نزدیک اہل کتاب نہیں ہیں.

ابوبکر مصنف احکام القرآن کہتے ہیں کہ اس

---

[1] احکام القرآن. ج ۲ ص ۲۰۳-۲۰۴ -

Marfat.com

وقت جو لوگ صابئین کے نام سے مشہور ہیں ان میں
اہل کتاب نہیں ہیں، اور در اصل ان سب کا
مذہب ایک ہے۔ میری مراد ان لوگوں سے ہے
کہ جو حران کے اطراف میں ہیں، نیز واسط کے مضافات
میں سگستانی علاقہ میں ہیں۔ ان کے عقیدہ کی بنیاد
سبعہ سیارہ کی تعظیم، ان کی پرستش اور ان کو معبود
قرار دینا ہے۔ یہ لوگ اصل میں بت پرست ہی ہیں
مگر جب سے کہ اقلیم عراق پر اہل فارس کا غلبہ ہوا
اور انہوں نے صابئین کی سلطنت کا کہ جو نبطی تھے
خاتمہ کر دیا تو ظاہر میں یہ بت پرستی کی جرأت نہ کر سکے
کیوں کہ انہوں نے اس کی ممانعت کر دی تھی۔ اسی
طرح رومی اور ساحل شام اور اہل جزیرہ بھی صابی
تھے پھر جب قسطنطین نصرانی ہو گیا تو اس نے بزور
شمشیر ان کو نصرانیت کے قبول کرنے پر مجبور کیا
اس وقت سے بت پرستی تو موقوف ہوئی اور یہ
بظاہر نصاریٰ ہی کی جماعت میں آ ملے پر بہتیرے اسی
مذہب پر باقی رہے اور خفیہ بت پرستی کرتے رہے
پھر جب اسلام پھیلا تو یہ سبھی نصاریٰ ہی کے زمرہ
میں آ گئے اور مسلمان ان میں اور نصاریٰ میں فرق
نہ کر سکے کیوں کہ یہ خفیہ طور پر بت پرست تھے
اور اصل اعتقاد کو پوشیدہ رکھتے تھے۔ انسانی دنیا میں یہ
سب سے زیادہ اپنے اعتقاد کو چھپانے والے ہیں
ان کے بچے جب سیانے ہوتے ہیں تو اپنے مذہب کے چھپانے
میں ان کے عجیب گر اور حیلے ہیں۔ ان سے ہی فرقہ
اسماعیلیہ نے کتمان مذہب کا طریقہ اخذ کیا ہے اور ان
کی دعوت بھی ان ہی کے مذہب پر جا کے ختم ہوتی ہے
سب صابئیوں کا اصل الاصول سبعہ سیارہ کو معبود
بنانا، ان کی عبادت کرنا اور ان کے نام کے بت
تیار کرنا ہیں۔ اس بارے میں ان کے اندر باہم کوئی
اختلاف نہیں، علاقہ حران اور سگستانی علاقہ کے
لوگوں میں جو اختلاف ہے وہ ان کے کچھ شرائع اور رسوم
و آئین مذہب کے متعلق ہے اور ان میں اہل کتاب
موجود نہیں ہیں۔

صابئین کے متعلق امام ابو حنیفہ کا جو قول ہے اس
کے متعلق میرا ظن غالب یہ ہے کہ انہوں نے اس
فرقہ کے ان لوگوں کو دیکھا ہوگا جو تقیۃً ظاہر میں اپنے کو
نصاریٰ کہتے، انجیل پڑھتے اور دین مسیحی کی طرف
اپنی نسبت کرتے ہیں۔ یہ سب اس لیے ہے کہ ائمہ
فقہا اس قسم کے اعتقاد رکھنے والوں کے بارے
میں جزیہ کے قائل نہیں، اور بجز اسلام یا تلوار کے
ان سے متعلق اور کسی بات کو قبول نہیں کرتے۔ صابئین
میں جب کا بھی یہ اعتقاد ہے جو ہم نے بیان

Marfat.com

کتابیوں کے متعلق فقہا کے درمیان اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ نہ وہ اہل کتاب ہیں اور نہ اُن کا ذبیحہ کھایا جاسکتا ہے اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح ہوسکتا ہے۔ [1]

"صابئین کے معتقدات اور ان کے مزید حالات کے معلوم کرنے کے لیے ابن الندیم کی الفہرست، امام ابن حزم کی الفصل فی الملل والنحل اور علامہ عبدالکریم شہرستانی کی کتاب الملل والنحل کا مطالعہ کرنا چاہیئے یہ سب کتابیں مصر سے چھپ کر شائع ہوچکی ہیں۔ ۶/۱۴

**صَابِئِیْنَ**۔ صابئین صابئ کی جمع بحالت نصب وجر۔ ۱/۸ ۱۷/۹

**صَاحِب**۔ والا، ساتھی، رفیق۔ صُحْبَۃٌ سے جس کے معنی ساتھ رہنے کے ہیں۔ اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر۔ اصحابٌ اور صَحَابَۃٌ جمع۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:-

"ساتھ رہنے والا صاحب ہے انسان ہو یا حیوان مکان ہو یا زمان اور اس امر میں فرق نہیں کہ مصاحبت (باہم ساتھ رہنا) بدن سے ہو جو کہ اصل اور اکثر ہے یا بذریعہ عنایت و ہمت کہ جس کے متعلق کہا ہے:

لئن غبت عن عینی لما غبت عن قلبی

(اگر تو میری نظروں سے غائب ہے تو دل سے تو غائب نہیں)

اور عرف میں "صاحب" صرف اسی کو کہا جائیگا کہ جو کثرت کے ساتھ رہا ہو اور کسی شے کے مالک کو بھی "صاحب" کہہ دیا جاتا ہے اور اسی طرح اس کو بھی کہ جو اس شے میں تصرف کا مالک ہو"

(ملاحظہ ہو ذُو) ۵/۲ ۲۹/۴

**صَاحِبَتِہٖ**۔ اس کے ساتھ والی۔ اس کی بیوی صَاحِبَۃٌ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ (ملاحظہ ہو صَاحِبَۃٌ) ۲۹/۶ ۳۰/۵

**صَاحِبُکُمْ**۔ تمہارا رفیق صَاحِبُ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ۔ یہاں کُمْ کا خطاب کفار کی جانب ہے اور صاحب سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہاں صَاحِب کہہ کر کفار کو اس امر پر تنبیہ کرنا ہے کہ تم ان کے ساتھ رہ چکے ہو ان کا تجربہ کرچکے ہو اور اُن کے ظاہر و باطن کو پہچان چکے ہو اور پھر بھی تم نے ان میں کوئی خرابی

[1] احکام القرآن ج ۲ ص ۴۰۱ و ۴۰۲ طبع مصر ۱۳۴۷ھ

یاد یوانگی نہیں پائی ہے۔" ۳۲/۱۲ ۲۱/۵ ۳۰/۶

**صَاحِبَۃٌ** ۔ ساتھ رہنے والی، جورو، بیوی، صُحْبَۃٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مونث۔ چونکہ بیوی رفیقہ حیات ہوتی ہے اس لیے صاحبہ کہلاتی ہے۔

۲۶/۱۱ ۶/۱۹

**صَاحِبِہٖ** ۔ اُس کا رفیق، اس کا ساتھی، صَاحِبِ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ

۱۵/۱۱ ۱۰/۱۲

**صَاحِبِہِمْ** ۔ اُن کا رفیق۔ صاحِب مضاف ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ ۹/۱۲ ۲۷/۹

**صَاحِبْہُمَا** ۔ اُن دونوں کا ساتھ دے، ان دونوں کی رفاقت کر، صَاحِبْ مُصَاحَبَۃٌ سے جس کے معنی کسی سے صحبت رکھنے یا اس کے ساتھ رہنے کے ہیں امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر ۔ ھُمَا ضمیر تثنیہ غائب ۲۱/۱۱

**صَاحِبَیِ** دو ساتھی، دو رفیق ۔ صَاحِبٌ کا تثنیہ بحالت نصب و جر۔ اصل میں صَاحِبَیْنِ تھا منادیٰ مضاف ہونے کے باعث نون تثنیہ آخر سے ساقط ہو گیا ہے۔ ۱۲/۱۵

**صَاخَّۃٌ** ۔ غل۔ کان پھوڑ دینے والی۔ علامہ سید مرتضیٰ زبیدی لکھتے ہیں:

"صَاخَّۃٌ وہ چیخ ہے جو کانوں کو پھوڑ دے یعنی اپنی سختی کے باعث بہرا کر دے یہ ابن سیدہ کا بیان ہے، اور اسی سے قیامت کو صَاخّہ کہا گیا ہے، چنانچہ ابو عبیدہ نے آیت فَاِذَا جَاءَتِ الصَّاخَّۃُ کی یہی تفسیر کی ہے۔ اب یا تو صَاخّہ صَخَّ یَصُخُّ سے المعنی غل شور کا کانوں کا پھوڑ دینا) اسم فاعل ہے اور یا مصدر ہے۔ ابو اسحٰق نے کہا ہے کہ صَاخّہ وہ شور ہے جس میں قیامت برپا ہو گی اور جو کانوں کو پھوڑ ڈالے گا۔ اور بہرا کر دے گا کہ بجز اس آواز کے جو زندہ ہونے کے لیے دی جائیگی اور کوئی چیز سنائی نہ دے گی۔ [۱] ۳۰/۵

**صَادِقٌ** سچا۔ صِدْقٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو صِدْق) ۱۶/۲ ۲۶/۱۸

**صَادِقًا** ۲۴/۹

**صٰدِقٰتِ** ۔ سچی عورتیں۔ سچ کہنے والیاں۔ صِدْقٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مونث۔ صَادِقَۃٌ کی جمع ۲۲/۲

**صٰدِقُوْنَ** ۔ سچے مرد۔ سچ بولنے والے۔ صِدْقٌ ۹

[۱] تاج العروس شرح قاموس فصل الصاد من باب الخاء۔

سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر صَادِقٌ کی جمع بحالت
رفع ۸/۵ ۱۳/۴ ۱۴/۵ ۱۹/۱۹ ۲۶/۱۴ ۲۸/۴
صٰدِقِیْنَ ۔ سچے مرد۔ سچ بولنے والے صِدْقٌ
سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر صَادِقٌ کی جمع
بحالت نصب وجر ۱/۲،۴،۱۱،۱۳ ۳/۱۰ ۴/۱،۸،۱۰۰
۶/۶،۱۰ ۸/۴،۱۶ ۹/۳،۱۴ ۱۱/۴،۹،۱۰ ۱۲/۲،۳،۱۲،۱۳،۱۶
۱۳/۱ ۱۶/۲ ۱۸/۷ ۱۹/۴،۱۲،۱۳ ۲۰/۱،۲،۸،۱۵
۲۱/۱۰،۱۴،۱۹ ۲۲/۲،۵ ۲۳/۲،۹ ۲۵/۱۵،۱۹ ۲۶/۱۰،۳۰،۱۳ ۲۷/۴،۱۶ ۲۸/۱۱ ۲۹/۲،۴ ۔
صَارِمِیْنَ کاٹنے والے صَرْمٌ سے جس کے
معنی کاٹنے کے ہیں اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر۔
صَارِمٌ کی جمع ۲۹/۲

صٰعِقَۃٌ : بجلی کی کڑک ۔ امام راغب فرماتے
ہیں :-
صَاعِقَۃ اور صَاقِعَۃ دونوں قریب قریب ہیں
اور ان دونوں کے معنی سخت گڑگڑاہٹ
کے ہیں، مگر صقع اجسام ارضیہ کے لیے بولا
جاتا ہے اور صعق اجسام علویہ کے لیے بعض
اہل لغت نے کہا ہے کہ صاعقہ تین طرح پر آتا ہے
(۱) موت کے معنی ہیں جیسے فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی
الْاَرْضِ ، سو مر گئے جو تھا آسمان میں اور زمین میں اور
ارشاد ہے فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَۃُ (پھر آ پکڑا
ان کو موت نے)، (۲) عذاب کے معنی ہیں جیسے اَنْذَرْتُكُمْ
صٰعِقَۃً مِّثْلَ صٰعِقَۃِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (میں نے تم کو خبر سنا دی ایک سخت
عذاب کی جیسے عذاب آیا عاد اور ثمود پر)
(۳) آگ کے معنی میں جیسے وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَاءُ
(اور بھیجتا ہے آگ پھڑاتا ہے جس پر چاہے)،
اور یہ جو کچھ ذکر کیا ہے وہ چیزیں ہیں کہ جو صاعقہ
سے حاصل ہوتی ہیں۔ کیونکہ صاعقہ فضائے آسمانی
کی سخت آواز کا نام ہو پھر یا تو اس میں فقط
آگ ہی ظاہر ہوتی ہے اور یا عذاب اور موت
بھی، اور وہ اپنی ذات کے اعتبار سے ایک
ہی چیز ہے اور یہ چیزیں اس کے اثرات ہیں"
صَاعِقَہ یا تو صَعِقَ يَصْعَقُ کا مصدر ہے جس کے
معنی بے ہوش ہونے کے ہیں جیسا کہ کاذبین کے بارے
میں اہل لغت نے کہا ہے یا صَعِقٌ سے بمعنی مذکور
اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث ہے اور آواز رعد کی
صفت ہے یا خود "رعد" کی۔ اخیر صورت
میں تاء اس میں مبالغہ کے لیے ہوگی جیسے
کہ روایۃ میں ہے۔ [1]

[1] البحر المحیط ج ۱ ص ۸۴ طبع مصر ۱۳۲۸ھ

۱/۶ ۶/۲ ۲۴/۱۶ ۲۷/۱

**صَاغِرُوْنَ** ۔ ذلیل، خوار۔ صَغَارٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، صَاغِرٌ کی جمع بحالت رفع، (ملاحظہ ہو صَغَارٌ) ۱/۱۰ ۱۹/۱۸

**صَاغِرِیْنَ** ۔ ذلیل، بے عزت صَاغِرٌ کی جمع بحالت نصب و جر۔ ۸/۹ ۹/۴ ۱۲/۱۴

**صٰٓفّٰتٍ** ۔ پرا باندھے، صف بستہ صف باندھے والیاں، پر کھولے ہوئے۔ صَفٌّ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مؤنث، صَافَّۃٌ کی جمع (ملاحظہ ہو صَفٌّ) ۱۸/۱۲ ۲۳/۵ ۲۹/۲

**صٰفِنٰتُ** ۔ وہ گھوڑے جو تین پاؤں پر کھڑے ہوں اور چوتھے پاؤں کے سم کو موڑ کر اس پر ٹیک لگاتے ہوں۔ صُفُوْنٌ سے جس کے معنی تین پاؤں پر کھڑے ہو کر چوتھے پاؤں کے کنارہ سم پر ٹیک لگانے کے ہیں۔ اسم فاعل کا صیغہ جمع مؤنث، صَافِنَۃٌ کی جمع، واضح رہے کہ جو گھوڑا اس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ نہایت ہی فربہ اور توانا ہوتا ہے۔ ۲۳/۱۲

**صَآفُّوْنَ** ۔ صف باندھنے والے، صَفٌّ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر صَافٌّ کی جمع (ملاحظہ ہو صَفٌّ) ۲۳/۹

**صَالِ** ۔ پہنچنے والا صَلْیٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، یہ اصل میں صَالِیٌ تھا، ی آخر سے حذف ہوگئی ہے (ملاحظہ ہو اِصْلَوْهَا) ۲۳/۹

**صَالِحٌ** ۔ نیک، اچھا، بھلا، صَلَاحٌ سے جس کے معنی نیک ہونے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر صُلَحَاءُ جمع۔ امام راغب لکھتے ہیں: "صلاح فساد کی ضد ہے یہ دونوں اکثر استعمال میں افعال کے ساتھ مخصوص ہیں قرآن مجید میں صلاح کہیں تو فساد کے مقابل لایا گیا ہے اور کہیں سیئہ کے۔ ارشاد ہے (خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَیِّئًا (ملا دیا انہوں نے ایک کام نیک اور دوسرا بد) اور لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (مت خرابی ڈالو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد) اور اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ تو بہت مقامات پر ہے"

۱۱/۴ ۱۲/۴ ۲۲/۱۴ ۲۸/۱۹

**صَالِحًا** ۔ ۱/۸ ۶/۱۴ ۹/۱۴ ۱۱/۲ ۱۴/۱۹ ۱۶/۱۰،۱۱،۱۲،۱۳
۱۸/۴،۶ ۱۹/۴،۱۴ ۲۰/۱۰،۱۱ ۲۱/۸،۱۵ ۲۲/۱،۸،۱۵ ۲۳/۱۰،۱۹،۲۰ ۲۵/۱۸
۲۶/۲ ۲۸/۱۵،۱۸

**صَالِحٌ** ۔ علیہ الصلوٰۃ والسلام مشاہیر انبیاء میں سے ہیں۔ قرآن مجید میں ان کا اسم گرامی نو جگہ آیا ہے قوم

ثمود کی طرف مبعوث ہوئے تھے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں مذکور ہے کہ چار پیغمبر عرب سے ہیں ہود، صالح، شعیب اور تمہارے نبی (علیہم الصلوٰۃ والسلام)[1] امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے راوی ہیں کہ حج کے موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر وادی عسفان پر ہوا تو آپ نے فرمایا اے ابوبکر یہ کون سی وادی ہے؟ عرض کیا وادی عسفان، ارشاد فرمایا یہاں سے ہود اور صالح علیہما السلام جوان اونٹنیوں پر گزرے ہیں جن کی مہاریں خرما کی چھال کی تھیں ان کی تہبند عبا رکے تھے اور ان کی چادریں دھاری دار تھیں لبیک کہتے ہوئے خانہ کعبہ کا حج کرتے تھے، حافظ ابن کثیر نے اس کی اسناد کو حسن کہا ہے۔[2]

۸/۱۶ ۱۲/۶،۸ ۲۹/۱۲ صَالِحًا ۸/۱۶ ۱۲/۶ ۱۹/۱۹

**صٰلِحٰتُ**: نیکیاں، اچھے کام، نیک عورتیں صَلَاحٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مؤنث صَالِحَۃٌ کی جمع۔ قرآن مجید میں صرف ایک مقام پر لفظ صٰلحٰت نیک عورتوں کے لیے استعمال ہوا ہے ارشاد ہے فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ (پھر جو عورتیں نیک ہیں سو اللہ کی فرمانبردار ہیں) اور باقی سب جگہ نیکیوں کے لیے آیا ہے

۱/۲،۹ ۳/۶،۱۴ ۵/۳،۵،۱۵ ۶/۴،۶ ۷/۲ ۸/۱۲ ۱۱/۶
۱۲/۲ ۱۳/۱۰،۱۶ ۱۵/۱،۱۳،۱۶،۱۹ ۱۶/۴،۸،۹،۱۲،۱۵
۱۷/۷،۹،۱۰،۱۴ ۱۸/۱۳ ۱۹/۱۵ ۲۰/۱۳ ۲۱/۲،۵،۸،۱۰،۱۵
۲۲/۷،۱۳ ۲۳/۱۱،۱۲،۱۵ ۲۴/۱۱،۱۵ ۲۵/۴،۱۸،۲۰ ۲۶/۵،۶،۱۲
۲۸/۱۸ ۳۰/۹،۱۰،۲۰،۲۳،۲۸

**صٰلِحُوْنَ** نیک مرد، نیک لوگ، صَلَاحٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر صَالِحٌ کی جمع بحالت رفع ۹/۱۱ ۱۷/۶ ۲۹/۱۱

**صٰلِحِیْنَ**: نیک بندے صَلَاحٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر صَالِحٌ کی جمع بحالت نصب و جر ۱/۱۶ ۳/۱۲،۱۳ ۴/۳ ۵/۶ ۷/۱،۱۶ ۹/۱۴ ۱۰/۱۶ ۱۲/۱۲
۱۳/۵ ۱۴/۲۲ ۱۵/۳ ۱۷/۵،۶ ۱۸/۱۰ ۱۹/۹،۱۷ ۲۰/۶،۱۳،۱۵
۲۳/۷ ۲۸/۱۲،۲۰ ۲۹/۴

**صَالُوْا**۔ گھسنے والے، داخل ہونے والے صَلْیٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر۔ اضافت کے سبب نون جمع حذف ہو گیا ہے، اصل میں صَالُوْنَ تھا ۲۳/۱۲
۳۰/۸

**صٰمِتُوْنَ**۔ خاموش، چپ صَمْتٌ سے جس کے معنی خاموش ہونے کے ہیں اسم فاعل کا صیغہ جمع

---

[1] حدیث کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو لغات انبیاء [2] البدایۃ والنہایۃ ج ۱ ص ۱۳۹ طبع مصر ۱۳۴۸ھ

مذکر، بَائِمٌ کی جمع ۹/۱۴

**صَائِمَاتٍ** روزہ دار عورتیں۔ صَوْمٌ اور صِیَامٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مؤنث، صَائِمَۃٌ کی جمع (ملاحظہ ہو صَوم اور صِیَام) ۲۲/۲

**صَائِمِیْنَ**۔ روزہ دار مرد۔ صَوْمٌ اور صِیَامٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر ۲۲/۲

## فصل الباء الموحدہ

**صَبَّ**۔ اس نے بہایا۔ اس نے اوپر سے ڈالا (نَصَرَ) صَبٌّ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب

۳۰/۱۴۴

**صَبًّا**۔ اوپر سے بہانا۔ اوپر سے بہنا، مصدر ہے متعدی اور لازم دونوں طرح مستعمل ہے پہلی صورت میں بہانے کے معنی ہوں گے اور اس کا فعل باب نَصَرَ سے آئے گا۔ اور دوسری صورت میں بہنے کے اور فعل باب ضَرَبَ سے استعمال ہوگا۔[1] قرآن مجید میں یہ متعدی ہی استعمال ہوا ہے۔ ۳۰/۵

**صَبَاحٌ**۔ صبح۔ دن کا ابتدائی حصہ جب کہ کنارہ آفتاب۔ سے اُفق مشرق سُرخ رہتا ہے، اسم ہے

نَسَاءٌ کی ضد ہے۔ ۲۳/۹

**صَبَّارٍ**۔ بڑا صبر کرنے والا، بڑا تحمل کرنے والا، بڑا قائم رہنے والا۔ صَبْرٌ سے بروزن فعّال مبالغہ کا صیغہ ہے۔ راغب لکھتے ہیں کہ "صَبَّارٌ اس وقت کہا جاتا ہے جب کہ اس میں ایک قسم کا تکلف[2] اور مجاہدہ ہو"۔ سید مرتضیٰ زبیدی لکھتے ہیں کہ :۔

"صبر کے پانچ درجے بتائے گئے ہیں۔ صَابِرٌ، مُصْطَبِرٌ، مُتَصَبِّرٌ، صَبُوْرٌ، صَبَّارٌ سو صابِرٌ تو ان سب میں عام ہے اور مصطبر جو صبر کے حصول میں لگا ہوا اور اس میں مبتلا ہو، اور مُتصبِّر وہ جو بقوت صبر سے کام لے اور اپنے آپ کو اس پر مجبور کرے، اور صبور جو بڑا صبر کرنے والا ہو کہ اس کا صبر دوسروں سے بڑھ کر ہو اور صبّار وہ کہ جو بلا کا صابر ہو۔ یہ مقدار اور کمیت کے اعتبار سے ہے اور صبور وصف اور کیفیت کے لحاظ سے"[3]

۱۳/۱۳ ۲۱/۱۳ ۲۲/۸ ۲۵/۵

**صَبَبْنَا**: ہم نے بہایا صَبٌّ سے ماضی کا صیغہ

[1] ملاحظہ ہو تاج العروس فصل الصاد من باب الباء [2] مطلب یہ کہ صبر میں مزا آتا ہو مگر نفس اپنے کو آمادہ بصبر کیا جائے [3] تاج العروس فصل الصاد من باب الراء -

جمع متکلم (ملاحظہ ہو صَبَّحَ) ۳۰/۵

**صُبْحٌ**۔ صبح فجر، صَبَاحٌ کے ہم معنی ہے اَصْبَاحٌ جمع۔ ۱۲/۰ ، ۲۹/۱۶ ، ۳۰/۶ **صُبْحًا** ۳۰/۲۵

**صَبَّحَهُمْ**۔ صبح کو ان پر آپڑا۔ صَبَّحَ تَصْبِيحٌ سے جس کے معنی صبح سویرے کسی پر آپڑنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب۔ ۲۷/۹

**صَبْرٌ**۔ صبر تحمل سہنا۔ جمے رہنا تنگی میں روکے رکھنا۔ صَبَرَ يَصْبِرُ کا مصدر ہے۔ امام راغب مفردات میں فرماتے ہیں:۔

"صبر کے معنی ہیں اپنے جی کو اس طرح روکے رکھنا جس طرح کہ عقل اور شرع کا تقاضا ہے یا عقل و شرع جس چیز سے نفس کو روکنے کے مقتضی ہیں اس سے روک دینا۔ پس صبر ایک عام لفظ ہے جس کے مختلف مواقع کے اعتبار سے مختلف نام ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اگر کسی مصیبت پر جی کو تھاما جا رہا ہے تو یہ صبر کے سوا اور کسی نام سے موسوم نہیں ہوگا، اور جزع (گھبراہٹ) اس کی ضد ہوگا، اور اگر جنگ میں ہو تو شجاعت سے موسوم ہوگا اور جُبْنٌ (بزدلی) اس کی ضد ہوگا، اور اگر کسی ملول کر دینے والے حادثہ میں ہوگا تو رَحْبُ الصَّدْرِ (کشادہ دلی) سے موسوم ہوگا اور ضَجَرٌ (تنگ دلی) اس کی ضد ہوگا، اور اگر بات کو روکے رکھنے کے بارے میں ہوگا تو کِتْمَان (چھپانا) سے موسوم ہوگا اور مَذَلٌ (ڈنگل ہو کر فاش کر دینا) اس کی ضد ہوگا اور حق تعالیٰ شانہ نے ان سب باتوں کو صبر سے موسوم فرمایا ہے"

۱/۵ ، ۲/۲ ، ۱۲/۱۲ ، ۱۳/۴ ، ۳۰/۱۵-۲۸

**صَبْرًا**، ۲/۱۷ ، ۹/۴ ، ۱۵/۲۱،۲۲ ، ۱۶/۱ ، ۲۹/۷

**صَبَرَ**۔ اس نے سہا، اس نے تحمل کیا۔ وہ ٹھہرا رہا۔ صَبْرٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب۔ ۲۵/۵ ، ۲۶/۴

**صَبَرْتُمْ**۔ تم نے صبر کیا۔ صَبْرٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر ۱۳/۹ ، ۱۴/۲۲

**صَبْرُكَ**: تیرا صبر کرنا۔ صَبْرٌ مصدر مضاف كَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ ۱۴/۲۲

**صَبَرْنَا**۔ ہم نے صبر کیا، ہم جمے رہے۔ صَبْرٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم ۱۳/۱۵ ، ۱۹/۲

**صَبَرُوْا**۔ انہوں نے صبر کیا۔ صَبْرٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب ۱۰/۰ ، ۹/۰ ، ۱۲/۲ ، ۱۳/۹

Marfat.com

۳۴/۱۲،۱۹،۲۰ – ۱۸/۶ – ۱۹/۴ – ۲۰/۹ – ۲۱/۲،۱۶ – ۲۴/۱۹ – ۲۶/۱۳ – ۲۹/۱۹

دِ صِبْغٍ ۔ روٹی ڈبونا، سالن، نانخورش، امام بغوی لکھتے ہیں ،۔

صِبْغٌ اور صِبَاغٌ وہ سالن ہے کہ جب روٹی اس میں ڈبوئی جائے تو وہ روٹی کو رنگ دے اور روٹی رنگین ہو جائے اور "ادام" ہر وہ سالن ہی جو روٹی کے ساتھ کھایا جاتا ہے خواہ روٹی اس سے رنگین ہو یا نہ ہو، [1]

اصل میں صِبْغٌ کے معنی رنگنے اور ڈبونے کے ہیں اس لیے ایسا سالن کہ جس میں روٹی ڈبونے سے رنگین ہو جائے صِبْغٌ کہلاتا ہے، یہ معنی مجازی ہیں

اَصْبَاغٌ جمع ۱۸/۱

صِبْغَةَ ۔ رنگ، اسم مصدر ہے، رنگ کی ہیئت و کیفیت کو صبغہ کہتے ہیں، صِبْغَةٌ سے مراد جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے "اللہ کا دین" ہے۔ دین کو نسبت اس لیے موسوم ہوا کہ جس طرح رنگ کا اثر کپڑے پر ظاہر ہوتا ہے، اسی طرح دیندار پر دین کا اثر ظاہر ہوتا ہے یا جس طرح سے کہ کپڑے میں رنگ ہوتا ہے اسی طرح دیندار کو دین لازم ہے کہ اس سے الگ نہیں ہوتا۔ [2]

شاہ عبد القادر صاحب دہلوی موضح القرآن میں زیر آیہ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ (ہم نے لیا رنگ اللہ کا اور کس کا رنگ ہے اللہ سے بہتر اور ہم اسی کی بندگی پر ہیں) فرماتے ہیں ،۔

"نصاریٰ کے پاس دستور تھا کہ جس کو اپنے دین میں داخل کرتے ایک زرد رنگ بناتے اور اس کے کپڑے بھی رنگ دیتے اور اس پر ڈال بھی دیتے۔ یہاں کے مقابل فرمایا"

صُبُّوْا ۔ تم بہاؤ، تم اوپر سے ڈالو۔ صَبٌّ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر ۲۵/۱۶

صَبِیًّا ۔ بچہ، لڑکا، صاحب قاموس نے صبی کے معنی اس بچہ کے لکھے ہیں کہ جس نے ابھی دودھ نہ چھوڑا ہو۔ اور راغب نے لکھا ہے کہ صبی وہ بچہ ہے جو بلوغ کو نہ پہنچا ہو۔ اور یہی زیادہ صحیح ہے صُبُوٌّ سے جس کے معنی نادانی کی طرف مائل ہونے کے ہیں بر وزن فَعِیْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ ہے

صِبْیَۃٌ اور صِبْیَانٌ جمع۔ ۱۶/۵،۴

---

[1] تفسیر معالم التنزیل ج ۵ ص ۲۹ طبع مصر۔ [2] البحر المحیط ج ۱ ص ۱۱ ہم طبع مصر ۱۳۲۹ھ

Marfat.com

## فصل الحاء المہملة

**صِحَاف**۔ رکابیاں۔ صَحْفَۃٌ کی جمع۔ اتنی بڑی رکابی جس میں پانچ آدمی پیٹ بھر کر کھا لیں۔ صَحْفَۃٌ کہلاتی ہے۔ ۲۵/۱۲

**صُحُفٌ** صحیفے (کتابیں، نوشتے، اوراق) صَحِیْفَۃٌ کی جمع، واضح رہے کہ یہ جمع نادر ہے کیونکہ فعیلۃ کی جمع فُعُلٌ پر نہیں آتی ہے۔ ندرت اور قیاس میں اس کی مثال سَفِیْنَۃٌ اور سُفُنٌ ہے
۱۲/۱۸ ۲۸/۶ ۳۰/۵،۶،۱۲۰ **صُحُفًا** ۳۶/۱۶ ۳۰/۲۳

## فصل الخاء المعجمة

**صَخْرٌ**۔ سخت پتھر صَخْرَۃٌ کی جمع ۳۰/۱۴

**صَخْرَۃٌ**۔ بڑا اور سخت پتھر صَخْرٌ اور صُخُوْرٌ جمع۔ ۱۵/۲۱ ۲۱/۱۱

## فصل الدال

**صَدٌّ**۔ رکنا۔ روکنا۔ صَدَّ یَصُدُّ کا مصدر ہے پہلے معنی کے اعتبار سے لازم ہے اور دوسرے کے اعتبار سے متعدی۔ راغب لکھتے ہیں کہ صُدُوْدٌ اور صَدٌّ کے معنی کبھی کسی شے سے پھرنے اور رُک جانے کے ہوتے ہیں جیسے یَصُدُّوْنَ عَنْکَ صُدُوْدًا (رک جاتے ہیں تیری طرف سے پھر کر) اور کبھی روکنے اور منع کرنے کے ہوتے ہیں جیسے وَزَیَّنَ لَہُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَہُمْ فَصَدَّہُمْ عَنِ السَّبِیْلِ (اور بھلے دکھائے ہیں شیطان نے اُن کو اُن کے کام پھر روکا ہے اُن کو راہ سے) یہاں اس کا استعمال دوسرے ہی معنی میں ہوا ہے۔ ۲۷/۱۱

**صَدَّ**۔ وہ باز رہا، وہ اٹک رہا، وہ رک رہا (لفظ) صَدٌّ اور صُدُوْدٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، اس معنی میں یہ لازم ہے ۵/۵

**صَدَدْتُمْ**۔ تم نے روکا۔ صَدٌّ اور صُدُوْدٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، یہاں معنی فعل متعدی ہے ۱۴/۱۹

**صَدَدْنٰکُمْ**۔ ہم نے تم کو روک رکھا صَدَدْنَا، صَدٌّ اور صُدُوْدٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم۔ کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر۔ یہاں بھی فعل متعدی ہی ہے۔ ۲۲/۱۰

**صَدْرًا**۔ سینہ۔ صُدُوْرٌ جمع۔ راغب لکھتے ہیں بعض حکماء کا بیان ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے قلب کا ذکر فرمایا وہاں عقل و علم کی طرف اشارہ ہے جیسے اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی

Marfat.com

كَانَ لَهٗ قَلْبٌ (بے شک اس میں نصیحت ہے اس کے لیے جس کے پاس دل ہو) اور جہاں "صدر" کا ذکر کیا ہے وہاں عقل و علم کی طرف بھی اشارہ ہے، نیز شہوت، ہوائے نفس اور غضب وغیرہ تمام قویٰ کی طرف بھی۔ اور رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ (اے میرے پروردگار میرا سینہ کھول دے) میں اپنے قویٰ کی اصلاح ہی کا سوال ہے۔ اسی طرح آیہ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ (اور دل ٹھنڈے کرے مسلمانوں کے) اہل ایمان کی شفایابی کی طرف اشارہ ہے، اور ارشاد ہے فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ (سو کچھ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں پر اندھے ہوتے ہیں دل جو سینوں میں ہیں) یعنی وہ عقلیں کہ جو تمام قویٰ میں گم سی ہو گئی ہیں اور صحیح راہ پر نہیں ہیں۔ واللہ اعلم بذلک

**صَدْرِكَ** - تیرا سینہ۔ صَدْرٌ مضاف كَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ ۸/۸ ۱۲/۲ ۱۴/۶ ۳۰/۱۹

**صَدْرَهٗ** - اس کا سینہ۔ صَدْرَ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ۔ ۸/۲ ۲۳/۱۶

**صَدْرِيْ** - میرا سینہ۔ صَدْرِ مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ ۱۶/۱۱ ۱۹/۶

**صَدْعٌ** - شق ہونا۔ شگافتہ ہونا۔ پھٹنا صَدَعَ يَصْدَعُ کا مصدر ہے۔ یہاں صَدْع سے مراد زمین سے کھیتی کا پھوٹ نکلنا ہے (ملاحظہ ہو اِصْدَعْ)

۳۰/۱۲

**صَدَفَ** - وہ کترایا۔ اُس نے مُنہ موڑا (ضرب) صَدَفٌ سے جس کے معنی سخت روگردانی کرنے کے ہیں۔ ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ۸/۶

**صَدَفَيْنِ** - پہاڑ کی دو پھانکیں۔ پہاڑ کے دونوں کنارے، صَدَفٌ کا تثنیہ بحالت نصب و [illegible] جر جس کے معنی کنارِ کوہ کے ہیں کہ جہاں جا کر پہاڑ کا اوپر کا سرا تمام ہوتا ہے۔ ۲۶/۲

**صِدْقٍ** - راستی، سچائی۔ نام نیک۔ ثنا [illegible] سچی بات۔ صَدَقَ يَصْدُقُ کا مصدر ہے۔ اس کے معنی لغت میں سچ کہنے اور سچ کر دکھانے کے ہیں اور چونکہ یہ ذکر خیر کا سبب ہے اس لیے مجاز [illegible] نام نیک، ثنا اور ذکر خیر کے معنی میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں۔

"صدق و کذب اصل میں تو یہ دونوں قول میں خواہ وہ ماضی ہو یا مستقبل وعدہ ہو یا غیر وعدہ سادہ مراد اولیٰ میں یہ دونوں [illegible]

کے علاوہ اور کسی کے لیے نہیں آتے اور
قول میں بھی صرف خبر میں ہی ہوتے ہیں اس
کے سوا اور اصناف کلام میں نہیں ہوتے
اسی لیے ارشاد ہے وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ
اللّٰہِ قِیْلًا (اور اللہ سے سچی کس کی بات) اِنَّہٗ کَانَ
صَادِقَ الْوَعْدِ (وہ تھا وعدہ کا سچا) ہاں
بالعرض ضمنی طور پر دیگر انواع کلام مثلاً استفہام
امر اور دعا کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں جیسے
کہنے والے کا یہ کہنا کہ ازید فی الدار (کیا
زید گھر میں ہے) کہ اس کے ضمن میں اس بات کی
اطلاع ہے کہ وہ زید کے حال سے بے خبر ہے
اور اسی طرح جب کہا واسینی (اور تو میری
غمخواری کر) تو اس کے ضمن میں یہ آیا کہ وہ
مواساۃ کا محتاج ہے اور جب کہا لا توذ
(تو مجھے ایذا مت دے) تو اس کے ضمن میں یہ
پتہ چلا کہ وہ اسے ایذا دیتا ہے اور صدق کے
معنی میں ضمیر یعنی دل اور مخبر عنہ (یعنی جس کے
متعلق کہ خبر دی گئی ہے) دونوں کے ساتھ قول
کا مطابق ہونا۔ اگر ان میں سے ایک شرط میں
بھی فتور آ جائے تو "صدق تام" نہ رہے گا۔ بلکہ یا

تو اس کو صدق سے موصوف ہی نہیں کیا جائے
گا اور یا دو مختلف حیثیتوں کے اعتبار سے
کبھی اس کو صدق سے متصف کریں گے اور کبھی
کذب سے۔ مثلاً کسی کافر کا "محمد رسول اللہ"
کہنا جبکہ وہ بغیر اعتقاد کے کہے کہ اس کو صدق
کہنا بھی صحیح ہے کیوں کہ مخبر عنہ ایسے ہی ہیں (یعنی
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واقع میں اللہ کے
رسول ہی ہیں) اور اس کو کذب کہنا بھی صحیح
ہے کیوں کہ اس کا یہ کہنا اس کے ضمیر کے خلاف
ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو منافقین کی تکذیب فرمائی
ہے وہ دوسری ہی وجہ کی بناء پر ہے اس لیے
کہ انہوں نے کہا تھا نَشْہَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ
اللّٰہِ (ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک تم خدا کے
رسول ہو) اور کبھی "صدق" و "کذب" کا استعمال
ہر اس شے کے متعلق ہوتا ہے کہ جو اعتقاد میں
ثابت اور موجود ہو جیسے صَدَقَ ظَنِّیْ (میرا ظن
سچ نکلا) کَذَبَ ظَنِّیْ (میرا ظن جھوٹا رہا) نیز افعال
جوارح کے لیے بھی ان کا استعمال ہوتا ہے چنانچہ
جب کوئی شخص جنگ کا حق ادا کر دے اور جو کچھ اس
پر واجب تھا یا جیسا کہ اس پر لازم تھا
کر دکھائے تو کہا جاتا ہے صَدَقَ فِی الْقِتَالِ

---

مواساۃ جان و مال سے کسی کے ساتھ غمخواری کرنا

دو جگہیں سچا رہا) اور اگر اس کے خلاف ہو تو کہا جاتا ہے "کذب فی القتال" (دو جگہیں غلط رہا یعنی جھوٹا ثابت ہوا) ارشاد ہے رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (کتنے مرد ہیں کہ انہوں نے سچ کر دکھایا جس پر قول کیا تھا اللہ سے یعنی انہوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ان کے ذریعہ اپنے عہد کو ثابت کر دکھایا) نیز ہر وہ فعل کہ جس میں ظاہری یا باطنی فضیلت ہو اُسے صدق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جو فعل اس صفت سے موصوف ہوتا ہے اس کو اس کی طرف مضاف کر دیا جاتا ہے جیسے فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيكٍ مُقْتَدِرٍ (سچی مجلس میں قدرت والے بادشاہ کے پاس) اور اسی طرح أَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ (کہ ان کو ہے پایہ سچا اپنے رب کے یہاں) اور ارشاد ہے أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ (مجھ کو داخل کر اچھا داخل کرنا اور مجھ کو نکال اچھا نکالنا) اور وَاجْعَلْ لِي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ (اور رکھ میرا ذکر خیر پچھلوں میں) کیونکہ یہ اس امر کا سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ایسا صالح بندہ کر دے کہ بعد کے لوگ جب ان کی ثنا کریں تو وہ ثنا غلط نہ ہو بلکہ ایسی ہو جیسا کہ شاعر نے کہا ہے

إِذَا نَحْنُ أَثْنَيْنَا عَلَيْكَ بِصَالِحٍ
فَأَنْتَ الَّذِي نُثْنِي وَفَوْقَ الَّذِي نُثْنِي

(جب ہم کسی بات میں تیری ثنا کرتے ہیں تو بس تیری ہی ثنا کرتے ہیں اور تو تو اس سے بھی بالا ہے کہ جو ہم ثنا کرتے ہیں)

۱۱/۱۵۸ ۱۵/۹ ۱۶/۲ ۱۹/۹ ۲۴/۱ ۲۶/۲ ۲۷/۱۰

## ص د ق

**صَدَقَ**۔ اس نے سچ کہا۔ اس نے سچ کر دکھایا (نَصَرَ) صِدْقٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب آیۂ کریمہ لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ (بیشک اللہ نے سچا دکھایا تھا اپنے رسول کو خواب واقع کے مطابق) صدق باعتبار فعل ہے یعنی عمل سے ثابت کر دینا مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے خواب کو سچ کر دکھایا۔ واضح رہے کہ صَدَقَ کا تعدیہ کبھی دو مفعولوں کی طرف بھی ہوتا ہے جیسے وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهُ (اور اللہ سچ کر چکا تم سے اپنا وعدہ) ۴/۱ ۲۱/۱۹ ۲۳/۳ ۲۶/۱۱ ۔

**صَدَّقَ** - اس نے سچ کر دکھایا، اس نے سچ مانا، وہ یقین لایا۔ تصدیقٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ یہ وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖ (اور جو لایا سچی بات اور سچ مانا اس کو) کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ زبان سے ادا کیا اپنے عمل سے اس کو ثابت بھی کر دیا (ملاحظہ ہو تصدیقٌ)
٢٢/٨ ٢٣/٦ ٣٣/١ ٢٩/١٨ ٣٠/١٧

**صَدَقٰتٌ** خیراتیں، زکاتیں۔ صَدَقَۃٌ کی جمع ہے (ملاحظہ ہو صَدَقَۃٌ) ٢/٦٥ ١٠/١٣،١٣،١٢ ١١/٢ ٢٨/٢

**صَدَقٰتِکُمْ** تمہاری خیراتیں، تمہارے صدقے۔ صَدَقٰتِ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ ٣/٤

**صَدُقٰتِهِنَّ** ان کے مہر۔ صَدُقٰتِ مضاف هِنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب مضاف الیہ۔ صَدُقٰتِ صَدُقَۃٌ کی جمع ہے جس کے معنی مہر کے ہیں ٤/١٢

**صَدَقَتْ** اس نے سچ کہا، وہ سچ بولی۔ صِدْقٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب ١٢/١٣

**صَدَّقَتْ** - اس نے تصدیق کی، اس نے سچ مانا۔ تصدیقٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب (ملاحظہ ہو تصدیقٌ) ٢٨/٢٠

**صَدَقْتَ** - تو نے سچ کہا۔ صِدْقٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر۔ ١٩/١٠

**صَدَّقْتَ** - تو نے سچ کر دکھایا۔ تصدیقٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر ٢٣/٦

**صَدَقْتَنَا** تو نے ہم کو سچ بتایا۔ صَدَقْتَ صیغہ ماضی۔ نا ضمیر جمع متکلم ٧/٥

**صَدَقَكُمُ** - اس نے تم کو سچ کر دکھایا۔ صَدَقَ صیغہ ماضی، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر ہے ٤/٦

**صَدَقَنَا** - اس نے ہم سے سچ کر دکھایا۔ اس میں نا ضمیر جمع متکلم ہے۔ ٢٣/٥

**صَدَقْنٰهُمُ** - ہم نے ان کو سچ کر دکھایا۔ صَدَقْنَا صِدْقٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم۔ هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ١٧/١

**صَدَقُوْا** - انہوں نے سچ کہا، انہوں نے سچ کر دکھایا۔ صِدْقٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب۔ ٢/٦ ٣٠/١٣ ٢١/١٩ ٢٦/٧

**صَدَقَۃٌ** - خیرات۔ زکوٰۃ۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:-

"صدقہ وہ ہے جس کو انسان اپنے مال میں سے بطور عبادت نکالتا ہے جیسے کہ زکوٰۃ، لیکن صدقہ اصل میں نفلی خیرات کے لیے بولا جاتا ہے

Marfat.com

اور زکوٰۃ ما جب کے لیے اور کبھی واجب کو صدقہ سے موسوم کر دیا جاتا ہے جب کہ اس کا ادا کرنے والا اپنے فعل میں صدق کا ارادہ کرے ارشاد ہے خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (لے ان کے مال میں سے زکات) اور فرمایا اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ (زکوٰۃ جو ہے سو حق ہے مفلسوں کا)

یہاں دو باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں اول تو یہ کہ زکوٰۃ انبیاء علیہم السلام پر بالاتفاق واجب نہیں ہے۔ مفتی ابو السعود نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ یہ حضرات اپنے پاس کی چیز کو ودیعت جانتے تھے خرچ کے موقع پر اس کو صرف کر دیتے اور بے موقع خرچ سے روکتے تھے، دوسری وجہ یہ ہے کہ زکوٰۃ طہارت ہے اس شخص کے حق میں جو آلودہ گناہ ہو اور انبیاء علیہم السّلام گناہوں سے معصوم ہیں۔ [۱]

دوم یہ کہ زکوٰۃ اور صدقہ واجبہ نہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے حلال تھا اور نہ بنی ہاشم کے لیے البتہ دیگر انبیاء کے لیے بھی حلال تھا یا نہیں اس میں اختلاف ہے بسوط میں مذکور ہے کہ اگر صدقہ بقیہ انبیاء کے لیے حلال ہے تو ایک قول یہ ہے کہ ہاں جائز ہے اور خصوصیت ہی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کہ ان کے لیے جائز نہیں ہے اور ایک قول یہ ہے کہ انبیاء کو حلال نہیں بلکہ ان کے اقرباء کو حلال ہے تو یہ خصوصیت ہے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقرباء کی ان کے اکرام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کی بناء پر کہ ان کو صدقہ حلال نہیں ہے [۲]

ب ۲/۸ ۳/۱۴ ب ۵/۱۴ ب ۱۱/۲ ۲۸/۲

**صِدْقِهِمْ** ان کا سچ۔ صِدْق مضاف ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ آیہ شریفہ لِيَسْئَلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ (تاکہ اللہ پوچھے سچوں سے ان کا سچ) کا مطلب یہ ہے کہ جس نے اپنی زبان سے صدق کا اظہار کیا اس کے "صدق فعل" سے اللہ تعالیٰ سوال فرمائے گا، یہ جتلاتا ہے کہ فعل کے ذریعہ طلب حق کیے بغیر محض اعتراف حق کافی نہیں ہے۔ ب ۷/۲ ۲۱/۱۹، ۱۸

**صَدُّوْا** انہوں نے روکا صَدٌّ اور صُدُوْدٌ سے ماضی کا صیغہ مذکر غائب ب ۶/۳ ب ۱۰/۸ ب ۱۴/۱۸

ب ۲۶/۸، ۵ ب ۲۸/۱۳، ۱۳

**صُدُّوْا** روکے گئے صَدٌّ اور صُدُوْدٌ

[۱] ملاحظہ ہو طحاوی شرح در مختار کتاب الزکوٰۃ

[۲] الدر المختار کتاب الزکوٰۃ باب المصرف

Marfat.com

سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر غائب پ ۱۳/۱۱

**صُدُوْدًا** - رُکنا، روگردانی کرنا، منہ موڑنا۔ صَدَّ یَصُدُّ کا مصدر ہے۔ لازم ہے۔ پ ۵/۱

**صُدُوْرِ** سینے۔ صَدْرٌ کی جمع پ ۴/۴ ۶/۶ ۱۰/۸،۱

۱۱/۱۰،۱ ۱۱/۱۳ ۲۰/۱۳ ۲۱/۱۲،۱ ۲۲/۱۱ ۲۳/۱۵ ۲۴/۷ ۲۵/۴

۲۷/۱۱ ۲۸/۱۵ ۲۹/۱ ۳۰/۲۹،۲۵

**صُدُوْرِكُمْ** تمہارے سینے۔ صُدُوْرِ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ پ ۴/۲ ۵/۹

۸/۱۲ ۱۱/۱۱ ۱۴/۴ ۲۰/۱۰،۲ ۲۴/۱۱ ۲۸/۵،۴

**صَدَدْنٰكُمْ** - انہوں نے تم کو روک دیا۔ صَدُّوْا صیغہ ماضی۔ کُمْ جمع مذکر حاضر (ملاحظہ ہو صَدُّوْا)

۲۶/۱۱ ۶/۵

**صَدَّهَا** اس کو روک دیا۔ صَدَّ صیغہ ماضی ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب (ملاحظہ ہو صَدَّ)

۱۹/۱۸

**صَدَّهُمْ** - اس نے ان کو روک دیا۔ صَدَّ صیغہ ماضی، ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب پ ۱۹/۱۱ ۲۰/۱۶

**صَدِّهِمْ** - ان کو روکنا۔ صَدِّ مصدر مضاف ھِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ (ملاحظہ ہو صَدَّ)، پ ۶/۲

**صَدِيْدٍ** - پیپ پ ۱۳/۱۵

**صَدِيْقٍ** - دوست۔ جمع اَصْدِقَاءُ۔ قاضی بیضاوی نے لکھا ہے کہ صَدِیْقٌ اصل میں مصدر ہے جیسے کہ حَنِیْنٌ اور صَہِیْلٌ ہیں[1]۔ واضح رہے کہ یہ لفظ مفرد بھی آیا ہے اور جمع بھی، مذکر بھی استعمال ہوا ہے اور مؤنث بھی۔ راغب لکھتے ہیں[2] کہ صَدَاقَۃٌ کے معنی مودت میں صدق اعتقاد کے ہیں یعنی سچی دوستی کے اور یہ انسان ہی کے ساتھ مختص ہے کسی اور کے لیے نہیں پ ۱۹/۹

**صِدِّيْقٌ** بہت سچا۔ صِدْقٌ سے بر وزن فِعِّیْلٌ۔ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ شاہ عبد القادر صاحب دہلوی فرماتے ہیں کہ: "صدیق وہ کہ جو سچی ہیں آگے ان کا جی آپ ہی اس پر گواہی دے[3]"۔

امام راغب رقمطراز ہیں:۔

"صدیق وہ ہے جس سے کثرت سے صدق ظاہر ہوا اور کہا گیا ہے بلکہ اس کو کہا جاتا ہے جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا اور بعض نے کہا ہے جس سے سچائی کی عادت ڈال لینے کے سبب

---

[1] تفسیر بیضاوی سورۃ شعراء ج ۲ ص ۱۰۹ طبع مصر [2] منتخب اللغات شاہجہانی باب الصاد مع القاف

[3] موضح القرآن سورۃ نساء، خاتمہ آیۃ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ۔

Marfat.com

جھوٹ بن ہی نہ آتا ہو، اور بعض کا بیان ہے
بلکہ جو قول میں اور اعتقاد میں سچا ہو اور اپنے
عمل سے اپنے صدق کو ثابت کرے، ارشاد
ہے وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ
اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (اور
مذکور کر کتاب میں ابراہیم کا بے شک تھا وہ سچا
نبی) اور فرمایا وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ (اور اس
کی ماں صدیقہ یعنی ولی ہے) اور فرمایا مِنَ
النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ
(نبی اور صدیق اور شہداء) پس "صدیقین"
وہ لوگ ہیں جو فضیلت میں انبیا سے کچھ
ہی کم ہیں، جیسا کہ میں نے "الذریعہ الی مکارم
الشریعۃ" میں بیان کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے
ازالۃ الخلفاء میں مقام "صدیقیت" کی مزید
تشریح فرمائی ہے جو درج ذیل ہے فرماتے ہیں
آنکہ بمجرد استماع سخن پیغامبر حاصل کار
متنبہ شود و گویا بے واسطہ می بیند بمثل
آنکہ آئینہ از آفتاب اثر پذیر گردد و نور خاص
بر آید و نام ایں مقام صدیقیت است و از
لوازم او تصدیق پیغامبر ست بے ماکرات و
بدون طلب معجزہ و صحبت دائمہ بوصف
فنا و فدا و تسلیم و رضا و اختیار موافقت و
ترک مخالفت اگرچہ در ادنی شے باشد یعنی
حالتے کہ در عرف آں را عشق مفرط گویند و
نیز از لوازم و تعبیر رویا ست و موافقت رائے
پیغمبر قبل از آنکہ پیغامبر تصریح کردہ باشد[1]

١٢/١٦ صِدِّيْقًا ١٩/٦، ٣/٦

**صَدِيْقِكُمْ**۔ تمہارا گہرا دوست۔ صَدِيْقِ
مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ ١٨/١٤

**صِدِّيْقُوْنَ** صدیق، سچے ایمان والے۔ صِدِّيْقٌ
کی جمع بحالت رفع ٢٧/١٨
**صِدِّيْقَةٌ** سچی، ایمان والی، ولی۔ صِدِّيْقٌ
کی مؤنث ہے۔ ٦/١٤
**صِدِّيْقِيْنَ** صدیق، سچے ایمان والے
صِدِّيْقٌ کی جمع بحالت نصب و جر ٥/٦

## فصل الراء المهملة

**صِرٌّ** ۔ شرہ پالا۔ لو، باد سموم، علامہ
خازن البغدادی لکھتے ہیں:۔

---

[1] ازالۃ الخلفاء عن خلافۃ الخلفاء۔ ج ۲ ص ۳۔ طبع بریلی۔

"صِرٌّ میں دو وجہیں ہیں (۱) جو کہ اکثر مفسرین اور اہل لغت کا قول ہی یہ ہے کہ صِرٌّ سخت ٹھنڈ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما قتادہ، سدی اور ابن زید نے یہی کہا ہے (۲) یہ کہ وہ گرم لو ہے جو کہ مہلک ہوتی ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایک روایت یہی ہے اور اہل لغت میں سے ابن الانباری کا بھی یہی قول ہے"[1]

قاضی بیضاوی نے لکھا ہے:-

"اس کا اطلاق ہوائے سرد کے لئے شائع ہے جیسے کہ صَرْصَر ہے۔ پس یہ اصل میں مصدر ہے جو بطور وصف مستعمل ہے یا صفت ہے کہ بطور مبالغہ بَرْدٌ اس سے موصوف ہے جیسے کہ بَرْدٌ بَارِدٌ بولتے ہیں"[2] ۲/۴

**صِرَاط**۔ راہ، راستہ۔ سیدھے اور آسان راستے کو صِرَاطٌ کہتے ہیں۔ واضح رہے کہ صِرَاطٌ اصل میں سِرَاطٌ ہے۔ اس میں س کا ص سے قلب ہے کہ اطباق میں طا کے مطابق ہو جائے۔ اس کی اصل سرطت الطعام سے ہے جس کا استعمال کھانے کے نگلنے کے لئے ہوتا ہے گویا سِرَاط میں اس کا تصور ہے کہ رہرو راہ کو نگل لیتا ہے یا راستہ رہرو کو ہڑپ کر جاتا ہے۔ عربی کی مثل ہے قتل ارضًا عالمھا وقتلت ارضٌ جاھلَھا (زمین سے واقف نے تو زمین کو ختم کیا اور اس سے ناواقف کو زمین نے مار ڈالا) اس کی جمع سُرُطٌ اور صُرُطٌ ہے جیسے کتابٌ کی جمع کُتُبٌ ہے ۱/۱، ۲/۱۰۱، ۳/۱۳، ۴/۱، ۶/۴،۱، ۷/۱۰،۱۶، ۸/۱۱،۱۶،۷،۲، ۱۱/۸، ۱۲/۵، ۱۳/۱۳، ۱۴/۳،۲۰،۲، ۱۶/۵،۱۶، ۱۷/۱۰،۱۴، ۱۸/۴،۱۲، ۲۲/۷،۱۸، ۲۳/۲،۶،۸،۱۱، ۲۵/۶،۱۰،۱۲، ۲۹/۲

**صِرَاطًا** ۵/۶، ۶/۴، ۱۶/۴، ۲۶/۹،۱۱

**صِرَاطَكَ**۔ تیرا راستہ۔ صِرَاطٌ مضاف لَكَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ ۸/۱

**صِرَاطِيْ**۔ میرا راستہ صِرَاطِ مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ۔ ۸/۶

**صَرْحٌ**۔ محل، قصر، ہر وہ عالی شان عمارت کہ جس میں نقش و نگار ہوں صَرْحٌ کہلاتی ہے صُرُوْحٌ جمع ۱۹/۱۸ **صَرْحًا** ۲۰/۷ ۲۴/۹

**صَرْصَرٌ**۔ ہوائے تند، سخت ٹھنڈی، شالے کی ٹھنڈی ہوا۔ راغب کہتے ہیں کہ لفظ صَرْصَر صَرٌّ سے ہے جس کے معنی باندھنے کے ہیں اور یہی بندش ہی کی طرف راجع ہے کیوں کہ ٹھنڈ میں جما دینے کی

[1] لباب التاویل معروف بہ تفسیر خازن ج ا ص ۲۴۲ طبع مصر ۱۳۳۱ھ [2] تفسیر انوار التنزیل ج ا ص ۱۲۷ طبع میمنیہ مصر ۱۳۲۶ھ

صفت ہے۔ صَرَامِرُ جمع ۲۹/۵ صَرْصَرًا ۲۳/۱۶ ۲۸/۸

صَرْعٰی بچھڑے ہوئے۔ زمین پر گرے ہوئے
صَرِیْعٌ کی جمع جو صَرَعَ سے ہے جس کے معنی زمین پر
بچھڑنے کے ہیں بروزن فَعِیْلٌ بمعنی مفعول ہے ۲۹/۵

صَرَفَ اس نے پھیر دیا۔ اس نے دور رکھا اس
نے دفع کیا۔ صَرْفٌ سے ماضی کا صیغہ واحد
مذکر غائب۔ آیۂ کریمہ ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ
قُلُوْبَهُمْ میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ان کے
لیے بد دعا ہو یعنی "پھر وہ پلٹے پلٹ دے اللہ
ان کے دل" (ملاحظہ ہو اَصْرِفُ)، ۱۱/۵ ۱۲/۱۴

صَرْفًا پھیرنا، ٹالنا صَرَفَ يَصْرِفُ کا مصدر
ہے۔ آیۂ کریمہ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا
(اب تم پھیر دے سکتے ہو نہ مدد کر سکتے ہو) میں عذاب
پھیر دینا یا بات پلٹ ڈالنا مراد ہے۔ ۱۸/۱

صُرِفَتْ۔ وہ پھیری گئی۔ صَرْفٌ سے ماضی
مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب ۸/۱۲

صَرَفَكُمْ اس نے تم کو پھیر دیا۔ صَرَفَ صیغہ
ماضی۔ كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر ہے۔ ۴/۷

صَرَفْنَا ہم نے پھیرا۔ ہم نے متوجہ کیا صرفٌ
سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم ۲٦/۴

صَرَّفْنَا ہم نے پھیر پھیر کر سمجھایا۔ ہم نے طرح
طرح سے بیان کیا۔ تَصْرِیْفٌ سے جس کے معنی پھیرنے
اور ظاہر کرنے کے ہیں ماضی کا صیغہ جمع متکلم۔
امام راغب فرماتے ہیں :-
"تَصْرِیْفٌ صَرْفٌ ہی کی طرح ہے، البتہ تکثیر میں
فرق ہے کہ تَصْرِیْفٌ کے معنی بہت پھیرنے
کے آتے ہیں۔ اور صَرْفٌ کے معنی صرف پھیرنے
کے، اور زیادہ تر یہ کسی شے کے ایک حالت
سے دوسری حالت کی طرف اور ایک امر سے
دوسرے امر کی طرف پلٹنے اور تبدیل کرنے کے
لیے بولا جاتا ہے اور "تصریف الریاح"
کے معنی ہیں ہواؤں کا ایک حالت سے دوسری
حالت کی طرف لوٹانا، ارشاد ہے وَصَرَّفْنَا
الْاٰيٰتِ (اور ہم نے پھیر پھیر کر سنائیں باتیں)، وَ
صَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ (اور طرح طرح
پر اس میں سنا دیئے ڈراوے) اور اسی سے
ہے "تصریف الکلام" (بات کو پھیر پھیر کر بیان
کرنا، طرح طرح سے گفتگو کا بیان کرنا) اور
"تصریف الدراہم" (درہموں کا الٹ پلٹ
کرنا) ۱۵/۵،۱۰،۲۰ ۱٦/۱۵

صَرَّفْنٰهُ ہم نے اس کو تقسیم کیا، ہم نے اس
کو طرح طرح بانٹا، ہم نے اس کو پھیر پھیر کر بیان

کیا۔ حَرَّثَ فعل ماضی، ۂ ضمیر واحد مذکر غائب آیۂ شریفہ وَلَقَدْ صَرَّفْنَاهُ بَيْنَهُمْ میں بعض نے تو ۂ ضمیر کا مرجع "قول" کو قرار دیا ہے۔ یعنی ہم نے اس بات کو ان میں طرح طرح سے بیان کیا اور بعض نے پانی کو اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے پانی کو ان میں طرح طرح سے بانٹا ۱۹/۲

**صَرَّة** چیخ۔ فریاد۔ انسانوں کی جماعت جو باہم بیچ بلی ملی ہو۔ راغب نے دونوں معنی لکھے ہیں۔ لیکن فریابی نے مجاہد سے اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں چیخ کے معنی نقل کیے ہیں۔ ابو عبیدہ نے بھی "شدۃ الصوت" یعنی زور کی آواز سے اس کی تفسیر کی ہے[۱]۔ اس معنی میں یہ صَرِيرٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی زور سے چیخنے کے ہیں اور دوسرے معنی میں صِرَّہٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی باندھنے کے ہیں گویا ایسی جماعت کو جو باہم باندھ دی گئی ہو۔ ۲۶/۱۹

**صُرْهُنَّ**۔ تو ان کو ہلا دے۔ صَارَ، صَوْرًا سے جس کے معنی ہلانے اور مائل کرنے کے ہیں امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر۔ هُنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب واضح رہے کہ یہ لفظ صَارَ يَصُورُ اور صَارَ يَصِيرُ دونوں سے پڑھا گیا ہے اور لفظ مشترک ہے بمعنی مائل کرنا اور ہلانا اور پارہ پارہ اور ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور بعض نے کہا ہے کہ بالکسر بمعنی قطع کرنا اور بالضم بمعنی مائل کرنا۔ اور بعض نے کہا کہ بالضم تو دونوں معنوں میں مشترک ہے اور بالکسر فقط بمعنی قطع کرنا ہے۔

ابن ابی حاتم نے دو طریقوں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے معنی ہی نقل کیے ہیں اور متعدد طرق سے تابعین کی ایک جماعت سے بھی یہی نقل کیا ہے[۲]۔ اور ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ارشاد باری فَصُرْهُنَّ نبطی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی ہیں فَشَقِّقْهُنَّ یعنی ان کو پارہ پارہ کر دے نیز ضحاک سے بھی اسی کی مثل نقل کیا ہے اور ابن المنذر وہب بن منبہ سے راوی ہیں کہ انہوں نے یہ بیان کیا کہ کوئی سی زبان ہو قرآن میں اس میں کا کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ اس پسان سے کہا گیا رومی زبان کا کیا ہے؟ کہنے لگے فَصُرْهُنَّ بمعنی قَطِّعْهُنَّ کے[۳]

[۱] فتح الباری شرح صحیح البخاری ج ۸ ص ۲۶۱ طبع میمنیہ

[۲] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتح الباری ج ۸ ص ۱۵۰ - ۱۵۱ [۳] الاتقان ج ۱ ص ۱۴۰ طبع مصر میمنیہ

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں :-

"صاحب "مغرب" نے ذکر کیا ہے کہ یہ لفظ سریانی ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ نبطی ہے لیکن سابق میں جو نقل ہوا وہ اس کو بتاتا ہے کہ یہ عربی ہے۔ والعلم عند اللہ تعالیٰ ل۱ ۳/۴

**صَرِیْخٌ** ۔ فریاد کو پہنچنے والا ۔ فریاد رس ۔ چیخ پکار فریاد ، استغاثہ ۔ اوّل معنی کے اعتبار سے صُرَّاخٌ سے جو کہ اضداد میں سے ہے اور جس کے معنی فریاد کرنے اور فریاد کو پہنچنے کے ہیں ۔ بمعنی فریاد کو پہنچنے کے بروزن فَعِیْلٌ بمعنی فاعل ہے اور صُرَّاخٌ جمع ہے اور دوسرے معنی میں صَرَخَ یَصْرُخُ کا مصدر ہے جس کے معنی فریاد کرنے اور چلانے کے آتے ہیں ۲۳/۲

**صَرِیْمٌ** : کٹا ہوا ، ٹوٹا ہوا ۔ صَرْمٌ سے جس کے معنی کاٹنے کے ہیں بروزن فَعِیْلٌ بمعنی مفعول یعنی مَصْرُوْمٌ ہے ۔ واضح رہے کہ اصل معنی تو "صریم" کے یہی ہیں ، کٹا ہوا ، جدا کیا ہوا ۔ پھر چونکہ صبح رات سے کٹی ہوئی ہوتی ہے اور رات صبح سے ، اس لیے صریم کا استعمال کبھی صبح کے معنی میں ہوتا ہے اور کبھی رات کے معنی میں بھی ، اسی طرح اس ذرہ ریگ کو صریم کہا جاتا ہے کہ جو تودۂ ریگ سے جدا ہو گیا

چنانچہ کالصریم کی تفسیر میں یہ سارے اقوال بیان کیے گئے ہیں کہ وہ باغ سوکھ کر ایسا سپید ہو گیا جیسا کہ دن ہوتا ہے ۔ یا جل کر اتنا سیاہ ہو گیا جیسی کہ رات ہوتی ہے ، یا اس طرح ٹوٹ کر ذرہ ذرہ ہو گیا کہ جس طرح ذرہ ہائے ریگ تودۂ ریگ سے اڑ کر منتشر ہو جاتے ہیں ۔ نیز صریم کی تفسیر مَصْرُوْمٌ سے بھی کی گئی ہے جیسے کہ قتیل بمعنی مقتول ہے ل۱ ۲۱/۴

## فصل العین المهملة

**صَعَدًا** : سخت شاق کہ جو معذب کے اوپر چھا جائے ، قاضی بیضاوی نے لکھا ہے کہ یہ مصدر ہے جو صفت واقع ہوا ہے ۔ امام راغب فرماتے ہیں :

صَعَدٌ ، صَعِیْدٌ اور صُعُوْدٌ اصل میں ایک ہیں لیکن صُعُوْدٌ اور صَعَدٌ تو گھاٹی کے لیے بولا جاتا ہے اور بطور استعارہ ہر امر شاق کے لیے آتا ہے ۔ ارشاد ہے وَمَنْ یُّعْرِضْ عَنْ ذِکْرِ رَبِّہٖ یَسْلُکْهُ عَذَابًا صَعَدًا ۔ اور جو کوئی منہ موڑے اپنے رب کی یاد سے تو داخل کرے اس کو سخت عذاب میں یعنی

ل۱ ملاحظہ ہو صحیح بخاری تفسیر سورۃ نون والقلم اور تفسیر بیضاوی سورۃ مذکورہ ۔

جو کہ سخت شاق ہو۔ اور فرمایا سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا (اب اس سے چڑھوا دوں گا بڑی چڑھائی) یعنی سخت گھاٹی اور صَعِیْدٌ روئے زمین کو کہا جاتا ہے۔ فرمایا فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا (تو قصد کرو زمین پاک کا) اور بعض نے کہا ہے کہ صَعِید اس غبار کو کہا جاتا ہے کہ جو اوپر چڑھتا ہے صُعُوْدٌ سے ماخوذ ہے لہٰذا ان کے نزدیک اسی لیے تیمم کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ہاتھ میں غبار لگ جائے" ۲۹/۱۱

**صَعِقَ**۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ وہ مر گیا۔ (صَعْقٌ سے جس کے معنی گرج کے صدمہ سے بیہوش ہونے اور مر جانے کے آتے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب۔ ۲۴/۴

**صَعِقًا**۔ بے ہوش۔ صَعْقٌ سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ ب

**صَعُوْدًا**۔ بڑی چڑھائی۔ سخت گھاٹی، دوزخ کے ایک پہاڑ کا نام، اصل میں صُعُوْدٌ اس گھاٹی کو کہتے ہیں کہ جس کی چڑھائی سخت ہو، جو سختیاں اور دشواریاں کہ پیش آتی ہیں ان کے لیے یہ لفظ بطور مثال مستعمل ہے۔ امام احمد اور ترمذی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ صَعُود آگ کا ایک پہاڑ ہے کہ جس پر ستر برس تک چڑھایا جائیگا اور پھر وہاں سے گرایا جائیگا۔[1] اور امام بغوی معالم التنزیل میں اپنی اسناد سے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ صَعُود دوزخ میں آگ کا ایک پہاڑ ہے کافر پر زور دیا جائے گا کہ اس پر چڑھے سو جب وہ اس پر ہاتھ رکھے گا گل جائے گا اور جب اٹھاویگا تو پھر بدستور درست ہو جائے گا۔ اسی طرح جب پائں رکھے گا تو گل جائے گا اور جب اٹھائے گا تو پھر ویسا ہی ہو جائے گا۔[2] ۲۹/۱۵

**صَعِیْدًا**۔ زمین۔ خاک۔ صُعُوْدٌ سے جس کے معنی بلند ہونے کے ہیں بر وزن فَعِیْلٌ صفت کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی کے متعلق جو علماء کا اختلاف ہے وہ صَعَدًا کے ضمن میں امام راغب کے بیان میں معلوم ہوا کہ بعض نے اس کے معنی غبار کے بھی لیے ہیں۔ امام شافعی کا یہی مسلک ہے۔ علامہ علی بن محمد خازن البغدادی، تفسیر لباب التاویل فی معانی التنزیل میں لکھتے ہیں:۔

[1] الاتقان ج ۲ ص ۲۰۳ طبع مصر
[2] معالم التنزیل ج ۷ ص ۱۴۶ طبع مصر

Marfat.com

ربیع نے امام شافعی سے صعید کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ اسم صعید غبار والی مٹی کے علاوہ اور کسی معنی کے لیے نہیں آتا چنانچہ سنگریزہ پر بھی خواہ موٹا ہو یا باریک صعید کا لفظ واقع نہیں ہوتا اور اگر مٹی یا ڈھیلہ سنگریزہ کے ساتھ اس طرح مل جائے کہ اس پر غبار آجائے تو صعید وہ ہے جو اس کے ساتھ ملا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا ہے کہ چونہ اور سرمہ اور گیرو سے تیمم نہ کرے کہ یہ سب پتھر ہی ہیں۔

خازن لکھتے ہیں کہ صعید کی تفسیر میں یہ امام شافعی کا کلام ہے کہ جو لغت میں مقتدا ہیں اور ان کا قول اس کے بارے میں سند ہے۔ اور فرّا اور ابو عبیدہ نے بھی اس بارہ میں ان سے موافقت کی ہے کہ اس کے معنی مٹی ہی کے ہیں۔ لہ

لیکن حقیقت یہ ہے کہ لفظ صعید کی یہ لغوی تشریح نہیں بلکہ فقہی تفسیر ہے جو امام شافعی نے اپنے مسلک کے مطابق کر دی ہے چنانچہ امام حافظ قاضی ابوبکر بن العربی امام شافعی کا قول نقل کر کے فرماتے ہیں :-

| | |
|---|---|
| وھذا تفسیر فقھی | یہ ان کی اپنے مذہب کے |
| علیٰ مذھبہ و | مطابق فقہی تفسیر ہے |
| الاول الذی قدمنا | اور پہلے معنی جو ہم نے |
| اصوب واجریٰ | سابق میں بیان کیے وہ |
| علی اللغۃ قال | زیادہ صحیح اور لغت کے |
| اللہ سبحانہ | زیادہ مطابق ہیں اللہ |
| فَتُصْبِحَ صَعِیْدًا | سبحانہ کا ارشاد ہے پھر |
| زَلَقًا لہ | ہو جائے وہ زمین صاف، |

اور زجاج نے جو لغت عربیت کے امام ہیں تصریح کی ہے کہ :-

| | |
|---|---|
| لا اعلم خلافًا | میں اس بارے میں اہل |
| بین اھل اللغۃ | لغت کے درمیان کوئی |
| ان الصعید وجہ | اختلاف نہیں جانتا کہ صعید |
| الارض سواء | کے معنی روئے زمین |
| کان علیھا التراب | کے ہیں خواہ اس پر مٹی |
| ام لا ومنہ قولہ | ہو یا نہ ہو اسی سے |

لہ تفسیر خازن ج ۱ ص ۳۴۸ شیخ احمد قسطلانی نے بھی ارشاد الساری شرح صحیح البخاری میں یہی لکھا ہے (ملاحظہ ہو قسطلانی ج ۷ ص ۶۷ طبع نول کشور۔)

لہ عارضۃ الاحوذی شرح الجامع الترمذی از ابن العربی ج ۱ ص ۲۰۶ طبع نظامی ۱۲۹۲ھ مع مجموعہ شرح اربعہ ترمذی

Marfat.com

| | |
|---|---|
| تعالیٰ صعیدًا | ارشادِ الٰہی ہے صعیدًا |
| جُرُزًا وصعیدًا | جُرُزًا زمین چاٹ کر |
| زلقًا انما سمی | اور صعیدًا زلقًا زمین |
| صعید الانہا | ٹپرا اور اس کا نام |
| نہایۃ ما یصعد | اس لئے ہوا کہ وہ زمین کی |
| من الارض [1] | سطح بالائی کی انتہا ہے |

امام بخاری نے اپنی صحیح میں سورۂ نساء کی تفسیر میں صعید کے معنی "وجہ الارض" یعنی روئے زمین کے ہی لکھے ہیں، اور حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں ابو عبیدہ کا بھی یہی قول نقل کیا ہے[2]۔ اور اسی بنا پر ائمہ حنفیہ کا مسلک ہے کہ زمین کی جنس میں سے جس چیز سے بھی تیمم کر لیا بشرطیکہ وہ پاک کرنے والی ہو تو جائز ہے اگرچہ اس پر گرد و غبار نہ ہو زمین کی جنس سے وہ چیز مراد ہے جو نہ آگ سے پگھلے اور نہ جل کر راکھ ہو جائے۔ چنانچہ پتھر اور گچ اور چونہ اور سرمہ اور گیرو اور ہرتال اور گندھک اور یاقوت اور زبرجد اور فیروزہ اور عقیق اور سیو اور چپنہ لیٹ کر یہ سب زمین کی جنس میں داخل ہیں اور پہاڑ کے نمک یعنی سیندھا نمک میں دو روایتیں ہیں مگر جواز تیمم پر فتویٰ ہے۔ ۵/۴ ۶/۶ ۱۵/۱۲،۱۳

# فصل الغین المعجمہ

**صَغَارٌ** ۔ ذلت، خواری۔ صَغُرَ یَصْغُرُ کا مصدر ہے جس کے معنی ذلیل ہونے کے ہیں، نیز بطور اسم بھی بمعنی ذلت و خواری مستعمل ہے ش/۲

**صَغَتْ** ۔ وہ جھک پڑی اور مائل ہو گئی صَغْوٌ اور صَغْیٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب۔ یہاں قُلُوبٌ کے فاعل ہونے کی بنا پر صیغہ جمع کے معنی ہوں۔ یعنی جھک پڑے، مائل ہو گئے (ملاحظہ ہو تُبَتَّتْ اور تَصْغٰی) ۲۸/۲۹

**صَغِیْرٌ** ۔ چھوٹا۔ صِغَرٌ سے جس کے معنی چھوٹا ہونے کے ہیں، بروزن فعیل صفت مشبہ کا صیغہ ہے صِغَارٌ اور صُغَرَاءُ جمع ہے۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ۔

صِغَر اور کِبَر اسماءِ متضادہ میں سے ہیں جو بعض کے لئے بعض کے اعتبار سے بولے جاتے ہیں، پس ایک ہی شئے ایک شئے کی نسبت سے صغیر ہوتی ہے اور دوسری کے اعتبار سے کبیر اور کبھی زمانے کے اعتبار سے بولتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے کہ فلاں صغیر

[1] و [2] فتح الباری ج ۸ ص ۱۸۹۔

Marfat.com

ہے اور فلاں کبیر ہے جب کہ اس کی عمر دوسرے سے کم ہو اور کبھی جثہ کے لحاظ سے اور کبھی قدر و منزلت کے اعتبار سے کہتے ہیں آیات شریفہ كُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ اور لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا وَلَآ اَصْغَرَ وَلَآ اَكْبَرَ میں سب جگہ خیر و شر میں قدر و منزلت کے اعتبار سے ایک دوسرے کی نسبت سے صغیر و کبیر مراد ہیں۔"

پ۲۰/۱۰ صَغِيْرًا ۱ ع ۱۵/۲

صَغِيْرَةً چھوٹی۔ صَغِيْرٌ کی مونث ہے پ۱۱/۴ ۱۵/۱۸

## فصل الفاء

صَفَا ۔ ایک مشہور پہاڑی کا نام ہے جو مکہ شریف میں مسجد حرام کے پاس ہے۔ امام البغوی لکھتے ہیں۔ صَفَا صَفَاةٌ کی جمع ہے۔ صَفَاةٌ اس سخت چٹان کو کہتے ہیں جو صاف اور ہموار ہو۔ کہا جاتا ہے صَفَاةٌ اور صَفَا جیسے حَصَاةٌ اور حَصٰی اور نَوَاةٌ اور نَوٰی۔ اور مروہ نرم پتھر کو کہتے ہیں اور اس کی جمع مروات آتی ہے اور جمع کثرت مرو ہے جیسے تَمْرَةٌ اور تَمَرَاتٌ اور تَمْرٌ۔ اور حق تعالیٰ شانہ کی صفا اور مروہ سے مراد مکہ معظمہ کی وہ دو مشہور پہاڑیاں ہیں جو سعی گاہ کے ہر دو جانب ہیں۔ [1]

تعجب ہے کہ علامہ سیوطی سے الاتقان فی علوم القرآن کی "النوع التاسع والستون" میں جو ان اسماء اور کنی اور القاب کے بیان میں ہے کہ جن کا قرآن مجید میں ذکر ہے۔ صفا اور مروہ کا ذکر چھوٹ گیا۔ پ۲/۲

صَفًّا قطار۔ صف۔ یہ اصل میں صَفَّ يَصُفُّ کا مصدر ہے جس کے معنی قطار باندھنے کے آتے ہیں اور خود قطار کے معنی میں بھی بطور اسم مستعمل ہے۔ صُفُوْفٌ جمع۔ راغب لکھتے ہیں کہ "کسی شے کو مثلاً آدمیوں یا درختوں کو تم ایک خط مستوی پر کر دو اس کو صف کہتے ہیں اور کبھی جیسا کہ ابو عبیدہ نے تصریح کی ہے صَفٌّ بمعنی (اسم فاعل) صَافٌّ (قطار باندھنے والا) بھی آتا ہے حق تعالیٰ کے ارشاد اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا (اللہ چاہتا ہے اُن کو جو لڑتے ہیں اس

[1] معالم التنزیل ج ۱ ص ۱۱۱ طبع مصر برحاشیہ خازن

کی راہ میں قطار باندھ کر) اور (ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا
(پھر آؤ قطار باندھ کر) میں لفظ صَفًّا مصدر
بھی ہو سکتا ہے اور اسم فاعل بھی بمعنی صَافِّيْنَ
یعنی قطار باندھنے والوں کے۔ اور اِنَّا لَنَحْنُ
الصَّآفُّوْنَ (اور ہم جو ہیں سو ہم ہی ہیں قطار
باندھنے والے) اور وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا (قسم
صف باندھنے والوں کی قطار ہو کر) میں
ملائکہ مراد ہیں۔

۱۵/۱۸ ۱۶/۱۲ ۲۳/۵ ۲۸/۹ ۳۰/۱۳،۲

صَفَحَ۔ کنارہ پکڑنا۔ کنارہ کش ہونا۔ الزام سے
درگزر کرنا۔ صَفَحَ يَصْفَحُ کا مصدر ہے۔ راغب نے
لکھا ہے کہ:۔

صَفْحٌ کے معنی ترکِ تثریب یعنی الزام اور
الاہنا چھوڑ دینے کے ہیں اور یہ عَفْو سے زیادہ بلیغ
ہے اسی لیے ارشاد ہے فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ
اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (سو تم درگزر کرو اور خیال میں نہ
لاؤ جب تک بھیجے اللہ اپنا حکم) اور یہ واقعہ ہے
کہ کبھی انسان معاف تو کر دیتا ہے مگر الزام دینا
نہیں چھوڑتا۔

۱۴/۲ صَفْحًا ۲۵/۲

صُفْرٌ۔ زرد۔ صُفْرَةٌ سے جس کے معنی زردی کے
ہیں بروزن فُعْلٌ صفت مشبّہ کا صیغہ جمع ہے
اَصْفَرُ واحد مذکر اور صَفْرَاءُ واحد مؤنث ہے ۲۹/۶۱

صَفْرَآءُ۔ زرد۔ صُفْرَةٌ سے بروزن فَعْلَاءُ
صفت مشبّہ کا صیغہ واحد مؤنث ہے راغب نے
لکھا ہے کہ:۔

"چونکہ زردی سیاہی سے زیادہ قریب ہوتی ہے
اس لیے کبھی صفرۃ "کی تعبیر" سواد "سیاہی"
سے بھی کی جاتی ہے" چنانچہ حضرت حسن بصری
نے ارشاد الٰہی صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا میں
صَفْرَآءُ کی تفسیر سَوْدَآءُ (سیاہ رنگ والی)
سے کی ہے اور بعض علماء نے کہا ہے کہ سواد
میں فَاقِعٌ نہیں کہا جاتا بلکہ حَالِكٌ کہتے ہیں

۱/۸

صَفْصَفًا۔ چٹیل میدان۔ ایسی ہموار زمین
کہ گویا اس کے اجزاء ایک ہی صف میں ہیں صفصف
کہلاتی ہے۔ اسم ہے ۱۶/۵

صَفْوَانٍ۔ صاف پتھر۔ اس کا واحد صَفْوَانَةٌ
ہے۔ ۳/۲

## فصل الکاف

صَكَّتْ۔ اس نے پیٹ لیا (نَصَرَ) صَكٌّ سے

Marfat.com

جس کے معنے کہ سنے اور زور سے پیٹنے کے ہیں۔
ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب ۲۶/۱۹

## فصل اللام

**صَلِّ** ۔ تو دعا دے، تو نماز پڑھ۔ تَصْلِیَۃٌ سے
امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر (ملاحظہ ہو تَصْلِیَۃٌ
صَلوٰۃ) ۱۱/۲ ، ۳۰/۲۳

**صَلَاتُكَ** ۔ تیری نماز۔ صَلَاۃَ مضاف كَ
ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ۔ واضح رہے کہ
قرآن مجید میں جہاں بھی لفظ صلوٰۃ کی اضافت
ضمیر بنی آدم کی طرف ہے وہاں یہ الف کے
ساتھ مرقوم ہے جو لام سے متصل ہے، البتہ دو[2]
جگہ ایک تو سورۃ ہود میں اور دوسرے سورۃ
توبہ میں باوجود ضمیر مخاطب کی طرف اضافت کے
واو ہی کے ساتھ مرقوم ہے جو لام سے ملا ہوا ہے ۱۵/۱۲

**صَلَاتَہٗ** ۔ اس کی نماز، اپنی نماز۔ صلوٰۃ مضاف
ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ ۱۸/۱۲

**صَلَاتِہِمْ** ۔ ان کی نماز، اپنی نماز۔ صلوٰۃ مضاف
ہُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ ۹/۱۸ ، ۱۶ ، ۱۸
۱۸/۱ ، ۲۹/۷ ، ۳۰/۳۲

**صَلَاتِیْ** ۔ میری نماز۔ صَلَاۃ مضاف ی
ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ ۶

**صُلْبِ** ۔ پیٹھ۔ اَصْلَابٌ جمع۔ راغب نے
لکھا ہے کہ صُلْبٌ کے معنی سخت کے ہیں اور باعتبار
صلابت اور شدت کے ہی پشت کو صلب کہا
جاتا ہے اور ابن خالویہ لغوی نے تصریح کی ہے
کہ صُلْبٌ، صَلَبٌ، صَالِبٌ، قَمَا مِطَا ظَهْرٌ
مَتْنٌ اور مَتْنَۃٌ سب کے ایک معنی ہیں۔ ارشاد الٰہی
یَخْرُجُ مِنْ بَیْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ (جو نکلتا ہے
پیٹھ اور چھاتی کے بیچ سے) یہاں صُلْبٌ کو واحد
لایا گیا اور ترائب کو جمع اس کی وجہ جیسی ہی ایک
تو یہ کہ گو عورت کے سینہ کو تَرِیْبَۃٌ کہتے ہیں مگر
محاورہ میں کہا جاتا ہے لِلْمَرْأَۃِ تَرَائِبُ اور اس
سے مراد اس کا سینہ اور سینہ کا ادھر ادھر کا حصہ
ہوتا ہے اور دوسرا جواب یہ ہے کہ صُلْب
سے مراد تو اصلاب ہی ہیں مگر جمع کی بجائے واحد پر
اکتفا کی گئی جیسے کہ آیہ شریفہ اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا
اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا (کیا دیکھا نہیں ان
منکروں نے آسمان اور زمین منہ بند تھی) اگرچہ مراد
زمینیں ہیں لیکن اَلْاَرْض کہا اَلْاَرَضِیْن نہیں کہا ہے ۳/۱۱

ملاحظہ ہو کتاب اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن العظیم از ابن خالویہ ص ۲۰ طبع دار الکتب المصریہ ۱۳۶۰ ہجری

**صَلَبُوْهُ** ۔ انہوں نے اس کو سولی دی (ضرب، نصر) سے جس کے معنی سولی دینے اور دار پر کھینچنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، ضمیر واحد مذکر غائب ۶/۲

**صُلْحٌ** ۔ صلح، اشتق مُصَالَحَۃٌ سے جس کے معنی آپس میں صلح کرنے کے ہیں، اسم ہے۔ راغب لکھا ہے کہ صلح لوگوں کی باہمی منافرت کو دور کرنے کے لیے مخصوص ہے ۵/۱۲ صُلْحًا ۵/۱۶

**صَلَحَ** ۔ وہ نیک ہوا (نصر، فتح، کرم) صَلَاحٌ و صُلُوحٌ سے جس کے معنی نیک ہونے اور نیکی کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، امام راغب لکھتے ہیں :۔

صَلَاحٌ فساد کی ضد ہے، یہ دونوں غالب استعمال میں افعال کے ساتھ مخصوص ہیں قرآن حکیم میں کہیں تو صلاح کا فساد سے مقابلہ کیا گیا ہے اور کہیں سَيِّئَۃٌ سے ۔ ارشاد ہے خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا (انہوں نے ملایا ایک کام نیک اور دوسرا بد) اور وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (اور مت خرابی مچاؤ زمین میں اس کے سنوارے پیچھے)۔ ۱۳/۹ ۲۴/۶

**صَلْدًا** ۔ سپاٹ اور سخت پتھر کہ جس پر کچھ نہ اگے اَصْلَادٌ جمع ۔ ۲/۴

**صَلْصَالٍ** ۔ بجتی ہوئی مٹی۔ کھنکھناتی ہوئی مٹی وہ خشک مٹی کہ جب اس پر انگلی ماری جائے تو بجنے اور کھنکھنانے لگے صلصال کہلاتی ہے اور بعض نے اس کے معنی سڑی ہوئی مٹی کے بھی بیان کیے ہیں۔ امام راغب لکھتے ہیں :۔

اصل میں صلصال خشک چیز کے بجنے کا نام ہے اسی سے محاورہ ہے صَلَّ الْمِسْمَارُ (کھونٹی بجی)۔ اور اسی سے خشک مٹی صلصال سے موسوم ہے کیونکہ وہ بجتی ہے۔ ارشاد ہے مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (کھنکھناتی مٹی سے جیسے ٹھیکرا) اور مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (کھنکھناتے سنے گارے سے) اور صَلْصَلَۃٌ باقی ماندہ پانی کا نام ہے جو مشکیزہ میں ہلنے کی کھڑکھڑاہٹ سے مشابہ ہونے کی بنا پر اس نام سے موسوم ہے اور بعض نے کہا ہے کہ صلصال سڑی ہوئی مٹی ہے۔ یہ عرب کے محاورہ صَلَّ اللَّحْمُ (گوشت سڑ گیا) سے ماخوذ ہے۔ ان کا بیان ہے کہ اس کی اصل صَلَّالٌ ہے ایک لام کو ص سے بدل لیا گیا ہے۔"

Marfat.com

فرا کا بیان ہے کہ صلصال وہ مٹی ہے جس میں ریگ ملی ہوئی ہو اور اس طرح بجنے لگے جس طرح ٹھیکری بجتی ہے اور ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ صلصال وہ خشک مٹی ہے جس کو آگ نہ پہنچی ہو اور جب تم اس کو انگلی سے ٹھونکو تو بجنے لگے اور تم اس کی کھنکھناہٹ سنو اور جب وہ آگ میں پکائی جائے تو فخار ہے، نیز ہر وہ شے جو کھنکھن بولے صلصال ہے۔ طبری نے قتادہ سے بھی باسناد صحیح ایسا ہی نقل کیا ہے اور مجاہد سے سڑی ہوئی کے معنی روایت کیے ہیں۔ کسائی نے بھی مجاہد ہی کے قول کو اختیار کیا ہے[1]

یہاں یہ امر ذہن نشین رہے کہ صنعت خلقت انسانی یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بارے میں قرآن مجید میں مختلف عبارتیں مذکور ہیں کہیں ارشاد ہے مِن تُرَابٍ (مٹی سے) کہیں فرمایا مِن طِينٍ لَازِبٍ (چپکتے گارے سے) اور کہیں مذکور ہے مِن حَمَإٍ مَسْنُونٍ (سڑے گارے سے) اور کہیں وارد ہے مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (کھنکھناتی مٹی سے جیسے ٹھیکرا) تو واضح رہے کہ ان عبارات میں ------

حقیقت میں اختلاف نہیں ہے، بلکہ مطلب ایک ہی ہے کیوں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے اول مٹی سے پیدا کیا، پھر اس میں پانی ملا تو طین لازب ہوئی یعنی اس میں چپک پیدا ہوئی، اس کے بعد حمأ مسنون کہلائی کہ سیاہ ہو گئی اور سڑ گئی پھر جب خشک ہوئی صلصال کالفخار سے موسوم ہوئی کہ ٹھیکری کی طرح کھن کھن بولنے لگی[2]

۱۴/۳ ـ ۲۶/۱۱ ـ ۲۹/۵

**صَلُّوا**: تم درود بھیجو، تم رحمت بھیجو۔ تَصْلِيَةٌ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر (ملاحظہ ہو تَصْلِيَةٌ) اور صَلوٰۃٌ ۲۲/۴

**صَلَوَاتٌ**: رحمتیں، شاباشیں، نمازیں، دعائیں، عبادت خانے، صَلوٰۃٌ کی جمع ہے ۲/۱۵۴ ـ ۱۱/۱ ـ ۱۶/۱۲

**صَلوٰتِهِمْ**: اپنی نمازیں، ان کی نمازیں، صَلوٰۃ مضاف، هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ

۱۸/۱ ـ

**صَلوٰتَكَ**: تیری دعا، صَلوٰۃِ مضاف، كَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ واضح رہے کہ لفظ صلوٰۃ ان دو مقامات پہ باوجودیکہ ضمیر

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۲۵۷، ۲۵۸
[2] معالم التنزیل ج ۴ ص ۵۳ طبع مصر ۱۳۳۲ھ
[3] ملاحظہ ہو لباب التاویل از علامہ خازن بغدادی ج ، ص ۴ طبع مصر

Marfat.com

کی طرف مضاف ہے مگر واؤ کے ساتھ مرقوم ہے الف کے ساتھ نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دو قرأتیں ہیں اس لیے اس کو صلوٰۃ غیر مضاف کی طرح لکھنا چاہیے۔ ۱۱/۲ ۱۲/۸

**صَلٰوۃ** ۔ نماز، دعا، رحمت، قرآن مجید میں جہاں بھی لفظ صلوٰۃ بغیر اضافت ہے واؤ کے ساتھ مرقوم ہے، یہ لفظ کے مفخم ہونے کی بنا پر ہے جیسے کہ زکوٰۃ ہے صَلٰوۃ، تَصْلِیَۃٌ سے اسم ہے۔ امام راغب اصفہانی رقمطراز ہیں:۔

بہت سے اہل لغت کا بیان ہے کہ صلوٰۃ کے معنی دعا کرنے، برکت مانگنے اور بزرگی سے یاد کرنے کے ہیں، بولا جاتا ہے صلیت علیہ یعنی میں نے اس کے لیے دعا کی اور بزرگی سے یاد کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اذا دعی احدکم الی طعام فلیجب وان کان صائما فلیصل جب تم میں کسی کو کھانے پر بلایا جائے تو قبول کر لینا چاہیے اور اگر روزہ دار ہو تو دعا کرنا چاہیے، یعنی دعوت کرنے والے کے حق میں دعا کرے۔ اور وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (اور دعا دے ان کو بیشک تیری دعا ان کے لیے

موجب تسکین ہے) يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ (وہ رحمت بھیجتے ہیں رسول پر اے ایمان والو رحمت بھیجو اس پر) وَصَلَوَاتِ الرَّسُولِ (اور دعائیں یعنی رسول کی) اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں پر صلاۃ کا مطلب حقیقت میں ان کو سراہنا ہے۔ ارشاد ہے أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ (ایسے لوگوں پر ہی شاباشیں ہیں اپنے رب کی اور مہربانی) اور فرشتوں کی طرف سے صلوٰۃ کے وہی معنی ہیں جو آدمیوں کی طرف سے صلوٰۃ کے ہیں یعنی دعا کرنا اور مغفرت چاہنا۔ ارشاد ہے إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ (اللہ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں رسول پر) الصلاۃ (صلاۃ) کہ جو عبادت مخصوصہ ہے (یعنی نماز) اس کی اصل بھی دعا ہی ہے جس طرح کہ کسی شے کو اس کے بعض اجزاء کے نام پر موسوم کر دیتے ہیں، اسی طرح یہ عبادت یعنی نماز بھی صلوٰۃ سے موسوم ہوئی کہ دعا پر مشتمل ہے، نماز ان عبادات میں سے ہے کہ جس سے کوئی شریعت خالی نہیں رہی گو اس کی صورتیں ہر شریعت کے اعتبار سے

یکے بعد دیگرے مختلف رہیں۔ اسی لیے وارد ہے
إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا
مَّوْقُوْتًا (بیشک یہ نماز ہے مسلمانوں پر
وقت باندھا حکم) اور بعض علماء نے کہا ہے کہ
صلوٰۃ کی اصل صلا ہے اور ان کا بیان ہے کہ صَلَّى
الْحَمَل کے معنی یہ ہیں کہ اس شخص نے اس
عبادت کے ذریعہ صلا کو کہ جو حق تعالیٰ کی
سلگائی ہوئی آگ ہے اپنے اوپر سے دفع کیا
اور صَلّی کی بنا مَكّنَ کی طرح ہے کہ جو ازالہ مرض
کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

نیز عبادت خانہ کو بھی صلوٰۃ کہا جاتا ہے
چنانچہ کنائس یہود یہودیوں کے عبادت خانے
صلوات سے موسوم ہیں۔ ارشاد ہے لَّهُدِّمَتْ
صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ (تو
ڈھائے جاتے تکیے اور مدرسے اور عبادت
خانے اور مسجدیں)

اور ہر وہ مقام کہ جہاں حق تعالیٰ نے فعل
صلوٰۃ پر مدح فرمائی ہے یا اس پر رغبت دلائی
ہے وہاں لفظ اقامت مذکور ہے جیسے الْمُقِيْمِيْنَ
الصَّلٰوةَ (اور آگے نہیں ہے نماز پر قائم رہنے والے)
کہ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (اور قائم کرو نماز)
اَقَامُوا الصَّلٰوةَ (اور قائم کریں نماز) حالانکہ
مُصَلِّيْنَ منافقین کے سوا اور کسی کو نہیں کہا
چنانچہ فرمایا: فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ
عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (پھر خرابی ہے
ان نمازیوں کی جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں) وَلَا
يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى (اور نہیں
آتے نماز کو مگر جی ہارے) لفظ اقامۃ کو خاص
طور پر اس لیے لایا گیا کہ اس امر پر تنبیہ ہو جائے
کہ نماز پڑھنے کا مقصد اس کے حقوق و شرائط
کی بجا آوری ہے نہ کہ مجرد ہیئت کذائی کا ادا
کر دینا۔ اسی لیے مروی ہے کہ ان المصلين
كثير والمقيمين قليل (نمازی تو بہت ہیں
پر نماز کے حقوق و شرائط کے ادا کرنے والے
تھوڑے ہیں)"

علامہ جوالیقی نے کہا ہے کہ عبرانی میں صلوات
کے معنی کنائس یہود کے ہیں اور اس کی اصل
صلوتا ہے۔[1]

واضح رہے کہ نماز معراج میں شب شنبہ
رمضان کی سترہویں تاریخ ہجرت سے ڈیڑھ برس پہلے

[1] الاتقان ج ۱ ص ۱۴۰ طبع مصر۔

فرض ہوئی ہے اور معراج سے پہلے دو نمازیں تھیں ایک تو آفتاب نکلنے سے پہلے اور دوسری اس کے ڈوبنے سے پہلے۔ یہ علامہ شمنی کا بیان ہے[1] لیکن رمضان میں معراج کا ہونا ایک قول ہے اور دوسرا یہ ہے کہ معراج رجب میں ہوئی تھی اور یہی عام طور پر مشہور ہے

۱/۱،۵،۷،۱۲ — ۲/۳،۶ — ۳/۶

۵/۸،۱۲،۱۷ — ۶/۲،۳،۷،۱۲،۱۳ — ۷/۲،۴،۱۵ — ۹/۱۱،۱۵

۱۰/۴،۸،۹،۱۳،۱۴ — ۱۱/۱۴ — ۱۲/۱۰ — ۱۳/۹،۱۶،۱۸ — ۱۵/۹

۱۶/۵،۷،۱۰،۱۶ — ۱۷/۵،۱۳،۱۳،۱۶ — ۱۸/۱۱،۱۳،۱۵ — ۱۹/۱۲ — ۲۱/۱،۷،۱۰،۱۱

۲۲/۱،۱۵،۱۶ — ۲۵/۵ — ۲۸/۲،۱۲ — ۲۹/۱۴ — ۳۰/۲۳

**اَلصَّلٰوۃُ الْوُسْطٰی** ۔ بیچ والی نماز اور میانی نماز، شاہ عبد القادر صاحب موضح القرآن میں فرماتے ہیں:—

"بیچ والی نماز عصر ہے کہ دن اور رات کے بیچ میں ہے، اس کا تقید زیادہ کیا ہے"

واضح رہے کہ سلف میں صلوٰۃ وسطیٰ کی تعیین میں اختلاف ہے کہ اس سے کون سی نماز مراد ہے علامہ دمیاطی نے اس کے متعلق ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس میں انیس اقوال جمع ہیں اس رسالہ کا نام کشف الغطا عن الصلوٰۃ الوسطیٰ ہے۔ اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں اس پر ایک اور قول کا اضافہ کر کے پورے بیس[2] نقل کیے ہیں۔ لیکن صحیح حدیثوں میں اس کی تفسیر نماز عصر سے مروی ہے چنانچہ ترمذی اور ابن حبان نے بروایت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور امام احمد نیز ترمذی نے بروایت سمرہ رضی اللہ عنہ اور ابن جریر نے بروایت ابوہریرہ اور ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہما آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ: "صلوٰۃ وسطیٰ صلوٰۃ عصر ہے"[3] چنانچہ امام ابو حنیفہ اور امام احمد کا یہی قول ہے۔

جو لوگ عصر کی نماز کے علاوہ کسی اور نماز کو صلوٰۃ وسطیٰ کہتے ہیں ان کے دلائل کا حاصل تین باتیں ہیں (۱) بعض صحابہ کے اقوال مگر وہ اور صحابہ کے اقوال سے معارض ہیں کہ جو عصر بیان کرتے ہیں اور قول عصر کی تصحیح نص صریح مرفوع سے ہوتی ہے، نیز جب صحابہ میں اختلاف ہو تو ایک کا قول دوسرے کے مقابل حجت نہیں تو لہٰذا الصدر مرفوع کی دلیل اپنی جگہ باقی رہے گی

[1] ملاحظہ ہو الدر المختار کتاب الصلوٰۃ۔ [2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتح الباری ج ۸ ص ۱۳۶ تا ۱۴۸۔ [3] الاتقان ج ۲ ص ۱۹۲ طبع مصر۔

Marfat.com

(۲) احادیث مرفوع کا معارضہ ان روایتوں سے کرنا جن میں عصر کی نماز کے علاوہ اور نمازوں کی تاکید آئی ہے جیسے وہ روایت کہ جس میں صبح اور عشاء کی پابندی پر رغبت دلائی گئی ہے مگر یہ اس روایت کے معارض ہے کہ جو اس سے زیادہ قوی ہے کہ جس میں نماز عصر کے چھوٹنے پر سخت وعید آئی ہے

(۳) حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما سے جو ایک قرأت میں حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى کے بعد وَصَلٰوةِ الْعَصْرِ بالو عطف وارد ہے اور عطف مغایرت کا متقضی ہے مگر یہ قرأت کا خبر آحاد سے اثبات ہے جو ممنوع ہے اور بمنزلہ خبر واحد اس کو تسلیم کرنا مختلف فیہ ہے اور بالفرض اگر اس کو خبر واحد تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی منصوص صریح کا معارض نہیں ہو سکتا علاوہ ازیں عطف کا مقتضی مغایرت ہونا بھی صریح نہیں کیوں کہ نفس صفات میں عطف وارد ہے جیسے ارشاد باری هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ہے۔ یہ حافظ صلاح الدین علائی کے بیان کی تلخیص ہے۔[1] ۲/۱۵

صَلُّوْا۔ اس کو داخل کرو۔ صَلُّوْا تَصْلِيَةً

صحاضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، کا ضمیر واحد مذکر غائب ۲۹/۵

**صَلّٰى** ۔ اس نے نماز پڑھی، تَصْلِيَةٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ آیہ کریمہ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى سو اس نے نہ تصدیق کی نہ نماز پڑھی، میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ وہ ان لوگوں میں نہ تھا کہ جو نماز ادا کرتے ہیں یعنی نماز کے حقوق و شرائط تو درکنار اس کی ظاہری ہیئت کو بھی ادا نہیں کرتا تھا (ملاحظہ ہو تَصْلِيَةٌ اور صلٰوۃ) ۲۹/۱۸ ۳۰/۲۱،۱۲

**صِلِيًّا** ۔ آگ میں داخل ہونے والے آگ میں داخل ہونا۔ پہلے معنی کے اعتبار سے یہ صَالٍ کی جمع ہے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے صَلِيَ یَصْلٰی کا مصدر ہے جس کے معنی سوختہ ہونے اور آگ میں داخل ہونے کے ہیں (ملاحظہ ہو صال) ۱۶/۸

## فصل المیم

**صُمٌّ** ۔ بہرے۔ اَصَمُّ کی جمع ہے (ملاحظہ ہو اَصَمُّ اور صَمُّوْا)، ۱/۲ ۲/۵ ۷/۱۰ ۹/۱۶ ۱۱/۱۶ ۱۱/۴ ۱۷/۲ ۲۱/۸ ۲۵/۱۰ صُمًّا ۱۵/۱۱ ۱۹/۴

[1] ملاحظہ ہو فتح الباری ج ۸ ص ۱۴۸۔

Marfat.com

صَمَدُ بے نیاز۔ بے احتیاج۔ جو کھاتا پیتا نہ ہو واضح رہے کہ صَمَد کے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں:۔

ابن عباس (رضی اللہ عنہما)، مجاہد، حسن اور سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ صَمَد وہ ہے جس کے جوف یعنی شکم نہ ہو شعبی نے کہا یعنی جو نہ کھاتے نہ پیتے[۱]۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا مابعد اس کی تفسیر ہے، چنانچہ ابو العالیہ اُبَیّ بن کعب (رضی اللہ عنہ) سے راوی ہیں کہ الصمد الذی لم یلد ولم یولد۔ صمد وہ ہے جس کو نہ کسی نے جنا نہ وہ کسی سے جنا گیا کیونکہ جو پیدا ہوگا شتاب مریگا، اور جو وارث ہوگا دوسرا اس کی وراثت پائیگا۔ ابو وائل شقیق بن سلمہ کا بیان ہے کہ "صمد" وہ سردار ہے جس پر سرداری ختم ہو گئی ہو۔ علی بن ابی طلحہ کی بھی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت یہی ہے کہ صَمَد وہ سردار ہے جو سیادت کی تمام انواع میں کامل ہو۔ نیز سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ جمیع صفات وافعال میں کامل ہو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ وہ سردار ہے جو حوائج میں مقصود ہو۔ سُدّی کا بیان ہے کہ وہ سردار جس کی طرف نعمتوں میں رُخ کیا جائے اور مصیبتوں میں اس سے فریاد کی جائے اہلِ عرب "قصد کرنے" کے معنی میں بولتے ہیں صمدت فلانا اصمدہ صمدا بسکون میم اور صَمَد بفتح میم مقصود کو کہتے ہیں"۔ اور قتادہ کا قول ہے کہ صمد وہ ذات ہے جو اپنی خلق کے فنا ہو جانے کے بعد باقی رہے اور عکرمہ نے کہا ہے کہ صمد وہ ہے جس کے اوپر کوئی نہ ہو اور یہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے

[۱] شاہ عبد القادر صاحب نے بھی موضح قرآن میں یہی معنی اختیار کیے ہیں، چنانچہ اَللّٰہُ الصَّمَدُ کا ترجمہ لکھتے ہیں "نرادھار یعنی کھاتا پیتا نہیں" امام راغب نے لکھا ہے کہ اَللّٰہُ الصَّمَدُ فرمانے سے مقصود اس امر پر تنبیہ کرنا ہے کہ ان لوگوں نے جن کو معبود قرار دیا اللہ تعالےٰ کی ذات ان کے برخلاف ہے۔ آیہ کریمہ مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ "اور نہیں مسیح مریم کا بیٹا، مگر رسول ہے گذر چکے اس سے پہلے بہت رسول اور اس کی ماں ولی ہے، دونوں کھاتے تھے کھانا" میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم جن کو معبود بناتے ہو وہ کھانے پینے کے محتاج ہیں اور اللہ تعالیٰ کو نہ کھانے کی حاجت نہ پینے کی ۱۲ منہ

Marfat.com

اور ربیع کہتے ہیں کہ صَمَدٌ وہ ہے جس پر آفتیں نہ آئیں اور مقاتل بن حیان نے کہا ہے کہ جس میں کوئی عیب نہ ہو[1]

محدث ملا علی قاری حنفی نے الحرز الثمین شرح الحصن الحصین میں ان تمام معانی کا خلاصہ ان لفظوں میں بیان کیا ہے:-

| | |
|---|---|
| وحاصله الغنی | حاصل یہ ہے کہ صمد وہ ذات |
| المغنی الذی | غنی مغنی ہے کہ جس کو کسی چیز |
| لا یحتاج الی شیء | کی طرف احتیاج نہیں اور |
| ویحتاج الیه کل | اس کی طرف ہر ایک کو |
| احد[2] | احتیاج ہے۔ |

علامہ خازن البغدادی نے لکھا ہے کہ "اولیٰ یہ ہے کہ صمد کو ان تمام معانی پر محمول کیا جائے کہ جو اس کے متعلق بیان کیے گئے ہیں کیونکہ وہ ہر ایک کا محتمل ہے۔"[3]

واضح رہے کہ جیسا سابق میں معلوم ہوا اصل میں صَمَدٌ کے معنی قصد کرنے کے ہیں اور صَمَدٌ اسی سے بر وزن فَعَلٌ صیغہ صفت ہے، بمعنی مفعول یعنی مقصود پس لغت و اشتقاق کے اعتبار سے تو اس کے اصل معنی وہی ہیں جو ائمہ لغت ابو عبیدہ، راغب اور خطابی نے بیان کیے ہیں کہ[4]

| | |
|---|---|
| الصمد السید | "صمد" وہ سردار ہے جس کی طرف |
| الذی یصمد | (حاجتوں، مصیبتوں اور تمام معاملات |
| الیه۔ | میں) قصد کیا جائے۔ |

**صَمُّوا** - وہ بہرے بن گئے (فتح) صَمٌّ اور صَمَمٌ سے جس کے معنی بہرا ہونے کے ہیں ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، جو حق کی طرف متوجہ نہ ہو اور اسے قبول نہ کرے وہ اس صفت سے متصف کیا جاتا ہے۔ ارشاد ہے صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ (بہرے ہیں گونگے اندھے سو وہ نہیں پھریں گے) اور فرمایا وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا (اور جب ان کو سمجھائیے

---

[1] معالم التنزیل ج ۷، ص ۲۶۵ طبع مصر۔ امام بیہقی نے بھی ان میں سے اکثر اقوال کو باسانید روایت کیا ہے (ملاحظہ ہو کتاب الاسماء والصفات ص ۴۳، ۴۴ مطبع انوار احمدی الہ آباد۔ [2] منقول از حواشی مولانا عبد الحیی فرنگی محلی برحصن حصین ص ۳۸ طبع مصر ۱۳۳۱ھ [3] لباب التاویل معروف بہ تفسیر خازن ج ۷، ص ۲۶۶ [4] ابو عبیدہ کا قول فتح الباری میں اور خطابی کا قول کتاب الاسماء والصفات میں منقول ہے۔ ابن خالویہ لغوی نے اس معنی کے لئے کہا ہے (یعنی جو کچھ بیان کیا گیا ہے ان سب میں بہتر) ملاحظہ ہو کتاب اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن العظیم ص ۲۹ اور خطابی نے کہا ہے کہ جو کچھ اس آیت میں کہا گیا ہے اس میں زیادہ صحیح وہی ہے جس کے لیے معنی اشتقاق شاہد ہیں (ملاحظہ ہو الاسماء والصفات ص ۴۴)

Marfat.com

ان کے سب کی باتیں نہ ہو پڑیں ان پر بہرے اندھے
وَحَسِبُوا أَلَّا تَكُونَ فِتْنَةٌ فَعَمُوا وَصَمُّوا
ثُمَّ تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوا وَصَمُّوا اور خیال
کیا کہ کچھ خرابی نہ ہوگی سو اندھے ہو گئے اور بہرے
پھر اللہ نے توجہ فرمائی ان پر پھر بہرے اور اندھے ہو گئے

$\frac{6}{12}$

## فصل النون

صُنْعَ - کاریگری، بنانا، اچھا کام کرنا۔ صَنَعَ
يَصْنَعُ کا مصدر ہے جس کے معنی کاریگری اور
نکوئی کرنے کے ہیں۔ راغب نے لکھا ہے کہ صُنْعٌ
کے معنی اجادۃ فعل، کام کو عمدگی سے کرنے
کے ہیں۔ بلس ہر صنع فعل ہے لیکن ہر فعل صنع
نہیں ہے۔ نیز جس طرح کہ فعل کی نسبت حیوانات اور
جمادات کی طرف ہوتی ہے صنع کی نہیں ہوتی

صُنْعًا $\frac{16}{3}$

صَنَعُوا - انہوں نے کیا، انہوں نے بنایا
صَنَعَ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب ہے واحد
ہوا صَنَعَ ، $\frac{12}{2}$ $\frac{13}{10}$ $\frac{16}{2}$

صَنْعَةَ - بنانا۔ یہ صَنَعَ يَصْنَعُ کا مصدر

$\frac{14}{9}$ ۳۰

صِنْوَانٌ : جڑے ہوئے، ایک جڑ سے نکلی ہوئی
شاخیں۔ صنوان جمع صِنْوٌ اس شاخ کو کہتے
ہیں جو درخت کی جڑ سے نکلی ہو، اس کا تثنیہ
صِنْوَانِ اور جمع صِنْوَانٌ ہے۔ یہ امام راغب اصفہانی کا
بیان ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ
در اصل میں صنو کے معنی مثل کے ہیں اور مراد
اس سے یہاں وہ شاخ ہے کہ اس کو اور
دوسری شاخ کو یا دیاں شاخوں کو ایک ہی جڑ
گھیرے ہوئے ہو۔ اسی معنی میں حدیث ہے
عَمُّ الرَّجُلِ صِنْوُ أَبِيهِ (مرد کا چچا اپنے
باپ کی طرح ہے) کیوں کہ ان دونوں کو
ایک ہی اصل گھیرے ہوئے ہوتی ہے[1] $\frac{13}{4}$

## فصل الواو

صَوَابًا - ٹھیک بات، حق، راست، الاست
خطا کی ضد ہے۔ امام راغب لکھتے ہیں:
صواب کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے: ایک
کسی شے کے اپنی ذات کے لحاظ سے جیسے
جب کوئی شے فی نفسہ لغو لغرلیف کے قابل ہو

[1] فتح الباری ج ۸ ص ۲۸۳ طبع مصر۔ [2] دادا مراد ہے۔

اور عقل و شرع کے مقتضیٰ کے مطابق پسندیدہ
ہو تو کہا جاتا ہے ہٰذا صواب جیسے تم بولتے
ہو تحری العدل صواب الفاظ کو مدِ نظر
رکھنا ٹھیک ہے اللہ الکرم صواب
(سخاوت عمدہ ہے)

دوسرے قاصد یعنی ارادہ کرنے والے کے
اعتبار سے اس کا استعمال ہوتا ہے جبکہ
وہ مقصود کو اپنے ارادہ کے مطابق پالے
چنانچہ کہا جاتا ہے اصاب کذا یعنی جس
کی طلب تھی اسے پالیا۔ جیسے تم بولتے ہو
اصابہ بالسہم (تیر سے اس کو پالیا)

اور اس کی مختلف صورتیں ہیں:۔
(۱) یہ کہ جس چیز کا قصد کرنا مستحسن ہے اس
کا قصد کرے اور اسے کر ڈالے اور یہی صواب
تام ہے کہ جس پر انسان کی مدح کی جاتی ہے
(۲) یہ کہ جس چیز کا قصد کرنا مستحسن ہے قصد تو
اسی کا کرے مگر اس شے کے علاوہ اور کوئی
شے اس سے سرزد ہو جائے کیونکہ اس کے
اجتہاد کے بعد اپنے اندازہ میں وہی چیز صواب
تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کل
مجتہد مصیب فرمایا ہے اس سے یہی مراد ہے

نیز مروی ہے المجتہد مصیب وان اخطأ
فہذا لہ اجر (مجتہد صواب پر ہے اور اگر اس
نے خطا کی تو اس کو ایک اجر ہے) جس طرح یہ
روایت ہے کہ من اجتہد فاصاب فلہ
اجران ومن اجتہد فاخطأ فلہ اجر
(جس نے اجتہاد کیا اور ٹھیک کیا تو اس کو دو
اجر ہیں اور جس نے اجتہاد کیا اور خطا کی تو اس
کو ایک اجر ہے) (۳) صواب کا قصد کیا مگر
کسی خارجی سبب کی بناء پر خطا ہو گئی جیسے
ایک شخص شکار پر تیر لگانا چاہتا تھا کہ انسان
کو لگ گیا تو یہ معذور ہے (۴) یہ کہ فعل
قبیح کا قصد کرتا تھا لیکن اس سے اپنے
قصد کے خلاف واقع ہوا تو کہا جائیگا کہ اس
نے اپنے قصد میں خطا کی اور جو اس نے پایا وہ
صواب یعنی درست ہے“ ۳۰/۲

**صُوَاعَ** ۔ پینے کا بڑا جام جس میں شراب پی
جاتی ہے، نیز صاع کو صواع کہتے ہیں جو
ایک مشہور پیمانہ ہے صِیْعَانٌ جمع۔ امام راغب لکھتے ہیں
یہ ایک برتن تھا جس سے پیا بھی جاتا تھا اور
ناپا بھی جاتا تھا۔ اسے صاع بھی کہا جاتا ہے
یہ مذکر اور مونث دونوں طرح مستعمل ہے

Marfat.com

چنانچہ نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ (ہم نہیں پاتے
بادشاہ کا پیمانہ) کے بعد ارشاد ہے ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا
(آخر کار وہ برتن نکالا)
اس میں ھا ضمیر واحد مؤنث غائب صُوَاعَ کی
طرف راجع ہے (ملاحظہ ہو سِقَايَة) ۱۳/۴

**صَوَاعِقَ**: کڑک بجلیاں۔ صَاعِقَةٌ کی جمع
ہے (ملاحظہ ہو صعق) ۱/۲، ۱۲/۸

**صَوَافَّ**: صف بستہ۔ صف باندھے ہوئیں
صَافَّةٌ کی جمع، جو صَفٌّ سے اسم فاعل کا صیغہ
واحد مؤنث ہے۔ قاموس میں مرقوم ہے:۔
"قرآن مجید میں فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا
صَوَافَّ (سو پڑھو ان پر نام اللہ کا قطار باندھ
کر) میں صَوَافَّ بمعنی مَصْفُوفَةٌ (اسم
مفعول کے معنی میں یعنی ایک قطار میں کی
ہوئیں) فَوَاعِلُ بمعنی مَفَاعِلُ اور بعض نے
بمعنی مُصْطَفَّةٌ (اسم فاعل یعنی قطار باندھے
والیاں) بیان کیا ہے" ۱۷/۱۲

**صَوَامِعُ**: عیسائی راہبوں کے تکیے صَوْمَعَةٌ
کی جمع "صومعہ" ہر وہ عمارت ہے کہ جس کا اوپر کا سرا
باہم مجتمع ہوتا ہو چونکہ عیسائی اپنے عبادت خانوں کا سرا
بلند اور باریک گاؤدم بناتے ہیں اس لیے اس کو
صومعہ بولتے ہیں۔ علامہ سلیمان جمل شیخ مسین سے
ناقل ہیں کہ:۔
صَوَامِعُ، صَوْمَعَةٌ کی جمع ہے۔ صومعہ اس
بلند عمارت کو کہتے ہیں کہ جس کا بالائی حصہ
محدب ہو، اور اس کا وزن فَوْعَلَةٌ ہے جیسے
کہ دَحْرَجَةٌ ہے، اور یہ راہبوں کا عبادت خانہ ہے
اور بعض نے کہا ہے کہ صابیوں کا عبادت خانہ
ہے۔[۱] ۱۷/۱۲

**صَوْتِ**: آواز۔ آواز کرنا۔ پہلے معنی کے اعتبار
سے اسم ہے اور اس کی جمع اَصْوَاتٌ اور دوسرے
معنی کے لحاظ سے صَاتَ يَصُوْتُ کا مصدر ہے
راغب لکھتے ہیں:۔
"صوت وہ ہوا ہے جو دو جسموں کے ٹکرانے
سے بج جاتی ہے، اور اس کی دو قسمیں ہیں
ایک وہ آواز کہ جو کسی شے سے تنفس (سانس
سائیں) سے خالی ہو، جیسے وہ آواز کہ جو
(فضا میں) پیدا ہوتی ہے دوسری وہ کہ جس
میں کسی آواز کی سنسناہٹ موجود ہو، اس
"صوت متنفس" کی بھی دو قسمیں ہیں۔

[۱] الفتوحات الالٰہیہ بتوضیح تفسیر الجلالین للدقائق الخفیہ از سلیمان جمل ج ۳ ص ۱۶۹ طبع مصر

Marfat.com

(۱) غیر اختیاری جو کہ جمادات اور حیوانات سے سرزد ہوتی ہے' (۲) دوم اختیاری جو کہ انسان سے ظاہر ہوتی ہے اور اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ (۱) جو ہاتھ کی حرکت سے پیدا ہو جیسے عود اور اسی قسم کی اشیاء کی آوازیں (۲) اور جو منہ سے نکلے اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ نطق اور غیر نطق، غیر نطق جیسے بانسری کی آواز ہے اور نطق یا کلام مفرد ہوگا یا کلام مرکب"

$\frac{۲۱}{۱۱}$ $\frac{۲۶}{۱۳}$

**صَوْتِكَ** - تیری آواز، تیرا آواز کرنا صَوْتِ مضاف ك ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ

$\frac{۱۵}{۳۰}$ $\frac{۲۱}{۱۱}$

**صُوْرِ** - صور - نرسنگا۔ شیخ ابوالفضل جمال قرشی رقمطراز ہیں۔

"صور بالضم بمعنی شاخ ہے نیز وہ چیز کہ جسکو حضرت اسرافیل علیہ السلام خلق کو مارنے اور جلانے کے لیے پھونکیں گے۔ ارشاد الٰہی ہے یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ (جس دن پھونکا جائیگا صور) کلبی نے کہا ہے مجھے نہیں معلوم کہ صور کیا ہے نیز بیان کیا جاتا ہے کہ صُوَر، صُوْرَۃٌ کی جمع ہے جس کے معنی پیکر و پتلے کے ہیں جیسے کہ بُسْرَۃٌ اور بُسْرٌ میں یعنی مردوں کے پیکروں میں روحیں پھونکی جائیں گی اور حسن بصری نے تو قرأت ہی بتحریک واو کی ہے۔ (جس دن پتلوں میں پھونکا جائیگا)[۱]

یہ دوسرا قول ابو عبیدہ اور مقاتل کا ہے[۲] مگر پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ قرآن مجید میں دوسری جگہ فرمایا ہے ثُمَّ نُفِخَ فِیْهِ اُخْرٰی (پھر دوبارہ اس میں پھونکا جائے گا) فِیْهِ میں ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب ہے ظاہر ہے کہ اگر صُوَر صُوْرَۃٌ کی جمع ہوتا تو ضمیر واحد مذکر کیوں آتی ہے۔ نیز ارشاد ہے فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ (پھر جب بجنے لگے گی وہ کھوکھلی چیز) یعنی صور پھونکنے کا بیان ہے علاوہ ازیں خود حدیث میں اس کے معنی نرسنگے کے موجود ہیں چنانچہ امام احمد، ابوداؤد، نسائی، دارمی، ترمذی اور حاکم نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی روایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا الصور القرن ینفخ فیہ[۳] صور نرسنگا ہے جس کو پھونکا جائے گا۔

---

[۱] ملاحظہ ہو الصراح من الصحاح باب الراء فصل الصاد
[۲] حواشی شیخ سلیمان جمل بر جلالین ج ۲ ص ۳۹ طبع مصر
[۳] مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح از ملا علی قاری ج ۵ ص ۲۳۲ طبع مصر۔

Marfat.com

اور مجاہد نے جو کبار تابعین سے ہیں تصریح کی ہے کہ صُوْر شاخ (نرسنگا) ہے جو بوق کی طرح ہوتی ہے

لہ ۔ ۷/۱۵ ، ۱۶/۲ ، ۳۰/۳ ، ۲۳/۳ ، ۲۴/۴ ، ۳۶/۱۶ ، ۲۹/۵ ، ۳۰/۱

**صُوَرَكُمْ**۔ تمہاری صورتیں۔ صُوَرَ۔ صُوْرَةٌ کی جمع ہے مضاف ہے۔ کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ (ملاحظہ ہو صُوْرَةٍ) ۲۴/۱۲ ، ۲۸/۱۵

**صَوَّرَكُمْ**۔ اس نے تمہاری صورت کھینچی اس نے تمہاری شکل بنائی صَوَّرَ۔ تَصْوِیْرٌ سے جس کے معنے صورت بنانے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر۔

۲۴/۱۲ ، ۲۸/۱۵

**صَوَّرْنٰكُمْ**۔ ہم نے تمہاری صورتیں بنائیں صَوَّرْنَا۔ تَصْوِیْرٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر ہے۔ ۹/۳

**صُوْرَةٍ**۔ صورت شکل پیکر۔ جمع۔ امام راغب لکھتے ہیں:۔

صورة وہ ہے جس کے ذریعہ اعیان (ذوات اشیاء) کا نقش (آثار) لیا جاتا ہے اور اسی لئے اشیاء میں باہمدگر امتیاز ہوتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں (۱) صورت محسوسہ کہ جس کا خاص و عام سب ادراک کرتے ہیں، بلکہ انسان تو انسان بہت سے جانوروں کو بھی اس کا ادراک ہوتا ہے، جیسے انسان گھوڑے گدھے کی صورت ہے کہ جو معائنہ میں آتی ہے۔

(۲) صورت معقولہ کہ جس کا خاص ہی لوگ ادراک کرتے ہیں عام نہیں جیسے انسانی عقل و فکر کی وہ صورت کہ جو انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ نیز وہ معانی کہ جن سے کوئی شے کسی خاص شے کے ساتھ مختص ہے آیات ذیل میں دونوں ہی صورتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہے ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ (پھر ہم نے تمہاری صورتیں بنائیں) اور صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (اور صورت بنائی تمہاری تو اچھی بنائیں صورتیں تمہاری) اور فرمایا فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ (جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ دیا) یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ (وہ نقشہ بناتا ہے تمہارا ماؤں کے پیٹ میں جس طرح چاہے) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ بلاشبہ اللہ نے آدم کو اس

---

لہ جمل علی الجلالین ج ۲ ص ۴۹ ۔ طبع مصر

Marfat.com

کی صورت پر بنایا) یہاں "صورت" سے انسان
کی وہ مخصوص ہیئت مراد ہے کہ جس کا بصر
سے ادراک ہوتا ہے اور بصیرت سے بھی اور
جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی اور
بہت سی مخلوق پر فضیلت عطا کی ہے۔ اور
صورۃ کی اضافت حق کی طرف بر بنا ملکیت
ہے، نہ بر سبیل بعضیت و تشبیہ[سه]، کہ اللہ کی
ذات اس سے برتر ہے۔ بلکہ یہ اس صورت
کے شرف کے لئے ہے جیسے کہ "بیت اللہ"
(اللہ کا گھر) اور "ناقۃ اللہ" (اللہ کی اونٹنی) ہے
اور اسی طرح سے وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي (اور
میں پھونکوں اس میں ایک اپنی جان ہے" [۳۰]

صَوْمًا۔ روزہ۔ یہ صَامَ يَصُومُ کا مصدر ہے
جس کے معنی روزہ رکھنے کے ہیں۔ راغب
لکھتے ہیں :-
صوم کے معنی اصل میں کام کے کرنے سے رک
جانے کے ہیں، خواہ کھانا ہو یا گفتگو کرنا ہو یا
چلنا پھرنا۔ اسی لیے اس گھوڑے کو جو چلنے
پھرنے اور گھاس چارے سے رک جائے صائم
کہا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے۔ ع

خیل صیام واخری غیر صائمۃ

اور تھمی ہوئی ہوا کو صائمہ بولتے ہیں، اور استواء[له]
نہار کو صوم کہتے ہیں یہ تصور کر کے کہ آفتاب
وسط آسمان میں ٹھہر گیا ہے اور اسی تصور
پر بولتے ہیں۔ قام قائم الظھیرۃ (گرمی
کے وقت کا ٹھہرنے والا ٹھہر گیا۔ یعنی دوپہر
ہو گئی اور آفتاب سر پہ آ کر رک گیا) اور شریعت
میں صوم سے مراد مکلف کا نیت کے ساتھ
صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک
کھانے پینے، استمناء (قصداً منی نکالنے)
اور استقاءہ (خود جان کر قے کرنے) سے رک
جانے کا نام ہے اور ارشاد الٰہی اِنِّي نَذَرْتُ
لِلرَّحْمَٰنِ صَوْمًا (میں نے رحمٰن کا روزہ)
کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ اس سے چپ
رہنا مراد ہے جس کو فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ
إِنسِيًّا (سو میں بات نہ کروں گی آج کسی)
بتا رہا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی

---

سه یعنی یہ مطلب نہیں کہ اللہ نے کچھ اپنی صورت میں سے آدم کی صورت بنائی یا اپنی جیسی بنائی۔ بلکہ اضافت اس بنا پر ہے کہ وہ صورت اللہ کی ہے یعنی اللہ اس صورت کا مالک ہے اور وہ صورت اس کی مخلوق ہے۔ ۱۲ منہ

له نیمروز ٹھیک دوپہر جب سورج سر پہ آ جاتا ہے

Marfat.com

بیان صومًا کی تفسیر میں خاموش رہنا ہے مروی ہے[1] اسرائیلی شریعت میں چپ کا روزہ رکھنا درست تھا لیکن ہماری شریعت میں یہ حکم منسوخ ہوا اب خاموشی کا روزہ رکھنا درست نہیں ۱۲/۵

## فصل الھاء

صِھْرًا: سسرال۔ امام قرطبی فرماتے ہیں:۔

"صھر" اور "نسب" دو ایسے معنی ہیں جو ہر اس قرابت کو شامل ہیں کہ جو دو آدمیوں میں پائی جائے۔

"نسب" اور "صھر" میں فرق یہ ہے کہ "نسب" وہ قرابت ہے جس سے خاندانی رشتہ چلتا ہے اور نسل کا سلسلہ قائم ہوتا ہے۔ اور صھر وہ قرابت ہے جو عورتوں سے چلتی ہے اور اس سے سسرال اور دامادی کا رشتہ قائم ہوتا ہے چنانچہ علامہ محمود بن عمر زمخشری آیہ شریفہ وَھُوَالَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَہٗ نَسَبًا وَّصِھْرًا "اور وہی ہے جس نے بنایا پانی سے آدمی پھر ٹھہرایا اس کیلئے نسب اور سسرال" کی تفسیر میں قطراز ہیں۔ مراد یہ ہے کہ بشر کی دو قسمیں فرمائیں (۱) ذوی نسب یعنی مرد کہ جن سے نسب چلتا ہے اور کہا جاتا ہے فلاں بن فلاں اور فلانہ بنت فلاں (۲) ذوات صھر یعنی عورتیں کہ جن سے سسرالی رشتہ چلتا ہے۔[2]

ازہری نے کہا ہے کہ:۔

"صھر عورتوں کی قرابتوں والے محرم مرد اور محرم عورتوں پر مشتمل ہے جیسے والدین اور بھائی اور ان کی اولاد اور چچا اور ماموں اور خالائیں کہ یہ سب عورت کے شوہر کے اصھار (سسرال والے) ہیں۔ اور اسی طرح جو شوہر کی طرف کے قرابت والے محارم ہیں وہ عورت کے اصھار ہیں"

اور ابن السکیت کا بیان ہے:۔

"شوہر کی طرف کے جو قرابت دار ہیں اس کا بھائی اور چچا یہ سب احماء کہلاتے ہیں اور عورت کی طرف کے جو اہل قرابت ہیں وہ اختان کہلاتے ہیں اور اصھار کا لفظ دونوں صنفوں کو جامع ہے"[3]

[1] صراح باب المیم فصل الصاد۔ [2] الکشاف عن حقائق التنزیل ج ۲ ص ۱۸۹ طبع کلکتہ

[3] قرطبی، ازہری اور ابن السکیت تینوں کے بیانات جمل علی الجلالین میں مرقوم ہیں۔ ملاحظہ ہو ج ۳ ص ۲۰۸ طبع مصر۔

Marfat.com

غرض سسرالی اور دامادی رشتہ کے جو اہلِ قرابت ہیں وہ سب صِہر میں داخل ہیں اور اسی لیے صِہر کے معنی داماد، خسر اور بہنوئی سب کے آتے ہیں صِہْرٌ کی جمع اَصْہَارٌ ہے۔ پ ۱۹/۴

## فصل الیاء المثناة

**صَیَاصِیْہِمْ**۔ اُن کے قلعے، ان کی گڑھیاں صَیَاصِی۔ مضاف ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ صَیَاصِی، صِیْصَۃٌ کی جمع ہے۔ بمعنی قلعہ کے ہر وہ چیز کہ جس کے ذریعہ تحفظ کیا جائے صِیْصَۃٌ کہلاتی ہے، اور اسی اعتبار سے گائے کے سینگ اور مُرغ کے خار کو "صِیْصَۃ" بولتے ہیں۔ پ ۲۱/۱۹

**صِیَامُ**۔ روزہ رکھنا۔ صَامَ یَصُوْمُ کا مصدر ہے پ ۲/۶،۸ پ ۵/۱۰ پ ۷/۲ پ ۲۸/۱ صِیَامًا پ ۷/۴

**صَیِّبٍ**۔ زور کا مینہ برسنے والا بادل۔ یہ صَوْبٌ سے بروزن فَیْعِلٌ مبالغہ کا صیغہ ہے واو کا یاء میں ادغام کر دیا گیا ہے۔ صَوْبٌ کے معنی اوپر سے نشیب کی طرف آنے، نازل ہونے اور برسنے کے ہیں، چونکہ مینہ برستا ہے اور بادل میں برسنے والا پانی ہوتا ہے اس لیے زور کی بارش اور ابرِ باراندہ کو صَیِّب کہتے ہیں۔ پ ۱/۲

**صَیْحَۃٌ**۔ چیخ، کڑک، ہولناک آواز، نعرہ، چنگھاڑ۔ یہ صَاحَ یَصِیْحُ کا مصدر ہے اور بمعنی حاصل مصدر بھی آتا ہے۔ علامہ سلیمان جمل شیخ حسین سے ناقل ہیں:-

"صَیْحَۃٌ بروزن فَعْلَۃٌ یہ صیاح کے ایک بار وقوع میں آنے کو بتاتا ہے اور صیاح "شدت بشدید سخت عذاب) کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے صَاحَ یَصِیْحُ صِیَاحًا یعنی زور سے چیخا"[1]

اصل میں لکڑی کے چرنے یا کپڑے کے پھٹنے سے جو زور کے چڑچڑاہٹ کی آواز پیدا ہوتی ہے اس آواز کے نکلنے کو "انصیاح" کہتے ہیں۔ صیحہ اسی سے ہے اور چونکہ زور کی آواز سے آدمی گھبرا اٹھتا ہے اس لیے بمعنی گھبراہٹ اور عذاب کے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ پ ۱۲/۶،۸ پ ۱۴/۵،۶ پ ۱۸/۳ پ ۲۰/۱۶ پ ۲۳/۱،۲،۳،۱۱ پ ۲۶/۱۷ پ ۲۷/۹ پ ۲۸/۱۲

**صَیْدِ**۔ شکار، شکار کرنا۔ اصل میں تو صَادَ یَصِیْدُ کا مصدر ہے جس کے معنی شکار کرنے کے آتے ہیں اور کبھی شکار کیے ہوئے جانور کے معنی میں بھی آتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں:

"فقیر گوید صید گاہے اطلاق کردہ می شود بمعنی

---

[1] الجمل علی الجلالین ج ۲ ص ۴۲۴ طبع مصر۔

مصدر۔ صاد یصید و گاہے اطلاق کردہ
می شود بمعنی حیوانے کہ صید کردہ شد، ولکل
وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا [1]

امام راغب نے لکھا ہے کہ آیات شریفہ لَا تَقْتُلُوا
الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ (نہ مارو شکار جس وقت
تم ہو احرام میں) اور اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا
(جب احرام سے نکلو تو شکار کر لو) اور غَيْرَ مُحِلِّي
الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ (مگر حلال نہ سمجھو شکار کو
احرام کی حالت میں) میں جیسا کہ فقہاء کا بیان ہے
"صید" کا لفظ ان مواضع میں اسی جانور کے
ساتھ مختص ہے کہ جس کا گوشت کھایا جاتا ہے

چنانچہ روایت خمس یقتلھن المحرم فی الحل
والحرم الحیة والعقرب والفأرة والذئب
الکلب العقور (سانپ، بچھو، چوہا، بھیڑیا، کٹ
کھنا کتا۔ یہ پانچ جانور ہیں کہ جن کو احرام باندھنے
والا حل و حرم سب جگہ قتل کر سکتا) اس
معا پر دلالت کر رہی ہے۔ پ ۶/۵ ۔ ۷/۲

صَيْفٍ ۔ موسم گرما، گرمی کی رت۔ شتاء
کی ضد ہے، یہ اصل میں صَافَ یَصِیفُ کا مصدر
ہے جس کے معنی گرمی کے موسم میں کسی مقام پر
قیام کرنے کے آتے ہیں، اور گرمی کے موسم کے
لیے بطور اسم بھی مستعمل ہے۔ پ ۳۰/۳۱

# باب الضاد المعجمه

## فصل الالف

ضَاحِكًا ۔ ہنستے ہوتے۔ ضحِکٌ سے اسم فاعل
کا صیغہ واحد مذکر ہے۔ واضح رہے کہ "ضحک" کے
اصل معنی تو ہنسنے کے ہیں اور ہنسنے کے مختلف
اسباب ہیں، انسان کبھی مذاق اڑانے کے لیے
ہنستا ہے کبھی محض خوشی ہنسی کا باعث ہوتی ہے
کبھی کسی چیز پر اچنبھا ہوتا ہے تو ہنسی آ جاتی ہے اس
لیے بطور استعارہ ضحک کا استعمال تمسخر اور مسرت
اور تعجب کے لیے بھی ہوتا ہے، چنانچہ قرآن مجید
میں بھی یہ تینوں معانی میں مستعمل ہوا ہے ارشاد ہے
فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِاٰيٰتِنَا اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ
(پھر جب موسیٰ لائے ان کے پاس ہماری نشانیاں

[1] ازالة الخفاء ج ۱ ص ۱۰۰ ۔ طبع صدیقی بریلی۔

تو وہ لگے ان پر ہنسنے یعنی معجزات کا مذاق اڑانے
لگے۔ اور خوشی اور تعجب دونوں کی مثال جیسے یہی
آیت فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّن قَوْلِهَا (سو
سلیمان اس کی بات سے مسکراتے ہوئے ہنس
پڑے یعنی چیونٹی کی گفتگو کے سننے پر تعجب سے
مسکرادیئے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی بات
سننے پر مارے خوشی کے مسکرادیئے۔ [1]
واضح رہے کہ تبسّم "مسکرانا" ضحک "ہنسنا"
قہقہہ "کھکھلا کر ہنس پڑنا" گو یہ تینوں میں کھلنا
ہے مگر تبسم میں آواز بالکل نہیں ہوتی۔ ضحک میں
آواز تو ہوتی ہے مگر بہت خفیف اور قہقہہ میں
اچھی خاصی آواز ہوتی ہے۔ [2] پ $\frac{19}{17}$

ضَاحِكَةٌ۔ خنداں، ہنستے ہوئے۔ ضِحْكٌ
سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث، یہ بھی
مسرت کا بیان ہے۔ پ $\frac{30}{5}$

ضَارِّهِمْ۔ ان کو ضرر پہنچانے والا، ان کا
نقصان رساں۔ ضَارٍّ، ضَرٌّ سے اسم فاعل کا
صیغہ واحد مذکر، مضاف ہے هُمْ ضمیر جمع
مذکر غائب مضاف الیہ (ملاحظہ ہو ضَرًّا) $\frac{18}{2}$

ضَآرِّيْنَ۔ ضرر پہنچانے والے ضَرٌّ سے اسم
فاعل کا صیغہ جمع مذکر، ضَارٌّ کی جمع بحالت
نصب و جر۔ پ $\frac{1}{12}$

ضَاقَ۔ وہ تنگ ہوا ضَيْقٌ سے ماضی کا صیغہ
واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو ضَيِّق) پ $\frac{12}{6}$ $\frac{20}{16}$

ضَاقَتْ۔ وہ تنگ ہوگئی ضَيْقٌ سے ماضی
کا صیغہ واحد مؤنث غائب۔ پ $\frac{10}{10}$ پ $\frac{11}{3}$

ضَالًّا۔ ناواقف حیران، بے خبر۔ ضَلَالٌ
سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (تفصیل کے
لیے ملاحظہ ہو ضَلَال) $\frac{30}{18}$

ضَالُّوْنَ۔ گمراہ، بھٹکے ہوئے، راہ بھولے
ہوئے۔ ضَلَالٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر
ضَالٌّ کی جمع بحالت رفع $\frac{3}{11}$ $\frac{14}{4}$ $\frac{27}{15}$
$\frac{29}{3}$ پ $\frac{30}{8}$

ضَامِرٍ۔ دُبلا جس کی کمر پتلی ہو اور پیٹ پیٹھ
سے لگ گیا ہو ضُمُورٌ سے جس کے معنی دبلا ہونے
کے ہیں اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ہے چونکہ دبلے پن میں
پیٹ پیٹھ سے لگ جاتا ہے اور کمر پتلی ہو جاتی
ہے اس لیے "ضامر" کے مفہوم میں یہ دونوں معنی

---

[1] علامہ جاراللہ زمخشری نے کشاف میں دونوں وجہیں ذکر کی ہیں (ملاحظہ ہو ج ۲ ص ۱۰۲۱ طبع کلکتہ

[2] الجمل علی الجلالین۔ ج ۳ ص ۳۲۲ ۔ طبع مصر۔

Marfat.com

داخل ہیں، یہاں ضامرٌ سے مراد سواری کا جانور اونٹ
گھوڑا وغیرہ ہے کہ جو سواری دینے کے سبب
دبلا ہوگیا ہو۔ $\frac{۱۲}{۱۱}$

ضَأنٍ۔ بھیڑ، دنبہ جس پر اون ہوتی ہے،
ضائن کی جمع ہے جیسے رَکبٌ، راکبٌ کی، ضائنٌ
میش نر یعنی نر دنبہ یا نر بھیڑ کو کہتے ہیں جو "ماعز"
یعنی بکرے کی ضد ہے، مراح میں اسی طرح ہے
اور بعض نے کہا ہے کہ ضَأنٌ ضائنٌ اور ضائنۃٌ
یعنی نر اور مادہ دونوں کی جمع ہے اور بعض نے
اس کو اسم جمع بھی بتایا ہے۔[۱] $\frac{ش}{۴}$

ضَائِقٌ۔ تنگ ہونے والا ضَیقٌ سے اسم
فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو ضَیّقٌ) $\frac{۱۲}{۲}$

## فصل الباء الموحدۃ

ضَبْحًا۔ ہانپنا، یہ ضَبَحَ یَضْبَحُ کا مصدر ہے
"ضبح" گھوڑوں کے دوڑنے کے سبب ہانپنے
کو کہتے ہیں۔ $\frac{۳۰}{۲۵}$

## فصل الحاء المہملۃ

ضَحِکَتْ۔ وہ ہنسی، وہ ہنس پڑی، اسے
ہنسی آگئی، ضِحکٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث
غائب، آیۃ شریفہ وَامْرَأَتُہٗ قَائِمَۃٌ
فَضَحِکَتْ (اور اس کی عورت کھڑی تھی تب
وہ ہنس پڑی) یہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ و
والسلام کی زوجہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کا
ذکر ہے، یہاں "ضحک" سے کیا مراد ہے علماء کے
اس کی تفسیر میں دو قول ہیں۔ اوّل یہ کہ ضحک سے
یہی مشہور معنی ہنسنا مراد ہیں اور یہی اکثر مفسرین
کا قول ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ
یہ ہنسی کس بات پر تھی، بعض نے کہا ہے کہ
قوم لوط کی تباہی کی جو بشارت سنی اسی کی خوشی میں
تھی، اور بعض کا بیان ہے کہ فرشتوں کے آنے
سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں جو دھڑکا
پیدا ہوگیا تھا اس ڈر کے رفع ہونے سے خوش
ہو کر ہنس پڑیں بعض کہتے ہیں کہ حضرت اسحٰق
علیہ السلام کی ولادت کی خبر سننے پر مارے اچنبھے
کے ہنسی آگئی۔ بعض نے ہنسی کی اور وجہیں بھی
ذکر کی ہیں۔
دوسرا قول یہ ہے کہ ضَحِکَتْ بمعنی حَاضَتْ ہے
یعنی ان کو حیض آگیا، چنانچہ ابو جعفر بیہقی نے
تاج المصادر میں ثعلب اور ابن الاعرابی سے

---

[۱] الجمل علی الجلالین ج ۲ ص ۱۰۳۔ طبع مصر

یہی معنے نقل کیے ہیں۔ اور عکرمہ اور مجاہد کا بھی یہی قول ہے لیکن امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ "ان کا ہنسنا تعجب کی بنا پر تھا جس پر ارشاد باری اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ کیا تو تعجب کرتی ہے اللہ کے حکم سے) دلالت کر رہا ہے نیز ارشاد ءَ اَلِدُ وَ اَنَا عَجُوْزٌ وَّھٰذَا بَعْلِیْ شَیْخًا اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ عَجِیْبٌ (کیا میں بچہ جنوں گی اور میں بڑھیا ہوں اور یہ خاوند میرا بوڑھا ہے یہ تو ایک عجیب بات ہے) بھی اسی کو بتلا رہا ہے، اور جس نے یہ بیان کیا ہے کہ ان کو حیض آ گیا تو یہ ضحکت کی تفسیر نہیں ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے خیال کیا ہے، بلکہ اظہار واقعہ کے طور پر ذکر کیا ہے کہ ان کو جو بشارت دی گئی تھی، اللہ تعالےٰ نے بیاس کا نشان ٹھہرایا، اور انہیں اسی دم حیض آ گیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان کا حاملہ ہونا کچھ بعید نہیں ہے اس لیے کہ عورت کو جب تک حیض آتا ہے وہ حاملہ ہو جاتی ہے" مگر یہ واضح رہے کہ راغب نے جو ہنسنے کی وجہ تعجب بیان کی ہے تو اس کے ماننے کی صورت میں آیت میں تقدیم و تاخیر ماننی پڑے گی اور تقدیر آیت یوں ہو گی فَبَشَّرْنٰھَا بِاِسْحٰقَ فَضَحِکَتْ یعنی ہم نے اس کو اسحٰق کی خوشخبری دی تو وہ ہنس پڑی [1]

۱۲ ب

**ضُحٰی**: ۔ وقت چاشت، دن چڑھے، وہ وقت جب کہ دھوپ چڑھ جائے ۔ ضحی کے معنے دھوپ کے پھیلنے اور دن کے چڑھنے کے ہیں نیز اس وقت کو بھی ضحی کہتے ہیں۔ ابن خالویہ لغوی لکھتے ہیں "ضحی اسم مقصور ہے۔ مثل ھُدٰی کے اور ضحی مؤنث ہے اس کی تصغیر ضُحَیَّۃٌ ہے اور بہتر یہ ہے کہ اس کی تصغیر میں ضُحَیٌّ کہیے بغیر ہ کے تاکہ اس کی تصغیر ضَحْوَۃ کی تصغیر کے مشابہ نہ ہو، اور ضحی کے معنی دن چڑھنے کے ہیں" [2] شیخ مجد الدین فیروز آبادی نے قاموس میں تصریح کی ہے کہ ضحی مذکر بھی آتا ہے۔ علامہ ابو الفضل جمال قرشی نے لکھا ہے کہ:۔ "جس نے اس کو مؤنث کیا اس نے اسے

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الجمل علی الجلالین ج ۲ ص ۴۲۶ طبع مصر تفسیر سورۃ ہود،

[2] کتاب اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن العظیم ص ۹۵ طبع دار الکتب المصریہ ۱۳۶۰ھ

ضَدُّوْا کی جمع کہا اور جس نے مذکر کیا اس نے کہا
کہ یہ اسم ہے بروزن فُعَلٌ جیسے کہ صُرَدٌ ہے
اور ظرف غیر متمکن ہے مثل سَحَرَ کے''[1]

ب ۹/۲ ۱۶/۱۲ ۳۰/۱۸

ضُحٰہَا ۔ اس کے دن چڑھے، اس کی
دھوپ کا پھیلنا اور روشن ہونا۔ ضُحٰی مضاف
ھا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ ۳۰/۱۲،۱

# فصل الدال المہملہ

ضِدًّا ۔ مخالف۔ اَضْدَادٌ جمع، یہ مفرد اور جمع
دونوں طرح استعمال ہوتا ہے[2]۔ اور یہاں یہ جمع ہی کے
معنی میں ہے۔ علامہ سمین فرماتے ہیں کہ:۔
''اگرچہ یہ خبر ایک جماعت کے متعلق دی گئی مگر
''ضد'' کو واحد لایا گیا، اس کی دو وجہیں ہو
سکتی ہیں یا تو یہ کہ ضِدٌّ اصل میں مصدر ہے
اور مصادر واحد ہوتے ہیں اور مذکر ہوتے
ہیں اور یا یہ کہ یہ مفرد ہے بمعنی جمع[3]''
اور شیخ سلیمان جمل نے لکھا ہے کہ ضد کے متعلق
ایسا معلوم ہوتا ہے یا تو یہ مصدر سماعی ہے اور یا
اسم مصدر ہے[4]۔ اور امام راغب ضد کے معنی کی
تشریح میں رقمطراز ہیں:۔
''ایک قوم نے کہا ہے کہ ''ضِدَّیْن'' وہ دو چیزیں
ہیں کہ جو ایک ہی جنس کے تحت ہوں اور
ان میں سے ہر ایک دوسرے کے اوصاف خاصہ
میں منافی ہو اور دونوں کے مابین بہت ہی
زیادہ فرق ہو جیسے کہ سیاہی اور سپیدی
اور خیر و شر اور جو دو چیزیں کہ ایک جنس کے
تحت نہیں ہوں گی ''ضدین'' نہیں کہلائیں گی
جیسے کہ شیرینی اور حرکت یہ کہتے ہیں کہ ضد
احد المتقابلات کا نام ہے، کیونکہ متقابلین
وہ دو مختلف بالذات چیزیں ہیں کہ ان میں سے
ہر ایک دوسرے کے مقابل ہو اور ایک وقت
میں دونوں کسی ایک شے میں جمع نہ ہو سکیں
اور ایسی چیزیں چار ہیں (۱) ضدین جیسے سپیدی
اور سیاہی (۲) متناقضین جیسے ضعف (دو
چند) اور نصف (۳) وجود و عدم جیسے بینائی
اور نابینائی (۴) ایجاب میں موجبہ اور
سالبہ جیسے ہر انسان یہاں ہے اور

[1] صراح باب الواو والیا فصل الضاد　[2] منتخب اللغات شاہجہانی باب الضاد مع الدال
[3][4] حواشی سلیمان جمل علی الجلالین ج ۳ ص ۸۲۔

Marfat.com

ہر انسان یہاں نہیں ہے۔

اور بہت سے متکلمین اور اہل لغت ان سب کو متضادات ہی میں سے قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ضدین وہ دو چیزیں ہیں کہ جن کا اجتماع ایک محل پر نہ ہو سکے۔ اور کہا جاتا ہے اَللّٰہُ لَا نِدَّ لَہٗ وَلَا ضِدَّ کیونکہ نِدّ کہتے ہیں جوہر میں اشتراک کو اور "ضد" کا مطلب یہ ہے کہ دو متنافی چیزیں ایک جنس کے تحت ہوں اور جب حق تعالیٰ جوہر ہونے ہی سے منزّہ ہے تو اب نہ اس کا کوئی ضد ہوا نہ ندّ"

١٦/٨

## فصل الراء المہملۃ

**ضُرٌّ**۔ بلا، سختی، بُرائی، تکلیف، ضرر، ایذا، نقصان اسم ہے۔ امام راغب لکھتے ہیں:-

"ضُرٌّ بمعنے بد حالی ہے خواہ اپنے نفس (اندرونی) میں ہو بسبب علم و فضل اور عفت کی کمی ہونے کے خواہ اپنے بدن میں کسی عضو کے نہ ہونے کے باعث یا کسی نقص کی بنا پر خواہ حالت ظاہری میں بوجہ مال و جاہ کی قلت کے آیہ شریفہ فَلَمَّا کَشَفْنَا مَا بِہٖ مِنْ ضُرٍّ اس سے ہم نے دور کر دی جو اس پر تکلیف تھی، تینوں کو محتمل ہے"

٧/٨ ١١/١٠،١٢ ١٣/٤ ١٤/١٣ ١٥/٤،٦ ١٧/١٠ ١٩/٤ ٢١/٧ ٢٣/١٥،١ ٢٤/٢،١ -

**ضَرًّا**۔ ضرر، ضرر پہنچانا، ضَرَّ یَضُرُّ کا مصدر ہے جس کے معنے گزند پہنچانے کے ہیں نَفْع کی ضد ہے ٦/١٢ ٩/١٣ ١١/١٠ ١٣/٨ ١٧/١٣ ١٩/١٦ ٢٢/١١ ٢٦/١٠ ٢٦/١١

**ضَرَّآءُ**۔ تکلیف، سختی، تنگی، مرض، بیماری، مصیبت، اسم ہے سَرَّاء اور نَعْمَاء کی ضد ہے، واضح رہے کہ بَاْسَاءُ اور ضَرَّاءُ دونوں مؤنث ہیں اور ان کا مذکر نہیں آتا ہے فرّاء کا بیان ہے کہ اگر ان دونوں کی جمع میں اَبْؤُسٌ اور اَضُرٌّ استعمال کیا جائے جس طرح سے کہ نعماء کی جمع اَنْعُمٌ استعمال کی جاتی ہے تو جائز ہے[1]

٢/١٠،٢٦ ٤/٥ ٧/١١ ٩/٢ ١١/٨ ١٢/٢ ٢٥/١

**ضِرَارًا**۔ ستانا، ایذا دینا، تکلیف پہنچانا، ضرر پہنچانا، ضَارَّ یُضَارُّ باب مُفَاعَلَۃ کا مصدر ہے جس کے معنی ایک دوسرے کو گزند پہنچانے کے ہیں۔ ٢/١٣ ١١/٢

---

[1] الصراح من الصحاح باب الراء فصل الضاد۔

**ضَرَبَ** ۔ بیان کیا، بتایا، ظاہر کیا۔ ضَرْبٌ سے
ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب "ضرب المثل" کے
معنی مثال بیان کرنے کے ہیں ضَرَبَ اللّٰہُ
مَثَلاً کے معنی ہیں اللہ نے مثال بیان کی۔
قرآن مجید میں لفظ ضَرَبَ جہاں آیا ہے مثال
بیان کرنے ہی کے لیے آیا ہے (ملاحظہ ہو اِضْرِبْ)

۱۳/۱۲ ، ۱۴/۲۱،۱۶ ب ۲۱/۷ ب ۲۳/۱۴،۱۶ ب ۲۵/۸ ب ۲۸/۲۰

**ضُرِبَ** ۔ بیان کیا گیا، بتایا گیا، ظاہر کیا گیا
کھڑا کیا گیا۔ قائم کیا گیا۔ ضَرْبٌ سے ماضی
مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب فَضُرِبَ
بَیْنَھُمْ بِسُوْرٍ لَّہٗ بَابٌ (پھر کھڑا کر دیا جائیگا
ان کے درمیان میں ایک دیوار کو جس میں ہوگا دروازہ)
میں ضرب بمعنی کھڑا کرنے کے ہے۔

۱۴/۱۴ ، ۲۵/۱۲ ، ۲۶/۱۸

**ضَرْبٌ** ۔ مارنا، چلنا ضَرَبَ یَضْرِبُ کا مصدر
ہے اس کے معانی کی تفصیل اِضْرِبْ کے ضمن
میں گزر چکی ہے "ضرب فی الارض" کے معنی
زمین پر چلنے کے ہیں۔ ۲۶/۵ ضَرْبًا ۳/۵ ، ۲۳/۷

**ضُرِبَتْ** ۔ ڈال دی گئی، مار دی گئی، لازم
کر دی گئی، لگا دی گئی۔ ضَرْبٌ سے ماضی کا
صیغہ واحد مؤنث غائب۔ امام راغب فرماتے
ہیں :۔
ضَرَبَ الْخَیْمَۃَ (خیمہ گاڑا) کے معنے ہیں ہتھوڑے
سے اس کی میخوں کو ٹھونکنا۔ اور خیمہ ہی
سے تشبیہ کی بنا پر ارشاد ہے ضُرِبَتْ
عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ یعنی ذلت نے ان کو اس
طرح سے گھیر لیا جس طرح سے کہ خیمہ اس
شخص کو گھیر لیتا ہے جس پر اس کو تانا جاتا ہے
اور اسی طرح وَضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الْمَسْکَنَۃُ
(اور لازم کر دی گئی ان پر حاجت مندی)"

ب ۴/۳

**ضَرَبْتُمْ** ۔ تم نے سفر کیا، تم چلے ضَرْبٌ
سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر۔ یہاں بھی
"ضرب" کا استعمال چلنے ہی کے معنی میں ہے

ب۵/۲ ، ب۱۵/۱۳

**ضَرَبْنَا** ۔ ہم نے بتلایا، ہم نے کہہ سنایا۔
ہم نے بیان کیا، ہم نے تھپک دیا ضَرْبٌ سے
ماضی کا صیغہ جمع متکلم۔ آیہ شریفہ فَضَرَبْنَا عَلٰی
اٰذَانِھِمْ (پھر تھپک دیئے ہم نے ان کے کان) بھی
ضرب الخیمۃ ہی سے مستعار ہے کہ جس طرح "ضرب الخیمۃ"
کا مطلب اس کی میخوں کا گاڑنا ہے اسی طرح
"ضرب علی الآذان" کے معنے کانوں کو تھپک

Marfat.com

دینے اور ان کو گویا ٹھونک دینے کے ہیں تاکہ کوئی چیز سنائی نہ دے سکے، یا یہ معنی ہیں کہ ہم نے ان کے کانوں پر نیند کا پردہ ڈال دیا۔ گویا جس طرح سے کہ ضرب الخیمہ کے معنی خیمہ تاننے کے آتے ہیں اسی طرح "ضرب علی الآذان" کے معنی نیند کا پردہ ڈالنے کے ہیں۔ اس صورت میں ضرَبنا کا مفعول "الحجاب المانع من السماع" محذوف ماننا پڑیگا۔ اور علیٰ اٰذانِہم ان پر نیند ڈالنے کا استعارہ ہوگا۔ ب ۱۳/۱۹ ب ۱۵/۱۲ ب ۱۹/۲ ب ۲۱/۹ ۲۳/۱۷

ضَرَبُوْا ۔ وہ چلے۔ اُنہوں نے بیان کیا ضرَبَ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب۔
ب ۴/۸ ب ۱۵/۵ ب ۱۸/۱۶ ۲۵/۱۲

ضَرَبُوْہُ ۔ انہوں نے اس کو بیان کیا اس میں ہُ ضمیر واحد مذکر غائب ہے ۲۵/۱۲

ضَرَرِ ۔ ضرر۔ اسم ہے۔ ب ۵/۱۰

ضُرُّہٗ ۔ اس کی تکلیف۔ ضُرٌّ مضاف، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ ہے ۱۱/۱

ضَرُّہٗ ۔ اس کا ضرر۔ اس کا ضرر پہنچانا۔ ضَرٌّ مصدر مضاف، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ سورۃ حج میں جو ارشاد ہے یَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَضُرُّہٗ وَمَا لَا یَنْفَعُہٗ ذٰلِکَ ہُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِیْدُ ۔ یَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّہٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِہٖ لَبِئْسَ الْمَوْلٰی وَلَبِئْسَ الْعَشِیْرُ وہ پکارتا ہے اللہ کے سوائے ایسی چیز کو کہ نہ اُس کا نقصان کر سکے اور نہ اس کا فائدہ کرے یہی ہے دور جا پڑنا گمراہ ہو کر پکارنے جاتا ہے اس کو جس کا ضرر پہلے پہنچے اس نفع سے بیشک بُرا دوست ہے اور بُرا رفیق ہے یہاں ایک طرف تو یہ ارشاد ہے کہ وہ چیز نہ اس کا نقصان کرے نہ نفع، اور ساتھ ہی یہ فرمایا جاتا ہے کہ اس کا ضرر نفع سے پہلے ہے، تو واضح رہے کہ پہلی آیت میں وہ ضرر اور نفع مراد ہے جو قصد اور ارادہ سے ہو اور اس امر پر تنبیہ ہے کہ بت چونکہ جماد ہے اس لیے وہ اس بارے میں نہ ضرر کا قصد کرتا ہے نہ نفع کا اور دوسری آیت میں وہ ضرر مراد ہے جو بت سے مدد مانگنے اور اس کی پوجا کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے وہ ضرر نہیں کہ جو بت کے اپنے ارادہ سے صادر ہو۔ ب ۱۷/۹

ضَرِیْعِ ۔ خاردار جھاڑ۔ کانٹے۔ صحیح بخاری میں ہے:۔
"بیان کیا جاتا ہے کہ "ضریع" ایک گھاس ہے

جس کو شبرق کہا جاتا ہے، یہی گھاس جب سوکھ جاتی ہے تو اہل حجاز اس کو ضریع سے موسوم کرتے ہیں اور یہ زہر ہے"[۱]

حافظ الحدیث علامہ بدرالدین عینی نے لکھا ہے کہ اس کے بیان کرنے والے فراہیں اور خلیل نے کہا ہے کہ یہ ایک بدبودار سبز گھاس ہے جس کو سمندر کنارہ پر ڈال دیتا ہے[۲]. مجاہد کا قول ہے کہ یہ ایک خاردار گھاس ہے جو زمین سے چپاں رہتی ہے، قریش اس کو شبرق کہتے ہیں اور جب خشک ہو جاتی ہے تو اس کو ضریع نام دیتے ہیں اور سب سے زیادہ خبیث اور سب سے زیادہ بُری خوراک ہے. کلبی کا بیان ہے کہ جب یہ گھاس خشک ہو جاتی ہے تو جانور بھی اس کے پاس نہیں پھٹکتا- ابن زید کہتے ہیں کہ دنیا میں تو ضریع خشک کانٹے ہیں کہ جن پہ پتے نہیں اور آخرت میں آگ کے کانٹے ہوں گے اور حدیث میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً آیا ہے کہ ضریع دوزخ میں کانٹوں کی طرح ایک درخت ہے جو ایلوے سے زیادہ تلخ مُردار سے زیادہ بدبودار ہے اور آگ سے زیادہ حرارت والا ہے[۳] شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں یہاں کے حیوانات و نباتات کی طبائع پر جوہر خاک و آب غالب ہے اس طرح سے دوزخ میں جوہر ناری وہاں کے حیوانات و نباتات کی طبیعتوں پر غالب ہے. وہاں کے جانور اور درخت بس ظاہری صورت میں تو دنیا کے جانوروں اور درختوں سے مشابہت رکھتے ہیں لہٰذا اسی نام سے وہ بھی پکارے جاتے ہیں ورنہ درحقیقت ان کا مادہ جوہر آتش ہے اور وہاں کی ہر چیز میں سوزش و ناریت موجود ہے.[۴]

واضح رہے کہ سورہ غاشیہ میں تو دوزخیوں کا کھانا صرف ضریع ہی کو بتلایا ہے ارشاد ہے

لَیْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِیْعٍ

لا یکو بجز ایک خاردار جھاڑ کے اور کوئی کھانا نصیب نہ ہوگا حالانکہ دوسری سورتوں میں دوزخیوں

[۱] صحیح بخاری کتاب التفسیر سورہ هل اتاک [۲] عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری للعینی ج ۹ ص ۲۶۵ طبع مصر۔ [۳] الفتوحات الالٰہیہ بتوضیح تفسیر الجلالین للدقائق الخفیہ معروف بہ حاشیہ جمل علی الجلالین لنصوص الخطیب ج ۴ ص ۵۰۴ طبع مصر۔ [۴] تفسیر فتح العزیز سورہ غاشیہ۔

Marfat.com

کے ریسے دوسرے کھانوں کا بھی ذکر ہے چنانچہ سورۂ
دخان میں ہے اِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّوْمِ طَعَامُ الْاَثِیْمِ
(بیشک درخت زقوم کا کھانا ہے گنہگار کا) اور سورۂ
واقعہ میں ہے۔ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ
(یقیناً کھاؤ گے سینڈھ کے درخت سے) اور
سورۂ حاقہ میں فرمایا وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِیْنٍ
لَّا یَاْكُلُهٗۤ اِلَّا الْخَاطِــٴُـوْنَ (اور کچھ نہیں کھانا
مگر وہی دھوون کوئی نہ کھاوے اس کو مگر وہی گنہگار)
تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عذاب رنگا رنگ کا ہوگا
اور معذبین کے مختلف طبقے ہوں گے، بعض زقوم
کے کھانے والے ہوں گے، بعض غسلین کے اور
بعض ضریع کے ہر طبقہ میں ایک خاص قسم ہوگی۔[۱]
اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آیت میں مِنْ
ضَرِیْعٍ سے "ضریع" کی خصوصیت مراد نہیں
بلکہ جو کچھ "ضریع" کی جنس سے ہے بے لذتی اور
تلخی اور بدبو اور موٹا نہ کرنا اور بھوک دفع نہ کرنا وہ
سب ضریع میں داخل ہے۔ یہاں تک کہ بعض
مفسرین نے ضریع کو فَعِیْلٌ بمعنی مُفْعِلٌ جیسے عَلِیْمٌ
اور بَدِیْعٌ میں قرار دیا ہے اور معنی یہ بیان کیے ہیں
کہ جو طعام کہ سبب ضراعت اور خراشی اور طبیعت
کی بدمزگی کا ہو وہ "ضریع" ہے، اس صورت میں
بھی یہ اشکال دفع ہو جاتا ہے۔[۲] $\frac{30}{12}$

## فصل العین المہملۃ

**ضِعْفًا**: ضعیف، ناتواں، ضَعِیْفٌ کی جمع
ہے۔ $\frac{14}{12}$

**ضِعْفٌ**۔ دگنا، دونا، دوچند امام راغب
اصفہانی تحریر فرماتے ہیں۔
ضِعْفٌ۔ الفاظ متضایفہ میں سے ہے کہ ان
میں سے ایک کا وجود دوسرے کے وجود کا
مقتضی ہے جیسے کہ نِصْفٌ اور زَوْجٌ ہیں
"ضِعْف" کے معنی دو مساوی قدروں
کی ترکیب کے ہیں اور یہ عدد کے ساتھ مخصوص
ہے چنانچہ جب کہا جائیگا اَضْعَفْتُ الشَّیْءَ
وَضَعَّفْتُهٗ، ضَاعَفْتُهٗ تو معنی ہوں گے میں
نے اس کے ساتھ اسی کی مثل اور اس سے
بھی زیادہ شامل کر دیا۔[۳] بعض نے کہا ہے کہ
ضَاعَفْتُ بہ نسبت ضَعَّفْتُ کے زیادہ

---

[۱] ملاحظہ ہو عمدۃ القاری ج ۹ ص ۲۶۵ اور حاشیہ جمل علی الجلالین ج ۴ ص ۵۲۱
[۲] تفسیر فتح العزیز سورۂ غاشیہ
[۳] مصباح میں خلیل سے بھی یہی معنی منقول ہیں

بلیغ ہے، اور اسی لیے اکثر قراء نے پڑھا ہے۔ يُضَاعَفُ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ۔ اور وَإِن تَكُ حَسَنَةً يُضَاعِفْهَا اور فرمایا مَن جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا (اور جو کوئی لاتا ہے ایک نیکی تو اس کے لیے اس کا دس گنا ہے) اس فرمان کے مطابق "مضاعفت" اس کی متقضی ہے کہ دس گنی ہو اور کہا گیا ہے ضَعَّفْتُهُ بِالتَّخْفِيفِ ضِعْفًا فَهُوَ مَضْعُوفٌ ضَعْفٌ مصدر ہے اور ضِعْفٌ اسم جیسے کہ شَيْءٌ اور شِيْءٌ پس کسی شے کا "ضعف" وہ ہے جو اس کو ڈبل کر دے اور جب اس کی اضافت کسی عدد کی طرف کی جائے گی تو وہ عدد اور اس تناسب اور یعنی اس عدد کا دوگنا مراد ہو گا، جیسے اگر ضعف العشرة اور ضعف المائة کہا جائے تو بلا خوف عشرون (بیس) اور مائتین (دو سو) مراد ہوں گے اور اسی محاورہ پر شاعر کا شعر ہے جَزَيْتُكَ ضِعْفَ الْوُدِّ لَمَّا اشْتَكَيْتَهُ وَمَا إِنْ جَزَاكَ الضِّعْفَ مِنْ أَحَدٍ قَبْلِي (جب تو نے اس کا گلہ کیا تو میں نے دوگنی محبت تجھے جزا میں دی اور مجھ سے پہلے کسی نے تجھے دوگنی جزا نہیں دی)

اور جب بولا جائے گا أَعْطِهِ ضِعْفَيْ وَاحِدٍ تو اس (ضِعْفَيْ) کا یہ مطلب ہو گا کہ ایک اور اس کا دوچند یعنی سہ چند کیوں کہ اس کے معنی ہوئے ایک اور ایسے دو کہ جو اس کے برابر ہوں تو تین ہی ہوئے، اور یہ معنی جب ہیں جبکہ ضعف مضاف ہو اور اگر مضاف نہ ہو اور ضِعْفَيْنِ کہو تو یہ زوجین کے قائم مقام ہو گا اس امر میں کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا جفت ہے تو یہ دو کا مقتضی ہوا کیوں کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو دوچند کر دیتا ہے تو دو ہونے سے خارج نہ ہوئے بخلاف اس صورت کے جب کہ ضعفین کی اضافت واحد کی طرف ہو کہ یہ ان کو تین کر دے گی جیسے کہ ضعفی الواحد اور ارشاد باری ہے فَآتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ سو تو ان کو دوچند عذاب آگ کا) کیوں کہ انہوں نے جناب باری عز اسمہ سے سوال کیا تھا کہ ان کو ایک عذاب ان کی گمراہی کا ہو اور ایک ان کے گمراہ کرنے کا جیسا کہ

حق تعالیٰ نے آیہ کریمہ لِيَحْمِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُمْ (تاکہ اُٹھائیں بوجھ اپنے پورے دن قیامت کے اور کچھ بوجھ ان کے جن کو بہکاتے ہیں) میں اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور آیۃ وَلِكُلٍّ ضِعْفٌ وَلَكِنْ لَا تَعْلَمُونَ (ہر ایک کو دوگنا ہے لیکن تم نہیں جانتے) کے معنی یہ ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کو جتنا تمہیں عذاب ہے اس سے دوگنا ہے اور یہ معنی بھی بیان کیے گئے ہیں کہ ان میں سے اور تم میں سے ہر ایک کو اس سے دوگنا عذاب ہے جتنا کہ دوسرے کو نظر آتا ہے کیوں کہ عذاب کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے اور ہر ایک دوسرے کے ظاہر کا تو ادراک کرتا ہے باطن کا نہیں کرتا اس لیے وہ دل میں یہ سمجھتا ہے کہ اس کو باطن میں عذاب نہیں ہے۔

ازہری نے جو لغت و عربیت کے امام ہیں تصریح کی ہے کہ ضعف کے معنی کلام عرب میں مثل کے ہیں اور اصل تو یہی ہے، پھر ضعف کا استعمال مثل میں بھی کیا گیا اور اس سے زیادہ کیلئے بھی اور زیادتی کی کوئی حد نہیں ہے، کہا جاتا ہے هٰذَا ضِعْفُ هٰذَا یعنی یہ اس کے مثل ہے اور هٰذَانِ ضِعْفَا هٰذَا یعنی یہ اس کے دوچند ہیں اور سہ چند ہیں کیوں کہ تضعیف غیر محدود زیادتی ہے[1]

ضِعْفًا ۱۱ ضِعْفٌ ۸ ۱۵ ۸ ۱۱ $\frac{۲۳}{۱۳}$

**ضُعْفٌ** ۔ ناتوانی، کمزوری، ضعف، سست ہونا۔ ضَعُفَ يَضْعُفُ کا مصدر ہے، قاموس میں ہے کہ اس کا فعل باب کَرُمَ اور نَصَرَ دونوں سے آتا ہے اور تاج المصادر اور صراح میں صرف باب کَرُمَ مذکور ہے اور قرآن مجید میں بھی اس کا استعمال کَرُمَ ہی سے ہوا ہے، راغب کہتے ہیں ضعف خلافِ قوت ہے ضَعُفَ فَهُوَ ضَعِيفٌ آتا ہے (باب کَرُمَ سے) ارشاد ہے ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ (بودا ہے چاہنے والا اور جس کو چاہتا ہے) "ضعف" نفس میں بھی ہوتا ہے بدن میں بھی اور حال میں بھی، اور کہا گیا ہے کہ ضَعْفٌ اور ضُعْفٌ دونوں لغتیں ہیں۔ ارشاد ہے وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا (اور جانا کہ تم میں سستی ہے) الخلیل رحمہ اللہ نے کہا کہ ضُعْفٌ بالضم بدن میں ہوتا ہے

[1] حاشیہ جمل علی الجلالین ج ۳ ص ۴۵۴

اور ضُعف عقل اور رائے میں، اور اسی معنی میں
حق تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ
الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا (پھر اگر وہ
شخص کہ جس پر قرض ہے بے عقل ہے یا ضعیف
(یعنی کم سمجھ ہے)، ضَعِيْفٌ کی جمع ضِعَافٌ
اور ضُعَفَاء ہے)، آیہ شریفہ اَللّٰهُ الَّذِىْ
خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ
ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ
ضُعْفًا (اللہ ہے جس نے بنایا تم کو کمزوری سے
پھر دیا کمزوری کے پیچھے زور پھر دیگا زور
کے پیچھے کمزوری) یہاں دوسرا "ضعف" پہلے
"ضعف" سے جُدا ہے اور اسی طرح تیسرا
"ضعف" دونوں کے علاوہ ہے کیونکہ خَلَقَكُمْ
مِّنْ ضُعْفٍ میں "ضعف" سے مراد نطفہ یا
مٹی ہے اور دوسرا "ضعف" وہ ہے جو
جنین (وہ بچہ جو ماں کے پیٹ میں ہو) اور طفل
(بچہ) میں پایا جاتا ہے، اور تیسرا "ضعف" وہ ہے
کہ جو بڑھاپے کے بعد ہو جس کی طرف اَرْذَلِ
الْعُمُرِ (نکمی عمر) سے اشارہ کیا گیا ہے اور
اور دو قوتوں میں سے پہلی قوت تو وہ ہے جو بچہ کو
حرکت کرنے، ہدایت پانے دودھ مانگنے اور
رو کر اپنے پر سے اذیت دفع کرنے کے لیے
دی جاتی ہے اور دوسری قوت وہ ہے جو
بلوغ کے بعد عطا ہوتی ہے۔

اور اس امر پر کہ یہ آیہ شریفہ میں ہر "ضعف"
ایک ایسی حالت کی طرف اشارہ ہے کہ جو پہلی
حالت کے سوا ہے یہ چیز بھی دلالت کرتی
ہے کہ اس کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے اور قاعدہ ہے
کہ منکر کو جب دوبارہ ذکر کیا جائے اور اس سے
اگلی ہی چیز مراد ہو تو اسے معرفہ کر لیا جاتا ہے
جیسے تم بولتے ہو رایت رجلاً فقال لی
الرجل میں نے ایک شخص کو دیکھا تو اس
شخص نے مجھ سے یوں کہا[1] اور جب دوبارہ
بھی نکرہ ہی ذکر کیا جائے تو اس سے اوّل کے
علاوہ کوئی اور مراد ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت
ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آیہ کریمہ فَاِنَّ
مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (سو البتہ
مشکل کے ساتھ آسانی ہے البتہ مشکل کے
ساتھ آسانی ہے) میں فرمایا ہے کہ لَنْ يَّغْلِبَ عُسْرٌ
يُّسْرَيْنِ (ہرگز ایک مشکل
دو آسانیوں پر غالب نہیں آسکتی)۔

[1] یہاں پہلے رَجُلاً نکرہ لایا گیا اور دوبارہ چونکہ وہی مراد تھا اس لیے الرجل معرفہ کہا گیا۔

Marfat.com

**ضِعْفًا** ۲۱/۹ ۲۱/۹

**ضَعُفَ**۔ کمزور ہوا۔ ناتواں ہوا۔ بوڑھا ہوا
ضُعْفٌ اور ضَعْفٌ سے ماضی کا صیغہ واحد
مذکر غائب۔ پ ۱۱/۱۱

**ضَعْفًا**۔ سستی۔ کمزوری۔ سست ہونا۔
ضَعُفَ یَضْعُفُ کا مصدر ہے پ ۱۰/۵

**ضُعَفَاءُ**۔ ضعیف، کمزور، ناتواں ضَعِیْفٌ
کی جمع ہے یہ لفظ سورۂ مومن اور سورۂ ابراہیم
میں واؤ کے ساتھ موسوم ہے۔ پ ۳/۴ پ ۱۰/۱۸

**ضُعَفٰٓؤُا** پ ۱۳/۱۵ پ ۲۴/۱۰

**ضَعُفُوْا**۔ وہ سست ہوئے اور وہ کمزور ہوئے
ضُعْفٌ اور ضَعْفٌ سے ماضی کا صیغہ جمع
مذکر غائب پ ۴/۶

**ضِعْفَیْنِ**۔ دوگنا، دونا۔ دوبرابر دوچند
ضِعْفٌ کا تثنیہ بحالت نصب وجر پ ۳/۴

پ ۲۱/۲۰ پ ۲۲/۵

**ضَعِیْفًا**۔ ضعیف سست۔ کمزور
ضُعْفٌ اور ضَعْفٌ سے بروزن فَعِیْلٌ
صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ راغب
لکھتے ہیں۔
ارشاد ہے وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا اور پیدا
کیا گیا انسان ناتواں، یہ انسان کا ضعف اس
کی حاجتوں کی کثرت ہے کہ جس سے ملأ اعلیٰ
مستغنی ہے اور فرمایا اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ
کَانَ ضَعِیْفًا (بے شک فریب شیطان کا
سست ہے، یہ شیطان کے فریب کا سست
ہونا ان لوگوں کے ساتھ ہے جو اللہ کے ان
بندوں میں سے ہو گئے ہیں جن کا آیہ کریمہ اِنَّ
عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ
(جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا زور نہیں)
میں تذکرہ ہے۔
اور قاموس میں ہے کہ خُلِقَ الْاِنْسَانُ
ضَعِیْفًا کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی خواہش
اس کو ہر طرف مائل کرتی رہتی ہے۔ اور ضعیف
بمعنی نابینا کے حمیری لفظ ہے اور بیان کیا
گیا ہے کہ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْنَا ضَعِیْفًا
بھی اسی سے ہے یعنی نابینا" پ ۳/۶ پ ۵/۱۲،۷ پ ۱۲/۸

## فصل الغین المعجمہ

**ضِغْثًا**۔ تنکوں کا مٹھا، جھاڑو۔ راغب
نے لکھا ہے کہ ضغث کھیتی کے تنوں یا گھاس
کے یا ٹہنیوں کے مٹھے کو کہتے ہیں۔ اس

Marfat.com

جمع اَضغَاثٌ ہے اور حاشیہ جمل میں شیخ مسین سے منقول ہے کہ ضغث گھاس یا ٹہنیوں کی چھوٹی گٹھری کو کہتے ہیں، اور یہ کہا گیا ہے کہ ٹہنیوں کا بڑا گٹھر ہے [1]۔ یہاں درخت کی پتلی پتلی ٹہنیوں کا جو کہ قمچیوں کے طور پر استعمال ہوتی ہیں گٹھا مراد ہے شیخ سلام اللہ دہلوی لکھتے ہیں کہ :-

"ابن ابی حاتم نے بطریق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سعید بن المسیب روایت کی ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے قسم کھائی تھی کہ اپنی بیوی کو سو تازیانے لگائیں گے پھر جب حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ کی تکلیف کو دور کر دیا تو ساتھ ہی یہ حکم بھی فرمایا کہ ضغث (یعنی پتلی پتلی ٹہنیوں کی قمچی کا مٹھا) لے کر اس سے اپنی اہلیہ کو مار دیں چنانچہ آپ نے سو ٹہنیاں لے کر ان سے انہیں ایک ہی دفعہ مار دیا۔ پھر عطا سے یہ روایت کی ہے کہ یہ حکم سب لوگوں کے لیے عام ہے۔ اور مجاہد سے یوں نقل کیا ہے کہ یہ حضرت ایوب علیہ السلام ہی کیلئے خاص تھا چنانچہ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی عطا کے قول کی طرف گئے ہیں کہ جو ایسا کرے گا وہ اپنی قسم سے بری ہو جائے گا اور امام مالک جیسا کہ مجاہد نے کہا ہے اس حکم کو حضرت ایوب علیہ السلام کے لیے خاص سمجھتے ہیں [2]"

## فصل الفاء

**ضَفَادِعَ** ۔ مینڈک ضَفْدَعٌ کی جمع جس کے معنی مینڈک کے ہیں۔ پ ۹ / ۶

## فصل اللام

**ضَلَّ** ۔ گمراہ ہوا، بہکا، بھٹکا، راہ سے دور جا پڑا، کھو گیا، ضائع ہو گیا، گم ہو گیا، ہلاک ہو گیا ضَلَالٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب

پ ۱ / ۱۳، پ ۵ / ۱۰،۱۵، پ ۶ / ۷، پ ۷ / ۴،۹،۱۰، پ ۸ / ۱۳، پ ۱۱ / ۸،۱۶، پ ۱۲ / ۲، پ ۱۴ / ۱۸،۲۲
پ ۱۵ / ۲،۷، پ ۱۶ / ۳، پ ۲۰ / ۳،۱۰، پ ۲۲ / ۲، پ ۲۳ / ۶، پ ۲۴ / ۱، پ ۲۵ / ۱
پ ۲۷ / ۵،۶، پ ۲۸ / ۲، پ ۲۹ / ۳

**ضَلَالٌ** ۔ گمراہی، بھٹکنا، راہ سے دور جا پڑنا، کھو جانا، ضائع ہو جانا، گم ہو جانا، ہلاک ہو جانا۔ علامہ جمال قرشی لکھتے ہیں۔
"ضلال بالفتح ضائع ہونا، گم ہونا اور مغلوب ہونا

[1] حاشیہ جمل بر جلالین ج ۳ ص ۶۰۱ [2] الکمالین علی الجلالین ص ۳۸۱ طبع مجتبائی دہلی۔

Marfat.com

کہا جاتا ہے، ضل الماء فی اللبن یعنی
پانی اتنا مغلوب ہوا کہ دودھ میں اس کا اثر ظاہر
نہیں ہوتا اور اسی سے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے
یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی زبانی
کہ اِنَّ اَبَانَا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ کہ ہمارے
باپ تو ان دونوں کی محبت میں مغلوب ہیں
یعنی حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے
بھائیوں کی محبت میں۔ اور حضرت موسیٰ
علیہ السلام کی زبانی مذکور ہے فَعَلْتُهَآ اِذًا
وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ۔ یعنی میں نے یہ کام
اس وقت کیا تھا جب کہ میں عصبیت دین میں
مغلوب تھا، نیز ہلاک ہونے کے بھی معنی ہیں
اور ضلال بالفتح اور ضلالۃ بمعنی گمراہی رشاد
کی ضد ہے اس کی ماضی کے عین کلمہ کو فتحہ
اور مضارع کے عین کلمہ کو کسرہ ہے یعنی باب
ضَرَبَ یَضْرِبُ سے مستعمل ہے حق تعالیٰ کا ارشاد
ہے قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ
عَلٰی نَفْسِیْ اور یہی اہل نجد کی زبان ہے اور
یہی فصیح ہے۔ اور اہل عالیہ[عہ] ضَلِلْتُ اَضَلُّ
ماضی میں عین کلمہ کو کسرہ اور مضارع
میں عین کلمہ کو فتحہ بولتے ہیں (یعنی باب سَمِعَ
یَسْمَعُ سے استعمال کرتے ہیں)[1]
اور امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں:۔
"ضلال کے معنی سیدھے راستہ سے ہٹ
جانے کے ہیں۔ ھدایۃ اور یہ باہم ضد ہیں،
حق تعالیٰ کا ارشاد ہے فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا
یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا
یَضِلُّ عَلَیْهَا (اب جو کوئی راہ پر آوے تو وہ
راہ پاتا ہے اپنے بھلے کو اور جو کوئی بہکا پھرے
تو وہ بہکا پھرے اپنے برے کو) اور راہ سے
ہٹنا کسی طرح بھی ہو قصداً ہو یا سہواً کم ہو یا
زیادہ ہر حال میں "ضلال" ہی کہلائیگا کیونکہ
"طریق مستقیم" جو پسندیدہ ہے بہت دشوار ہے
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے
استقیموا ولن تحصوا سیدھے چلے چلو
اور تم ہرگز پورے طور پر نگہداشت نہیں کر سکو گے
کسی حکیم نے کہا ہے کہ ہمارا صواب پر ہونا ایک
ہی وجہ سے ہے اور گمراہ ہونا بہت سی وجوہ
سے کیونکہ استقامت اور صواب نشانہ بازی
کے نشانہ کے قائم مقام ہے اور اس کے علاوہ

عہ حجاز اور اس کے مضافات کا علاقہ "عالیہ" کہلاتا ہے۔ [1] الصراح من الصحاح باب اللام فصل الضاد

Marfat.com

سب طرف ضلال ہے ضلال ہے، اور اسی بنا پر کہ جو ہم نے بیان کیا بعض صالحین سے مروی ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم سے روایت بیان کی جاتی ہے کہ آپ نے یوں ارشاد فرمایا ہے شَيَّبَتْنِي هُودٌ وَّ أَخَوَاتُهَا (مجھے ہود اور اس کے ساتھ کی سورتوں نے بوڑھا بنا دیا) آخر ان کی کس چیز نے آپ کو بوڑھا بنایا، فرمایا ارشاد الٰہی فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ (تو سیدھا چلا چل جیسا تجھ کو حکم ہوا ہے) نے۔

اور جب ضلال طریق مستقیم کا ترک کرنا ہوا عمداً ہو یا سہواً قلیل ہو یا کثیر تو جس سے بھی کسی قسم کی کوئی خطا سرزد ہو اس کیلئے ضلال کا استعمال صحیح ہے یہی وجہ ہے کہ انبیاء اور کفار دونوں کی طرف ضلال کی نسبت کی گئی ہے گو دونوں ضلالوں میں بون بعید ہے دیکھئے نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد ہے وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ (اور پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ سمجھائی) یعنی جو نبوت کہ تمہاری طرف بھیجی گئی اس کی طرف تم راہ یاب نہ تھے، اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی بابت ہے إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ (تو تو اپنی اسی قدیم غلطی میں ہے) اور ان کی اولاد نے کہا تھا إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (البتہ ہمارا باپ صریح خطا پر ہے) یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف آپ کے دل سے فریفتہ ہونے اور ان کی جانب آپ کے شوق کی طرف اشارہ ہے اور اسی طرح آیہ کریمہ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا إِنَّا لَنَرَاهَا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (فریفتہ ہو گیا اس کا دل اس کی محبت میں ہم تو دیکھتے ہیں اس کو صریح خطا پر ہے) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی فرمایا ہے وَأَنَا مِنَ الضَّالِّينَ (اور میں تھا چوکنے والا) اس پر متنبہ کرنا ہے کہ یہ فعل ان سے سہواً ہوا، اور آیہ أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا (میں ضلال بمعنی فراموش کرنے کے ہے (یعنی اگر ایک ان دونوں میں سے بھول جائے) اور یہ وہ نسیان ہے کہ جس پر انسان کی گرفت نہیں ہے۔

نیز ایک اور طور سے ضلال کی دو قسمیں ہیں (۱) علوم نظریہ میں ضلال جیسے اللہ تعالیٰ

شانہ کی معرفت، اس کی وحدانیت نیز نبوت کی معرفت وغیرہ میں ضلال کہ جن کی طرف آیہ کریمہ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا (اور جو کوئی یقین نہ رکھے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور کتابوں پر اور رسولوں پر اور قیامت کے دن پر وہ بہک کر دور جا پڑا) میں اشارہ کیا گیا ہے (۲) علوم عملیہ جیسے کہ معرفت احکام شرعیہ یعنی عبادات کے بارے میں ضلال۔

اور "ضلال البعید" کفر کی طرف اشارہ ہے، چنانچہ آیۂ سابقہ میں وَمَنْ یَّکْفُرْ فرمایا ہے اور ارشاد ہے اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًا بَعِیْدًا (جو لوگ کافر ہوئے اور انہوں نے روکا اللہ کی راہ سے وہ بہک کر دور جا پڑے) اور فرمایا بَلِ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ فِی الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِیْدِ بلکہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے عذاب اور دور دراز گمراہی میں ہیں یعنی "ضلال بعید" کی عقوبت میں گرفتار ہیں اور اسی طرح سے آیہ

کریمہ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ کَبِیْرٍ تم تو بڑے ہوئے ہو شبہ سے بہکاوے میں، اور قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا کَثِیْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ (جو گمراہ ہو چکے پہلے اور گمراہ کر گئے بہتوں کو اور بہک گئے سیدھی راہ سے) ہیں اور ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ (کیا جب ہم رل گئے زمین میں) یہ موت اور بدن کے استحالہ کا کنایہ ہے، اور وَلَا الضَّآلِّیْنَ کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ "ضآلین" سے نصاریٰ مراد ہیں، اور یہ جو فرمایا ہے عِلْمُہَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ کِتٰبٍ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی (ان کی خبر میرے رب کے پاس لکھی ہوئی ہے نہ بہکتا ہے میرا رب اور نہ بھولتا ہے) یہاں لَا یَضِلُّ کے یا تو یہ معنی ہیں کہ میرے رب سے کوئی چیز رہتی نہیں یعنی ہر ایک چیز اس کو معلوم ہے اور یا یہ مطلب ہے کہ میرا رب کسی چیز سے غافل نہیں

ب ۷/۸، ۱۵ — ث /۱۵ — ب ۱۱/۹ — ب ۱۲/۱۴، ۱۳ — ب ۱۳/۱۵، ۱۳، ۸ — ۱۶/۵ — ب ۱۷/۵، ۹ — ۱۹/۹ — ب ...

۲۱/۱۰ — ب ۲۲/۹، ۷ — ۲۳/۱۷، ۲، ۱ — ۲۴/۱۰، ۸ — ۲۵/۱، ۳ — ۲۶/۱۶، ۴ — ب ۲۷/۹ ...

ب ۲۸/۱۱ — ۲۹/۲، ۱

ضَلَالًا ب ۵/۱۶، ۱۵، ۶ — ب ۶/۳ — ۲۲/۲ — ۲۹/۱۰

ضَلَالَۃً۔ گمراہی، بہکنا، گمراہ ہونا، یہ سج...

ضَلَالٌ کی طرح ضَلَّ یَضِلُّ کا مصدر ہے

پ ۱/۲ پ ۲/۵ پ ۵/۴ پ ۸/۱۰،۱۵ پ ۱۴/۱۱ پ ۱۶/۸

**ضَلَالِهِمْ**۔ ان کی گمراہی۔ ضَلَالَةٌ مضاف هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ پ ۲۰/۲ پ ۲۱/۸

**ضَلَالِكَ**۔ تیری حیرانی، تیری غلطی، تیری خطا ضَلَالِ مضاف، كَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ پ ۱۳/۵

**ضَلَلْتُ**۔ میں بھٹکا، میں گمراہ ہوا۔ ضَلَالٌ اور ضَلَالَةٌ سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم پ ۲۲/۱۲

**ضَلَلْنَا**۔ ہم رل گئے، ہم گم ہوگئے، ہم ضائع ہوگئے۔ ضَلَالٌ اور ضَلَالَةٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم پ ۲۱/۱۴

**ضَلُّوْا**۔ وہ بھٹکے، وہ گمراہ ہوئے، وہ گم ہوئے وہ کھو گئے ضَلَالٌ اور ضَلَالَةٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب پ ۶/۴،۱۴ پ ۸/۴،۱۱ پ ۹/۸ پ ۱۵/۵ پ ۱۶/۱۴ پ ۱۸/۱۰،۱۶ پ ۲۴/۱۳ پ ۲۶/۴

## فصل النون

**ضَنْكًا**۔ تنگ، تنگ ہونا ضَنُكَ يَضْنُكُ کا مصدر ہے جو باب کَرُمَ سے آتا ہے علامہ شیخ زادہ نے حاشی تفسیر بیضاوی میں ضَنَكَ کو باب نَصَرَ يَنْصُرُ سے بیان کیا ہے[1] جو صحیح نہیں کیونکہ قاموس اور تاج المصادر وغیرہ میں اس کو باب کَرُمَ ہی سے بتلایا ہے اور چونکہ یہ مصدر ہے اس لیے جب بطور صفت استعمال ہوتا ہے تو مذکر، مؤنث مفرد و تثنیہ اور جمع سب کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے چنانچہ یہاں بھی یہ باعتبار اصل مؤنث ہی کی صفت واقع ہے[2] پ ۱۶/۱۶

**ضَنِيْنٍ**۔ بخیل، ضَنٌّ سے جس کے معنی بخل کرنے کے ہیں صفت مشبہ کا صیغہ ہے یہ بھی واضح رہے کہ ضَنٌّ کا استعمال نفیس شے کے بارے میں بخل کے متعلق ہوتا ہے پ ۳۰/۶

## فصل الیاء

**ضِيَاءً**۔ چمک، روشنی، چمکنا، روشن ہونا، یہ اجوف واوی ہے اور مہموز اللام، اصل میں ضِوَاءٌ ہے چونکہ واو کے ماقبل پر کسرہ تھا اس لیے اس کو یا سے بدل لیا گیا ہے ابوعلی فارسی کا بیان ہے

[1] حاشیہ شیخ زادہ علی تفسیر البیضاوی ج ۳ ص ۲۳۵ طبع عثمانیہ ۱۳۰۶ھ

[2] روح المعانی ج ۵ ص ۲۱۵ طبع میریہ بولاق مصر ۱۳۰۱ھ

Marfat.com

کہ ضیاء دو امر سے خالی نہیں یا تو یہ ضَوْءٌ کی جمع ہے جیسے کہ سَوْطٌ اور سِیَاطٌ اور حَوْضٌ اور حِیَاضٌ ہیں اور یا مصدر ہے ضَاءَ یَضُوْءُ ضِیَاءً سے جیسے کہ قَامَ قِیَامًا اور صَامَ صِیَامًا ہیں۔ اور ابو علی نے اس کے جمع ہونے ہی کو زیادہ قرین قیاس بتایا ہے لیکن آیہ شریفہ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَاءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا (وہی ہے جس نے بنایا سورج کو چمکتا اور چاند کو چاندنا) میں نوراً کا مفرد لانا اس کے مصدر ہونے ہی کو راجح قرار دیتا ہے، نیز مصدر ہونے کی صورت میں ضیاءٌ بمعنی اسم فاعل یعنی مُضِیْئَۃٌ (روشن کنندہ) بھی ہو سکتا ہے اور مبالغہ کے لیے بھی[2] ۱۱/۵ ۱۷/۴ ۲۰/۱۰

**ضَیْرٌ** ۔ ڈر، ضرر، مضرت، زیان۔ ضَارَ یَضِیْرُ کا مصدر ہے جس کے معنی نقصان کرنے اور ضرر پہنچانے کے ہیں۔ ۱۹/۷

**ضِیْزٰی** ۔ بہت بھونڈی، بہت ناقص
شیخ سلیمان جمل علامہ سمین سے ناقل ہیں[1] محتمل ہے کہ ضَارَ یَضِیْرُ سے ہو جس کا استعمال بلا کرنے اور ستم ڈھانے کے معنی میں ہوتا ہے اور ضِیْزٰی کے معنی ہوتے ظالمانہ نا منصفانہ الغا اس صورت میں دو وجہوں کا احتمال ہے ایک یہ کہ صفت ہو بر وزن فُعْلٰی اور فا کو کسرہ اس لیے دیا گیا تا کہ ی کی سلامتی برقرار رہ سکے جیسا کہ بِیْضٌ میں ہوا ہے[3]۔

اب اگر یہ سوال ہو کہ آخر اس کی ضرورت ہی کیا ہے کہ اس کی اصل کو بضم فا مقدر مانا جائے تو جواب یہ ہے کہ سیبویہ کا بیان ہے کہ صفات میں فِعْلٰی بکسر فا نہیں آیا بلکہ بضم فا ہی آیا ہے جیسے حُبْلٰی، اُنْثٰی، رُبّٰی اور جو اس کے مشابہ ہے۔ ہاں سیبویہ کے علاوہ اور علماء نے صفات میں یہ بھی بیان کیا ہے۔ چنانچہ ثعلب نے مِیتۃٌ حِیکٰی، رجل نقل کیا ہے اور ثعلب کے علاوہ دیگر لوگوں نے امرأۃٌ عِزْھِی اور امرأۃ سِعْلٰی بھی حکایت کیا ہے۔ لیکن اس سے سیبویہ کی تردید نہیں ہوتی کیوں کہ سیبویہ حیکیٰ اور کیصیٰ کی بھی وہی وجہ بیان کرتے ہیں جو ضِیْزٰی کی بیان کی ہے کہ کسرہ یا کی صحت کے لیے ہے۔ رہا عزھی اور سعلی تو ان دونوں کی

---

[1] تفسیر کبیر ج ۴ ص ۸۰ طبع دار الطباعۃ العامرہ

[2] ملاحظہ ہو روح المعانی تفسیر سورہ یونس

[3] بِیْضٌ اصل میں اَبْیَضُ کی جمع ہے جیسے کہ سُوْدٌ اَسْوَدُ کی، اس کی با کو اصل میں ضمہ تھا، مگر یا کے سلامت رہنے کے لیے ضمہ کو کسرہ سے بدل لیا گیا۔

Marfat.com

میں بھی جزعاۃ اور صلاۃ یہی مشہور ہیں اور دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ضیزیٰ مصدر ہو جیسے کہ ذکریٰ ہے کسائی سے کہا ہے کہ ذکر یذکر ذکریٰ کی طرح سے ضَازَ یَضِیزُ ضِیزیٰ بھی بولا جاتا ہے۔

نیز یہ بھی احتمال ہے کہ ضَأَزَ ہو ہمزہ کے ساتھ جیسا کہ ابن کثیر کی قرأت میں ضِئزیٰ ہے لیکن اس کی ہمزہ میں تخفیف کر دی گئی ہو اور ضَأَزَ یَضأَزُ کے معنی بھی ظلم اور نا انصافی سے کسی کے حق کو گھٹا دینے کے ہیں اور یہ معنی بھی اوّل معنی ہی کے قریب ہیں[1]۔

واضح رہے کہ ضَازَ یَضِیزُ اجوف ہے باب ضَرَبَ سے آتا ہے اور ضَأَزَ یَضأَزُ مہموز ہو اور باب فَتَحَ سے آتا ہے معنی دونوں کے قریب قریب ہیں اور ضِیزیٰ دونوں سے صیغہ صفت کا بھی ہو سکتا ہے اور مصدر بھی۔ ۲۷

**ضَیفٌ** ۔ مہمان ۔ راغب لکھتے ہیں: ضَیفٌ کے معنی اصل میں میلان کے ہیں کہا جاتا ہے ضِفتُ الٰی کَذا (میں اس کی طرف مائل ہوا) اور اضعفت کذا الی کذا (میں نے اس کو اس کی طرف مائل کیا) اور ضافَتِ الشمسُ للغروب وتضیّفت (آفتاب ڈوبنے کی طرف مائل ہوا) اور ضاف السھم عن الھدف وتضیّف (تیر نشانہ سے جھک گیا) اور ضَیفٌ وہ ہے جو تمہارے پاس اتر کر تمہاری طرف مائل ہوا اور ضیافۃ بستیوں میں متعارف ہو چکی ہے۔ ضیف اصل میں مصدر ہے اسی لیے عرب کی عام بول چال میں واحد اور جمع دونوں میں اس کا استعمال یکساں ہے اور کبھی اس کی جمع بھی بنا لی جاتی ہے چنانچہ اَضیافٌ، ضُیُوفٌ اور ضِیفَانٌ کہا جاتا ہے

علامہ محمود آلوسی نے تصریح کی ہے کہ زیادہ فصیح یہی ہے کہ نہ اس کا تثنیہ بنایا جائے نہ جمع اور نہ تثنیہ جمع اور مونث کے لیے اس کی تانیث کی جائے[2]

اور علامہ شیخ زادہ لکھتے ہیں: ضَیفٌ اصل میں ضَافَ یَضِیفُ کا

---

[1] الفتوحات الالٰہیہ بتوضیح تفسیر الجلالین للدقائق الخفیہ از سلیمان جمل سورۃ النجم ج ۴

[2] روح المعانی طبع میریہ بولاق مصر ۱۳۰۱ھ سورۃ الحجر۔ ج ۴ ص ۳۱۱ ۔

مصدر ہے جس کے معنی کسی شخص کے پاس مہمان بن کر آنے کے ہیں۔ پھر خود مہمان ہی کو یہ نام دے دیا گیا (یہاں) جو فرشتوں کے حق میں لفظ ضَیف کا استعمال ہوا ہے حالانکہ کھانا اور مہمانی کا طلب کرنا ان کے لیے ناممکن ہے تو یہ اس حیثیت سے ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کو اپنے خیال میں مہمان ہی سمجھا تھا کیوں کہ مہمانوں کی ہی صورت میں وہ آپ کے پاس آئے تھے" [1]

۱۴/۴ ۲۶/۱۹

**ضَیْفِہٖ** ۔ اس کے مہمان ضَیفِ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ ۲۷/۹

**ضَیْفِیْ** :۔ میرے مہمان ضَیف مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ ۱۲/۷ ۱۴/۵

**ضَیْقٍ** :۔ تنگ ہونا ضَاقَ یَضِیْقُ کا مصدر ہے راغب لکھتے ہیں۔

"ضِیق سَعَۃ (وسعت، کشادگی) کی ضد ہے اور ضَیَق بھی بولا جاتا ہے، ضَیْقَۃٌ کا استعمال فقر، بخل، غم اور اسی قسم کے معنوں میں ہوتا ہے ارشاد ہے وَضَاقَ بِھِمْ ذَرْعًا یعنی ان سے عاجز ہو گیا، اور فرمایا وَ اِنِّیْ بِہٖ صَدْرُکَ (اور تنگ ہوگا اس سے تیرا جی) وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ (اور رک جاتا ہے میرا جی) ضَیِّقًا حَرَجًا (تنگ بے نہایت تنگ) ضَاقَتْ عَلَیْھِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَیْھِمْ اَنْفُسُھُمْ (تنگ ہوگئی ان پر زمین باوجود کشادہ ہونے کے اور تنگ ہوگئیں اُن پر ان کی جانیں) وَلَا تَکُ فِیْ ضَیْقٍ (اور تنگ مت ہو) یہ سب غم وحزن کی تعبیریں ہیں اور وَلَا تُضَآرُّوْھُنَّ لِتُضَیِّقُوْا عَلَیْھِنَّ (اور ایذا نہ دینا چاہو ان کو تاکہ تنگ پکڑو ان کو) یہ لفظ کی تنگی پر بھی حاوی ہے اور دل کی تنگی پر بھی اور فقر کے معنی میں بھی ضَاقَ اَضَاقَ فَھُوَ مُضِیْقٌ بولا جاتا ہے، اور اس کا استعمال فقر میں ایسا ہی ہے جیسا کہ وُسْعٌ کا استعمال اس کی ضد میں"

۱۴/۲۲ ۲۰/۲

**ضَیِّقًا** :۔ تنگ، ضَیْقٌ سے صفت کا صیغہ ہے۔ ۸/۲ ۱۸/۱۲

[1] حواشی شیخ زادہ علی تفسیر البیضادی طبع عثمانیہ ج ۲ ص ۱۵۸

Marfat.com

# بابُ الطاء المہملۃ

## فصل الالف

طَابَ۔ خوش آیا۔ بھلا معلوم ہوا (ضَرَبَ) طِیْبٌ سے جس کے معنی خوش لگنے، خوشبو دار ہونے اور پاکیزہ ہونے کے آتے ہیں۔ ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ۴/۱۲

طَارِدٌ۔ ہانکنے والا۔ طَرْدٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو تَطْرُدُ)، ۱۲/۳، ۱۹/۱۰

طَارِقٌ۔ اندھیرے میں آنے والا، رات میں آنے والا، شب میں ظاہر ہونے والا ستارہ ثریا کا نام۔ علامہ محمود آلوسی رقمطراز ہیں:۔

"یہ اصل میں طَرْقٌ سے اسم فاعل ہے جس کے معنے ٹکر اس زور سے مارنے کے ہیں کہ اس کی آواز سنائی دینے لگے۔ اسی سے مِطْرَقَۃٌ بمعنی ہتھوڑا، اور طَرِیْقٌ (بمعنی راستہ) بھی کیونکہ چلنے والے اس کو روندتے رہتے ہیں۔ پھر عرف لغت میں یہ رہ نورد کا نام پڑ گیا اس تصویر پر کہ وہ راستہ کو اپنے قدم سے روندتا رہتا ہے اور اس معنی میں اس درجہ مشتہر ہوا کہ گویا اس کی حقیقت ٹھہر گیا۔ پھر یہ لفظ شب میں آنیوالے کے لیے مختص ہوا کیوں کہ وہ اکثر اوقات در وا بند پاکر ان کو پیٹتا ہے۔ پھر اس کے معنی کو ہر اس شے کے لیے کہ جو رات میں ظاہر ہو وسعت دی گئی خواہ وہ کچھ ہی ہو حتی کہ ان خیالی صورتوں کے لیے بھی کہ جو رات میں ظاہر ہوتی ہیں، اس کا استعمال کیا جانے لگا۔

اور یہاں جمہور کے نزدیک رات میں ظاہر ہونے والا ستارہ مراد ہے، یا تو اس بنا پر کہ وہ اسم جنس ہے اور ایک معہود ستارہ کا نام ہے۔ [1]

۳۰/۱۱

طَاعِمٌ۔ کھانے والا۔ طَعْمٌ سے جس کے معنی چکھنے اور کھانے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ۸/۵

[1] روح المعانی۔ سورۃ الطارق۔

**طَاعَةً**: حکم برداری، قبول کرنا، حکم ماننا، طَوْعٌ سے جس کے معنی فرمانبرداری کرنے کے ہیں، اسم ہے $\frac{٥}{٣}$ $\frac{١٨}{١، ١٣}$ $\frac{٢٦}{٤}$

**طَاغُوْتُ**: شیطان، حق سے روکنے والے بت، معبود باطل، سرکش، سخت طاغی، مفسد، ہُرْدنگا۔ [۱]

طاغوت سے کیا مراد ہے؟ امام فخر الدین رازی نے مفسرین سے اس بارے میں پانچ اقوال نقل کیے ہیں (۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ، مجاہد اور قتادہ نے شیطان کے معنے بیان کیے ہیں (۲) سعید بن جبیر نے کاہن کہا ہے (۳) ابو العالیہ نے ساحر بتایا ہے (۴) بعض مفسرین اصنام (بت) بیان کرتے ہیں، اور (۵) پانچواں قول یہ ہے کہ اس سے سرکش جن اور انسان نیز ہر وہ شخص جو حد سے گزر جائے، مراد ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ تحقیق اس باب میں یہ ہے کہ چونکہ ان سب اشیاء سے اتصال کے وقت طغیان کا حصول ہوا، اس لیے یہ سب چیزیں اسباب طغیان قرار دی گئیں۔ [۲]

حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلہ میں جو اقوال بھی بیان کیے گئے ہیں وہ تعیین کے لیے نہیں بلکہ تمثیل کے طور پر ہیں، طاغوت اپنے عموم کے اعتبار سے ہر معصیت میں حد سے گزر جانے والے نیز ہر اس معبود کے لیے کہ جس کی حق تعالیٰ کے سوا پرستش کی جائے استعمال ہوتا ہے اور اسی اعتبار سے ساحر، کاہن، سرکش جن اور خیر کے راستے سے روکنے والے کو "طاغوت" سے موسوم کیا جاتا ہے [۳] چنانچہ امام محمد بن جریر طبری فرماتے ہیں :-

میرے نزدیک طاغوت کے بارے میں صحیح بات یہی ہے کہ جو بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں حد سے متجاوز ہو اور بجائے حق تعالیٰ کو چھوڑ کر اُسے پوجا بھی جائے وہ طاغوت ہی ہے خواہ جو اس کو پوجتا ہے اس پر اس کا دباؤ ہو خواہ پوجنے والے کی اپنی مرضی ہو اور خواہ وہ معبود انسان ہو یا شیطان یا پتھر ہو یا بت یا کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ [۴]

---

[۱] ہُرْدنگا وہ جو ناحق سرداری کا دعویٰ کرے جو کچھ سند نہ رکھنے ایسے کو طاغوت کہتے ہیں، بت اور شیطان اور زبردست ظالم سب یہی ہیں ۱۲ موضح القرآن از شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی سورۃ النحل رکوع ۵

[۲] تفسیر کبیر ج ۱۷، ص ۳، ۴، ۴، ۴۰ طبع مصر سورۃ البقرہ [۳] ملاحظہ ہو مفردات امام راغب اصفہانی

[۴] تفسیر امام ابن جریر طبری ج ۳ - ص ۱۲ -

Marfat.com

علامہ محب الدین ابو البقاء عبداللہ العکبری
املاء ما من بہ الرحمٰن من وجوہ الاعراب والقراءات
فی جمیع القرآن میں لکھتے ہیں :-
"طاغوت مذکر بھی آتا ہے اور مؤنث بھی نیز واحد
جمع، تذکیر و تانیث سب میں ایک ہی طرح یہ
استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی اصل طَغَيُوْتٌ
ہے کیونکہ یہ طَغَيْتُ طَغِيَ سے ہے اور یہ بھی جائز
ہے کہ واو سے ہو کیونکہ اس میں يَطْغُوْ بھی بولا
جاتا ہے پر یا کا استعمال اکثر ہے اور اسی
پر (مصدر) طغیان آیا ہے پھر لام کلمہ کو مقدم
کر کے غین سے پہلے کر دیا گیا تو طَغَيُوْتٌ یا
طَوَغُوْتٌ بن گیا پھر حرف علت متحرک اور
اس کا ماقبل مفتوح ہوا تو اس کو الف سے
بدل دیا گیا چنانچہ اب اس کا وزن فَلَعُوْتٌ
ہے اور وہ اصل یہ مَلَكُوْتٌ کی طرح مصدر ہے
واضح رہے کہ مصدر ہونے کی صورت میں
اس کی تا زائد ہوگی۔ اور علامہ سلیمان نے بعض سے
یہ بھی نقل کیا ہے کہ اس کی تاء زائد نہیں بلکہ
لام کلمہ کا بدل ہے اور اس کا وزن فاعول ہے[1]

پھر اس کے مصدر ہونے نہ ہونے میں بھی بحث ہے
مبرد نے تصریح کی ہے کہ میرے نزدیک زیادہ
درست یہ ہے کہ یہ جمع ہے۔ ابو علی فارسی کہتے ہیں
کہ ہمارے نزدیک ایسا نہیں ہے کیونکہ طاغوت
مصدر ہے جیسے کہ رَغَبُوْتٌ، رَهَبُوْتٌ، ملکوت
ہیں پس جس طرح یہ اسماء آحاد میں اسی طرح یہ
اسم بھی مفرد ہے جمع نہیں ہے اور جو چیز اس کے
مصدر مفرد ہونے پر دلالت کر رہی ہے وہ
آیہ کریمہ اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ (ان کے رفیق
ہیں شیطان) ہے کہ جمع کے مقام پر مفرد لایا گیا ہے
جس طرح سے کہ هم رضا اور هم عدل
کہا جاتا ہے اور سیبویہ کے نزدیک یہ اسم جنس ہے
مفرد مذکر، اور اس کی جمع و تانیث الگ مراد
ہونے کی بنا پر ہے۔[2]
اور علامہ جار اللہ محمود زمخشری تفسیر سورۃ
الزمر میں رقمطراز ہیں۔
"یہ لفظ شیطان یا شیاطین کے لیے استعمال
کیا گیا ہے کیونکہ یہ مصدر ہے، اس میں کئی
مبالغے ہیں (۱) مصدر سے موسوم کرنا گویا کہ

[1] کتاب مذکور ج ۱ ص ۱ طبع میمنیہ مصر ۱۳۰۶ھ [2] حاشی سلیمان جمل علی تفسیر الجلالین ج ۱ ص ۲۰۰ مصر
[3] تفسیر کبیر امام رازی ج ۱ ص ۳۰۴ [4] تفسیر علامہ ابو السعود عمادی بر حاشیہ تفسیر کبیر امام رازی
حوالہ مذکور۔

Marfat.com

شیطان کی ذات خود طغیان ہے (۲) صیغہ بھی مبالغہ کا صیغہ ہے کیوں کہ رحموت کے معنی ہیں وسیع رحمت اور ملکوت کے معنی ہیں فراخ ملک (۳) قلب جو اختصاص کے لیے ہے کہ غیر شیطان کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ ^له^

۳/۲ ۵/۵،۶،۷ ۶/۱۳ ۱۴/۱۱ ۲۳/۱۶

**طَاغُوْنَ** - نافرمان، سرکش، شریر، معصیت میں حد سے بڑھ جانے والے، طُغْیَانٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر طَاغِیٌ کی جمع بحالت رفع ۲۷/۲،۴ (ملاحظہ ہو طُغْیَانًا)

**طَاغِیْنَ** - سرکش، شریر، حد سے گزر جانیوالے طاغی کی جمع بحالت نصب و جر، ۲۳/۱۳،۶

۲۹/۳ ۳۰/۱

**طَاغِیَۃٌ** - نافرمانی الفرۃ تند، حد سے نکل جانے والی آواز - یہ یا تو مصدر ہے اس صورت میں اس کے معنی خدا کی نافرمانی میں حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں، یا صفت ہے یعنی حد سے بڑھ جانے والی اس صورت میں طُغْیَانٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث ہوگا، امام فخرالدین رازی مفاتیح الغیب معروف بہ تفسیر کبیر میں رقم طراز ہیں :-

طَاغِیَۃٌ کے بارے میں کئی قول ہیں اوّل یہ کہ " طاغیہ " الیا واقعہ ہے جو شدت و قوت میں حد سے بڑھ گیا ہو ارشاد الٰہی ہے اِنَّا لَمَّا طَغَی الْمَآءُ (ہم نے جس وقت پانی نے طغیانی کی) یعنی حد سے بڑھ گیا۔ اور فرمایا مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (بہکی نہیں نگاہ اور حد سے بڑھی نہیں) اس قول پر " طاغیہ " کسی محذوف کی صفت ہے اور وہ محذوف کیا ہے۔ اس میں لوگ مختلف ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ لفظ صیحۃ (چنگھاڑ) محذوف ہے یعنی ایسی چنگھاڑ کہ جو بہت سی چنگھاڑوں سے قوت و شدت میں بڑھی ہوئی ہو جیسا ارشاد الٰہی ہے اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ صَیْحَۃً وَّاحِدَۃً فَكَانُوْا كَهَشِیْمِ الْمُحْتَظِرِ (ہم نے بھیجی اُن پر ایک چنگھاڑ پھر رہ گئے جیسے روندی باڑ کانٹوں کی) اور بعض رَجْفَۃٌ (زلزلہ بھونچال) محذوف بتلاتے ہیں، اور بعض صَاعِقَۃٌ (بجلی کی کڑک) بیان کرتے ہیں -

له الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل ج ۱ ص ۲۶۱ طبع بولاق مصر ۱۲۸۰ھ

Marfat.com

دوسرا قول یہ ہے کہ طَاغِیَۃٌ یہاں بمعنی الطغیان ہے۔ اور کَاذِبَۃٌ، بَاقِیَۃٌ اور عَافِیَۃٌ کی طرح یہ بھی مصدر ہے۔ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے[1]۔ اور متاخرین نے دو طرح سے اس قول پر اعتراض کیے ہیں۔

پہلا اعتراض تو وہی ہے جو زجاج نے ذکر کیا ہے کہ چونکہ جملہ ثانیہ میں جس شے کا عذاب واقع ہوا ہے اس کی نوع کا بیان ہے جو ارشاد الٰہی بِرِیْحٍ صَرْصَرٍ (ٹھنڈی سناٹے کی باد سے) میں مذکور ہے۔ لہٰذا جملہ اولیٰ میں بھی ایسا ہی ہونا لازم ہے تاکہ مناسبت موجود رہے

اور دوسرا اعتراض ہے جو قاضی (علیہ الرحمۃ) ہمدانی معتزلی نے کیا ہے کہ جو یہ بیان کرتے ہیں۔ اگر وہ مراد ہو تو محاورہ کا تقاضا یہ تھا کہ اُہْلِکُوْا لِلطَّاغِیَۃِ یا لحبل الطاغیۃ کہا جاتا۔ حالانکہ یہاں لام کی بجائے با رکھا گیا ہے

تیسرا قول یہ ہے کہ بالطاغیۃ کے معنی ہیں اس جماعت کی بدولت کہ جس نے تمام ثمود میں حد سے بڑھ کر سرکشی کی، اور ناقہ کی کونچیں کاٹنے کی جسارت کی کہ آخر اس کی کونچیں کاٹ ہی ڈالیں یعنی ثمود اپنے اس طاغی فرقہ کی بدبختی کی بدولت ہلاک کئے گئے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ طاغیۃ سے مراد خاص وہی ایک شخص ہو کہ جس نے اس فعل بد کا اقدام کر کے سب کو ہلاک کرایا کیونکہ سب اس کے کرتوت پر خوش تھے اور جس طرح سے فلان راویۃ الشعر داھیۃ، نسّابۃ اور نسّابۃ کہا جاتا ہے اسی طرح سے اس کو طاغیۃ کہا گیا ہو (یعنی تا مبالغہ کی ہو)[2]

واضح رہے کہ امام راغب اصفہانی سے اس جگہ فاش غلطی ہو گئی ہے "طاغیۃ" کو طوفان کا اشارہ سمجھے حالانکہ یہاں ثمود کا مذکور ہے، قوم نوح کا نہیں۔ چنانچہ مفردات میں لکھتے ہیں۔ ارشاد باری فَاُہْلِکُوْا بِالطَّاغِیَۃِ اس طوفان کی طرف اشارہ ہے کہ جس کو اِنَّا لَمَّا طَغَی الْمَآءُ میں بیان کیا گیا ہے۔" پ ۲۹/۵

**طَافَ** ۔ پھر گیا۔ پھرا گیا، نصر، طَوْفٌ سے جس کے معنی کسی چیز کے گرد پھرنے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب پ ۲۹/۳

**طَاقَۃَ** ۔ طاقت، قوت، توانائی۔ راغب

---

[1] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی صحت محل نظر ہے۔ [2] تفسیر کبیر ج ۸ ص ۲۰۰ طبع دار الطباعۃ العامرہ قسطنطنیہ۔

کہتے ہیں کہ:

طاقت اس مقدار کا نام ہے جس کو انسان کے لیے مشقت کے ساتھ انجام دینا ممکن ہو یہ دراصل اُس طوق کے ساتھ تشبیہ ہے کہ جو کسی چیز کو گھیرے رہتا ہے۔ پس آیۂ کریمہ وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ اور نہ اُٹھوا ہم سے جس کی طاقت نہیں ہم کو) کا مطلب یہ ہے کہ جس کا انجام دینا دشوار ہو اور یہ معنی نہیں ہیں وہ چیز ہم پر مت ڈال جس کی ہم کو قدرت نہیں، کیونکہ حق تعالےٰ شانہٗ کبھی وہ چیز بھی انسان پر ڈال دیتے ہیں جو اس پر دشوار ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ (اور اُتارتا ہے ان سے بوجھ اُن کے) اور فرمایا وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ (اور اُتار رکھا ہم نے اُن سے بوجھ تیرا یعنی وہ سخت عبادات کہ جن کے چھوڑنے میں گناہ تھا ہم نے تم پر سے اُن کی تخفیف کر دی اور اسی طرح قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهٖ (انہوں نے کہا قوت نہیں ہم کو آج جالوت کی اور اس کے لشکروں کی) ہے

یعنی ممکنہ مشقت کے ساتھ آج اس لڑائی کا انجام دینا بس میں نہیں"

امام فخر الدین رازی سورۃ البقرہ کے اخیر میں رقمطراز ہیں:-

طَاقَةٌ اسم ہے اِطَاقَةٌ سے جیسے طَاعَةٌ اِطَاعَةٌ سے اور جَابَةٌ اِجَابَةٌ سے اور یہ مصدر کی جگہ بھی استعمال کیا جاتا ہے"[1]

اور اس سے پہلے قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "طَاقَةٌ مصدر ہے بمنزلہ اِطَاقَةٌ کے کہا جاتا ہے اَطَقْتُ الشَّيْءَ اِطَاقَةً وَطَاقَةً اور اسی طرح سے ہے اطاع اطاعۃ اور طاعۃ اسم ہے اور اَغَارَ يُغِيْرُ اِغَارَةً اور غارۃ اسم ہے اور اجاب یجیب اجابۃ اور جابۃ اسم ہے مثل میں ہے۔ اَسَاءَ سَمْعًا فَاَسَاءَ اِجَابَةً ای جَوَابًا[2]

علامہ خازن البغدادی نے رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ کے ذیل میں لکھا ہے۔

"تکلیف مالا یطاق کی دو صورتیں ہیں، ایک تو وہ کہ جس کا برداشت کرنا بندہ کی قدرت

[1] ج ۱۲ ص ۵۷۹

[2] ج ا ص ۲۴۲

ہی سے باہر ہے جیسے نابینا کو بینائی کا مکلف کرنا یا اپاہج کو دوڑنے کی تکلیف دینا سو اس قسم کی تکلیف کا حق تعالیٰ کسی صورت میں بھی اپنے بندے کو مکلف نہیں فرماتا، اور دوسری قسم کی تکلیف مالایطاق وہ ہے کہ شدید مشقت اور سخت تکلیف کے ساتھ اس کو برداشت کر لینا بندے کی قدرت میں ہے جیسے کہ اعمال شاقہ اور فرائض ثقیلہ کا مکلف کرنا، چنانچہ ابتدائے اسلام میں قیام اللیل واجب تھا، سو یہی وہ تکلیف جس کے متعلق اہل ایمان نے اپنے رب سے درخواست کی کہ ان پر وہ بوجھ نہ ڈالے جس کے اٹھانے کی ان میں طاقت نہیں۔

جو لوگ "تکلیف مالایطاق" کے جواز کے قائل ہیں وہ اسی آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ اگر یہ جائز نہ ہوتی تو حق تعالیٰ سے دعا کے ذریعہ اس کی تخفیف کی درخواست بھی مناسب نہ ہوتی" پ ۲/۱۷ ، ۳/۸

**طَالَ** - دراز ہوا، لمبا ہوا (اکثر طول سے) ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو طُولاً)

۱۶/۱۳ پ ، ۱۴/۴ پ ، ۲۷/۱۸

**طَالِبٌ** - طالب، مانگنے والا، چاہنے والا۔ طَلَبٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو طَلَبًا) پ ۱۴/۱۴

**طَالُوْتُ** - بنی اسرائیل کے ایک با اقبال اور صالح بادشاہ کا نام ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام کے ابتدائے عہد میں گزرے ہیں قرآن مجید میں سورۂ بقرہ میں ان کا تفصیلی احوال مذکور ہے، صحیح بخاری میں بطرق متعددہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ہم اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ بیان کیا کرتے تھے کہ اصحاب بدر کی تعداد طالوت کے ان ساتھیوں کی تعداد کے مطابق تھی کہ جنہوں نے ان کے ہمراہ نہر کو پار کیا تھا اور طالوت کے ساتھ صرف مومن ہی نے نہر کو پار کیا تھا اور یہ کچھ اوپر تین سو دس آدمی تھے[1]۔ جامع ترمذی کے الفاظ یہ ہیں کہ ہم یہ گفتگو کیا کرتے تھے کہ اصحاب بدر بدر کے دن اصحاب طالوت کی تعداد کے مطابق تین سو تیرہ تھے، امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس بارے حضرت ابن عباس

[1] صحیح بخاری کتاب المغازی باب عدۃ اصحاب بدر

Marfat.com

رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے اور یہ حدیث حسن صحیح ہے[1]۔ بخاری اور ترمذی کے علاوہ ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور بیہقی نے بھی دلائل النبوۃ میں اس روایت کو نقل کیا ہے[2]۔

تعجب ہے کہ علامہ جلال الدین سیوطی سے الاتقان فی القرآن کی النوع التاسع والستون میں جو کہ قرآن مجید کے اسماء، کنی اور القاب کے بیان پر مشتمل ہے طالوت کا ذکر چھوٹ گیا ہے[3]۔

علامہ محی الدین ابو البقاء عکبری لکھتے ہیں:

طالوت عجمی نام ہے معرفہ ہے اور اسی بنا پر غیر منصرف ہے اور طول سے مشتق نہیں ہے جس طرح کہ اسحٰق سحق سے نہیں بنا ہے، بلکہ یہ وہ الفاظ ہیں جو عربی الفاظ سے ملتے جلتے ہیں[4]۔

اور علامہ جار اللہ زمخشری کشاف میں رقمطراز ہیں:

"طالوت، جالوت اور داؤد کی طرح سے عجمی نام ہے اور معرفہ اور عجمہ ہونے کے سبب غیر منصرف ہے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ طول سے بنا ہے کیوں کہ طالوت کو البسطۃ فی الجسم سے موصوف کیا گیا ہے۔ اور اگر یہ طول سے ہے تو اس کا وزن اس سے فعلوت ہوگا اور اس کی اصل طولوت ہوگی۔ مگر اس کا غیر منصرف ہونا اس کے طول سے مشتق ہونے کو مانع ہے۔ مگر الا یہ کہ یوں کہا جائے کہ یہ عبرانی نام ہے جو عربی کے موافق ہوگیا ہے جیسے حنطا حنطہ کے موافق ہے اور بشما لاھا رخمانا رخیما، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے موافق ہے پس یہ طول سے اسی طرح بنا ہے جس طرح سے کہ عربی ہونے کی صورت میں مشتق ہوتا۔ اور عبرانی ہونے کے باعث اس کا عجمی ہونا بھی اس کے غیر منصرف ہونے کے دو سببوں میں سے ایک سبب ہے[5]۔"

اور علامہ محمود آلوسی فرماتے ہیں:۔

"طالوت کے بارے میں دو قول ہیں۔ ان دونوں میں ظاہر تر یہ ہے کہ یہ عجمی اور عبری نام ہے جیسے

---

[1] جامع ترمذی باب ماجاء فی عدۃ اصحاب بدر ص ۲۰۰ طبع احمدی دہلی ۱۳۱۶ھ [2] الدر المنثور ج ۱ ص ۳۱۸ طبع مصر
[3] اس وقت میرے پیش نظر اتقان کا نسخہ مطبوعہ مطبع احمدی دہلی ہے [4] املاء ما من بہ الرحمٰن ص ۵۰ طبع مصر
[5] کیونکہ غیر منصرف ہونے کے لیے دو سبب یا ایک ایسا سبب جو کہ دو سببوں کا قائم مقام ہو سکے موجود ہونا ضروری ہے اور اس کے مشتق ہونے کی صورت میں یہ عجمی نہیں رہتا بلکہ عربی ہو جاتا ہے اور پھر بجز معرفہ ہونے کے کوئی دوسرا سبب اس کے غیر منصرف ہونے کے لیے موجود نہیں رہتا۔ [6] تفسیر کشاف ج ۱ ص ۱۰۰ طبع بولاق مصر۔

...دواؤ ہے اور اسی لیے غیر منصرف ہے، اور بعض
...کا قول ہے کہ یہ عربی ہے طول سے بنا ہے اور اس
...اصل طَوَلُوْتٌ ہے جیسے کہ رَہَبُوْتٌ اور رَحَمُوْتٌ
...ہیں پھر چونکہ واؤ متحرک تھا اور اس کا ماقبل
...مفتوح اس لیے واؤ الف سے بدل لیا
...گیا اور اس صورت میں اس کا غیر منصرف
...ہونا عَلَمِیت اور شبہ عجمیہ کی بنا پر ہے کیونکہ یہ وزن
...عرب پر نہیں ہے لیکن اس کے متعلق طویل
...سے عدل کا دعویٰ کرنا یا یہ کہنا کہ یہ عبرانی ہے
...اور عربی کے موافق ہوگیا ہے تکلف ہے۔[1] پ ۲

...طَامَّۃٌ۔ بلائے بزرگ، بڑی آفت، بڑا ہنگامہ
...ست، طَمَّ سے جس کے معنی کسی چیز کے اتنے
...زیادہ ہونے کے ہیں کہ وہ چھا جائے اور غالب
...آجائے۔ اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث اور اسی
...سے طامّہ کے معنی اس بڑی مصیبت کے آتے
...ہیں کہ جو ہر چیز پر چھا جائے۔ یہاں اس سے قیامت
...مراد ہے کیوں کہ ہنگامہ قیامت سب کو اپنی لپیٹ
...میں لیے ہوگا۔ پ ۳۰/۴

طَائِرٌ۔ پرندہ، ہر وہ جانور کہ جس کے پر ہوں اور
...ہوا میں اُڑتا پھرتا ہے طائر ہے۔ طَیْرٌ جمع ہے۔

طَائِرُکُمْ:۔ تمہاری فال بد، تمہارا شگون بد، تمہاری بُری قسمت، تمہاری نحوست، تمہاری نامبارکی
طَائِرُ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ
واضح رہے کہ اصل میں تو طائر کے معنی اُڑنے والے ہی کے ہیں چنانچہ طَارَ یَطِیْرُ طَیَرَانًا کا استعمال اسی معنی میں ہوتا ہے مگر عرب جاہلیت کا معمول تھا کہ جب وہ کسی اہم کام کا ارادہ کرتے تو پرندوں کو اُڑاتے اور ان سے فال لیتے اگر وہ داہنے سے بائیں کو نکل جاتے تو اسے بُرا سمجھتے اور منحوس جانتے اور پھر اس کام کو نہ کرتے چنانچہ اس طرح اس کا استعمال پرندوں سے برے شگون لینے کے بارے میں ہونے لگا۔ اور پھر ہر اس شے کیلئے کہ جس سے بدفالی لی جائے یا اسے منحوس سمجھا جائے استعمال کرنے لگے غرض چونکہ عرب پرندہ کو شوم و نحوست کی دلیل و علامت سمجھتے تھے اس لئے مدلول کو دلیل کا نام دے کر خود طائر اور طیر کو شوم سے موسوم کر دیا گیا نیز طائر کے معنی حصہ کے بھی ہیں چنانچہ امام رازی نے ابو عبیدہ سے تفسیر کبیر میں نقل کیا ہے[2]۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں :-

[1] روح المعانی ج۱ ص ۲۵۲ طبع میریہ بولاق مصر ۱۳۰۱ھ [2] تفسیر کبیر ج۴ ص ۴۴۰ سورہ اعراف

کبھی طائر، کا استعمال حصّہ اور نصیب کے معنی میں بھی کرتے ہیں خواہ بھلا ہو یا بُرا حتیٰ کہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ تطیر کی اصل ہی لوگوں میں مال کو متفرق کر دینا اور اُڑا دینا ہے تاکہ ہر ایک کے لیے اس کا حصّہ بھلا ہو یا بُرا اُڑ جائے پھر شر میں اس کا استعمال غالب ہو گیا[1]"

دوسرے معنی کے اعتبار سے طائرھم کے معنی ہوں گے ان کا بُرا حصّہ یا ان کی بدنصیبی ۱۹/۱۹ ۲۲/۱۹

طَائِرَہٗ - اس کی شامتِ اعمال، اس کی بُری قسمت، طائر مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ۔ راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ وہ عمل مراد ہے، جو انسان سے اُڑے خیر ہو یا شر[2]"

۱۵/۲

طٰئِرُھُمْ - ان کا شگون بد، ان کی شومی ان کی نحوست، طائر مضاف ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ۔ ۹/۹

طَائِعِیْنَ۔ فرمانبردار، اپنی خوشی سے کہا ماننے والے طَوْعٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر طائع کی جمع بحالتِ نصب و جر۔ ملاحظہ ہو طَوْعًا ۲۴/۱۹

طَائِفٌ وسوسہ، خطرہ، پھر جانے والا، پھیرنے والا

پہلے معنی مجازی ہیں اور دوسرے حقیقی، بسورہ الاعراف میں مَسَّ کا رسم خط بغیر الف کے ہمزہ کے مرکز کے ساتھ اس طرح ہے طٰئِفٌ، طَائِفٌ طَوْفٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ہے طوف کے معنی ہیں کسی چیز کے گرد چکر کاٹنے کے اور اسی لیے جو شخص گھروں کے گرد اگرد ان کی حفاظت کے لیے چکر لگاتا رہتا ہے "طائف" کہلاتا ہے اور اسی سے جن، خیال، حادثہ وغیرہ کو بطور استعارہ "طائف" کہتے ہیں۔ ارشاد ہے اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ (جہاں پر گیا ان پر شیطان کا گزر) یعنی جو شیطان انسان پر چکر کاٹتا رہتا ہے اور اس کو شکار کرنا چاہتا ہے اس کا وسوسہ اور خطرہ اثر کر گیا۔ اور فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ (پھر پھیرا کر گیا اس پر کوئی پھیرے والا تیرے رب کی طرف سے) میں جو عذاب الٰہی ان لوگوں کو پہنچا تھا، اس کو بطور تعریض بیان کیا گیا ہے۔ ۹/۱۴ ۲۹/۳ -

طَائِفَةٌ. گروہ جماعت، بعض لوگ، کچھ لوگ ایک اور ایک سے زائد سب "طائفہ" کہلاتا ہے طَوْفٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث

[1] روح المعانی ج ۳ ص ۵۳ مع طبع میریہ بولاق مصر [2] یعنی سرزد ہوا، اُڑنا اسی سے استعارہ ہے۔

شیخ الاسلام حافظ علامہ بدر الدین محمود بن احمد
عینی عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری میں رقمطراز ہیں
"لغت میں طائفہ" کے معنی ہیں کسی شے کے
ایک قطعہ یعنی ٹکڑے کے۔ عباب میں ہے
"الطائفۃ من الشئ القطعۃ" اسی معنی میں ارشاد
ہے وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ
الْمُؤْمِنِينَ ۔ اور دیکھیں ان کا مارنا کچھ
لوگ مسلمان ۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں
کہ ایک اور ایک سے زائد طائفہ ہے چنانچہ
جو مفرد کے لیے طائفہ کا استعمال کرتے ہیں وہ
نفس طائفہ مراد لیتے ہیں اور مجاہد کا بیان ہے کہ
ایک شخص سے لے کر ہزار تک "طائفہ" ہے
عطا کہتے ہیں کہ طائفہ کم سے کم دو آدمی ہیں
انتہی۔ اور زجاج نے کہا ہے کہ میرے نزدیک
اقل طائفہ دو ہی ہیں۔ امام شافعی وغیرہ علماء
نے قرآن مجید میں مختلف مواقع پر "طائفہ" کو
اپنے اپنے مقام کے لحاظ سے مختلف وجوہ پر
محمول کیا ہے چنانچہ آیت کریمہ فَلَوْلَا نَفَرَ مِن
كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ سو کیونکہ نکلا
ہر فرقہ میں سے ایک طائفہ ہیں ایک اور ایک
سے زائد مراد ہے اسی آیت سے خبر واحد
کے مقبول ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے اور آیہ
کریمہ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ میں
دو سے کم ۔ چار اور فَلْتَقُمْ طَائِفَةٌ مِّنْهُم
مَّعَكَ ۔ تو چاہیئے کہ ایک جماعت ان کی کھڑی
ہو تیرے ساتھ میں دو سے کم ۔ تین مراد ہیں اور ان
سب مقامات پر قرآن کے لحاظ سے تفریق کی ہے
پہلی جگہ اس اعتبار سے کہ انذار یعنی احکام الٰہی
سے ڈرانا اور خبردار کرنا ایک سے بھی حاصل
ہو جاتا ہے اور دوسری جگہ اس لحاظ سے کہ
چار ہی کی شہادت اس میں معتبر بھی ہے، اور
تیسری تین اس بنا پر کہ پوری آیت وَلْيَأْخُذُوا
أَسْلِحَتَهُمْ الخ میں ان لوگوں کو بلفظ جمع ہی
ذکر کیا ہے۔ اور اقل جمع جمہور اہل لغت و فقہ
و اصول کے مذہب مختار پر تین ہی ہے
اور اگر تم یہ کہو کہ آیت انذار میں بھی تو اللہ تعالیٰ
نے فرمایا ہے لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَ
لِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ اور یہ
سب جمع ہی کی ضمیریں ہیں تو میں جواب میں
کہوں گا کہ ضمیر جمع ان طوائف کی طرف عائد
ہے کہ جو مختلف فرقوں سے مجتمع ہوں [1]

[1] عینی شرح بخاری ج ۱ ص ۲۳۳ طبع استنبول۔

اور علامہ شہاب الدین خفاجی فرماتے ہیں کہ:-

"تحقیق مقام یہ ہے کہ طائفۃ اصل میں اسم فاعل ہے مونث، طواف سے جس کے معنی دوران (چکر لگانے، گھومنے) یا احاطہ (گھیر لینے) کے ہیں اب یہ یا تو نفس کی صفت ہے یعنی نَفْسٌ طَائِفَةٌ اس صورت میں واحد کے لیے بولا جاتا ہے یا جماعت کی صفت ہے یعنی جَمَاعَةٌ طَائِفَةٌ اور ایک سے زائد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ تو گویا یہ ان سب معانی میں مشترک ہے، اور ہر مقام پر اس مقام کے مناسب معنی پر محمول ہوتا ہے"[1]

اور علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:-

"طائفۃ سے جب جماعت مراد لی جائے گی تو طائف کی جمع ہوگا۔ اور جب اس سے واحد مراد ہوگا تو اس صورت میں اس کا جمع ہونا بھی صحیح ہے اور اس کے ذریعہ واحد سے کنایہ ہوگا اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس کو رَاوِيَةٌ اور عَلَّامَةٌ وغیرہ کی طرح قرار دیا جائے (یعنی اس کی تاء کو مبالغہ کی تاء قرار دیا جائے نہ کہ تانیث کی)۔

امام فخر الدین رازی آیہ کریمہ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (سو کیوں نہ نکلے ہر فرقہ میں سے ایک دو آدمی، سمجھ پیدا کریں دین میں اور تا خبر پہنچاویں اپنی قوم کو جب پھر آویں ان کی طرف شاید وہ بچتے رہیں) کے ذیل میں لکھتے ہیں:-

"یہ آیت ان کی قوی دلیل ہے جو خبر واحد کو حجت سمجھتے ہیں، ہم نے کتاب المحصول من علم الاصول میں اس کی تقریر میں نہایت تفصیل سے کام لیا ہے، اور یہاں جو ہم کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہر تین ایک فرقہ ہیں اور حق تعالیٰ شانہ نے ہر فرقہ میں سے ایک طائفہ کا نکلنا واجب قرار دیا ہے، اور تین میں سے نکلنے والے دو ہونگے یا ایک، اس لیے "طائفہ" کا دو یا ایک ہونا ضروری ہوا، پھر حق تعالیٰ شانہ نے ان کے خبر دینے پر عمل کو واجب قرار دیا کیونکہ ارشاد الٰہی وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ ان کے خبر دینے ہی سے عبارت ہے اور فرمان لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ میں ان کی قوم پر اس کو واجب قرار دیا ہے کہ ان کے خبر دینے پر عمل کریں، اور یہ اس کا مقتضی ہے کہ ایک کی یا دو کی خبر شریعت میں حجت قرار پائے"[2]

[1] روح المعانی ج ۶ ص ۱۱ طبع میریہ مصر ۱۳۰۱ھ [2] تفسیر کبیر ج ۴ ص ۶۵، ۶۶، طبع دار الطباعۃ العامرہ استنبول

اور اسی طرح امام ابوبکر جصاص رازی حنفی نے بھی احکام القرآن میں اس آیت سے خبر واحد پر عمل لازم ہونے کے بارے میں نہایت عمدہ تقریر کی ہے جو بخوف طوالت درج نہیں کی گئی منکرین حدیث کو جو اپنے اہل قرآن ہونے کا شور مچاتے ہیں اس آیت پر خوب غور کرنے کی ضرورت ہے

پ ۳/۱۶،۱۵ پ ۴/۷ پ ۵/۱۲،۱۰، ۱۲ پ ۸/۱۸ پ ۱۰/۱۶،۱۴ پ ۱۱/۴ پ ۱۹/۷
پ ۲۰/۴ پ ۲۱/۱۸ پ ۲۸/۱۰ پ ۲۹/۱۴ -

## طَائِفَتٰنِ

دو گروہ ۔ دو فرقے ۔ دو جماعتیں ، طائفۃ کا تثنیہ بحالت رفع ، امام رازی کا بیان ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے جو یہاں اِنْ طَآئِفَتَانِ فرمایا ہے اور اِنْ فِرْقَتَانِ نہیں فرمایا یہ اسی معنی کو ثابت کرنے کے لیے ہے جس کا ہم نے ذکر کیا اور وہ تقلیل ہی ہے کیونکہ "طائفہ" فرقہ سے کم ہوتا ہے[1]

اور امام ابوبکر جصاص فرماتے ہیں کہ :-

اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ بھی جب جنگ کریں گے آیت کے حکم میں مراد ہوں گے نیز اس لیے بھی کہ لغت میں طائفہ ایسا ہی ہے جیسا کہ تم بعض کا لفظ بولتے ہو یا "القطعہ من الشئی" (کسی چیز کا ایک قطعہ یا ٹکڑا) کہتے ہو اور یہ معنی واحد میں بھی موجود ہیں"[2]

پ ۴/۴ پ ۲۶/۱۳

## طَائِفَتَيْنِ

دو گروہ ، دو جماعتیں ، دو فرقے طَائِفَۃ کا تثنیہ بحالت نصب وجہ آیہ کریمہ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا اس واسطے کہ کبھی کہو تم کتاب جو اتری تھی سو دو ہی فرقوں پر ہم سے پہلے ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما حسن البصری ، مجاہد ، قتادہ سُدی اور ابن جریج نے کہا ہے کہ "طائفتین" سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں ۔ ابوبکر جصاص فرماتے ہیں کہ :-

"یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اہل کتاب صرف یہود و نصاریٰ ہی ہیں ، اور مجوس اہل کتاب نہیں ہیں کیونکہ اگر وہ اہل کتاب ہوتے تو تین طائفے ہوتے حالانکہ حق تعالیٰ شانہ نے دو ہی طائفے بتلائے ہیں"[3]

اسی طرح ہندو اور بدھ وغیرہ غیر مسلم فرقے اہل کتاب نہیں ہیں ۔

---

[1] تفسیر کبیر ج ، ص ۵۹۶ . طبع دار الطباعۃ العامرہ استنبول [2] احکام القرآن از جصاص ج ۲ ص ۱۶۲ طبع دار الخلافہ [3] ایضاً ج ۲ ص ۲۶

اور سورۃ الانفال میں جو اِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ
(دو جماعتوں میں سے ایک) ارشاد ہے ان دونوں گروہوں
سے مراد ایک تو قریش کا وہ کاروان تجارت ہے جو
مال و اسباب سے لدا پھندا ابو سفیان کی سرکردگی
میں شام سے مکہ معظمہ واپس ہو رہا تھا اور جس کو قرآن مجید
نے غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ سے تعبیر فرمایا
ہے اور دوسرا طائفہ قریش کا وہ ایک ہزار کا لشکر تھا
جو ساز و سامان سے لیس عتبہ بن ربیعہ کی سپہ
سالاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نبرد
آزمائی کے لیے مکہ معظمہ سے نکلا تھا اور بدر کے
میدان میں کھیت رہا۔ پ ۹/۱۵

**طَائِفِينَ**: طواف کرنے والے، گرد پھرنے
والے، طَوْفٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر
بحالت نصب و جر، طائفٌ کی جمع، لغت میں
طَوْفٌ اور طَوَافٌ کے معنی کسی چیز کے گرد پھرنے
کے ہیں لیکن شرعی اصطلاح میں "طواف" سے مراد
خانہ کعبہ کے گرد پھرنا اور اس کا چکر کاٹنا ہے اور
"طائفین" وہ لوگ ہیں جو حج اور عمرہ کی نیت سے
بیت اللہ شریف کا قصد کرتے اور اس کا طواف
کرتے ہیں، واضح رہے کہ سورۃ البقرۃ میں جو
لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وارد ہے اس سے بعض
علماء نے بیرونی اور مقامی اشخاص کو مراد لیا ہے
چنانچہ امام محمد بن جریر طبری لکھتے ہیں:-

"اہل تفسیر نے اس مقام پر طائفین کے
معنی میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے تو کہا
ہے کہ یہ وہ بیرونی لوگ ہیں جو باہر سے بیت اللہ
شریف آتے ہیں (چنانچہ طبری نے سعید بن
جبیر کا یہی قول نقل کیا ہے) اور دوسروں کا
بیان ہے کہ نہیں بلکہ "طائفین" وہ لوگ ہیں
جو بیت اللہ شریف کا طواف کرتے ہیں
خواہ بیرونی ہوں یا مقامی (چنانچہ عطاء کا
یہی قول نقل کر کے لکھتے ہیں) اور دونوں تفسیروں
میں آیت کے زیادہ مناسب وہ ہے جو
عطاء بیان کرتے ہیں۔ کیوں کہ طائف وہی
ہے جو کسی چیز کا طواف کرے کوئی اور نہیں
اور بیرون سے آنے والا اگر اس نے بیت اللہ
شریف کا طواف نہیں کیا ہے تو طائف
کے نام کا بھی مستحق نہیں ہے"[1]

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ طواف خانہ کعبہ
ہی کے ساتھ مخصوص ہے، کسی اور جگہ
یہ معاملت نہ چاہیے عوام میں جو اولیا اور صلحا کی قبروں کے

[1] تفسیر طبری مسمیٰ بجامع البیان - ج ۱ ص ۴۴۰ -

Marfat.com

گرد پھرنے اور اُن کا حکم کاٹنے کا رواج ہو گیا ہے
اور وہ اس کو بزرگوں کی قبروں کی تعظیم شمار کرتے
اور ان سے تبرک حاصل کرنے کا ایک ذریعہ سمجھتے
ہیں غلط ہے اور شرعاً ناجائز ہے۔ قاضی ثناء اللہ
صاحب پانی پتی، ارشاد الطالبین میں فرماتے ہیں
"گرد قبور گردیدن جائز نیست کہ طواف بیت
حکم نماز دارد قال رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم طواف البیت صلوٰۃ یعنی
طواف بیت اللہ حکم نماز دارد[1]"
قاضی صاحب نے جس حدیث کا ذکر
فرمایا ہے وہ سنن الدارمی میں حضرت عبداللہ
بن عباس رضی اللہ عنہما سے بایں الفاظ
مروی ہے قال رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم الطواف بالبیت صلوٰۃ[2]
(بیت اللہ کا طواف نماز کے حکم میں ہے)
اور مسند امام احمد اور نسائی میں ایک صحابی
سے یوں مرفوعاً روایت ہے الطواف صلوٰۃ[3]
$\frac{ر ۱۷}{۱۵}$

[1] ارشاد الطالبین ص ۸ طبع مطبعہ مجتبائی دہلی ۱۳۰۵ھ
[2] سنن الدارمی ص ۲۳۲ طبع مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۳ھ
[3] تلخیص الحبیر فی تخریج احادیث الرافعی الکبیر از
حافظ ابن حجر عسقلانی ص ۴۸ طبع انصاری دہلی۔

# فصل الباء

**طِبَاقًا** - اوپر تلے، تہ بر تہ۔ تو بر تو۔ یہ باب
مفاعلہ کا مصدر ہے، فعل طَابَقَ یُطَابِقُ آتا ہے
"مطابقت" اسماء متضائفہ میں سے ہے۔ اس کے معنی ہیں
ایک چیز کو دوسری چیز کے اوپر اس کے اندازے کے
مطابق رکھ دینا۔ طَابَقْتُ النَّعْلَ میں نے ایک
جوتے کو دوسرے کے مطابق کر دیا۔ کسی کے قدم
بقدم چلنے کیلئے بطور محاورہ مستعمل ہے۔ اسی سے ہے
"طباق" کا استعمال کبھی تو اس شے کے لیے ہوتا
ہے جو دوسری کے اوپر ہو اور کبھی اس شے
کے لیے کہ جو دوسری شے کے موافق ہو،
امام ابو جعفر بیہقی تاج المصادر میں لکھتے ہیں کہ
"باب ایک شے کے دوسری شے پر اس طرح جیلا
کر رکھنے پر دلالت کرتا ہے کہ یہ اس کو ڈھانپ
لے" $\frac{۲۹}{۱۰۹}$

**طِبْتُمْ**: تم خوش حال ہوئے۔ تم پاکیزہ ہوئے
تم مزے میں رہے۔ طِیْبٌ سے ماضی کا صیغہ
جمع مذکر حاضر۔ انسان کے طیب ہونے کا یہ مطلب
ہے کہ وہ جہالت، فسق اور اعمال بد کی گندگی سے
صاف اور علم و ایمان اور اعمال صالحہ سے آراستہ
ہو (ملاحظہ ہو طاب) $\frac{۲۴}{۵}$

Marfat.com

**طَبَعَ** ۔ اُس نے مہر کی، اُس نے بند لگا دیا، اس نے چھاپ لگا دیا، اس نے کندہ کر دیا (فَتْح، طَبْعٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب) کسی شے کے کسی صورت میں اتارنے کو طبع کہتے ہیں، جیسے کہ ٹھپہ یا زر میں کندہ کرنا، یہ لفظ ختم سے عام ہے، اور نقش سے خاص ہے، اور اسی اعتبار سے طَبْعٌ یا طَبِیْعَۃٌ نفس پر کسی صورت کے نقش کا نام ہے خواہ خلقی طور پر ہو یا عادت کے طور پر مگر خلقی طور پر جو نقش ہوتا ہے اس میں اس کا استعمال بیشتر ہے اور طبع السیف کے معنی ہیں تلوار کا زنگ آلود ہونا اور اس پر میل کچیل چڑھ جانا، محاورہ ہے رجل طَبِعٌ یعنی وہ شخص کہ جس کے اخلاق دنی ہوں، اور گندہ کہ کسی بے حیائی سے شرماتا نہ ہو چنانچہ بعض علماء نے طَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ اور کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِ الْکٰفِرِیْنَ میں طبع کو اسی معنے پر محمول کیا ہے اور اس کے معنی کیے ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں کو زنگ آلود اور میلا کر دیا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ہے بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ (بلکہ زنگ پکڑ گیا ہے ان کے دلوں پر) اور فرمایا اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ لَمْ یُرِدِ اللّٰہُ اَنْ یُّطَھِّرَ قُلُوْبَھُمْ (یہ لوگ ایسے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے کو ان کے دلوں کا پاک کرنا منظور نہیں ہوا)

علامہ محمد طاہر پٹنی مجمع بحار الانوار فی غرائب التنزیل و لطائف الاخبار میں لکھتے ہیں:۔

طَبْعٌ سکون کے ساتھ بمعنی ختم یعنی مہر کرنے کے ہی اور حرکت کے ساتھ (یعنی ) بمعنی زنگ لگنے کے ہے اور اصل میں یہ وہ میل کچیل اور زنگ ہے جو تلوار پر چھا جاتا ہے طبع السیف سے ماخوذ ہے، پھر گناہ وغیرہ برائیوں کے لیے استعمال ہونے لگا۔“ [1]

اور علامہ راغب اصفہانی مفردات القرآن میں فرماتے ہیں:۔

” خَتْمٌ اور طَبْعٌ دو طرح مستعمل ہیں ایک تو خَتَمْتُ اور طَبَعْتُ کا مصدر ہو کر بمعنی تاثیر الشئے کے (یعنی کسی چیز کا کسی چیز میں اثر اور نشان چھوڑنا) جیسے کہ مہر اور ٹھپہ کا نقش کرنا دوم خود وہ اثر جو نقش سے حاصل ہو (اس صورت میں بحیثیت اسم مستعمل ہیں) اور مجازاً ان کا استعمال کبھی تو کسی شے سے بندش اور منع کرنے کے لیے ہوتا ہے یہ معنی نوشتوں اور

[1] کتاب مذکور۔ ج ۲ ص ۳۰۲ طبع نولکشور

دروازوں پر مُہر کرنے سے جوان کے بارے میں ہیں یعنی نوشتہ میں زیادتی اور دروازہ میں داخلہ سے ممانعت حاصل ہوتی ہے اس کے اعتبار سے ہیں، چنانچہ ارشاد ہے۔ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ (اللہ نے انکے دلوں پر مہر کردی) اور خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی سَمْعِہٖ وَقَلْبِہٖ (مہر لگادی اس کے کان پر اور اس کے دل پر)[۱] اور کبھی کسی شے سے کوئی اثر حاصل کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ معنی اسی نقش حاصل کرنے کے اعتبار سے ہیں اور کبھی اس سے آخر تک پہنچنا مراد ہوتا ہے۔

امام ابوجعفر بیہقی نے تاج المصادر میں تصریح کی ہے کہ طبع کی ترکیب اس انتہا پر دلالت کرتی ہے کہ جہاں کوئی شے پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔

علامہ محمود آلوسی رقمطراز ہیں: ۔

اکثر کے نزدیک اس طبع سے آیات میں تدبر اور پند و وعظ سے نصیحت حاصل ہونے کی توفیق کا سلب ہونا اور اللہ کی مدد سے محروم ہونا مراد ہے اور بعض کے نزدیک طبع حقیقی ہے اور اس کی تائید میں بزار کی اس روایت کو بھی پیش کیا گیا ہے جس کو وہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ناقل ہیں کہ طابع (مہر یا ٹھپہ لگانے والا فرشتہ) عرش کے پایہ سے معلق ہے جب کسی حکم الٰہی کی حرمت کو پامال کیا گیا اور معاصی پر عمل درآمد ہوا اور اللہ تعالےٰ کے خلاف جرأت کو کام میں لایا گیا تو حق تعالےٰ اس طابع کو بھیج دیتا ہے اور وہ اس مجرم کے قلب پر ٹھپہ لگا دیتا ہے کہ پھر وہ شخص سمجھائے کچھ نہیں سمجھتا۔ امام بیہقی نے شعب الایمان میں اس حدیث کو روایت کیا ہے مگر انہوں نے اس کی تضعیف کی ہے"[۱] (ملاحظہ ہو ختم)

$\frac{۶}{۲}$ $\frac{۱۰}{۱۸}$ $\frac{۱۴}{۲۰}$ $\frac{۲۶}{۶}$

**طُبِعَ**: مہر کردی گئی، بندش کردی گئی، بند لگا دیا گیا۔ طَبْعٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب $\frac{۱۰}{۱۰}$ $\frac{۲۸}{۱۳}$

**طَبَقٍ**: طبقہ، درجہ، منزل، کھنڈ، حال، حالت

طَبَقٍ اصل میں مطلقاً اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری چیز کے مطابق ہو اور عرف میں یہ لفظ اس حال کے لیے خاص ہو گیا ہے کہ جو دوسرے

[۱] یعنی اب قبول حق سے رکاوٹ اور بندش ہو گئی۔ [۱] روح المعانی ج ۲ ص ۲۱ طبع میریہ مصر سنہ ۱۳۰۱ھ

حال کے مطابق ہوا اقرع بن حابس کا شعر ہے:
اِنّی امرؤٌ قد حلبتُ الدھرَ اَشطُرہٗ
وساقنی طبقٌ منہ الیٰ طبقٍ
(میں ایسا شخص ہوں کہ زمانہ کے سرد و گرم کو دیکھ چکا ہوں اور اس کا ایک حال مجھے دوسرے حال کی طرف کھینچ چکا ہے)

علمائے لغت کی ایک جماعت طَبَقٍ کو طَبَقَۃٌ کی جمع بتاتی ہے جس کے معنے درجے کے ہیں اور بعض کے خیال میں یہ اسم جنس جمعی ہے جو واحد اور جمع دونوں کیلئے مستعمل ہے[1]۔ راغب لکھتے ہیں "ارشاد الٰہی ہے لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ تم کو ضرور ایک حالت سے دوسری حالت پر پہنچنا ہے (یعنی ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف ترقی کرنی ہے۔ دنیا میں جو انسان مختلف حالات میں ترقی کرتا ہے۔ یہ ان حالات کی طرف اشارہ ہے) جیسا کہ آیہ کریمہ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ[2] تم کو بنایا مٹی سے پھر بوند پانی سے، فرما کر بھی اسی طرف ایما کیا ہے۔ نیز آخرت میں حشر و نشر حساب و کتاب اور پلصراط سے لے کر جنت و دوزخ میں ٹھکانہ ہونے تک جو مختلف حالات پیش آنے والے ہیں ان کی طرف اشارہ ہے"

۳۰ طَبَقًا ۹/۳۰

طِبْنَ: وہ خوش ہوئیں، ان کو خوش آیا ان کو بھلا معلوم ہوا۔ طَيْبٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مؤنث غائب (ملاحظہ ہو طاب ۱۲/۴)

# فصل الحاء المہملۃ

طَحٰهَا: اس کو پھیلایا۔ اس کو بچھایا (فتح) طَحْيٌ، طَحْوٌ سے جس کے معنے کسی چیز کو بچھانے اور پھیلانے کے ہیں۔ ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب۔ امام فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے:

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو روح المعانی سورۃ الانشقاق۔ [2] پوری آیت سورۂ مومن میں اس طرح ہے جس میں مراتب ارتقاء کا تفصیلی بیان ہے هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُونُوا شُيُوخًا وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ مِن قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوا أَجَلًا مُّسَمًّى وَلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (وہی ہے جس نے بنایا تم کو خاک سے پھر پانی کی بوند سے۔ پھر لہو کی پھٹکی سے پھر تم کو نکالتا ہے لڑکے، پھر جب تک پہنچو اپنے زور کو پھر جب تک ہو جاؤ بوڑھے اور کوئی ہے تم میں کہ مر لیا پہلے اس سے اور جب تک پہنچو لکھے وعدہ کو اور شاید تم بوجھو)۔

Marfat.com

"لیث نے کہا ہے کہ طحو، دحو کے ہم معنی ہے جس کے معنے بسط یعنی پھیلانے کے ہیں اور طا کا دال سے بدلنا جائز ہے"

## فصل الراء المہملة

**طَرَائِق** : راہیں، طریقے آسمان کے طبقے طریقۃ کی جمع ہے آیہ کریمہ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ (اور ہم نے تمہارے اوپر سات طبق راہوں والے پیدا کیے) میں طبقات آسمانی مراد ہیں۔ اور كُنَّا طَرَائِقَ قِدَدًا (ہم مختلف طریقوں پر تھے) میں مسلک و مشرب نیز درجات کا اختلاف مراد ہے۔ پ ۱۸/۱ ، ۲۹/۱۱

**طَرَدْتُّهُمْ** : میں نے ان کو ہانک دیا۔ میں نے ان کو نکال دیا، طَرَدْتُ، طَرْدٌ سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم اور هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب (ملاحظہ ہو تَطْرُدُ) ۱۲/۳

**طَرْفٌ** ۔ نظر، نگاہ، طرف العین کہتے ہیں آنکھ کی پلک کو اور طَرْفٌ کے معنی ہیں پلک جھپکانے کے۔ پلک جھپکانے کو لازم ہے نگاہ، اس لیے خود نگاہ اور نظر کے لیے بھی طرف کا استعمال ہوتا ہے قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ (نیچی نگاہ والیاں) حورانِ جنت کی صفت ہے کہ غایت عفت کے سبب ان کی نظریں اوپر کو نہیں اٹھتیں۔ ۲۳/۶، ۱۳ ۲۵/۶ ۲۷/۱۳

**طَرَفًا** : ایک ٹکڑا، ایک حصہ، لفظ طَرَفٌ کا استعمال اجسام میں بھی ہوتا ہے اور اوقات میں بھی اَطْرَافٌ جمع (ملاحظہ اَطْرَاف) ۴/۴

**طَرْفُكَ** : تیری نگاہ، تیری نظر طَرْفُ مضاف كَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ۔ ۱۹/۱۸

**طَرْفُهُمْ** : ان کی نگاہ، ان کی آنکھ طَرْفُ مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ ۱۳/۱۹

**طَرَفِي** : دونوں طرف، دونوں کنارے طَرَفٌ کا تثنیہ بحالت نصب (ملاحظہ ہو اَطْرَاف) ۱۲/۱۰

**طَرِيًّا** : تر وتازہ طَرَاوَةٌ سے جس کے معنے تر وتازہ ہونے کے ہیں بر وزن فعیل صفت مشبہ کا صیغہ ہے ۱۴/۸ ۲۲/۱۴

**طَرِيْقٍ** : راہ، راستہ، طُرُقٌ جمع طَرَقٌ سے بروزن فعیل بمعنے مفعول ہے۔ مذکر و مؤنث دونوں طرح مستعمل ہے، راستہ کو "طریق" اس لیے کہتے ہیں کہ وہ پیروں سے روندا جاتا ہے اور طَرَقٌ کے معنی ہتھوڑے سے مارنے کے ہیں اور ٹھوکو

استعارہ انسان کے ہر اس مسلک کو جو کسی فعل کے بارے میں وہ اختیار کرتا ہے "طریق" کہتے ہیں خواہ وہ محمود ہو یا مذموم (ملاحظہ ہو کلمہ طرق)

ب ٦/٣ ب ٢٦/٤ طَرِيقًا ب ٦/٣ ب ١٦/١٣

طَرِيقَةً: روش، راہ، دین مذہب طَرَائِقَ جمع، لغت میں طریقہ کے معنی سردار قوم کے بھی آتے ہیں۔ اور اس معنی میں واحد اور جمع دونوں کے لیے مستعمل ہے۔ ب ١٦/١٤ ب ٢٩/١١

طَرِيقَتِكُمُ: تمہاری راہ، تمہارا طریقہ، تمہارا دین تمہارا مذہب، طَرِيقَةِ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ۔ آیہ شریفہ وَيَذْهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ الْمُثْلَىٰ (اور تمہارے بہتر طریقے یعنی دین ہی کو اٹھا دیں) میں عام مفسرین نے تو دین و مذہب اور راہ روش ہی کے معنی کیے ہیں لیکن ابو جعفر محمد بن جریر طبری نے "طریقہ" کے معنے سادات و اشراف کے بیان کیے ہیں ان کے نزدیک آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ تمہارے سادات و اشراف پر وہ غالب ہو جائیں گے (یعنی ان کو اپنے ساتھ ملا لیں) فرماتے ہیں: —

"جب کوئی شخص اپنی قوم کا سردار، رئیس اور منظور نظر ہوتا ہے تو اس کے متعلق بولا جاتا ہے هو طريقة قومه ونظورة قومه ونظيرتهم اور اس معنی میں یہ واحد اور جمع دونوں کے لیے مستعمل ہے اور کبھی کبھی اس کی جمع بھی لے آتے ہیں، چنانچہ بولتے ہیں هٰؤلاءِ طَرَائِقُ قَوْمِهِمْ (یہ لوگ اپنی قوم کے سردار ہیں، اور اسی معنی میں ارشاد باری ہے كُنَّا طَرَائِقَ قِدَدًا (ہم تھے مختلف سردار)[1]

ائمہ لغت میں سے فرا بھی اس بارے میں امام موصوف کے ہمنوا ہیں، انہوں نے بھی یہاں "طریقہ" کے معنے ان سرداروں ہی کے کیے ہیں جو اپنی قوم کے مقتدا ہوں[2]، علامہ محمود آلوسی روح المعانی میں لکھتے ہیں کہ سرداران قوم کے لیے طریقہ کا استعمال مجاز ہے باین طور کہ جس طرح آدمی طریق یعنی راستہ کی اتباع کرتا ہے اسی طرح سرداروں کی بھی اتباع کیا کرتا ہے[3] (لہٰذا مجازی طور پر خود سرداروں کو بھی طریقہ کہا جانے لگا)؛

علامہ ابو السعود عمادی نے اس معنی پر یہ اعتراض

۱؎ تفسیر ابن جریر ج ۱۶ ص ۱۲۱ طبع مصر ۲؎ ملاحظہ ہو تفسیر کبیر امام رازی ج ۶ ص ۴ طبع دار الطباعۃ العامرہ ۳؎ روح المعانی ج ۵ ص ۲۰۵ طبع بولاق ۱۳۰۱ھ

Marfat.com

کیا ہے کہ اگر سردار مراد لیے جائیں گے تو ان کی تخصیص میں کیا خوبی رہے گی[1]۔ لیکن یہ اعتراض بالکل بے معنی ہے کیوں کہ جب ارباب مناصب اور با اقتدار اصحاب ساتھ ہو لیتے ہیں تو عوام اپنے آپ ہی مان جاتے ہیں۔

ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ بھی روایت کی ہے کہ سریانی میں طریقہ کے معنی سردار قوم کے ہیں، واللہ اعلم۔ ۱۶/۱۲

## فصل السین المہملۃ

**طٰسٓ**: طا، سین، حروف مقطعات ہیں جن کی مراد حق تعالیٰ شانہٗ ہی کو معلوم ہے ملاحظہ ہو (النمل)۔ ۱۹/۱۶

**طٰسٓمٓ**: طا، سین، میم، حروف مقطعات ہیں جن کے معنی اللہ ہی کو معلوم ہیں ملاحظہ ہو (الشعراء، القصص)۔ ۱۹/۵، ۲۰/۴

## فصل العین المہملۃ

**طَعَام**: کھانا، خوراک، خوردنی، کھلانا، جو چیز کھائی جائے اس کا نام ہے اَطْعِمَۃٌ جمع اور کبھی طعام اسم ہوتا ہے بمعنے اطعام یعنی کھانا کھلانے کے جیسے کہ عطا اسم ہے بمعنی اعطاء کے[2] چنانچہ آیہ کریمہ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (اور فقیر کے کھانا کھلانے پر رغبت نہیں دلاتا)، میں طعام بمعنی اطعام ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ بعض اہل لغت صاحب قاموس اور ان کے متبعین نے طعام کے معنی گندم کے بھی بیان کیے ہیں لیکن گیہوں سے اس کی تخصیص کی کوئی وجہ لغت یا عرف کے اعتبار سے نہیں ہے بات یہ ہے کہ صدقہ فطر کی حدیث میں جو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں صَاعًا مِّنْ طَعَامٍ وارد ہے یہاں بعض ائمہ نے بعض قرائن کی وجہ سے طعام سے گندم مراد لیا ہے لیکن اور ائمہ نے اس مراد کو تسلیم نہیں کیا اور طعام سے یہاں بھی وہی اس کے عام اور اصل معنی ہی مراد لیے ہیں لیکن بعد کو بعض شافعی لغت نویسوں نے اپنے مذہب کی تائید کے

---

[1] تفسیر ابوالسعود برحاشیہ تفسیر کبیر ج ۶ ص ۲۔ [2] تفسیر غرائب القرآن و رغائب الفرقان معروف به تفسیر نیشاپوری ج ۲۹ ص ۳۶ - برحاشیہ تفسیر ابن جریر طبری طبع میمنیہ مصر۔

Marfat.com

لیے طعام کے معنے گندم کے بھی نقل کرنا شروع کر دیئے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ عہد نبوی کے بعد جب مسلمانوں میں فتوحات کی کثرت ہوئی اور مال غنیمت کی فراوانی ہو گئی تو کسی خاص خطہ میں گندم کے معنی میں اس کا استعمال بکثرت ہونے لگا ہو آیہ شریفہ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ (اور کتاب والوں کا کھانا تم کو حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کو حلال ہے) میں طعام سے مراد ذبیحہ ہے۔ امام ابو بکر احمد بن علی جصاص رازی احکام القرآن میں رقم طراز ہیں۔

حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما)، ابو درداء (رضی اللہ عنہ) حسن بصری، مجاہد، ابراہیم نخعی قتادہ اور سدی۔ سے مروی ہے کہ ذبائح مراد ہیں اور ظاہر اسی کا مقتضی ہے کیوں کہ ان کے ذبیحے ان کے طعام میں داخل ہیں اور اگر ہم لفظ کو اس کے عموم میں استعمال کریں تو وہ ذبیحے غیر ذبیحے سب پر سب کھانوں پر مشتمل ہو گا۔ مگر زیادہ ظاہر یہی ہے کہ خاص طور پر ذبائح ہی مراد ہیں کیوں کہ اور سب کھانے روٹی تیل اور تمام روغنیات کا حکم ان کے مالک کے اعتبار سے مختلف نہیں اور اس بارے میں کسی کو شبہ بھی نہیں خواہ ان کا بنانے والا اور تیار کرنے والا مجوسی ہو یا کتابی اور نہ اس بارے میں مسلمانوں میں کوئی اختلاف ہے اسی طرح جو چیز ذبح نہ کی گئی ہو اس کی حرمت کا حکم بھی مختلف نہیں خواہ اس کا مار ڈالنے والا مسلمان ہو یا کتابی یا مجوسی پھر جب اللہ تعالٰے نے طعام اہل کتاب کو اباحت کے ساتھ مخصوص فرمایا تو یہ ضروری ہے کہ حکم ذبائح پر ہی محمول ہو کیوں کہ ان کا حکم اختلاف ادیان سے بدل جاتا ہے۔" [1]

اور علامہ صدر الدین حسن بن محمد نیشاپوری لکھتے ہیں "اکثر مفسرین کے نزدیک یہاں طعام سے ذبائح مراد ہیں، کیوں کہ آیت کا ماقبل صید و ذبائح کے بیان میں ہے، نیز ماسوائے صید و ذبائح تو اہل کتاب ہونے سے پہلے بھی اور اہل کتاب ہونے کے بعد بھی حلال ہی ہیں لہٰذا اہل کتاب سے ان کی تخصیص میں

[1] احکام القرآن ج ۲ ص ۳۲۲ طبع دار الخلافہ استنبول ۱۳۳۵ھ

کیا فائدہ ہے؟ [1]

۱/۴ ۲/۴ ۴/۱ ۶/۵،۱۴ ۷/۳ ۱۲/۱۵ ۱۸/۹،۱۰ ۲۲/۳ ۲۵/۱۶

۲۹/۱۹،۵ ۳۰/۱۳،۱۴،۲۲

**طَعَامًا** ۱۵/۱۵ ۲۹/۱۲

**طَعَامِكَ**: تیرا کھانا۔ طَعَام مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ ۳/۲

**طَعَامُكُمْ**: تمہارا کھانا طَعَامُ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ ۶/۵

**طَعَامِهٖ**: اس کا کھانا طَعَامِ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ ۷/۲ ۳۰/۵

**طَعِمْتُمْ**: تم کھا چکے، تم نے کھالیا (سَمِعَ) طَعْمٌ سے جس کے معنی کھانا کھانے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر ۲۲/۴

**طَعِمُوْا**: وہ کھا چکے، انہوں نے کھایا طَعْمٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب ۷/۲

**طَعْمُهٗ**: اس کا ذائقہ، اس کا مزہ طَعْمٌ مضاف، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ کسی شے کا جو مزہ یا ذائقہ ہوتا ہے مثلاً مٹھاس یا ترشی اس کو طَعْمٌ کہتے ہیں۔ اس کی جمع طُعُوْمٌ ہے۔ ۲۶/۲

**طَعْنًا**: طعن کرنا، عیب دینا، مصدر ہے اس کا فعل نَصَرَ، ضَرَبَ، فَتَحَ تینوں بابوں سے مستعمل ہے اصل میں تو اس کے معنی نیزہ، سینگ اور اسی قسم کی چیزوں سے مارنے کے ہیں لیکن بطور استعارہ عیب گوئی اور طعنہ زنی کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یہاں یہی معنی مراد ہیں۔ ۵/۴

**طَعَنُوْا**: انہوں نے طعن کیا، انہوں نے عیب دیا۔ طَعْنٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب ۱۰/۸

## فصل الغین المعجمہ

**طَغَوْا**: انہوں نے سرکشی کی، انہوں نے سر اٹھایا، وہ حد سے گزر گئے (نَصَرَ، سَمِعَ) طُغْيَانٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب (ملاحظہ ہو اَطْغٰى اور طُغْيَانًا) ۳۰/۱۴

**طَغْوٰهَا**: اس کی سرکشی، اس کا حد سے گزرنا۔ طَغْوٰى مضاف ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ طَغْوٰى، طُغْيَانٌ سے اسم ہے جیسے دَعْوٰى، دُعَاءٌ سے ہے۔ آیہ شریفہ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰهَا (ثمود نے اپنی شرارت سے جھٹلایا) کے بارے

[1] تفسیر نیشاپوری بر حاشیہ ابن جریر ج ۶ ص ۵۸۔

ہیں علامہ واحدی کا بیان ہے کہ مفسرین کہتے
ہیں ثمود نے اپنی طغیان کی بناء پر تکذیب کی
مطلب یہ ہے کہ طغیان نے ان کو جھٹلانے پر مجبور
کیا۔ طغیان کے معنی معاصی کے ارتکاب میں
حد سے گزر جانے کے ہیں اور بطغوٰہا میں
سببیت کے لیے ہے بعض مفسرین نے طغویٰ سے
وہ عذاب مراد لیا ہے جس کی ان کو دھمکی دی گئی
تھی۔ عذاب کو طغویٰ اس لیے کہا گیا کہ عذاب نے
ان سرکشوں پر طغیانی کی تھی۔ اس صورت میں
با تعدیہ کے لیے ہوگی[1]۔ علامہ راغب اصفہانی
کا رجحان بھی اسی طرف ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں
کہ آیہ مذکورہ میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ ثمود کو
جب ان کی سرکشی کی پاداش سے ڈرایا گیا تو
انہوں نے تصدیق نہیں کی۔

طغویٰ اصل میں طَغیا تھا ی کو واؤ سے
بدل لیا گیا ہے تاکہ اسم اور صفت میں فرق باقی
رہے اہل عرب کا دستور ہے کہ وہ اکثر اسماء میں
یا کو واؤ سے بدل لیتے ہیں جیسے تقویٰ، نحویٰ اور سردی[2]
علامہ مخدوم علی مہائمی فرماتے ہیں کہ طغویٰ

قوت نظریہ کا قوت شہویہ اور غضبیہ کے تابع
کر دینے کا نام ہے[3]۔ ب ۳۰/۱۶

طَغٰی: وہ حد سے نکل گیا۔ اس نے سرکشی
کی، اس نے سر اٹھایا۔ طُغیانٌ سے ماضی کا صیغہ
واحد مذکر غائب۔ جب نگاہ اپنی حد سے گزر
جاتی ہے تو بہکنے لگتی ہے۔ اسی طرح پانی جب
اپنی حد سے متجاوز ہوتا ہے تو طغیانی آجاتی ہے طغٰی
کا استعمال ان دونوں معنوں میں اسی اعتبار سے
ہے ۱۶/۱۰، ۱۱ ، ۲۷/۵ ، ب ۳۰/۳، ۴ طغا ۲۹/۵

طُغْیَانًا: سرکشی، شرارت، نافرمانی، گمراہی
اصل میں "طغیان" کے معنی نافرمانی اور معصیت کوشی
میں حد سے بڑھ جانے کے ہیں۔ یہ مصدر ہے
اس کا فعل جب واوی ہوتا ہے تو باب نصر
سے آتا ہے طغیٰ یطغو طغیانا اور جب
یائی ہوتا ہے تو فتح اور سمع دونوں سے آتا ہے طغٰی
یطغٰی طغیانا و طغِیَ یطغٰی طغیانا اور
قرآن مجید میں یہ باب فتح ہی سے آیا ہے۔
۱/۱۳، ۱۴ ، ۱۵/۶ ، ۱۶/۱

طُغْیَانِہِمْ: ان کی گمراہی، ان کی سرکشی ان

[1] تفسیر فتح القدیر از علامہ شوکانی ج ۵ ص ۴۳۰ طبع مصر، سورۃ الشمس [2] ایضاً
[3] تفسیر تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنان بعض ما یشیر الی اعجاز القرآن از مخدوم مہائمی ج ۲ ص ۴۴۴

کی شرارت ان کی بے راہی۔ طُغْيَانِ مضاف،
هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ۔

۱/۲، ۷/۱۹، ۹/۱۳، ۱۱/۲، ۱۸/۴

## فصل الفاء

طَفِقَ، وہ کرنے لگا۔ اس نے شروع کیا۔
(سَمِعَ) طَفَقَ سے جس کے معنی کسی کام کو کرنے لگنے اور اس کو شروع کرنے کے ہیں۔ ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب۔ شیخ رضی نے شرح کافیہ میں لکھا ہے کہ:-

اخفش نے بعض اہل لغت سے (اس کا مصدر) طُفُوقاً بھی نقل کیا ہے اور طَفِقَ يَطْفَقُ جَلَسَ يَجْلِسُ کی طرح (باب ضَرَبَ) سے بھی آتا ہے،، ؎۱

لیکن امام ابو جعفر بیہقی نے تاج المصادر میں تصریح کی ہے کہ طَفَقَ بفتح فاردی لغت ہے قاموس میں ہے کہ اس کا استعمال وصل فعل (یعنی اس کام کو کرنے لگ جانے) کیلئے ہوتا ہے۔ اور یہ اثبات کے ساتھ خاص ہے مَاطَفِقَ نہیں کہا جائے گا۔

واضح رہے کہ طَفِقَ افعال مقاربہ میں سے ہے جو فاعل کے لیے خبر کے شروع کرنے اور اس کی انجام دہی کو قریب کرنے کیلئے وضع کیا گیا ہے۔ جیسے طَفِقَ زَیْدٌ يَخْرُجُ (زید نکلنے لگا) کہ یہ زید کے لیے حصول خروج کے قرب پر دلالت کر رہا ہے اور یہ بتلاتا ہے کہ زید ایسی چیز شروع کر چکا ہے جو اس کے لیے نکلنے کی مقتضی ہے۔ مگر شیخ رضی محمد بن حسن استرآبادی کو اس کے افعال مقاربہ میں شمار کرنے پر اعتراض ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

طَفِقَ اور اس کے مرادفات (جَعَلَ، كَرَبَ، اَخَذَ) کو نحویوں کا افعال مقاربہ میں باین معنی شمار کرنا کہ وہ قرب خبر کے لیے موضوع ہیں محل نظر ہے کیونکہ طَفِقَ زَیْدٌ يَخْرُجُ کے معنی یہ ہیں کہ زید نے نکلنا شروع کر دیا اور وہ نکلنے کے ابتدائی اجزاء کے ساتھ لگ چکا اور یہ بات کہ زید کا نکلنا قریب اور نزدیک ہے یہ سب خروج زید کے شروع ہونے سے پہلے پہلے ہی کہی جا سکتی ہے کیونکہ قرب کے معنی قلت مسافت کے ہیں ہاں جو شخص کسی چیز کو شروع کر چکا ہو تو اس کے لیے

؎۱ شرح کافیہ للرضی مطبوعہ نول کشور ۱۳۰۱ھ ص ۶۲۳ م -

یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ اس شے کا اس کے ہاتھوں پورا ہونا قریب ہے۔

لہٰذا اس تقریر پر سوائے کاد اور اس کے مرادفات کے اور کوئی فعل افعال مقاربہ میں سے نہیں جو کہ قرب خبر کے لیے موضوع ہیں"

پھر چند سطور کے بعد لکھتے ہیں کہ :-

"طَفِقَ اور اس کے مرادفات خبر کو شروع کرنے کے قرب کے لیے نہیں بلکہ خود شروع کرنے کے لیے ہیں" [۱]

واضح رہے کہ طَفِقَ کا استعمال کاد کی طرح سے ہوتا ہے یعنی جس طرح سے کہ کاد کی خبر مضارع بغیر ان ہوتی ہے اسی طرح طفق کی خبر بھی مضارع ہوتی ہے اور بغیر ان آتی ہے

۲۳/۱۲

**طَفِقَا**: وہ دونوں لگے (اس کام میں جو آگے مذکور ہے) ان دونوں نے شروع کیا طَفِقَ سے ماضی کا صیغہ تثنیہ مذکر غائب ۱۲/۱۶ ۸/۹

**طِفْلٌ**: لڑکا، بچہ، واحد ہے اور کبھی جمع کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے کیونکہ یہ اسم جنس ہے جیوان یا انسان کا ہر نوزائیدہ بچہ "طفل" کہلاتا ہے، اس کی جمع "اَطْفَال" آتی ہے (ملاحظہ ہو اَطْفَالٌ ۱۸/۱۰)

**طِفْلًا** ۱۱/۸ ۲۴/۱۲

## فصل اللام

**طَلٌّ**: شبنم، اوس، پھوار، طِلَالٌ اور طِلَلٌ

جمع ۳/۴

**طَلَاقٌ**: طلاق، جدائی، رخصت کرنا، چھوڑ دینا، نکاح کی قید سے عورت کے باہر آنے کو طلاق کہتے ہیں۔ یہ مصدر ہے اس کا فعل باب نَصَرَ اور کَرُمَ دونوں سے آتا ہے نیز "طلاق" بمعنی تطلیق (چھوڑ دینے) کے اسم ہو کر بھی مستعمل ہے۔ علامہ سید شریف جرجانی کتاب التعریفات میں رقم طراز ہیں۔

"طلاق کے معنے لغت میں قید سے رہا کرنے اور چھوڑ دینے کے ہیں اور شرع میں ملک نکاح کے زائل کرنے کو کہتے ہیں۔ طلاق بدعت یہ ہے کہ عورت کو تین طلاقیں ایک ہی کلمہ کے ساتھ دی جائیں یا تینوں ایک ہی طہر میں دے دی جائیں۔ طلاق سنت یہ ہے کہ مرد عورت کو تین طلاقیں تین طہر میں ... طلاق احسن یہ ہے کہ مرد عورت کو ایسے طہر میں کہ جس میں اس سے جماع نہ کیا ہو ...

[۱] ملاحظہ ہو شرح کافیہ از رضی ص ۲۵۱۔

Marfat.com

ایک طلاق دے کر چھوڑ دے اور دوسری طلاق نہ دے یہاں تک کہ وہ اپنی عدت پوری کرے۔ ¹

اور در مختار کتاب الطلاق میں مرقوم ہے:۔

" طلاق لغت عرب میں بمعنی رفع قید ہے لیکن علماء نے عورت کے لیے طلاق" اور عورت کے علاوہ اور چیز کے لیے" اطلاق" کا لفظ مقرر کیا ہے اور اسی واسطے اَنْتِ مُطْلَقَۃٌ کنایہ ہے طلاق سے صریح الفاظ میں داخل نہیں ہے کیوں کہ مطلقۃ " اطلاق سے مشتق ہے اور اطلاق بمعنی طلاق کے مستعمل نہیں، اور شرع میں طلاق" لفظ مخصوص کے ذریعہ رفع قید نکاح کو کہتے ہیں خواہ رفع قید فی الحال ہو جیسے کہ طلاق بائن سے ہوتا ہے یا انجام کار رفع قید ہی ہو جیسے کہ طلاق رجعی سے بعد عدت گزرنے کے ہوتا ہے" لفظ مخصوص سے مراد وہ لفظ ہے جو طلاق کو شامل ہو خواہ طلاق صریح ہو یا کنایہ، رجعی ہو یا بائن،

راغب لکھتے ہیں:۔

اصل میں طلاق کے معنی بندش سے رہا کر دینے کے ہیں چنانچہ بولا جاتا ہے اطلقت البعیر من عقالہ وطلقتہ (یعنی میں نے اونٹ کو پائے بند سے رہا کر دیا) اور ھو طالق وطلق کے معنی ہیں وہ بلا قید ہے۔ اسی سے طلقت المرأۃ بمعنی عورت کو چھوڑ دینے کے استعارہ کر لیا گیا ہے۔ اور ھی طالق کے معنی ہیں عورت حبالۂ نکاح سے آزاد ہے"

۲ / ۱۲،۱۳

**طَلَبًا** : طلب کرنا۔ ڈھونڈھنا۔ تلاش کرنا۔

" طلب" کے معنی ہیں کسی شئے کو پانے کے لیے جستجو کرنا خواہ وہ شے اعیان میں سے ہو یا معانی میں سے اس کا فعل باب نَصَرَ سے آتا ہے۔ ۱۵ / ۱۷

**طَلْحٍ** : موز، کیلے، طَلْحَۃٌ واحد ہے ۲۷ / ۱۴

**طَلْعٌ** : خوشہ، گچھا، گابھا۔ درخت خرما کا پہلا شگوفہ جو باہر نکلتا ہے" طلع" کہلاتا ہے طَلْعَۃٌ واحد ہے۔ ۲۶ / ۱۵

**طَلَعَتْ** : وہ دھوپ نکلی۔ وہ آفتاب نکلا (نَصَرَ) طُلُوْعٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب ہے ۱۵ / ۱۴

**طَلْعِہَا** : اس کا گابھا، اس کا خوشہ، اس کا

¹ الکتاب التعریفات مطبوعہ خیریہ مصر ۱۳۰۶ھ ص ۶۱۔ ² وہ رسی جس سے اونٹ کے پاؤں کو موڑ کر اس کے بازو سے باندھ دیتے ہیں۔

Marfat.com

ہنگوئہ طَلْعِ مضاف، ھَا ضمیر واحد مونث غائب مضاف الیہ۔ پ ۷/۱۸ ۱۹/۱۲ ۲۳/۶

**طَلَّقْتُمُ**: تم نے طلاق دی تَطْلِيقٌ سے جس کے معنے عورت کو طلاق دینے کے ہیں ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر ۲/۱۳، ۱۴، ۱۵ ۲۸/۱۴

**طَلَّقْتُمُوهُنَّ**: تم نے ان کو طلاق دی۔ اس میں هُنَّ ضمیر جمع مونث غائب ہے پ ۲/۱۵ ۲۲/۲

**طَلَّقَكُنَّ**: اس نے تم کو طلاق دی، طَلَّقَ تَطْلِيقٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب اور كُنَّ ضمیر جمع مونث حاضر ہے، ۲۸/۱۹

**طَلِّقُوهُنَّ**: ان کو طلاق دو، طَلِّقُوا۔ تَطْلِيقٌ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر اور هُنَّ ضمیر جمع مونث غائب ہے۔ ۲۸/۱۷ -

**طَلَّقَهَا**: اس نے اس عورت کو طلاق دی طَلَّقَ تَطْلِيقٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب اور ھا ضمیر واحد مونث غائب ہے۔ ۲/۱۳

**طُلُوعِ**: نکلنا، طلوع ہونا، سورج یا دھوپ کے نکلنے کو طُلُوع کہتے ہیں۔ یہ مصدر ہے اس کا فعل باب نصر سے آتا ہے پ ۱۶/۱۷ ۲۶/۱۷

لہ تاج العروس -

# فصل المیم

**طُمِسَتْ**: وہ مٹائی گئی (ستارے) مٹا دیئے گئے، بے نور کر دیئے گئے (ضرب و نصر) طَمْس سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مونث غائب ہے واضح رہے کہ طَمْسٌ کا استعمال متعدی اور غیر متعدی دونوں طرح پر ہوتا ہے یعنی مٹانے ا... محو کر دینے کے بھی معنی آتے ہیں اور مٹ جانے محو ہو جانے کے بھی جیسے فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ (جب تارے مٹائے جائیں) میں بعض اہل لغت نے تو یہی مٹانے کے معنے کیے ہیں، لیکن ابن سیدہ نے محکم میں تصریح کی ہے کہ نجم، قمر اور بصر کے سا... جب طمس کا استعمال ہوگا تو بے نور ہونے روشنی زائل ہو جانے کے معنی ہوں گے۔ ا... طرح ازہری نے تہذیب اللغۃ میں لکھا ہے "طموس الکواکب کے معنی ستاروں کے بے نور... اور ماند پڑ جانے کے ہیں"[1]۔ اس اعتبار سے آ... مذکورہ میں ستاروں کا بے نور ہونا اور ماند پڑ جانا مراد ہے... واضح رہے کہ ضمیر جمع مذکر مکسر کے پیچھے چونکہ ص... فعل میں تاء تانیث یا واؤ جمع کا الحاق ضروری... اس لیے طُمِسَتْ کو مونث لایا گیا کیونکہ ا...

جو ضمیر مستتر ہے وہ نجوم کی طرف راجع ہے جو جمع مذکر مکسر ہے۔ ٢٩/١

**طَمَسْنَا**: ہم نے مٹا دیا، ہم نے بے نور کر دیا طَمْسٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم ہے۔ یہاں بھی چونکہ طمس کا استعمال آنکھوں کے لیے ہوا ہے اس لئے حسب تصریح ابن سیدہ و ازہری بے نور کرنے اور روشنی کھو دینے یعنی اندھا کر دینے کے معنی زیادہ مناسب ہیں امام راغب اصفہانی نے آیہ شریفہ وَلَوْ نَشَاءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ میں دونوں معنی جمع کر دیے ہیں فرماتے ہیں یعنی ہم آنکھوں کی روشنی کو اور ان کی صورت شکل کو مٹا دیں جس طرح سے کہ نشان مٹایا جاتا ہے۔

٢٣/٣ ٢٧/٩

**طَمَعًا**: توقع، امید، لالچ، حرص، طَمِعَ يَطْمَعُ کا مصدر ہے۔ باب سَمِعَ يَسْمَعُ سے مستعمل ہے، امام راغب فرماتے ہیں کہ کسی چیز کی طرف اس کی خواہش کی بنا پر جی للچانے کا نام طمع ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی زیر آیہ شریفہ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ "جدا رہتی ہیں ان کی کروٹیں اپنے سونے کی جگہ سے پکارتے ہیں اپنے رب کو ڈر سے اور لالچ سے اور ہمارا دیا کچھ خرچ کرتے ہیں۔" رقم طراز ہیں۔

"اللہ سے لالچ برا نہیں بندہ اس سے ڈرے اور اس واسطے بندگی کرے تو قبول ہے۔ ڈر اور لالچ دنیا کا ہو یا آخرت کا۔ اگر کسی اور کے خوف و رجا سے بندگی کرے تو ریا ہے۔ کچھ قبول نہیں۔"[1]

اور سورۂ انبیاء میں زیر آیہ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ (وہ لوگ دوڑتے تھے بھلائیوں پر اور پکارتے تھے ہم کو توقع سے اور ڈر سے اور تھے ہمارے آگے عاجز) فرماتے ہیں: – "لوگ کہتے ہیں جو کوئی اللہ کو پکارے توقع سے یا ڈر سے وہ صاحب تحقیق نہیں۔ یہاں سے اس کی غلطی نکلی۔"

ش ٨/١٢ ب ١٣/٨ ٢١/١٥،٦

## فصل الواوٗ

**طَوّٰفُوْنَ**: بہت پھرتے رہنے والے، کثرت سے آنے جانے والے۔ بہت زیادہ چکر کاٹنے والے۔ طَوْفٌ اور طَوَافٌ سے مبالغہ کا صیغہ جمع مذکر۔ راغب اصفہانی نے تصریح کی ہے کہ یہاں طَوّٰفُوْنَ سے مراد خادم ہیں لیکن آیت میں خود نابالغوں اور غلاموں کے لئے استیذان کی تصریح موجود ہے چونکہ نابالغ لڑکے، لڑکیاں، لونڈی غلام اور خادم گھر سے اندر باہر چکر لگاتے رہتے ہیں اس لیے انکو طوافون کہا ہے

[1] موضح القرآن، سورۃ السجدہ

Marfat.com

لی کیلئے حدیث میں آتا ہے کہ اِنَّہَا مِنَ الطَّوَّافِیْنَ عَلَیْکُم وَالطَّوَّافَاتِ (بلاشبہ وہ تو تمہارے پاس چکر کاٹنے والے اور چکر کاٹنے والیوں میں ہے) ملاحظہ ہو طَائِفٌ اللہ طَائِفِیْنَ ۔ $\frac{15}{14}$ ۔

طُوْبٰی: خوبی، خوش حالی جنت کے ایک درخت کا نام علامہ محمود آلوسی فرماتے ہیں :۔

"طُوْبٰی کو طَابَ (ضرب)[1] کا مصدر بتایا گیا ہے جیسے کہ بُشْرٰی، اور زُلْفٰی ہیں اور واؤ مُوْسِرٌ اور مُوْقِنٌ کی طرح یا سے تبدیل شدہ ہے[2] چنانچہ مکوزہ اعرابی نے یا کے سلامت رہنے کیلئے اسکی قرأت طُیْبٰی ہی کی ہے۔ ابوالحسن ہنائی کا بیان ہے کہ یہ طَیِّبَۃٌ (پاکیزہ، عمدہ) کی جمع ہے جس طرح سے کَیِّسَۃٌ کی جمع کُوْسٰی بیان کرتے ہیں لیکن ابوحیان نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ فُعْلٰی اوزان جمع میں سے نہیں ہے۔ اس لیے شاید جمع کہنے سے ابوالحسن کی مراد اسم جمع ہو۔

بہرحال مصدر مان لینے کی صورت میں اس کے معنی اور مراد کو مختلف عبارات میں ادا کیا گیا ہے چنانچہ ابن جریر وغیرہ نے حسب ذیل اقوال نقل کیے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس کے معنی فرحت اور آنکھوں کی ٹھنڈک کے ہیں، ضحاک کا بیان ہے کہ قابل رشک ہونا مراد ہے۔ قتادہ کہتے ہیں خوبی کے معنی ہیں اور دوسری روایت میں خیر کے معنے بتاتے ہیں۔ امام نخعی نے خیر کثیر سے ترجمہ کیا ہے۔ امام منصور ہی کی دوسری روایت میں کرامت یعنی عزو شرف کے معنی منقول ہیں، سمیط بن عجلان کہتے ہیں دوام خیر مراد ہے۔ بہرحال سارے معانی کے حاصل عیش طیب (مزیدار اور پاکیزہ زندگی) ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت میں یہ بھی مروی ہے کہ حبشی زبان میں طوبیٰ جنت کا نام ہے۔ ابن جبیر سے بھی یہی منقول ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہندی میں اس کے معنی جنت کے ہیں۔ علامہ قرطبی نے کہا ہے کہ صحیح یہی ہے کہ یہ جنت کے ایک درخت کا نام ہے کیونکہ امام احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن حبان اور طبرانی نیز بیہقی اپنی تصنیف البعث والنشور میں عتبہ بن عبد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ اور سہیلی وغیرہ نے

[1] کتاب یَطِیْبُ کا استعمال لذیذ، شیریں، خوب اور عمدہ ہونے کے لیے ہوتا ہے　[2] طُوْبٰی اصل میں طُیْبٰی تھا بروزن فُعْلٰی یا ساکن ماقبل اس کا مضموم تھا اس لیے یا کو واو سے بدل لیا گیا ہے۔

Marfat.com

اس روایت کی تصحیح بھی کی ہے کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ کیا جنت میں میوے بھی ہیں آپ نے فرمایا ہاں جنت میں ایک درخت ہے جس کو طوبیٰ کہا جاتا ہے۔ (الحدیث بطولہ[1])

واضح رہے کہ حسب تصریح احادیث چونکہ طوبیٰ شجرۂ جنت کا علم ہے۔ اسلئے اس پر الف لام داخل نہیں ہوگا لیکن اگر اس کو طَیّبۃ کی جمع قرار دیا جائے تو اس کے معنی عمدہ خوب اور پاکیزہ اشیاء کے ہوں گے۔ نیز طُوبیٰ اَطْیَبُ کی تانیث بھی ہو سکتی ہے جس کے معنی بہت عمدہ اور بہت پاکیزہ کے ہیں۔ اس صورت میں یہ اَطْیَبُ سے افعل التفضیل کا صیغہ واحد مونث ہوگا مگر چونکہ احادیث میں مصرح ہے کہ طوبیٰ جنت کے ایک درخت کا نام ہے اس لیے یہاں یہی مراد لینا زیادہ صحیح ہے۔ پ۱۳/۱۰

**طَوْدٍ** : بلند پہاڑ۔ علامہ زمخشری لکھتے ہیں طود کے معنی ہیں بلند پہاڑ کے۔ یہ بنائے منطاد سے ماخوذ ہے اہل عرب بنا منطاد اس عمارت کو کہتے ہیں جو بلندی میں آسمان سے جا لگے[2] راغب اصفہانی نے تنبیہ کی ہے کہ قرآن مجید میں جو طود کی صفت عظیم آئی ہے اس کے بنانے والے وہ بلند پہاڑ کی طرح تھا یہ مطلب نہیں کہ اور سب پہاڑوں سے بلند تر تھا۔ پ۱۹/۸

**طُوْرِ** : پہاڑ ہرا بھرا پہاڑ کوہ درخت ناک جزیرہ نمائے سینا کے ایک مخصوص و متعین پہاڑ کا نام عربی زبان میں طور کے معنی پہاڑ کے ہیں لیکن بعض اہل لغت نے تصریح کی ہے کہ مطلق پہاڑ کو طور نہیں کہتے بلکہ جب تک وہ درختوں سے ہرا بھرا نہ ہو طور نہیں کہلائیگا عرب کے مشہور جغرافیہ نویس اور ادیب علامہ یاقوت حموی رومی المتوفی سنہ ۶۲۶ھ اپنی کتاب معجم البلدان میں کہ جو قدیم جغرافیہ پر نہایت ہی مستند اور مشہور و معروف تصنیف ہے رقمطراز ہیں:-

| | |
|---|---|
| والطور فی کلام العرب | طور عربی زبان میں پہاڑ کو کہتے ہیں |
| الجبل وقال بعض | اور بعض اہل لغت نے بیان کیا |
| اهل اللغۃ لا یسمی | ہے کہ جب تک پہاڑ میں درخت |
| طوراً حتی یکون ذا | نہ ہوں اس کو "طور" سے موسوم نہیں |
| شجر ولا یقال للاجرد | کیا جاتا چنانچہ خشک پہاڑ کو جو |
| طور (ج ۶ ص ۶۷) | درختوں سے خالی ہو طور نہیں کہتے۔ |

امام بخاری نے کتاب التفسیر میں مجاہد سے نقل کیا ہے کہ سریانی زبان میں طور پہاڑ کو کہتے ہیں۔ اور ابن ابی حاتم ضحاک سے ناقل ہیں کہ نبطی زبان میں طور کے معنی پہاڑ کے ہیں[3] بہر حال ان تصریحات سے ثابت

---

[1] روح المعانی تفسیر سورہ رعد ج ۱۳ ص ۱۴۵ طبع منیریہ مصر پوری حدیث روح المعانی میں مذکور ہے۔
[2] الفائق فی غریب الحدیث ج ۲ ص ۵۰ طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن [3] الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی ج ۱ ص ۱۳۸ طبع منیریہ مصر

Marfat.com

ہوتا ہے کہ عربی سریانی اور نبطی "تینوں زبانوں میں طور کا استعمال یکساں طور پر ہوتا ہے لیکن عربی لغت نویسوں نے اس کے معنی بیان کرنے میں سرسبز اور خشک پہاڑ کا بھی فرق ملحوظ نظر رکھا ہے مفسرین ارباب روایت میں سے ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس فرق کو نقل کیا ہے کہ۔

| | |
|---|---|
| الطور ما انبت من | "طور" وہ پہاڑ ہے جس میں روئیدگی |
| الجبال وما لم ینبت | ہو اور جس میں روئیدگی نہیں |
| فلیس بطور[1] | وہ "طور" نہیں۔ |

قرآن مجید میں طور کا استعمال ایک مخصوص و متعین پہاڑ کے لیے ہوا ہے چنانچہ الطور میں الف لام عہد کا اس پر دلالت کر رہا ہے یہ وہی پہاڑ ہے جو مصر و مدین کے مابین ہے حضرت موسیٰ علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اسی پہاڑ پر تجلی خداوندی سے سرفراز فرمایا گیا تھا اسی پہاڑ پر آپ کو خلعت کلیمی سے نوازا گیا تھا اسی پہاڑ پر آنجناب کو پیش گاہ ربانی سے الواح توریت کا نسخہ مرحمت فرمایا گیا تھا یہ وہی پہاڑ ہے جس کو حضرت جبریل علیہ السلام نے تھام کر بنی اسرائیل کے سروں پر

لا کھڑا کیا تھا۔ قرآن مجید میں جا بجا ان تمام واقعات کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔

یاقوت رومی نے طور کے سلسلہ میں حسب ذیل پہاڑوں کی نامزدگی کی ہے (۱) بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ طور یہی پہاڑ ہے جو نابلس پر بلند ہے سامرہ اس کا حج کرتے ہیں اور یہود اس کی بڑی تعظیم بجالاتے ہیں یہود کے زعم میں اسی پہاڑ پر حضرت ابراہیم علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حضرت اسمٰعیل علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قربانی کے لیے حکم دیا گیا تھا مگر اُن کے یہاں توراۃ میں ذبیح (بجائے حضرت اسمٰعیل کے) حضرت اسحٰق علیہ السلام ہیں (۲) مصر کے قریب ایک موضع کے پاس جس کا نام مدین ہے ایک پہاڑ ہے جو طور سے موسوم ہے یہ ممکن ہے اس پہاڑ کے پتھروں کو کسی ترکیب سے بھی تو... جائے ان پر درخت عُلیق[2] کی تصویر نمودار ہوتی ہے حضرت موسیٰ علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دوسری مرتبہ خطاب الٰہی اسی پہاڑ پر ہوا تھا جبکہ وہ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے واپس آرہے تھے نبط... میں ہر پہاڑ کو طور کہتے ہیں اور جب اس پر

[1] فتح القدیر للشوکانی ج۱ ص۸۰ طبع مصر

[2] یہ ایک قسم کی گھاس ہے جو درختوں پر آویزاں ہو جاتی... اس کے فوائد بہت ہیں۔ اس کا پھل شہتوت کی طرح کا ہوتا ہے۔

Marfat.com

سبزہ دار درخت ہوں تو طور سینا کہلاتا ہے۔

(۲) طبریہ اردن پر بھی ایک پہاڑ ہے جس کو طور کہا جاتا ہے۔ یہ طبریہ سے بارہ میل پر ہے۔

(۴) مصر کے بالائی علاقہ میں ایک آبادی کے پاس طور نامی ایک پہاڑ ہے جس میں متعدد گاؤں بستے ہیں اور اسی کے قریب کوہ فاران واقع ہے[۱]

طور کی وجہ تسمیہ کے سلسلہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے صاحبزادے طور بن اسمٰعیل کی طرف منسوب ہونے کی بنا پر طور سے موسوم ہے۔ بالکا استعمال ثقل کی وجہ سے جاتا رہا اور طور کہلانے لگا یہی نہیں بلکہ پورا ملک شام بھی طور کہلاتا تھا اہل سیر کا بیان ہے چونکہ طور بن اسمٰعیل یہاں کے حکمران تھے اس کی نسبت سے پورا ملک طور کہلاتا تھا۔[۲]

چونکہ ملک شام اور وہاں کے پہاڑ طور سے موسوم تھے اس لیے طور موسیٰ کے سلسلہ میں بھی بہت سی علماء کا ذہن ملک شام کی طرف منتقل ہوا اور انہوں نے اس کو شام ہی میں بتلایا حتیٰ کہ ابو حیان نے تو البحر المحیط میں بیان تک لکھ دیا کہ اس میں کوئی اختلاف ہی نہیں کہ یہ پہاڑ شام میں واقع ہے چنانچہ محمود آلوسی روح المعانی میں رقمطراز ہیں:

وفی البحر انہ لم یختلف فی انہ جبل بالشام وتعقبہ الشہاب بانہ خلاف المشہور فان المعروف الیوم بطور سینا ماھو بقرب التیہ بین مصر و العقبۃ۔
(ج ۹ ص ۶۰ ، ۳ طبع قدیم)

البحر المحیط میں ہے کہ اس بارہ میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ شام میں ایک پہاڑ ہے اور علامہ شہاب الدین خفاجی نے اس پر گرفت کی ہے کہ یہ خلاف مشہور ہے کیونکہ جو پہاڑ آج طور سینا کے نام سے معروف ہے وہ ہے جو تیہ کے نزدیک مصر و عقبہ کے مابین واقع ہے۔

واضح رہے کہ زمانہ حال میں نہر سویز نے بر اعظم افریقہ کو ایک عظیم الشان جزیرہ کی شکل میں ایشیا کے بر اعظم سے جدا کر دیا ہے۔ وہ جزیرہ نمائے سینا خلیج سویز اور خلیج عقبہ سے گھرا ہوا ہے اس کے شمال میں بیابان تیہ ہے یہ عرب کے شمال اور مغربی حصہ کو افریقہ سے ملائے ہوئے تھا۔ اس جزیرہ نما میں سینا کا کوہستانی سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے، جدید جغرافیہ نویس تصریح کرتے ہیں کہ طور کا اطلاق جزیرہ نمائے سینا کے متعدد پہاڑوں پر ہوتا ہے لیکن موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے سلسلہ میں کوہ طور سے مراد کوہ سینا ہے۔

قرآن مجید میں دو مقام پر طور کی قسم کھائی گئی ہے

[۱] [۲] ملاحظہ ہو معجم البلدان ج ۶ ص ۶۷ - ۶۸ طبع مطبعۃ السعادہ مصر ۱۳۲۴ھ

ایک سورۃ الطور میں دوسرے سورۃ التین میں شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی نے اس سلسلہ میں ایک نفیس بحث سپرد قلم فرمائی ہے جو ہدیۂ ناظرین فرماتے ہیں۔ طور لغت میں پہاڑ کو کہتے ہیں۔ پہاڑ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو درختوں سے بھرے ہوں ان میں جابجا پانی کے چشمے بہہ رہے ہوں جن کی بدولت درختوں کی ان میں بہتات ہو میوہ کے اقسام میں سے چار مغز اور حب الزلم جس کو ہندی میں چرونجی کہتے ہیں۔ نیز انجیر و زیتون اور بھی بڑے بڑے درخت خصوصاً ساگوان کے درخت خودرو وہاں پیدا ہوتے ہوں اور انواع و اقسام کی دوائیاں اور جڑی بوٹیاں گرم مصالحے اور جدوار نیز طرح طرح کی نفع بخش و معطر نباتات کی وہاں کثرت سے پیداوار ہو اور عجیب عجیب جانور جیسے بارہ سنگھا اور آہوئے مشک اور مرغ زریں اور مختلف اقسام کے جانور وہاں پیدا ہوتے ہوں، اور جنس معادن سے بلور یشب اور دوسرے مختلف اقسام کے پتھر وہاں پائے جاتے ہوں۔ سو اس قسم کے پہاڑ کی جامعیت بہت اعلیٰ مرتبہ پہ پہنچ جاتی ہے کہ اس میں طرح طرح کے نباتات اور انواع اقسام کے حیوانات موجود ہوتے ہیں نیز ازواج جنبہ ان پہاڑوں میں بہت ہوتے ہیں اور انسانی افراد بھی اشیاء مذکورہ سے نفع اندوزی کی خاطر وہیں سکونت اختیار کر لیتے ہیں۔ سو ایسی جمعیت وہاں فراہم ہو جاتی ہے کہ اس کا عشر عشیر بھی کسی جگہ معلوم نہیں ہوتا۔ تاہم باوجود اس جامعیت کے ہر کوہ پر شجر پر تجلی الٰہی نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس قسم کے پہاڑ پہ اگر تجلی الٰہی بھی حاصل ہو جاتے تو پھر جامعیت اتم فراہم ہو جاتی ہے۔

سو اس صفت کا کوہ پر شجر مدین و مصر کے راستے میں ایک پہاڑ ہے کہ جس کو فلسطین کہتے ہیں حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو اسی پہاڑ پر تجلی الٰہی سے مشرف فرمایا گیا۔ اور ندا انی انا رب العٰلمین اسی پہاڑ سے آپ کے سمع اقدس میں پہنچائی گئی۔ اسی پہاڑ پہ آنجناب کو رتبہ کلیمی حاصل ہوا۔ اور اس واقعہ کے بعد بھی حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اس پہاڑ پر تشریف لیجاتے اور مناجات باری میں چلہ کشیاں فرماتے تھے۔ الواح توریت بارگاہ خداوندی اسی پہاڑ پر آپ کو عنایت ہوئی تھیں۔ سو وہ پہاڑ جامعیت ظاہر کے ساتھ ساتھ حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسرار وحی اور انوار عبادات

Marfat.com

کا بھی جامع تھا اور جس سر اور نور نے اس پہاڑ پر ظہور فرما کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بیہوش کیا تھا وہ اس قدر اس مقام پر جاگزین اور راسخ رہا کہ مدتہا مدت اور زمانہائے دراز کے گزرنے پر بھی وہ پیروان حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے شرائع کی امداد کے لیے کافی ہوا پس انوار موسوی کا مبدا اور منتہا کہ سارے بنی اسرائیل جن انوار سے منور و مہذب ہوئے یہی مبارک پہاڑ ہے۔ اسی واسطے اس قسم میں پہلی قسم سے بھی ترقی فرمائی کیوں کہ جو نور زیتون میں ہے وہ نور لنوعِ عنصری ہے اور جس نور نے اس پہاڑ پر تجلی فرما کر اس کو ریزہ ریزہ اور پارہ پارہ کر دیا تھا وہ نور الٰہی تھا کہ قرنوں اور مدتوں اس کی تاثیر باقی رہی اور نہال کمال موسوی کو تا بہ ابد اس سے سیراب فرمایا۔

دوسرے خشک پہاڑ کہ اس میں پانی نہ جھاڑی ایسا پہاڑ انسان کے جسم مردہ کے مانند ہے کہ بظاہر انسان معلوم ہوتا ہے اور باطن میں کسی انسانی کیفیت کا حامل نہیں اور چونکہ اس قسم کا پہاڑ تیسری قسم کے قابل نہیں لہٰذا اس سے بچنے کے لیے ہی سینین کا لفظ فرمایا ہے اور اگرچہ اصل لغت میں طور سینین ہر کوہ پر شجر کو کہتے ہیں لیکن اہل عرب کے عرف میں یہ لفظ اسی کوہ موسوی کے ساتھ مخصوص ہے کہ جس پر تجلی الٰہی واقع ہوئی تھی۔ لفظ سینین نبطی زبان کا ہے نبطی اقلیم شام کے کاشتکار لوگ ہیں عرب اس لفظ کو طرح طرح کے تصرف سے استعمال کرتے ہیں کبھی سِینِین کہتے ہیں اور کبھی سَیْنَا بفتحہ سین چنانچہ سورۃ قد افلح میں آیا ہے اور کبھی سِیناء بکسر سین، چنانچہ ابو عمرو، نافع اور ابن کثیر نے یہی قرأت کی ہے۔

اور بعض مفسرین کا بیان ہے کہ انجیر سے مراد مسجد اصحاب کہف ہے اس مسجد کے حوالی میں انجیر کے درخت بہت ہیں۔ اور زیتون سے مراد مسجد بیت المقدس ہے کہ اس کے ارد گرد درخت زیتون بہت ہیں۔ اور بعضوں نے کہا ہے کہ زیتون سے مراد طور زیتا ہے کہ جو بیت المقدس کی شرقی جانب ایک پہاڑ ہے اور مسجد اقصیٰ پر بلند ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ جب بیت المقدس کی زیارت کے لیے تشریف فرما ہوئیں اور مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھ چکیں تو کوہ زیتا کے اوپر چڑھ گئیں اور اس پر بھی نماز ادا کی اور اس پہاڑ کے ایک کنارے پر کھڑے ہو کر اشارہ فرمایا

Marfat.com

کہ اس جگہ سے لوگ قیامت کے دن جدا ہونگے
ایک جماعت بہشت کو روانہ ہوگی اور دوسری
دوزخ کو۔ ایسے ہی پہاڑ ہے کہ حضرت عیسےٰ
علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اسی پہاڑ
پر سے آسمان پر اُٹھایا گیا تھا۔ اس مقام کی
نصاریٰ بڑی تعظیم کرتے تھے اور اب بھی
کرتے ہیں۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر ہیلانہ نامی ایک
فرنگی عورت نے ایک گرجا تعمیر کرایا تھا اور اس
گرجا میں ایک گنبد بنایا تھا کہ جس کو مصعدِ عیسےٰ
کہا کرتے تھے یعنی حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے
آسمان پر اٹھائے جانے کی جگہ رفتہ رفتہ وہ
کنیسہ تو منہدم ہوگیا لیکن بالفعل اس پہاڑ
پر خرنوب نبطی کا درخت ہے جس کے قریب
ایک مسجد بنائی گئی ہے اور اس مسجد کے پائیں
میں ایک غار ہے مصلےٰ، بہت سے
لوگ اس مکان کی زیارت کے واسطے
وہاں جاتے ہیں اور اس درخت کو خرنوبۃ العشرہ
کہتے ہیں۔
سلطان صلاح الدین ایوبی نے جب بیت المقدس تک

کو فتح کرکے فرنگیوں کے ہاتھ سے چھڑایا تھا
تو طور زیتا کی کل زمین کو شیخ احمد حکاری اور
شیخ علی حکاری دونوں کو برابر تقسیم کرکے وقف
کردیا تھا۔ یہ واقعہ ۱۰ ذی الحجہ ۵۸۴ھ ہجری کا
ہے۔ اور وہ زمین تاحال ان دونوں شیخوں
کی اولاد کے ہاتھ میں ہے[1]
پس اس صورت میں اوّل قسم اس مقام کی ذکر
کی جو اصحاب کہف کے انوار و ولایت کی جگہ
ہے۔ اصحاب کہف اولیاء کا وہ پہلا گروہ ہے
کہ جنہوں نے راہ فنا کو طے کیا ہے اس کے بعد
مقام انوار نبوت عیسوی کی قسم کھائی زاں بعد مقام
انوار موسوی کی قسم کو ذکر کرکے اس کے بعد فرمایا ہے میں
وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ یعنی قسم ہے اس امانت
والے یا امن والے شہر کی۔ اس شہر سے مکہ معظمہ
مراد ہے کہ جو اپنی جامعیت میں انتہا کو پہنچ چکا ہے[2]
یہاں یہ امر بھی واضح کردینا مناسب معلوم ہوتا
ہے کہ مفسرین کا اس امر میں تو کوئی اختلاف نہیں کہ طور
سے طور موسیٰ اور بلد امین سے مکہ معظمہ مراد ہے لیکن عام
طور پر مفسرین تین و زیتون سے انجیر و زیتون ہی مراد لیتے

[1] یہ فقرہ شاہ صاحب کے عہد تک کا ہے معلوم نہیں اس دور انقلاب میں اب وہ زمین کس کے قبضہ میں ہے ۱۲ نعمانی
[2] تفسیر فتح العزیز از شاہ صاحب مذکور سورۃ التین مطبوعہ محمدی لاہور۔ ص ۲۲۷، ۲۲۸۔

ہیں حالانکہ سیاق چاہتا ہے کہ یہاں بھی تین و زیتون سے
منابت التین والزیتون مراد ہوں اور ان سے بھی
ایسے دو مختلف مقامات مراد ہوں کہ جو طور و بلد امین
کی طرح مہبط انوار الٰہی ہوں۔ متقدمین سلف کی
ایک جماعت نے اس کی تصریح بھی کی ہے
چنانچہ ابن زید فرماتے ہیں کہ تین سے مسجد دمشق
اور زیتون سے مسجد بیت المقدس مراد ہے۔ قتادہ کا
قول ہے کہ تین وہ پہاڑ ہے جہاں دمشق آباد ہے اور زیتون
وہ پہاڑ ہے جہاں بیت المقدس بسا ہوا ہے۔ عکرمہ
اور کعب احبار کہتے ہیں کہ تین دمشق اور زیتون بیت المقدس
ہے۔[1]

تین و زیتون سے منابت التین والزیتون یعنی ان کی
پیداوار کے مقامات کو مراد لینے میں زبان کا ادنیٰ سا بھی
اشکال نہیں۔ عرب کا دستور ہے کہ وہ اکثر ان مقامات کو
جہاں پر کوئی درخت کثرت سے پیدا ہوا اسی درخت
کے نام سے موسوم کرتے ہیں چنانچہ جہاں غضا[2] کے درخت
بکثرت ہوں اس مقام کو غضی اور درختوں کا جھنڈ جہاں
ہو اس کو شجر اور نخلستان کو نخلہ کہتے ہیں۔ یہ لفظ
کے اصلی معنی سے ہٹنا نہیں بلکہ اس کے متعدد معانی
میں سے ایک معنی کا استعمال ہے۔ بطریق تسمیۃ الظرف
بالمظروف یعنی ظرف کو مظروف کا نام دے دینا جو شائع
ذائع ہے پس تین و زیتون سے ان کے مقامات
روئیدگی کو مراد لینا بھی اسی قبیل سے ہے۔

مولانا حمید الدین فراہی نے اپنی تفسیر نظام
القرآن میں سورۃ التین[3] کی تفسیر میں ان مقامات
کے تعین پر بڑی عمدہ اور تحقیقی بحث کی ہے وہ
مقامات ثلاثہ کی تعیین میں تو شاہ صاحب سے متفق ہیں
زیتون سے وہ بھی طور زیتا یعنی جبل زیتون ہی مراد
لیتے ہیں۔ البتہ تین کی تفسیر میں شاہ صاحب
نے محمد بن کعب کے قول کو لیا ہے۔ وہ تین
مسجد اصحاب کہف کو بتلاتے ہیں اور مولانا فراہی
نے اس سلسلہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ
عنہما کی تفسیر کو اختیار کیا ہے کہ وہ تین سے مسجد
نوح علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مراد لیتے ہیں
کہ جو کوہ جودی پر تعمیر کی گئی تھی[4]۔ اور یہی زیادہ
قرین صحت ہے کہ اس طرح وہ چاروں مقامات داخل

[1] تفسیر فتح القدیر۔ ج ۵ ص ۴۵۲ طبع مصر [2] غضا ایک قسم کا درخت ہے جو بیر کے مشابہ ہوتا ہے۔
[3] نظام القرآن میں سے تفسیر سورۃ التین کا حصہ علیحدہ رسالہ کی صورت میں مطبع معارف اعظم گڑھ میں طبع ہو چکا ہے اسی طرح پارہ عم کی کچھ اور سورتوں کی تفسیریں بھی علیحدہ علیحدہ رسالوں کی شکل میں طبع ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔ [4] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس روایت کو ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے نقل کیا ہے (ملاحظہ ہو فتح القدیر۔ ج ۵ ص ۴۵۲)

Marfat.com

قسم ہو جاتے ہیں کہ جو انبیاء اولوالعزم کے لیے مخصوص ہوا کرتے ہیں۔ تفصیل کے لیے مولانا فراہی کی تفسیر کی طرف مراجعت کی جائے کہ وہ اس سلسلہ میں بہت ہی قیمتی معلومات کی حامل ہے۔

پ ۱/۱۱۸، پ ۶/۲، پ ۱۲/۱۳۰، پ ۱۸/۱، پ ۲۰/۸۱، پ ۲۷/۳، پ ۳۰/۲۰

**طَوْعًا** : فرمانبرداری، انقیاد۔ یہ مصدر ہے اس کے معنی فرمانبرداری کرنے کے ہیں، کُرْہٌ اس کی ضد ہے اس کا فعل باب نَصَرَ اور عَلِمَ دونوں سے مستعمل ہے طاع یطوع طوعًا اور طلع یطاع طوعًا اول کو ازہری نے جو لغت کے مشہور امام ہیں بعض اہل عرب سے نقل کیا ہے اور طاع یطاع کے لیے تصریح کی ہے کہ لغت جیدہ ہے۔ ازہری نے طاع یطاع اور طاوع کے درمیان یہ دقیق فرق بھی بیان کیا ہے کہ بغیر الفت انقیاد و فرمانبرداری کے لیے یطوع آتا ہے اور جب حکم کی بجا آوری کر چکا تو اطاع بولتے ہیں اور جو محض موافقت کی تو طاوع استعمال ہو گا؎۔ پ ۳/۱۷، پ ۱۰/۱۲، پ ۱۳/۸، پ ۲۴/۱۶

**طَوَّعَتْ** اس نے رغبت دلائی۔ اس نے راضی کر دیا۔ اس نے آمادہ کر دیا۔ اس نے آسان کر دیا تَطْوِیْعٌ سے جس کے معنی کسی چیز کو فرمانبردار بنا سازوار کرنے کے ہیں۔ ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب۔ آیہ شریفہ فَطَوَّعَتْ لَہٗ نَفْسُہٗ قَتْلَ اَخِیْہِ وسوسہ کے جی نے اس کو اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کر دیا میں مترجمین قرآن نے طَوَّعَتْ کے ترجمہ میں یہ سب معانی لکھے ہیں جو اوپر تحریر ہوئے علامہ سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں رقم طراز ہیں: ارشاد الٰہی فَطَوَّعَتْ لَہٗ نَفْسُہٗ کی تاویل میں اختلاف کیا گیا ہے چنانچہ بعض نے تَابَعَتْہُ کہا ہے یعنی اس کے جی نے اس کی پیروی کی، یہ معنی ازہری نے فراء سے نقل کیے ہیں اور بعض نے طاوعتہ بیان کیا ہے یعنی اس کے جی نے اس کی موافقت کی، اور اخفش نے کہا ہے کہ طوعت لہ طَوَّقَتْ لَہٗ کی طرح سے ہے اور اس کے معنی ہیں اس کے جی نے اس کے لیے سہل اور آسان کر دیا۔ اس اعتبار سے یہ مجاز ہو گا۔ مبرد کا بیان ہے کہ طَوَّعَ سے باب تفعیل کے وزن پر ہے یا یہ بمعنی شَجَّعَتْہُ ہے یعنی اس کے جی نے اس کو آمادہ کر دیا۔ یہ معنی مجاہد سے مروی ہیں۔ ابو عبیدہ کا بیان ہے کہ مجاہد کی مراد یہ ہے کہ اس کے نفس نے اس کی اعانت کی اور اس کی بات کو منظور کر لیا۔ ابو عبیدہ نے

؎ ملاحظہ ہو تاج العروس۔

Marfat.com

نے یہ بھی کہا ہے کہ میں اس کی اصل طَاعِیَۃٌ
(بمعنی اطاعت) کے اور کچھ نہیں جانتا ازہری
نے کہا ہے کہ میرے نزدیک اخفش کا قول
زیادہ قرین صحت ہے الا فنا اور مبرد کے بیان
پر قَتْلَ اَخِیْہِ کا نصب اس کی طرف فعل
کے تعدیہ کی بنا پر ہے، تو گویا طَوَّعَتْ لَہٗ
نَفْسُہٗ کا مطلب ہوا انقادت فی قتل اخیہ
ولقتل اخیہ پھر حرف جار کو حذف کر کے اس
کی طرف فعل کا تعدیہ کیا گیا تو اس کو نصب ہو گیا۔
علامہ محمد بن احمد انصاری قرطبی نے مروی ہے
نقل کیا ہے کہ طَوَّعَتْ اور اطاعت دونوں کے ایک
ہی معنی ہیں[1] لیکن امام راغب اصفہانی نے مفردات
القرآن میں تصریح کی ہے کہ طَوَّعَتْ اطاعت سے ابلغ
ہے۔ امام موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ طَوَّعَتْ
لَہٗ نَفْسُہٗ۔ اہل عرب کے محاورہ تَابَعَتْ عَنْ
کَذَا انْقَبَضْ د اس کے جی نے اس سے انکار
کیا ہے ٹھیک بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔
علامہ سید محمد رشید رضا مصری نے تفسیر المنار میں اس
کی بلاغت پر نہایت تفصیل سے عمدہ بحث
کی ہے جو ہدیہ ناظرین ہے۔ فرماتے ہیں۔

"مفسرین نے طَوَّعَتْ کی تفسیر شجعت سے کی ہے
اور یہی تفسیر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما
اور مجاہد سے مروی ہے نیز دَسَّعَتْ
سَہَّلَتْ، زَیَّنَتْ اسی قسم کے اور الفاظ
بھی مفسرین سلف اور علماء لغت سے منقول
ہیں، ان الفاظ میں سے ہر ایک فی الجملہ حاصل
معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے لیکن میں نے
کسی کو نہیں دیکھا کہ جس نے اس مقام پر اس
لفظ کی بلاغت کی ذرا سی بھی اس قسم کی تشریح
کی ہو جیسی کہ میں اپنے دل میں اس کی تاثیر
کو پا رہا ہوں۔ حالانکہ یہ لفظ بلاغت
کے اس مقام پر ہے کہ قلب کا
احاطہ کیے ہوئے ہے اور ہر طرف سے
اس کو دبائے جا رہا ہے۔
میں اس وقت لکھ تو رہا ہوں
لیکن اس اثر و تاثیر کی بنا پر کہ جو اس لفظ
کا مجھ پر ہے میرا دل مجھ کو لکھنے نہیں دیتا یہ لفظ
اس تدریج اور کشمکش کو بتلاتا ہے کہ
جو فطرت انسانی کو ایسی حد کے کچے پر
چلنے میں پیش آتی ہے کہ جو قتل

[1] الجامع لاحکام القرآن مطبوعہ دار الکتب المصریہ ۱۳۵۷ھ ج ۶ ص ۱۳۸۔

تک نوبت پہنچا دیتی ہے جس طرح سے ایک سرکش گھوڑے یا اونٹ کے رام کرنے میں پیش آیا کرتی ہے، یہ درحقیقت اہل دانش کے لیے ایک نقشہ کھینچا جا رہا ہے۔ آدم کا بیٹا جس کو حسد نے اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کر دیا ہے۔ کشاکش میں مبتلا ہے وہ اپنے بھائی کے حکمت بھرے بولوں میں سے ہر بول پر سوچ رہا ہے اور ہر بول میں اس کو ارتکاب جرم سے باز رکھنے والی ایک ایسی حقیقت مل رہی ہے کہ جو فطری موانع عقل، قرابت اور خوف کی موید و مددگار ہے دفعۃً حسد جلدی سے نفس امارہ سے اٹھ کر نفس لوامہ کے ہر باز رکھنے والے اور روکنے والے کے خلاف صف آرا ہو جاتا ہے۔ اب حسد اور اس کے موانع میں جنگ شروع ہو جاتی ہے کشاکش ہونے لگتی ہے۔ آخر حسد سب پر غالب آتا ہے اور آدم کے بیٹے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ غرض موانع فطرت نیز موانع پند و موعظت کے داعیہ کا حسد کے آگے جھک جانا اور اس کا مطیع و منقاد ہو جانا یہی وہ "تطویع" ہے

جس کو حق تعالیٰ شانہ نے مراد لیا ہے۔ اور جب یہ تطویع (مطیع کرنا) تمام ہو جاتی ہے تو اس سے قتل کا صدور ہوتا ہے یہی وہ معنی ہیں جن کو لفظ ادا کر رہا ہے اور ہر دور میں اسی کے مقتضے کے مطابق جو نسل انسانی کا حال رہا ہے وہ اس کا مؤید ہے چنانچہ ہم لوگوں کے حالات دیکھتے رہتے ہیں اور حکام کو تو ملزموں اور قصورواروں کا خوب تجربہ ہے کہ ہر وہ شخص جس کو اس کا جی اپنے بھائی کے قتل کے لیے کہتا ہے خواہ وہ بھائی اس کے قریبی ماں باپ سے ہو یا دور کے باپ سے (یعنی آدم علیہ السلام کے رشتہ سے) وہ اپنے نفس میں ایک یا ایک سے زائد ایسے موانع محسوس کرتا ہے جو اس کو ناروا کام سے باز رکھتے ہیں پھر دیر یا سویر تک اس کے دل ہی دل میں اس مانع (روکنے والا) اور مقتضی (اکسانے والا) میں باہم تصادم ہوتا رہتا ہے۔ تا آنکہ اس کا نفس موانع پر مقتضی کو ترجیح دے کر قتل پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اب اگر وہ قتل کر سکتا ہے تو کر ڈالتا ہے۔ پس تطویع میں ویسی ہی کشمکش ضروری ہے جیسی کہ سرکش حیوان کو رام کرنے میں اور صنعت یا علم کے سکھانے

Marfat.com

میں کبھی تو یہ کشاکش صرف ایک ہی مانع اللہ
ایک ہی رکاوٹ کی بنا پر ہوتی ہے اور کبھی متعدد
رکاوٹوں کی وجہ سے۔ اور اس مانع معنی کی تعبیر
کے لیے سب سے زیادہ مناسب لفظ
تشجیع ہی ہے کہ جو سلف سے مروی بھی ہے اور
جو اس بات کو بتلاتا ہے کہ وہ اپنے بھائی کے
قتل سے ڈرتا تھا اور اس کی فطرت اس کے
ارتکاب میں بزدلی کا ثبوت دے رہی تھی لیکن
اس کا نفس امارہ برابر اس کو اس فعل پر اکساتا
رہا ہے یہاں تک کہ اس میں جرأت آ گئی
اور اس تطویع کے بعد انجام کو سوچے سمجھے
بغیر قتل کا ارتکاب کر بیٹھا۔" [1]

## ط و ف

**طُوْفَانٌ**: طوفان۔ امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں:-

ہر وہ حادثہ جو انسان کو گھیرے طوفان ہے ارشاد الٰہی فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ "سو ہم نے بھیجا اُن پر طوفان" اسی معنی پر محمول ہے ویسے اس کا استعمال اس پانی کے لیے کہ انتہائی کثرت میں ہو متعارف ہو گیا ہے کیوں کہ نوح علیہ السلام کی قوم کو جو حادثہ پہنچا تھا وہ پانی ہی کا حادثہ تھا"

اور علامہ سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس من جواہر القاموس میں عبارت مذکورۃ الصدر کو نقل کر کے لکھتے ہیں:-

"یہ نفیس تحقیق ہے پھر اس کے اشتقاق میں بھی اختلاف ہے گو اکثر ائمہ نے اس سے تعرض نہیں کیا ہے، چنانچہ بعض نے تو کہا ہے کہ یہ طاف یطوف سے ہے جیسا کہ مصنف (صاحب قاموس) اور راغب کے کلام کا اقتضاء ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ طغا الماء یطغو سے جس کے معنے پانی کے بلند ہونے اور چڑھ آنے کے ہیں فعلان کے وزن پر ہے بعد میں عین کلمہ کی جگہ پر لام کلمہ کو بدل دیا گیا۔ چنانچہ ہمارے شیخ نے اقتضاب سے اس کو نقل کیا ہے۔ میں (یعنی صاحب تاج العروس) کہتا ہوں کہ دوسرا قول غریب ہے"

شیخ احمد بن محمد فیومی (المصباح المنیر) میں رقمطراز ہیں:-

[1] تفسیر المنار۔ ج ۶ ص ۳۴۵ و ۳۴۶ طبع مطبع المنار مصر۔

Marfat.com

بصری کہتے ہیں کہ یہ جمع ہے اور اس کا واحد طوفانۃ ہے۔ اور کوفہ والوں کا بیان ہے کہ یہ رُجْحَانٌ اور نُقْصَانٌ کی طرح سے مصدر ہے اور جمع نہیں آتا"

تاج العروس میں ہے:-

"اخفش کا بیان ہے کہ طُوفَانٌ، طُوفَانَۃٌ کی جمع ہے۔ ابن سیدہ کہتے ہیں۔ اخفش ثقہ ہے اور جب ثقہ کسی بات کو بیان کرے تو اس کا قبول کرنا لازم ہے۔ اور ابو العباس (مبرد) کہتے ہیں کہ یہ طاف یطوف سے مشتق ہے اور طوفان مثل رجحان اور نقصان کے مصدر ہے اور اس کی ضرورت نہیں کہ اس کا واحد تلاش کیا جائے۔

اور علامہ محمود آلوسی روح المعانی میں فرماتے ہیں:- "طوفان وہ ہے جو لوگوں کو گھیرلے اور ان کے مکانات اور کھیتوں کو ڈھانپ لے خواہ وہ بارش ہو یا سیلاب، تو یہ طواف سے اسم جنس ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اصل میں نقصان کی طرح سے مصدر ہے اور ہر اس شے کا نام ہے جو حادثہ میں نمودار ہو کر چہار جانب سے گھیرلے اور عام ہو جائے جیسے بہت زیادہ پانی اور قتل عام اور موت کی گرم بازاری اور پانی کے طوفان میں اس کا استعمال مشتہر ہو چکا ہے۔ اور اس مقام پر اس کی تفسیر متعدد روایات میں حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے یہی آئی ہے۔ اور عطا اور مجاہد سے موت کے معنے آتے ہیں اور موت ہی کی تفسیر ابن جریر وغیرہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً نقل ہے۔ اور وہب بن منبہ سے منقول ہے کہ یمنی زبان میں اس کے معنی طاعون کے ہیں اور ابو قلابہ سے مروی ہے کہ اس سے مراد چیچک ہے۔ اور قوم فرعون پر سب سے پہلے یہی عذاب بھیجا گیا تھا۔ پہ یہ دونوں باتیں حدیث مرفوع ہی سے جا ملتی ہیں۔[1]

$\frac{9}{6}$ $\frac{20}{14}$ ب

**طَوْلٌ** ، مال، دولت، تونگری، انعام اور گنجائش، مقدور، قدرت، یہ طال یطول مصدر ہے۔ اس کا استعمال دو معنی میں ہوتا ہے ایک تو درازی اور فضیلت میں غلبہ کرنا۔ دوسرے کسی شخص کے ساتھ احسان کرنا اور اس کو الفت

[1] تفسیر روح المعانی۔ ج ۹ ص ۳۰ طبع منیریہ مصر۔

دیا۔ علامہ بغوی ابو جعفر بیہقی تاج المصادر میں رقمطراز ہیں۔

"الطول بدرازی و فضل غلبہ کردن، و با کسے فضل کردن"

اس معنی میں اس کا تعدیہ بحرف علیٰ ہوتا ہے اور باب نصر سے آتا ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں:۔

"طول۔ فضیلت اور احسان کے معنی میں مخصوص ہوگیا ہے۔ ارشاد ہے: شَدِيْدُ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ (سخت عذاب کرنیوالا، انعام کا مالک) اور دوسری جگہ فرمایا اِسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ (تجھ سے رخصت مانگتے ہیں ان کے صاحبان مقدور یعنی اُن کے بڑے لوگ اور وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا (اور جو کوئی نہ رکھے تم میں سے مقدور ہیں طَوْلًا مہر و نفقہ سے کنایہ ہے۔"

اور علامہ احمد فیومی المصباح المنیر میں فرماتے ہیں طال علی القوم یطول طولا یہ باب قال سے ہے۔ اس کے معنی صاحب فضل ہونے کے ہیں۔ طائل اسم فاعل ہے۔ اور اطال ہمزہ کے ساتھ اور تطول بھی اسی معنی میں مستعمل ہیں اور طول الحرۃ بھی اصل میں اسی سے مصدر ہے۔ کیوں کہ شوہر جب بیوی کے مہر اور اس کے خرچ وغیرہ کی تکلیف برداشت کرنے پر قادر ہوا تو اس پر صاحب فضیلت ہوا۔ اور بعض فقہاء کہتے ہیں کہ طول الحرۃ وہ سرمایہ ہے جو مرد کے کفاف سے زائد ہو اور نکاح کے خرچ و اخراجات کے لیے کافی ہو سکے۔ اور یہ معنی ازہری کے اس بیان کے موافق ہیں کہ آیۂ کریمہ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ (یہ اس کے واسطے ہے جو کوئی تم میں ڈرتے تکلیف میں پڑنے سے) اس شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس میں طول کی استطاعت نہیں یعنی اس کے پاس اتنا نہیں سمجھا کہ جس سے وہ آزاد عورت سے نکاح کر سکے اور بعض نے طول کے معنی غنی یعنی تونگری کے بیان کیے ہیں۔

اور اصل تو یہ ہے کہ اس کا تعدیہ بذریعہ الیٰ کیا جائے اور کہا جائے وجدت طولا الی نکاح الحرۃ یعنی آزاد عورت کے نکاح تک پہنچنے کے لیے میں نے مالی وسعت پائی۔ کیونکہ یہ صلت یعنی پہنچنے کے معنی پر مشتمل ہے پھر جب اس کا استعمال بکثرت ہونے لگا تو طولا الی الحرۃ کہنے لگے۔ بعد میں فقہاء نے اس کی مزید تخفیف کی

Marfat.com

تو صرف طول الحرة ہی بولنے لگے اور بعض نے کہا ہے کہ اصل میں طولا علیہا ہے اور معنی میں بعورت کے نکاح پر قدرت ہونا۔ اور زیادتی کے معنی پر باب کا دار و مدار ہے۔"

اور علامہ نظام الدین حسن بن محمد قمی نیشاپوری اپنی تفسیر غرائب القرآن ورغائب الفرقان میں لکھتے ہیں:۔

"طَوْلٌ کے معنی ہیں مال میں زیادتی اور وسعت کے اور اسی سے طُوْلٌ (دراز ہونا، لمبا ہونا) ہے جو جسم میں ہوتا ہے کیونکہ وہ جسم میں زیادتی ہے جس طرح سے کہ قصر (کوتاہ ہونا) جسم میں قصور و نقصان ہے"[1]

۱/۱ ۲۴/۶ طَوْلًا ۵/۱

طُوْلًا: لمبا ہونا، دراز ہونا، لمبائی، درازی، لمبا ہونا طَالَ یَطُوْلُ کا مصدر ہے۔ اس کے معنی امتداد یعنی لمبے اور دراز ہونے کے ہیں۔ صحاح جوہری میں ہے کہ طول خلاف عرض ہے۔ اور محکم میں ہے کہ قصر کی نقیض ہے۔ امام راغب نے تصریح کی ہے کہ "طول اور قصر اسماء متضائفہ میں سے ہیں اور طول کا استعمال اعیان و اعراض (جیسے زمان وغیرہ) سب کے لیے ہوتا ہے۔ ارشاد ہے فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ (پھر لمبی گزری ان پر مدت)"

اور احمد فیومی مصباح میں لکھتے ہیں:۔

"مگر بعض تو اس کی نقیض قَصُرَ پر حمل کر کے اس کو باب فَہُمَ سو کَرُمَ) سے بتاتے ہیں اور بعض کہتے ہیں باب قَالَ (نَصَرَ) سے ہے اور اس کا فعل لازم مستعمل ہے" ۱۵/۴

طُوًى: طُویٰ ہوا دی مقدس کا نام ہے علامہ مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں رقمطراز ہیں:۔

(طُوًی بالضم اور بالکسر یعنی طِوًی اور اس کو تنوین بھی دی جاتی ہے ملک شام میں ایک وادی ہے ارشاد الٰہی اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (تو ہے میدان پاک میں) کی یہی تفسیر کی گئی ہے حمزہ، کسائی، عاصم اور ابن عامر نے اس کی قرأت تنوین کے ساتھ کی ہے۔ صحاح میں ہے کہ طُوًی شام میں ایک جگہ کا نام ہے۔ اسے کسرہ بھی دیا جاتا ہے اور ضمہ بھی اور یہ منصرف بھی پڑھا جاتا ہے اور غیر منصرف بھی جس نے اس کو منصرف کیا ہے اس نے وادی اور مکان کا نام قرار دیا ہے اور اسے

[1] ملاحظہ ہو تفسیر مذکور طبع شدہ برحاشیہ تفسیر ابن جریر طبری۔ ج ۵ ص ۱۹، ۲۰ طبع امیری بولاق مصر۔

[2] بین القوسین متن یعنی قاموس کی عبارت کا ترجمہ ہے۔

Marfat.com

نکرہ بنایا ہے۔ اور جس نے غیر منصرف کیا ہے اس نے اسے شہر اور مقام کا نام قرار دیا ہے اور معرفہ بنایا ہے۔ انتہی۔ زجاج کا بیان ہے کہ طوی میں چار صورتیں ہیں (۱) ضم اول اور منون طُوًی (۲) ضم اول اور غیر منون طُوٰی (۳) کسر اول اور منون طِوًی (۴) کسر اول اور غیر منون طِوٰی پس جس نے تنوین دی وہ اس بنا پر کہ یہ ایک خاص وادی کا نام ہے جو مذکر ہے۔ کیونکہ وہ فُعَلٌ کے وزن پر ہے جیسے کہ حُطَمٌ اور صُرَدٌ ہیں مذکر سے موسوم ہے۔ مبرد سے دریافت کیا گیا تھا کہ وہ وادی جس کو طُویٰ کہا جاتا ہے آیا ہم اس کو منصرف کر سکتے ہیں۔ جواب دیا ہاں کیونکہ دو علتوں میں سے ایک اس میں سے گر چکی ہے۔ اور محکم میں کہ طوی بالضم والکسر شام میں ایک پہاڑ ہے یا طور کی جڑ میں ایک وادی ہے۔ پس جو اس کو غیر منصرف کرتے ہیں وہ دو وجہ سے کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ طاو سے معدول ہے جیسے عمر عامر سے ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ ایک مخصوص مقام کا نام ہے اور جو اس کو ضمہ اور تنوین دیتے ہیں وہ اس کو میدان یا پہاڑ کا ایسا اسم مذکر قرار دیتے ہیں کہ جو مذکر ہی سے موسوم ہے الخ

جو کسرہ اور تنوین دیتے ہیں وہ اسے معی اور ضِلَعٌ کی طرح سمجھتے ہیں۔ نیز صحاح میں ہے کہ بعض علماء کہتے ہیں طُوًی مثل طِوًی ہے جس کے معنی ہیں شئے مثنی کے یعنی وہ چیز جس کو دوبارہ عمل میں لایا جائے۔ یہ لوگ واد المقدس طوی کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں "وہ وادی کہ جس کی دو دفعہ تقدیس کی گئی ہے"

علامہ یاقوت رومی نے بھی معجم البلدان میں طوی پر اسی کے قریب قریب لکھا ہے[1] اور امام ابوبکر محمد بن عزیز سجستانی، نزہۃ القلوب فی تفسیر غریب القرآن میں لکھتے ہیں۔

"جو لوگ اس کو مصدر قرار دیتے ہیں جیسے کہ نادیت طوی (میں نے اس کو دو دفعہ پکارا) وہ بھی اس کو منصرف ہی کرتے ہیں[2]"

امام راغب نے لکھا ہے کہ:

"بعض تو طوی کو اس وادی کا نام بتلاتے ہیں کہ جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حصول نبوت ہوا تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ طوی اس

[1] ملاحظہ ہو معجم البلدان ج ۶ ص ۱۴۱ طبع السعادۃ مصر سنہ ۱۳۲۴

[2] نزہۃ القلوب طبع مصر سنہ ۱۲۹۵ ص ۳۴۴ بر حاشیہ تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنان معروف بہ تفسیر مہائمی۔

Marfat.com

حالت کی جانب اشارہ ہے کہ جو آپ کو لطریق اجتباء حاصل ہوئی تھی۔ گویا آپ کو اپنی مسافت طے کرا دی گئی تھی کہ اگر اپنی ذاتی کوشش سے اس کو حاصل کرنے کی ضرورت پیش آتی تو اس کا حصول لعبید تھا "۱ے

اور علامہ مہائمی نے اپنے خاص متصوفانہ ذوق پر اس کی تفسیر یوں کی ہے۔

| | |
|---|---|
| طوی ای الذی | "طوی" یعنی وہ مقام جہاں |
| طوی فیہ الالتفات | ماسوی کی طرف سے التفات |
| الی ما سواہ فیجب | کو بالکل لپیٹ دیا گیا ہو اور |
| فیہ رعایۃ الادب | جہاں ہر طرح پر ادب |
| من کل وجہ ۱ے | کا ملحوظ رکھنا واجب ہے |

لیکن علامہ محمود آلوسی نے روح المعانی میں صاف تصریح کر دی ہے۔

| | |
|---|---|
| ولا یخفی علیک ان | تمہیں واضح رہے کہ زیادہ |
| الاظہر کونہ اسما | ظاہر یہی ہے کہ یہ سب قرأتوں |
| للوادی فی جمیع | میں وادی ہی کا نام ہے |
| القراءات ۲ے | |

اور علامہ سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن میں فرماتے ہیں:—

"طوی وادی کا نام ہے چنانچہ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور ایک اور سند سے انہی سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ اس وادی کا نام طوی اس لیے پڑا کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو رات میں طے کیا تھا۔ نیز حضرت حسن بصری سے روایت کی ہے کہ طوی فلسطین میں ایک وادی ہے جس کو طوی اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کی تقدیس دوبارہ عمل میں آئی۔ اور بشر بن عبید سے یہ روایت نقل کی ہے کہ طوی ایلہ کی ایک وادی ہے جس کو دو دفعہ برکت سے سرفراز کیا گیا تھا" ۳ے

۱۶/۱۰ ۳۰/۳

**طَوِيْلًا**: لمبا، دراز، طُوْلٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر طِوَالٌ جمع جیسے کہ کَرِیْمٌ اور کِرَامٌ ہیں علامہ احمد فیومی نے مصباح میں اسی طرح ذکر کیا ہے لیکن اصطلاح نحاۃ میں اس کو بجائے اسم فاعل صفت مشبہ کہنا چاہیے۔ تاج العروس میں ہے کہ "نحویوں کا بیان ہے کہ طال کی اصل طَوُلَ ہے

ا ے تفسیر مہائمی ج ۲ ص ۱۵

۲ے روح المعانی ج ۱۶ ص ۱۵۵ طبع منیریہ مصر

۳ے الاتقان ج ۲ ص ۱۴۸ طبع مصر ۱۳۰۶ھ

بروزن کَرُم اور اپنے اس دعوے پر وہ اس کے اسم سے استدلال کرتے ہیں کیوں کہ وہ فَعِیْل کے وزن پر آیا ہے چنانچہ طویل مستعمل ہے اور اسی بنا پر نحوی اس کو شَرُفَ فھو شریف اور کَرُمَ فھو کریم پر حمل کرتے ہیں"۔

۲۹
۲۰/۱۳

# فصل الہاء

**طٰہٰ:** طا، ہا۔ طٰہٰ کی تفسیر میں مفسرین کے دو قول ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ دونوں حروف تہجی میں سے ہیں جو سورتوں کی ابتدا میں آتے ہیں۔ اور حروف مقطعات کہلاتے ہیں حروف مقطعات کے معانی کے متعلق تفصیلی بحث الٓمّٓ میں گزر چکی ہے ملاحظہ فرمائی جاوے مجاہد سے جو دور تابعین کے مشہور مفسر ہیں ایک روایت میں یہی قول مروی ہے اور علامہ محمود آلوسی نے تو روح المعانی میں یہاں تک لکھ دیا ہے۔

بل قیل ھی کذلک عند جمہور المتقنین بلکہ کہا گیا ہے کہ جملہ ماہرین فن کی یہی رائے ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ طٰہٰ ایک بامعنی کلمہ ہے جس کے معنے ہیں اے شخص "سُدی کہتے ہیں اس کے معنی ہیں اے فلاں" اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک جماعت نے اس کے معنے یارجل یعنی اے مرد کے نقل کیے ہیں۔ اور یہی معنی حسن بصری سعید بن جبیر، عطاء اور عکرمہ سے منقول ہیں اور مجاہد سے بھی دوسری روایت میں یہی مروی ہے۔ البتہ ان حضرات میں اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ طٰہٰ کے یہ معنے کس زبان میں آتے ہیں بعض کہتے ہیں نبطی میں اس کے یہی معنی ہیں بعض کہتے ہیں حبشی زبان میں ہیں بعض عبرانی میں بتلاتے ہیں اور بعض سریانی میں اور بعض کا قول ہے کہ یہ قبیلہ عکل کی زبان ہے اور بعض کہتے ہیں کہ قبیلہ عک کی ہے چنانچہ کلبی سے یہی خبر کی تصریح منقول ہے کہ اگر قبیلہ عک میں تم کسی کو یارجل کہو گے تو وہ جواب نہیں دے گا تاآنکہ طاھا کہہ کر اس کو خطاب کرو۔ امام ابن جریر طبری کے نزدیک یہی دوسرے معنے قابل ترجیح ہیں فرماتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| والذی ھو اولی بالصواب | ان اقوال میں میرے نزدیک |
| عندی من الاقوال قول | جو زیادہ قرین صواب ہے وہ اس |
| من قال معناہ یارجل | شخص کا قول ہے جو اس کے معنی |
| لانھا کلمۃ معروفۃ | اے شخص کے بتاتا ہے کیونکہ یہ |

لہ ہر سہ مذکورہ حوالوں کے لیے ملاحظہ ہو روح المعانی ج ۱۶ ص ۱۳۴ طبع منیریہ مصر۔

فی عك فیما بلغنی　کہ مجھے روایت پہنچی ہے کہ قبیلہ
وان معناہ فیہم　عک کا محاورہ ہے جس کے
یارجل۔　معنی ان کے یہاں ہیں
"اے شخص"
امام موصوف نے اس سلسلہ میں دو شعر بطور استشہاد
پیش کیے ہیں متمم بن نویرہ کا شعر ہے۔

ھتفت بطہٰ فی القتال فلم یجب
فخفت علیہ ان یکون موائلا

(میں نے اے شخص کہہ کر اُسے جنگ میں پکارا تو اس
نے جواب نہیں دیا اور مجھے یہ ڈر ہوا کہ کہیں وہ ہاتھ سے
نہ نکل جائے۔)

اور ایک دوسرا شاعر کہتا ہے:۔

ان السفاھۃ طٰہٰ من خلائقکم
لابارك اللہ فی القوم الملاعین

(بلاشبہ اے شخص بے وقوفی تو تمہاری عادات میں
داخل ہے۔ خدا لعنتی لوگوں میں برکت نہ دے)

اس کے بعد امام موصوف نے لکھا ہے کہ جب معنی
جلیا کہ ہم نے ذکر کیا ان لوگوں میں مشہور ہیں تو ضروری
ہے کہ طہٰ کی تاویل میں اس کے مشہور و معروف
معنی ہی کی توجیہ کی جائے خصوصاً جب کہ یہ

توجیہ علماء صحابہ و تابعین کی تفسیر کے موافق ہے[1]

اور علامہ ابن الانباری نے توجیہ بھی تصریح کی ہے کہ

ان لغۃ قریش وافقت　قریش کی زبان بھی طہٰ کے
تلك اللغۃ فی ھذا　استعمال میں اس زبان کے
لان اللہ تعالیٰ لم　موافق ہے کیوں کہ حق تعالیٰ
یخاطب نبیہ صلی　نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
اللہ علیہ وسلم　کو قریش کی زبان کے
بلسان غیر لسان　علاوہ کبھی دوسری زبان
قریش　میں خطاب نہیں فرمایا۔

لیکن یہ واضح رہے کہ آیا قرآن مجید میں قریش
کی زبان کے علاوہ دیگر قبائل عرب کی زبانوں کے الفاظ
بھی پائے جاتے ہیں یا نہیں یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے
علامہ سیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن میں
اس پر تفصیل سے بحث کی ہے اور صحیح یہی ہے
کہ دوسری زبانوں کے الفاظ بھی قرآن مجید میں
موجود ہیں۔

علامہ زمخشری نے یہاں ایک اور قیاس
لگایا ہے، وہ کہتے ہیں کہ شاید قبیلہ عک نے یا ھذا
میں تصرف کر کے طہٰ بنا لیا ہو یا س طور کہ یا کو طا سے
بدل کر طا کہنے لگے، اور ھذا میں اختصار کر کے

[1] تفسیر امام ابن جریر طبری۔ ج ۶ ص ۱۰۳ طبع میریہ بولاق مصر ۱۳۲۸ھ۔

Marfat.com

صرف ھا پر اکتفا کی۔ اور اس طرح یاھذا کی جگہ طٰہٰ استعمال کرنے لگے لیکن علامہ ابوحیان نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ عربی زبان میں یا ندا کو طا سے بدلنے کا کہیں وجود نہیں۔ اور اسی طرح ندا کے وقت اسم اشارہ کو حذف کر کے ہا تنبیہ کو برقرار رکھنے کا ثبوت بھی ندارد ہے، اور نہ کوئی نحوی اس کا قائل ہے۔[1] پ ۱۶/۱

طَهِّرْ: پاک رکھ، تَطْهِیْرٌ سے امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر۔ راغب اصفہانی مفردات میں لکھتے ہیں "ارشاد باری وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ کے بعض نے یہ بھی معنی کیے ہیں کہ اپنے نفس کو معائب سے پاک صاف رکھو۔ اور یہ جو فرمان ہے وَطَهِّرْ بَیْتِیَ اور کہہ دیا ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کو کہ پاک کر رکھو گھر میرا، یہ کعبہ کو بتوں کی گندگی سے پاک رکھنے کی ترغیب ہے اور بعض علماء کا بیان ہے کہ قلب کو اس سکینت کے داخلہ کے لیے پاک رکھنے کی ترغیب دلانا ہے کہ جس کا ذکر آیت شریفہ هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ وہی ہے جس نے اتارا چین دل میں ایمان والوں کے، میں مذکور ہے"

(ملاحظہ ہو تطهیرًا) پ ۲۹/۱۵ ، ۱۱

طَهِّرَا: تم دونوں پاک رکھو، تَطْهِیْرٌ سے امر کا صیغہ تثنیہ مذکر حاضر۔ تاج العروس میں ازہری سے منقول ہے کہ طَهِّرَا بَیْتِیَ کے معنی یہ ہیں کہ معاصی اور ناجائز افعال کے ارتکاب سے میرے گھر کو پاک رکھو۔ پ ۱/۵

طَهَّرَكِ: تجھ کو ستھرا بنایا، تجھ کو پاک کیا۔ طَهَّرَ تَطْهِیْرٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب۔ کِ ضمیر واحد مؤنث حاضر۔ امام ابن جریر طبری نے تصریح کی ہے کہ طَهَّرَكِ کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے دین کو شک اور ان آلودگیوں سے پاک کر دیا کہ جو دیگر بنی آدم کی مستورات کے مذاہب میں پائی جاتی ہیں۔[2] پ ۳/۱۲

طَهُوْرًا: پاک کرنے والا، نہایت پاک پاک کرنا۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں۔ "طہور کبھی تو مصدر ہوتا ہے جیسا کہ سیبویہ نے عرب کا محاورہ تَطَهَّرْتُ طَهُوْرًا نقل کیا ہے اور تَوَضَّأْتُ وَضُوْءًا کہ یہ فَعُوْلٌ کے وزن پر مصدر ہے اور اسی طرح وَقَدْتُ وَقُوْدًا ہے۔ اور کبھی اسم ہوتا ہے مصدر نہیں ہوتا جیسے کہ فَطُوْرٌ فطاری[3] کا نام ہے اور اسی

[1] ملاحظہ ہو روح المعانی ج ۱۶ ص ۱۳۵ طبع منیریہ مصر [2] تفسیر ابن جریر ج ۳ ص ۱۸۰ طبع مصر ۱۳۲۴ھ
[3] وہ چیز جس سے روزہ کھولا جائے۔

Marfat.com

طرح وَجُوْرٌ (وہ دوا جو حلق میں ڈالی جائے)
سَعُوْطٌ (وہ دوا جو ناک میں چڑھائی جائے)
اور ذَرُوْرٌ (وہ دوا جو آنکھ کے اندر یا کسی زخم
پر چھڑکی جائے) ہیں، نیز صفت بھی ہوتا ہے
جیسے کہ ہَصُوْلٌ اور اسی طرح کی اور صفات
ہیں اور اسی معنی میں ارشاد ہے وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ
شَرَابًا طَهُوْرًا (اور ان کو ان کا رب پاکیزہ
شربت پلائے گا) یہ اس امر پر تنبیہ ہے کہ اہل
جنت کی شروبات اہل دوزخ کی شروبات
سے بالکل مختلف ہیں کہ جس کا بیان آیۂ کریمہ وَ
يُسْقٰى مِنْ مَّاءٍ صَدِيْدٍ (اور اس کو پیپ کا
پانی پلایا جاوے گا) میں مذکور ہے۔
آیۂ کریمہ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُوْرًا
(اور ہم نے آسمان سے پانی ستھرائی کرنے
کا) میں امام شافعی رضی اللہ عنہ کے اصحاب طَهُوْرٌ
کو بمعنی مُطَهِّرٌ (پاک کرنے والا) لیتے ہیں
لیکن لفظ کے لحاظ سے یہ معنی صحیح نہیں کیونکہ
فَعُوْلٌ باب اَفْعَلَ (افعال) اور فَعَّلَ (تفعیل)
سے نہیں بنایا جاتا۔ بلکہ فَعُلَ سے بنایا جاتا ہے
اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ لفظ معنی کے لحاظ
سے تطہیر کا متقضی ہے کیونکہ طاہر (پاک) کی دو

قسمیں ہیں ایک وہ جس کی طہارت متعدی نہ ہو
جیسے کپڑے کی طہارت کہ کپڑا خود تو پاک ہے
مگر دوسری شے کو اس کے ذریعہ پاک نہیں کیا جا سکتا
دوسرا وہ کہ جس کی طہارت متعدی ہو اور دوسری
شے کو بھی پاک کر دیتا ہو چنانچہ حق تعالیٰ شانہٗ
نے پانی کو جو طہور سے موصوف فرمایا ہے وہ اس
کی اسی صفت کو بتلانے کے لیے ہے۔"
اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ :-
"ہر وہ پانی کہ جس کو حق تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے
خواہ وہ آسمان سے نازل ہوا ہو یا زمین سے اُبلا
ہوا نیز کسی اور چیز نے مل کر نہ تو اس کا رنگ بدلا
ہو اور نہ اس کے مزہ میں اس سے کوئی تبدیلی
آئی ہو تو ایسا پانی حکم خداوندی کے مطابق طہور
ہے اور ما سوائے اس کے جو اور پانی ہیں جیسے
عرق گلاب یا کسی درخت کے پتوں کا عرق یا
وہ پانی جو انگور کی بیل سے بہتا ہے وہ اگرچہ
طاہر ہے لیکن طہور نہیں[1]

تاج العروس میں ہے۔
"آب طہور (بالفتح) وہ ہے جو حدث[2] کو رفع کر...

---

[1] تاج العروس [2] حدث کہتے ہیں
کسی کو یعنی بے وضو اور بے غسل ہونا۔

نجاست کا ازالہ کرے کیونکہ فعول اوزان مبالغہ میں سے ہے۔ گویا وہ پانی کہ جو طہارت میں انتہا کو پہنچ چکا ہو۔ اور آب طاہر غیر طہور وہ ہے کہ جو نہ حدث کو رفع کرے اور نہ نجاست کو زائل کرے جیسے وہ پانی کہ جو وضو اور غسل میں استعمال کیا جا چکا ہو"

$\frac{19}{3}$ ب $\frac{29}{19}$

# فصل الیاء المثناۃ

طَیّ : لپیٹنا طَوٰی یَطْوِیْ کا مصدر ہے۔ اس کا فعل باب ضرب سے آتا ہے۔ ب ۱۶

طَابَ یَطِیْبُ. پاک، پاکیزہ، ستھرا، حلال۔

طَیِّبًا ۔ صفت مشبہ کا صیغہ واحد مذکر۔ امام راغب فرماتے ہیں:-

"اصل میں طیب وہ چیز ہے کہ جس سے حواس لذت اٹھائیں اور جی مزہ پائے"۔ "طعام طیب" شرع میں وہ ہے جو جائز طور پر جائز مقدار میں جائز مقام سے حاصل کیا گیا ہو۔ کیونکہ جو کھانا ایسا ہوگا وہ اب بھی اور آئندہ بھی "طیب" ہی رہیگا۔ ثقیل اور ردی نہیں ہوگا۔ ورنہ فی الحال اگر طیب بھی ہوا تو آئندہ چل کر مضر ہوگا اور اسی

معنی میں ارشاد ہے کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ (کھاؤ ستھری چیزیں جو دیں ہم نے تم کو) فَکُلُوْا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ حَلٰلًا طَیِّبًا (سو کھاؤ جو روزی دی اللہ نے تم کو حلال اور پاک) لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمْ (مت حرام ٹھہراؤ ستھری چیزیں جو اللہ نے تم کو حلال کیں) کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (کھاؤ ستھری چیزیں اور کام کرو بھلا) اور یہی مراد ہے وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (اور ستھری چیزیں کھانے کی) سے اور آیہ شریفہ اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ (آج حلال ہوئیں تم کو سب ستھری چیزیں) میں بعض نے کہا ہے کہ اس سے ذبائح مراد ہیں اور رَزَقَکُمْ مِنَ الطَّیِّبٰتِ (اور روزی دی تم کو ستھری) مال غنیمت کی طرف اشارہ ہے۔ اور انسانوں میں "طیب" وہ ہے کہ جو جہالت، فسق اور بد اعمالیوں کی نجاست سے پاک ہو اور علم و ایمان اور محاسن اعمال سے آراستہ ہو۔ ارشاد الٰہی اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ طَیِّبِیْنَ (جو لوگ کہ قبض کرتے ہیں ان کو فرشتے اس حالت میں کہ وہ پاکیزہ ہیں) سے یہی لوگ مراد ہیں اور فرمایا طِبْتُمْ فَادْخُلُوْھَا خٰلِدِیْنَ (تم لوگ پاکیزہ ہو

سو داخل ہو اس میں سدا رہنے کو نیز ارشاد ہے
هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً (عطا کر
مجھ کو اپنے پاس سے اولاد پاکیزہ) اور لِيَمِيْزَ
اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ (تا جدا کرے
اللہ ناپاک کو پاک سے)

پ ۴/۹،۱۲ پ ۷/۳ ث ۸/۱۴ پ ۹/۱۸ پ ۱۰/۱۰ پ ۲۲/۱۴ طیبًا ۲/۵ پ ۵/۴
پ ۶/۶ پ ۷/۲ پ ۱۰/۵ ۱۴/۲۱

طَيِّبٰتِ: ستھری چیزیں، نفیس اشیاء، پاک چیزیں، پاکیزہ چیزیں، عمدہ چیزیں طَيِّبَةٌ کی جمع، ارشاد الٰہی وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ (اور ستھری ہیں ستھرو کے لیے) کے متعلق راغب نے لکھا ہے کہ اس بات پر تنبیہ ہے کہ پاکیزہ اعمال پاکیزہ ہی لوگوں سے سرزد ہوتے ہیں چنانچہ مروی ہے کہ المؤمن اطیب من عملہ والکافر اخبث من عملہ (مومن اپنے عمل سے بھی زیادہ پاکیزہ ہے اور کافر اپنے عمل سے بھی زیادہ خبیث ہے)

واضح رہے کہ آیۂ بالا کا نزول واقعۂ افک کے سلسلہ میں ہوا ہے پوری آیت اس طرح ہے۔
اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ج
وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ج
اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ
وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (گندیاں ہیں گندوں کے واسطے اور گندے واسطے گندیوں کے اور ستھریاں ہیں واسطے ستھروں کے اور ستھرے واسطے ستھریوں کے وہ لوگ بے لگاؤ ہیں ان باتوں سے جو کہتے ہیں ان کو بخشنا ہے اور روزی ہے عزت کی) اکثر مفسرین نے آیہ مذکورہ میں "خبیثات" سے بری باتیں اور "طیبات" سے اچھی باتیں مراد لی ہیں مطلب یہ ہے کہ بری باتیں برے آدمیوں کے لیے مناسب ہوتی ہیں اور اچھی باتیں اچھوں کیلئے۔ لہذا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے لیے بری باتیں کیوں کر مناسب ہو سکتی ہیں وہ تو طیبہ ہیں ان کی طرف تو پاکیزہ باتوں ہی کا انتساب ہو سکتا ہے اور مدح و ثنا ہی ان کے حق میں زیب دیتی ہے۔ زجاج کہتے ہیں کہ آیت کے یہ معنی ہیں کہ خبیث باتیں . . . خبیث ہی لوگ زبان سے نکالتے ہیں اور اچھے لوگ اچھی ہی باتیں کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے آیت میں ان لوگوں کی مذمت ہے کہ جنہوں نے قذف کی حرکت ناشائستہ کا ارتکاب کیا تھا۔ اور ان لوگوں کی مدح ہے جنہوں نے حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طہارت بیان کر کے آپ کی براءت کا اظہار کیا تھا۔ ابن زید نے اس کے یہی معنی بیان کیے ہیں جو بیان تفسیر

ترجمہ میں مذکور ہیں اور اسی کو شاہ عبد القادر صاحب اور دیگر مترجمین قرآن نے اختیار فرمایا ہے اور اس صورت میں مطلب صاف ہے کہ حضرت ام المؤمنین صدیقہ رضی اللہ عنہا طیبہ ہیں جن کو حق تعالیٰ شانہ نے اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے منتخب فرمایا تھا[1] یہ بھی واضح ہے کہ پہلے دونوں معنے کے لحاظ سے خبیثین اور طیبین میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی بسبیل تغلیب داخل ہوں گی جس طرح سے کہ اور بیشتر قرآن مجید میں مردوں کا مذکور ہے اور عورتیں بھی اس کی مخاطب ہیں۔ ب ۱/۶ ب ۲/۵ ب ۳/۵ ب ۶/۱۲،۵ ب ۷/۲ ب ۸/۱۱ ب ۹/۱۰،۹،۲

ب ۱۱/۱۵ ب ۱۴/۱۶ ب ۱۵/۷ ب ۱۶/۱۳ ب ۱۸/۹،۴ ب ۲۴/۱۲ ب ۲۵/۱۸

**طَيِّبٰتِكُمْ**: تمہاری لذت کی چیزیں، تمہاری نعمتیں، تمہاری نیکیاں، تمہاری پاکیزہ چیزیں۔ طَيِّبٰتُ معنا کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ ب ۲۶/۲

**طَيِّبُوْنَ**: ستھرے مرد، پاکیزہ لوگ، مردان پاک، طَيِّبٌ کی جمع بحالت رفع ب ۱۸/۹

**طَيِّبَةً**: پاک، پاکیزہ، اچھی، ستھری، نفیس، طاب یطیب سے صفت مشبہ کا صیغہ واحد مؤنث

باب طیبات جمع ب ۲/۱۲ ب ۱۰/۱۵ ب ۱۱/۸ ب ۱۳/۱۶

ب ۱۴/۱۱ ب ۱۸/۱۴ ب ۲۲/۸ ب ۲۸/۱۰

**طَيِّبِيْنَ**: پاکیزہ، ستھرے، پاک مرد طَيِّبٌ کی جمع بحالت نصب وجر ب ۱۴/۱۰ ب ۱۸/۹

**طَيْر**: پرندے، پرندہ۔ علامہ احمد فیومی المصباح المنیر میں رقم طراز ہیں:۔

طائرٌ کی جمع طَيْرٌ ہے جیسے کہ صَاحِبٌ اور صَحْبٌ اور رَاكِبٌ اور رَكْبٌ ہیں اور طَيْرٌ کی جمع طُيُوْرٌ اور اَطْيَارٌ آتی ہے۔ ابو عبیدہ اور قطرب کا بیان ہے کہ لفظ طیر واحد اور جمع دونوں کے لیے آتا ہے۔ اور ابن الانباری نے کہا ہے کہ طیر جمع ہی ہے، اور اس کی تانیث بہ نسبت تذکیر کے زیادہ مستعمل ہے اور واحد کے لیے طَيْرٌ نہیں بلکہ طائر کہا جاتا ہے۔"

واضح رہے کہ آیت شریفہ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ (تو وہ ہو جاتا اڑتا جانور اللہ کے حکم سے) میں طیر کا اطلاق واحد پر ہوا ہے۔ اس لحاظ سے ابو عبیدہ اور قطرب کا بیان صحیح ہے ب ۳/۱۳،۲ ب ۶/۵

ب ۱۲/۱۵ ب ۱۴/۱۶ ب ۱۶/۱۱،۶ ب ۱۸/۱۲ ب ۱۹/۱۶ ب ۲۲/۸ ب ۲۳/۱۱ ب ۲۷/۱۴

ب ۲۹/۲ طَيْرًا ب ۳/۱۲ ب ۵/۵ ب ۳۰/۳۰

**طِيْنٍ**: گارا، مٹی، خاک، مٹی اور پانی دونوں کا آمیزہ "طین" ہے جس کو فارسی میں گِل اور اردو میں

[1] ملاحظہ ہو معالم التنزیل ج ۶ ص ۸۰ و ۸۱ طبع المنار مصر ۱۳۴۷ھ یہ تفسیر ابن کثیر کے ساتھ طبع ہوئی ہے۔

Marfat.com

گارا اور کیچڑ کہتے ہیں۔ اور کبھی پانی کی قوت زائل ہو جانے کے بعد بھی اس کو طین ہی کہتے ہیں جیسے ارشاد ہے مِن طِینٍ لَّازِبٍ ۔ چپکنے گارے

سے) ب ۳/۱۳ ب ۷/۵،۵ ب ۸/۹ ب ۲۰/۷ ب ۲۱/۱۴ ب ۲۳/۵

ب ۲۷/۱ طِینًا ۱۵/۷

# بابُ الظاء المعجمه

## فصل الالف

**ظَالِمٌ:** ظالم، ستمگار، ظلم کرنے والا، نا انصاف ظُلْمٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو ظلم) ۵/۷ پ ۱۵/۱۷ ب ۹/۱ ب ۲۲/۱۶ ب ۲۳/۷

**ظٰلِمُوْنَ:** ظالم لوگ، ظلم کرنے والے ستمگار بے انصاف، ظُلْمٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر ظَالِمٌ کی جمع بحالت رفع ب ۱/۶،۱۱ ب ۲/۱۳ ب ۳/۲ ب ۴/۱،۲،۶

۶/۱۱ ب ۷/۹،۱۱،۱۷ ب ۸/۳ ب ۱۰/۹ ب ۱۲/۱۳ ب ۱۳/۳،۱۰،۱۹ ب ۱۴/۲۱ ب ۱۵/۵،۱۱

۱۶/۵ ب ۱۷/۵ ب ۱۸/۶،۱۲،۱۶ ب ۲۰/۷،۹،۱۴ ب ۲۱/۱،۱۰ ب ۲۲/۱۰،۱۷

ب ۲۵/۲ ب ۲۶/۱۴ ب ۲۸/۸

**ظَالِمَةٌ:** ظلم کرنے والی، نا انصاف، ستمگار۔ ظُلْمٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مونث ۱۲/۹ ب ۱۷/۱۲،۲

**ظَالِمِی:** ظلم کرنے والے، اصل میں ظَالِمِیْنَ تھا اضافت کے سبب نون جمع گر گیا ہے ۵/۱۱ ب ۱۴/۱۰

**ظٰلِمِیْنَ:** ظلم کرنے والے، ستمگار، نا انصاف ظَالِمٌ کی جمع بحالت نصب و جر ب ۱/۶،۱۱

۲/۱،۸،۱۶ ۳/۳،۵،۹،۱۰ ۴/۵،۷،۱۱ ۶/۹،۱۲،۱۳

۷/۲،۱۰،۱۲،۱۳،۱۴ ۸/۲،۴،۸،۹،۱۲ ۹/۸

۱۰/۳،۹،۱۳ ۱۱/۲،۹،۱۲،۱۹ ۱۲/۲،۴،۷ ۱۳/۳،۱۲

۱۴/۵ ۱۵/۹،۱۱،۱۹ ۱۶/۸ ۱۷/۲،۴،۵،۶،۷،۱۲،۲

۱۸/۲،۳،۶ ۱۹/۲،۶،۱۵ ۲۰/۵،۶،۷،۸،۱۲ ۲۲/۱۶ ۲۳/۶،۱۷

۲۵/۴،۵،۶،۱۳،۱۵ ۲۶/۱ ۲۸/۵،۹،۱۱،۲۰

۲۹/۳،۱۰،۲۰

**ظَآنِّیْنَ:** گمان کرنے والے، اٹکل پچانے ... ظَنٌّ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر ظَانٌّ ... بحالت نصب و جر (ملاحظہ ہو ظَنٌّ) ...

**ظَاهِرٌ:** ظاہر، کھلا، آشکارا، ظاہری ... باہر ظُهُوْرٌ سے جس کے معنی ظاہر ہونے بلند ... ہونے اور قابو پانے کے ہیں۔ اسم ... صیغہ واحد مذکر،

Marfat.com

کبھی کبھی "ظاہر" کا استعمال ظاہری اور سرسری کے معنی میں بھی ہوتا ہے جیسے اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ (یا گرتے ہو ظاہری بات پر) اور فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا (سو تو مت جھگڑ ان کی بات میں مگر سرسری جھگڑا)۔

اور الظَّاهِرُ حق تعالیٰ شانہ کے اسماء حسنیٰ میں ہے۔ علامہ مجد الدین ابو السعادات مبارک بن محمد المعروف بابن الاثیر اپنی مشہور کتاب النہایہ فی غریب الحدیث والاثر میں رقم طراز ہیں۔

"اسماء الٰہی میں الظاہر سے وہ ذات عالی مراد ہے جو ہر شے سے اوپر اور ہر چیز پر غالب ہو اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انسان حق تعالیٰ شانہ کے افعال وصفات کے آثار دیکھ کر عقلی استدلال کی راہ سے جس ذات عالی کی معرفت حاصل کرتا ہے وہی الظاہر ہے"۔[1]

اور علامہ نظام الدین حسن بن محمد قمی نیشاپوری لکھتے ہیں:-

الظاہر والباطن کی تعبیر کے متعلق محققین کا بیان ہے کہ حق تعالیٰ شانہ "ظاہر" ہے ان دلائل کی بنا پر جو اس کے وجود پر دلالت کرتے ہیں اور باطن ہے اس بنا پر کہ وہ دنیا میں یا دنیا و آخرت دونوں میں حواس و عقول کی دسترس سے بالاتر ہے اور بعض نے ظاہر کے معنی غالب کے اور باطن کے معنی پوشیدہ کو جاننے والے کے دیئے ہیں۔ لیث نے کہا ہے کہ انت ابطن هذا الامر کے معنی آتے ہیں تو اس امر سے زیادہ خبردار ہے"۔[2]

اور امام بخاری اس کی تفسیر میں یحییٰ سے ناقل ہیں:-

الظاهر علی کل شیئ علما۔ ہر شے پر اس کا ظہور علم کے اعتبار سے ہے۔

یعنی ہر ظاہر شے کا وہ عالم ہے۔ حافظ مزی نے تصریح کی کہ یہ یحییٰ وہی ابن زیاد فراء ہیں جن کی کتاب معانی القرآن سے موسوم ہے۔[3] لغت کے دوسرے مشہور امام ازہری بھی یہی کہتے ہیں کہ الظاہر والباطن کا استعمال کبھی عالم ظاہر و باطن کے معنی میں بھی ہوتا ہے۔[4]

حجۃ الاسلام غزالی فرماتے ہیں:-

الظاہر اور الباطن یہ دونوں اضافی وصف ہیں کوئی شے کسی شے کے لیے ایک ہی حیثیت سے ظاہر و باطن نہیں ہو سکتی بلکہ ایک

[1] النہایہ ج ۳ ص ۵۰ طبع عثمانیہ مصر ۱۳۱۱ھ

[2] غرائب القرآن ورغائب الفرقان معروف بہ تفسیر نیشاپوری ج ۲۷ ص ۱۳۶ برحاشیہ تفسیر ابن جریر طبع امیریہ مصر ۱۳۲۹ھ [3] تفسیر ابن کثیر ج ۸ ص ۱۰ طبع المنار ۱۳۴۷ھ اسی کے ساتھ معالم التنزیل بھی طبع ہوئی ہے [4] روح المعانی ج ۲۷ ص ۱۴۳۔

کے لحاظ سے ایک وجہ سے ظاہر ہوگی اور دوسری وجہ سے باطن کیونکہ ظہور اور بطون ادراکات کے لحاظ سے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی اگر حواس کے ادراک اور خزانۂ خیال سے جستجو کی جائے تو وہ "باطن" ہے اور جو خزانۂ عقل سے استدلال کے ذریعہ اسے طلب کیا جائے تو وہ "ظاہر" ہے اور (منکروں کو وجود باری میں جو شک ہے وہ شدتِ ظہور کی بنا پر ہے[1]۔

اور آیہ شریفہ یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (جانتے ہیں ظاہر کو زندگانی دنیا سے) کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ صرف امورِ دنیوی کو جانتے ہیں اور علومِ اُخروی کا علم نہیں رکھتے اور علم ظاہر و باطن سے کبھی تو کھلے اور چھپے علوم مراد ہوتے ہیں۔ اور کبھی دنیوی اور اخروی علوم۔ ١/٨ ١١/١٣ ١٧/٢٧ ظَاهِرًا ١٥/١٥ ٦/٢١

**ظَاهَرُوْا**: انہوں نے مدد کی۔ انہوں نے معاونت کی، مُظَاهَرَةٌ سے جس کے معنی باہمی ایک دوسرے کی پشتیبانی کرنے اور معاونت کرنے کے ہیں ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب۔ ٨/٢٨

**ظَاهَرُوْهُمْ**: انہوں نے ان کی مدد کی انہوں نے ان کی پشتیبانی کی۔ ظَاهَرُوْا ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ١٩/٢١

**ظَاهِرَةً**: ظاہری، کھلی، آشکارا ظُهُوْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث اور آیہ کریمہ وَاَسْبَغَ عَلَیْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (اور پورا کیا تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتوں کو) میں "نعم ظاہرہ" سے وہ نعمتیں مراد ہیں جن سے ہم واقف ہیں۔ اور "نعم باطنہ" سے وہ نعمتیں مراد ہیں جن کی معرفت ہم کو حاصل نہیں ١٢/٢١ ٨/٢٢

**ظَاهِرُهٗ**: اس کا ظاہر، اس کا باہر ظَاهِرٌ مضاف، هٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ ١٨/٢٧

**ظَاهِرِیْنَ**: غالب، غلبہ پانیوالے ظُهُوْرٌ سے یعنی اوپر ہونے اور غلبہ پانے کے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر ظَاهِرٌ کی جمع بحالت نصب و جر ٩/٢٤ ١٠/٢٨

## فصل العین

**ظَعْنِكُمْ**: تمہارا سفر، تمہارا کوچ، تمہارا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا۔ ظَعْنٌ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر

[1] روح المعانی، ج ۲۷، ص ۱۲۴۔ طبع منیریہ مصر۔

Marfat.com

مضاف الیہ "ظَعْنٌ" مصدر ہے۔ اس کے معنے ہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا۔ اس کا فعل باب فَتَحَ سے آتا ہے ۱۶/۱۴

## فصل الفاء

**ظُفُرٍ**: ناخن۔ امام راغب نے تصریح کی ہے کہ "ظفر" کا استعمال انسان اور غیر انسان دونوں کے لیے ہوتا ہے۔ اَظْفَار جمع ہے۔ ۶

## فصل اللام

**ظَلَّ**: ہو گیا، رہا (فَتَحَ، سَمِعَ) ظَلٌّ اور ظُلُولٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب "ظل" اور "ظلول" کے معنی دن میں کسی کام کو انجام دینے کے ہیں۔ واضح رہے کہ جس طرح بَاتَ یَبِیْتُ کا استعمال رات گزارنے کے لیے ہوتا ہے اسی طرح ظل یظل کا استعمال دن گزارنے کے لیے ہوتا ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ جو چیز دن میں کی جائے اس کی تعبیر ظَلَّ سے کی جاتی ہے نیز صار کی جگہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ علامہ شہاب خفاجی شرح شفاء میں لکھتے ہیں۔

"یہ فعل ناقص ہے اور جیسا کہ رضی نے کہا ہے خبر کو دن بھر کے لیے ثابت کرتا ہے کیونکہ یہ ایسے وقت کو بتاتا ہے کہ جس میں سورج کا سایہ موجود ہو از صبح تا شام یا از طلوع تا غروب۔ اور جب بمعنی صار ہوتا ہے تو پھر دن کی تخصیص نہیں رہتی۔ اور اسی طرح جب یہ تامہ ہوتا ہے تو دوام کے معنی دیتا ہے" [1]

واضح رہے کہ یہاں یہ فعل ناقص ہے بمعنی صار اور زمانہ سے مقید نہیں ہے ۱۴/۱۲ ۲۵/۸

**ظِلٌّ**: سایہ، پرچھائیں، چھاؤں۔ امام راغب لکھتے ہیں:۔

ظِلٌّ، ضِحٌّ (دھوپ) کی ضد ہے۔ یہ فَیْءٌ سے زیادہ عام ہے کیونکہ ظلّ اللیل اور ظِلّ الجنۃ بولا جاتا ہے۔ (مگر فیء اللیل اور فیء الجنۃ نہیں بولا جاتا) نیز ہر اس جگہ کو کہ جہاں دھوپ نہ پہنچی ہو ظِلٌّ بولتے ہیں۔ مگر فیٔ صرف اسی جگہ کو کہتے ہیں کہ جہاں سے دھوپ جا چکی ہو۔ اور کبھی عزت و شوکت نیز رفاہیت کو بھی ظلّ سے تعبیر کرتے ہیں . . . اور بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ پرچھائیں کو بھی کہا جاتا ہے . . . اور کبھی ہر اس شے کو جو

[1] تاج العروس شرح قاموس۔

ڈھانپنے والی ہو ظِلٌّ کہہ دیتے ہیں خواہ وہ شے اچھی ہو یا بُری چنانچہ اچھی شے کی مثال ہے وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ (اور نہ سایہ اور نہ لو) اور وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلَالُهَا (اور جھک رہی ہیں ان پر اس کی چھاؤں) اور بُری شے کے بارے میں ارشاد ہے وَظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ (اور چھاؤں میں دھوئیں کی) اور آیہ شریفہ اِلٰى ظِلٍّ ذِىْ ثَلٰثِ شُعَبٍ (ایک سائبان کی طرف جس کی تین شاخیں ہیں) میں ظِلٌّ بمعنی ظُلَّةٌ یعنی سائبان ہے۔ کیونکہ دوسری جگہ ارشاد ہے ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ سائبان ہوں گے آگ کے۔"

اور علامہ احمد بن محمد فیومی المصباح المنیر میں رقمطراز ہیں "ابن قتیبہ کا بیان ہے کہ لوگ ظل اور فیٔ کو ایک خیال کرتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ ظل صبح اور شام ہوتا ہے اور فیٔ صرف زوال کے بعد چنانچہ سایہ قبل زوال کو فیٔ نہیں کہا جائے گا۔ اور سایہ بعد زوال جو فَے سے موسوم ہے وہ اس لیے کہ وہ مغرب کی سمت سے مشرق کی طرف لوٹ کر آیا ہے اور فیٔ کے معنی رجوع یعنی لوٹنے کے ہیں۔

اور ابن السکیت کہتے ہیں کہ ظل طلوع سے لے کر زوال تک ہوتا ہے۔ اور زوال سے لے کر غروب تک۔ اور ثعلب کا قول ہے کہ ظل صبح کے اوقات میں درخت وغیرہ کا ہوتا ہے اور فیٔ شام کے اوقات میں۔ اور رؤبہ بن العجاج کا بیان ہے کہ جب کسی چیز پر دھوپ آکر وصل جاتے وہ ظل بھی ہے اور فیٔ بھی۔ اور جہاں سرے سے دھوپ ہی نہ ہو تو وہ ظل ہی ہے۔ اور اسی لیے کہا گیا ہے کہ الشمس تنسخ الظل والفیٔ تنسخ الشمس (دھوپ ظل کو مٹا دیتی ہے اور فیٔ دھوپ کو) کی جمع ظِلَالٌ، اَظِلَّةٌ اور ظُلَلٌ ہے۔ اور انا فی ظل فلان کے معنی ہیں میں فلاں کے زیر سایہ ہوں اور ظل اللیل کے معنی رات کے اندھیرے کے ہیں کیونکہ وہ نگاہوں کو نفوذ کرنے سے روک دیتا ہے"

غرض اکثر اہل لغت کی تصریح کے مطابق ظل غربی سایہ ہے اور فیٔ شرقی سایہ۔ نیز یہ بھی واضح رہے کہ جو ظل بمعنی سائبان ہے وہ اظلال کا اسم ہے اِظلالٌ کے معنے ہیں ڈھانپنے کے چونکہ سائبان اپنے زیر سایہ اشیاء کو ڈھانپ لیتا ہے اس

...ظل بھی کہہ دیتے ہیں پ ١٩/٣ پ ٢٠/٦ پ ٢٢/١٥ پ ٢٧/١٤، ١٥

٢٩/٢١ ظِلًّا ٥/٥

ظِلٰلٍ : سایے ظِلٌّ کی جمع۔ راغب نے لکھا ہے کہ

...ان المتقین فِی ظِلٰلٍ (جو ڈر والے ہیں وہ

...سایوں میں ہیں) میں ظلال کے معنی عزت و کثرت

...کے ہیں اسی طرح وَاَزْوَاجُهُمْ فِي ظِلٰلٍ

...میں بھی یہی مراد ہے پ ٢٣/٣ ٢٩/٢٢ ظِلٰلًا ١٤/١٠

ظِلٰلُهٗ : اس کے سایے ظِلٰلٌ مضاف ہ ضمیر

...واحد مذکر غائب مضاف الیہ ١٤/١٢

ظِلٰلُهَا : اس کے سایے ظِلٰلٌ مضاف هَا

...ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ ٢٩/١٩

ظِلٰلُهُمْ : ان کے سایے ان کی پرچھائیاں

ظِلٰلٌ مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ

...امام راغب اصفہانی نے زیر آیہ شریفہ وَلِلّٰهِ

يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا

وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ (اور اللہ کو سجدہ

...کرتی ہے آسمان و زمین میں خوشی سے اور زور سے

...اور ان کی پرچھائیاں صبح اور شام) حضرت حسن بصری

...سے ایک عجیب سا نقرہ نقل کیا ہے فرماتے ہیں

...اما ظِلُّكَ فیسجد للہ واما انت فتکفر

...(اے انسان تیرا سایہ تو اللہ کے حضور

سجدہ ریز ہو اور تو مبتلا کفر ہو۔

اور شاہ عبد القادر صاحب اسی آیت کے

تحت موضح القرآن میں فرماتے ہیں۔

"جو اللہ پر یقین لایا خوشی سے رکھتا ہے اس کے

حکم پر اور جو نہ یقین لایا آخر اس پر بھی اسی کا

حکم جاری ہے اور پرچھائیاں صبح و شام زمین

پر پڑ جاتی ہیں یہی ہے ان کا سجدہ" ١٣/٨

ظَلَّامٌ : ظلم کرنے والا ظُلْمٌ سے مبالغہ کا

صیغہ ہے۔ واضح رہے کہ آیت شریفہ وَاَنَّ اللّٰهَ

لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (اور اللہ ظلم نہیں کرتا بندوں پر الخ)

اسی طرح دیگر آیات میں کہ جہاں حق تعالیٰ شانہ کی

ذات عالی سے نفی ظلم کے سلسلہ میں مبالغہ کا صیغہ

استعمال ہوا ہے اور ظلام کا اطلاق کیا گیا تو ظلام

میں مبالغہ کیت کے اعتبار سے ہے نہ کیفیت کے

لحاظ سے یعنی ذرا سا بھی ظلم نہیں کرتا یہ مطلب نہیں کہ

زیادہ ظلم نہیں کرتا اور تھوڑا کرتا ہے۔ نیز یہ بھی خیال

رہے کہ ظلام نسبت کے اعتبار سے عطار کی

طرح ہے یعنی جس طرح عطر کی نسبت سے عطار بولتے

ہیں اسی طرح ظلم کی نسبت سے ظلام تو

معنی یہ ہوئے کہ اس کی

طرف ظلم کی نسبت سرے سے

Marfat.com

ہو ہی نہیں سکتی۔

شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی۔ موضح القرآن میں زیر آیۂ کریمہ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا فرماتے ہیں۔

"رب جو کرے ظلم نہیں سب اسی کا مال ہے پر ظاہر میں جو ظلم نظر آوے وہ بھی نہیں کرتا بے گناہ دوزخ میں نہیں ڈالتا۔ اور نیکی ضائع نہیں کرتا۔

جو کوئی کہے گناہ میں ہمارا کیا اختیار، سو بات نہیں اپنے دل سے پوچھ لے جب گناہ پر دوڑتا ہے اپنے قصد سے دوڑتا ہے اور جو کوئی کہے قصد بھی اسی نے دیا سو قصد دونوں طرف لگ سکتا ہے اور جو کوئی کہے اسی نے ایک طرف لگا دیا سو بندے کی دریافت سے باہر ہے۔ بندے سے معاملت ہے اس کی سمجھ پر۔ بندہ بھی کرے گا اسی کو جو اس سے بدی کرے نہ کہیگا کہ اس کا کیا قصور اللہ نے کروایا" [1]

$\frac{۴}{۱۰}$ $\frac{۱۰}{۳}$ $\frac{۱۴}{۸}$ $\frac{۲۴}{۲۰}$ $\frac{۲۶}{۱۶}$

**ظَلْتَ** : تو سارے دن لگا۔ تو ہو گیا، تو برابر لگا رہا۔ ظَلٌّ، ظَلُوْلٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر۔ واضح رہے کہ یہاں دوام کے معنی مراد ہیں اور ظَلْتَ بمعنی دُمْتَ ہے ظَلْتَ اصل میں ظَلِلْتَ تھا چونکہ دو لاموں کا ایک ساتھ جمع ہونا ثقیل تھا اور پھر کسرہ میں اور بھی ثقل تھا۔ لہٰذا لام اولیٰ کو حذف کر دیا گیا اور ظا اپنے فتح پر باقی رہا۔

علامہ ابو حیان نے سیبویہ سے نقل کیا ہے کہ یہ حذف شذوذ قیاس میں داخل ہے اور صرف اسی وقت ہوتا ہے جبکہ آخر فعل ساکن ہو اور ان ہی کے بعض معاصرین کا یہ بیان ہے کہ لغت بنی سلیم میں ہر مضاعف العین و اللام میں جبکہ آخر فعل ساکن ہو یہی قاعدہ ہے اور بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ مضاعف کا جب عین کلمہ مکسور یا مضموم ہو تو پھر قیاس یہی ہے [2]

(ملاحظہ ہو ظَلَّ $\frac{۱۶}{۱۴}$)

**ظَلَّتْ** : وہ ہو گئی، وہ رہ گئی ظَلٌّ ظَلُوْلٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب یہاں بھی دوام کے معنی مراد ہیں (ملاحظہ ہو ظَلَّ اور دُمْتَ $\frac{۱۹}{۵}$)

**ظَلْتُمْ** : تم سارے دن ہو ظَلٌّ اور ظُلُوْلٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر ظَلْتُمْ اصل میں ظَلِلْتُمْ تھا کسر لام۔ لام اول کو جیسا ظَلْتَ

---

[1] موضح القرآن سورہ کہف [2] روح المعانی ج ۱۶ ص ۲۴۲ طبع منیریہ مصر۔

میں گزرا تخفیف کے لیے حذف کر دیا گیا ہے۔ ۲۶/۱۵

**ظُلَلٌ** : سائبان، بدلیاں۔ ظُلَّۃٌ کی جمع ہے جیسے غُرْفَۃٌ کی جمع غُرَفٌ اور قُرْبَۃٌ کی جمع قُرَبٌ ہے۔ امام راغب لکھتے ہیں کہ ارشاد باری اَنْ یَّاْتِیَھُمُ اللّٰہُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ (یہ کہ آوے اللہ ان پر ابر کے سائبانوں میں) میں مراد یہی کہ عذاب الٰہی ان کو آ گھیرے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ظُلَّۃٌ)

۱/۹ ، ۲۱/۱۲ ، ۲۲/۱۶

**ظَلَّلْنَا** : ہم نے سایہ کیا۔ ہم نے سائبان کیا۔ ہم نے سایہ فگن کر دیا۔ تَظْلِیْلٌ سے جس کے معنے سایہ میں کر دینے اور سایہ دار کرنے کے ہیں ماضی کا صیغہ جمع متکلم۔ آیہ شریفہ وَظَلَّلْنَا عَلَیْکُمُ الْغَمَامَ (اور سایہ کیا ہم نے تم پر ابر کا) میں حق تعالے شانہ کی اس مستقل نعمت کا ذکر ہے کہ جب بیابان تیہ میں بنی اسرائیل سرگرداں رہے تو قدرت الٰہی سے بادل ان کے لیے مسخر کر دیا گیا تھا جو ان کے سر پر سایہ فگن رہتا اور دن کو دھوپ سے بچاتا تھا اور پھر یہ کیفیت ارض مقدس میں داخلہ تک برابر قائم رہی۔

۱/۶ ، ۹/۱۰

**ظُلْمٌ** : ظلم، ستم، بے انصافی، زبردستی، ستمگاری، شرک، گناہ، تقصیر۔ ظلم کے اصل معنی ہیں غیر کی ملک میں تصرف کرنا۔ اور حد سے گزر جانا۔ اسی لیے علماء نے تصریح کی ہے کہ ظلم کا صدور ذات باری تعالٰے سے محال ہے کیونکہ عالم تمام تر اسی وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ملکیت ہے لہٰذا وہ اپنی ملک میں جو کچھ بھی کرے بجا ہی بجا ہے۔ امام راغب اصفہانی رقم طراز ہیں:-

"اہل لغت اور بہت سے علماء کے نزدیک ظلم کہتے ہیں کسی شے کو اس کی مخصوص جگہ سے ہٹا کر نقصان کے ساتھ یا زیادتی کے ساتھ یا وقت بدل کر یا جگہ بدل کر بے جگہ رکھ دینے کو۔ اسی سے عربی کا محاورہ ہے ظَلَمْتُ السِّقَاءَ (یعنی میں نے مشکیزہ کے دودھ کا بے وقت استعمال کیا) اور یہ استعمال شدہ دودھ ظلیم کہلاتا ہے اسی طرح ظلمت الارض کے معنی ہیں

---

عہ سقاء اس مشکیزہ کو کہتے ہیں کہ جس میں پانی اور دودھ وغیرہ رکھتے ہیں جب مشکیزہ میں دودھ کو دہی جمانے اور مکھن نکالنے کی غرض سے رکھا جاتا ہے۔ اور دودھ کو جمنے سے پہلے استعمال کر لیا جاتا ہے تو ایسے موقع پر یہ محاورہ بولتے ہیں۔

Marfat.com

میں نے زمین کو ایسی جگہ سے کھودا کہ جہاں کھودنے کی جگہ نہ تھی اور وہ جگہ ارض مظلوم کہلاتی ہے اور جو مٹی اس زمین سے نکلتی ہے وہ بھی ظلیم کہلاتی ہے۔

اور ظلم کا استعمال حق سے کہ جو نقطہ دائرہ کا حکم رکھتا ہے۔ تجاوز کرنے کے لیے ہوتا ہے اور خواہ تجاوز کثیر ہو یا قلیل دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبیرہ گناہ ہو یا صغیرہ دونوں کے لیے اس کا استعمال ہوتا ہے چنانچہ حضرت آدم علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی اپنی تقصیر پر ظالم کہا گیا ہے اور ابلیس لعین کے حق میں بھی ظالم ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے حالانکہ دونوں کے ظلموں میں بون بعید ہے۔

اور بعض حکماء نے کہا ہے کہ ظلم تین طرح کا ہوتا ہے اول ظلم وہ جو انسان سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑا ظلم کفر و شرک اور نفاق ہے اسی لیے ارشاد ہے اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (بے شک شرک کرنا بڑا بھاری ظلم ہے) اور اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (سن رکھو کہ بے انصاف لوگوں پر اللہ کی لعنت ہے) اور وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (اور ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے) وغیرہ بہت سی آیات میں ظلم سے یہی ظلم مراد ہے نیز ارشاد ہے فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (اور اس سے زیادہ ظالم کون جو جھوٹ باندھے اللہ پر)۔

دوسرا وہ ظلم جو انسان سے دوسرے لوگوں کے بارے میں ہوتا ہے چنانچہ ارشاد باری وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (اور برائی کا بدلہ برائی ہے ویسی ہی پھر جو کوئی معاف کر دے اور سنوارے تو اس کا ثواب ہے اللہ کے ذمے، واقعی اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا) میں اسی ظلم کا بیان مقصود ہے نیز اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ (الزام تو ان پر ہے جو ظلم کرتے ہیں لوگوں پر) اور وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا (جو مارا گیا ہو ظلم سے) میں بھی یہی ظلم مراد ہے۔

تیسرا ظلم وہ ہے جو انسان سے اپنے نفس کے بارے میں سرزد ہوتا ہے چنانچہ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ

لِنَفْسِہٖ (پھر کوئی ان میں سے ظلم کرتا ہے اپنی جان پر) اور ظَلَمْتُ نَفْسِیْ (میں نے اپنی جان پر ظلم کیا) اور اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَہُمْ (جس وقت کہ ظلم کیا تھا ان لوگوں نے اپنی جانوں پر) یہاں بھی ظلم مراد ہے اور فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ کے معنی یہ ہیں کہ تم بھی ان لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جو اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں اور فرمایا وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَہٗ (اور جس نے ایسا کیا اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا)

درحقیقت یہ تینوں ظلم نفس پر ہی ظلم ہیں کیونکہ جب انسان ظلم میں پہل کرتا ہے تو پہلے اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے۔ لہٰذا ظالم کے ظلم کی ابتداء ہمیشہ اپنے آپ سے ہوا کرتی ہے۔ اسی بنا پر حق تعالیٰ نے جگہ جگہ فرمایا ہے وَمَا ظَلَمَہُمُ اللّٰہُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَہُمْ يَظْلِمُوْنَ (اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں) اور وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَہُمْ يَظْلِمُوْنَ (اور انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہیں کیا لیکن اپنا ہی نقصان کرتے رہے)۔

اور ارشادِ الٰہی وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَہُمْ بِظُلْمٍ (اور انہوں نے اپنے ایمان کو شرک کے ساتھ مخلوط نہیں کیا) کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے۔ جس پر یہ چیز دلالت کرتی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پر شاق ہوا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو نہیں دیکھتے اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (بلاشبہ شرک کرنا بڑا ظلم ہے)[1]

[1] صحیح بخاری کتاب التفسیر سورۂ لقمان میں یہ واقعہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زبانی اس طرح منقول ہے کہ جب آیہ کریمہ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَہُمْ بِظُلْمٍ نازل ہوئی تو یہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر شاق گزرا کہنے لگے ہم میں کون ہے جس کا ایمان ظلم سے آلودہ نہ ہوا ہو تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ مطلب نہیں۔ تم نے سنا نہیں لقمان نے اپنے بیٹے کو کیا کہا ہے اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (جلد ثانی ص ۷۰۴) مطلب صاف ہے کہ اگلی آیت کے نزول پر صحابہ کو یہ فکر دامن گیر تھا کہ ہم میں ایسا کون ہے جس سے نجات ایسا کوئی ذرہ بھی تقصیر ہرگز نہ ہوا ہو کیونکہ معصیت تو صفت بشریت ہے لہٰذا جس کا ایمان ایسا ہی بعد ہدایت کا رہ و جائے نعوذ باللہ ہم محروم نہ ہو جائیں تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی (باقی بر صفحہ ۱۲۶)

Marfat.com

اور یہ جو ارشاد ہے وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا اور نہ گھٹایا اس میں سے کچھ، یہاں ظلم کے معنی نقصان کے ہیں اور لَمْ تَظْلِمْ بمعنی لَمْ تَنْقُص ہے اس آیۂ شریفہ وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اور اگر گنہگاروں کے پاس ہو جتنا کچھ کہ زمین میں ہے سارا اور اتنا ہی اور اس کے ساتھ سب دے ڈالیں اپنے چھڑوانے میں بری طرح کی مار سے دن قیامت کے۔ ظلم کی تینوں قسموں کو عام ہے کیونکہ کوئی ایسا شخص نہیں کہ جس سے دنیا میں ذرا سا بھی ظلم سرزد ہوا ہو اور اس کو (روز قیامت) جو کچھ زمین میں ہے سارا اور اتنا ہی اور اس کے ساتھ مل جائے اور وہ اپنے چھڑوانے میں سب کا سب نہ دے ڈالے۔

یہ بھی واضح رہے کہ ظُلْمٌ بالضم اسم ہے جو مصدر کا قائم مقام ہو گیا ہے پ ۶/۱۵۲، پ ۸/۳، پ ۱۲/۱۰، پ ۱۶/۱۰، پ ۲۱/۱۱، پ ۲۴/۷ ظُلْمًا پ ۴/۱۲،۲، پ ۵/۲، پ ۱۱/۱۵، پ ۱۸/۱۶، پ ۱۹/۱۶، پ ۲۴/۹۔

**ظَلَمَ**: اس نے ظلم کیا۔ اس نے ستم کیا اس نے برا کیا اس نے نقصان کیا اس نے بے انصافی کی اس نے زیادتی کی (ضرب) ظَلْمٌ (بالفتح) سے جس کے معنی ظلم کرنے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب پ ۲/۱۲، پ ۱۶/۲، پ ۱۹/۱۶، پ ۲۵/۱۰

**ظُلِمَ**: وہ مظلوم ہوا۔ اس پر ظلم کیا گیا ظُلْمٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب پ ۶/۱

**ظُلُمٰتٍ**: تاریکیاں۔ اندھیرے ظُلُمٰتٌ جمع ہے ظُلْمَةٌ کی ظلمت کہتے ہیں روشنی کے نہ ہونے کو۔ امام راغب فرماتے ہیں:-
کبھی کبھی جہالت، شرک اور فسق کو ظلمت سے تعبیر کیا جاتا ہے جس طرح سے کہ ان کے اضداد (علم، ایمان، اور عمل صالح) کو نور سے تعبیر کرتے ہیں، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (نکالتا ہے ان کو اندھیروں سے اُجالے میں) اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (کہ نکال اپنی قوم کو اندھیروں سے اُجالے میں) فَنَادٰى فِي

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۶) غلط فہمی دور کرنا پڑی کہ یہاں ظلم سے تقصیر اور گناہ نہیں بلکہ شرک مراد ہے اور اپنے اس استشہاد میں سورۂ لقمان کی آیہ مذکور بالا کو پیش فرما کر ان کی تسلی فرما دی۔

الظُّلُمٰتِ (پھر بکارا ان اندھیروں میں) اور کَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ (برابر اس کے کہ جس کا حال یہ کہ اندھیروں میں پڑا) کَمَنْ هُوَ اَعْمٰى (برابر ہوگا اس کے جو اندھا ہے) کے ہم معنی ہے۔ اور سورۂ انعام میں جو ارشاد ہوا ہے، وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ (اور جو جھٹلاتے ہیں ہماری آیتیں بہرے اور گونگے ہیں۔ اندھیروں میں) تو یہاں الظلمت کا استعمال ٹھیک اسی موقع پر ہوا ہے جہاں کہ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ (بہرے ہیں گونگے اندھے ہیں) عُمْيٌ کا اور فِي ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ (تین اندھیروں میں) سے مراد پیٹ، رحم اور بچہ دانی ہے۔

پ ۱/۲ پ ۳/۲ پ ۶/۷ پ ۷/(۷، ۱۰، ۱۳، ۱۴، ۱۸) پ ۸/۲ پ ۱۳/(۸، ۱۳) پ ۱۶/۱۶
پ ۱۸/۱۱ پ ۲۰/۱ پ ۲۲/(۳، ۱۵) پ ۲۳/۱۵ پ ۲۷/۱۶ پ ۲۸/۱۸

ظَلَمَتْ: اس نے ظلم کیا۔ ظَلْمٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب پ ۱۱/۱۱

ظَلَمْتُ: میں نے ظلم کیا۔ میں نے بُرا کیا۔ میں نے قصور کیا۔ ظَلْمٌ سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم پ ۱۹/۱۸ پ ۲۰/۵

ظَلَمْتُمْ: تم نے ظلم کیا۔ تم نے نقصان کیا۔ تم نے ستم کیا۔ ظَلْمٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر

پ ۱/۶ پ ۲۵/۱۰

ظَلَمَكَ: اس نے تیرے ساتھ بے انصافی کی۔ اس نے تجھ پر ظلم کیا۔ ظَلَمَ ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب اور كَ ضمیر واحد مذکر حاضر پ ۲۳/۱۱

ظَلَمْنَا: ہم نے ظلم کیا۔ ہم نے نقصان کیا ہم نے خراب کیا۔ ظَلْمٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم پ ۸/۹

ظَلَمْنٰهُمْ: ہم نے ان پر ظلم کیا۔ ہم نے ان پر زیادتی کی۔ ظَلَمْنَا صیغہ جمع متکلم ماضی هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب پ ۱۲/۹ پ ۱۴/۲۱ پ ۲۵/۱۳

ظَلَمُوْا: انہوں نے ظلم کیا۔ انہوں نے بے انصافی کی۔ انہوں نے ظلم کیا۔ ظَلْمٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب۔ یہاں "ظلم" سے مراد اکثر جگہ کفر و شرک و نفاق ہے۔ پ ۱/۶ پ ۲/(۲، ۴) پ ۴/(۳، ۵)

انہوں نے زیادتی کی

پ ۵/۶ پ ۶/۳ پ ۷/۱۱ پ ۹/(۳، ۱۰، ۱۱، ۱۶) پ ۱۱/(۷، ۱۰) پ ۱۲/(۴، ۶، ۸)
پ ۱۲/(۹، ۱۰) پ ۱۳/۱۹ پ ۱۴/۱۸ پ ۱۵/(۶، ۲۰) پ ۱۷/۱ پ ۱۸/۲ پ ۱۹/۱۳
پ ۲۰/۳ پ ۲۱/(۱، ۷، ۹) پ ۲۲/(۸، ۱۱) پ ۲۳/۶ پ ۲۴/۲ پ ۲۵/۱۲ پ ۲۶/۲
پ ۲۷/(۲، ۴) -

ظُلِمُوْا: وہ ستائے گئے۔ ان پر ظلم کیا گیا۔ ظَلْمٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر غائب پ ۱۴/۱۲

پ ۱۷/۱۳ پ ۱۹/۱۵

Marfat.com

**ظَلَمُوْنَا**: انہوں نے ہمارا نقصان کیا، انہوں نے ہم پر ظلم کیا۔ ظَلَمُوْا ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب نا ضمیر جمع متکلم پ ۱/۶ ب ۹/۱۰

**ظُلْمِہٖ**: اس کا ظلم، اس کی تقصیر، اس کی زیادتی، اس کا مظلوم ہونا۔ ظُلْمِ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، واضح رہے کہ آیہ شریفہ فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِہٖ میں جس نے توبہ کی اپنی تقصیر کے پیچھے یعنی ظلم کرنا۔ اور لَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِہٖ (جو کوئی بدلا لے اپنے ظلم پر) میں مظلوم ہونا مراد ہے، ب ۶/۱۰ ۲۵/۲

**ظَلَمَہُمْ**: اس نے ان پر ظلم کیا۔ ظَلَمَ ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ہُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ۴/۲ ۱۴/۱۰

**ظُلْمِہِمْ**: ان کا ظلم، ان کی گنہگاری، ان کی بے انصافی۔ ظُلْمِ مضاف، ہِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ ۶/۲ ۱۳/۷ ۱۴/۱۴

**ظَلُّوْا**: وہ سارے دن رہے، وہ ہو گئے وہ لگے، ظَلَّ اور ظُلُوْلٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب (ملاحظہ ہو ظَلَّ)، ۱۴/۱ ۲۱/۲

**ظَلُوْمٌ**: نہایت ستمگار، بہت ظلم کرنے والا، بے انصاف، نہایت بے باک، بڑا بے ترس

ظَلُوْمٌ سے بروزن فَعُوْلٌ مبالغہ کا صیغہ ہو، واضح رہے کہ قرآن مجید میں ظَلُوْمٌ انسان کی صفت بیان ہوئی ہے اور انسان سے جنس انسان مراد ہے اور جب جنس کو مبالغہ کے صیغہ سے متصف کیا جائے تو یہ ضرور نہیں کہ وہ صفت اس جنس کے تمام افراد میں یا بعض میں مبالغہ ہی کے ساتھ پائی بھی جائے ہاں اگر پائی جائے تو بہتر ضرور ہے چنانچہ یہ بات یہاں بھی موجود ہے کہ اکثر افراد انسانی ظلم شدید کے مرتکب ہیں۔ تاہم یہ چیز ضروری اور لازمی نہیں ہے[۱]۔ اور روح المعانی میں ہے کہ شاید ظلوم جہول" سے یہ مراد ہو کہ جس کی شان ظلم کرنا اور جہالت ہو[۲]۔ اور شاہ ولی اللہ دہلوی حجۃ اللہ البالغہ میں رقمطراز ہیں۔

| | |
|---|---|
| فان الظلوم من لا | بلاشبہ ظلوم وہ جو عادل نہ ہو اور |
| یکون عادلاً ومن | اس میں عدل کی صلاحیت |
| شانہ ان یعدل | موجود ہو۔ اور جہول یہ ہے |
| والجھول من لا | کہ جو عالم نہ ہو اور اس کی |
| یکون عالماً ومن | شان یہ ہو کہ وہ عالم ہی |
| شانہ ان یعلم[۳] | ہے۔ |

ظَلُوْمًا پ ۱۳/۱۲ ۲۲/۶

[۱، ۲] ملاحظہ ہو روح المعانی ج ۲۲ ص ۹۳ طبع منیریہ مصر
[۳] باب سر التکلیف ج ۱۔ ص ۱۹ طبع مذکور

Marfat.com

**ظُلَّۃٌ:** سائبان، ظُلَلٌ جمع۔ امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں:-

"ظُلَّۃٌ وہ بدلی ہے جو سایہ فگن ہو۔ اور اکثر اس کا استعمال بُری اور ناپسند صورت حال میں ہوتا ہے ارشاد ہے وَ اِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ (اور جس وقت اٹھایا ہم نے پہاڑ ان کے اوپر جیسے سائبان) اور فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ (پھر پکڑا ان کو آفت نے سائبان والے دن کی)"

اور جوہری نے ابو زید سے نقل کیا ہے کہ پہلی بدلی جو سایہ فگن ہو وہ ظُلّہ ہے۔ اور عذاب یوم الظلہ کے متعلق جوہری نے لکھا ہے کہ یہ ایک ابر تھا جس کے نیچے بادِ سموم چل رہی تھی۔ اور تہذیب اللغۃ میں ہے کہ ایک بدلی ان کے سر پر سایہ فگن ہو گئی تھی جب لوگ اس کے نیچے تپش سے پناہ کے لیے جمع ہوئے تو دیکھا یک ان پر آگ گر رہی ہے اور سب وہیں ڈھیر ہو گئے نیز جس چیز سے سایہ کیا جائے اس کو بھی ظُلّہ کہتے ہیں اور وہ سائبان بھی کہ جس سے گرمی اور سردی کا بچاؤ ہوتا ہے ظُلَّۃٌ کہلاتا ہے۔ پ ۹/۱۱، ۱۹/۱۴

**ظِلُّهَا:** اس کا سایہ۔ ظِلٌّ مضاف، ھَا ضمیر مونث غائب مضاف الیہ۔ ظل سے مراد بہشت کا دائمی عیش و آرام اور شان و شوکت ہے۔ پ ۱۲/۱۱

**ظَلِيلٍ:** گھن کی چھاؤں، ٹھنڈا سایہ، سایہ دینے والا۔ علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں:-

"ظَلِیل صیغہ صفت ہے جو لفظ ظل عرب کی عام عادت کے مطابق تاکید کے لیے مشتق ہوا ہے۔ جس طرح یوم اَیْوَمَ (بڑا سخت دن) اور لَیْلٌ اَلْیَلُ (لمبی اور بھیانک رات) وغیرہ ہیں۔ اور امام مرزوقی نے کہا ہے کہ یہ محض مشتق منہ کا تابع مہمل ہے اور اس کے کوئی وصفی معنی نہیں ہیں بلکہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حسن بسن میں بسن، حسن کا تابع مہمل ہے"[1]

اور امام راغب نے لکھا ہے کہ آیہ کریمہ وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيلًا (اور ان کو ہم داخل کریں گے گھن کی چھاؤں میں) میں ظل ظلیل خوش عیشی سے کنایہ ہے۔ ۲۹/۲۱، ۵/۵

## فصل المیم

**ظَمَأٌ:** تشنگی، پیاس۔ یہ اصل میں ظَمِیَ یَظْمَأُ کا مصدر ہے جس کے معنی پیاس لگنے کے ہیں۔ پ ۱۱/۳

[1] روح المعانی ج ۵ ص ۵۵ طبع منیریہ مصر۔

Marfat.com

**ظَمْآنُ**: پیاسا تشنہ۔ ظَمِیَ یَظْمَأُ سے بروزن فعلان صیغہ صفت ہے۔ ۱۵/۱۱

# فصل النون

**ظَنٌّ**: گمان، خیال، اٹکل، تخمینی بات، علم، یقین شک، اور وہ اعتقاد راجح کہ جس میں اس کے خلاف ظہور پذیر ہونے کا بھی احتمال ہو۔ یہ ظَنَّ یَظُنُّ (نصر) سے کبھی مصدر ہو کر مستعمل ہوتا ہے اور کبھی اسم ہو کر اور جب بمعنی اسم ہو تو اس کی جمع ظُنُونٌ آتی ہے۔ علامہ قاضی ابوبکر ابن العربی اندلسی مالکی فرماتے ہیں:۔

"ہمارے علماء نے کہا ہے کہ ظن کی حقیقت دل میں دو باتوں کا ٹھہرانا ہے باین طور کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح ہو، اور شک کا مطلب ان دونوں کو برابر رکھنا ہے۔ اور علم کہتے ہیں ان دونوں میں سے ایک کو گرا کر دوسری کے متعین کر دینے کو اور ہم اصول کی کتابوں میں ان کی تحقیق کر چکے ہیں"[1]

لیکن یہ ظن کی منطقی تعریف ہے جس کو اصولیوں نے اختیار کر لیا ہے۔ قرآن کریم میں ہر جگہ اس کا استعمال اس معنی میں نہیں فرمایا گیا ہے چنانچہ امام جلال الدین سیوطی شافعی الاتقان فی علوم القرآن میں رقمطراز ہیں:۔

"ظن کے معنی اصل میں اعتقاد راجح کے ہیں چنانچہ ارشاد الٰہی ہے اِنْ ظَنَّا اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ (اگر وہ دونوں گمان غالب رکھتے ہیں کہ خداوندی ضابطوں کو قائم رکھیں گے) اور کبھی یقین کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے جیسے ارشاد ہوتا ہے اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ (جن کو یہ یقین ہے کہ ان کو ملنا ہے اپنے رب سے) ابن ابی حاتم وغیرہ نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہ قرآن مجید میں ہر جگہ ظن کا استعمال یقین ہی کے معنی میں ہے لیکن اس کلیہ کا بہت سی ان آیات میں کہ جہاں یہ معنی یقین مستعمل نہیں ہوا ہے تسلیم کرنا مشکل ہے جیسے کہ پہلی ہی آیت ہے اور زرکشی نے برہان میں کہا ہے کہ قرآن مجید میں اس فرق کو سمجھنے کے لیے کہ کہاں ظن کا استعمال یقین کے معنی میں ہے اور کہاں شک کے معنی میں دو ضابطے ہیں۔

(۱) جہاں ظن کی تعریف آئی ہے اور اس پہ

[1] ملاحظہ ہو احکام القرآن ابن العربی: ج ۲ ص ۲۲۶ طبع مصر ۱۳۳۱ھ

ثواب کا وعدہ فرمایا گیا ہے وہاں یقین مراد ہے اور جہاں اس کی مذمت واقع ہے اور اس پر عقاب کی دھمکی دی گئی ہے وہاں شک کے معنی ہیں۔

(۲) ہر وہ ظن جس کے بعد اَن خفیفہ ہوگا وہاں شک کے معنی ہوں گے جیسے بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ یَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ (بلکہ تمہیں شک تھا کہ اب رسول واپس نہ ہوں گے) اور ہر وہ ظن کہ جس کے ساتھ اَنَّ مشددہ متصل ہوگا بمعنی یقین ہوگا۔ جیسے ارشاد ہے اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَہْ (بلاشبہ مجھے یقین تھا کہ مجھ کو ملنا ہے میرا حساب) اور وَظَنَّ اَنَّہُ الْفِرَاقُ (اور یقین جانا کہ اب آیا وقت جدائی کا) چنانچہ بجائے ظَنَّ کے اَیْقَنَ اَنَّہُ الْفِرَاقُ کی قراءت بھی مروی ہے۔

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ مشددہ چونکہ تاکید کے لیے وضع کیا گیا ہے اس لیے وہ یقین کے موقع پر آتا ہے۔ اور خفیفہ میں چونکہ یہ بات نہیں اس لیے وہ شک کے موقع پر استعمال ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ مشددہ کا استعمال علوم میں ہوا کرتا ہے جیسے فَاعْلَمْ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ (سو تو یقین رکھ کر کسی کی بندگی نہیں سوائے اللہ کے) اور عَلِمَ اَنَّ فِیْکُمْ ضَعْفًا (اور جانا کہ تم میں سستی ہے) اور مخففہ کا حسبان (گمان کرنے) میں چنانچہ ارشاد ہے وَحَسِبُوْٓا اَنْ لَّا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ (اور گمان کیا کہ کچھ خرابی نہ ہوگی) راغب نے اپنی تفسیر میں اس قاعدہ کو بیان کر کے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰہِ (اور انہوں نے یقین کر لیا کہ اللہ سے کوئی پناہ کی جگہ نہیں) میں یہ ضابطہ نہیں چلتا کیوں کہ یہاں باوجود اَن خفیفہ کے یقین کے معنی میں لیکن اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ یہاں اَن کا اتصال ملجأ سے جو کہ اسم ہے اور امثلہ سابقہ میں اس کا اتصال فعل سے تھا۔ اس جواب کو برہان میں ذکر کر کے لکھا ہے کہ اس ضابطہ کو ہاتھ سے نہ دو کیونکہ یہ اسرار قرآن میں سے ہے۔ اور ابن الانباری کہتے ہیں کہ ثعلب کا بیان ہے عرب ظن کو علم بھی قرار دیتے ہیں اور شک اور کذب بھی سو اگر علم کے دلائل قائم ہوں اور وہ شک کے دلائل سے زیادہ ہوں تو ظن بمعنی یقین ہوگا

Marfat.com

اور اگر یقین و شک دونوں کے دلائل برابر ہوں تو ظن کے معنی شک کے ہوں گے اور اگر شک کے دلائل یقین کے دلائل سے زیادہ ہوں تو ظن بمعنی کذب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (وہ لوگ محض جھوٹ بولتے ہیں) یہاں يَظُنُّوْنَ بمعنی یکذبون ہے۔[1]

اور علامہ سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں لکھتے ہیں:-

"ظن اس تردد راجح کا نام ہے کہ جو اعتقاد غیر جازم کی طرفین کے مابین ہوتا ہے اور حکم میں ہے کہ اس کے معنی شک اور یقین کے ہیں مگر وہ یقین نہیں جو معائنہ سے حاصل ہو بلکہ وہ یقین جو تدبر سے پیدا ہوتا ہے اور جو یقین کہ معائنہ سے حاصل ہوتا ہے اس کے سوائے علم کے اور کسی لفظ کا استعمال نہیں ہوتا . . . اور مناوی کہتے ہیں کہ ظن اس اعتقاد راجح کا نام ہے جس کے ساتھ اس کی نقیض کا احتمال بھی موجود ہو، نیز شک اور یقین میں اس کا استعمال ہوتا ہے . . .

. . . اور بصائر میں ہے کہ ظن قرآن مجید میں چار طرح پر وارد ہوا ہے۔ یقین کے معنی میں، شک کے معنی میں، تہمت کے معنی میں اور گمان کرنے کے معنی میں پھر بصائر میں ان آیات کو ذکر کیا ہے۔ اور ہمارے شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ بیضاوی اور مطول کے حاشیہ نگاروں نے لکھا ہے کہ اشیاء محسوسہ کے ریسے ظن کا استعمال بمعنی یقین اور علم نہیں ہوتا ہے اور بہت سے لوگوں کا ظن کے معنی کے متعلق یہ فیصلہ ہے کہ یہ اضداد میں سے ہے چنانچہ شروح فصیح میں مذکور ہے"

اور امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں فرماتے ہیں:-

"نشان اور علامت سے جو حاصل ہو اس کا نام ظن ہے جب علامت قوی ہو تو اسے علم تک پہنچا دیتی ہے اور جو بہت زیادہ ضعیف ہو تو پھر وہم کی حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتی پھر جب ظن قوی ہوتا ہے یا قوی کی طرح اس کا تصور کیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ

[1] ملاحظہ ہو الاتقان ج ۱ ص ۱۰۱ طبع مصر ۱۳۰۶ھ بین القوسین تاج العروس یعنی قاموس کا ترجمہ ہے

اَنَّ مشدد ہ اور اس اَنْ کا استعمال ہوتا ہے کہ جس کو مشدد ہ سے مخفف کر لیا گیا ہو۔ اور جو ضعیف ہوتا ہے تو پھر اس کے ساتھ اس اَنَّ اور ان کا استعمال ہوتا ہے کہ جو معلوم قول و فعل کے ساتھ مختص ہیں"

غرض لغت کے اعتبار سے ظن یقین اور شک کے خلاف کسی خاص ادراک کا نام نہیں بلکہ علامات و نشانات اور دلائل کی بنا پر جو انسان کا ایک تخمینہ اور اٹکل قائم ہوتی ہے وہ ظن ہے اس اعتبار سے ظن علم و یقین شک و وہم اور کذب سب سے عام ہے اور سب کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے رہا اس کا فیصلہ کہ کون سا ظن" علم و یقین میں داخل ہے اور کون سا شک و وہم میں شامل۔ حسب تصریح ثعلب و راغب اصفہانی ان دلائل و علامات کی بنا پر ہوگا کہ جن کی بنا پہ اس ظن کا حصول ہوا ہے۔

البتہ اہل منطق کی اصطلاح میں ظن اعتقادِ راجح کا نام ہے۔ ان کے یہاں اگر قضیہ کی صورت کا حصول بلا تردد و تجویز ہو تو وہ تخییل" ہے اور اگر نسبت باہمی کا ادراک اس طرح ہو کہ اس میں تردد ہو اور جانبین کی تجویز برابر ہے تو اس کو شک" کہتے ہیں اور جو نسبت کا تصور بایں طور ہو کہ جانب مخالف کا رجحان ہے تو ادراک مرجوح کو وہم کہیں گے اور ادراک راجح کو ظن اس اعتبار سے منطقی اصطلاح میں ظن اس اعتقاد کا نام ہے کہ جس میں اس کی نقیض کا احتمال بھی باقی ہو اور اگر اس اعتقاد میں نقیض کا احتمال باقی نہ رہے تو پھر وہ جزم" کہلاتا ہے پھر یہ جزم" اگر مطابق واقع نہیں ہے تو جہل مرکب ہے اور اگر مطابق واقع ہے مگر کسی شک ڈالنے والے کے شک سے زائل ہو جاتا ہے تو اس کو "تقلید" کہیں گے۔ ورنہ اس کا نام یقین ہوگا اس لحاظ سے منطقیوں کے یہاں تصدیق کی سب سے اعلیٰ قسم کا نام "یقین" ہے اور سب سے ادنیٰ کا نام ظن ہے۔

علمی اصطلاحات میں عام طور پر ظن سے اس کے منطقی معنی مراد ہوتے ہیں لیکن لغوی اعتبار سے یہ ٹھیک ایسے موقع پر استعمال ہوتا ہے کہ جہاں ہم اُردو میں اٹکل کا لفظ استعمال کیا کرتے ہیں یعنی کسی چیز کے متعلق وہ اندازہ کہ جو ہم نشانات دیکھ کر قائم کر سکیں خواہ وہ رجحان کے مرتبہ پر پہنچے یا نہ پہنچے۔ یہاں پہنچ کر ہم کو ہمارے ملک کے مایۂ صد افتخار مشہور مترجم قرآن مولانا شاہ عبدالقادر

دہلوی خلاصہ دودمان ولی اللہی کی بالغ نظری کا بے اختیار معترف ہونا پڑتا ہے کہ موصوف نے جا بجا اس کا ترجمہ اٹکل اور خیال سے ہی فرمایا ہے مخزام (عند خیر البراد تلقی) اس دور ضلالت کا ایک بڑا سخت گمراہ کن فتنہ انکار حدیث بھی ہے منکرین حدیث نے اس سلسلہ میں بڑا شور برپا کر رکھا ہے کہ خبر واحد مفید ظن ہوتی ہے مفید الیقین نہیں لہذا دین کی بنیاد غیر یقینی چیزوں پر کس طرح رکھی جا سکتی ہے۔ اور پھر اس سلسلہ میں تمام وہ آیات کہ جن میں ظن کی مذمت وارد ہے بڑے زور شور سے پیش کر کے سادہ لوح عوام کو گمراہ کرتے ہیں لیکن درحقیقت یہ ایک قسم کا خوشنما مغالطہ ہے جس کا اصل سبب ان کی علمی فرومایگی اور بے بضاعتی ہے۔ نیز لوگ ظن کی حقیقت لغویہ سے واقف ہیں نہ اس کی اصطلاح عرفی سے اس مقام پر حجیت حدیث کی تفصیلی بحث چونکہ ہمارے موضوع تصنیف سے خارج ہے اس لیے ہم اس کو مجبوراً نظر انداز کرتے ہیں۔ جن حضرات کو اس سلسلہ میں تفصیلی بحث درکار ہو وہ ہمارے رفیق محترم حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی کی مشہور بلند پایہ تصنیف ترجمان السنہ کی طرف مراجعت فرمائیں، موصوف نے اس کے مقدمہ

میں حجیت حدیث پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے اور اس کے ہر گوشہ پر بڑی تفصیل سے داد تحقیق دی ہے چنانچہ مولانا نے اس سلسلہ میں ظن و علم کے مفہوم پر بھی ایک نہایت اہم اور نفیس بحث سپرد قلم فرمائی ہے جو کتاب کے پورے سوا صفحات پر پھیلی ہوئی ہے حقیقت یہ ہے کہ موصوف کا مقدمہ بڑی ہی قیمتی تحقیقات پر مشتمل ہے اور منکرین کے تمام شبہات کا نہایت ہی تفصیلی جواب ہے۔

آیہ شریفہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ اے ایمان والو بچتے رہو زیادہ اٹکل چلانے سے بلاشبہ بعضی اٹکل چلانا گناہ ہے، کے ذیل میں امام ابوبکر احمد بن علی جصاص رازی حنفی المتوفی ۳۷۰ھ نے اپنی مشہور بیش بہا تصنیف احکام القرآن میں ظن کے اقسام و احکام کے متعلق ایک نہایت ہی عمدہ بحث قلم بند فرمائی ہے جو ہدیہ ناظرین ہے۔ فرماتے ہیں،

"آیت اس بات کی مقتضی ہے کہ بعض ظن کی ممانعت ہو نہ جمیع ظنون کی، کیوں کہ الفاظ كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ بعض ہی کے مقتضی ہیں اور پھر اس کے بعد جو ارشاد ہے اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ

---

ہ کتاب کا یہ نام خود مؤلف ہی کا تجویز کردہ ہے ورنہ پہلے مولانا کا ارادہ اس کو جامع الاصول سے موسوم کرنے کا تھا۔

اثم - یعنی اس بات کو بتلا رہا ہے کہ سب ظنون سے نہی نہیں فرمائی ہے اور دوسری آیت میں فرمایا ہے۔ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا (بلاشبہ اٹکل کام نہیں آتی صحیح بات کے بارے میں) اور ارشاد ہوتا ہے وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُوْرًا (اور اٹکل کی تم نے بری اٹکلیں اور تم لوگ تھے کھپنے والے) ان دونوں آیتوں سے پتہ چلا کہ ایک تو صحیح بات میں اٹکل چلانا خراب ہے۔ اور دوسرے کسی کے بارے میں بری اٹکل کرنا اور بے جا گمان رکھنا ناجائز ہے ورنہ اٹکل کی جگہ پر اٹکل کرنا برا نہیں)

پس ظن کی چار قسمیں ہیں (۱) محظور یعنی جس کی ممانعت ہے (۲) مامور بہ یعنی جس کا حکم دیا گیا ہے (۳) مندوب الیہ یعنی جس کی صرف ترغیب دلائی گئی ہے، حکم نہیں دیا گیا (۴) مباح۔ اب جو ظن کہ ممنوع ہے وہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں سوءِ ظن ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی وفات سے تین روز پہلے سنا فرماتے تھے۔ لا یموتن احدکم الا وھو یحسن الظن باللہ عزوجل (تم میں کسی کو اس وقت تک مرنا زیب نہیں جب تک کہ اُس کو اللہ عزوجل کی جناب میں حسن ظن نہ حاصل ہو)

... اور حضرت واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا حق تعالیٰ فرماتا ہے انا عند ظن عبدی فلیظن بی ما شاء (میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں سو جو چاہے میرے متعلق خیال کرے) ...

... اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا حسن الظن من العبادۃ (حسن ظن عبادت ہے) ... لہذا اللہ تعالیٰ کی جناب میں حسن ظن فرض ہے اور سوءِ ظن ممنوع اور حرام۔ اور اسی طرح ان مسلمانوں کے حق میں بھی کہ جن کا ظاہر حال عدالت ہے اسوءِ ظن ممنوع ہے جس سے سختی سے روکا گیا ہے اور یہ بھی اسی ظن محظور و منہی عنہ میں داخل ہے ... اور ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی رہائش گاہ

Marfat.com

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے گھر میں
تھی۔ راہ میں دو انصاری مردوں کا گزر ہوا
انہوں نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا
تو تیزی اختیار کی آپ نے فرمایا ٹھہر جاؤ
یہ صفیہ بنت حیی ہیں۔ دونوں نے عرض کیا
یارسول اللہ، سبحان اللہ (یعنی بھلا اس
بات کے جتانے کی کیا ضرورت تھی اور آپ
کی جناب میں بدگمانی کا کیا موقع ہو سکتا تھا)
ارشاد فرمایا کہ شیطان انسان کے
اندر اس طرح دوڑتا ہے جس طرح سے
کہ خون کا اس کے اندر دوران ہوتا ہے
سو مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ تمہارے دل
میں کوئی خیال آئے یا برائی کا خطرہ گزرے
. . . . اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ
روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ نے
فرمایا ایاکم والظن فان الظن اکذب
الحدیث (بچو تم بدگمانی سے کیوں کہ بدگمانی
سب سے جھوٹی بات ہے) سو یہ بھی اسی
"ظن ممنوع" کا بیان ہے یعنی کسی مسلمان کے
متعلق بغیر کسی ضروری وجہ سے بدگمانی کرنا نیز
ہر وہ "ظن" (اٹکل) کہ جس کی معرفت کا

راستہ موجود ہے اور شریعت نے وہاں پر عبادت
حصول علم یقین) پر وابستہ رکھی ہے ایسا ظن
بھی ممنوع ہے کیوں کہ جب عبادت کی بجا آوری
علم کے حصول پر وابستہ ٹھہری اور اس علم پر
دلیل بھی قائم کر دی گئی اور پھر بھی اس نے دلیل
کا اتباع نہیں کیا اور ظن (اٹکل) پر ہی اڑ اٹھا
تو جس چیز کا وہ مامور تھا اس کو چھوڑ بیٹھا
لیکن جس جگہ پر کوئی ایسی دلیل نہیں بتلائی
گئی کہ جو اس کو علم و یقین کے مقام پر پہنچا سکے
اور وہاں حکم کی بجا آوری عبادت میں داخل
ہے تو ایسی جگہ پر "ظن غالب" ہی پر اکتفا اور اس
پر عمل درآمد واجب ہے۔ چنانچہ اس قسم کے
احکام کی مثالیں کہ جن کی بجا آوری کا ہمیں
حکم ہے جیسے عادل گواہوں کی شہادت
کو قبول کرنا اور اشتباہ کے وقت اٹکل سے
قبلہ کا رُخ متعین کرنا اور دخصومت کے
وقت، تلف شدہ اشیاء کی قیمتوں کا تعین
کرنا۔ نیز ان جنایات کا تاوان مقرر کرنا کہ
شرع کی جانب سے جن کی
مقداروں پر کوئی اطلاع نہیں ہے سو یہ
اور اسی قسم کے اور مسائل میں ہم کو

ظنِ غالب کے احکام نافذ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

اور ظنِ مباح" جیسے وہ شخص کہ جس کو نماز میں اکثر شبہ ہو جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اٹکل اور ظنِ غالب پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔ سو اگر وہ ظنِ غالب پر عمل کرے تو مباح ہے اور اگر بجائے ظنِ غالب کے یقین پر بنا رکھے اور نئے سرے سے نماز پڑھے، تب بھی جائز ہے (کیونکہ یہ امر وجوبی نہیں ہے)۔ . . . . اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اذا ظننتم فلا تحققوا جب تم کو کچھ گمان ہو تو تحقیق میں مت پڑو، سو یہ وہ ظن (گمان) ہے جو انسان کے دل میں اپنے بھائی کے متعلق پیدا ہو جاتا ہے اور شک میں ڈال دیتا ہے سو ایسے گمان کی تحقیق مناسب نہیں۔

اور ظنِ مندوب الیہ" مسلمان بھائی کے ساتھ وہ حسنِ ظن ہے کہ اس کے متعلق ترغیب دلائی گئی ہے اور اس پر ثواب ہوگا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ جب مسلمان کے متعلق بدظنی ممنوع ہے تو حسنِ ظن واجب ہونا چاہیے تو اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں یہ واجب نہیں ہے کیونکہ بدظنی اور حسنِ ظن دونوں کے مابین ایک بیچ کی چیز بھی موجود ہے اور وہ یہ کہ اس کے متعلق کچھ بھی ظن نہ رکھے، پھر جب اس نے اس شخص کے متعلق حسنِ ظن رکھا تو ایسے فعل کو انجام دیا ہے جو فعل مرغوب ہے۔[1]

غور فرمائیے شریعت کے بیشتر معاملات کا دار و مدار ظن پر ہے۔ دنیا کا سارا کاروبار ظن پر چل رہا ہے نسب کا ثبوت میراث کی تقسیم حدود و قصاص کا اجراء سب ظنی اخبار پر موقوف ہے کیا دیکھا گواہوں کی شہادت سے ظن یقین میں تبدیل ہو جاتا ہے اور ان کی شہادت میں کذب کا امکان باقی نہیں رہتا۔ آخر اس امر کا یقینی ثبوت کس طرح بہم پہنچایا جا سکتا ہے کہ زید، عمرو ہی کا بیٹا ہے آخر سوائے ظن کے یہاں اور کس چیز کا اعتبار ہے مگر ان منکرین حدیث کی دانش فروشی ملاحظہ ہو کہ انہوں نے خبرِ واحد میں سرے سے ظن کا اعتبار ہی اڑا دیا۔ قاضی ابوبکر بن العربی نے بالکل ٹھیک

---

[1] احکام القرآن ج ۳ ص ۴۹۹، ۵۰۰ طبع

لکھا ہے: ھی مسئلۃ تعزق بین الغبی والفطن (ظن کے ماننے اور نہ ماننے کا مسئلہ غبی اور ذکی کی شناخت کر دیتا ہے) ب ۴/۲ ب ۶/۲ ب ۸/۱،۵ ب ۱۱/۹،۱۱ ب ۲۳/۱۲ ب ۲۶/۹،۱۰،۱۴

ظَنًّا ۲/۱۳ ۱۱/۹ ۲۵/۲۰

ظَنَّ: وہ اٹکلا، اس نے اٹکل کی۔ اس نے گمان کیا، اس نے جانا۔ ظَنٌّ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب آیہ شریفہ وَظَنَّ اَنَّہُ الْفِرَاقُ (اور یقین کیا کہ آیا اب وقت جدائی کا) میں ظن بمعنی یقین ہی ہے امام راغب لکھتے ہیں وَظَنَّ اَھْلُھَا اَنَّھُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَیْھَا (اور گمان کیا زمین والوں نے کہ وہ اس سے نفع اندوزی پر قادر ہیں) میں اس بات کو جتلانا ہے کہ اپنی قوی امید اور توقع کی بدولت یقین کرنے والوں کے حکم میں ہو گئے تھے اور وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰہُ (اور خیال میں آیا داؤد کے کہ ہم نے اس کو جانچا) میں ظَنَّ بمعنی عَلِمَ ہے اور "فتنہ" یہاں اسی معنی میں ہے جس معنی میں ارشاد ہے وَفَتَنّٰکَ فُتُوْنًا (اور جانچا تجھ کو ایک رہ جانچنا) اور ارشاد الٰہی وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّھَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ (اور مچھلی والے (یعنی یونس علیہ السلام) کو ہدایت کی) جب چلا گیا غصہ کھا کر پھر گمان کیا کہ ہم تنگ نہ پکڑیں گے) کے بارے میں کہا گیا ہے کہ بہتر یہی ہے کہ یہاں ظن بمعنی وہم ہو یعنی ان کو وہم گزرا کہ ہم ان پر تنگی نہ کریں گے۔ ب ۱۱/۸ ۱۲/۱۵ ب ۱۴/۶ ۱۸/۸ ب ۲۳/۱۱،۱۲ ۲۹/۱۴ ب ۳۰/۹

ظَنُّکُمْ: تمہارا گمان، تمہارا خیال۔ ظَنٌّ مضاف ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ۔ یہاں بھی حسب تصریح امام راغب ظن اس اعتقاد کے معنی میں ہے جو یقین کا حکم رکھتا ہے۔ ب ۲۳/۲ ۲۳/۱۷

ظَنَنَّا: ہم نے گمان کیا، ہم نے خیال کیا۔ ظَنٌّ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم ۲۹/۱۱

ظَنَنْتُ: میں نے یقین کیا۔ میں نے جانا۔ ظَنٌّ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم ۲۹/۱۱

ظَنَنْتُمْ: تم نے گمان کیا، تم نے خیال کیا، تم نے جانا، تم نے اٹکل کی، تم نے یقین کیا۔ ظَنٌّ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر۔ یہاں بھی ظن بمعنی یقین ہی ہے اور زیادہ تر ظن مذموم کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ب ۲۴/۱۲ ب ۲۶/۱۰ ۲۸/۴ ۲۹/۱۱

ظَنُّوْا: انہوں نے یقین کیا، انہوں نے جانا، انہوں نے گمان کیا۔ ظَنٌّ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب۔ آیہ شریفہ وَظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ اِلَیْنَا لَا یُرْجَعُوْنَ (اور انہوں نے گمان کیا کہ وہ ہماری طرف پھر نہ لادیں گے) کے متعلق راغب نے لکھا ہے کہ

Marfat.com

پر آنّ کا لانا جو کہ اس ظن کے لیے لایا جاتا ہے جس کے معنی یقین کے ہیں اس بات پر تنبیہ ہے کہ ان لوگوں کو اس کا ایسا ہی اعتقاد تھا جیسا کسی یقینی بات کا ہوتا ہے، حالانکہ یہ چیز یقین کے قابل نہ تھی۔ اور وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ (اور وہ خیال رکھتے تھے کہ ان کا بچاؤ ہے ان کے قلعے) کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے اس کا ایسا اعتقاد کر لیا تھا کہ جس سے وہ یقین رکھنے والوں کے حکم میں ہو گئے تھے۔ ب ۹/۱۱ ب ۱۱/۸،۳ ب ۱۳/۶ ۱۵/۱۹

پ ۲۰/۴ پ ۲۵/۱ پ ۲۸/۴ ۲۹/۱۱

**ظُنُوْنَا** : طرح طرح کے گمان ظَنٌّ کی جمع ہے اور الف اشباع کا ہے۔ ارشاد باری وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا (اور گمان کرتے تھے تم اللہ کے ساتھ طرح طرح کے گمان) کے متعلق علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں :-

ظنون جمع ہے ظن کی اور ظن گو مصدر اور قلیل و کثیر سب کو شامل ہے تاہم جمع کو اس لیے لایا گیا ہے کہ اس کے متعدد انواع پر دلالت کرے چنانچہ اشعار عرب میں بھی اس کا استعمال اسی غرض کے لیے ہوا ہے۔ ابوعمر نے کتاب الالحان میں یہ شعر درج کیا ہے :-

اذا الجوزاء اردفت الثریا
ظننت بآل فاطمة الظنونا

آیۃ کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی جناب میں طرح طرح کے مختلف گمان کر رہے تھے۔ تم میں سے جو لوگ مخلص اور راسخ الایمان تھے وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ سبحانہ نے اپنے دین کو بلند کرنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ ضرور پورا فرما کر رہے گا، چنانچہ آگے چل کر جو ان کا مقولہ بیان فرمایا جا رہا ہے کہ هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا (یہ وہی ہے جو وعدہ دیا تھا ہم کو اللہ اور اس کے رسول نے اور سچ کہا اللہ نے اور اس کے رسول نے اور ان کو اور بڑھایا یقین اور اطاعت کرنا) یہ اسی بات کو ظاہر کر رہا ہے :

یا یہ خیال کر رہے تھے کہ حق تعالیٰ شانہ ان کا امتحان لینے والا ہے اور ڈر رہے تھے کہیں ان کے قدم نہ ڈگمگا جائیں اور جس حادثہ سے انہیں دوچار ہونا ہے اس کا تحمل کر سکیں

Marfat.com

ظاہر ہے کہ ایسا خیال کرنا اخلاص و استقلال کے منافی نہیں ہے۔ اور منافقین اور جن لوگوں کے دلوں میں کھوٹ تھا وہ اس سوچ میں تھے جس کا ذکر آیہ کریمہ وَاِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا (اور جب کہنے لگے منافق اور جن کے دل میں روگ ہے جو وعدہ دیا تھا ہم کو اللہ نے اور اس کے رسول نے سب فریب تھا) میں ہے۔

اور ابن جریر و ابن ابی حاتم نے حسن بصری سے یہ نقل کیا ہے کہ آیت میں ظنون مختلفہ کا بیان ہے۔ منافقوں کا تو یہ ظن تھا کہ (نعوذ باللہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا اور مسلمانوں کو یقین تھا کہ اللہ اور اس کے رسول کا وعدہ حق ہے، اور دین اسلام بہت جلد سب ادیان پر غالب ہو کر رہیگا۔ نیز یہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے کہ آیت میں خطاب صرف مسلمانوں ہی کو ہو ظاہراً بھی اور باطناً بھی۔ اور اختلاف ظنون بایں صورت ہو کر کبھی یہ خیال آیا کہ حق تعالے شانہ کفار کے

مقابل ان کی مدد تو ضرور فرمائیگا مگر اسی کو معلوم ہے کہ ان پر مسلمانوں کا پورا استیلا ہو یا نہ ہو، اور کبھی یہ خیال ہوا کہ پہلے ان کے خلاف خدا کافروں کی مدد فرمائے گا اور وہ مدینہ پر قابض ہو جائینگے اور پھر بعد میں مسلمانوں کو نصرت عطا کی جائے گی۔ اور کبھی یہ خطرہ گزرا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کافروں کی مدد ہو جائے اور وہ مسلمانوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکیں اور جاہلیت کا دور دورہ ہو جائے۔ یا اختلاف ظنون اس بنا پر ہوا کہ کسی کو یہ خیال تھا اور کسی گروہ اور کسی کو کچھ اور، اور اس صورت میں یہ لازمی ہے کہ جو ظن مسلمان کی شان کے لائق نہیں وہ نفس کا خطرہ ہے کہ جو خوف طبعی کی بنا پر ضروری ہوتا ہے اور جس کا دفعیہ انسانی دسترس سے باہر ہے۔ اور ایسا خطرہ معاف بھی ہے۔ یا یہ کہنا چاہیئے کہ ان کے ظنون مختلفہ یہ تھے۔ ان کو گمان تھا کہ ان کی مدد ہو گی اور دشمن ان کو ذرا نقصان نہ پہنچا سکے گا۔ اور یہ بھی خیال تھا کہ مدد تو ہو گی مگر نقصان اٹھانے کے بعد نیز امتحان و آزمائش کا بھی ڈر تھا اس صورت میں کسی اور توجیہ کی ضرورت

ہی نہیں رہتی "۔ ؎۱

اور علامہ نظام الدین نیشاپوری لکھتے ہیں :-

"ظن کی جو جمع لائی گئی ہے اس کے فوائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس بات کا یقینی طور پر علم ہو جائے کہ ان میں سے بعض لوگوں کا ظن قطعی غلط تھا، کیونکہ ظاہر ہے ظنونِ مختلفہ" سب کے سب صحیح نہیں ہو سکتے۔ یا تو سب کے سب غلط ہوں گے ورنہ بعض تو ضرور ہی ہوں گے اور پھر یہ مقام ہے بھی نتائج خوف ہی کے بیان کا " ؎۲ $\frac{۲۱}{۱۸}$

**ظَنَّ** : اس کی اٹکل - اس کا گمان - اس کا اندیشہ۔ ظَنَّ مصدر مضاف، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ $\frac{۲۲}{۱۲}$

# فصل الہاء

**ظَهَرَ** : وہ کھلا، وہ ظاہر ہوا، وہ آشکارا ہوا، وہ غالب ہوا، وہ چڑھ گیا، وہ پھیل پڑا۔ فَتَحَ ظُهُوْر سے ماضی کا واحد مذکر غائب۔ راغب لکھتے ہیں :-

ظَهَرَ الشَّیْءُ کا اصل مطلب یہ ہے کہ کوئی شئے پشت ؎۳ زمین پر نمودار ہے اور مخفی نہیں ہے اور بطن کے معنی یہ ہیں کہ وہ زمین کے اندر موجود ہے اور مخفی ہے۔ پھر ظَهَرَ کا استعمال ہر اس شئے کے بارے میں ہونے لگا کہ جو آشکارا ہو اور بصر و بصیرت سے نظر آتی ہو "۔

اور علامہ احمد فیومی المصباح المنیر میں فرماتے ہیں کہ ظہور کے معنی ہیں خفا کے بعد نمودار ہونے کے چنانچہ کہا جاتا ہے ظَهَرَ لِی رَأْیٌ (مجھے رائے ظاہر ہوئی) یعنی پہلے معلوم نہ تھی اب معلوم ہوئی۔ اور جب اس کا صلہ عَلٰی آتا ہے تو اس کے معنی اوپر سے جھانکنے، بلند مقام پر چڑھنے اور غلبہ پانے کے آتے ہیں۔

آیہ شریفہ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (اور نہ دکھادیں اپنا سنگار مگر جو کھلی چیز ہے اس میں سے) میں "زینت" سے زینت خلقی اور زینت کسبی دونوں مراد ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ زینت کا لفظ خلقی محاسن اور پیدائشی خوبیوں

---

؎۱ روح المعانی ج ۱۱ ص ۱۳۰، ۱۳۱ طبع منیریہ مصر ؎۲ تفسیر نیشاپوری موسوم بغرائب القرآن و رغائب الفرقان ج ۲۰ ص ۸۸ طبع شدہ بر حاشیہ تفسیر ابن جریر طبع میریہ ۱۳۱۵ھ ؎۳ عربی میں ظہر کے معنی پشت ہی کے ہیں۔

کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور ان تمام چیزوں کے لیے بھی کہ جن کو انسان اپنی آرائش و زیبائش کے لیے استعمال میں لاتا ہے جیسے عمدہ لباس اور زیورات وغیرہ ہیں مفسرین سلف میں سے بعض نے یہاں زینت خلقی مراد لی ہے اور بعض نے زینت کسبی جن لوگوں نے زینت کسبی مراد لی ہے انہوں نے اس کو تین باتوں میں منحصر کیا ہے۔

(۱) وہ رنگ جو زینت کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں جیسے آنکھ کے لیے سرمہ ابروؤں کے لیے وسمہ رخساروں کے لیے زعفران اور ہاتھ پاؤں کے لیے مہندی۔

(۲) زیورات جیسے انگوٹھی، کنگن، پازیب، پہنچی، بازو بند، ہار، تاج، جھومر، کمرپیٹی اور آویزے وغیرہ۔

(۳) کپڑے چنانچہ قرآن مجید میں خُذُوا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ لے لو اپنی رونق ہر نماز کے وقت) میں زینت سے کپڑے ہی مراد ہیں اب جو علماء کہ زینت سے "زینت خلقی" مراد لیتے ہیں ان کے نزدیک آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ عورتیں اپنے سارے بدن کو ظاہر نہ کریں سوائے ان اعضا کے کہ جن کے کھلنے میں مجبوری اور ناچاری ہے اور جو عادتاً کھلے ہی رہتے ہیں عورتوں میں ایسے اعضا چہرہ اور دونوں ہاتھ ہی ہیں کیونکہ ان کے چھپانے میں سخت حرج ہے کہ چیزوں کے اٹھانے رکھنے اور لینے دینے میں ہاتھوں ہی سے کام لینا پڑتا ہے اسی طرح چلنے پھرنے آنے جانے اٹھنے بیٹھنے میں چہرہ کا کھل جانا بھی لازمی ہے تو اگر ضرورت کے وقت غیر محرم اجنبی کے سامنے چہرہ اور دونوں ہاتھ کھولے تو اس کی اجازت ہے کہ یہ اعضا عورت کے ستر میں داخل نہیں ہیں اور نماز میں عورت کو ان کے کھولنے کا حکم ہے اور جو حضرات کہ زینت سے زینت کسبی مراد لیتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں زینت کا لفظ مذکور ہے اور ظاہر ہے کہ زینت جب عورت کے بدن سے علیحدہ ہو تو اس زینت کا دیکھنا بالاتفاق حلال اور جائز ہے اب جب حق سبحانہ تعالیٰ نے اس زینت کے اظہار سے بھی منع فرمایا کہ جو عورت کے بدن پر ہے تو اس کے اعضا پر نگاہ ڈالنے کی حرمت تو اور زیادہ ہوئی، ہاں اِلَّا مَا ظَهَرَ سے جس زینت کے چھپانے میں ناچاری ہے اس کے کھولنے کی اجازت ہوئی۔ اب ناچاری کو یا ہاتھ کی مہندی انگلی کا چھلا۔ آنکھ کا کاجل، لبوں کی سرخی،

رخسار کا غازہ کھل جائے، یا عورت کی چپٹی پوشاک اور نیچی پاپوش پر نظر پڑ جائے تو روا ہے۔[1]

بیہقی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ اِلَّا مَا ظَهَرَ سے مراد چہرہ اور دونوں ہاتھ ہیں نیز طبری اور بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں سرمہ اور انگوٹھی کو بھی روایت کیا ہے۔ اور مصنف ابن ابی شیبہ میں عکرمہ، ابو صالح اور سعید بن جبیر سے اور مصنف عبدالرزاق میں قتادہ سے بھی یہی تفسیر مروی ہے البتہ طبری نے متعدد طرق سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد کپڑے ہیں۔[2]

استاذ مرحوم مولانا حیدر حسن خان ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے پردہ کے ثبوت میں ایک مستقل رسالہ عربی زبان میں تصنیف فرمایا ہے جس کا نام ہے الحجاب فی الاسلام یہ ۱۳۵۹ھ ہجری مطبع قیمہ بمبئی سے چھپ کر شائع ہو چکا ہے استاذ مرحوم نے رسالہ مذکور میں حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کے اقوال کے مابین باہم تطبیق دی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کا محمل حالت نماز ہے یعنی نماز میں تو عورت کو سوائے دونوں ہاتھوں اور چہرہ کے باقی سارے بدن کا ڈھانپنا ضروری ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں نظر کا حکم مذکور ہے کہ اجنبی مرد کو سر سے پا تک عورت کے کسی عضو پر نظر ڈالنے کی اجازت نہیں اگر وہ عورت پوری طرح سر سے پیر تک کپڑوں میں لپٹی ہوئی ہو تو اوپر کے کپڑے جو بضرورت ظاہر ہوں جیسے چادر یا برقع وغیرہ ان کے دیکھنے میں مضائقہ نہیں۔ پ ۱۸/۱۰ ن ۲/۱۴ ۸/۱۱۲۶

۲۱/ب/۸

**ظَهْرَكَ**: تیری پیٹھ۔ تیری پشت ظَهْر اور بطن دو متقابل اعضا کے نام ہیں بطن پیٹ کو کہتے ہیں اور ظَهْر پیٹھ کو۔ تاج العروس میں ہے کہ انسان کی ظہر کاندھے سے شروع ہو کر سرین کے قریب اس کے آخر پر ختم ہوتی ہے یہ لفظ عربی زبان میں مذکر آتا ہے اور ان اسماء میں سے ہے کہ

---

[1] تفصیل کے ملاحظہ ہو تفسیر کبیر از امام رازی سورۃ النور، آیہ مذکورہ

[2] نصب الرایہ لاحادیث الہدایہ للزیلعی ج ۲ ص ۲۰۸ طبع علوی لکھنؤ۔

جو ظروف کی جگہ استعمال ہوتے ہیں اس کی جمع أَظْهُرٌ ظُهُورٌ اور ظُهْرَانٌ ہے۔ ظَهْرَ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ $\frac{30}{19}$

ظَهْرِهٖ: اس کی پیٹھ، اس کی پشت۔ ظَهْرِ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ۔

$\frac{25}{5}$ ب $\frac{30}{9}$

ظَهْرِهَا: اس کی پیٹھ، اس کی پشت۔ ظَهْرِ مضاف، هَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ۔ راغب نے تصریح کی ہے کہ روئے زمین کے لیے بھی بطور استعارہ ظهر کا استعمال ہوتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے ظهر الارض و بطنها $\frac{22}{14}$

ظِهْرِيًّا: بھولا بسرا، فراموش شدہ، پیٹھ پیچھے ڈالا ہوا۔ علامہ زمخشری کشاف میں لکھتے ہیں:۔ "ظِهْرِيٌّ ظَهْرٌ کی طرف منسوب ہے اور کسرہ نسبت کے تغیرات میں سے ہے جیسے کہ اَمْس کی طرف نسبت کرتے ہیں تو اِمْسِيٌّ بولتے ہیں" [1]

اصل میں جو چیز پیٹھ پیچھے ڈال کر بھلا دی جائے وہ ظهری کہلاتی ہے۔ اسی لیے کوتل جانور کو بھی ظهری کہتے ہیں کیونکہ اس کا مالک نہ اس پر سوار ہوتا ہے اور نہ اس پر کچھ لادتا ہے بلکہ وقت ضرورت کے لیے تیار کر کے رکھ چھوڑتا ہے۔ [2] ب $\frac{12}{8}$

ظُهُوْرِكُمْ: تمہاری پیٹھیں، تمہاری پشتیں۔ ظُهُوْرِ ظَهْرٌ کی جمع مضاف ہے كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ ب $\frac{1}{14}$

ظُهُوْرِهٖ: اس کی پیٹھیں، اس کی پشتیں۔ ظُهُوْرٌ جمع ظُهُوْرِ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ آیہ شریفہ وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ (اور بنا دی تم کو کشتی اور چوپائے جس پر تم سوار ہوتے ہو تاکہ چڑھ بیٹھو اس کی پیٹھ پر) کے متعلق امام فخرالدین رازی تفسیر کبیر میں رقمطراز ہیں۔

"یہاں دو سوال ہیں۔ ایک یہ کہ (جمع کے اعتبار سے بجائے علیٰ ظهوره کے) علیٰ ظهورها کیوں نہ فرمایا گیا۔ علماء نے اس کے متعدد جوابات دیئے ہیں (۱) ابو علیدہ کا بیان ہے کہ تذکیر ضمیر لفظ ما کے لحاظ سے ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے لتستوا علیٰ ظهور ما ترکبوه (۲) فراء کہتے ہیں کہ ظهور کی اضافت ایسے واحد کی طرف ہے کہ جس

[1] تفسیر کشاف ج ۱ ص ۶۱۱ طبع مصر [2] بلاحظہ ہو تاج العروس۔

میں جمع کے معنی موجود ہیں جس طرح سے کہ (سپاہ) اور جند (لشکر) ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ضمیر کو مذکر لایا ہے اور ظہور کو جمع (۳) یہ تانیث تانیث حقیقی نہیں لہٰذا الفاظ کا مختلف ہونا اس میں جائز ہے چنانچہ بولا جاتا ہے عندی من النساء من یوافقک کہ یہاں بجائے من یوافق کے من توافق صیغہ واحد مؤنث غائب ہونا چاہیے تھا مگر چونکہ تانیث حقیقی نہیں ہے اس لیے صیغہ کا اختلاف جائز ہے)۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ رکبوا الانعام اور رکبوا فی الفلک بولا جاتا ہے۔ یعنی "انعام" کی طرف رکوب کا تعدیہ بلا واسطہ ہوتا ہے اور فلک کی طرف بواسطہ فی، اب یہاں الفلک اور الانعام دو جنسوں کو ذکر کرکے صرف ترکبون کیوں فرمایا گیا، اس کا جواب یہ ہے کہ متعدی بغیر واسطہ کو اس کی قوت کی بنا پر متعدی بالواسطہ پر غالب کر دیا گیا ہے۔" [۱] ۲۵ پ

**ظُهُوْرِهَا**: ان کی پیٹھیں۔ ان کی پشتیں ظُهُوْرِ مضاف، هَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ دوسرے پارے میں ھا کا مرجع الواب ہیں اور آٹھویں میں انعام پ ۲/۸ ع ۳

**ظُهُوْرِهِمْ**: ان کی پیٹھیں ان کی پشتیں ظُهُوْرِ مضاف، هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ
پ ۱/۱۲ پ ۴/۱۰ پ ۷/۱۰ پ ۱۰/۱۱ پ ۱۷/۳

**ظُهُوْرُهُمَا**: ان کی پیٹھیں، ان کی پشتیں۔ ظُهُوْر مضاف، هُمَا ضمیر تثنیہ مذکر غائب مضاف الیہ ع ۵

**ظَهِيْرٌ**: یار، پشتیبان، مددگار مُظَاهَرَةٌ سے بروزن فَعِیْلٌ بمعنی فاعل صفت کا صیغہ ہے علامہ لغوی سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں لکھتے ہیں:-

"ظَهِيْرٌ بروزن امیر بمعنی معین و مددگار ہے۔ واحد اور جمع دونوں میں اس کا استعمال یکساں ہے، اور ظہیر کی جمع اس لیے نہیں بنائی کہ فعیل اور فعول دونوں میں مذکر و مؤنث اور جمع کا استعمال یکساں طور پر ہوتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (بلاشبہ ہم دونوں رب العلمین

[۱] تفسیر کبیر ج ۷، ص ۲۳۳ و ۳۴۴ طبع مصر۔

Marfat.com

کے فرستادہ ہیں، اور فرمایا وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرًا (اور فرشتے اس کے پیچھے مددگار ہیں) ابن سیدہ کا بیان ہے کہ یہ اس محاورہ کے مطابق ہے جس کو سیبویہ نے اہل عرب سے نقل کیا ہے کہ وہ جماعت کو کہتے ہیں ھم صدیق (وہ دوست ہیں) اور ھم فریق (وہ ایک گروہ ہیں)

لیکن یہ واضح رہے کہ علامہ ابن مالک نحوی نے "الاعلام بمثلث الکلام" میں اس کی جمع ظُهُرٌ لکھی ہے فرماتے ہیں:-

فهو ظهير والجميع ظهرا

على قياس للخلاف ابى[1]

ہاں قرآن کریم میں بلاشبہ آیت وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ میں جو اس کی جمع ظُهُرٌ نہیں لائی گئی اس کی وجہ وہی ہے جو صاحب تاج العروس نے لکھی ہے چنانچہ امام رازی نے تفسیر کبیر میں اور قاضی شوکانی نے فتح القدیر میں آیہ مذکور کے تحت ابو علی فارسی اور فراء وغیرہ سے یہی نقل کیا ہے آیہ کریمہ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا اور ہے کافر اپنے رب کی طرف سے پیٹھ دیے رہا ہے کے متعلق امام راغب لکھتے ہیں:-

"یعنی کافر رحمٰن کی مخالفت میں شیطان کا مددگار ہے۔ اور ابو عبیدہ کا بیان ہے کہ ظهير بمعنی مظهور بہ (وہ چیز جو پیٹھ پیچھے ڈال دی گئی ہو فعیل بمعنی مفعول) ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک بے وقعت اور ذلیل ہے جس طرح سے کہ پیٹھ پیچھے ڈالی ہوئی چیز ہوتی ہے عرب کا محاورہ ہے ظهرت بکذا یعنی اس کو پس پشت ڈال کر پھر التفات نہ کیا ہو"

اور امام رازی نے تفسیر کبیر میں توجیہ مذکور کے علاوہ دو توجیہیں اور نقل کی ہیں:-

(۱) ظهير بمعنی مظاہر ہے جیسے عوین بمعنی معاون اور فعیل بمعنی مفاعل غریب نہیں ہے اور معنی یہ ہیں کہ کافر خدا سے عداوت کر کے شیطان کا معین و مددگار بن جاتا ہے۔

(۲) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ظهير سے جماعت مراد ہو جیسا کہ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ میں ہے اور جس طرح سے کہ صدیق اور خلیط کا استعمال ہوتا ہے اس تفسیر پر کافر سے جنس کافر مراد ہوگی اور مطلب یہ

[1] کتاب مذکور ص ۱۱۸ طبع جمالیہ مصر ۱۳۲۱ھ۔

ہوگا۔ کہ کافر تو حق کے کُل کھنے میں ایک دوسرے کے معین و مددگار ہیں۔ ارشاد ہے وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ (اور جو شیطانوں کے بھائی ہیں وہ ان کو کھینچے جاتے ہیں غلطی میں)[1]

اور قاضی شوکانی نے ایک اور توجیہ بھی نقل کی ہے وہ یہ کہ آیت میں رب سے کافر کا وہ معبود مراد لیا ہے جس کی وہ پرستش کرتا ہے یعنی بت اور ظہیر کے معنی قوی اور غالب کے لیے جائیں۔ اب مطلب صاف ہے کہ جماد میں نہ دفع کرنے کی قوت ہے نہ نفع دینے کی طاقت، بلکہ کافر ہی اس پر قوی اور غالب ہے کہ جو چاہتا ہے وہ اس کے ساتھ کرتا رہتا ہے[2]

۲۲/۹ ۲۸/۱۹
ظَهِيْرًا ۱۵/۱۰ ۱۹/۲۰ ۲۰/۱۲۰، ۵

ظَهِيْرَة : دوپہر، نیمروز، وقت ظہر، ٹھیک دوپہر میں جو گرمی کی شدت ہوتی ہے وہ ظہیرہ کہلاتی ہے۔ ابن الاثیر اور ابن سیدہ نے تصریح کی ہے کہ موسم سرما میں دوپہر کو ظہیرہ نہیں بولتے ہیں[3]۔ قرآن کریم میں اس سے قیلولہ کا وقت مراد ہے ظَهَائِر جمع ہے ۱۸/۱۴

[1] ملاحظہ ہو کتاب مذکور ج ۶ ص ۲۹۲ [2] فتح القدیر ج ۴ ص ۸۱ طبع بابی حلبی مصر۔
[3] تاج العروس۔

Marfat.com

# بابُ العین المُہملۃ

## فصل الالف

**عَابِدٌ**: پوجنے والا، عبادت کرنے والا، بندگی کرنے والا۔ عِبَادَۃٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو عِبَادَۃ) $\frac{۳۰}{۲۴}$

**عٰبِدٰتٍ**، عبادت کرنے والیاں، بندگی بجا لانے والیاں۔ عِبَادۃ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مؤنث عَابِدَۃٌ کی جمع۔ حضرت حسن بصری اور سعید بن جبیر نے "عابدات" کے معنی کثرت سے عبادت کرنے والیوں کے بیان کیے ہیں۔[۱] $\frac{۲۸}{۱۹}$

**عٰبِدُوْنَ**، عبادت کرنے والے، بندگی کرنے والے، خدمت کرنے والے، مطیع۔ عِبَادَۃٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، عَابِدٌ کی جمع بحالت رفع۔

ارشاد الٰہی وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ (اور ان کی قوم تو ہماری بندگی کرتی ہے) میں اکثر مفسرین نے "عابدون" کی تفسیر خادمون سے کی ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کو فرعون بے عون نے خادم اور غلام بنا رکھا تھا چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام جب اس کے دربار میں تبلیغ رسالت کے لیے تشریف لیجاتے ہیں اور بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لیجانے کا مطالبہ فرماتے ہیں تو فرعون طعنہ دیتا ہے اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ (کیا نہیں پالا ہم نے تجھ کو اپنے اندر لڑکا سا اور رہا تو ہم میں کئی برس) اور جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی حقیقت کو آشکارا فرماتے ہیں کہ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (اور یہ وہ احسان ہے جس کو تو مجھ پر اس لیے رکھتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے) عربی زبان میں عابد کے معنی مطیع

---

[۱] تفسیر فتح القدیر ج ۵ ص ۲۲۴- طبع مصر-

فرمانبردار اور خادم کے بھی آتے ہیں چنانچہ امام ابن جریر طبری فرماتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| العرب تسمی کل من | اہل عرب ہر اس شخص کو جو کسی |
| دان لملک عابدا | بادشاہ کے آگے سر تسلیم خم کر |
| له ومن ذلك قيل | دے اس کا عابد بتاتے ہیں |
| لاهل الحيرة العباد | اہل حیرہ کو عباد اسی لیے |
| لانهم کانوا اهل | کہا جاتا تھا کہ وہ شاہان عجم |
| طاعة لملوك العجم[1] | کے اطاعت گزار تھے۔ |

لیکن علامہ زمخشری کا اور بعض دوسرے مفسرین نے یہاں بھی عابدین کے معنی عبادت گزار اور پرستار ہی کے اختیار کیے ہیں۔ ان کے خیال میں چونکہ فرعون مدعی الوہیت تھا اس لیے وہ لوگوں کو اپنا پرستار ہی سمجھتا تھا لیکن پہلے معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں چنانچہ علامہ محمود آلوسی فرماتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| والاولی تفسیر | عابدوں کی تفسیر خادموں |
| عابدون بخادمون | ہی سے کرنا بہتر ہے |

البتہ اس میں اہل لغت کا اختلاف ہے کہ عابد بمعنی خادم حقیقت ہے یا مجاز۔ علامہ خفاجی نے راغب سے تصریح نقل کی ہے کہ ان العابد بمعنی الخادم حقیقة[2] پ/۶ ۱۱/۳ ش/۲ ۲۰/۲۴

عٰبِدِیْنَ: عبادت کرنے والے، بندگی کرنے والے، پوجا کرنے والے، عِبَادَۃٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، عَابِدٌ کی جمع بحالت نصب وجر۔ آیہ کریمہ قُلْ اِنْ کَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِیْنَ (تو کہہ اگر ہو رحمٰن کو اولاد تو میں سب سے پہلے پوجوں) میں جمہور مفسرین نے عٰبِدِیْنَ کو عِبَادَۃٌ سے ہی مشتق مانا ہے۔ لیکن امام بخاری نے کتاب التفسیر میں اِنْ کَانَ کو بمعنے مَا کَانَ (نہیں ہے) اور عَابِدِیْنَ کو بمعنی اٰنِفِیْنَ (ناراض ہونے والے) بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| اول العابدين ای | یعنی رحمٰن کے اولاد نہیں سو |
| ما کان اول الآنفين | میں تو اولاد ماننے سے پہلا |
| وهما لغتان عابد | ناراض ہونے والا ہوں ناراض |
| وعبد[3] | ہونے والے کے لیے عابد |
| | اور عَبِدٌ دونوں لفظ استعمال |
| | ہوتے ہیں۔ |

اس معنی کے لحاظ سے عَابِدِیْنَ عَبِدَ یَعْبَدُ عَبَدًا (سمع) سے ہے جس کے معنی ناراض اور غصہ ہونے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر ہوگا۔ لیکن اس

[1] تفسیر ابن جریر ج ۱۰ ص ۱۹ طبع میریہ بولاق مصر ۱۳۲۵ھ [2] روح المعانی ج ۱۸ ص ۳۳ طبع منیریہ مصر
[3] صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۱۳ طبع مجتبائی دہلی۔

معنی پر ایک سخت اشکال یہ ہے کہ عَبِدَ یَعْبَدُ سے صیغہ صفت عَبِدٌ مستعمل ہے اور عَابِدٌ کا استعمال قلیل و نادر بلکہ شاذ و نادر استعمال کی بنیاد پر قرآن مجید کے معنی کرنا کیا معنی۔ چنانچہ قاضی محمد بن علی شوکانی جو متاخرین علماء میں بہت نامور ہیں رقمطراز ہیں:-

| | |
|---|---|
| لا شك ان عبدو | اس میں شک نہیں کہ عَبِدَ |
| اعبد بمعنی انف او | اور اعبد کا استعمال لغت |
| غضب ثابت فی اللغۃ | میں نفرت اور غصہ کے لیے |
| وکفی بنقل ھؤلاء | ثابت ہے۔ اور ان ائمہ |
| الائمۃ حجۃ ولکن | کی نقل اس کے بارے میں |
| جعل ما فی القرآن | حجت ہے لیکن قرآن مجید |
| من ھذا من التکلف | میں یہ معنی لینا بلا وجہ کا |
| الذی لا ملجأ الیہ | تکلف اور کھلی ہوئی بے |
| ومن التعسف الواضح | اعتدالی ہے چنانچہ ابن عرفہ |
| وقد رد ابن عرفۃ | نے ان لوگوں نے جو کچھ بیان کیا ہے |
| ما قالوہ فقال انما | اس کی تردید کی ہے اور کہا |
| یقال عَبِدَ یَعْبَدُ | ہے کہ عَبِدَ یَعْبَدُ، عَبِدٌ |
| فھو عَبِدٌ وقلما | تو بولا جاتا ہے مگر عَابِدٌ |
| یقال عابد والقرآن | کا استعمال اس باب سے |
| لا یأتی بالقلیل من | بہت کم ہوتا ہے۔ اور قرآن |
| اللغۃ ولا الشاذ[1] | کریم قلیل الاستعمال اور شاذ |
| | الفاظ کو نہیں لاتا ہے۔ |

جمہور کے معنی بالکل صاف اور واضح ہیں یعنی بفرض محال اگر خدا کے کوئی اولاد ہو تو سب سے پہلے میں اس کی عبادت کروں لیکن چونکہ اس کے لیے اولاد کا ہونا محال اس لیے میرا اس کی عبادت کرنا بھی محال۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے یوں کہا جاتے کہ اگر پانچ جفت ہوں تو وہ دو مساوی حصول پر برابر تقسیم ہوں گے۔ اب ظاہر ہے کہ پانچ کا جفت ہونا محال ہے۔ اسی طرح یہ آیت بھی قضیہ شرطیہ ہے کہ جس کے دونوں جز محال و ممتنع ہیں لیکن ان کے باہم لزوم صادق ہے پس اگر مقدم فی الواقع پایا جائے گا تو تالی کا وقوع بھی لازم ہوگا، ورنہ نہیں[2] قرآن مجید میں اس طرح کی تعلیق بالمحال اور جگہ بھی ہے مثلاً لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ سُبْحٰنَهٗ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ

[1] فتح القدیر ج ۳ ص ۵۵۰ طبع مصر [2] غرائب القرآن ورغائب الفرقان معروف بہ تفسیر نیشاپوری ج ۲۵ ص ۲، طبع امیریہ بولاق مصر ۱۳۲۹ھ برحاشیہ تفسیر ابن جریر طبری۔

Marfat.com

الْقَهَّارُ (اگر اللہ چاہتا کہ اولاد کرے تو چن لیتا اپنی مخلوق میں جو چاہتا، وہ پاک ہے، وہی ہے اللہ اکیلا دباؤ والا) یعنی بفرضِ محال اگر اللہ اولاد ہی چاہتا تو حسبِ زعمِ مشرکین بیٹیاں ہی لینے کی کیا ضرورت تھی چہیتی چیز یعنی بیٹے کیوں نہ لیتا لیکن چونکہ اللہ تعالےٰ کے لیے اولاد محال اس لیے بیٹا بیٹی سب محال پ ۱۷ ۵، ۶، ۷ پ ۲۵ ۱۳

عَابِرِیْ: گزرنے والے، عبور کرنے والے، راہ چلتے مسافر۔ عابری اصل میں عَابِرِیْنَ تھا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ میں سبیل کی طرف اضافت کی بنا پر حسبِ قاعدہ نحو نون جمع ساقط ہو گیا۔ یہ عَبْرٌ اور عُبُوْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر ہے اور عابر کی جمع ہے بحالتِ نصب عام لغت نویس عَبْرٌ اور عُبُوْرٌ دونوں کے معنی پانی پر سے گزرنے کے لکھتے ہیں، لیکن امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں ان کے باہم نہایت لطیف فرق بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"عَبْرٌ کے معنی ہیں اصل میں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف تجاوز کرنا لیکن عُبُوْرٌ کا استعمال پانی پر سے گزرنے کے لیے مخصوص ہے۔ تیر کر اسے پار کیا جائے یا کشتی میں بیٹھ کر خواہ اونٹ پر سوار ہو کر یا پل کے اوپر سے گزر کر"

آیہ شریفہ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا

اے ایمان والو نزدیک نہ ہو نماز کے جب تم کو نشہ ہو یہاں تک کہ سمجھنے لگو تم جو کہتے ہو اور نہ جب کہ جنابت میں مگر راہ چلتے ہوئے یہاں تک کہ غسل کر لو۔

میں "عابری سبیل" سے کیا مراد ہے اس بارے میں مفسرین سلف سے دو قول مروی ہیں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حسن بصری، ابراہیم نخعی، عکرمہ اور عمرو بن دینار نے اس کے معنی "راستے سے گزرنے والوں کے بیان کیے ہیں۔ اس صورت میں آیت شریفہ میں الصلوٰۃ سے "مساجد" مراد لینی ہوں گی۔ اور معنی یہ ہونگے کہ جب تم نشہ میں ہو تو مسجدوں کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو کہ کیا زبان سے نکال رہے ہو اور نہ مسجدوں کے قریب اس وقت جاؤ جب کہ تم جنبی ہو یہاں تک کہ غسل کر لو۔ البتہ راہ چلتے ہوئے گزر سکتے ہو۔ یعنی جنبی کو مسجد میں ٹھہرنے کی تو اجازت نہیں لیکن بغیر ٹھہرے گزرنے کی اجازت ہے چنانچہ جو حضرات یہ معنی کرتے ہیں ان کے نزدیک جنبی بحالت جنابت مسجد

Marfat.com

میں سے بغیر ٹھہرے گزر سکتا ہے۔ امام شافعی کی یہی رائے ہے۔

دوسرا قول حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ہے کہ "عابری سبیل" سے مراد مسافر ہیں۔ اکابر تابعین میں سے سعید بن جبیر، مجاہد اور حکم وغیرہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے دونوں قول مروی ہیں۔ اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ "تم نماز کے قریب نہ جاؤ جب کہ تم نشہ میں ہو یہاں تک جو کچھ تم زبان سے کہو اس کو سمجھنے لگو۔ اور اسی طرح جب تم جنابت کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ جبتک کہ غسل نہ کر لو ہاں اگر مسافر ہو تو اس حکم سے مستثنیٰ ہو کہ اس صورت میں بغیر غسل کے تیمم سے بھی نماز ادا کر سکتے ہو۔ اس تفسیر پر جنبی کو مسجد میں حق مرور حاصل نہیں چنانچہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک کا یہی مذہب ہے کہ جنابت کی حالت میں کسی کو مسجد میں جانے کی اجازت نہیں سنن ابی داؤد میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے:-

انی لا احل المسجد لحائض ولا جنب میں کسی حائضہ یا جنبی کے لیے مسجد کا داخلہ روا نہیں رکھتا

اس روایت پر چونکہ ابوداؤد نے سکوت اختیار کیا ہے اور کسی قسم کی کوئی جرح نہیں کی ہے۔ اس لیے حسب قاعدہ اصول حدیث اس کو حسن ہونا چاہیے چنانچہ حافظ جمال الدین زیلعی نے تصریح کی ہے وھو حدیث حسن [۲]

بہرحال اس میں تو کوئی اشکال نہیں کہ آیت دونوں معنی کی محتمل ہے۔ اور یہی صحابہ کے اختلاف کی بنیاد ہے۔ اب حضرات شافعیہ کا ذہن تو اس طرف گیا کہ اگر آیت "الصلوٰۃ" سے نفس صلوٰۃ مراد ہو تو نماز صلوٰۃ میں عبور کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے۔ اس لیے یہی مناسب ہے کہ "الصلوٰۃ" سے "موضع الصلوٰۃ" یعنی مسجد مراد لی جائے اور مضاف کو محذوف مان کر مضاف الیہ کو اس کا قائم مقام قرار دیا جائے۔ ان کی رائے میں پھر آیت کے اندر کسی لمبی تاویل کرنے یا حذف کثیر ماننے کی حاجت نہیں رہتی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عابری سبیل کے جو معنی دوسرے حضرات کر رہے ہیں وہ تو بعد والی فتیمموا صعیدا طیبا سے سمجھے ہی جاتے ہیں۔ پھر یہاں پر بھی وہی معنی مراد لینا کیا معنی۔

[۱] سنن ابی داؤد ص ۳۰ طبع اصح المطابع کراچی [۲] نصب الرایہ تخریج احادیث ہدایہ ج ۱ ص ۱۰۱ طبع علوی۔

Marfat.com

اور ہمارے علماء یہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے آیت کے شانِ نزول پر غور کرنا چاہیے چنانچہ عبد بن حمید ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم، نحاس اور حاکم نے اس سلسلہ میں جو روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ہماری دعوت کی تھی جس میں شراب بھی تھی چنانچہ شراب نے اپنا اثر دکھایا، نماز کا وقت ہو چکا تھا سب نے مجھے آگے کر دیا۔ میں نے قرأت شروع کی تو پڑھنے لگا قل یا ایہا الکفرون لا اعبد ما تعبدو ونحن نعبد ما تعبدون تب اللہ تعالیٰ[۱] نے آیت مذکورہ کو نازل فرمایا[۲]۔ امام ترمذی اس حدیث کو نقل کر کے لکھتے ہیں ھذا حدیث حسن غریب صحیح[۲]۔ اسی طرح قاضی علامہ ابوبکر بن العربی احکام القرآن میں لکھتے ہیں ھذا حدیث صحیح من روایۃ العدل عن العدل اب شان نزول سے یہ بات تو صاف ہو جاتی ہے کہ آیت کا نزول نماز کے بارے میں ہے نہ کہ مسجد کے متعلق اس لیے لفظ جب تک اس کے ظاہری معنی مراد لیے جا سکیں دوسرے معنی پر محمول کرنا درست نہیں۔

دوسرے لغت کے اعتبار سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن مجید میں لا تقربوا کے فتحہ کے ساتھ باب سَمِعَ سے آیا ہے۔ اور باب سمع سے اس کا استعمال قرب فعل کے لیے ہوتا ہے نہ قرب مکان کے لیے۔ لہٰذا یہاں مکان یعنی مسجد مراد لے کر اس کے ساتھ فعل کا تعلق کرنا صحیح نہیں، چنانچہ علامہ ابوبکر بن العربی مالکی رقمطراز ہیں:

| | |
|---|---|
| فانہ تعالیٰ قال | کہ اللہ تعالیٰ نے تو لا تقربوا |
| لا تقربوا بفتح الراء | را کے زبر سے ارشاد فرمایا ہے |
| وذلك یکون فی | اور یہ قرب فعل کے لیے آتا ہے |
| الفعل الحقی المکان | نہ قرب مکان کے لیے لہٰذا مکان |
| فکیف یصح المکان | کو مضمر ماننا کہ اس کے غیر |
| ویوصل لغیر فعلہ | مناسب فعل کے ساتھ اس |
| ھذا محال وتقدیر | کو کس طرح ملایا جا سکتا ہے |
| الأیۃ انہ قال | یہ تو محال ہے اور تقدیر آیت |
| سبحانہ لا تصلوا | یوں ہوگی لا تصلوا سکاریٰ |
| سکاریٰ ولا جنبا | ولا جنبا الا عابری سبیل |
| الا عابری سبیل[۳] | یعنی نشہ کی حالت میں نماز |

[۱] الدر المنثور فی التفسیر بالماثور از امام سیوطی ج ۲ ص ۱۶۴ و ۱۶۵ طبع مصر [۲] جامع ترمذی طبع احمدی ص ۱۹۲ ج ۲ طبع ۱۲۶۶ھ [۳] احکام القرآن از ابن العربی ج ۱ ص ۱۸۲ - طبع السعادہ مصر ۱۳۳۱ھ -

اور کہ وہ جنابت کی حالت

میں مگر سفر کی حالت مستثنیٰ ہے

تعجب ہے لغت کے اس دقیق فرق کو صاحب قاموس بھی نظر انداز کر گئے اور صرف اتنا لکھ کر رہ گئے قرب منہ ککرم وقرب کسمع الا خر شارح قاموس علامہ سید مرتضیٰ زبیدی کو اس پر تنبیہ کرنی پڑی کہ۔

"مصنف کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں مترادف ہیں حالانکہ اہل اصول نے ان کے باہم فرق بیان کیا ہے کہ جب لا تقرب کذا بفتح الراء کہا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کام کو انجام نہ دو اور جب بضم راء ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ قریب نہ ہو"

(تاج العروس)

رہی یہ بات کہ تیمم کا حکم تو بعد والی آیت سے سمجھا ہی جاتا ہے پھر یہاں بھی جنبی کے لیے بحالت سفر تیمم کی اجازت کے معنی مراد لینا کیا معنی تو اس کا جواب مولانا سید امیر علی مرحوم صدر مدرس دارالعلوم ندوۃ العلماء مترجم فتاویٰ عالمگیری و ہدایہ نے اپنی بیش بہا تفسیر مواہب الرحمٰن میں خوب ارقام فرمایا ہے، فرماتے ہیں:۔

"رہا یہ کہ مابعد میں بیان حکم مسافر سے تکرار لازم آتی ہے تو یہ میرے نزدیک کسی طرح علم نہیں بلکہ یہ تو اضعف الاضعف ہے حاصل اس وجہ سے کہ الا عابری سبیل سے استثناء کیا گیا ہے مطلق اس کے کوئی حکم اس کا بیان ہو پس صحیح تو یہ ہے کہ حکم سے سکوت ہے اور اگر مستثنیٰ منہ کے حکم کے خلاف مفہوم سے نکالا جاتا ہے تو مفہوم مخالف حجت نہیں۔ اور اگر مان لیا جائے تو اس سے یہ کب ثابت ہوا کہ مسافر اگر پانی نہ پاوے تو نماز پڑھے کیونکہ اتنا نکلتا ہے کہ مسافر ہو تو نماز پڑھے اور مابعد میں یہ قید مذکور ہے کہ مسافر ہو اور پانی نہ پاوے تو تیمم کرکے پھر نماز پڑھے۔ اب فرمائیے کہ تکرار کہاں لازم آتی ہے"[1]

اور قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں:۔

"ہمارے نزدیک جنبی کو مسجد میں گزرنے کی اجازت نہیں کیونکہ اجازت ہونے کی صورت

[1] مواہب الرحمٰن المشتہر بجامع البیان ج ۵ ص ۶۳ طبع نول کشور پریس لکھنؤ۔

میں آیت کے معنی مضاف کو مقدر ماننے پر موقوف رہیں گے۔ حالانکہ اصل عدم تقدیر ہے۔ (یعنی اصل قاعدہ یہی ہے کہ جہاں تک بن پڑے عبارت میں کسی لفظ کو مقدر ماننے سے احتراز کیا جائے) نیز اگر آیت کے معنی یہ لیے جائیں کہ مواضع صلوٰۃ کے پاس نہ جاؤ تو اس سے جنبی کے لیے گھروں کی مساجد[1] میں داخلہ کی حرمت بھی لازم ہوگی حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں۔

نیز یہ تفسیر کہ نزدیک جاؤ نماز کی جگہوں کے درانحالیکہ تم نشہ میں ہو یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو کہ تم کیا بول رہے ہو بےمعنی ہے کیونکہ آیت قرب صلوٰۃ سے نہی کے بارے میں صریح ہے اور معطوف میں کسی ایسی چیز کا مقدر ماننا کہ جو معطوف علیہ میں مذکور یا مقدر نہ ہو کسی طرح ممکن نہیں[2]"

یہاں یہ بھی واضح کرنا ضروری ہے کہ قاضی شوکانی اور ان کے مقلد جامد نواب صدیق حسن خان کو "عابر سبیل" سے مسافر کے مراد لینے میں ایک گونہ تکلف نظر آتا ہے اور عبور سبیل بمعنی راہ سے گزر جانا بے تکلف معلوم ہوتا ہے اور اسی بنا پر ان کے نزدیک گو اور وجوہ سے مسافر کے معنی یہاں مراد لینا قوی ہیں لیکن اس اعتبار سے اس میں ایک قسم کا ضعف ہے۔

سو "عابر سبیل" سے مسافر مراد لینا کچھ مستبعد نہیں حدیث میں آتا ہے کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل دنیا میں اس طرح رہ گویا کہ تو اجنبی اور مسافر ہے حقیقت اور لازم دونوں کے اعتبار سے مسافر کو "عابر سبیل" کہا جاتا ہے امام ابوبکر جصاص رازی فرماتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| وانما سمی المسافر عابر | مسافر جس طرح ابن السبیل سے |
| سبیل لانہ علی الطریق | موسوم ہے اسی طرح اس کا |
| کما یسمی ابن السبیل[5] | نام "عابر سبیل" بھی ہے کیونکہ |

[1] اپنے گھر کے اندر جو جگہ علیحدہ عبادت کی غرض کے طور پر مخصوص کر لی جاتی ہے وہ "مسجد بیت" کہلاتی ہے عورتوں کے لیے اسی میں اعتکاف کا حکم ہے۔

[2] تفسیر مظہری ج ۲ سورۂ نساء ص ۱۱۶ طبع جید برقی پریس دہلی [3] ترغیب و ترہیب منذری مجلد بخاری و ترمذی ج ۵ ص ۲ طبع مصر ۱۳۰۵ھ [4] ملاحظہ تفسیر فتح القدیر ج ۱ ص ۴۳۴ اور نیل المرام ص ۱۷۲ تفسیر آیات الاحکام ص ۱۷۱ طبع علوی نواب صاحب نیل المرام میں بجز تلخیص تنقیدی ہے وہ حرف بحرف قاضی شوکانی کی تفسیر کا سرقہ ہے مگر داد دیجئے ہر شیاری کی کہ کہیں قاضی کا نام تک نہیں لیا۔

[5] احکام القرآن از امام جصاص ج ۲ ص ۲۵ طبع مصر ۱۳۴۷ھ۔

وہ راستہ پر لگا ہوا ہے

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ عام طور پر مسائل فقہیہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابراہیم نخعی کا (جو امام صاحب کے استاذ الاستاذ ہیں) مسلک ہی اختیار فرماتے ہیں۔ چنانچہ فقہ حنفی کا مدار بیشتر ان ہی دونوں بزرگوں کے فتاوی پر ہے لیکن اس مسئلہ میں امام صاحب نے ان حضرات کی رائے سے اتفاق نہیں فرمایا، اور امام شافعی رحمہ اللہ نے جو عام طور پر مسائل خلافیہ میں دوسری طرف جاتے ہیں یہاں اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔

ہ
ش
عَاتِيَةٌ : حد سے نکل جانے والی، نافرمان
عُتُوٌّ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث، یہاں عَاتِيَةٌ باد صرصر کی صفت ہے جو قوم عاد پر ان کی سرکشی کی پاداش میں بصورت عذاب بھیجی گئی تھی۔ قاضی شوکانی لکھتے ہیں :-

"عاتیۃ وہ جو اطاعت سے گردن تابی کرے گویا وہ فرشتگان ہوا سے سرکشی کر رہی تھی ان کی اطاعت نہیں کرتی تھی اور وہ اس کے تیز و تند چلنے کے باعث اس کے تھامنے پر قابو نہ پا رہے تھے یا عاد کے خلاف اس نے سرکشی کی یعنی کہ وہ اس کو روک نہ سکے بلکہ الٹا اس نے ہی انہیں تباہ کر ڈالا[1]"

ابن جریر طبری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالے نے جب بھی کوئی ہوا بھیجی ایک خاص مقدار سے بھیجی۔ اسی طرح جب بھی پانی کا کوئی قطرہ نازل فرمایا ایک مخصوص پیمانہ سے نازل فرمایا بجز یوم نوح اور یوم عاد کے۔ کہ یوم نوح میں پانی فرشتگان آب کے کہنے سے باہر تھا اور اس روز ان کا اس پر کچھ قابو نہ تھا۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی اِنَّا لَمَّا طَغَى الْمَاءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ بیشک جس وقت پانی بے قابو ہوا تو ہم نے تم کو کشتی میں لاد لیا، اسی طرح یوم عاد میں ہوا فرشتگان ہوا کے کہنے سے باہر تھی اور ان کا اس پر کچھ زور نہ چل رہا تھا۔ پھر تلاوت فرمایا بِرِيحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ یعنی ایسی سنسناتی ہوا سے جو ان کے ہاتھوں سے نکلی جاتی۔ ابن جریر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی مضمون کی

[1] فتح القدیر ج ۵ ص ۲۰۲ طبع مصر۔

روایت نقل کی ہے[1]۔ شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی نے
جو "عاتیہ" کا ترجمہ ہاتھوں سے نکل جاتی کیا ہے
وہ اسی اعتبار سے ہے (ملاحظہ ہو عُتُق)

۲۹/۵

**عَاجِلَة**: جلد ملنے والی، دنیا اور دنیا کی آسودگی
مراد ہے۔ عَجَلٌ اور عَجَلَةٌ سے اسم فاعل کا صیغہ
واحد مؤنث (ملاحظہ ہو عَجَل) ۱۵/۲

۲۹/۲۰،۱۶

**عَاد**: حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں
ایک شخص گزرا ہے جس کا سلسلہ نسب تین واسطوں
سے حضرت نوح علیہ السلام سے جا ملتا ہے بعد
میں اس کی نسل بھی اسی نام سے موسوم ہوئی
جو طوفان نوح کے بعد ملک عرب میں سب سے
پہلی با اقتدار حکمراں قوم تھی۔

لفظ "عاد" کے لغوی معنی کیا ہیں اس کے
متعلق مولانا سید سلیمان ندوی ارض القرآن میں
لکھتے ہیں:

"السنہ سامیہ میں لٹریچر کے لحاظ سے عبرانی
سب سے قدیم زبان ہے جس کا نتیجہ یہ ہے
کہ قدیم الفاظ کی اصلیت عربی سے زیادہ اس میں
محفوظ ہے، لغوی حیثیت سے عربی میں
عاد کے کوئی معنی نہیں ملتے۔
عبری میں "عاد" کی اصلیت موجود ہے
עד کے معنی "بلند و مشہور" کے ہیں اور جیسے
یہ کہ "ارم" ארם اور "شم" (سام) کے بھی
یہی معنی ہیں۔ ان معنوں کا بقیہ اثر عربی میں
بھی موجود ہے۔ ارم کے معنی پہاڑی اور
نشان راہ کے پتھر کے لغت میں مذکور ہیں اور
"شم" سے "شمم" اور "سمو" تو اب تک مستعمل
ہیں۔ توراۃ میں "عاد" مذکر کے لیے اور
"عادہ" عورتوں کے لیے کئی جگہ آیا ہے
جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عہد قدیم میں یہ
نام عموماً مستعمل تھا"[2]

تاج العروس میں ابن سیدہ سے منقول ہے کہ
ہم نے "عاد" کے الف کے بارے میں یہ فیصلہ کیا
ہے کہ وہ واؤ ہے کیونکہ اس مادہ کا واؤ کے ساتھ
استعمال کثیر ہے اور عربی زبان میں ع۔ی۔د
کے مادہ کا وجود نہیں۔ رہا عید اور اعیاد سو یہ
بدل لازم ہیں۔
منصرف ہے یا غیر منصرف اس کے متعلق

[1] ملاحظہ ہو تفسیر ابن جریر۔ ج ۲۹ ص ۱۳۲۔ میریہ مصر [2] ارض القرآن۔ ج ۱ صفحہ ۱۲۱ طبع معارف اعظم گڑھ ۱۳۴۲ھ

علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں :-

"عاد اصل میں قبیلے کے مورث اعلیٰ کا نام ہے۔ پھر قبیلہ یا حی (خاندان) کو اس نام سے موسوم کیا گیا سو اس کا منصرف اور غیر منصرف ہونا دونوں جائز ہیں جیسا کہ سیبویہ نے ذکر کیا ہے[1]

اور امام قرطبی فرماتے ہیں :-

"کسائی نے بیان کیا ہے کہ بعض اہل عرب عاد کو غیر منصرف بولتے ہیں اور اس کو قبیلہ کا نام قرار دیتے ہیں"[2]

اور سورہ شعراء میں لکھتے ہیں کہ عاد کی تانیث قبیلہ اور جماعت کے معنی کے لحاظ سے ہے" اور روح المعانی میں ہے کہ

"عاد منصرف ہے حی کے معنی کے اعتبار سے اور قبیلے[3] کے معنی کے لحاظ سے اس کو غیر منصرف بھی بولا جاتا ہے چنانچہ ضحاک نے اس کو ایک روایت میں غیر منصرف ہی کہا ہے اور چونکہ یہ ساکن الاوسط ہے اس لیے خفت کے اعتبار سے اس کے منصرف ہونے ہی کو ترجیح دی گئی ہے . . . لیکن میں نے تفسیر بیضاوی کے حواشی عصامیہ پر بعض افاضل کی تعلیقات میں یہ دیکھا ہے کہ اگر یہ علمیت و عجمہ کی بنا پر غیر منصرف ہی ہوگا خواہ اسے قبیلہ کا نام قرار دیا جائے یا جد قبیلہ کا، اور گو یہ دونوں باتیں عاد میں بھی موجود ہیں لیکن چونکہ وہ ثلاثی ساکن الاوسط ہے اس لیے اس میں صرف و عدم صرف دونوں جائز ہیں"[4]

بہر حال سیبویہ اور کسائی کے بیان کے مطابق اس کے غیر منصرف ہونے کی وجہ تانیث اور علمیت ہوگی اور اس صورت میں یہ قبیلہ کا نام ہوگا۔ اور منصرف ہونے کی وجہ یہ ہوگی کہ یہ حی کے معنی میں ہے جو مذکر ہے لہذا صرف علمیت کی بنا پر غیر منصرف نہیں ہو سکتا ہے۔ اور فاضل مذکور کی تصریح کی بنا پر اس کے عدم صرف کی وجہ علمیت اور عجمہ اور صرف کی وجہ ثلاثی ساکن الاوسط ہونا،

[1] روح المعانی ج ۸ ص ۱۵۲ طبع مصر [2] الجامع لاحکام القرآن ج ۷ ص ۲۳۵ طبع دارالکتب المصریہ ۱۳۵۵ھ

[3] ادیب لغوی محمد بن احمد خوارزمی مفاتیح العلوم میں لکھتے ہیں۔ حی اور قبیلہ کے مابین فرق یہ ہے کہ حی میں بنو فلاں نہیں کہا جاتا جیسے قریش، ثقیف، معد اور جذام ہیں۔ اور قبائل میں بنو فلاں کہا جاتا ہے جیسے بنو تمیم، بنی سلول (کتاب مذکور ص ۴، طبع منیریہ مصر ۱۳۴۲ھ) [4] روح المعانی ج ۳۰ ص ۱۲۳، ۱۲۴ طبع مصر

لیکن دونوں صورتوں میں بوجہ خفت اس کا منصرف ہونا ہی راجح ہے اور یہی جمہور کی قرأت ہے۔

علامہ احمد بن محمد بن علی مصری فیومی المتوفی ۷۷۰ھ

المصباح المنیر فی غریب الشرح الکبیر میں لکھتے ہیں:

" عاد عرب اولیٰ کے ایک شخص کا نام ہے جس کے نام پر قوم ہود کا قبیلہ موسوم ہے۔ اور قدیم العہد سلطنت کو عادی کہا جاتا ہے گویا وہ بھی قدامت عہد کی بنا پر عاد ہی کی طرف منسوب ہے اسی طرح پرانے کنوئیں کو بئر عادیۃ اور اس زمین کو جو قدیم سے ملکیت میں چلی آتی ہو عادی الارض بولتے ہیں۔ نیز اہل عرب عام طور پر مضبوط عمارتوں اور کنوؤں کو کہ جن کی منڈیریں پختہ ہوں اور جن میں پانی خوب ہو عاد کی طرف منسوب کر دیتے ہیں"

اور علامہ محمود آلوسی ارقام فرماتے ہیں،

" عاد سے مراد اولاد عاد بن عوص ارم بن سام ابن نوح علیہ السلام ہے اور یہی حضرت ہود علیہ السلام کی قوم ہے' یہ اپنے باپ کے نام سے موسوم ہیں جس طرح بنو ہاشم ہاشم کے نام سے۔ اور باپ کا نام اس کی قوم پر بولا جانا مجازاً شائع ذائع ہے، یہاں تک کہ بعض نے تو اسے حقیقت ہی قرار دے دیا ہے ان کے اگلوں کو عاد اولیٰ اور پچھلوں کو عاد آخرہ کہا جاتا ہے۔ عماد الدین بن کثیر نے کہا ہے کہ قرآن مجید میں باستثناء سورہ احقاف جہاں بھی عاد کا واقعہ مذکور ہے اس سے " عاد اولیٰ " ہی مراد ہیں۔

اور ان ہی کو ان کے دادا کے نام پر ارم بھی کہا جاتا ہے۔ دادا کے نام پر پورے قبیلہ کا نام رکھ دینا بھی شائع ذائع ہے مگر یہ نام عاد اولیٰ کے ساتھ مخصوص ہے[1]

یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ تاریخ قدیم کے بعض یورپین مصنفین عاد کو محض ایک فرضی اور مذہبی فسانہ خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ مشہور مستشرق نولدیکی نے کہ جو یورپ کی سرزمین پر شرقیات اور تاریخ کا سب سے بڑا فاضل سمجھا جاتا ہے، عاد اور عمالیق کی تحقیق میں ایک رسالہ لکھا جس میں ثابت کیا ہے کہ یہ غیر تاریخی قومیں ہیں۔ لیکن یہ کوئی نئی اُپج نہیں قدیم زمانہ میں

[1] روح المعانی ج ۳۰ ص ۱۲۲ طبع منیریہ مصر۔

بھی بعض یورپینوں کو ان کے وجود سے انکار تھا چنانچہ امام ابن جریر طبری نے جو مشہور مؤرخ ہیں عاد کے حالات میں لکھا ہے۔

"بعض یورپینوں نے عاد سے انکار کیا ہے حالانکہ اشعار جاہلیت میں ان کا نہایت کثرت سے تذکرہ ہے اگر خوف تطویل نہ ہوتا تو میں ان کو نقل کرتا"

لیکن یہ نہایت فاش غلطی ہے۔ عاد و ثمود کے واقعات عرب کے مشہور ترین واقعات ہیں جن کا علم خود ان کو ذاتی طور پر حاصل تھا۔ کیوں کہ عاد و ثمود کی آبادیاں خود ان کے اندرون ملک کی آبادیاں تھیں اور ان کے حالات و واقعات خاندانی طور پر ان میں نقل ہوتے چلے آتے تھے۔

مشہور مؤرخ ابن ہشام کلبی نے جس کا مخصوص موضوع عرب جاہلیت کی تاریخ و روایت ہے ان کے حالات میں تین مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں پہلی کتاب کا نام تفرق عاد ہے یعنی عاد کی قوم عرب سے نکل کر کہاں کہاں گئی اور دوسری کتاب کا نام ہے کتاب من نقل من عاد و ثمود والعالیق وجرهم وبنی اسرائیل من العرب یعنی عاد و ثمود عمالیق جرہم اور بنی اسرائیل جو عرب سے نکل کر باہر گئے ان کے حالات" تیسری کتاب کا نام ہے،

یعنی عاد اولیٰ اور عاد ثانیہ کے حالات۔

بطلیموس نے اپنے جغرافیہ میں جنوبی عرب کے قبائل میں عاد ریشیا اور عاد ائٹ کا ذکر کیا ہے ظاہر ہے کہ پہلا نام عاد ارم اور دوسرا عاد ہے جس کو یونانی تلفظ نے یہ صورت دے دی ہے بطلیموس دوسری صدی عیسوی میں تھا اس بنا پر عاد کا وجود اس زمانہ تک مسلم ہے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں عبدالرحمٰن مصر کے گورنر تھے۔ انہوں نے حضرموت کے منہدم شدہ قلعہ حصن غراب پر ایک کتبہ پایا تھا۔ یہ کتبہ علامہ نوری نے اپنی کتاب مسالک الا... میں نقل کیا ہے ۱۸۳۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک مشن یمن بھیجا تھا۔ اس کو یہی کتبہ اصل قدیم حمیری خط میں ملا، یہ کتبہ فارسٹر صاحب کی تحقیق کے مطابق قوم عاد کا ہے اور عرب کے قدیم ترین کتبات میں ہے جس کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اٹھارہ سو برس قبل کا ہے۔ یہ کتبہ ایک منہدم عمارت میں پتھر پر کندہ تھا۔ ایک انگریز افسر جس کا نام ولسٹڈ تھا اس کا مکتشف تھا اور یہ سب سے پہلا عربی کتبہ...

ہے جو یورپ نے عرب کی سرزمین میں دریافت کیا اصل کتبہ اور اس کا حل رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں چھپا تھا۔ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے اس کا پورا ترجمہ "عاد ثانیہ" کی تحقیق میں اپنی مشہور کتاب ارض القرآن میں درج کر دیا ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے:۔

"ہم مدت تک اس وسیع قصر میں رہے ہماری حالت بدنصیبی اور ادبار سے دور تھی، ہماری نہروں میں دریا کا پانی اُمڈا آتا تھا، سمندر موجیں مارتا ہوا ہمارے قلعہ کی دیواروں سے غضبناک ہو کر ٹکریں مارتا تھا، ہمارے چشمے خوش آیند آواز سے بہتے تھے۔ بلند کھجوروں کے اوپر جن کے باغبان خشک چھوہارے ہماری وادیوں کے چھوہاروں کی زمینوں میں لگاتے تھے اور خشک چاول بوتے تھے (؟) ہم پہاڑی بکروں کا اور جوان خرگوشوں کا شکار پنجروں اور جالوں سے کرتے تھے اور مچھلیوں کو بہلا بہلا کر باہر نکال لیتے تھے اور ہم آہستہ آہستہ خراماں رنگ برنگ کے ریشم کے کپڑے اور کاہی سبز مختلف الالوان جامہ پہن کر چلا کرتے تھے اور ہم پر وہ بادشاہ حکومت کرتے تھے جو کمینہ خیالات سے بہت دور اور شریروں کو سزا دینے والے تھے۔ ہود کی شریعت کے مطابق اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے اور ہم معجزات کا یقین رکھتے تھے قیامت کے رانہ اور نتھنوں کے رواد پہ ایمان تھا۔ راہزنی (دشمن) گھس آتے اور وہ ہمارے ساتھ کچھ جھگڑا کرتے مگر ہم نے گھوڑوں کو لو پیہ ڈال دیا اور ہمارے کریم نوجوان سخت اور نوک دار نیزوں کو لے کر آگے بڑھے، ہمارے خاندان کے مغرور بہادر مرد اور عورتیں گھوڑوں پر لڑ رہی تھیں جن کی گردنیں لمبی تھیں اور جو چمکدار کمیت رنگ کے تھے ہماری تلواریں بدستور دشمنوں کو زخمی کر رہی تھیں اور چھید رہی تھیں یہاں تک کہ ان کے قلب پر حملہ کر کے ان کو مفتوح اور بالکل پست کر دیا جو بدترین نوع انسان تھے"

یہ کتبہ متعدد حیثیات سے قرآن عظیم کی تائید کرتا ہے۔ اوّل یہ کہ حضرت ہود علیہ السلام کی تاریخی شخصیت ثابت ہے، ثانیاً یہ کہ قبایا سے عاد عرف متبعین ہود علیہ السلام تھے۔ ثالثاً یہ کہ عاد ثانیہ کے عماد

اور عمارتوں کے بانی تھے۔ رالبغایہ کروہ حقیقۃً جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا ہے بڑے بڑے باغ چشمے آل اولاد اور چوپایوں کے مالک تھے۔

لفظ عدن کی حقیقت پر بھی غور کر لیجیے جو ساحل یمن و حضرموت کا مشہور شہر ہے۔ عہد قدیم میں عموماً عربوں کا یہ دستور رہا ہے کہ آبادی کا نام اس کے بانی کے نام پر مشہور ہو جاتا تھا۔ چنانچہ عرب کے قدیم ترین شہر رقیم، سبا، حضرموت، عمان، مدین، اوفر، حویلہ، تیما، وغیرہ کے نام اسی طرح پر رکھے گئے ہیں۔ اس طرح اگر یمن کا قدیم ترین شہر عدن بھی اگر اپنے آباد کرنے والوں کے نام پر اصل میں "عادیین" ہو اور بعد میں کثرت استعمال کی بنا پر مخفف ہو کر عدن رہ گیا ہو تو کیا تعجب کا مقام ہے جب کہ اس کے قریب وہ تمام عمارات واقع ہیں جن کو عرب عادیات کہتے ہیں اور تاریخ سے اسی کے قرب و جوار میں عاد کی آبادی کا پتہ چلتا ہے۔ لے

بہر حال عاد کا انکار تاریخ کی ایک مسلمہ حقیقت کا انکار ہے۔ تاریخ اور اکتشافات عصریہ دونوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ عرب کے قدیم باشندے ... کثیر التعداد اور باعظمت و جبروت قوم تھی۔ جن کا زمانہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے قبل کا زمانہ ہے عرب مورخین ان کو عرب عاربہ یعنی خالص عرب کہتے ہیں، یہ بہت سے قبائل تھے، مورخ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں ان میں حسب ذیل بارہ قبائل نام بنام گنائے ہیں۔ ۲ے

(۱) عاد (۲) ثمود (۳) جرہم (۴) طسم (۵) جدیس (۶) امیم (۷) مدین (۸) عملاق (۹) وعبیل (۱۰) جاسم (۱۱) قحطان (۱۲) بنو یقطن۔ ۲ے

ان قبائل کو "امم بائدہ" بھی کہا جاتا ہے یعنی برباد شدہ قومیں، کیونکہ زمانہ نے ان کا نام و نشان مٹا کر رکھ دیا۔ ان میں سے عاد، ثمود، جرہم، لیـ... طسم اور جدیس وغیرہ مشہور قبائل ہیں اور اشـ... جاہلیت میں ان کا ذکر کثرت سے آیا ہے قبیلہ عاد ان قبائل میں سب سے زیادہ کثیر الا... باعظمت جمعیت تھی جو تمام عرب بائدہ میں شوکـ... وجبروت کے اعتبار سے ممتاز تھی۔ اور نو... علیہ السلام کی قوم کی بربادی کے بعد خلافت ارضـ...

لے عاد کے تاریخی ثبوت کی یہ بحث تمام تر ارض القرآن جلد اول سے ماخوذ ہے جو کتاب مذکور کے جستہ جستہ التقاط سے مرتب کی گئی ہے ۲ے ملاحظہ ہو کتاب مذکور ج ۱۔ ص ۱۲۰ طبع مصر ۱۳۵۱ھ۔

Marfat.com

اسی کے حصہ میں آئی تھی۔ یہی قوم تھی جو دنیا کی قدیم ترین تہذیب کی بانی تھی۔ بڑی بڑی عظیم الشان عمارتیں اسی کی دستکاری کا نتیجہ تھیں۔ قرآن مجید میں جو اس قوم کا بار بار ذکر آیا ہے وہ اسی لیے کہ اہل عرب کے لیے خود ان کے ملک کے اندر اس قوم کی تاریخ زندگی میں عبرت کا بہت بڑا مرقع تھا۔

عاد کے مسکن کے متعلق تفصیلی بحث احقاف کے ضمن میں سپرد قلم کی جاچکی ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ قوم عاد کے متعلق عام طور پر نہایت لغو باتیں مشہور ہیں، مثلاً شداد کی جنت کا قصہ کہ اس میں سونے چاندی کی اینٹیں تھیں اور لعل و گوہر کی پچی کاری۔ اس کے سنگریزے جواہر کے تھے اور مٹی مشک و عنبر کی وغیرہ وغیرہ مفسرین کی ایک جماعت نے اس قصہ کو اپنی تفسیروں میں نقل کر ڈالا ہے اور ثعلبی وغیرہ نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں عبداللہ بن قلابہ اس کی سیر بھی کر آئے تھے اور تعجب یہ ہے تفسیر قرطبی اور تفسیر عزیزی تک میں یہ قصہ بحوالہ تو منقول ہے، لیکن یہ محض ایک بے اصل افسانہ ہے جس کی کچھ حقیقت نہیں ہے۔ چنانچہ

قاضی محمد بن علی شوکانی نے اس کی تردید بڑے زور شور سے کی ہے، فرماتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| وھٰذا کذب علیٰ | اور یہ جھوٹ پر جھوٹ اور |
| کذب وافتراء علی | افتراء پہ افتراء ہے اسلام |
| افتراء وقد اصیب | اور اہل اسلام اس قسم کے |
| الاسلام و اھلہ | جھوٹے دجالوں سے کہ جو کبھی بنی اسرائیل اور کبھی انبیاء پہ اور کبھی صالحین |
| بداھیۃ دھیاء و | |
| فاقرۃ عظمیٰ ورزیۃ | پہ اور کبھی خود رب العٰلمین |
| کبریٰ من امثال | پہ دروغ بیانی کی جرأت |
| ھٰؤلاء الکذابین | کر بیٹھتے ہیں، سخت مصیبت |
| الدجالین الذین | اور عظیم نقصان اور بڑی |
| یجترؤن علی الکذب | پریشانی لاحق ہوئی۔ اور پھر |
| تارۃ علیٰ بنی اسرائیل و تارۃ علی الانبیاء | ایسے لوگوں کے تصنیف اور |
| وتارۃ علی الصالحین | کتاب اللہ کی تفسیر میں پیش |
| وتارۃ علیٰ رب العٰلمین | پیش ہو جانے سے کہ جن |
| وتضاعف ھٰذا الشر | کو صحیح ضعیف اور موضوع |
| وزاد کثرۃ بتصدر | روایات کا پتہ نہیں یہ برائی |
| جماعۃ | دونی ہوگئی اور کثرت |
| من الذین | سے بڑھ گئی۔ کیوں کہ |
| لا علم لھم تصحیح الروایۃ | انہوں نے ان من گھڑت |
| من ضعیفھا و | خرافات اور خود ساختہ |

Marfat.com

موضوعها للتصنيف فسانوں اور بنائے
التفسير الكتاب العزيز ہوئے قصوں کو
فادخلوا هذه الخرافات کتاب اللہ کی تفسیر
المختلفة والأقاصيص میں داخل کر کے
المنحولة والأساطير بڑی تحریف
المفتعلة في كتاب الله اور تغییر و تبدل
سبحانه فحرفوا وغيروا کر ڈالا۔
وبدلوا ؎۱

ملاحظہ فرمایا تردید میں کیا زور لگایا ہے
لیکن یہی بزرگ ہیں جنہوں نے سورۂ اعراف
میں عاد کے قد و قامت، ڈیل ڈول انسان
کی جسامت کے بارے میں عجیب و غریب باتیں
بے تکلف نقل کر ڈالی ہیں جو درج ذیل
ہیں۔ فرماتے ہیں:-

"ابن عساکر وہب سے راوی ہیں کہ عاد
کا ہر شخص ان کے گز کے اعتبار سے ساٹھ
گز کا ہوتا تھا۔ اور اس کی کھوپڑی قبہ سے
گنبد کے مانند ہوتی تھی اور آنکھ اور اسی طرح
ان کی ناک اتنی بڑی تھی کہ جس میں درندے
کے بچے پیدا ہو جائیں، اور عبد بن حمید
نے قتادہ سے روایت کی ہے کہ ان کی

قامت کی درازی بارہ گز کی تھی، اور حکیم ترمذی
نے نوادر الاصول میں حضرت ابن عباس
رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ ان
کا قد اسی ہاتھ لمبا اور گیہوں کا دانہ ان
کے یہاں گائے کے گردے کے برابر
تھا۔ اور انار اتنا بڑا ہوتا تھا کہ جس کے
چھلکے میں دس آدمی بیٹھ جائیں، اور عبد اللہ
بن احمد نے زوائد الزہد میں نیز ابن ابی حاتم
نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ
سے روایت کی ہے کہ قوم عاد کا ایک
شخص پتھر کے دروازہ کا ایک پٹ اتنا
بڑا بناتا تھا کہ اس امت کے پانچ سو مل
کر اس کو اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتے
اور اگر عاد کا کوئی آدمی زمین میں اپنا
پاؤں دھنساتا تو دھنس جاتا تھا ؎۲"

اب یہاں بجائے اس کے کہ قاضی صاحب
ان حکایات واہیہ کی تردید کرتے یہ کہہ کر کہ
وقد ورد عن السلف قوم عاد کے بڑے بڑے
حكايات عن عظم ڈیل ڈول ہونے میں سلف
اجرام قوم عاد ؎۳ سے بہت سے قصے منقول ہیں

؎۱ تفسیر فتح القدیر ج ۲ ص ۲۴۳ طبع بابی حلبی مصر ؎۲،۳ کتاب مذکور ج ۲ ص ۲۰۸-

Marfat.com

اور ان پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اصل میں بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں ان کے متعلق مذکور ہے:۔

وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَسْطَةً۔ اور زیادہ دیا تم کو بدن میں پھیلاؤ۔

قاضی صاحب اس آیت سے یہ سمجھے کہ یہاں کے قد و قامت کی درازی اور ان کے ڈیل ڈول کی بڑائی کا بیان ہے چنانچہ وہ اس کی تفسیر ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

ای طولا فی الخلق و عظم جسم زیادة علیٰ ما کان علیہ اباؤھم فی الابدان [1] یعنی خلقت میں درازی اور جثہ میں بڑائی کہ جو ان کے باپ دادا کے قد و قامت سے کہیں زیادہ تھے۔

حالانکہ بَصْطَةً سے مقصود زور و قوت کا بیان ہے یعنی اللہ تعالےٰ نے تمہارے بدن میں زور و توانائی زیادہ دی۔ لطف یہ کہ خود قاضی صاحب نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بروایت ابن ابی حاتم و ابوالشیخ بَصْطَةً کی تفسیر شِدَّةً قوت (زور و طاقت) سے نقل کی ہے [2]۔ غور فرمائیے دوسری جگہ خود قرآن مجید میں حضرت طالوت کے متعلق بھی یہی ارشاد ہوتا ہے۔

وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ۔ اور اللہ نے ان کو زیادہ کشائش دی عقل میں اور بدن میں

اب اس سے یہ کون سمجھے گا کہ طالوت بہت ہی قد آور تھے بلکہ یہاں کے صاحب زور و قوت ہونے کا بیان ہے۔

اسی طرح سورہ الفجر میں عاد کو ذَاتِ الْعِمَادِ (ستون والے) کہا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے اس کو بھی قد و قامت کا بیان سمجھا ہے، حالانکہ مقصود "عمارتوں والے" ہے۔

درحقیقت عاد کے طول قامت کے بارے میں جتنی بھی روایات ہیں سب اسرائیلی فسانے ہیں جو مسلمانوں میں پھیل گئے تھے۔ اسی لیے محتاط مفسرین نے جو نقد و نظر کے مالک تھے اس بارے میں ایک حرف نہیں نقل کیا۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر نے البدایۃ والنہایۃ میں وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَسْطَةً کی تفسیر میں اس سے زیادہ کچھ نہ لکھا۔

ای جعلھم اشد اھل زمانھم فی الخلقة والشدة والبطش [3] یعنی ان کو اپنے اہل خانہ میں شکل و صورت اور طاقت و گرفت میں سب سے زیادہ زور آور بنایا۔

[1] فتح القدیر ج ۲ ص ۲۰۸ [2] ایضاً [3] البدایۃ والنہایۃ ج ۱۔ ص ۱۲۳ طبع السعادۃ مصر۔

ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کوئی روایت منقول نہیں اور جو حکایات کہ اوپر ذکر کی گئی ہیں وہ ان کتابوں میں موجود نہیں کہ جن کے مصنفین نے صحت کا التزام کیا ہے اور نہ ان کی اسانید کا حال معلوم کہ صحیح ہیں یا ضعیف پھر ایسے غیر معمولی واقعات کے لیے جب تک کہ کثرت سے روایتیں نہ موجود ہوں کیوں کر ان کو صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اسی بنا پر امام محمد بن احمد قرطبی نے اپنی تفسیر جامع احکام القرآن میں جب ابن العربی کے حوالہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا کہ عاد میں ہر شخص کا قد ستر گز کا تھا۔ تو فرمایا:-

| | |
|---|---|
| وهو باطل لان | یہ غلط ہے کیونکہ الصحیح |
| فی الصحیح ان اللہ | میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ |
| خلق آدم طولہ | نے آدم کو پیدا کیا تو ان کا |
| ستون ذراعا فلم | قد ساٹھ گز کا تھا پھر برابر |
| یزل الخلق ینقص | نسل انسانی کا قد آج تک |
| الی الآن [1] | گھٹتا چلا آتا ہے۔ |

بلاشبہ یہ روایت صحیح بخاری، کتاب الاستیذان باب بدء السلام میں موجود ہے جس کو ہم بتمامہ یہاں نقل کیے دیتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| عن ابی هریرة عن | حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ |
| النبی صلی اللہ علیہ | سے روایت ہے کہ آنحضرت |
| وسلم قال خلق اللہ | صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ اللہ |
| آدم علی صورتہ | تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام |
| طولہ ستون ذراعا | کو اپنی صورت پر |
| فلما خلقہ قال | بنایا کہ ان کے قامت |
| اذهب فسلم علی | کی درازی ساٹھ گز تھی پھر |
| اولئک نفر من | جب ان کو پیدا فرما چکا تو |
| الملٰئکة جلوس فاستمع | ارشاد فرمایا جاؤ اور وہ جو |
| ما یحیونک فانها تحیتک | فرشتوں کی جماعت بیٹھی ہوئی |
| وتحیة ذریتک | ہے ان کو سلام کرو اور سنو کہ |
| فقال السلام علیکم | وہ تمہیں کیا جواب دیتے ہیں کیونکہ |
| فقالوا السلام علیک | وہی تمہارا اور تمہاری اولاد |
| ورحمة اللہ فزادوه | کا آپس کا سلام رہے گا چنانچہ |
| رحمة اللہ فکل من | انہوں نے فرمایا السلام علیکم |
| یدخل الجنة علی | فرشتوں نے جواب میں کہا |
| صورة آدم فلم | السلام علیک ورحمۃ اللہ فرشتوں |
| یزل الخلق ینقص | نے ورحمۃ اللہ کو اور زیادہ کیا |
| بعد حتی الآن | اب جو بھی جنت میں داخل ہوگا۔ |

[1] کتاب مذکور ج ۲۰ ص ۵۴ طبع مصر۔

Marfat.com

وہ آدم علیہ السلام کی صورت پر داخل ہوگا جو پیراں کے بعد سے برابر اب تک مخلوق گھٹتی چلی جاتی ہے

لیکن اس حدیث کے متعلق حافظ عقیلی، کتاب الضعفاء میں ابوالزناد کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:۔

حدثنا مقدام بن داؤد حدثنا الحارث بن مسکین وابن ابی الغمر قالا انبأنا ابن القاسم قال سألت مالکا عمن یحدث بالحدیث الذی قالوا ان اللہ خلق آدم علی صورتہ فانکر ذلک مالک انکارا شدیدا ونھی ان یحدث بہ احد[1]

ابن قاسم کہتے ہیں میں نے مالک سے اس شخص کے بارے میں دریافت کیا تھا جو اس حدیث کو بیان کرتا ہے جس میں لوگوں نے کہا ہے ان اللہ خلق آدم علی صورتہ تو امام مالک نے اس روایت کا نہایت سختی سے انکار فرمایا اور منع کر دیا کہ کوئی اس کو بیان نہ کرے۔

اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ سرآمد علماء متاخرین میں یہ لکھتے ہیں:۔

ویشکل علی ھذا ما یوجد الآن من آثار الامم السالفۃ کدیار ثمود فان مساکنھم تدل علی ان قاماتھم لم تکن مفرطۃ الطول علی حسب ما یقتضیہ الترتیب السابق ولا شک ان عھدھم قدیم وان الزمان الذی بینھم وبین آدم دون الزمان الذی بینھم وبین اول ھذہ الامۃ ولم یظھر لی الی الآن ما یزیل ھذا الاشکال[2]

اس روایت پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ اب جو گزشتہ قوموں کے آثار موجود ہیں جیسے ثمود کی آبادیاں ہیں کہ ان کی سکونت گاہیں یہ بتلاتی ہیں کہ ان کے ڈیل ڈول زیادہ لامبے نہ تھے اس معیار کے مطابق کہ جس کی ترتیب سابق مقتضی ہے حالانکہ اس میں شک نہیں کہ ان کا زمانہ قدیم ہے اور جو مدت کہ ان کے اور آدم علیہ السلام کے مابین ہے وہ اس مدت سے کم ہے کہ جو اس امت کے اول اور ان کے مابین تھی اور اب تک مجھے کوئی ایسی چیز معلوم نہ ہو سکی کہ جو اس اعتراض کو دفع کر سکے۔[3]

---

[1] کتاب الضعفاء عقیلی کا قلمی نسخہ حیدرآباد دکن کے کتب خانہ آصفیہ میں نظر سے گزرا ہے۔ اس وقت یہ عبارت امام ذہبی کی مشہور کتاب میزان الاعتدال ج ۲ ص ۴۰ طبع مصر سے نقل کی گئی ہے [2] فتح الباری ج ۶ ص ۲۶۰ طبع میریہ مصر ۱۳۰۰ [3] (بر صفحہ ۱۶۸)

آئیے اب ذرا قرآن مجید کی روشنی میں اس روایت اور عاد کے قد و قامت پر نظر ڈال لیجیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

| | |
|---|---|
| وَعَادًا وَّثَمُوْدَا۟ وَقَدْ | اور ہم نے عاد اور ثمود کو |
| تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ | (بھی) ہلاک کیا، اور تم پر کھل |
| مَّسٰكِنِهِمْ | چکا ہے ان کے گھروں سے |

یہ عاد و ثمود کے ان ہی مکانات کا ذکر ہے جو عہد نبوی میں ظاہر تھے اور آج بھی موجود ہیں اور جن کو مسلمان اس زمانہ سے لے کر آج تک مساکن عاد و ثمود ہی مانتے ہیں۔ ورنہ ان مساکن کے مساکن عاد و ثمود ہونے میں اگر کچھ شبہ ہوتا تو قَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مَّسٰكِنِهِمْ کیوں فرمایا جاتا۔ اس لیے اس بارے میں خود ان کی [illegible] کو گواہوں سے بڑھ کر جو آنکھوں دیکھی کھلی شہادت ہے اور کون سی چیز فیصلہ کن ہو سکتی ہے، رہا عاد کی قدامت عہد کا یقین سو قرآن مجید کی اس آیت سے ہو جاتا ہے جس میں حضرت ہود علیٰ نبینا و علیہ الصلاۃ والسلام اپنی قوم کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ | اور یاد کرو کہ اللہ نے تم کو |
| خُلَفَاۗءَ مِنْۢ بَعْدِ | سردار کر دیا پیچھے قوم |
| قَوْمِ نُوْحٍ | نوح کے۔ |

قرآن مجید میں عاد کا ذکر سورۂ اعراف، ہود، مومنون، شعراء، حم السجدہ، احقاف، ذاریات، حاقہ اور فجر میں تفصیل سے وارد ہے۔

اور صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے کہ مجھے پروا ہوا کے ذریعہ نصرت عطا کی گئی اور قوم عاد پچھوا کے ذریعہ ہلاک کی گئی ہے۔[1] اور صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب آندھی چلتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرماتے:

| | |
|---|---|
| اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ | یا اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں |
| خَیْرَهَا وَخَیْرَ مَا | بھلائی اس کی اور بھلائی اس |

(حاشیہ صفحہ ۱۶۱) ہاں ایک یہ توجیہ ہو سکتی ہے کہ یہ واقعہ آسمان کا ہو اور دنیا میں آنے کے بعد بھی قد و قامت رہ گیا ہو نسل انسانی کا عام طور پر چلا آرہا ہے جس طرح دن کا معاملہ ہے کہ عالم علوی کا ایک دن عالم سفلی کے ایک ہزار برس کے برابر ہے چنانچہ ارشاد وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (اور ایک دن تیرے رب کے ہاں ہزار برس کے برابر ہے جو تم گنتے ہو) اور جب اس عالم میں دوبارہ پہنچیں گے تو پھر وہیں کے مناسب قد و قامت عطا کر دیا جائے گا
چنانچہ اہل جنت کا قد و قامت ساٹھ ہاتھ کا روایات میں مذکور ہے۔

(نوٹ صفحہ ہذا) - [1] البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۲۸، ۱۲۹۔

Marfat.com

فیہا و خیر ما — چیز کی جو اس میں ہے اور بھلائی اس کی کہ جس کو لے کر یہ بھیجی

ارسلت بہ و — گئی ہے، اور پناہ مانگتا ہوں میں تجھ

اعوذ بک من — سے اس کی برائی سے اور

شرھا و شر ما — اس چیز کی برائی سے جو اس میں ہے

فیہا و شر ما — اور اس چیز کی برائی سے

ارسلت بہ۔ — کہ جس کو دے کر بھیجی گئی ہے

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آسمان پر ابر چھا جاتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ متغیر ہو جاتا کبھی باہر جاتے کبھی اندر آتے کبھی آگے بڑھتے کبھی پیچھے ہٹ آتے (یہ آپ کے اضطراب و تردد کا بیان ہے) پھر جب برس جاتا تو یہ کیفیت جاتی رہتی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جب اس بات کو پہچان لیا تو آپ سے دریافت کیا۔ ارشاد فرمایا اے عائشہ شاید ایسا ہو جیسا کہ قوم عاد نے کہا تھا فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ قَالُوا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا[1] پھر جب دیکھا اس کو ابر سامنے آیا ان کے نالوں کے بولے یہ ابر ہے ہم پر برسے گا۔ شارحین حدیث نے تصریح کی ہے کہ یہ واقعہ جب کا ہے کہ آپ کو اپنی امت کے آسمانی عذاب سے محفوظ رہنے کی کامل بشارت نہیں ملی تھی۔

۸/۱۶،۱۰ ۱۰/۱۵ ۱۲/۵ ۱۳/۱۴ ۱۶/۱۳ ۱۹/۱۱ ۲۳/۱۰ ۲۴/۹،۱۲

۲۶/۱۵،۲ ۲۷/۸،۱ ۲۹/۵ ۳۰/۱۴

عَادًا ۵/۱۲ ۱۹/۲ ۲۰/۱۶

عَادٍ : زیادتی کرنے والا عَدْیٌ سے جس کے معنی ظلم کرنے اور حد سے بڑھ جانے کے ہیں اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، امام فخر الدین رازی عدو کی تشریح ان الفاظ میں فرماتے ہیں: -

العدو ھو التعدی — "عدوٌ کے معنی ہیں معاملات

فی الامور و تجاوز — میں زیادتی کرنا اور جس حد پر

ماینبغی ان یقتصر — رکنا چاہیئے اس سے

علیہ یقال عدا علیہ — آگے بڑھ جانا، عدا

عدوا و عدوانا و عدیا — علیہ عدوا و عدوانا و

واعتداء و تعدیا — عدیا و اعتداء و

اذا ظلمہ ظلما — تعدیا کا استعمال ایسے

مجاوزا للحد[2] — موقع پر ہوتا ہے جب کہ کسی نے کسی پر حد سے زیادہ ظلم کیا ہو۔

عَادٍ اصل میں عَادِیٌ تھا۔ واو پہلی یا ہوا

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ج ۱ ص ۱۳۰ [2] تفسیر کبیر ج ۲۰ ص ۱۲۱ طبع مصر۔

Marfat.com

اور پھر گر پڑا۔ کیوں کہ قاعدہ یہ ہے کہ جو داو اسم فاعل میں کلمہ کے آخر میں ہو اور اس کا ماقبل مکسور ہو وہ یا ہو کر گر پڑتا ہے، امام قرطبی کے نزدیک عَادٍ عَائِدٌ کا مقلوب ہے جیسے شَاكٍ شَائِكٌ کا اور هَارٍ هَائِرٌ کا اور لَاثٍ لَائِثٌ کا۔[1]

ارشاد باری فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ (پھر جو کوئی پھنسا ہو نہ بے حکمی کرتا ہو نہ زیادتی تو اس پر گناہ نہیں) میں "باغی" اور "عادی" سے کیا مراد ہے۔ اس کے متعلق امام رازی فرماتے ہیں :-

ارشاد الٰہی غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ میں اہل تاویل کے دو قول ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اکل (کھانے) کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور دوسرا یہ کہ اکل اور غیر اکل دونوں کے لیے عام ہے۔

پہلے قول پر اس کی چند صورتیں ہیں غَيْرَ بَاغٍ باغی نہ ہو یعنی طالب حرام نہ ہو کہ حلال ملجانے کے باوجود محض اس لیے کہ وہ پسند خاطر اور مرغوب طبع نہیں لذیذ حرام کی طرف متوجہ ہو جائے وَّلَا عَادٍ اور زیادتی نہ کرے یعنی رخصت کی مقدار سے آگے نہ بڑھے (۲) باغی نہ ہو یعنی لذت کا طالب نہ ہو۔ اور "عادی" نہ ہو یعنی بھوک کی روک تھام سے زیادہ نہ کھائے۔

(۳) "باغی" نہ ہو یعنی کسی اور مضطر کے خلاف بغاوت نہ کرے کہ اس پر قابو پا کر اس کا حصہ چھین لے، اور عادی نہ ہو یعنی گرسنگی کو روکنے میں حد سے نہ بڑھے۔

دوسرے قول پر معنی یہ ہوں گے کہ سفر میں امام المسلمین سے بغاوت نہ کرے اور معصیت کر کے حق پرستوں کے شیوہ سے متجاوز نہ ہو (یعنی رہزنی اور قزاقی کا مرتکب نہ ہو)[2]"

اور امام ابوبکر احمد بن علی جصاص رازی المتوفی ۳۷۰ھ ہجری احکام القرآن میں رقمطراز ہیں :-

"ارشاد الٰہی (فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ) کے معنی میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) حسن بصری اور مسروق فرماتے ہیں (غَيْرَ بَاغٍ فِي الْمَيْتَةِ) (وَّلَا عَادٍ) (فِي الْاَكْلِ) یعنی نہ مردار کی چاہت ہو اور نہ کھانے میں

[1] تفسیر قرطبی ج ۲ ص ۲۱۴
[2] تفسیر کبیر ج ۲۰ ص ۱۲۱ -

زیادتی، اور یہی ہمارے اصحاب (ائمہ احناف) اور امام مالک بن انس کا قول ہے۔ یہ لوگ ان باغیوں کیلئے بھی کہ جو مسلمانوں کے خلاف خروج کریں ضرورت پڑ جانے پر مردار کھانے کو اسی طرح مباح قرار دیتے ہیں جس طرح کہ اہلِ حق کے لیے۔

اور مجاہد اور سعید بن جبیر یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص امام المسلمین کے خلاف بغاوت کر کے خروج نہیں کرتا ہے اور اس کا سفر معصیت کا سفر نہیں ہے تب تو اس کے لیے روا ہے کہ مضطر ہو تو مردار کھالے ورنہ اگر اس کا سفر معصیت (رہزنی و قزاقی) کا سفر ہے یا وہ امام سے باغی ہے تو ایسی صورت میں اس کو کھانا حلال نہیں، اور یہی امام شافعی کا قول ہے۔[1]

اب اس پر غور کرنا ہے کہ ان دونوں معانی میں سے کس معنی کو زیادہ ترجیح ہے۔ سو واضح رہے کہ اضطرار کے احکام قرآن مجید میں تین جگہ مذکور ہیں اوّل تو اسی آیت میں جو تین جگہ مکرر ہے فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ (پھر جو کوئی عاجز ہو نہ زور کرتا ہو نہ زیادتی) دوسری جگہ سورۂ مائدہ میں ارشاد ہے فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (پھر جو کوئی ناچار ہوگیا بھوک میں کچھ گناہ پر نہیں ڈھلتا تو اللہ بخشنے والا ہے مہربان) تیسری جگہ سورۂ انعام میں وارد ہے وَقَدْ فَصَّلَ لَكُم مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ (اور وہ کھول چکا جو کچھ تم پر حرام ہے مگر جب وقت ناچاری ہو اس کی طرف) ان تینوں مذکورہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے ضرورت اور ناچاری کا بیان فرمایا ہے اور اخیر آیت یعنی إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ میں اباحت کو اضطرار کی حالت میں مطلق رکھا ہے کسی شرط یا صفت کے ساتھ مقید نہیں فرمایا جو اس بات کو مقتضی ہے کہ جب اضطرار پایا جائے اباحت بھی پائی جائے خواہ اضطرار کسی حال میں بھی ہو لہٰذا معلوم ہوا کہ آیت مذکورہ سب مضطرین کے لیے اباحت کو واجب کر رہی ہے خواہ وہ مطیع ہوں یا عاصی۔

اب پہلی آیت میں جو غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ ارشاد فرمایا ہے تو اس میں دونوں احتمال ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ البغی والعدوان فی الاکل (یعنی کھانے کی چاہت اور اس میں زیادتی) مراد ہو اور اس کا بھی

---

[1] احکام القرآن ج ۱ ص ۱۲۶ طبع استانہ (قسطنطنیہ)

احتمال ہے کہ البغی علی الامام وغیرہ امام یا کسی اور کے خلاف بغاوت مراد ہو۔ اور محض احتمال سے کسی آیت کے عموم کی تخصیص نہیں کی جاسکتی بلکہ ایسی صورت میں آیت کو اسی معنی پر محمول کرنا ضروری ہے کہ جس میں اس کا عموم بغیر کسی قسم کی تخصیص کے باقی رہے۔

اس پر بھی غور فرمائیے کہ ایک شخص کا سفر سفر معصیت نہیں کہ جو ناجائز ہو بلکہ وہ حج کے مبارک سفر پر نکل رہا ہے یا جہاد اور تجارت کے لیے سفر کر رہا ہے مگر وہ اس سفر میں دوسرے شخص کا مال زبردستی لے لیتا ہے اور اس طرح اس کے خلاف بغاوت کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے یا اسی سفر میں نماز چھوڑ دیتا ہے اور زکوٰۃ نہیں ادا کرتا اور اس طرح حکم الٰہی سے عدوان و سرتابی کا مرتکب ہوتا ہے تو بالاتفاق فقہا اس کی یہ بغاوت و عدوان اضطرار کی حالت میں اس کو مردار کھانے سے مانع نہیں بلکہ مردار کا کھانا اس کے لیے اسی طرح مباح ہے جس طرح کہ ان ناجائز امور کے ارتکاب سے پہلے اضطرار کی حالت میں تھا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ میں جمیع وجوہ سے بغاوت و عدوان کی نفی مراد نہیں کیونکہ اسی طرح آیت میں کسی مخصوص بغی و عدوان کا بھی ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ دونوں الفاظ مجمل ہیں اور محتاج بیان بدیں وجہ آیت اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ کی اس سے تخصیص نہیں کی جاسکتی ہے اور نہ اضطرار کو کسی خاص حالت سے مقید کیا جا سکتا ہے کیونکہ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ کا استعمال اپنی حقیقت اور ظاہر پر دشوار ہے۔

ہاں اگر یہاں البغی والتعدی فی الاکل مراد لیں تو اس صورت میں ہم لفظ کو اسی حقیقت اور عموم میں استعمال کریں گے کہ جو اس سے مراد ہے اور جس کے لیے وہ لفظ لایا گیا ہے اور دو وجہ سے یہاں یہی معنی اولیٰ ہیں اول تو اس لیے کہ اس صورت میں یہ الفاظ اپنے عموم میں مستعمل ہوں گے یعنی مردار کھانے کے بارے میں ہر طرح کی چاہت اور زیادتی حرام رہے گی اور دوسری وجہ یہ ہے کہ پھر اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ کی تخصیص بھی نہیں کرنا پڑے گی۔

اسی طرح غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ (وہ مائل نہ ہو گناہ پر) کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ سارے گناہوں سے مجتنب بھی ہے یعنی مضطر کے لیے شرط اباحت یہ ہوگی کہ اس سے قطعاً کسی قسم کا کوئی گناہ سرزد نہ ہوا ہو خواہ اس گناہ کا تعلق کھانے سے ہو یا نہ ہو حتیٰ کہ اگر اس نے کسی کا ایک روپیہ بھی دبا رکھا ہے یا کسی ایک

وقت کی بھی نماز چھوڑ رکھی ہے یا کسی ایک دن کے
بھی روزہ کی ناغہ کر دی ہے اور ابھی تک توبہ نہیں
کی ہے تو اس کے لیے مردار کھانا روا نہیں۔ یا پھر
یہ معنی کرنا پڑیں گے کہ خواہ اس سے کسی قسم کا بھی گناہ سرزد
ہوا اُسے اکل میتہ کی اجازت ہے بس اتنی شرط
ہے کہ اس کا سفر معصیت کے لیے نہ ہو اور وہ امام
کا باغی نہ ہو، حالانکہ یہ سب کے نزدیک ثابت
ہے کہ بعض معاصی پر اس کا جمار ہنا الوقت لمضطر
اس کے لیے مردار کے حلال ہونے کو نہیں روکتا
اس لیے یہ معنی بھی مراد نہیں ہو سکتے۔ اب وہ کون
سا گناہ ہے کہ جو اباحت سے مانع ہے اس کو دوسری
جگہ سے تلاش کرنا پڑے گا جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ لفظ
کو مجمل اور محتاج بیان ماننا پڑے گا اور آیت کا حکم
دوسری جگہ کے بیان پر موقوف رہے گا حالانکہ جہاں
تک ہم سے آیت کے حکم پر عمل ہو سکے وہاں تک
اس پر عمل کرنا لازمی ہے اور اس پر عمل کرنے کی
صورت یہی ہے کہ "اثم" سے مراد وہی "یعنی د
تعدی فی الاکل" ہے کہ بقدر سد رمق کھائے یعنی
اتنا کہ جس سے تلف ہونے کا خوف جاتا رہے۔
یہ واضح رہے کہ دوسری جگہ ارشاد ہو رہا ہے
وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو)

اب جو شخص کہ مباح کو استعمال نہ کرے اور مر جائے
تو وہ سارے اہل علم کے نزدیک اپنے نفس کا قاتل اور
اس کا تلف کنندہ ہے اور علماء میں اس مسئلہ کے اندر
عاصی اور مطیع کا حکم مختلف نہیں ہے۔ بلکہ ایسی صورت
میں عاصی کا کھانے سے رُک جانا اس کے عصیان
میں اور زیادتی ہی کا باعث ہے۔ لہٰذا بحالت
اضطرار بھی کھانے کے مباح ہونے میں عاصی اور
مطیع دونوں کا حکم ایک ہونا چاہیئے۔ بغور فرمائیے
اگر یہی عاصی اس طعام مباح کے کھانے سے باز
رہے جو اس کے پاس موجود ہے اور اسی حالت
میں مر جائے تو یقیناً نہ کھانے میں وہ اللہ کا نافرمان
ہوگا۔ گو وہ باغی ہو اور اس کا سفر معصیت ہی
ہو۔ ظاہر ہے کہ بحالت ضرورت و ناچاری مردار کا وہی
حکم ہے جو وسعت و گنجائش کے ہوتے حلال کا۔ اب
اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ آخر "باغی" اور "عادی"
کو وقت ہی کیا ہے کیوں نہ فوراً توبہ کر لے کہ مردار
حلال ہو جائے۔ لہٰذا جب وہ توبہ نہیں کرتا اور مردار
حلال نہ ہونے کے سبب بغیر کھائے مر جاتا ہے
تو ایسی صورت میں وہ خود اقدام خودکشی کا مرتکب
ہے، تو اس کا جواب صاف ہے کہ بلا شبہ
یہ آپ کا فرمانا بجا لیکن بہرحال اگر اس نے توبہ نہ کی
جب بھی اس کو اپنے آپ کو تلف کرنے کی اجازت

Marfat.com

نہیں کر کھانا چھوڑ بیٹھے اور مر جائے کیونکہ ترک توبہ سے اس کو خودکشی مباح نہیں ہو جائے گی بلکہ اس نے اگر ایسا کیا تو ڈبل مجرم ہوگا اور ایک کی بجائے دو گناہوں کا ارتکاب کرے گا۔ ایک خروج فی المعصیت کا اور دوسرا نہ کھانے کے باعث خودکشی کا۔

یہ بھی خیال رہے کہ مطیع اور عاصی کا حکم ماکولات و مشروبات میں مختلف نہیں مطیع اور فرمانبردار کو جن چیزوں کے کھانے کی اجازت ہے نافرمان اور عصیاں شعار بندوں کو بھی ان کا استعمال روا ہے اور جو المطعم اور المشرب نیک بندوں پر حرام ہیں ان کا استعمال گنہگار بندوں کو بھی ناجائز ہے۔ غرض حلت و حرمت کے باب میں اطاعت کیش اور معصیت کوش میں کوئی فرق مراتب نہیں ہے۔ اب فیصلہ فرمائیے کہ اگر بوقت ضرورت مطیعین کو اکل میتۃ مباح ہے تو عاصیوں کو ضرورت پڑ جانے پر کیوں حرام ہو جائے گا۔

شاید یہ خیال آئے کہ اباحت میتۃ ایک شرعی رخصت ہے اور عاصی کو رخصت سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں۔ تو اول تو یہ در اصل ایک قسم کا مغالطہ ہے کیونکہ اکل میتۃ بحالت اضطرار درحقیقت رخصت نہیں بلکہ فرض ہے اضطرار نے اس کی حرمت کو زائل کر دیا ہے چنانچہ سابق میں گزر چکا کہ اگر مضطر اس کے کھانے سے باز رہا اور مر گیا تو شرعاً وہ اسی طرح خودکشی کا مرتکب سمجھا جائے گا جس طرح وہ شخص کہ جس نے مقدور رکھتے ہوئے روٹی کھانا اور پانی پینا چھوڑ دیا، اور جان دے ڈالی۔ دوسرے یہ دعویٰ کہ عاصی کو رخصت سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں یہ بھی سر سے غلط ہے۔ اگر عاصی مقیم ہو اور ماہ رمضان میں بیمار ہو جائے تو اس کو روزہ افطار کرنے کی رخصت حاصل ہے اسی طرح اگر وہ مسافر ہو اور سفر میں پانی نہ ملے تو تیمم کر سکتا ہے۔ اسی طرح مسح علی الخفین میں مقیم کو ایک دن اور ایک رات اور مسافر کو تین دن اور تین رات تک موزوں پر مسح کرنے کی اجازت ہے اور اس باب میں عاصی اور مطیع میں کوئی فرق ہے۔

عربیت کے لحاظ سے غور کیجیے گا تو معلوم ہوگا کہ آیت فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اور فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ

مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ
میں ایک فعل مضمر ہے جس سے کلام مستغنی نہیں ہو سکتا
کیوں کہ ضرورت کا پڑ جانا مضطر کا اپنا ذاتی فعل
نہیں کہ جس کی بنا پر فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ اور فَاِنَّ
اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ اس کی خبریں بن سکے لہٰذا
فَمَنِ اضْطُرَّ کے لیے خبر کا ہونا ضروری ہے جس
پر کلام تمام ہو کیوں کہ حکم کا تعلق نفس ضرورت سے
نہیں ہے اب جس خبر پر کلام تمام ہو گا وہ اکل ہی
ہے گویا تقدیر آیت یہ ہے فمن اضطر فاکل فلا
اثم علیہ (جو عاجز ہوا اور اس نے کھا لیا تو اس
پر کچھ گناہ نہیں) رہا غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ تو بعض لوگوں
کے نزدیک کہ جو اس کی تفسیر غیر باغ فی المیتۃ
ولا عاد فی الاکل سے کرتے ہیں یہ حالت اکل کا
بیان ہے یعنی اس حالت میں کھایا کہ نہ کھاتے وقت
مردار کی چاہت تھی اور نہ کھانے میں ضرورت
کی حد سے آگے بڑھا صرف بقدر ضرورت کھایا
اور جو لوگ کہ اس کی تفسیر غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ علی
المسلمین سے کرتے ہیں ان کے نزدیک تقدیر یوں
ہو گی فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ ولا عاد علی المسلمین
فاکل فلا اثم علیہ (یعنی جو مضطر ہوا بشرطیکہ وہ
مسلمانوں کے خلاف بغاوت اور زیادتی نہ کرتا تھا
اور پھر اس نے کھا لیا تو اب گناہ نہیں) اس صورت
میں بغاوت و عدوان کھانے سے قبل اضطرار
کی حالت کا بیان ہو گا یعنی ایسا مضطر ہے کہ جو
مسلمانوں سے باغی نہیں ہے اور ان کے خلاف
سرتابی نہیں کرتا ہے بغرض ان کے خیال میں وہ
اکل کی صفت نہیں ہے اور پہلی تفسیر پر یہ اکل ہی کی صفت
ہے، یہ حذف ایسا ہی ہے جیسا کہ آیت شریفہ
فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى
سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ (پھر جو کوئی تم میں بیمار
ہو یا سفر میں تو گنتی چاہیے اور دنوں سے) میں
یہ معنی ہیں کہ جو کوئی تم میں بیمار ہو یا مسافر ہو اور
افطار کرے تو دوسرے دنوں میں ان کو گن کر پورے
کرے یہاں فافطر محذوف ہے تقدیر آیت یوں ہے
فمن کان منکم مریضا او علی سفر فافطر
فعدۃ من ایام اخر اسی طرح دوسری آیت
فَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ
فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ (پھر جو کوئی تم میں بیمار ہو یا
اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو بدلا ہے روزے)
کہ یہاں فحلق محذوف ہے اور تقدیر آیت یوں
ہو گی فحلق ففدیۃ من صیام یعنی اگر بیمار ہو
یا سر میں کچھ تکلیف ہو اور منڈا ڈالے تو روزے

رکھے۔ ان مقامات پر حذف اس لیے ہوا ہے کہ مخاطبوں کو محذوف کا علم ہے اور خطاب حذف پر دلالت کر رہا ہے۔ اب غور کیجیے یہ حذف بھی اسی بات کو بتلاتا ہے کہ یہاں البغی والعدوان فی الاکل ہی مراد لینا اولیٰ ہے اور البغی والعدوان علی المسلمین مراد لینا مناسب نہیں کیونکہ آیت میں اس سے پیشتر مسلمین کا کہیں مذکور نہیں نہ محذوفاً نہ مذکوراً جس طرح سے کہ اکل کا لفظ محذوف ہے لہٰذا آیت کو اس کے مقتضیٰ پر محمول کرنا اور غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ کو اکل کا حال اور اس کی صفت قرار دینا ہی اولیٰ ہے بہ نسبت اس کے کہ اس کو ایسے معنی پر محمول کیا جائے کہ جس پر لفظ محذوفاً یا مذکوراً کسی طرح بھی متضمن نہ ہو۔ ہاں آیتہ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ میں کسی ضمار یا حذف کے ماننے کی ضرورت نہیں کہ یہ بذات خود اس سے مستغنی ہے کیونکہ یہ ایسے جملہ سے استثناء ہے کہ جس سے خود اس کے معنی یعنی تحریم سمجھ میں آرہی ہے۔ ارشاد ہے وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ (اور کھول کر احکام کو جو کچھ کہ تم پر حرام ہے مگر جس وقت ناچار ہو اس کی طرف) معلوم ہوا کہ حالت اضطرار حرمت سے مستثنیٰ ہے لہٰذا مباح ہے اس لیے یہاں کسی ضمار کے ماننے کی بسرے سے گنجائش نہیں[1] (ملاحظہ ہو اضطرّ)

پ ۸ ۸ ۱۴
۵ ۵ ۲۱

**عَادَ**: وہ پھرا، اس نے عود کیا، وہ پھر آرہا، وہ گیا (نَصَرَ) عَوْدٌ سے جس کے معنی کسی چیز سے ہٹ جانے کے بعد پھر اس کی طرف لوٹنے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب عَادَ اصل میں عَوَدَ تھا واؤ متحرک ما قبل مفتوح فتحہ واؤ پر ثقیل تھا اس لیے واؤ کو الف سے بدلا عَادَ ہوگیا۔

واضح رہے کہ عود کے معنی کبھی صیرورت کے بھی آتے ہیں چنانچہ علامہ ناصر بن عبد السید مطرزی المغرب میں لکھتے ہیں :-

"عود کے معنی ہیں صیرورت (ایک حال سے دوسری حالت کی طرف پلٹنے کے) کے خواہ ابتداً ہو یا ثانیاً۔ پہلی صورت کی مثال ہے حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ (یہاں تک کہ پھر آرہے جیسے کہ ٹہنی پرانی) اور دوسری صورت کی مثال ہے كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ جیسا کہ تم کو پہلی بنایا دوسری

[1] یہ بحث تمام تر احکام القرآن جصاص کا ترجمہ ہے۔

بار بن گئے بعود کا تعدیہ بنفسہ بھی ہوتا ہے اور حروف جارہ میں الیٰ علیٰ اور فی کے ساتھ بھی نیز لام کے ذریعہ بھی جیسا ارشاد ہے وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ اور اگر پھر بھیجے تو پھر کریں وہی جو منع ہوا تھا ان کو۔[۱]

آیہ شریفہ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (اور جو کوئی پھر کرے تو وہی ہیں دوزخ کے لوگ اسی میں رہ پڑے) میں عود سے مراد جیسا کہ زجاج نے تصریح کی ہے سود کا پھر حلال سمجھنا ہے[۱] محض سود خواری نہیں جیسا کہ زمخشری نے اپنے اعتزال کی بدولت سمجھا ہے۔ اور اس آیت سے فساق کے عذاب دائمی پر استدلال کیا ہے[۲] کیونکہ عود کو اسی معنی پر محمول کیا جائے گا جس کی سابق میں تصریح گزر چکی ہے۔ اور آیات سابقہ میں سود خواری اور بیع پر قیاس کر کے اس کو جائز سمجھنے کا بیان ہے لہٰذا عود سے مراد اسی ناپاک اعتقاد کی طرف عود ہو گا (ملاحظہ ہو تَعُوْدُوْنَ) ۳ پ ۲ ع ۲۳

عَادَ اِۨ الْاُوْلٰى: عاد اول، اگلے عاد۔ یہاں اولیٰ ہمزہ کے ساتھ بغیر اس کا مرکز ظاہر کئے ہوئے لکھا جاتا ہے۔ اسی طرح رسم قرآنی میں عاد کی دال کے بعد ایک الف کا اضافہ کیا جاتا ہے کیونکہ یہ ثمود سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ ابن زید نے تصریح کی ہے کہ ان کو عاد اولیٰ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ حضرت نوح علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد پہلی ہلاک ہونے والی قوم یہی ہے[۲] اور صالحین قوم ہود علیہ السلام کو جنہوں نے ایمان کی بدولت نجات پائی تھی اور ان کی اولاد "عاد ثانیہ" کہلاتی ہے[۳]

شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی عاد اولیٰ اور عاد ارم کو تو ایک خیال کرتے ہیں لیکن قوم ہود علیہ السلام کو "عاد ثانیہ" بتاتے ہیں۔ چنانچہ تفسیر عزیزی میں یہ سطر ہیں "دریں جا باید دانست کہ عاد نام دو فرقہ است عاد اولیٰ کہ آنہا را عاد قدیمہ نیز گویند و آنہا اولاد عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام اند و آنہا را عاد ارم نیز گویند زیرا کہ ارم جد آنہا بود و شہر ارم نیز بنام جد خود مسمّیٰ کردہ بودند

[۱] تفسیر مدارک التنزیل امام نسفی ج ۱ ص ۱۰۸ طبع مصر [۲] ملاحظہ ہو تفسیر کشاف آیہ مذکورہ [۳] فتح القدیر ج ۵ ص ۱۱۴۔ [۴] ملاحظہ ہو تفسیر بغوی اور تفسیر خازن ج ۷ ص ۲۲۵ طبع مصر ۱۳۳۲ھ

Marfat.com

مساکن ایشاں متصل عدن بود، و عاد دوم کہ انہا اولاد شخصے دیگر اند کہ نام او نیز عاد بود وانہ بقیہ عاد اولیٰ بود کہ در زمین احقاف متصل بحضر موت وطن گرفت و در زندان او در آں ملک منتشر گشتند و قصہ عاد دوم با پیغمبر ایشاں کہ حضرت ہود علیہ السلام بودند در قرآن مجید مکرر وارد است چنانچہ در مقام خود مذکور است و قصہ عاد اولیٰ در قرآن مجید بیش از دو جا نیامدہ و آں ہم بطریق اجمال یکے ایں جا و دوم در سورۂ نجم کہ اَهْلَكَ عَادًا الْاُوْلٰى بآں اشارہ است [1] "

لیکن شاہ صاحب کا یہ خیال چونکہ عام مفسرین اور مؤرخین کی تصریح کے خلاف ہے اس لیے قابل قبول نہیں ہے۔ ہود علیہ السلام عاد ثانیہ میں مبعوث نہیں ہوئے تھے بلکہ عاد اولیٰ کی طرف ان کی بعثت ہوئی تھی۔ اور یہی عاد اولیٰ عاد ارم بھی کہلاتے ہیں۔ قرآن مجید میں جہاں بھی عاد کا ذکر آیا ہے اس سے عاد اولیٰ ہی مراد ہیں سوائے سورۃ الاحقاف کے کہ وہاں حافظ ابن کثیر کے خیال میں عاد ثانیہ کا مذکور ہے۔ چنانچہ البدایۃ والنہایہ میں رقمطراز ہیں :

| | |
|---|---|
| فعلىٰ هذا تكون القصة | اس صورت میں سورہ |
| المذكورة فى سورة | احقاف میں جو قصہ مذکور |
| الاحقاف خبرا عن | ہے وہ عاد ثانیہ کا |
| قوم عاد الثانية وتكون | واقعہ ہے اور باقی |
| بقية السياقات فى | قرآن مجید میں جتنے بھی |
| القرآن خبرا عن | عاد کے قصے ہیں وہ عاد |
| عاد الاولىٰ. | اولیٰ ہی کی خبر ہے۔ |

لیکن صحیح یہی ہے کہ سورۂ احقاف میں بھی عاد اولیٰ ہی کا واقعہ مذکور ہے کیوں کہ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ (اور یاد کر عاد کے بھائی کو جب ڈرایا اپنی قوم کو احقاف میں) اب ظاہر ہے کہ یہ اخا عاد ہود علیہ السلام کے سوا اور کون ہیں خود قرآن مجید کی تصریح ہے وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا (اور عاد کی طرف ان کا بھائی ہود) اور دوسری جگہ ارشاد ہے اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ (جب کہا ان کو ان کے بھائی ہود نے کیا تم کو ڈر نہیں) چنانچہ اتنا

---

[1] تفسیر عزیزی الموسوم بہ فتح العزیز پارۂ عم طبع محمدی لاہور ص ۱۹۱ و ۱۶۲

[2] البدایۃ والنہایۃ ج ۱ ص ۱۳۰ طبع مصر۔

Marfat.com

اقرار تو خود حافظ ابن کثیر کو بھی ہے۔

| | |
|---|---|
| فالظاہران عــادا | سو ظاہر یہی ہے کہ یہ عاد |
| ھذہ ہی عاد الاولیٰ | عاد اولیٰ ہی ہیں کیوں کہ |
| فان سیاقہا شبیہ | اس کا سیاق قوم ہود |
| بسیاق قوم ھــود | کے سیاق کے مشابہ ہے |
| وھم الاولیٰ۔ | اور قوم ہود عاد اولیٰ ہی |
| | ہیں۔ |

حافظ ابن کثیر کے شبہ کا منشا در اصل ابن اسحٰق کا وہ بیان ہے جو انہوں نے قوم عاد کی تباہی کے بارے میں تحریر کیا ہے اور جس کو مفسرین عام طور پر نقل کرتے چلے آتے ہیں کہ جب قوم عاد نے بجز کفر کے ہر چیز کے ماننے سے انکار کیا تو حق تعالےٰ شانہٗ نے تین سال تک مسلسل بارش کو روک رکھا آخر جب یہ مجبور ہوئے تو انہوں نے ستر آدمیوں کا ایک وفد حرم مکہ کو روانہ کیا تاکہ وہاں جاکر پانی کے لیے دعائیں کریں۔ اس زمانہ میں دستور تھا کہ جب کوئی سخت مجبوری ہوتی تو حرم میں اکر اللہ تعالیٰ سے کشائش کے لیے دعا کیا کرتے تھے چنانچہ یہ وفد مکہ معظمہ میں ایک ماہ تک تو معاویہ بن بکر کا مہمان بنا رہا کہ مزے سے وہاں مے نوشی کرتا اور اس کی دو لونڈیاں تھیں ان کا گانا سنا کرتے ایک مہینہ میں یہاں تک پہنچ پاتے تھے اور ایک مہینہ یوں گزار دیا آخر میزبان ہی کو خیال آیا مگر چونکہ واپسی کے لیے ان سے خود کہتے شرم آتی تھی اس لیے کچھ اشعار نظم کرکے لونڈیوں کو دیئے تاکہ وہ ان کو گائیں، ان اشعار میں قوم عاد کی بدحالی پر توجہ دلائی تھی اور وفد کو اپنے فرض کی بجا آوری پر یاد دہانی کی تھی لونڈیاں اشعار گانے لگیں تو وفد کو ہوش آیا حرم محترم میں اٹھ کر گئے اور قوم کے لیے پانی کی دعا مانگی۔ رئیس وفد قیل بن عنز نے جب دعا کی تو اللہ تعالےٰ نے تین بدلیاں بھیجیں، سفید، سرخ اور سیاہ اور آسمان سے منادی نے ندا دی کہ اپنے اور اپنی قوم کے لیے ان تینوں میں سے ہائے ابر میں سے جس کو چاہے پسند کرے قیل نے کہا کہ میں ابر سیاہ کو پسند کرتا ہوں یہ ابر سیاہ ابر عذاب تھا جس نے قوم عاد کو تہ و بالا کرکے رکھ دیا۔ اور صفحۂ ہستی سے ان کا نام و نشان مٹا ڈالا۔ یہ قصہ بہت طول طویل ہے ابن اسحاق نے اس کو بہ تمام و کمال بیان کیا ہے۔ مسند امام احمد بن حنبل میں بھی بروایت حارث بن حسان بن یزید اس قصہ کی کچھ اصل ملتی ہے اس بنا پر حافظ ابن کثیر کو یہ شبہ ہوا کہ یہ حالات تو عاد ثانیہ کے ہو سکتے ہیں کیونکہ ابن اسحٰق

کے بیان میں مکہ شریف کا نام آیا ہے اور اس کی بنا حضرت ابراہیم خلیل صلوات اللہ وسلامہ علیہ کے عہد میں ہوئی ہے۔ نیز اس میں معاویہ بن بکر اور اس کے اشعار کا تذکرہ ہے جو عاد اولیٰ کے بعد کا کلام ہے پھر اس کی زبان متقدمین کی زبان کے مشابہ نہیں لہٰذا سورۂ احقاف میں جس عاد کا ذکر ہے وہ یہی عاد ثانیہ ہیں۔ سو اس کے متعلق صرف اتنا عرض کیا جا سکتا ہے کہ سند کی روایت کے بارے میں تو خود حافظ ابن کثیرہی نے لکھا ہے۔

هو غريب جدا من ✱ وہ احادیث غرائب و غرائب الحديث و ✱ افراد میں غریب ترین افراده [1] ✱ روایت ہے۔

رہا ابن اسحٰق کا بیان سو وہ کوئی حدیث مرفوع نہیں کہ جس کی بنا پر خواہ مخواہ ظاہر سیاق قرآن کو چھوڑا جائے علاوہ ازیں قرآن مجید میں مصرح ہے وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ (اور یاد کر عاد کے بھائی کو جب ڈرایا اپنی قوم کو احقاف میں اور گزر چکے تھے ڈرانے والے اس سے پہلے اور اس کے پیچھے کہ نہ بندگی کرو کسی کی اللہ کے سوائے

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ہود علیہ السلام سے پہلے بھی اور پیچھے بھی عاد میں متعدد رسول گزر چکے ہیں لہٰذا بجائے اس کے کہ خود قرآن کو سیاق کے خلاف احقاف کے عاد کو عاد ثانیہ بتایا جائے صرف یہ کہنا چاہیے کہ ابن اسحٰق کے بیان میں جس عاد کا تذکرہ ہے وہ عاد ثانیہ تھے۔ اور یہ واقعہ حضرت ہود علیہ السلام کے علاوہ کسی اور پیغمبر کے عہد میں ہوا ہے پھر اس پر مزید لطف یہ ہے کہ خود حافظ ابن کثیر حضرت ہود علیہ السلام کے متعلق مسند احمد سے باسناد حسن حج بیت اللہ کا واقعہ بھی نقل فرما رہے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مسند ابی یعلی سے حضرت نوح علیہ السلام کے حج کو بھی نقل کیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ کعبہ شریف کی بنا عہد ابراہیم علیہ السلام سے پہلے ہی ہونا چاہیے اور یہ ماننا چاہیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں اس کی دوبارہ تعمیر عمل میں آئی تھی۔ ۲۴/۲

**عَادُوْا**: وہ پھرے۔ انہوں نے پھر کیا۔ عَوْدٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب لَعَادُوْا (وہ پھر جاتے وہ پھر کرتے ہیں) میں لام جواب لو میں واقع ہے (ملاحظہ ہو لام) ۲/۶

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۱۶۰ طبع مصر۔

Marfat.com

عٰدُوْنَ: حد سے گزرنے والے، حد سے بڑھنے والے، حد سے نکلنے والے، عَدْوٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع عَادٍ کی جمع بحالت رفع، عَادُوْنَ اصل میں عَادِوُوْنَ تھا، واو کلمہ میں چوتھی جگہ آیا اور ماقبل اس کا مضموم نہ تھا لہٰذا اس کو ی سے تبدیل کیا عَادِیُوْنَ ہوا۔ ضمہ ی پر دشوار تھا، نقل کرکے ماقبل کو دیا اب دو ساکن جمع ہوئے ی اور و، ی کو حذف کر دیا عَادُوْنَ ہو گیا۔

علامہ راغب اصفہانی آیہ شریفہ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُوْنَ (بلکہ تم لوگ ہو حد سے بڑھنے والے) کے تین معنی کرتے ہیں (۱) مُعْتَدُوْنَ یعنی حد سے نکلنے والے ہو (۲) مُعَادُوْنَ (بلکہ تم لوگ ہو حد سے بڑھنے والے (۳) متجاوزن الطور یعنی طور طریق سے ہٹنے والے یہ عرب کے محاورہ عدا طورہ (وہ اپنے طور سے ہٹ گیا) سے ماخوذ ہے۔ اس صورت میں معنی ہوں گے: انسانیت کے طور سے ہٹ جانیوالے آیہ شریفہ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ (اور جو لوگ اپنی شہوت کی جگہ تھامتے ہیں مگر اپنی عورتوں پر یا اپنے ہاتھ کے مال (لونڈیوں) پر سو ان پر نہیں الاہنا، پھر جو کوئی ڈھونڈھے اس کے سوائے سو وہی ہیں حد سے بڑھنے والے) متعہ کی ناسخ ہے کیوں کہ ظاہر ہے کہ جن عورتوں سے متعہ کیا جاتا ہے وہ لونڈیاں تو یقیناً نہیں ہیں، اور ازواج میں بھی داخل نہیں کیوں کہ وہ وارث نہیں ہو سکتی ہیں۔ اور یہ بات بالاجماع ثابت ہے حتیٰ کہ روافض بھی ان کی وراثت کے قائل نہیں ہیں بلاشبہ بیویاں قرآن مجید کی رو سے وارث ہیں اور ان کا حصہ قرآن شریف میں بصراحت مذکور ہے جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ متعہ ابتدا اسلام میں رائج تھا۔ کوئی شخص جب کسی شہر میں جاتا اور وہاں اس کی جان پہچان نہ ہوتی تو وہ جتنی مدت کے لیے وہاں قیام کا ارادہ کرتا کسی عورت سے عقد کر لیتا وہ عورت اس کے مال و متاع کی حفاظت کرتی اور اس کا کام کاج بھی کر دیتی تھی تا آنکہ جب آیت اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ نازل ہوئی تو سوائے بیوی اور لونڈی کے ہر شرم گاہ حرام ہو گئی[1] ۱۸/۱ ۱۹/۱۳ ۲۹/۷

[1] جامع ترمذی ص ۱۰۹ مطبوعہ احمدی دہلی۔

Marfat.com

غٰدِیٰتِ: دوڑنے والیاں (گھوڑے یا اونٹنیاں)

قاضی شوکانی لکھتے ہیں:

"عَادِیَات عَادِیَۃٌ کی جمع ہے جو بمعنی تیز دوڑنے والی کے ہے اور عَدْوٌ سے مشتق ہے جس کے معنی تیز روی کے ہیں۔ واو کو ماقبل کے مکسور ہونے کی وجہ سے یا سے تبدیل کر لیا ہے جس طرح سے کہ غَازِیَاتٌ میں جو غَزْوٌ سے بنا ہے[1]"۔

امام راغب فرماتے ہیں کہ عَدْوٌ کے معنی ہیں سنجاوز کرنے اور پیوستگی کو ختم کرنے کے اب اگر یہ چیز چلنے میں ہو تو اس کو عَدْوٌ (دوڑنا) کہتے ہیں۔ یہاں عادیات سے کیا مراد ہے اس بارے میں مفسرین سلف کے دو قول ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما عطاؔ مجاہد، عکرمہ، حسن البصری، کلبی، قتادہ، مقاتل اور ابو العالیہ وغیرہ کا قول ہے کہ غازیوں کے گھوڑوں کی صفت بیان کی گئی ہے۔ اور حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اس سے مراد اونٹ ہیں، محمد بن کعب اور سدی کا بھی یہی قول ہے[2]۔

تفسیر کی کتابوں میں "العادیات" کے متعلق حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کے مابین ایک نہایت دلچسپ مکالمہ منقول ہے جو یہاں درج کیا جاتا ہے۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن الانباری (کتاب الاضداد میں)، حاکم (اور انہوں نے اس روایت کو صحیح بھی کہا ہے) اور ابن مردویہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ میں حجر اسود کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ایک شخص نے مجھ سے آکر "العادیات ضبحا" کے متعلق دریافت کیا، میں نے کہا یہاں گھوڑوں کا بیان ہے جو اللہ کی راہ میں تاخت کرتے ہیں اور جب سر شام واپس ہوتے ہیں تو پھر لوگ کھانوں کی تیاری کے لیے آگ جلاتے ہیں۔ وہ میرے پاس سے پلٹ کر حضرت علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) کے پاس پہنچا آپ اس وقت زمزم کے سقایہ کے نیچے تشریف فرما تھے۔ اس نے آپ سے بھی اسی کے متعلق سوال کیا آپ نے فرمایا تم مجھ سے پہلے بھی اس کے بارے میں کسی سے دریافت کر چکے ہو کہنے لگا ہاں میں نے ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے پوچھا تھا، تو انہوں نے بتلایا کہ یہ وہ گھوڑے ہیں جو اللہ کی راہ میں تاخت کرتے

[1] تفسیر فتح القدیر سورہ العٰدیٰت [2] ملاحظہ ہو معالم التنزیل از امام البغوی ج، ص ۲۲۵ طبع مصر ۱۳۴۶ھ بر حاشیہ تفسیر خازن۔

ہیں آپ نے فرمایا جاؤ اور انہیں میرے پاس لے آؤ جب میں آپ کے پاس لایا تو فرمانے لگے کہ تم لوگوں کو وہ بات بتاتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں۔ خدا کی قسم پہلا غزوہ جو اسلام میں ہوا وہ بدر تھا اور اس وقت ہمارے ساتھ صرف دو گھوڑے تھے۔ ایک حضرت زبیر بن العوام (رضی اللہ عنہ) کے پاس اور دوسرا حضرت مقداد بن الاسود (رضی اللہ عنہ) کے پاس، پھر العادیات ضبحا سے یہ مطلب کب نکلے گا العادیات ضبحا سے تو وہ اونٹنیاں مراد ہیں جو عرفہ سے مزدلفہ تک دوڑتی ہیں اور جب لوگ مزدلفہ جا ٹھہرتے ہیں تو پھر آگ روشن کرتے ہیں اور المغیرات صبحا یعنی صبح کو مزدلفہ سے منیٰ کی طرف تاخت کرتی ہیں چنانچہ یہی جمعا سے مراد ہے اور فاثرن بہ نقعا اس میں زمین کے اس غبار کا بیان ہے جو ان اونٹنیوں کے قدموں تلے روندنے سے اٹھتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ پھر میں نے اپنے قول کو چھوڑ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کی طرف رجوع کر لیا۔ اور ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم ابراہیم نخعی سے ناقل ہیں کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا تھا کہ بدر میں گھوڑے نہ تھے تو حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) نے کہا تھا کہ یہ سواروں کے ایک خاص دستہ کا بیان ہے جو کسی جنگی مہم پر روانہ کیے گئے تھے اور عبد بن حمید نے شعبی سے جو اس مکالمہ کو نقل کیا ہے اس کے اخیر میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ بھی کہا تھا کہ ملاحظہ فرمائیے اس میں غبار اڑانے کا ذکر ہے اور غبار گھوڑوں، کی ٹاپوں ہی سے اٹھتا ہے۔ نیز عبد الرزاق، سعید بن منصور، ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم بطریق عمرو بن دینار، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے العادیات ضبحا کی تفسیر میں راوی ہیں

| | |
|---|---|
| لیس شیئ من | سوائے کتے اور گھوڑے |
| الدواب یضبح الا | کے چوپایوں میں سے کوئی |
| الکلب والفرس۔ | جانور نہیں ہانپتا۔ |

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس روایت کی اسناد کو صحیح کہا ہے۔ ؎۲

اسی طرح کی گفتگو ان دونوں حضرات کے شاگردوں میں بھی ہوئی ہے۔ چنانچہ عبد بن حمید

؎۱ یہ تمام روایات تفسیر فتح القدیر ج ۵ ص ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳ سے منقول ہیں ؎۲ ملاحظہ ہو فتح الباری ج ۸ ص ۵۵۹ طبع میریہ مصر۔

Marfat.com

ابو صالح سے نقل کرتے ہیں کہ میرے اور عکرمہ کے درمیان "العادیات" پر گفتگو ہوئی وہ کہنے لگے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ جہاد کے گھوڑے ہیں اور میں نے کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ یہ حاجیوں کے اونٹ ہیں اور میرے مولیٰ تمہارے مولیٰ سے زیادہ عالم تھے ۱ بہرحال گو اس سے اونٹ بھی مراد لیے جا سکتے ہیں تاہم عامہ مفسرین و اہل لغت نے "العادیات" سے گھوڑے ہی مراد لیے ہیں چنانچہ

امام قرطبی فرماتے ہیں :-

كذا قال عامة المفسرين　　عامہ مفسرین اور اہل لغت
واهل اللغة ۲　　نے ایسا ہی کہا ہے۔

اور قاضی محمد بن علی شوکانی لکھتے ہیں :-

والراجح انها الخيل　　اور راجح یہی ہے کہ یہ
كما ذهب اليه الجمهور　　گھوڑے ہیں چنانچہ جمہور
وكما هو الظاهر من　　اسی طرف گئے ہیں اور
هذه الاوصاف　　یہی ان اوصاف سے ظاہر
المذكورة في هذه　　ہوتا ہے جو اس سورت
السورة فانها　　میں مذکور ہیں کیوں کہ
في الخيل اوضح منها　　یہ صفات بہ نسبت
في الابل ۳　　اونٹ کے گھوڑوں میں زیادہ واضح ہیں۔

اور تفسیر کبیر میں اسی کو اکثر محققین کا قول بیان کر کے لکھا ہے کہ۔

"العادیات کا الف لام اگر ہم عہد کا قرار دیں تو محل قسم اسی سریہ (دستہ فوج) کے سوار ہوں گے اور اگر جنس کا قرار دیں تو یہ ان تمام گھوڑوں کی قسم ہوگی کہ جو اللہ کی راہ میں دوڑتے ہیں۔

اور واضح رہے کہ آیتیں پکار کر بتلا رہی ہیں کہ یہاں گھوڑے ہی مراد ہیں کیوں کہ ضبح گھوڑے ہی میں پایا جاتا ہے۔ اور اونٹ کے لیے اس کا استعمال استعارہ ہے جیسا کہ مشافر (اونٹ کے ہونٹ) اور حافر (کھر) کا انسان کے لیے اور شفتان (انسان کے دونوں ہونٹ) کا بچھڑے کے لیے اور حقیقت کو چھوڑ کر بلا وجہ مجاز مراد لینا جائز نہیں ہے ۴"

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے سورہ العادیات کی تفسیر میں ایک مستقل رسالہ فارسی زبان میں لکھا ہے

---

۱ فتح القدیر ج ۵ ص ۴۷۱　　۲ تفسیر قرطبی ج ۲۰ ص ۱۵۲ طبع مصر
۳ فتح القدیر ج ۵ ص ۴۶۹　　۴ تفسیر کبیر ج ۸ ص ۶۵۸ طبع مصر قدیم

جس کا نام ہے تحصیل النخائر والبرکات سورۃ العادیات اس میں العادیات کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-
" آواز اسپ را اسم نام است، صہیل کہ بلند کند آواز را چنانکہ عادت است در حمحمہ چنانکہ برائے علف کند و صبح آواز نفس اور درود پیدا"[1]

٣٠/٢٥

**عَادَيْتُمْ**: تم نے دشمنی کی، تم نے عداوت رکھی مُعَادَاۃٌ (باب مفاعلت) سے جس کے معنی کسی سے دشمنی کرنے کے ہیں ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر (ملاحظہ ہو عَدَاوَۃٌ)

٢٨/٨

**عَادِّيْنَ**: گننے والے، شمار کرنے والے عَدٌّ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر عَادٌّ کی جمع بحالت نصب، عَادِّيْنَ اصل میں عَادِدِيْنَ تھا، دو حرف ایک ہی جنس کے جمع ہوئے لہٰذا ایک کا دوسرے میں ادغام کر دیا گیا، عَادِّيْنَ ہو گیا۔ یہاں عَادِّيْنَ سے بعض نے تو حساب دانوں کو مراد لیا ہے اور بعض نے ان فرشتوں کو جو اعمال اور دنیا کے اوقات و ساعات قلم بند کرتے رہتے ہیں (ملاحظہ ہو تَعُدُّوْنَ اور عَدَدًا)

١٥/٦

**عَارِضٌ**: ابر، بادل۔ عَرْضٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، امام راغب لکھتے ہیں:-
" عارض وہ ہے جو اپنے عرض (چوڑائی) کو ظاہر کرے یہ لفظ کبھی تو بادل کے لیے مخصوص ہوتا ہے جیسے هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا (یہ ابر ہے ہم پر برسے گا۔ نیز جو بیماری لاحق ہوتی ہے اس کے لیے کہا جاتا ہے بہ عَارِضٌ من سقم (اس کو بیماری کا عارضہ ہے) اور کبھی یہ لفظ رخسارہ کے لیے خاص ہوتا ہے جیسے اخذ من عارضیہ (اپنے دونوں رخساروں سے اس نے لیا) اور کبھی دانتوں کے لیے آتا ہے چنانچہ ہنستے وقت جو اگلے دانت ظاہر ہوتے ہیں ان کو عوارض کہا جاتا ہے اور فلان شدید العارضۃ جودت بیان سے کنایہ ہے"
کشاف میں ہے کہ عارض وہ بادل ہے جو افق آسمان پر نمودار ہوتا ہے[2]۔ صاحب تاج العروس نے ائمہ لغت سے اس کی حسب ذیل تشریحات نقل کی ہیں۔ ابوزید کا بیان ہے کہ " عارض" وہ بدل

---

[1] یہ رسالہ المکاتیب والرسائل الی ارباب الکمال والفضائل کے ساتھ کہ جو شیخ کے مکاتیب کا مجموعہ ہے طبع ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو المکاتیب والرسائل ص ٢٧٢ مطبوعہ بر حاشیہ اخبار الاخیار طبع مجتبائی دہلی۔
[2] الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل ج ٤ ص ٣٠٣ طبع العامرۃ مصر ١٣٠٨ھ

ہے جو آسمان کے کنارے پر نظر آتی ہے۔ یہ بھی جلب
(بے پانی کا بادل) ہی کی طرح ہے فرق یہ ہے کہ عارض
سفید ہوتا ہے اور جلب سیاہ، نیز جلب "عارض"
کی بہ نسبت زیادہ سمٹا ہوا اور زیادہ دور پر ہوتا ہے
اصمعی کہتے ہیں عارض وہ بادل ہے جو آسمان پر محیط
ہونے سے پہلے پہاڑ کی طرح نمودار ہو۔ باہلی
نے کہا ہے کہ عارض وہ ابر ہے جو اچانک آسمان
پر نمودار ہو اور کسی کو اس کا خیال بھی نہ ہو۔ ۲۶/۳

عَارِضًا ۲۶/۳

عَاشِرُوهُنَّ: تم ان کے ساتھ گزران کرو، تم
ان کے ساتھ برتاؤ کرو، تم ان کے ساتھ زندگی گزارو
عَاشِرُوا مُعَاشَرَةً (مفاعلۃ) سے جس کے معنی
باہم زندگانی گزارنے کے ہیں امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر
هُنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب، ارشاد ہے عَاشِرُوهُنَّ
بِالْمَعْرُوفِ (ان کے ساتھ تمہارا اچھا رہن سہن ہو)
اس "معاشرت بالمعروف" کی تشریح امام جصاص رازی
حنفی المتوفی ۳۷۰ھ اس طرح فرماتے ہیں:-
"اللہ تعالیٰ نے شوہروں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی
بیویوں کے ساتھ اچھی طرح سے پیش آئیں
معروف کا مطلب یہ ہے کہ زوجہ کے حقوق مہر
اور نفقہ کی پوری طرح ادائیگی ہو اگر اس کی کئی
بیویاں ہوں تو دنوں کی تقسیم میں کمی بیشی نہ ہو سخت
گفتگو اور اس سے بے رخی اور غیر کی طرف
میلان سے اس کو اذیت نہ پہنچائے بلا جرم
اس کے سامنے ترشروئی بدمزاجی اور اسی
قسم کی اور باتوں سے پرہیز کرے[1]" ۴/۱۴

عَاصِفٌ: تیز و تند ہوا۔ سخت جھونکا عَصْفٌ
سے جس کے معنی آندھی آنے اور تیز و تند ہوا کے
چلنے کے ہیں۔ اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر راغب
لکھتے ہیں کہ ریح عاصف وہ ہوا ہے جو
چیزوں کو توڑ کر بھس بنا دے (کیونکہ عصف بھس
کو کہتے ہیں) اسی لیے ریح عاصف وہ ہوا ہوتی
جو چیز کو عصف کی طرح کر ڈالے، آیہ کریمہ مَثَلُ
الَّذِينَ كَفَرُوا كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ
فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ (احوال ان کا کہ جو منکر ہوئے
اپنے رب سے ان کے کیے جیسے راکھ، زور کی چلے
اس پر باؤ آندھی کے دن) میں "یوم عاصف" سے مراد
آندھی کا دن ہے اور عاصف بمعنی معصوف ہے یعنی
فاعل بمعنی مفعول جیسے کہ لیل نائم اور
ھمٌ ناصب ہیں "عاصف" کو یوم کی صفت کیوں

[1] احکام القرآن ج ۲ ص ۱۰۹ طبع دار الخلافہ ۱۳۲۵ھ۔

قرار دیا گیا، اس کی وجہ امام فرا یہ بیان کرتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| ان العصوف للرياح | حقیقت میں تو "عصوف" |
| وانما جعل تابعا | ہواؤں ہی کی صفت ہے |
| لليوم على جهتين | اور یوم کی جو اس کو بنایا گیا ہے |
| احدهما ان العصوف | تو صرف دو وجہ سے ایک |
| وان كان للريح فان | تو یہ کہ "عصوف" |
| اليوم يوصف به | ریح ہی کے لیے مخصوص |
| لان الريح تكون | ہے تاہم یوم کو بھی اس سے |
| فيه فجاز ان يقال | موصوف کر دیا جاتا ہے |
| يوم عاصف كما | چونکہ آندھی اس دن |
| يقال يوم حار ويوم | میں ہوتی ہے۔ لہٰذا یوم |
| بارد والحر والبرد | عاصف" کہنا درست |
| فيهما والوجه الآخر | ہے جس طرح سے کہ |
| ان يقال اراد في | "یوم حار" (گرم دن) اور یوم |
| يوم عاصف الريح | بارد (سرد دن) کہا جاتا ہے |
| لانها ذكرت في | جبکہ ان دونوں میں گرمی اور |
| اول الكلمة۔ | سردی ہو۔ دوسری وجہ |
| (تاج العروس) | یوم عاصف جب ہوا کے |
| | مراد لینے کی یہ ہو کہ ابتدا کلام |
| | میں وہی مذکور ہے۔ |

(عَوَاصِفُ جمع مؤنث عَصْفًا، پ ۱۱/۸ ، ۱۳/۱۵

عٰصِفٰتِ: جھونکا دینے والیاں یعنی ہوائیں جو تیز و تند چلتی ہیں، آندھیاں، عَصْفٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مؤنث، علامہ سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں لکھتے ہیں عاصفات وہ ہوائیں ہیں کہ جس پر گزرتی ہیں مٹی ڈال کر اس کا بھس بنا دیتی ہیں۔ عَاصِفَۃٌ کی جمع۔

واضح رہے کہ قرآن مجید میں حق تعالیٰ شانہٗ نے سورۃ "المرسلات" میں حسب ذیل پانچ چیزوں کی قسم کھائی ہے المرسلات، العاصفات، الناشرات، الفارقات، الملقیات ان پانچوں چیزوں سے کیا مراد ہے، اس بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ مولانا محمد سعید اسلمی مدراسی اپنی تفسیر مواہب الرحمٰن میں لکھتے ہیں:-

"بدانکہ مفسرین ذکر کردہ اند در تفسیر ایں پنج کلمہ وجوہے چند، اوّل آنکہ مراد ایں پنج بادہائے کہ ذکر کردہ شد بہ تفصیل در بر نیند جمہور ثانی آنکہ مراد ازاں فرشتگانند و ہمیں است مروی از ابن مسعود رضی اللہ عنہ . . . . . . . .

. . . و عاصفات ہماں فرشتگانند کہ ہمچو باد شدید می پرند و نازل شوند تشبیہ دادہ شدند فرشتگان در سرعت پرواز ایشاں

Marfat.com

بو زمین باد سخت، و نزد بعضے مراد از "عاصفات" فرشتگانیکہ می وزند ارواح کفار را و ہلاک کنند ایشاں را ماخوذ از قول عرب تعصف بالقوم اے ببرد و ہلاک و فنا کند ایشاں را، و نیز احتمال دارد کہ مراد از "عاصفات" آیات مہلکہ بود چوں زلزلہ ہا و خسفات و خسوف و مانند آں . . . .

ثالث آنکہ مراد از "مرسلات عرفا" آیات قرآن مجید است کہ فرود می آید پے در پے بر پیغمبر خدا علیہ السلام بہر معروف و خیر، و عاصفات ہمیں آیات قرآن است کہ می لرزاند دلہا را بذکر وعید تا آنکہ می گرداند ہمچو برگ گشتہ افسردہ و ریزہ شدہ یا باز دو محو کند سائر کتب و ادیان را بہ نسخ . . .

رابع آنکہ مراد ازیں پنج کلمات چیز واحد نیست بلکہ چیزہائے متعددہ مراد است بنا بریں کہ از مرسلات تا ناشرات بادہا مراد است و از قول فالفارقات تا ذکرا فرشتگان

و بہر تقدیر و بہر تاویل ایں پنج اسماء مقسم بہ بود و قسم خوردن خدائے تعالیٰ بایں چیزہا دلالت دارد بر بودن آں معظم نزد خدائے تعالیٰ و مناسبت درمیان باد و فرشتگان چنیں کہ فرشتگان روحانیانند سریع الحرکات بسبب لطافت خود چوں باد، و نیز ایں ہر دو مخلوقات اکثر جنود خدائے تعالیٰ اند چنانکہ در خبر است اکثر جنود اللہ الملئکۃ والریح ماز جہت ہمیں مناسبت ذکر کردہ شدند ہم در قسم در درجہ خبر¹

(انتہی ملخصاً بقدر الحاجہ) ۲۹/۲۱

**عَاصِفَۃٌ** : باد تند۔ آندھی، زور کی ہوا عَصْفٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث، ۱۴/۶

**عَاصِمٍ** ، بچانے والا، حفاظت کرنے والا، روکنے والا عِصْمَۃٌ سے جس کے معنی حفاظت کرنے کے اور روکنے کے ہیں اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ۱۱/۸ ۱۲/۴ ۲۴/۹

**عَافِیْنَ** ، معاف کرنے والے عَفْوٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، عَافٍ کی جمع بحالت نصب وجر (ملاحظہ ہو عَفْوٌ ، ۴/۵

**عَاقَبَ** : اس نے بدلہ دیا۔ اس نے سزا دی مُعَاقَبَۃٌ (مفاعلۃ) سے جس کے معنی عقوبت کرنے اور سزا دینے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب

¹ تفسیر مواہب الرحمٰن (فارسی) ص ۱۲۵، ۱۲۶ پارۂ تبارک مطبوعہ مطبع جامع الاخبار مدراس ۱۲۶۱ھ ہجری

Marfat.com

اِعقاب اور مُعَاقَبَۃ میں فرق یہ ہے کہ پہلے لفظ کا استعمال جزاءِ خیر کے لیے ہوتا ہے اور دوسرے کا جزاءِ شر کے لیے۔ علامہ ابو القاسم بن القطاع کتاب الافعال میں لکھتے ہیں۔

والعرب تقول — اہل عرب کہتے ہیں
اعقبت الرجل — اعقبت الرجل یعنی میں
جازیتہ بخیر — نے اس شخص کے ساتھ
وعاقبتہ جازیتہ — بہتر بدلہ کیا اور عاقبتہ
بشر — یعنی اس کو بُرا بدلہ دیا۔ $\frac{۱۶}{۱۵}$

**عَاقَبْتُمْ**: تم نے بدلہ دیا۔ تم نے سزا دی۔ تمہاری باری آئی مُعَاقَبَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر

آیہ شریفہ وَإِن فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ أَزْوَاجِكُمْ إِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَآتُوا الَّذِينَ ذَهَبَتْ أَزْوَاجُهُم مِّثْلَ مَا أَنفَقُوا (اور اگر جاتی رہیں تمہارے ہاتھ سے کوئی تمہاری عورتیں کافروں کی طرف، پھر تمہاری نوبت آئے تو دو ان کو جن کی عورتیں جاتی رہی ہیں جتنا انہوں نے خرچ کیا تھا) کے متعلق امام ابو جعفر بیہقی تاج المصادر میں لکھتے ہیں:

قولہ فعاقبتم تاویلہ — عَاقَبْتُمْ کا مطلب
فکانت العقبیٰ لکم و — یہ ہے کہ نتیجہ تمہارے
الغلبۃ لکم — حق میں ظاہر ہو اور
حتی غنمتم — غلبہ تمہارا ہو تا آنکہ تم

ومعنی عاقبتم — غنیمت حاصل کر لو اور
اصبتموھم فی — معنی اس کے یہ ہیں کہ تم
القتال بعقوبۃ — نے جنگ میں ان کو اتنی
حتی غنمتم — عقوبت پہنچائی کہ غنیمت
حاصل کر لی۔

امام بیہقی نے معاقبۃ کے حسب ذیل معانی لکھے ہیں: عقوبت کردن، واز پے کسے در آمدن و بر نوبت کارے کردن و غنیمت یافتن۔ آیہ مذکور میں سب معانی بن سکتے ہیں، تم نے ان کو سزا دی، تم نے ان کا تعاقب کیا۔ تمہاری بھی باری آئی، تم نے غنیمت پائی۔ ہر صورت میں مراد یہ ہے کہ جب تمہاری ادائیگی مہر کی باری آئے۔ کیونکہ یہ سب معانی کامیابی اور فتح و ظفر پر دلالت کرتے ہیں جس کے بعد ادائیگی مہر میں کوئی دقت نہیں۔

$\frac{۱۴}{۲۲}$ $\frac{۲۸}{۸}$

**عَاقِبَتَهُمَا**: ان دونوں کا انجام۔ ان دونوں کی عاقبت، عَاقِبَۃٌ مضاف، هُمَا ضمیر تثنیہ مذکر غائب مضاف الیہ (ملاحظہ ہو عَاقِبَۃ)

$\frac{۲۸}{۵}$

**عَاقِبُوْا**: تم بدلہ دو، تم سزا دو مُعَاقَبَۃٌ سے بمعنی سزا دینے اور عقوبت کے امر کا صیغہ

Marfat.com

جمع مذکر حاضر۔ ۱۴/۲۲

**عَاقِبَةٌ** : عاقبت، انجام، آخر، یہ اصل میں عَقَبَ یَعْقُبُ کا مصدر ہے جس کے معنی پیچھے سے آنے کے ہیں، لیکن اس کا استعمال ہر شئے کے آخر اور انجام کے لیے ہوتا ہے۔ امام راغب نے تصریح کی ہے کہ اس کا استعمال ثواب کے لیے مخصوص ہے جیسے وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (اور آخر بھلا ہے ڈر والوں کا) اور اضافت کی صورت میں کبھی کبھی عقوبت کے لیے بھی آتا ہے جیسے ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَاءُوا (آخر عاقبت خراب ہوئی ان لوگوں کی جنہوں نے بُرا کام کیا تھا) اور آیۂ شریفہ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِى النَّارِ (پھر آخر ان دونوں کا یہ انجام نیک ہوا کہ دونوں آگ میں ہیں) استعارہ بالعند ہو سکتا ہے جیسا کہ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (سو ان کو خوشخبری سنا دُکھ والی مار کی) میں کہ عذاب کی خوشخبری نہیں بلکہ دھمکی ہوتی ہے لیکن یہاں استعارہ بالعند کے طور پر وعید کو بشارت سے تعبیر کیا ہے اسی طرح آیۂ مذکورہ میں انجام بد کی تعبیر عاقبۃ سے کی گئی ہے اس کی جمع عواقب ہے۔

۴/۵ ، ۸/۶ ، ۸/۱۳،۱۶،۱۸ ، ۹/۵،۱۳ ، ۱۱/۹،۱۳ ، ۱۲/۴ ، ۱۳/۶

۱۴/۱۱ ، ۱۶/۱۴ ، ۱۷/۱۳ ، ۱۹/۱۷،۱۹ ، ۲۰/۳،۷،۱۲ ، ۲۱/۴،۸،۱۲ ، ۲۲/۱۶ ، ۲۳/۴
۲۴/۸،۱۴ ، ۲۵/۸ ، ۲۶/۵ ، ۲۸/۱۸

**عَاقِرٌ** : بانجھ، عَقَارَةٌ سے جس کے معنی عورت کے بانجھ ہونے کے ہیں، بروزن فاعل بمعنی اسم منسوب ہے، امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں، عُقْرُ الحوض، عُقْرُ الدار (پیش کے ساتھ) حوض اور گھر کے صحن اور جگہ کو کہتے ہیں، اور عَقْرٌ (بالفتح) بھی بولتے ہیں۔ اور عَقَرْتُہٗ کے معنی ہیں میں نے اس کی عُقْر جڑ پر رسید کیا جیسے رأستُہٗ کے معنی ہیں میں نے اس کے سر پر ضرب لگائی۔ اور اسی سے نکلا ہے عقرت النخل میں نے درخت خرما کو جڑ سے کاٹ ڈالا اور عقرت البعیر میں نے اونٹ کی کونچیں کاٹ دیں، اور عقرت ظہر البعیر فانعقر میں نے اونٹ کی پشت پر زخم لگایا تو وہ زخمی ہو گیا . . .

اور اسی سے حسب ذیل الفاظ کا استعارہ کیا گیا ہے سَرْجٌ مُعْقِرٌ (زخمی کر دینے والی زین۔ اور کَلْبٌ عَقُوْرٌ (سگ گزندہ کٹ کھنا کتا) اور رجل عاقر (بانجھ مرد) اور اِمْرَاَۃٌ عَاقِرَۃٌ (وہ عورت جو بچہ نہ جنے گویا

مرد کے نطفہ کو قطع کرنے والی ہے۔"

یہ واضح رہے کہ اس کا فعل ضَرَبَ، سَمِعَ اور کَرُمَ تینوں بابوں سے آتا ہے تاج العروس میں ہے کہ عَاقِرٌ اسم ہے نسبت کے معنی میں یعنی ذات عقر کے معنی جیسے کہ امرأۃ حائض (بمعنی ذات حیض) اور امرأۃ طالق (بمعنی ذات طلاق) ہے۔ قاضی شوکانی نے لکھا ہے کہ اگر فاعل کے معنی میں ہوتے تو عقیرۃ ہونا چاہیے تھا[1] تفسیر مظہری میں ہے کہ اس لفظ کا استعمال مذکر و مؤنث دونوں کے لیے یکساں ہوتا ہے[2] اور قاضی شوکانی نے تصریح کی ہے کہ جو عورت بڑھاپے کے سبب سے نہ جنے وہ بھی عاقر ہے اور جو بانجھ ہو وہ بھی اور یہاں بانجھ ہی مراد ہے[3]۔ ان بی بی صاحبہ کا نام ابن جریر نے تو ایشاع بنت فاقوذ بن قبیل بتایا ہے جو حضرت رضی اللہ عنہا کی بہن ہوتی ہیں۔ حنہ رضی اللہ عنہا حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ ماجدہ کا نام ہے، اور مورخ ابن قتیبہ ان کا نام ایشاع بنت عمران بیان کرتے ہیں۔ پہلے قول پر ان کے صاحبزادے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کے خالہ کے بیٹے ہوتے ہیں اور دوسرے قول پر خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خالہ زاد بھائی جیسا کہ صحیح حدیث میں وارد ہے[4]

پ ۳/۱۲ عَاقِرًا ۱۶/۴

**عَاكِفٌ**: رہنے والا، باشندہ، متوطن، مجاور لگ بیٹھنے والا، جم کر بیٹھنے والا۔ عُكُوفٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، راغب اصفہانی لکھتے ہیں:۔

"عُكُوفٌ کے معنی ہیں تعظیم کے طور پر کسی چیز کی طرف متوجہ ہونا۔ اور اس کو لازم پکڑ لینا"

تاج المصادر میں اس کے حسب ذیل معانی لکھے ہیں، رکا جانا، کسی چیز کی طرف متوجہ ہونا کسی چیز کے گرد جمع ہونا۔ کسی جگہ میں مقیم ہونا۔ ارشاد باری اَلْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ کے متعلق امام ابو بکر جصاص فرماتے ہیں کہ "سلف کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ عَاكِفٌ سے مراد اہل حرم اور باد سے غیر اہل حرم ہیں[5]۔ اور ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا میں عاکف بمعنی مجاور و معتکف ہے کیونکہ جب

[1] فتح القدیر ج ۱ ص ۳۰۶ [2] تفسیر مظہری ج ۲ سورہ آل عمران ص ۴۱ طبع حیدر پریس دہلی [3] ملاحظہ فتح القدیر ج ۳ ص ۳۱۱ [5] احکام القرآن ج ۳ ص ۲۳۰ طبع دار الخلافہ۔

عکوف کا صلہ علیٰ آتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کی طرف اس طرح الگ کر بیٹھ جانا کہ پھر اس کی طرف سے منہ ہی نہ موڑے تاج العروس میں ہے وعکف علیہ عکوفا اقبل علیہ مواظبا لایصرف وجہہ عنہ۔ یعنی اس کی طرف اس اہتمام سے متوجہ ہوا کہ اُدھر سے منہ ہی نہیں ہٹاتا۔ ب۱ عَاكِفًا ۱۶/۱۴

عَاكِفُوْنَ: معتکف اعتکاف کرنے والے مجاور، گرد جمع ہونے والے۔ عُكُوْفٌ اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر عَاكِفٌ کی جمع بحالت رفع تاج العروس میں ہے کہ عَاكِفُوْنَ ای مقیمون ملازمون لایبرحون یعنی مقیم ہونے والے اور ایسے جمنے والے کہ ٹلتے ہی نہیں، اور عکوف فی المسجد کے معنی ہیں مسجد میں اعتکاف کرنے کے۔ اور اعتکاف شرع میں کہتے ہیں عبادت کی نیت سے اپنے آپ کو مسجد میں روکے رکھنے کو۔ ارشاد الٰہی عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدِ میں عاکفون سے معتکف لوگ مراد ہیں۔ اور یہاں یہ لفظ اپنے شرعی معنی میں استعمال ہوا ہے اور مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُوْنَ (یہ کیا مورتیں ہیں جن پر تم لگے بیٹھے ہو) میں عاکفون سے اس کے لغوی معنی مراد ہیں۔

ب۲ ۱۴/۵

عَالٍ: سرکش، متکبر، غالب، تابو یافتہ۔ عُلُوٌّ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، علامہ ابو جعفر بیہقی نے عُلُوٌّ کے حسب ذیل معانی لکھے ہیں: سرکشی کرنا۔ بلند ہونا۔ کسی کام پر قابو پانا، کسی چیز کے اوپر ہونا، کسی شخص پر غلبہ پانا۔ یہاں سب معانی بن سکتے ہیں، لیکن اس کا استعمال مذمت کیلئے ہوا ہے۔ اس لیے اس کا لحاظ ہے عَالٍ اصل میں عَالِيٌ تھا، عَادٍ میں جو تعلیل ہوئی وہی اس میں بھی ہوئی ہے (ملاحظہ ہو عَادٍ اور عُلُوًّا) ۱۹/۱۴

عَلِيْمٌ: جاننے والا۔ علم رکھنے والا۔ عِلْمٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر۔ قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال حق تعالےٰ کی ذات عالی ہی کے لیے ہوا ہے۔ اور جب حق تعالےٰ شانہ کے لیے اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں وہ ذات عالی کہ جس پر کوئی چیز مخفی نہ ہو اور ہر چیز کی حقیقت سے باخبر ہو۔ چنانچہ امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں فرماتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| قال الحلیمی فی معنی العالم انہ مدرک الاشیاء | علیمی نے "عالم" کے معنی بتائے ہیں وہ ذات جو اشیاء کا اس طرح ادراک |

علیٰ ما ھی بہٖ کر سکے جس طرح پر کردہ ہیں

امام راغب رقم طراز ہیں ا۔

والعالم فی وصف عالم جب اللہ تعالیٰ کا
اللہ ھو الذی لا وصف ہو تو اس کے
یخفی علیہ شیء و معنی ہیں وہ ذات جس
ذٰلک لا یصح الا سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں
فی وصف اور یہ بات صرف اللہ
تعالیٰ۔ تعالیٰ ہی کے وصف
میں صحیح ہے۔

(ملاحظہ ہو علم) پ ۷/۱۵، پ ۱۱/۲۱، پ ۱۳/۸، پ ۱۸/۵، ۲۱/۱۴، پ ۲۲/۷،۲۰، پ ۲۴/۲، پ ۲۸/۱۲،۱۷،۲، ۲۹/۱۲

عَالِمُوْنَ: جاننے والے، علم رکھنے والے
عِلْمٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر عَالِمٌ کی جمع
بحالت رفع پ ۲۰/۱۶

عَالِمِیْنَ: جاننے والے، علم رکھنے والے عِلْمٌ
سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر عَالِمٌ کی جمع بحالت
نصب وجر پ ۱۲/۲، ۱۷/۶،۵

عٰلَمِیْنَ: سارے جہان، تمام، عالَمٌ،
عَالَمٌ کی جمع بحالت نصب وجر۔ اللہ تعالیٰ کی ذات
کے سوا سب مخلوقات کو "عالم" کہتے ہیں۔

علامہ ابو البرکات عبد اللہ بن احمد نسفی، تفسیر
مدارک التنزیل وحقائق التاویل میں فرماتے ہیں۔

"اجسام جواہر اور اعراض جن سے خالق کا علم
ہوتا ہے یہ سب عالم ہیں یا اللہ تعالیٰ کے
سوا جو کچھ موجود ہے اس کا نام "عالم" ہے
اور یہ نام اس لیے ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ
کے وجود کی علامت ہے۔"

اور امام راغب مفردات القرآن میں رقمطراز ہیں
"عالم آسمان اور آسمان کے تلے جو جواہر و اعراض
ہیں ان کا نام ہے۔ یہ اصل میں اسم ہے اس
چیز کا جس کے ذریعہ علم حاصل کیا جائے جس
طرح سے طابع (ٹھپہ) اور خاتم (مہر)
ان اشیاء کے اسم ہیں کہ جن سے ٹھپہ لگایا جاتا
اور مہر کی جاتی ہے اور اس صیغہ پر اس کی
بنا بھی اسی لیے رکھی گئی ہے کہ وہ بھی
بمنزلہ آلہ کے ہے کیونکہ عالم اپنے بنانے

---

۱ کتاب مذکور ص ۱۵ طبع انوار احمدی الہ آباد۔ ۲ واضح رہے کہ منطقی ذات کو "جوہر" کہتے ہیں اور صفت کو "عرض"
ذات کی دو قسمیں ہیں جسم اور روح، جسم اس کو کہتے ہیں کہ جو محسوس ہو اور طول، عرض، عمق رکھتا ہو اور ایک متعدد اور مقدار
اس کی معین ہو اور اپنی صورت اور مقدار کو چھوڑ کر دوسری صورت اور مقدار کو اختیار نہ کرے اور روح وہ
ہے جو ایسی نہ ہو ۳ مدارک التنزیل ج ۱ ص ۶ طبع مصر۔

کی طرف رہنمائی کا آلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنی واحدانیت کی معرفت کے سلسلہ میں ہم کو عالم ہی کا حوالہ دیا ہے۔ ارشاد ہے اَوَلَمْ یَنْظُرُوا فِی مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ کیا انہوں نے نگاہ نہیں کی سلطنت میں آسمان اور زمین کی اور جو کچھ اللہ نے بنایا ہے اس میں ۔

اور اس کی جمع بھی اسی لحاظ سے ہے کہ ان مخلوقات کی ہر نوع " عالم " کہلاتی ہے چنانچہ کہا جاتا ہے۔ عالمِ انسان، عالمِ آب عالمِ آتش، نیز مروی ہے کہ حق تعالیٰ کے دہ ہژدہ ہزار " عالم " ہیں۔ اور جمع سلامت[مہ] کی وجہ یہ ہے کہ انسان بھی ان عالموں کے زمرہ میں شامل ہے اور جب کسی لفظ کا استعمال انسان اور غیر انسان کا دونوں کے لیے مشترک ہو تو انسان کا حکم غالب ہوتا ہے اور بعض کہتے ہیں چونکہ اس سے مخلوقات کی اصناف خاص یعنی فرشتے، جن اور انسان ہی مراد ہیں اور ان کے علاوہ دیگر مخلوقات مراد نہیں چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے اس بنا پر اس کی یہ

جمع لائی گئی ہے اور امام جعفر بن محمد (صادق) کا قول ہے کہ ثقلین سے مراد صرف انسان ہیں اور ہر انسان کو ایک علم قرار دیا گیا ہے امام موصوف نے یہ بھی فرمایا ہے کہ عالم کی دو قسمیں ہیں ایک عالم کبیر یہ آسمان اور جو کچھ زیر آسمان ہے اس کا نام ہے اور دوسرا عالم صغیر جو انسان ہے کیوں کہ وہ عالم کی ہئیت پر بنایا گیا ہے اور حق تعالےٰ نے جو کچھ عالم کبیر میں ایجاد فرمایا ہے وہی اس میں پیدا فرمایا ہے "

علامہ محمود زمخشری کا بھی مختار یہی معلو[م] ہوتا ہے کہ عالم ارباب علم کا نام ہے چنانچ[ہ] وہ الکشاف عن حقائق التنزیل میں لکھتے ہیں

العالم اسم لذوی العلم من الملئکۃ والثقلین وقیل کل ما علم بہ الخالق من الاجسام والاعراض۔

" عالم " نام ہے فرشتوں جن[وں] اور انسانوں میں سے ا[ن] لوگوں کا جو اہل علم ہیں اور ک[ہا] گیا ہے کہ وہ سب ج[و] و اعراض کہ جن سے [...] خالق کا علم [...]

مہ جو ذوی العقول کے ساتھ خاص ہے۔

Marfat.com

ہوتا ہے عالم ہیں

دوسرے قول کو چونکہ علامہ موصوف نے بلفظ قیل ذکر کیا ہے جو اس کے ضعف کی طرف ارشارہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ علامہ پہلے قول کے قائل ہیں۔

مشہور محقق علامہ سید شریف علی بن محمد جرجانی المتوفی ۸۱۶ھ کی تحقیق یہ ہے کہ مخلوقات کی ہر جنس پر عالم "کا اطلاق ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اجناس کے مابین قدر مشترک کا نام ہے اور ہر جنس پر بھی بولا جاتا ہے اور مجموعہ اجناس پر بھی چنانچہ سید موصوف حواشی الکشاف میں زمخشری کی عبارت مذکورہ کے تحت رقمطراز ہیں۔

"مطلب یہ ہے کہ جس طرح طابع اور خاتم دو نام ہیں ٹھپہ لگانے اور مہر کرنے والی چیز کے اسی طرح عالم بھی چونکہ اس کا اشتقاق علم سے ہے ارباب علم کا نام ہے یعنی وہ ایسا اسم ہے کہ جس کا اطلاق اہل علم کی اجناس میں سے ہر جنس پر ہوتا ہے فرد پر نہیں چنانچہ عالم الملک (فرشتوں کا عالم) عالم الانس (انسانوں کا عالم) عالم الجن (جنات کا عالم)، تو بولا جاتا ہے پر عالم زید مثلاً نہیں بولا جاتا۔

اور کہا گیا ہے کہ وہ ایسا اسم ہے جو ہر اس جنس پر بولا جاتا ہے کہ جس سے خالق کا علم ہو یعنی اللہ کے ماسوا ہر جنس کو " عالم" کہتے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔ عالم افلاک عالم عناصر، عالم نبات، عالم حیوان، عالم اعراض، وغیرہ۔

پس عالم نام ٹھہرا اس قدر مشترک کا کہ جو اجناس اہل علم اور ان اجناس کے مابین ہے کہ جن سے خالق کا علم ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا استعمال ان میں سے ہر ایک کے لیے بھی صحیح ہے اور ان سب کے مجموعہ پر بھی اور مصنف (یعنی علامہ زمخشری) کی یہ مراد نہیں ہے کہ وہ مجموع من حیث المجموع کے اعتبار سے مجموع ذوی العلم یا مجموع ما یعلم الخالق کا نام ہے ... اس صورت میں اس کی جمع بنانی ناممکن ہو گی کیوں کہ ہر دو مجموع میں اس حیثیت سے کوئی تعدد نہیں ہے[1]"

سید محمود آلوسی بھی جو متاخرین علما میں بڑے

---

[1] ملاحظہ ہو کشاف مع حاشیہ سید شریف ج ۱ص ۱۲-ص ۳۴ طبع مصر۔

پید کے مفسر ہوئے ہیں اس تحقیق میں سید شریف کے ہمزبان ہیں، چنانچہ روح المعانی میں ارقام فرماتے ہیں :—

،عالم جو خاتم کی طرح سے ہے نام ہے اس شے کا کہ جس کے ذریعہ کسی چیز کا علم کیا جائے، اس کا غالب استعمال اس شے کے متعلق ہوتا ہے کہ جس سے خالق عالم کا علم حاصل ہو۔ اللہ تعالیٰ کے ماسوا جو کچھ ہے جواہر ہوں یا اعراض وہ سب عالم ہیں۔ عالم کا اطلاق جس طرح ایک یا ایک سے زائد جنس پر ہوتا ہے اسی طرح مجموعہ اجناس پر بھی ہوتا ہے۔ گویا یہ قدر مشترک کا نام ہے ورنہ یا تو اس میں اشتراک ماننا پڑے گا یا حقیقت و مجاز، حالانکہ اصل[عہ] ان دونوں چیزوں کی نفی ہی ہے۔

عالم کا استعمال جنس کے کسی ایک فرد کے لیے نہیں ہوتا ہے۔ چنانچہ جس طرح عالم الانسان کہا جاتا ہے عالم زید نہیں کہا جاتا۔ اور شاید یہ صرف غلبہ استعمال اور اصطلاح کی بنا پر ہے ورنہ اصل معنی کے لحاظ سے فرد پر اس کا اطلاق صحیح ہونے میں قطعاً کوئی شبہ نہیں۔ کیوں کہ اس لفظ کا جو مصداق ہے وہ اس میں قطعی طور پر موجود ہے کیوں کہ حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کے وجود باجود پر جس طرح کہ اس کے ماسوا مجموعہ مخلوقات نیز مخلوقات کی ہر جنس سے استدلال کیا جاسکتا ہے ٹھیک اسی طرح اس مجموعہ کے اجزاء میں سے ہر ایک جزء سے اور ان اجناس کے افراد میں سے ہر فرد سے بھی اس ذات عال کے متعلق استدلال کیا جاسکتا ہے۔"[1]

اور ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں کہ :۔

۔بعض علماء نے العٰلمین کو ملائکہ اور ثقلین کے ارباب علم سے مخصوص کر دیا اور جو اشرف الموجودات کا رب ہے وہ اوروں کا بھی رب ہے۔ امام سیوطی فرماتے ہیں کہ اس معنی کے اعتبار سے لفظ

عہ یعنی جب تک تحقیقی طور پر لفظ کا مشترک ہونا یا حقیقت و مجاز ہونا معلوم نہ ہو اصل قاعدہ کے اعتبار سے اس کو ایک ہی معنی کے لیے موضوع سمجھا جائے گا۔ — [1] روح المعانی ج ۱ ص ۸۰ طبع منیریہ مصر۔

عالم علم سے مشتق ہے۔ اور جو عالمین میں عموم مانا جائے تو علامۃ (نشانی) سے، لیکن اس میں یہ خرابی ہے کہ دو معنی پر دونوں لفظوں سے اشتقاق ہو سکتا ہے لہٰذا یہ تخصیص دعویٰ بلا دلیل ہے"[1]

زجاج نے بھی جو متقدمین ائمہ لغت و عربیت میں سے ہیں اس کو علم اور علامۃ دونوں سے ماخوذ بتایا ہے۔[2]

بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ عٰلمین جمع مذکر سالم کے وزن پر اسم جمع ہے اور یہ اس بارے میں اپنی آپ نظیر ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ علامہ محمود آلوسی فرماتے ہیں:-

"اور کہا گیا ہے کہ وزن سلامت پر اسم جمع ہے اور اس کی کوئی نظیر نہیں ہے لیکن اس میں بحث ہے کیوں کہ جو اسم دو سے زیادہ پر دلالت کرتا ہے وہ اگر گنتی اکائیوں کے لیے وضع کیا گیا ہے اور ان پر اس طرح دلالت کرتا ہے کہ جس طرح واحد عطف کے ساتھ تکرار پر دلالت کرتا ہے تو وہ جمع کہلاتا ہے اور اگر وہ حقیقت کے لیے وضع کیا گیا ہے اور فردیت کا اعتبار اس میں ملحوظ نہیں تو وہ "اسم جنس جمعی" ہے جیسے تَمَرٌ (اسم جنس جمعی) اور تَمَرَةٌ (واحد) اور جو مجموعِ احاد کے لیے وضع کیا گیا ہے تو وہ "اسم جمع" ہے خواہ اس کا کوئی واحد ہو جیسے رَکْبٌ (کہ اس کا واحد رَاکِبٌ ہے) خواہ اس کا واحد نہ ہو جیسے رَھط، اب خود غور کر لیجئے کہ اس پر کونسی تعریف صادق آتی ہے"[3]

قاموس میں ہے کہ سوائے عالَم اور یاسَم کے فَاعَلٌ کے وزن پر کوئی بھی لفظ ہو اس کی جمع واو نون کے ساتھ نہیں آتی ہے۔ اور تاج العروس میں بعض علماء سے یہ نقل کیا ہے کہ عالَم جب بمعنی خلق ہو تو اس کی جمع عوالم ہوتی ہے

عالَمٌ کے متعلق ایک بحث یہ بھی ہے کہ اس کا واحد آتا ہے یا نہیں، علامہ ابن خالویہ لغوی اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن العظیم میں لکھتے ہیں "عالمین جمع ہے اس کا واحد عالَمٌ ہے اور عالَمٌ بھی جمع ہے مگر اس کا واحد اس لفظ پر بھی نہیں آتا۔ البتہ رجل، فرس، امرأۃ یہ سب اس کے واحد من غیر لفظہ

---

[1] روح المعانی ج ۱ ص ۷۹ [2] ملاحظہ ہو فتح القدیر شوکانی ج ۱ ص ۱۱ [3] روح المعانی ج ۱ ص ۸۰،

ہیں اور دیگر علماء یہ کہتے ہیں کہ عالم کا واحد ہی نہیں ہے نہ اس کے لفظوں پر نہ اور لفظوں پر کیوں کہ وہ اشیاء مختلفہ کی جمع ہے[1]
بہر حال جیسا کہ سابق میں معلوم ہوا عالم سے کبھی مجموعہ مخلوقات مراد ہوتا ہے اور کبھی مخلوقات کی جنس خاص اس لیے قرآن مجید میں اس کے معنی کا تعین موقع اور محل استعمال کے اعتبار سے کرنا پڑے گا۔ چنانچہ رب العٰلمین میں عالمین سے کل مخلوقات کا مراد لینا زیادہ بہتر ہے۔ کیوں کہ خدا کی ربوبیت عام کے لیے یہی معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

والمناسب للمقام هنا هو العموم[2] — یہاں تو عموم موقع کے زیادہ مناسب ہے

اور آیہ شریفہ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ اور وہ جو میں نے تم کو بڑا کیا جہان کے لوگوں سے) میں عٰلَمِیْنَ سے اسی زمانے کے لوگ مراد ہیں چنانچہ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:-

ارشاد الٰہی وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ میں کسی نے تو یہ کہا ہے کہ عالمین سے اس زمانے کے جہان مراد ہیں۔ اور کسی نے کہا ہے کہ اس سے اس عہد کے وہ فضلاء مراد ہیں کہ جن میں سے ہر ایک اللہ کی دین اور اس کی نوازش کی بدولت ایک عالم کا قائم مقام تھا۔ اور ان کو عالم سے موسوم کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً میں اُمت کے نام سے موسوم فرمایا ہے"

اور علامہ محمود بن عمر زمخشری نے تفسیر کشاف میں اس کا ترجمہ انسانوں کے جم غفیر سے کیا ہے چنانچہ وہ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:-

"ارشاد الٰہی بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِیْنَ (ہم نے اس زمین میں لوگوں کے لیے برکت رکھی) کی طرح سے یہاں بھی عٰلمین سے انسانوں کا جم غفیر مراد ہے۔ محاورہ ہے رأیت عالما من الناس (میں نے لوگوں کا ایک عالم دیکھا) اس سے کثرت مراد ہوتی ہے"[3]

لیکن امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں کہ:

---

[1] کتاب مذکور ص ۳۴ طبع دار الکتب المصریہ ۱۳۶۰ھ [2] روح المعانی ج ۱ ص ۷۹
[3] تفسیر کشاف ج ۱ ص ۲۱۳ طبع مصر۔

"یہ قول ضعیف ہے اس واسطے کہ عالم کا لفظ علم سے مشتق ہے اور علم کے معنی دلیل کے ہیں پس جتنی چیزیں حق تعالٰے کے وجود کی دلیلیں ہیں وہ سب عالم ہیں اور علمائے متکلمین کا جو یہ قول ہے کہ عالم ماسوی اللہ کو کہتے ہیں اس کی تحقیق بھی یہی ہے اس بنا پر عالم کی تخصیص بعض موجودات کے ساتھ نہیں ہو سکتی"۔ [1]

اس پر قاضی محمد بن علی شوکانی فتح القدیر میں رقم طراز ہیں:-

"میں کہتا ہوں کہ یہ اعتراض ساقط ہے ایک تو اس وجہ سے کہ اس کا اشتقاق علم سے بتانا دعوٰی بلا دلیل ہے۔ دوسرے اس بنا پر کہ اگر اس اشتقاق کی صحت کو ہم تسلیم بھی کر لیں تب بھی اس میں وہ معنی موجود ہیں کہ جس کے ہوتے دلیل وجود باری کا وہ مفہوم اس میں قائم رہتا ہے کہ جس کی بنا پر لفظ عالم کا اطلاق اس پر صحیح ہے۔ اور یہ معنی تو افراد مخلوقات میں سے ہر فرد میں موجود ہیں کہ اس سے خالق کائنات کے وجود پر استدلال ہوتا ہے۔

زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ عالمو کی جمع اس بات کو مستلزم ہے کہ مخلوقات کے بہت سے افراد پر ان کو فضیلت دی گئی ہے لیکن یہ بات کہ ہر زمانے میں ان کو کل خلق پر فضیلت عطا کی گئی تو نہ اس لفظ ہی سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے اور نہ اس کا اشتقاق ہی اس پر دلالت کرتا ہے۔

اور جن لوگوں نے کہ "عالم" سے اہلِ زمانہ مراد لیا ہے ان کے معنی پر بھی زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ چند زمانوں کے اعتبار سے ان کو فضیلت ہو گی نہ کہ ہر زمانہ کے لحاظ سے لہٰذا اس لفظ سے ان کی فضیلت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ عصر اور از منہ مابعد کے لوگوں پر لازم نہیں آتی۔ یہ بات حسب ذیل آیات کی تفسیر کرتے وقت بھی یاد رکھنی چاہیے (۱) اِذْ جَعَلَ فِیكُمْ اَنْبِیَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ (جب پیدا کیے تم میں نبی اور کر دیا تم کو بادشاہ اور

[1] تفسیر کبیر ج ۱ ص ۵۰۰ طبع مصر۔

دیا تم کو جو نہیں دیا کسی کو جہان میں) (۲) وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (اور ان کو ہم نے پسند کیا جان بوجھ کر جہان کے لوگوں سے) (۳) اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (بلاشبہ اللہ نے برگزیدہ کیا آدم کو اور نوح کو اور ابراہیم کے کنبے کو اور عمران کے کنبے کو سارے جہان پر)

اب اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ العلمین کا معرف باللام ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ لفظ ہر عالم پر شامل ہے (خواہ اس عہد کے عالم ہوں یا بعد کے) تو میں کہونگا کہ اگر ایسا ہو جب بھی یہ اُمت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر افضلیت کو مستلزم نہیں کیوں کہ حق تعالےٰ کا ارشاد ہے کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (تم ہو بہتر اُمت جو پیدا ہوئے ہیں لوگوں میں) لہٰذا یہ اور اسی طرح کی دوسری آیات ان آیتوں کی تخصیص کردیں گی۔ لہ

مفسرین سلف میں سے مجاہد، ابو العالیہ اور قتادہ سے اس آیت کی تفسیر میں عالمی زمانہم ہی مروی ہے۔ ؎

اسی طرح وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (اور سب کو ہم نے بزرگی دی سارے جہان والوں پر) اور وَهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (اور اس نے تم کو بزرگی دی سب جہان پر) اور اسی طرح کی دیگر آیات میں اسی عہد کے لوگ مراد ہیں۔ اور نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ سے بھی اس عہد کی عورتیں مراد ہیں لیکن زجاج کا مختار یہ ہے کہ اس سے مراد ساری دنیا کی عورتیں ہیں۔ اور سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ (سلام ہے نوح پر سارے جہان والوں میں) میں "عالمین" سے ملائکہ اور جن و انس مراد ہیں یعنی ہمیشہ خلق ان پر سلام بھیجتی ہے۔

اسی طرح ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ اور ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ اور لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا اور رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ وغیرہ آیات میں "عالمین" سے مراد وہ تمام جن و انس ہیں کہ جو نزول قرآن مجید کے وقت موجود تھے اور آئندہ تا قیام قیامت ہوتے رہیں گے خواہ وہ مومن ہوں یا کافر ۱/۱۵،۱۶ ۲/۱۶ ۳/۱۲،۱۳ ۴/۱،۲ ۶/۸،۹

۷/۵،۱۲،۱۵،۱۶ ۸/۱۰،۱۳،۱۵،۱۶،۱۸ ۹/۲۳،۲۴،۲۶

لہ تفسیر فتح القدیر ج ۱ ص ۶۷، طبع بابی حلبی ۱۳۴۹ھ ؎ تفسیر مظہری ج ۱ سورہ البقرہ ص ۶۶ بحوالہ ابن جریر

ب ۱۱/۶،۹ ، ب ۱۳/۵ ، ب ۱۴/۵ ، ب ۱۷/۵،۶،۷ ، ب ۱۸/۱۶ ، ب ۱۹/۶،۸،۹،۱۰،۱۱،۱۲

ب ۱۹/۳،۴،۱۵،۱۶،۱۸ ، ب ۲۰/۷،۱۳،۱۴،۱۵ ، ب ۲۱/۶،۱۴

ب ۲۳/۷،۹،۱۴ ، ب ۲۴/۵،۱۲،۱۶ ، ب ۲۵/۱۱،۱۵،۱۸،۲۰ ، ب ۲۷/۱۶

ب ۲۸/۵ ، ب ۲۹/۳،۶ ، ب ۳۰/۶،۹

**عَالِيًا** : سرکش، متکبر، جبر کرنے والا عُلُوٌّ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو عالٍ)

ب ۲۵/۵

**عَالِيْنَ** : سرکشی کرنے والے، تکبر کرنے والے زبردستی کرنے والے، بلند مرتبے والے عُلُوٌّ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، عَالٍ کی جمع بحالت نصب وجر، ب ۱۸/۳ ، ب ۲۳/۱۴

**عَالِيَةٍ** : عالی، اونچی، بلند، عُلُوٌّ سے بمعنی بلند ہونے کے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث، یہاں اس کا استعمال مقام مدح میں ہوا ہے اور جنت کی صفت میں آیا ہے کیوں کہ جنت مکان کے اعتبار سے بھی سب امکنہ سے بلند ہے اور قدر و منزلت کے لحاظ سے بھی سب سے بالا ہے اور وہاں وہ سب چیزیں موجود ہیں کہ جن سے آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ ب ۲۹/۵ ، ب ۳۰/۱۴

**عَالِيَهَا** : اس کا اوپر، اس کا بالا۔ یہاں عالی کا استعمال سافل کے مقابلہ میں ہے، اور قوم لوط علیہ السلام پر عذاب کا بیان ہے۔ لہٰذا ترجمہ یوں ہوگا: زمین کا بالائی طبقہ، عَالِی، عُلُوٌّ سے بمعنی بلند تر ہونے کے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، مضاف، هَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، ب ۱۲/۷ ، ب ۱۴/۵

**عَالِيَهُمْ** : ان کے اوپر کی پوشاک، جو چیز اوپر رہے اور بالا ہو وہ "عالی" ہے۔ اوپر کی پوشاک میں بھی چونکہ یہ بات موجود ہے اس لیے وہ بھی عالی ہے اور یہاں اس لفظ سے یہی معنی مراد ہیں، عَالِيَ مضاف، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، ب ۲۹/۱۹ ۔

**عَامٌ** : برس، سال، قاضی شوکانی لکھتے ہیں:- "عام کے معنی سال کے ہیں۔ عَوْمٌ کی طرح اس کی اصل بھی مصدر ہے۔ جو زمانہ کی اتنی مدت کا نام پڑ گیا ہے"[1]

اور علامہ احمد فیومی مصباح میں رقمطراز ہیں:- "عَامٌ فَعَلٌ بفتحتین کے وزن پر (عَوَمٌ) تھا۔ اسی لیے اس کی جمع أَعْوَامٌ آتی ہے جیسے سَبَبٌ کی جمع أَسْبَابٌ۔

[1] تفسیر فتح القدیر ج ۱ ص ۲۵۱ طبع مصر۔

امام راغب مفردات میں لکھتے ہیں :-

"حَوْمٌ کے معنی تیرنے کے ہیں۔ چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ سال کا نام بھی عام اسی لیے پڑا کہ سورج اتنی مدت میں سب برجوں میں شناوری کر لیتا ہے۔ اور آیہ کریمہ کُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ اور ہر کوئی ایک گھیرے میں پیرتے ہیں) بھی عَوْمٌ ہی کے معنی کو بتلاتی ہے۔"

عَامٌ اور سَنَةٌ میں جو فرق ہے اس کی بحث کے ضمن میں تفصیل کے ساتھ سپرد قلم کی جا چکی ہے اور آیہ شریفہ فَلَبِثَ فِي قَوْمِهِ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا (پھر رہا وہ اپنی قوم میں پچاس کم ہزار برس) میں جو مستثنیٰ منہ لفظ سنۃ اور مستثنیٰ لفظ عام ہے، اس کے متعلق امام راغب تو یہ فرما کر کہ "اس میں جو دقیق نکتہ ہے اس کا بیان ان شاء اللہ اس کتاب کے علاوہ کسی دوسرے موقع پر ہو گا" مفردات القرآن میں اس کے بیان کرنے سے گریز فرما گئے۔ لیکن علامہ محمود آلوسی المتوفی ۱۲۷۰ھ نے اپنی مشہور تصنیف روح المعانی میں اس کو تصریح کے ساتھ بتا دیا ہے فرماتے ہیں :-

ما قبل میں لفظ سنۃ کو اختیار فرمانے میں یہ نکتہ ہے کہ سنۃ کا استعمال بر خلاف لفظ عام کے سختی اور قحط سالی کے سلسلہ میں ہوتا ہے۔ لہٰذا اس زمان دعوت کے لیے کہ جس میں حضرت نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی قوم کے ہاتھوں وہ مصیبتیں جھیلیں کہ جو بیان سے باہر ہیں لفظ سنۃ ہی اختیار کرنا مناسب تھا۔1

اور علامہ محمود زمخشری اور امام ابوالبرکات نسفی کی رائے یہ ہے کہ فن بلاغت کی رو سے چونکہ ایک ہی جملہ میں ایک ہی لفظ کو بلا ضرورت مکرر لانے سے بچنا چاہیے، اس لیے ایسا کیا گیا ہے2

لفظ عَامٌ جیسا کہ فیومی نے تصریح کی ہے ، عَوَمٌ تھا۔ اجوف کا قاعدہ ہے کہ جو واؤ یا یا متحرک ہو اور اس کا ماقبل مفتوح ہو وہ الف سے بدل جاتا ہے۔ اسی قاعدہ کے مطابق یہاں بھی عَوَمٌ کا واؤ الف سے تبدیل ہو کر عَامٌ ہو گیا ہے۔ ۲/۳ ۵/۱۱ ۱۶/۱۲ عَامًا ۱۱/۱۱ ۱۴/۲۰

عَامِلٌ : محنت کرنے والا، کام کرنے والا عمل کرنے والا۔ عَمَلٌ سے اسم فاعل کا صیغہ

**حواشی**

1 روح المعانی ج ۲۰ ص ۱۴۲ 2 ملاحظہ ہو تفسیر کشاف ج ۲ ص ۱۰۶۔ اور مدارک التنزیل ج ۳ ص ۱۹۳ —

Marfat.com

واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو اَعْمَالٌ اور عَمَلٌ)

پ ۴/۱۱ ، ۳/۴ ، ۱۲/۸ ، ۲۴/۱

**عٰمِلُوْنَ** : عمل کرنے والے ، کام کرنے والے محنت کرنے والے عَمَلٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر عَامِلٌ کی جمع بحالت رفع ، پ ۱۲/۱۰

پ ۱۸/۴ ، ۲۳/۹ ، ۲۴/۱۵

**عَامِلَةٌ** : محنت کرنے والی ، عمل کرنے والی کام کرنے والی عَمَلٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث پ ۳۰/۱۳

**عَامِلِيْنَ** ، کام کرنے والے ، عمل کرنے والے عَمَلٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر عَامِلٌ کی جمع بحالت نصب وجر وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا میں عَامِلِيْنَ سے محکمہ زکوٰۃ کے کارندے مراد ہیں جن کے ذمہ زکوٰۃ وصدقات کی وصولیابی ہوتی ہے کیوں کہ عَامِلٌ کے معنی متولی امور اور کارندے کے بھی آتے ہیں اور اسی لحاظ سے محصل زکوٰۃ کو عامل کہتے ہیں[۱] پ ۴/۱۲ ، ۱۰/۱۴ ، ۲۱/۲ ، ۲۴/۲

**عَامِهِمْ** : ان کا برس ، ان کا سال ، عَامٌ مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ پ ۱۰/۱

**عَامَيْنِ** : دو سال دو برس عَامٌ کا تثنیہ بحالت جر ، پ ۲۱/۱۱

**عٰهَدَ** : اس نے عہد کیا ، اس نے اقرار کیا مُعَاهَدَةٌ سے جس کے معنی باہم عہد وپیمان اور قول وقرار کرنے کے ہیں ، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو عَهْدٌ) پ ۱۰/۱۶ ، ۲۶/۹

**عٰهَدْتَّ** : تو نے اقرار لیا ۔ تو نے عہد باندھا مُعَاهَدَةٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر

پ ۱۰/۳

**عٰهَدْتُّمْ** : تم نے عہد باندھا ۔ تم نے عہد کیا مُعَاهَدَةٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر

پ ۱۰/۱ ، ۱۴/۱۹

**عٰهَدُوْا** : انہوں نے عہد کیا ۔ انہوں نے عہد باندھا ۔ انہوں نے قول کیا مُعَاهَدَةٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب پ ۱/۱۲ ، ۲/۶ ، ۱۸ ، ۲۱/۱۹

**عَائِدُوْنَ** ، پھر کرنے والے ۔ پلٹنے والے عَوْدٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر عَائِدٌ کی جمع بحالت رفع ، (ملاحظہ ہو تَعُوْدُوْنَ اور عَادَ)

پ ۲۵/۱۴

**عَائِلًا** : تنگ دست ، فقیر ، مفلس ، نادار

[۱] ملاحظہ ہو تاج العروس ۔

Marfat.com

عیالدار۔ عَیۡلَۃٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں :- ارشاد ہے وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغۡنٰى (اور تجھ کو فقیر پایا سو غنی کر دیا) یعنی فقر نفس کو دور کر کے اسی "غنی اکبر" سے کہ جس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں الغنی غنی النفس (غنا دل غنی ہونے کا) نام ہے آپ کو سرفراز فرمایا۔

اور بعض نے یہ معنی کیے ہیں کہ تمہیں اللہ کی رحمت و بخشش کا محتاج پایا تو ساری اگلی پچھلی خطاؤں کی مغفرت فرما کر تم کو غنی کر دیا"

امام محمد بن اسمٰعیل بخاری نے الجامع الصحیح میں عائلا کی تفسیر عیالدار سے کی ہے ابوعبیدہ اور اخفش کا بھی یہی قول ہے اور فرا اس کے معنی فقیر کے بتاتے ہیں ان کا بیان ہے کہ میں نے خود حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں عدیما کا لفظ دیکھا ہے جس کے معنی نادار کے ہیں اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مال و اسباب کی زیادتی سے نہیں بلکہ اپنی رضا کی دولت سے مالا مال فرمایا جو اصل غنا ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دولت ظاہری کی فراوانی نہ تھی۔[1]

اور ابن خالویہ لغوی المتوفی ۳۷۰ھ لکھتے ہیں:-

"اہل عرب عَالَ الرَّجُلُ يَعِيۡلُ عَيۡلًا فَهُوَ عَائِلٌ کا استعمال کسی شخص کے فقیر ہو جانے کے لیے کرتے ہیں، اور عَالَ يَعُوۡلُ کا ظلم کرنے کے لیے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ذٰلِكَ اَدۡنٰٓى اَلَّا تَعُوۡلُوۡا (یہ بہت نزدیک ہے اس سے کہ بے انصافی نہ کرو) اور اَعَالَ يُعِيۡلُ کا کثیر العیال ہونے کے لیے"[2]

۳۰
۱۸

## فصل الباء الموحدۃ

عِبَاد ، بندے، غلام ، عَبۡدٌ کی جمع راغب لکھتے ہیں کہ جو "عبد" بمعنی غلام کے ہے اس کی جمع عَبِيۡدٌ آتی ہے اور جو عبد کہ بمعنی عابد یعنی پرستار حق اس کی جمع عِبَادٌ ہے لیکن میری ناقص رائے میں یہ قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ اکثری ہے کیونکہ خود قرآن پاک میں

[1] ملاحظہ ہو فتح الباری اور فتح القدیر تفسیر سورۃ والضحیٰ [2] اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن العظیم ص ۱۲۱

ایک مقام پر عِبَاد کا استعمال غلاموں کے معنی میں ہوا ہے، ارشاد ہے وَ اَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ وَ الصَّالِحِیْنَ مِنْ عِبَادِکُمْ وَ اِمَائِکُمْ (اور نکاح کر و رانڈوں کا اپنے اندر، اور جو نیک ہوں تمہارے غلام اور لونڈیاں)۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو عَبَد) ۲/۹ ، ۳/۱۲،۲،۱ ، ۹/۱۴ ، ۱۶/۲ ، ۱۹/۴ ، ۲۳/۱،۲،۹ ، ۲۳/۱،۸،۹،۱۶ ، ۲۴/۱۰،۹ ، ۲۵/۸،۱۳،۱۴ ، ۲۶/۱۵ ، ۲۹/۱۹ ، عِبَادًا ۳/۷۹ ، ۱۵/۱ ۔

**عِبَادَتِکُمْ**: تمہاری بندگی، تمہاری عبادت تمہاری پرستش، عِبَادَةِ مضاف، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو عِبَادَة) ۱۱/۸ ۔

**عِبَادَتِہٖ**: اس کی بندگی، اس کی پرستش اس کی عبادت، عِبَادَةِ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ ۱۲/۴ ، ۹/۱۴ ، ۱۶/۷ ، ۱۶/۲ ۔

**عِبَادَتِہِمْ**: ان کی بندگی، ان کی پرستش ان کی عبادت، عِبَادَةِ مضاف ھِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ ۱۶/۸ ، ۲۶/۱ ۔

**عِبَادَتِیْ**: میری بندگی میری پرستش میری عبادت عِبَادَةِ مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ ۲۴/۱۱ ۔

**عِبَادُکَ**: تیرے بندے، عِبَادَ مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ (ملاحظہ ہو عِبَاد اور عَبْد) ۵/۱۵ ، ۷/۶ ، ۱۴/۳ ، ۱۹/۱۶ ، ۲۳/۱۴ ، ۲۴/۲ ، ۲۹/۱۰ ۔

**عِبَادِکُمْ**: تمہارے غلام عِبَادِ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ ۱۸/۱۰ ۔

**عِبَادِنَا**: ہمارے بندے عِبَادِ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، ۱۲/۱۳ ، ۱۵/۲۱ ، ۱۶/۷ ، ۲۲/۱۶ ، ۲۳/۱،۸،۹،۱۳ ، ۲۵/۶ ، ۲۸/۲۰ ۔

**عِبَادَةِ**: عبادت، بندگی، پرستش عَبَدَ یَعْبُدُ کا مصدر ہے جس کے معنی پوجنے اور عبادت کرنے کے ہیں اس کا فعل باب نَصَرَ سے آتا ہے۔ امام راغب لکھتے ہیں۔ "عُبُودِیۃ اظہار فروتنی کا نام ہے اور عِبَادَة اس سے بھی بلیغ تر ہے کیوں کہ اس کے معنی انتہائی فروتنی کے ہیں اور اس کا استحقاق بھی سوائے اس ذات عالی کے کہ جس کے افضال و انعام بے حد و نہایت ہیں اور کسی کو نہیں ہے اسی لیے ارشاد ہے اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ (کہ نہ پوجو مگر اسی کو۔)

اور عبادت" کی دو قسمیں ہیں (۱) عبادت بالتسخیر یہ وہی عبادت ہے جس کو ہم سجودؐ کی بحث میں ذکر کر چکے ہیں (۲) عبادت بالاختیار جو ذوی العقول کے ساتھ خاص ہے اور جس کا حکم اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ (بندگی کرو تم اپنے رب کی) اور اُعْبُدُوا اللّٰهَ (عبادت کرو اللہ کی) وغیرہ آیات میں دیا گیا ہے"

قاموس میں عبادت" کے معنی طاعت کے بیان کیے ہیں لیکن ابن الاثیر کے نہایہ میں یہ الفاظ ہیں

العبادة فی اللغة الطاعة مع الخضوع — لغت میں عبادت نام ہے اس اطاعت کا جو عاجزی کے ساتھ ہو۔

علامہ ابن الاثیر کی یہ تعریف بہت جامع ہے راغب اصفہانی اور مجدالدین فیروز آبادی نے اس کے صرف ایک جز کو بیان کیا ہے۔ قاضی شوکانی نے تفسیر فتح القدیر میں حافظ ابن کثیر کے حوالہ سے عبادت کی شرعی تعریف ان لفظوں میں نقل کی ہے:-

وفی الشرع عبادة عما یجمع کمال المحبة والخضوع والخوف — اور شرع میں عبادت وہ ہے جو انتہائی محبت فروتنی اور خوف پر مشتمل ہو۔

اور علامہ علاء الدین علی بن محمد خازن البغدادی نے تفسیر لباب التاویل میں بعض علماء سے اس طرح نقل کیا ہے کہ "عبادت اس فعل کا نام ہے جس کے ذریعہ تعظیم الٰہی کے لیے فرض کی ادائیگی عمل میں آتی ہے۔"[۲]

اور مخدوم علی مہائمی اپنی مشہور تفسیر تبصیر الرحمٰن وتیسیر المنان بعض مایشیر الیٰ اعجاز القرآن میں رقمطراز ہیں :-

العبادة تذلل للغیر عن اختیار لغایة تعظیم فخرج — عبادت اپنے اختیار سے دوسرے کی انتہائی تعظیم کی غرض سے اس کیلئے

ؐ سجود کی بحث میں امام موصوف نے اس کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے۔

هو الدلالة الصامتة الناطقة المنبهة علی کونها مخلوقة وانها خلق فاعل حکیم — وہ خاموش دلالت جو کائنات کے مخلوق ہونے پر ناطق ہے اور جو بتلاتی ہے کہ یہ سب کچھ اسی حکیم کردگار کا پیدا کردہ ہے۔ اس لحاظ سے عبادت تسخیری" کے معنی ہوں گے "زبان حال کی وہ خاموش دلالت جو اس بات کو بتلاتی ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے خالق ومولا کے حکم کا غلام اس کے ارادہ کا مطیع اور اس کی مشیت کا مسخر ہے"۔ [۱] تفسیر فتح القدیر ج ۱ ص ۱۲

[۲] لباب التاویل معروف بہ خازن ج ۱ ص ۱۹ طبع مصر ۱۳۳۱ھ۔

Marfat.com

التسخیر والسخر فروتنی کا نام ہے۔ لہٰذا تسخیر کی بنا
و القیام و پر یا مذاق کی غرض سے کیا گیا نیز
الانحناء للنوع تعظیم رسمی کے لیے کسی کے واسطے
تعظیم له کھڑا ہو جانا یا جھک جانا، عبادت
کی طرف سے خارج ہے۔

مخدوم موصوف نے عبادت شرعی کی یہ بڑی جامع مانع تعریف کی ہے۔ غور فرمائیے بہت سے افعال ہیں جو بظاہر عبادت معلوم ہوں گے حالانکہ حقیقت میں وہ عبادت کی تعریف میں نہیں آتے ایک شخص پر کسی نے تسخیر کا عمل کر دیا ہے وہ عبادت کے بہت سے کام کرتا ہے لیکن چونکہ اس کے اپنے ارادے اور اختیار کو اس میں دخل نہیں اس لیے اس کو عبادت نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح ایک شخص مذاق کے طور پر رسوم عبادت کو بجا لاتا ہے دیکھنے والا جو حقیقت حال سے واقف نہیں بظاہر اس کو عبادت ہی خیال کرے گا حالانکہ ایسا نہیں کیونکہ وہ تعظیم کے لیے ان کو انجام نہیں دے رہا بلکہ مسخرہ پن کر رہا ہے۔ ایسے ہی قیام اور انحنا (جھکنا) کا شمار گو افعال عبادت میں ہے لیکن جبکہ اس سے مقصود غایت تعظیم نہیں کہ جو فی الواقع عبادت ہے بلکہ ایک خاص قسم کی رسمی تعظیم ہے کہ جو سوسائٹی میں رواج پا گئی ہے تو اس کو عبادت نہیں کہیں گے۔ علامہ سید مرتضیٰ زبیدی بلگرامی تاج العروس من جواہر القاموس میں لکھتے ہیں :-

"بعض ائمہ اشتقاق کا بیان ہے کہ عبودیۃ کی اصل عاجزی اور فروتنی ہے اور دوسرے حضرات یہ کہتے ہیں کہ عبودۃ کے معنی ہیں رب جو کرے اس پر راضی رہنا اور عبادۃ کے معنی ہیں وہ کام کرنا جس سے رب راضی رہے اول زیادہ محنت و مشقت کا کام ہے اسی لیے کہا گیا ہے کہ عبادۃ تو عالم آخرت میں ساقط ہو جائیگی مگر عبودۃ بدستور باقی رہے گی۔ کیوں کہ عبودۃ کا مطلب یہ ہے کہ دونوں جہان میں اللہ تعالیٰ کے سوائے کسی کو متصرف نہ سمجھے،،

اس عبارت کو نقل کر کے علامہ زبیدی فرماتے ہیں :-

قال شیخنا هذا ہمارے شیخ نے کہا ہے کہ یہ
ملحظ صوفی لا صوفیانہ نقطہ نگاہ ہے لغت

له تفسیر جمالی ج ۱ ص ۴۴ طبع بولاق مصر

له شیخ سے مراد ابو عبداللہ محمد بن طیب الفاسی المتوفی ۱۱۷۰ھ ہیں انہوں نے بھی قاموس کی مبسوط شرح لکھی ہے

دخل للاوضاع کی لغوی ساخت کو اس
اللغویۃ فیہ۔ تشریح میں کچھ دخل نہیں

امام محیی السنہ حسین بن مسعود فراء بغوی معالم التنزیل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ناقل ہیں کہ:

کل ما ورد فی القرآن قرآن پاک میں جہاں
من العبادۃ فمعناھا بھی عبادت کا ذکر ہے
التوحید[1] اس سے توحید مراد ہے

قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی فرماتے ہیں کہ اس تفسیر پر کفار کو تو اس کی بجا آوری کا حکم ہے اور مومنین کو اس پر ثابت قدم رہنے کا۔[2] ۱۲/۳

**عِبَادِہٖ**: اس کے بندے، عِبَادِ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ۔

۱/۱۱ ۷/۸،۱۴،۱۶ ۸/۱۱ ۹/۵ ۱۱/۲،۱۶ ۱۳/۱۴ ۱۴/۷
۱۵/۲،۳،۱۱ ۱۶/۷ ۱۹/۳،۱۷،۲۰ ۲۰/۱۱ ۲۱/۲،۸ ۲۲/۱۱،۱۹،۱۶
۲۳/۱۵،۱۶ ۲۴/۱۴ ۲۵/۳،۱۴،۷

**عِبَادِیْ**: میرے بندے عِبَادِ مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ۔ آیہ کریمہ یٰعِبَادِ لَاخَوْفٌ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ اے میرے بندو نہ ڈر ہے تم پر آج کے دن اور نہ تم غم کھاؤ ہیں یا عِبَادِی کے دونوں الف اور دال کے بعد ی قرآنی رسم خط میں بالاتفاق محذوف ہے۔ ۲/۳ ۱۳/۱۴ ۱۴/۳،۴ ۱۵/۲،۶،۷ ۱۶/۳،۴،۱۳ ۱۰/۷
۱۸/۶،۱۶ ۱۹/۲۴ ۲۱/۲ ۲۲/۸ ۲۳/۳ ۲۵/۱۳،۱۴ ۳۰/۱۴

**عَبَثًا**: کھیلنا، بے فائدہ، بیہودہ۔ اس کا فعل باب سَمِعَ سے آتا ہے۔ عَبِثَ یَعْبَثُ عَبَثًا

امام ابو جعفر بیہقی نے تاج المصادر میں اس کا ترجمہ لکھا ہے "بازی کردن" اور امام ابو الفتح ناصر بن عبد السید مطرزی المغرب فی ترتیب المعرب میں لکھتے ہیں۔ "عَبَثٌ کے معنی ہیں کھیلنے اور بے فائدہ گڑبڑ کا کام کرنے کے اور علامہ راغب اصفہانی مفردات القرآن میں رقم طراز ہیں۔ اپنے کام میں کھیل کود کے شامل کر دینے کو عَبَثٌ کہتے ہیں۔ یہ عرب کے محاورے عَبَثَ الْاَقِطَ سے نکلا ہے جس کے معنی پنیر کو ملانے کے ہیں اور عَبَثٌ اس کھانے کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے ساتھ مخلوط ہو چنانچہ کھجور اور گھی کے آمیزہ اور مخلوط ستو کو عوبثانی اسی اعتبار سے بولا جاتا ہے ارشاد ہے۔ اَتَبْنُوْنَ بِکُلِّ رِیْعٍ اٰیَۃً

---

[1] کتاب مذکور ج ا ص ۳۴ بر حاشیہ تفسیر خازن طبع مصر۔ [2] تفسیر مظہری ج ا ص ۳۵ ر ۳۶ طبع جدید پریس دہلی۔

Marfat.com

تَعْبَثُونَ (کیا بناتے ہو ہر اونچی زمین پر ایک نشانی کھیلنے کو) اور جس چیز سے کوئی صحیح غرض حاصل نہ ہو اس کو عَبَثٌ کہتے ہیں۔ ارشاد ہے اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا (سو کیا تم خیال رکھتے کہ ہم نے تم کو بنایا کھیلنے کو؟)

تاج العروس میں ہے کہ "عَبَثٌ کے معنی ہیں کسی چیز کے ساتھ کھیلنے کے اور جس چیز میں کوئی قابل لحاظ فائدہ نہ ہو یا سرے سے کوئی فائدہ نہ ہو اس کو بھی عَبَث کہتے ہیں۔" ۱۸/۶

عَبْدٌ: بندہ، غلام۔ تاج العروس میں ہے۔ "عبد انسان کو کہتے ہیں آزاد ہو یا غلام (حکم اور موت بیں یہی ہے)۔ گویا مصنف اس طرف گئے ہیں کہ "عبد" وہ ہے جو اپنے خالق کا پروردہ ہو، ابن حزم نے کہا ہے کہ عبد کا لفظ مذکر و مؤنث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے (نیز) عبد کے معنی (غلام) کے بھی ہیں جو آزاد کے برخلاف ہے . . . سیبویہ نے بیان کیا ہے کہ یہ اصل میں صفت ہے۔ اہل عرب جب عبد (مرد غلام) کہتے ہیں لیکن اسمار کی جگہ پر اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔"

علامہ احمد فیومی مصباح میں لکھتے ہیں:۔
"اس کی جمع تو بہت سی استعمال ہوتی ہیں مگر اَعْبُدٌ، عَبِيْدٌ اور عِبَادٌ ان سب میں زیادہ مشہور ہیں۔"

اور امام راغب مفردات میں ارقام فرماتے ہیں:۔
"عبد کا استعمال چار طرح پر ہوتا ہے (اول) عبد شرعی جو حکم شرع کے لحاظ سے "عبد" ہو اور یہ وہ انسان ہے کہ جس کی خرید و فروخت صحیح ہے جیسے اَلْعَبْدُ بِالْعَبْدِ (غلام کے بدلے غلام) اور عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ (ایک غلام پرایا مال نہیں اختیار رکھتا کسی چیز پر) (دوسرا) "عبد بالایجاد" جو اس اعتبار سے "عبد" ہے کہ اللہ نے اس کو عدم سے وجود عطا فرمایا ہے اور ایسا عبد سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کا نہیں پایا جا سکتا۔ آیہ شریفہ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا (کوئی نہیں آسمان اور

ـــــــــــ

ـلـہ بین القوسین متن یعنی قاموس کی عبارت ہے۔ ـلـہ یہ دونوں کتابوں کے نام ہیں۔

زمین میں جو نہ آئے رحمٰن کا بندہ ہو کر، میں یہی عبد مراد ہے۔ تیسرا وہ جو عبادت وخدمت کی بدولت عبد ہے۔ اس طرح کے لوگ دو قسم کے ہیں۔ ایک "عبداللہ" جو اللہ کا مخلص بندہ ہے اور اسی کا ذکر آیات ذیل میں مقصود ہے وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ (اور یاد کر ہمارے بندے ایوب کو) إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا (بے شک وہ تھا بندہ حق ماننے والا) أَنْزَلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ (اس نے اتاری فیصلہ کی کتاب اپنے بندے پر) أَنْزَلَ عَلَىٰ عَبْدِهِ الْكِتَابَ (اس نے اتاری اپنے بندے پر کتاب) إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ (وہ جو میرے بندے ہیں ان پر نہیں تیری حکومت) كُونُوا عِبَادًا لِي (تم میرے بندے ہو جاؤ) إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ (مگر جو تیرے چنے ہوئے بندے ہیں) وَعَدَ الرَّحْمَٰنُ عِبَادَهُ بِالْغَيْبِ (وعدہ کیا ہے رحمٰن نے اپنے بندوں سے ان کے بن دیکھے) وَعِبَادُ الرَّحْمَٰنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا (اور بندے رحمٰن کے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر دبے پاؤں) أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي لَيْلًا إِنَّكُمْ مُتَّبَعُونَ (پھر لے نکل رات سے میرے بندوں کو البتہ تمہارا پیچھا کریں گے) فَوَجَدَا عَبْدًا مِنْ عِبَادِنَا (پھر پایا ان دونوں نے ایک بندہ ہمارے بندوں میں کا)۔

اور ایک "عبدالدنیا" جو دنیا اور متاع دنیا ہی کا بندہ ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو دنیا ہی کا غلام ہے اور اسی کی رعایت رکھتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد ہے تعس عبدالدرہم تعس عبدالدنیا (ہلاک ہو روپیہ کا بندہ ہلاک ہو اشرفی کا بندہ) اس سے یہی شخص مراد ہے اور اسی لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہے کہ ہر انسان اللہ کا عبد (بندہ) نہیں کیونکہ اس صورت میں عبد بمعنی عابد ہے۔ لیکن عبد عابد سے زیادہ بلیغ ہے اور ویسے تو سب لوگ اللہ ہی کے بندے ہیں بلکہ انسان کیا تمام اشیاء کا یہی حکم ہے لیکن بعض "عبد بالتسخیر" اور بعض "عبد بالاختیار"

جو عبد کہ بمعنی غلام ہے اس کی جمع عَبِيدٌ اور بعض عِبِدَّى بتاتے ہیں اور جو عبد کہ

بمعنی عابد ہے اس کی جمع عِبَادٌ ہے۔ لیکن عَبِیْدٌ کی اضافت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنی میں عِبَاد سے زیادہ عموم ہوتا ہے۔ اسی لیے ارشاد ہوتا ہے وَمَا اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ اور میں ظلم نہیں کرتا بندوں پر، سو تنبیہ فرمادی کہ وہ نہ ان پر ظلم کرتا ہے جو خاص اسی کی عبادت کرتے ہیں اور نہ ان پر کہ جو غیر سے تعلق جوڑتے ہیں اور اپنا نام "عبد الشمس" اور عبد اللات" وغیرہ رکھتے ہیں"

قاضی شوکانی نے لکھا ہے کہ عَبْد تَعَبُّدٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی فروتنی کے ہیں[1]۔ اور امام بغوی فرماتے ہیں۔

سمی العبد عبدا عبد کو عبد اس کی فروتنی لذلتہ وانقیادہ اور عاجزی کی وجہ ہی سے کہا جاتا ہے[2]۔

۲/۱۱۱ ۲۲/۷ ۳۳/۱۱۲ ۲۵/۱۲ ۲۶/۱۵ عَبْدًا ۶/۴ ۱۴/۱۹ ۱۵/۱۰۱، ۲۱ ۱۶/۹ ۳۰/۲۱

عَبَدَ: اس نے بندگی کی۔ اس نے عبادت کی۔ اس نے اطاعت کی۔ عِبَادَةٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو عبادۃ)

۶/۱۳

عَبَّدْتَ: تو نے غلام بنایا۔ تَعْبِیْدٌ سے جس کے معنی کسی کو غلام بنانے اور اپنی بندگی میں رکھنے کے ہیں۔ ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر۔ ابن زید کہتے ہیں تَعْبِیْدٌ کے معنی ہیں کسی کو اتنا عاجز و ناچار کرنا کہ وہ غلاموں کے سے کام کرنے لگے۔ صاحب موعب نے ان کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں عَبَّدْتَ الرَّجُلَ ذَلَّلْتَہٗ حتی عمل عَمَلَ العبید[3] ۱۹/۶

عَبَدْتُّمْ: تم نے پوجا۔ تم نے بندگی کی۔ تم نے عبادت کی۔ عِبَادَةٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر ۳۰/۲۴

عَبْدُ اللّٰہِ: اللہ کا بندہ۔ یہاں بندہ کامل مراد ہے کیوں کہ قاعدہ ہے مطلق کو اپنے اطلاق پر جب باقی رکھا جاتا ہے تو فردِ کامل مراد ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں یہ الفاظ دو اولوالعزم انبیاء کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ ایک سورہ مریم میں حضرت روح اللہ عیسیٰ بن مریم صلوات اللہ وسلامہ علی نبینا و علیہ و علی امہ کے لیے اور دوسرے سورہ

[1] فتح القدیر ج ۱ ص ۳۹ [2] معالم التنزیل ج ۱ ص ۱۹ برحاشیہ تفسیر خازن [3] تاج العروس۔

حق میں حضرت خاتم النبیین جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ وسلم کے متعلق ظاہر ہے کہ عبدیت کاملہ مبارک وصف انبیاء علیہم السلام سے زیادہ اور کس کے لیے زیبا ہے حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت باسعادت پر جب ان کی والدہ ماجدہ حضرت صدیقہ مریم بتول علیہا السلام پر کل قوم طوفان اُٹھاتی ہے کہ بے بن باپ کے کیسے پیدا ہو گئے تو حضرت آغوش مادر ہی میں بزبان فصیح گویا ہوتے ہیں اِنِّی عَبْدُاللّٰہِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا (میں بندہ ہوں اللہ کا مجھ کو اس نے کتاب دی ہے اور مجھ کو اس نے نبی کیا ہے سچ ہے بروز پیدائش ہی عبودیت کا اقرار ایک سچے نبی ہی کی شان ہو سکتی ہے۔ ساتھ ہی اس میں قدرت کا یہ راز بھی پنہاں تھا کہ چونکہ آگے چل کر عیسائی اُمت حضرت کو آپ کے ملکوتی صفات کے باعث بندگی سے خدا کے درجہ پر پہنچا دے گی اس لیے سب سے پہلا کام جو آپ کی زبان اعجاز سے ادا ہو وہ اعتراف عبودیت ہونا چاہیئے۔

اور ہمارے نبی اکرم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ لقب خود پیش گاہ ربانی سے عطا فرمایا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہے وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا (اور یہ کہ جب کھڑا ہوا اللہ کا بندہ کہ اس کو پکارے تو لوگوں کا بندھنے لگتا ہے اس پر ٹھٹھ) اس آیۂ کریمہ میں خود حضرت حق جل مجدہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو "عبداللہ" کے لقب سے موسوم فرمایا ہے۔ استاذ ابو علی دقاق فرماتے ہیں:—

مومن کے لیے کوئی صفت عبودیت سے زیادہ اکمل و اشرف نہیں ہے اللہ تعالےٰ نے اسی لیے عزت کے سب سے اونچے موقع پر اپنے نبی کے لیے اس لفظ کا استعمال فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے (۱) سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ (۲) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْکِتٰبَ (۳) تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ (۴) فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰی [1]

اور امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی

[1] ملاحظہ ہو المعراج الکبیر تالیف حافظ نجم الدین غیطی ص ۸۰۷ طبع میمنیہ مصر۔

اپنے مکتوبات میں ارقام فرماتے ہیں :-

مقامِ عبدیت فوق جمیع مقامات باشد
چہ این معنی در عبدیت اتم و اکمل است
محبوباں را باین مقام مشرف می سازند محباں
بذوق شہود متلذذ دارند، التذاذ در بندگی و
انس بآں مخصوص بہ محبوبان است انس محباں
بمشاہدہ محبوب است و انس محبوباں بہ بندگی
محبوب دریں انس ایشاں را باین دولت
می رسانند و باین نعمت سرفراز می سازند
شاہ سوار یکہ تاز این میدان سرور دنیا
و دین سید اولین و آخرین حبیب
رب العلمین است علیہ من الصلوٰۃ اتمہا و
من التحیات اکملہا و کسے را کہ بمحض فضل
خواہند کہ باین دولت برسانند او را بکمال
متابعت آں سرور علیہ الصلوٰۃ والسلام
متحقق می سازند و آں را باں می برند
ذلک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء واللّٰہ
ذو الفضل العظیم ،، [1]

کسی نے کیا خوب کہا ہے :

مقامِ عبدیت کان منزل قست ، از بالا و بالا تر میان

16/5 ، 21/11

عَبَدْنَا : ہم نے پوجا ۔ ہم نے عبادت کی
عِبَادَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم ۔ (ملاحظہ ہو
عِبَادَۃٌ ) 14/11

عَبْدِنَا : ہمارا بندہ ، قرآن پاک میں یہ مبارک
الفاظ حضرت نوح ، حضرت ایوب ، حضرت داؤد
اور آنحضرت علیہم الصلوٰۃ والسلام کے لیے استعمال
فرمائے گئے ہیں جو کمال عبدیت کے مقام بلند پر
فائز تھے اور خدا کے کامل ترین بندے تھے
1/3 ، 10/1 ، 23/12،8 ، 27/8 ۔

عَبَدْنٰهُمْ : ہم نے اُن کی بندگی کی ، ہم نے
اُن کو پوجا ، عَبَدْنَا ماضی کا صیغہ جمع متکلم
هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب 25/8

عَبْدِہٖ : اس کا بندہ ۔ قرآن پاک میں یہ
سوائے ایک مقام کے کہ وہاں یہ حضرت زکریا
علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صفت میں آیا
ہے ۔ باقی سب جگہ "عبد کامل" جناب محمد رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے استعمال ہوا ہے
اور اسی لیے کلمہ شہادت میں آپ کی صفت رسالت
کے اقرار کے ساتھ آپ کے لیے عبدیت کی شہادت

---

[1] مکتوبات امام ربانی ج ۱ ص ۱۲ طبع نول کشور ۔

Marfat.com

سبیل لازمی کر دی گئی ہے (امی ہو۔ امی صلی اللہ علیہ وسلم) ۱۵/۱۳۰۱ پ ۱۶/۴ پ ۱۸/۱۶ پ ۲۲/۱ پ ۲۸/۵،۸،۱۰

**عَبْدَیْنِ** : دو بندے، عبد کا تثنیہ بحالت جر۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے دو مقدس و برگزیدہ بندے حضرت نوح اور حضرت لوط صلوات اللہ و سلام علیہما کی صفت میں آیا ہے ۲۸/۲۰۔

**عِبْرَۃً** : عبرت، نصیحت حاصل کرنا۔ دوسرے کے حال سے اپنا حال قیاس کرنا۔ دھیان کرنا

راغب لکھتے ہیں :-

"اصل میں عَبْرٌ کے معنی ہیں ایک حال سے دوسرے حال میں گزرنے کے . . . اور اِعْتِبَارٌ اور عِبْرَۃٌ اس حالت کے ساتھ مخصوص ہے کہ جس کے ذریعہ ایک ایسی چیز کی معرفت سے کہ جو مشاہدہ میں آ رہی ہے اس چیز کی معرفت تک پہنچا جاتے کہ جو ابھی مشاہدہ میں نہیں آتی"

اور علامہ احمد فیومی المصباح المنیر میں فرماتے ہیں :-

"اِعْتِبَار کے معنی نصیحت پکڑنے کے بھی آتے ہیں۔ جیسے فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَارِ (سو نصیحت پکڑو اے ایمان والو) عِبْرَۃٌ اسی اِعْتِبَارٌ سے اسم ہے۔ خلیل نے کہا ہے کہ عبرۃ اور اعتبار بامضی کے معنی ہیں گزرے ہوئے واقعات سے نصیحت پکڑنا اور عبرت حاصل کرنا عِبْرَۃٌ کی جمع عِبَرٌ ہے جیسے سِدْرَۃٌ کی سِدَرٌ"

اور امام فخر الدین رازی، تفسیر کبیر میں رقمطراز ہیں :

"عِبْرَۃ کے معنی ہیں نصیحت حاصل کرنا یہ وہ نشانی ہے کہ جس کے ذریعہ جہالت کے مقام کو عبور کر کے علم تک رسائی ہوتی ہے اس کی اصل عُبُوْرٌ سے ہے جس کے معنی ہیں ایک جانب سے دوسری جانب کی طرف پہنچ جانا، اور اسی عُبُوْرٌ سے عِبَارَۃٌ ہے جس کے معنی اس کلام کے ہیں کہ جو معنی کو لیکر مخاطب تک پہنچتا ہے، اور اسی سے عبارۃ الرؤیا ہے کیونکہ وہ خواب کی تعبیر ہے[۱]"

علامہ خازن بغدادی نے اس کی تعریف ان

[۱] تفسیر کبیر ج ۲ ص ۶۱۶ طبع مصر قدیم۔

Marfat.com

الفاظ میں کی ہے :-

العبرۃ الدلالۃ عبرت وہ دلالت ہے جو

الموصلۃ الی الیقین . یقین تک پہنچاتی اور

المودیۃ الی العلم ؎ علم تک رسائی کراتی ہے

اور قاضی شوکانی نے تفسیر فتح القدیر میں اس کی تشریح مختلف مقامات پر متعدد پیرایہ بیان میں کی ہے۔ چنانچہ سورہ آل عمران میں لکھتے ہیں:-

"عِبْرَۃٌ عُبُورٌ سے بروزن فِعْلَۃٌ ؎ ہے اور مراد ہے نصیحت حاصل کرنا اور تنکیر اس میں تعظیم کے لیے ہے یعنی عظیم عبرت اور بڑی موعظت" ؎

اور سورہ یوسف میں اس طرح لکھتے ہیں۔

"عبرت" وہ فکر و بصیرت جو جہالت و حیرت سے نجات دلاتی ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ "اعتبار" ہی کی ایک نوع ہے یعنی طرف معلوم سے طرف مجہول کو عبور کرنا ؎

اور زیر آیت وَاِنَّ لَکُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَۃً ۚ

(وہ) بے شک تمہارے لیے چوپایوں میں سوچنے کی جگہ ہے) یوں رقمطراز ہیں:-

"عبرۃ کے معنی ہیں اصل میں ایک چیز کی دوسری چیز کے ساتھ اس طرح تمثیل دینا کہ مشاکلت اور مشابہت کی بنا پر اس دوسری چیز کی حقیقت آنکھوں کے سامنے پھر جائے" ؎

$\frac{۳}{۱۰}$ $\frac{۱۳}{۲}$ $\frac{۱۴}{۱۵}$ $\frac{۱۸}{۲۰:۱}$ $\frac{۳۰}{۳}$

**عَبَسَ** : اس نے تیوری چڑھائی، وہ ترش رو ہوا، وہ چیں بجبیں ہوا۔ اس نے منہ بنایا (ضرب) عَبَسٌ اور عُبُوسٌ سے بمعنی ترشرو ہونے اور تیوری کا چڑھانے کے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب

راغب لکھتے ہیں کہ دل تنگی سے ماتھے پر بل آ جانے کا نام عُبُوسٌ ہے۔ اور تفسیر کبیر میں مرقوم ہے :-

عَبَسَ یَعْبِسُ فَھُوَ عَابِسٌ کا استعمال ماتھے پر بل ڈالنے کے لیے ہوتا ہے اور اگر اسی ترش روئی میں دانت بھی ظاہر ہو جائیں

؎ فِعْلَۃٌ کا وزن بیان حالت و نوع کے لیے آتا ہے چنانچہ جِلْسَۃٌ جلوس کا ایک خاص نوع اور حالت کے لیے استعمال کیا جائے گا اس لحاظ سے عبرۃ عبور کی ایک خاص حالت و نوع کا نام ہوگا۔ ؎ تفسیر خازن ج ۱ ص ۲۰۴

؎ فتح القدیر ج ۱ ص ۲۹۲ ؎ ایضاً ج ۳ ص ۵۸ ؎ ایضاً ج ۳ ص ۱۶۰ -

Marfat.com

تو پھر کلح بولتے ہیں اور اگر منہ بنانے کا کوئی اہتمام بھی ہو تو اس کے لیے بسر آتا ہے اور جو تیوری پر بل ڈالنے کے ساتھ غصہ ہو جائے تو پھر بسل کہا جاتا ہے [1]

۲۹ ۱۵ پ ۳۰ ۵ ۔

**عَبْقَرِيٍّ** قیمتی، نادر، عجیب، خوبصورت بچھونے۔ امام محمد بن عزیز سجستانی نزہۃ القلوب میں جو لغت قرآن پہ ان کی مشہور ترین کتاب ہے رقمطراز ہیں:۔

"عبقری موٹے فرش ہیں، ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ اہل عرب ہر بچھونے اور فرش کو "عبقری" کہتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ عبقر ایک خطہ ہے کہ جہاں منقش کپڑا تیار ہوتا تھا چنانچہ ہر عمدہ چیز کو اس کی طرف منسوب کیا جانے لگا۔ نیز کہا جاتا ہے کہ عبقری ہر اس مرد نیز اس بچھونے کو کہتے ہیں کہ جو قابل تعریف و توصیف ہو اور اسی معنی میں حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے آیا ہے فلم ار عبقریا یفری فریہ (پھر میں نے ایسا عجیب و غریب کسی کو نہیں دیکھا کہ جوان کی طرح کام کرنے والا ہو)

اور امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں:۔

"بیان کیا جاتا ہے کہ عبقر جنوں کی ایک بستی ہے جس کی طرف ہر نادر چیز کو انسان ہو یا حیوان یا کپڑا منسوب کر دیا جاتا ہے اور اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے فلم ار عبقریا مثلہ۔ اور قرآن پاک میں ہے وَعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ (اور قیمتی بچھونے نفیس) یہ جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے بچھونوں کی ایک خاص قسم ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے جنت کے بچھونوں کے لیے بطور مثال بیان فرمایا ہے۔

اور علامہ سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس من جواہر القاموس میں لکھتے ہیں:۔

(عبقر) بروزن جعفر (ایک موضع ہے بادیہ میں) جہاں جنات بہت ہیں اشل چلی آتی ہے کا نہم جن عبقر (گویا یہ عبقر کے جنات ہیں) بعض لوگوں کا بیان ہے کہ یہ یمن میں ایک جگہ ہے اور صحاح میں ہے کہ عرب یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ جنات

---

[1] تفسیر کبیر ج ۸ ص ۲۵۰ طبع مصر قدیم [2] بین القوسین متن یعنی قاموس کا ترجمہ ہے۔

کی سرزمین میں ہے۔ چنانچہ لبید کا شعر ہے

ومن فادمن اخوانہم وبنیہم کہول وشبان کجنۃ عبقر

بعد میں ہر اس چیز کو کہ جس سے اس کی مہارت یا خوبی صنعت اور قوت کی بنا پر تعجب ہوتا اس کی طرف منسوب کرنے لگے۔ اور ابن الاثیر کہتے ہیں کہ عبقر ایک قریہ ہے جہاں عربوں کے خیال میں جنات بستے تھے لہٰذا جب بھی کسی عمدہ اور عجیب چیز پر ان کی نظر پڑتی کہ جس کا بنانا دشوار اور اس کی ساخت نازک ہوتی یا خود وہ چیز بڑی پُر عظمت ہوتی تو اُسے عبقری کہتے اور ابن سیدہ کہتے ہیں کہ عبقر ایک شہر ہے یمن میں، اور معجم میں ہے کہ جزیرہ میں ہے جہاں منقش کپڑے اور فرش تیار کیے جاتے تھے اور اس جگہ کے کپڑے نہایت ہی نفیس اور عمدہ ہوتے تھے، لہٰذا یہ ہر اس شے کے لیے کہ جو کسی اعلیٰ درجہ کی چیز کی طرف منسوب ہو ایک کہاوت بن گیا اور جب بھی کسی چیز کی تعریف میں انتہائی مبالغہ کرنے لگے تو اسے عبقری کہہ دیا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اس کی طرف نسبت ہے کہ جو جنات کا موضع ہے۔ ابو عبیدہ کا بیان ہے کہ ہمیں کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو یہ جانتا ہو کہ یہ شہر کہاں تھا اور کب تھا؟

قاموس میں عبقری کے حسب ذیل معانی اور لکھے ہیں (۱) ہر وہ چیز جس میں کمال ہو (۲) سردار (۳) وہ جو سب سے فوق لے جائے (۴) مضبوط اور قوی (۵) خاص قسم کے فرش اور بچھونے تاج العروس میں ہے کہ فراء نے کہا ہے عبقری دبیز فرش ہیں۔ اور اس کا واحد عبقریہ ہے۔ اور عبقری دیبا کو بھی کہتے ہیں۔ اور قتادہ نے اس کا ترجمہ غالیچے کیا ہے۔ اور سعید بن جبیر نے نفیس غالیچے اور صراح میں یہ ہے کہ عبقری واحد اور جمع دونوں ہے۔ $\frac{۲۷}{۱۴}$

**عَبُوْسًا** : منہ بنانے والا۔ تیوری چڑھانے والا۔ ترش رو۔ سخت، منہ بگاڑ دینے والا۔ عَبْسٌ اور عُبُوْسٌ سے صفت مشبہ کا صیغہ قرآن پاک میں یہ یوم کی صفت واقع ہے۔ علامہ احمد فیومی نے مصباح میں لکھا ہے کہ عبس الیوم یہ کہ معنی میں دن کے سخت ہونے کے اس اعتبار

سے یوم عبوس کے معنی سخت دن کے ہیں اور قاموس میں یوماً عَبُوساً کی تشریح ان لفظوں میں کی ہے ای کریہا تعبس منہ الوجوہ (ایسا مکروہ دن کہ جس سے منہ بگڑ جائیں) علامہ خازن نے تصریح کی ہے کہ "یوم کو جو عبوس سے موصوف کیا ہے یہ مجاز ہے جس طرح سے کہ نہارہ صائم بولتے ہیں اور اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جس نے اس دن کا روزہ رکھا ہے۔ بغرض مطلب یہ ہوا کہ اس دن میں لوگوں کے چہرے اس کے ہول اور شدت سے بگڑ جائیں گے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ چونکہ خود اس دن میں سختی اور شدت ہے اس لیے اس کو عَبُوسٌ سے موصوف کیا گیا ہے۔[1] $\frac{۲۹}{۱۹}$

عَبِیْدٌ: بندے عَبْدٌ کی جمع تاج العروس میں ہے:۔

"عبد کی جمع عبید ہے جیسے کلب اور کلیب اور معز اور معیز جوہری نے کہا ہے کہ یہ جمع نادر ہے۔ ہمارے شیخ (محمد بن الطیب فاسی کہتے ہیں کہ اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ جمع ہے یا اسم جمع۔ اور شیخ ابن مالک نے اس کی وضاحت کی ہے اور کہا ہے کہ اوزان جمع میں فعیل بھی آیا ہے۔ لیکن اہل عرب کبھی تو اس کے ساتھ جمع کا معاملہ کرتے ہیں اور اس کو مؤنث لاتے ہیں جیسے عبید اور کبھی اسم جمع کا اور اس وقت مذکر استعمال کرتے ہیں جیسے جبیج اور کلیب"

ازہری نے تصریح کی ہے کہ سب کا اس پ[...] اتفاق ہے کہ عباد اللہ اور مما لیک میں فرق ہے۔ عبادت گزاروں کو عباد کہتے ہیں اور غلام[...] کو عبید[2] لیکن جیسا کہ امام راغب نے بیان[...] کیا ہے جب عبید کی اضافت اللہ تعالیٰ[...] کی طرف ہوتی ہے تو پھر اس سے جملہ بندگا[...] خدا مراد ہوتے ہیں $\frac{۴}{۱۰}$ $\frac{۱۰}{۳}$ $\frac{۱۶}{۸}$ $\frac{۲۳}{۲۰}$ $\frac{۲۶}{۱۶}$

# فصل التاء المثناة

عَتَتُ: اس نے سرتابی کی، اس نے سرک[...] کی، اس نے نافرمانی کی (نص) عُتُوٌّ سے ما[...] کا صیغہ واحد مؤنث غائب (ملاحظہ ہو عُتُوٌّ)

[1] باب التاویل از خازن ج ۴، ص ۱۶ طبع مصر۔ [2] ملخص ہو تاج العروس۔

عُتُلٍّ: سخت مزاج۔ گردن کش، احقر ملا عبد الرشید نعمانی نے منتخب اللغات میں اس کے حسب ذیل معانی لکھے ہیں (۱) بسیار خوار (۲) درشت (۳) ستمگار (۴) سخت گوئے۔ یہ عَتْلٌ سے صفت کا صیغہ ہے جس کے معنی کسی چیز کو پورے طور پر پکڑ کر سختی اور زبردستی کے ساتھ کھینچنے کے ہیں امام ابو بکر محمد بن عزیز سجستانی نزہۃ القلوب میں رقمطراز ہیں۔

عُتُلٍّ سے مراد یہاں تند خو اور سخت مزاج کافر ہے عُتُلٌّ ہر سخت چیز کو کہتے ہیں۔ ابو عمر ثعلب سے اور وہ ابن الاعرابی سے ناقل ہیں کہ عُتُلٌّ وہ شخص ہے جو نصیحت کو کچھ نہ سمجھے"

اور مولانا محمد سعید اسلمی مدراسی، تفسیر مواہب الرحمٰن میں لکھتے ہیں:۔

عُتُلٍّ درشت خوئے، جفا کار، حسن بصری فرمودہ کہ بدکار زشت خو، فرا گفتہ شدید الخصومہ در باطن۔ و نزد کلبی شدید در کفر و ہر شدید در لغت عرب عُتُل است۔ و عُتُلٌّ بضمتین و تشدید۔ مرد درشت آزار دہندہ و سخت گوئے کمافی الصراح، و در قاموس می گوید الاکول المنیع الجافی الغلیظ بسیار خوار سخت باز دارندہ و جفا کنندہ و درشت ماخوذ از قول عرب عتلہ چوں برانداد را بدرشتی و سختی، و ابو عبیدہ در معنی عُتُلٍّ گفت بسیار خورندہ و بسیار آشامندہ زور مند زبردستیکہ سنجیدہ شود در میزان آخرت بیک جو" [1]

قاضی شوکانی نے واخدی کے حوالہ سے مفسرین کے اقوال کا خلاصہ ان دو لفظوں میں نقل کردیا ہے:۔

ھو الشدید الخَلق عُتُلٌّ وہ ہے جو جسم کا مضبوط الفاحش الخُلق [2] ہو اور اخلاق کا خراب

مسند امام احمد بن حنبل میں حضرت عبدالرحمٰن بن غنم سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے العتل الزنیم کی تفسیر دریافت کی گئی تو آپ نے ارشاد فرمایا:

ھو الشدید الخلق وہ جو جسم کا مضبوط ہو

---

[1] مواہب الرحمٰن پارہ تبارک الذی ص ۲۰، ۲۱ طبع مطبع جامع الاخبار مدراس ۱۳۱۶ ہجری

[2] فتح القدیر ج ۵ ص ۲۶۱۔

Marfat.com

السصحمۃ الکول الشروب صحت مند پُر بڑا کھانے
الولجد للطعام و پینے والا جسے کھانے
الشراب الظلوم للناس پینے کو ملتا ہے لوگوں
الرحیب الجوف ١ پر بہت ظلم کرتا ہو اور
تو نما اس کی بڑی ہو۔

حضرت عبدالرحمن بن غنم رضی اللہ عنہ کے صحابی ہونے میں محدثین کا اختلاف ہے۔ تاہم کبار تابعین میں ان کا شمار ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔

چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی تقریب التہذیب میں لکھتے ہیں :-

" عبدالرحمن بن غنم (غین پر زبر اور نون ساکن) اشعری ہیں ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے۔ عجلی نے کبار ثقات تابعین میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ۷۸ ہجری میں وفات پائی"

بہرحال حدیث مرفوع نہ سہی مرسل ہوگی جو امام ابوحنیفہ امام مالک وغیرہ دیگر ائمہ کے نزدیک صحیح ہی ہے۔ $\frac{۲۹}{۲}$

عُتُوٍّ : شرارت، سرکشی، نافرمانی عَتَا یَعْتُوْ کا مصدر ہے۔ جس کے معنی اطاعت سے سر کشی کرنے تکبر کرنے اور حد سے بڑھ جانے کے ہیں اس

کا فعل باب نَصَرَ سے آتا ہے۔ قاضی شوکانی
لکھتے ہیں :-

العتو مجاوزۃ الحد عُتُوٌّ کے معنی ہیں سرکشی
فی الطغیان و میں حد سے گزر جانا اور
البلوغ الی اقصی نافرمانی کی آخری منزل
غایاتہ ٢ پر پہنچ جانا۔

$\frac{۲۱}{۲}$ عُتُوًّا $\frac{۱۹}{۱}$

عَتَوْا : انہوں نے سرکشی کی، انہوں نے نافرمانی
کی، وہ سرتابی میں حد سے گزر گئے۔ وہ شرارت
میں انتہا کو پہنچ گئے۔ عُتُوٌّ سے ماضی کا صیغہ
جمع مذکر غائب $\frac{۳۱}{۱۴}$ $\frac{۹}{۱۱}$ $\frac{۱۹}{۱}$ $\frac{۲۷}{۱}$

عِتِيًّا : حد سے باہر ہونا، اکڑنا، سرکشی کرنا یہ
عَتَا یَعْتُوْ کا مصدر ہے۔ جوہری کا بیان ہے
یہ اصل میں عُتُوٌّ ہی تھا اس کے ایک ضمہ کو
کسرہ سے بدلا تو واؤ بھی یا سے بدل گئی
عُتِيًّا ہوا پھر ایک کسرہ کے ساتھ دوسرا کسرہ
لگا دیا گیا اس تبدیلی کی نظیر تاکید ہو جانے تو
ہو گیا ٣ تاج المصادر میں عِتِيًّا کا ترجمہ لکھا
" بغایت پیری رسیدن " روح المعانی میں
کہ عِتِيٌّ کے معنی ہیں جوڑوں اور ہڈیوں میں خشکی

١ فتح الباری ج ۸ ص ۵۰۸ طبع میریہ مصر ٢ فتح القدیر ج ۴ ص ۶، طبع مصر ٣ تاج العروس

بوست دوڑ جانے کے لیے راغب لکھتے ہیں ومن الکبر عتیا کا مطلب یہ ہے کہ پیری کی اس حالت پر پہنچ گیا کہ اب اصلاحِ مادے کی کوئی سبیل نہیں رہی، اور قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی تفسیر مظہری میں ارقام فرماتے ہیں۔

عُتُوٌّ کے معنی اطاعت سے انکار کر دینے کے ہیں۔ یہاں کمال پیری مراد ہے کیوں کہ ضعیف آدمی کے اعضاء اس کے تابع نہیں رہتے اور وہ جو چاہے ان سے کام نہیں لے سکتا۔ قتادہ کا بیان ہے کہ ہڈیوں کا گھلنا مراد ہے اور جب کسی شخص کا سن انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور وہ بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس کے لیے بولتے ہیں عتا الشیخ یعتو عتیا و عَسِیا اور جب اُس کی ہڈیاں خشک ہو جائیں تو اس کو عاتٍ اور عاسٍ کہا جاتا ہے۔"[1]

اور ایہ شریفہ اَیُّهُمْ اَشَدُّ عَلَی الرَّحْمٰنِ عِتِیًّا (کون سا ہے ان میں رحمٰن سے سخت اکڑنے والا) کے متعلق امام راغب نے لکھا ہے کہ بعض تو عِتِیًّا کو یہاں مصدر بتاتے ہیں اور بعض عَاتٍ کی جمع۔ $\frac{16}{84,4}$

عَتِیْدٌ: تیار۔ ابوبکر سجستانی نے اس کے معنی حاضر کے لکھے ہیں۔ اور قاموس میں اس کا ترجمہ الحاضر المهیا کیا ہے، یہ عتاد سے جس کے معنی ضرورت سے پہلے کسی چیز کے ذخیرہ کر لینے کے ہیں بر وزن فعیل کبھی بمعنی فاعل آتا ہے اور کبھی بمعنی مفعول۔ راغب لکھتے ہیں وَالعتید المعِدُّ والمعَدُّ "عتید" کے معنی ہیں تیار کرنے والا اور تیار کردہ شدہ، قاضی شوکانی نے مَا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (وہ منہ سے کوئی بات نہیں نکالنے پاتا کہ اس کے پاس ایک نگہبان تیار رہتا ہے)، میں فاعل کے معنی لیے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ المراد هنا انه معد للکتابة مهیئ لها (یہاں یہ مراد ہے کہ وہ کتابت کے لیے تیار اور آمادہ ہے) اور وقال قَرِينُهُ هَٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيدٌ (اور بولا اس کا ساتھ والا یہ ہے جو میرے پاس

[1] روح المعانی ج ۱۶ ص ۶۶ طبع منیریہ مصر۔ تفسیر مظہری کا ج ۶ ص ۸۵ سورۂ مریم شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی۔

Marfat.com

حاضر تھا، ہیں مفعول کے، چنانچہ یہاں فرماتے ہیں "عتید حاضر قد هیاتہ یعنی حاضر ہے اور اسے میں نے تیار کر رکھا ہے۔ قاضی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ جوہری وغیرہ ائمہ لغت و نحو نے تصریح کی ہے کہ فعیل اور فعول واحد، تثنیہ اور جمع تینوں میں مساوی طور پہ استعمال ہوتے ہیں"[1]

$\frac{۲۶}{۱۲}$ -

**عَتِیْقٌ**: قدیم، آزاد، یہ یا تو عِتْقٌ سے جس کے معنی آزاد ہونے کے ہیں بروزن فَعِیْلٌ بمعنی مَفْعُوْلٌ ہے یعنی آزاد شدہ، اور یا عَتَاقَۃٌ سے جس کے معنی قدیم اور پرانا ہونے کے ہیں صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ علامہ ابوبکر بن العربی کا مختار بھی یہی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| البیت العتیق فعیل | "عتیق" "عَتُقَ" سے بروزن |
| من عَتُقَ ای تَقَدَّمَ | فَعِیْلٌ ہے یعنی قدیم |
| وجودہ ویقال | الوجود اور جب کسی تلوار |
| سیفٌ عَتِیْقٌ | کو بنائے ایک زمانہ |
| اذا تقدم | ہو جائے تو کہتے ہیں "سیف |
| صنعتہ[2] | عتیق" پرانی تلوار ہے |

عِتْقٌ کا فعل باب ضرب سے آتا ہے اور عَتَاقَۃٌ کا باب کَرُمَ سے اور کبھی باب نصر سے بھی۔ اور علامہ ناصر بن عبدالسید مطرزی المغرب میں لکھتے ہیں:-

"عتق کے معنی ہیں غلامی سے نکلنا چنانچہ بولا جاتا ہے عَتَقَ العبد عتقاً وعتاقاً وعتاقۃ وھو عتیق وھم عتقاءُ اور اعتقہ مولاہ کے معنی آزاد کرنے کے ہیں اور کبھی عتق کو بھی اعتاق کی جگہ استعمال کر لیا کرتے ہیں۔ یہ اس کے اصل معنی ہیں پھر شرافت اور اسی قسم کے معنی جیسے تیز گامی وغیرہ اس سے مراد لیے جانے لگے چنانچہ فرس عتیق رائع اس عمدہ گھوڑے کو بولتے ہیں کہ جو دوڑ میں آگے بڑھ جائے اور عتاق الخیل والطیر سے مراد بہترین گھوڑے اور پرندے ہوتے ہیں اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ مادہ گھوم پھر کر متقدم کے معنی کو بتلاتا ہے۔ چنانچہ عتق الفرس الخیل کے معنی ہیں گھوڑا دوڑ میں اور گھوڑوں سے

[1] فتح القدیر ج ۵ ص ۲، ۳، ۴، ۲ ملاحظہ ہو عارضۃ الاحوذی شرح جامع الترمذی از ابوبکر بن العربی ج ۱۲ ص ۳۰ طبع صادی مصر۔

Marfat.com

مقدم ہوگیا اور آگے نکل گیا اور کاندھے اور گردن کے درمیان حصّہ ابھرا ہوا ہے اس کو "عاتق" اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ آگے نکلا ہوتا ہے اور عَتِیقٌ کے معنی قدیم کے آتے ہیں اور عِتْقٌ اور عَتَاقَةٌ کا استعمال پرانے اور قدیم ہونے ہی کے لیے ہوتا ہے اور اسی معنی میں ہے دَرَاهِمُ عُتُقٌ (عین اور تاء دونوں کے پیش کے ساتھ) یعنی پرانے درہم اور عُتَّقٌ تشدید کے ساتھ بولنا غلط ہے کیوں کہ یہ عَتِيْقٌ کی جمع ہے اور پوری تفصیل "المعرب" میں مذکور ہے"

قرآن شریف میں یہ لفظ بیت کی صفت واقع ہوا ہے۔ ارشاد ہے وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ (اور طواف کریں اس قدیم گھر کا) اور اس سے مراد خانہ کعبہ ہے۔ کعبہ شریف کو "بیت عتیق" کیوں فرمایا گیا۔ اس کے بارے میں متعدد اقوال ہیں جو البیت العتیق کے ضمن میں گزر چکے ہیں لیکن حدیث میں خود اس کی وجہ تسمیہ مذکور ہے۔ چنانچہ جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

انما سمی البیت العتیق لانہ لم یظھر علیہ جبار[1] "بیت اللہ" شریف کا نام "عتیق" اس لیے ہوا کہ اس پر کسی زبردست کا قبضہ نہ چلا۔

امام ابو عیسیٰ ترمذی اس روایت کو نقل کر کے فرماتے ہیں ھذا حدیث حسن غریب اسی طرح حاکم نے بھی اس کو روایت کر کے صحیح کہا ہے ترمذی اور حاکم کے علاوہ امام بخاری نے اپنی تاریخ میں اور ابن جریر و طبرانی وغیرہ دیگر ائمہ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے[2]۔ اس روایت کی بنا پر کعبہ شریف کو "عتیق" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کو زبردستوں کے پنجے سے ہمیشہ آزاد رکھا اور کسی کو اس کے برباد کرنے کا موقع نہیں دیا۔ چنانچہ آج تک تاریخ اس پر شاہد ہے سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ "عتیق" بمعنی جید ہے

[1] جامع ترمذی ص ۵۲۱ طبع احمدی دہلی ۱۲۶۶ھ لیکن مصری نسخہ میں بجائے حسن غریب کے حسن صحیح ہے (ملاحظہ ہو صحیح ترمذی مع شرح ابن العربی ج ۱۲ ص ۳۰۔)

[2] ملاحظہ ہو روح المعانی ج ۱۷ ص ۱۴۶، ۱۴۶ طبع منیریہ مصر

جو عرب کے محاورے عتاق الخیل و عتاق الطیر سے ماخوذ ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ فَعِیْلٌ بمعنی مُفْعِلٌ یعنی مُعْتِقٌ ہے۔ اس صورت میں اس کے معنی ہوں گے گنہگاروں کی گردنوں کا آزاد کرنے والا اور اعتاق کی نسبت اس کی طرف مجاز ہے کیوں کہ حقیقت میں تو اس کے طواف کی بدولت خود حضرت حق جل مجدہ ان کی گردنوں کو آزاد فرماتے ہیں۔[1]

حافظ ابوبکر بن العربی فرماتے ہیں:-

مفسرین عتیق بمعنی قدیم لیتے ہیں اور گو اشتقاق میں بھی اس کی گنجائش ہے تاہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر زیادہ صحیح ہے اور حدیث صحیح میں ہے کہ آپ سے دریافت کیا گیا کہ روئے زمین پہ پہلی مسجد کونسی تعمیر ہوئی ارشاد فرمایا مسجد حرام سو یہ بھی اس کے متقدم ہونے پر نص ہے اس لحاظ سے خانہ کعبہ دونوں وجہوں کے اعتبار سے عتیق ہے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر کو اس بارے میں زیادہ خصوصیت حاصل ہے"[2]

علماء متاخرین میں سے علامہ محمود آلوسی بھی یہی کہتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| وھذا ھو المتبادر | عتیق بمعنی قدیم یہی معنی |
| الا انک تعلم | متبادر ہیں تاہم یہ آپ جانتے |
| انہ اذا صح الحدیث | ہیں کہ حدیث صحیح ہو تو |
| لا یعدل عنہ[3] | اس سے روگردانی نہیں |
| | کی جاسکتی۔ |

لیکن قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کو یہ دونوں وجہیں پسند نہیں وہ فرماتے ہیں:-

"مجھے سفیان بن عیینہ کا قول پسند ہے کہ اس کا نام عتیق اس لیے ہوا کہ وہ کسی بشر کی ملکیت میں نہیں آیا، اور وہ تو کبھی کسی بشر کی ملکیت کیا ہوتا اس کے ارد گرد کا علاقہ یعنی حرم بھی کسی کی ملکیت میں نہیں بنا"

قاضی صاحب موصوف کو ترمذی کی حدیث پر یہ شبہ ہے کہ حسب ذیل روایات اس قول کی تردید کر رہی ہے۔

لہ، ۳ہ ملاحظہ ہو روح المعانی ج ۱۰ ص ۱۴۶، ۱۴۷۔

۲ہ عارضۃ الاحوذی شرح جامع ترمذی ج ۱۲ ص ۳۰۔

Marfat.com

(۱) صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا حبشہ کا ایک شخص دو پتلی پتلی پنڈلیوں والا کعبہ کو ویران کرے گا۔

(۲) بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گویا میرے سامنے ہے وہ سیاہ حبشی چھدری ٹانگوں والا جو کعبہ کا ایک ایک پتھر اکھیڑتا جاتا ہے۔

(۳) حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تک حبشی تمہیں چھوڑیں تم انہیں مت چھیڑو کیوں کہ کعبہ کے خزانہ کو سوائے ایک پتلی پتلی ٹانگوں والے حبشی کے اور کوئی نہیں نکالے گا۔ اس روایت کو ابوداؤد اور حاکم نے نقل کیا ہے اور حاکم نے اس کی تصحیح بھی کی ہے۔

قاضی صاحب ان روایات کو نقل کرکے فرماتے ہیں :-

فان هٰذه الاحادیث — یہ احادیث اس بات
تدل علی تسلط — کو بتلاتی ہیں کہ آئندہ چل کر
جبار علیه فی — اس پر ایک زبردست
المستقبل وذٰلک — کا قبضہ ہو جائے گا اور یہ
ینافی کونه عتیقا — بات اس لحاظ سے ...
بهٰذا المعنی ل — کے عتیق ... کے منافی ہے

لیکن افسوس ہے کہ قاضی صاحب نے حدیث کے الفاظ پر غور نہیں فرمایا اس میں لم یظهر علیه وارد ہے نہ لا یظهر۔ ماضی میں تسلط کی نفی ہے نہ مستقبل میں۔ لہٰذا ان روایات اور اس حدیث میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ حدیث ترمذی میں زمانہ گذشتہ کا بیان ہے اور ان احادیث میں علامات قیامت کا۔ یہ وہ زمانہ ہوگا جب دنیا کی عمر ختم ہونے پر ہوگی اور خدائے واحد کا کوئی نام لیوا باقی نہیں رہے گا۔ لوگ خانہ کعبہ کی حرمت اٹھا چکے ہوں گے تب حبشیوں کے ہاتھوں کعبہ اس طرح برباد ہو جائے گا کہ پھر کبھی آباد نہ ہوگا چنانچہ مسند امام احمد بن حنبل میں اس سلسلہ میں جو روایت مذکور ہے وہ بڑی مفصل ہے اس کے اخیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ الفاظ منقول ہیں :-

ل ملاحظہ ہو تفسیر مظہری ج ۶ ص ۳۰۵ سورہ حج شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی۔

| | |
|---|---|
| ولن یستحل ھذا | اور اس کعبہ کو بے حرمت |
| البیت الا اھلہ | نہ کریں گے مگر کعبہ والے ہی، |
| فاذا استحلوہ | پھر جب وہ اس کی بے حرمت |
| فلا تسئل عن | کر چکیں گے تو اب عرب کی |
| ھلکۃ العرب | تباہی کو نہ پوچھو۔ پھر تو |
| ثم تجیئ الحبشۃ | حبشی (جن کا شمار ہمیشہ |
| فیخربونہ خرابا | دنیا کی ذلیل قوموں میں |
| لا یعمر بعدہ احدا[۱] | رہا ہے) آئیں گے اور کعبہ |
| | کو اس طرح برباد کر دیں گے |
| | کہ پھر کبھی آباد نہ ہوگا۔ |

علماء کی تصریحات بھی یہی ہیں۔ چنانچہ علامہ محمود آلوسی روح المعانی میں فرماتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| ان ذلک من اشراط | یہ تو علامات قیامت |
| الساعۃ التی لا ترد | میں سے ہے اس سے |
| نقضا | کوئی اعتراض نہیں آتا |

اور امام ابوبکر بن العربی لکھتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| وذلک عند انقضاء | یہ کعبہ کی بربادی جب |
| الزمان وجوب الساعۃ | ہوگی جب کہ زمانہ ختم |
| والخروج من الدنیا[۳] | ہو رہا ہوگا۔ قیامت |

سر پر ہوگی اور دنیا سے نکلنے کا زمانہ ہوگا۔

اور علامہ محمد طاہر پٹنی مجمع بحار الانوار میں فرماتے ہیں:۔

"یہ قرب قیامت میں ہوگا جب کوئی اللہ اللہ کہنے والا باقی نہ رہے گا حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات ہو چکی ہوگی اور قرآن سینوں اور کتابوں سے اُٹھ چکا ہوگا رہا ارشاد حرامًا امنًا سواس کے معارض نہیں، کیوں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کا امن قرب قیامت اور دنیا کی بربادی تک ہے[۴]" (انتہیٰ ملخصًا)

اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں اسی کے قریب قریب لکھا ہے[۵] ۱۶/۱۱

## فصل الثاء المثلثۃ

**عُثِرَ:** اُسے اطلاع دی گئی۔ اُسے خبر کر دی گئی (نصر۔ ضرب) عُثُوْرٌ سے جس کے معنی بغیر چاہے کسی چیز پر مطلع ہو جانے کے ہیں۔ ماضی کا صیغہ

۱؎ فتح الباری ج ۳ ص ۳۶۹ ۲؎ روح المعانی ج ۱۱ ص ۱۲۷ ۳؎ عارضۃ الاحوذی ج ۱۲ ص ۳۰
۴؎ مجمع بحار الانوار ج ۲ ص ۱۵۶، ۱۵۷ مطبع نول کشور لکھنؤ۔ 

Marfat.com

واحد مذکر غائب۔ راغب اصفہانی لکھتے ہیں :-

عثر الرجل یعثر عثارًا و عُثُورًا کے معنی گر پڑنے کے ہیں۔ اور مجازًا اس کا استعمال کسی شخص کے اچانک بلا طلب کسی بات پر مطلع ہو جانے کے لیے ہوتا ہے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فان عُثِرَ علٰی اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّا اِثْمًا (پھر اگر خبر ہو جاوے کہ وہ دونوں حق بات دبا گئے) مگر اس معنی میں اس کا صلہ علی آتا ہے، اور عَثَرْتُ عَلٰی کَذَا کہا جاتا ہے"

علامہ احمد فیومی نے مصباح میں مختصر العین کے حوالہ سے اس کے مصادر کا حسب ذیل فرق نقل کیا ہے۔

" انسان کے گرنے کے لیے عَثَرَ الرَّجُلُ عُثُوْرًا اور گھوڑے کے گر جانے کے لیے عَثَرَ الْفَرَسُ عِثَارًا اور کسی چیز پر اطلاع پانے کے لیے عَثَرَ علیہ عَثْرًا و عُثُورًا ہے باب نَصَرَ سے"

اور امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں رقمطراز ہیں[1]۔ ملیث رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ عَثَرَ الرجل یعثر عثورًا کے معنی ہیں کسی چیز پر اس طرح اچانک جا پڑنا کہ دوسرا ایکا یک نہ پہنچ سکے، اور اعثرت فلانًا علٰی امری کے معنی ہیں میں نے فلاں کو اس کی اطلاع دے دی اور عَثَرَ الرجل یَعْثُرُ عَثْرَۃً کے معنی ہیں کسی چیز پر گر پڑنے کے اہل لغت نے کہا ہے کہ عثر بمعنے اطلع عَثْرَۃٌ ہی سے ہے جس کے معنی گر پڑنے کے ہیں کیونکہ عاثر (ٹھوکر کھا کر گر پڑنے والا) ایسی ہی چیز پر گرتا ہے جس کو وہ نہیں دیکھتا پھر جب اس پر گر پڑتا ہے تو اس سے مطلع ہو جاتا ہے اور دیکھ لیتا ہے کہ کیا چیز ہے اسی لیے جب کوئی شخص کسی بات پر مطلع ہو جو اس سے پوشیدہ تھی تو بولتے ہیں قد عثر علیہ (اس پر مطلع ہو گیا) اور اعثر غیرہٗ (اس نے دوسرے کو اس پر مطلع کر دیا) اور اسی معنی میں ارشاد ہے وَکَذٰلِکَ اَعْثَرْنَا عَلَیْهِمْ (اور اسی طرح ہم نے لوگوں کو ان کی خبر ظاہر کر دی[1])"

عَثَرَ کا استعمال اطلاع پانے کے معنی میں

[1] تفسیر کبیر ج-۳ ص ۱۸۶ طبع مصر قدیم۔

حقیقت ہے یا مجازاً اس بارے میں امام راغب کی تصریح آپ کی نظر سے گزری۔ صاحب روح المعانی نے غوری سے بھی یہی نقل کیا ہے کہ کا استعمال کسی مخفی چیز پر اطلاع پانے کے معنی میں مجاز ہے۔ اصل میں عثر کے معنی ہیں کبا یعنی وہ منہ کے بل گر پڑا۔ چونکہ منہ کے بل گر پڑنے والا اپنے گرنے کی جگہ کو دیکھ لیتا ہے اور اسے پہچان کر اس پر مطلع ہو جاتا ہے اس لیے مجازاً مطلع ہونے کے معنی میں بھی اس کو استعمال کرنے لگے لیکن خود صاحب روح المعانی اس کو مجاز ماننے میں مذبذب ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"لیث نے کہا ہے کہ عثر بمعنی اطلع کا مصدر عثور ہے اور عثر بمعنی کبا کا عِثَارٌ اور اس صورت میں قول بالمجاز کی نفی ہوتی ہے کیوں کہ مصدر کا اختلاف مجاز ماننے کے منافی ہے لہذا یہ دعویٰ راغب کے قول کے مطابق صرف دونوں مصدروں کے اتحاد ہی کی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے۔ اور قاموس میں ہے کہ عثر بروزن ضَرَبَ و نَصَرَ و عَلِمَ و کَرُمَ عَثْرًا و عَثِيرًا و عِثَارًا اس کے معنی ہیں منہ کے بل گرنا اور عُثُورٌ کے معنی ہیں مطلع ہونا۔ نیز عثر بھی اسی معنی میں آتا ہے۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مجاز نہیں ہے۔ نیز اس معنی میں بعض مصادر کا اتحاد بھی سمجھ میں آتا ہے۔" [1]

بلاشبہ اختلاف مصادر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ائمہ نقل نے اس کو بیان کیا ہے لیکن یہ فرق کثرت استعمال کے لحاظ سے ہے، ورنہ بعض مصادر حسب تصریح صاحب قاموس و دیگر ائمہ لغت دونوں معنوں میں یکساں مستعمل ہیں تاہم اس مادہ کی اصل وضع حسب تصریح ائمہ لغت و عربیت گرنے ہی کے معنی کے لیے ہے۔ اور اطلاع ہونے کے معنی بعد کی پیداوار ہیں۔ امام رازی کے بیان سے بھی یہی پتہ چلتا ہے، علامہ مطرزی بھی المغرب میں امام رازی کے ہمزبان ہیں، اور سید مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں صاف لکھا ہے ومن المجاز (العثور) بالضم (الاطلاع) علی امر من غیر

[1] ملاحظہ ہو روح المعانی ج ، ص ۵۰ طبع منیریہ مصر۔

طلب رکالعش بالفتح. زبیدی حقیقت و
مجاز کا فرق عام طور پر علامہ زمخشری کی اساس
البلاغہ سے نقل کرتے ہیں۔ اور زمخشری کا لغت
و عربیت میں جو درجہ ہے محتاج بیان نہیں

۴/۲

# فصل الجیم المعجمہ

عُجَابٌ: عجب، عجیب، التعجب میں ڈالنے
والی چیز۔ امام راغب کے نزدیک عُجابٌ کے معنی
ہیں اچنبھے کی ایسی چیز جو باور نہ ہو" عَجَبٌ سے
بروزن فُعَالٌ مبالغہ کا صیغہ جوہری لکھتے ہیں
"جس سے اچنبھا ہو وہ عجیب ہے اور یہی
معنی عُجابٌ بالضم کے ہیں اور عُجّابٌ
بالتشدید وہ جس میں اس سے بھی زیادہ
اچنبھا ہو"
بعض علماء نے کہا ہے کہ عُجَابٌ بالتخفیف اور
عُجّابٌ بالتشدید دونوں حد سے زیادہ تعجب کو
بتلاتے ہیں جس طرح سے کہ طُوِیلٌ کہتے ہیں لمبے
کو اور طُوَّالٌ وہ ہے جو حد سے زیادہ لمبا ہو
قاضی شوکانی اس کو نقل کر کے لکھتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| وکلام الجوھری | اور جوہری کا کلام یہ بتاتا ہے کہ |
| یفید اختصاص | مبالغہ عُجَابٌ بغیر تشدید میں |
| المبالغۃ بعجّاب | نہیں بلکہ عُجّابٌ کے ساتھ |
| مشددۃ الجیم | مخصوص ہے جس کے جیم |
| لا بالمخفف [1] | پر تشدید ہے۔ |

لیکن قاضی صاحب موصوف کو یہ لکھتے وقت شاید
خیال نہیں رہا کہ فَعِیلٌ اور فُعَالٌ دونوں مبالغہ
کے اوزان ہیں۔ روح المعانی میں ہے۔

| | |
|---|---|
| عُجابٌ ای بلیغ | "عجابٌ" کے معنی ہیں بہت |
| فی التعجب فان | ہی اچنبھے کی چیز کیونکہ |
| فعالا بناء مبالغۃ | فُعَالٌ مبالغہ کا وزن ہے |
| کرجل طوال | جیسے رجل طُوالٌ بہت |
| وسراع۔ | لمبا مرد اور رجل سراع |
| | بہت جلد باز شخص۔ |

نیز جوہری کے الفاظ جو قاضی صاحب نے نقل کیے
ہیں وہ یہ ہیں۔ والعجّاب بالتشدید اکثر منہ۔
یعنی عُجّابٌ جو تشدید کے ساتھ ہے اس میں
عُجَابٌ سے بھی زیادہ اچنبھا ہے معلوم ہوا
کثرت تعجب تو عُجَابٌ میں بھی ہے لیکن
عُجّابٌ میں اس سے بھی زیادہ ہے ۲۳/۱

[1] فتح القدیر ج ۴ ص ۴۰۸ -

Marfat.com

**عِجَافٌ** ۔ لاغر، دبلی۔ امام عزیزی سجستانی نزہۃ القلوب میں لکھتے ہیں۔ عِجَافٌ وہ ہیں جو لاغری میں انتہا کو پہنچ چکی ہوں۔ اور تاج العروس میں ہے کہ "عِجَافٌ کے معنی ہیں ایسی لاغر کہ جن پر نہ گوشت ہو نہ چربی" اَعْجَفُ اور عجفاء دونوں کی جمع ہے جو عَجَفٌ سے جس کے معنی چربی کے جاتے رہنے کے ہیں صفت مشبہ کے صیغے ہیں، پہلا واحد مذکر کا صیغہ ہے اور دوسرا واحد مؤنث کا

امام محمد فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں رقمطراز ہیں:۔

"لیث کہتے ہیں عَجَفٌ کے معنی ہیں چربی کے جاتے رہنے کے اس کا فعل آتا ہے عَجِفَ یَعْجَفُ اور مذکر کی صفت اَعْجَفُ اور مؤنث کی عَجْفَاءُ ہے اور مذکر و مؤنث دونوں کی جمع عِجَافٌ ہے۔ عربی زبان میں سوائے اَعْجَفُ اور عَجْفَاءُ کے اَفْعَلُ اور فَعْلَاءُ کی کوئی جمع فِعَالٌ کے وزن پر نہیں آتی ہے اور عِجَافٌ جمع شاذ ہے جس کو لفظ سِمَانٌ پر حمل کر کے سِمَانٌ اور عِجَافٌ بولتے ہیں۔ چونکہ یہ دونوں باہم نقیضین ہیں کہ اہل عرب کی عادت ہے کہ وہ ایک نظیر کو دوسری نظیر پر اور ایک نقیض کو دوسری نقیض پر حمل کر لیا کرتے ہیں"۔ [1]

یہاں یہ مؤنث یعنی عَجْفَاءُ کی جمع واقع ہے قاعدہ کے لحاظ سے اس کی جمع عُجْفٌ ہونا چاہیے تھی جیسے کہ حَمْرَاءُ سے حُمْرٌ ہے مگر عرب کی عادت کے مطابق یا تو یہ اپنی نقیض سمان (فربہ) پر محمول ہے یا اپنی نظیر ضعاف (کمزور اور لاغر) پر بہرحال یہ جمع خلاف قیاس اہل عرب سے مروی ہے۔ فراء کا قول ہے کہ عجفاء عجاف کی کوئی نظیر سوائے حسناء حسان کے کلام عرب میں نہیں ہے۔ لیکن سید مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں تصریح کی ہے کہ "اس بات میں اس لیے زور نہیں کہ اہل عرب نے بَطْحَاءُ کی جمع مکسر بِطَاحٌ اور بَرْقَاءُ کی بِرَاقٌ بنائی ہے"۔ اہل لغت نے اسی حمل الشئ علیٰ ضدہ کی مثال میں عَدُوَّةٌ کو بھی پیش کیا ہے جس کے معنی دشمن عورت کے ہیں، اور جو صَدِیقَةٌ (دوست عورت) کی ضد ہے کیوں کہ عَدُوَّةٌ میں ہاء کو محض

[1] تفسیر کبیر ج ۵ ص ۱۹۰ طبع مصر قدیم [2] المصباح المنیر۔

صَدِیْقَۃٌ کی بنا پر داخل کیا گیا ہے، حالانکہ فعول بمعنی فاعل ہو تو اس کے مؤنث میں ہا نہیں آیا کرتی۔ بلکہ وہ مذکر و مؤنث دونوں میں یکساں استعمال ہوتا ہے[1]۔ ۱۲/۱۶

عَجَبٌ: عجب، تعجب، اچنبھا، عجیب۔ یہ عَجِبَ یَعْجَبُ کا مصدر بھی ہے جس کے معنی تعجب کرنے اور اچنبھا ہونے کے ہیں اور اسم بھی تفسیر کبیر میں ہے۔

"عَجَبٌ مصدر ہے اور عَجِیْبٌ کی جگہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ عَجِیْبٌ سے زیادہ بلیغ ہے" [2]

اور امام راغب اصفہانی رقمطراز ہیں:-

عَجِبْتُ عَجَبًا بولا جاتا ہے (یعنی باب سَمِعَ یَسْمَعُ سے آتا ہے) اور جس چیز سے اچنبھا ہو اس کو عَجَبٌ بولتے ہیں اور جس کی مثال نہ دکھائی دے اس کو عَجِیْبٌ کہتے ہیں، ارشاد ہے اَکَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَیْنَا (کیا لوگوں کو تعجب ہوا کہ وحی بھیجی ہم نے) یہ اسی بات پر تنبیہ ہے کہ یہ بات تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے قبل بھی لوگ دیکھ چکے ہیں نیز ارشاد ہے وَعَجِبُوْا اَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ (اور تعجب کرنے لگے اس بات پر کہ آیا ان کے پاس ایک ڈر سنانے والا) وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ (اور اگر تو عجب بات چاہے تو عجب ہے ان کا کہنا) اور یہ جو فرمایا ہے اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا (کیا تو خیال کرتا ہے کہ غار اور رکھوہ والے ہماری قدرتوں میں اچنبھا تھے) اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی حد درجہ تعجب کی چیز نہیں بلکہ ہمارے کام تو ایسے ہیں کہ ان سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر ان میں تعجب اور اچنبھا ہے قُرْاٰنًا عَجَبًا کے معنی ہیں ایسا قرآن کہ جس کی مثال نہ دیکھی گئی اور نہ اس کا سبب معلوم ہو سکا۔

اور کبھی بطور استعارہ اس کا استعمال کسی بھلی اور عمدہ چیز کے لیے بھی ہوتا ہے چنانچہ بولتے ہیں اَعْجَبَنِیْ کَذَا (مجھے یہ بھلا معلوم ہوا) اسی معنی میں ارشاد ہے وَمِنَ

---

[1] تاج العروس [2] تفسیر کبیر ج ۸۔ ص ۳۱۹ طبع مصر قدیم۔

Marfat.com

النَّاسِ مَنْ یُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ (اور بعض آدمی وہ ہے کہ پسند آتی ہے تجھ کو اس کی بات)، اور وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ (اور تعجب میں نہ ڈالیں تجھے ان کے مال)، اور وَیَوْمَ حُنَیْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ (اور حنین کے دن جب خوش ہوئے تم اپنی کثرت پر)، اور اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ (خوش لگا کسانوں کو اس کا سبزہ) اور ارشاد فرمایا بَلْ عَجِبْتَ وَیَسْخَرُوْنَ یعنی آپ کو چونکہ پختہ طور پر معرفت حاصل ہے اس لیے اس پر تعجب ہے کہ یہ دوبارہ جی اُٹھنے سے کیوں انکار کرتے ہیں اور یہ اپنی جہالت سے ٹھٹھا اڑاتے ہیں اور بعض نے یہ معنی لیے ہیں کہ آپ کو ان کے انکار حق پر تعجب ہے۔"

لسان العرب میں ہے کہ تعجب وہ ہے جس کا سبب مخفی ہو معلوم نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کسی چیز پر تمہاری نظر پڑے اور تم یہ خیال کرنے لگو کہ ایسی چیز کبھی نظر سے نہیں گزری اس کا نام "تعجب" ہے شیخ ابوالطیب فاسی نے قاموس کے قدیم حواشی سے اس کے معنی کے متعلق اہل لغت نے جو کچھ ذکر کیا ہے اس کا ماحصل ان لفظوں میں پیش کیا ہے:

| | |
|---|---|
| التعجب حیرة تعرض للانسان عند سبب جهل الشیئ (تاج العروس) | تعجب وہ حیرت ہے جو انسان کو کسی شے کے متعلق اس وقت لاحق ہوتی ہے جبکہ اس کا سبب معلوم نہیں ہوتا |

علامہ احمد فیومی نے مصباح میں بعض نحاۃ سے اس کی تعریف یہ نقل کی ہے۔

| | |
|---|---|
| التعجب انفعال النفس لزیادة وصف فی المتعجب منہ۔ | تعجب نفس کا وہ تاثر ہے جو اس چیز میں کہ جس پر تعجب ہو رہا ہے کسی وصف کی زیادتی کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ |

(ملاحظہ ہو تعجب ۱۳/۲ عَجَبًا ۱۱/۶ ۱۵/۱۲، ۲۱۱ ۲۹/۱۱۔

**عَجِبْتَ**: تو نے تعجب کیا۔ تو نے اچنبھا کیا (سمع) عَجَبٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر ۱۲/۵

**عَجِبْتُمْ**: تم نے تعجب کیا۔ تمہیں اچنبھا ہوا عَجَبٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر

**عَجِبُوْا**: اُنہوں نے تعجب کیا۔ انہوں نے اچنبھا کیا۔ عَجَبٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب ۲۳/۱۰ ۲۶/۱۵۔

Marfat.com

عَجَزْتُ: میں عاجز ہوا، میں ناتواں ہوا۔
(ضرب) عَجْزٌ سے جس کے معنی ناتواں اور عاجز ہونے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد متکلم۔ امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں:۔
"عَجْزٌ کے معنی ہیں اصل میں کسی چیز سے پیچھے رہنے نیز کسی شئے کے بالکل معاملہ کے اخیر میں حاصل ہونے کے جیسا کہ دُبُرٌ میں ذکر کیا جا چکا ہے[مہ]۔ اور عرف میں کسی فعل کی انجام دہی سے قاصر رہنے کا نام عجز ہے جو قدرت کی ضد ہے۔ ارشاد ہے أَعَجَزْتُ أَنْ أَكُونَ (مجھ سے اتنا نہ ہو سکا کہ ہو جاؤں)

ع ج ل

عَجِلَ: جلدی کرنا، شتابی کرنا۔ عَجِلَ يَعْجَلُ کا مصدر ہے۔ راغب لکھتے ہیں:۔
"عَجَلَةٌ کے معنی ہیں وقت سے پہلے کسی چیز کی طلب اور اس کا قصد کرنا اور چونکہ یہ خواہش نفسانی کے تقاضے کا نتیجہ ہے اس لئے قرآن مجید کے تمام مواقع استعمال میں یہ مذموم بن گئی ہے حتیٰ کہ محاورہ ہو گیا ہے العجلة من الشيطان جلدی کام شیطان کا،

آیہ شریفہ خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (پیدا کیا گیا ہے انسان جلدی سے) میں بعض نے عَجَل کے معنی حَمَأٍ یعنی گارے کے بیان کیے ہیں، جو کچھ نہیں ہیں بلکہ اس طرز بیان سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ انسان جلد بازی سے خالی نہیں رہتا اور جبلی اخلاق یہ کہ اس کی ترکیب عمل میں آتی ہے ان میں سے ایک یہ چیز بھی ہے۔ یہی مطلب دوسری آیت میں اس طرح ادا کیا گیا ہے وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا (اور ہے انسان جلد باز) امام راغب نے قائل کا نام نہیں بتایا لیکن صاحب تاج العروس نے ابن الاعرابی سے یہی معنی نقل کیے ہیں۔ ابن الاعرابی نے اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ شعر بھی پیش کیا ہے۔

والنبع في الصخرة الصماء منبتة
والنخل ينبت بين الماء والعجل

(نبع کا درخت تو سخت چٹان میں اگتا ہے اور کھجور کا درخت پانی اور گارے میں)
ابن عرفہ کہتے ہیں کہ میرے نزدیک اس کی کسی ایسے شخص کا حوالہ نہیں دیا گیا کہ جو علم لغت کا مرجع ہو

مہ وہاں لکھتے ہیں دبر فلان القوم صار خلفهم یعنی دبر کے معنی پیچھے ہونے کے آتے ہیں۔

Marfat.com

ازہری نے بھی ایسا ہی کہا ہے۔ ابو عبید کا بیان یہ ہے کہ عَجَل کے معنی گارے کے حمیری زبان میں آتے ہیں مشکل یہ ہے کہ وہ بھی سند میں اسی شعر کو پیش کرتے ہیں۔ اسی لیے علامہ زمخشری کو لکھنا پڑا واللہ اعلم بصحتہ یعنی ابو عبیدہ کے دعوے کی صحت کا حال خدا ہی کو معلوم ہے۔ ابن درید نے بھی اسی کے قریب قریب اشارہ کیا ہے۔[1]

اور علامہ احمد فیومی المصباح المنیر میں فرماتے ہیں کہ آیت میں قلب ہے اس لیے معنی یہ ہوں گے خلق العجل من الانسان یعنی انسان جلدی سے نہیں بلکہ جلدی انسان سے پیدا ہوئی ہے۔ صاحب تاج العروس نے ثعلب سے اور صاحب روح المعانی نے ابو عمرو، ابو عبیدہ اور قطرب سے بھی یہی نقل کیا ہے۔[2] ان حضرات کے خیال میں جس طرح آیت يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ (اور جس دن پیش کیے جائیں گے کافر آگ پر) میں قلب واقع ہوا ہے اور آیت کے معنی ہیں تعرض النار علیہم یعنی آگ ان پر پیش کی جائے گی۔ اسی طرح اس آیت میں بھی قلب ہے[3] لیکن

سید مرتضیٰ زبیدی ابن جنی سے ناقل ہیں:- سب سے بہتر یہی ہے کہ اس کی تقدیر خُلِقَ الْإِنسَانُ مِنْ عَجَلٍ ہی ہے بایں معنی کہ انسان جلدی کو بہت کام میں لاتا ہے اور اس کا عادی ہے۔ اور یہ معنی خلق العجل من الانسان مراد لینے کی بہ نسبت زیادہ قوی ہیں کیوں کہ یہ معنی درست بھی ہیں اور اس کی گنجائش بھی ہے اور قلب پر محمول کرنا فن کے لحاظ سے بھی بعید ہے اور معنی کو بھی پست کر دیتا ہے۔

(ابن جنی نے یہ بھی) کہا ہے کہ غالباً یہ مقام بعض لوگوں پر واضح نہ ہو سکا تو انہوں نے عَجَل کے معنی گارے کے کر ڈالے (ابن جنی کہتے ہیں) سو اپنی جان کی قسم لغت میں اس کے یہ معنی بھی آتے ہیں لیکن اس جگہ بجز عجلت اور شتابی کے اس سے اور کچھ مراد نہیں لیا جا سکتا۔ دیکھیے اس کے عین مابعد اللہ عز اسمہ کا کیا ارشاد ہو رہا ہے سَأُرِيكُمْ آيَاتِي فَلَا تَسْتَعْجِلُونِ

[1] ملاحظہ ہو تاج العروس [2] روح المعانی ج ۱۷ ص ۴۸

[3] تفسیر کبیر امام رازی ج ۶ ص ۱۵۲ و ۱۵۳ مطبوعہ مصر طبع قدیم۔

Marfat.com

(اب دکھلاتا ہوں تم کو اپنی نشانیاں سو مجھ سے جلدی مت کرو) آیت مذکورہ ہی کی نظیر یہ آیتیں بھی ہیں وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا (اور انسان جلد باز پیدا کیا گیا ہے) اور خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا (اور بنا ہے انسان کمزور) کیوں کہ عجلت بھی ضعف ہی کی ایک قسم ہے بایں طور کہ شتابی اس کی ضرورت اور حاجت کا اظہار ہے۔ بعرض یہ اس آیت کی اصل توجیہ ہے''

بات یہ ہے کہ عربی زبان کا یہ عام محاورہ ہے کہ بعض اوقات جب کسی چیز میں کسی صفت کی با فراط موجودگی کو بیان کرنا ہوتا ہے تو بطور مبالغہ اس کی تعبیر ان لفظوں میں کرتے ہیں کہ خلق منہ یعنی وہ تو اس سے بنا ہے، خود ہماری زبان میں بھی ایک ایسا ہی محاورہ مستعمل ہے کہ فلاں شخص تو حرفوں کا بنا ہوا ہے یعنی بڑا چالاک اور عیار ہے لوگوں کو باتوں باتوں میں دم جھانسے دے جاتا ہے اسی طرح یہ بھی محاورہ ہے کہ فلاں شخص آگ کا پتلا ہے یعنی بڑا آتش خو اور شعلہ مزاج ہے۔ آیت مذکورہ میں بھی انسان کے عجلت پسند اور جلد باز ہونے کے لیے بھی پیرایہ بیان اختیار فرمایا گیا ہے جس طرح

پر دوسری جگہ ارشاد ہے خَلَقَكُمْ مِنْ ضُعْفٍ یعنی اللہ نے تم کو ضعیف پیدا فرمایا ہے۔ چنانچہ ابو اسحٰق زجاج فرماتے ہیں۔

"عرب کو ان کی ہی سمجھ کے موافق خطاب فرمایا گیا ہے۔ اہل عرب اس شخص کے لیے کہ جس سے کوئی چیز بکثرت سرزد ہو خُلِقْتَ منہ۔ بولتے ہیں یعنی تو تو اس سے بنا ہے مثلاً کسی شخص کے وصف لعب (کھیل کود) کو اگر مبالغہ کے ساتھ بیان کرنا ہوگا تو یوں کہیں گے خلقت من لعب (تو تو کھیل سے بنا ہے) اسی طرح اگر افراط دانائی کے ساتھ کسی متصف کریں گے تو کہیں گے خلق فلان من الکیس (فلاں شخص دانائی سے بنا ہے یعنی عقل کا پتلا ہے''

(تاج العروس)

ازہری نے تہذیب میں فراء سے اس کی تشریح ان الفاظ میں نقل کی ہے :-

| | |
|---|---|
| خُلِقَ الْاِنْسَانُ من عَجَلٍ وَعَلَی عجلٍ کانک قلت رکب علی العجلة | "خلق الانسان من عجل" او علی عمل اسی معنی میں ہیں جس معنی میں تم بولتے ہو رکب علی العجلة یعنی وہ تو عجلت سے بنا ہے |

وبنیتہ العجلۃ و اور بنیتہ العجلۃ اس کی بناوٹ
خلقتہ العجلۃ عجلت ہے۔ اور خلقتہ العجلۃ وعلی
وعلی العجلۃ العجلۃ یعنی اس کی سرشت
(تاج العروس) ہی عجلت ہے۔ یا عجلت پر اس
کی خلقت ہے۔

اس تفصیل کے بعد ناظرین پر یہ عیاں ہو گیا ہو گا
کہ قلب یہاں چسپاں نہیں ہوتا۔ اسی لیے امام
فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں قمطراز ہیں کہ
"ان اقوال میں سب سے بعید تر یہ قلب ہے کیونکہ
جہاں تک ہو سکے کلام کو اس کی اپنی ترتیب
پر رکھتے ہوئے صحیح معنی پر محمول کرنا اس سے زیادہ
بہتر ہے کہ اس کو مقلوب پر محمول کیا جائے"۱

علاوہ ازیں خلقت العجلۃ من الانسان
میں بھی مجاز کے مختلف وجوہ موجود ہیں بہرحال
مخواہ نظم آیت (استائل) کو اسی طرح کے
مجاز میں تبدیل کرنا اس سے کیا فائدہ ہے؟
اخیر میں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ
نفس عجلت مذموم نہیں بلکہ جو چیز مذموم ہے وہ
افراط عجلت ہے یا عجلت بیجا۔۲ ۱۱/۳

**عِجْلٌ** : بچھڑا، گوسالہ، گائے کا بچہ، علامہ مطرزی
نے المغرب میں تصریح کی ہے کہ گائے کا بچہ
وقت ولادت سے لے کر ایک ماہ تک عِجل
کہلاتا ہے۔ راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ عِجلٌ بچہ
گاؤ کو کہتے ہیں کیوں کہ اس کے متعلق عجلت کا وہ
تصور پایا جاتا ہے کہ جو ثور (بیل) ہو جانے کی
حالت میں معدوم ہو جاتا ہے" اس کی مؤنث عجلۃ
اور جمع عجول ہے۔ امام ابو منصور ثعالبی نے
فقہ اللغہ میں گائے بیل کی عمر کے لحاظ سے حسب
ذیل تین الفاظ نقل کیے ہیں: بچہ کے لیے عِجل
جوان کے لیے شَبُوبٌ اور کمسن اور عمر رسیدہ
کے لیے فارِضٌ ۱/۱۱۱ ۶/۲ ۹/۹ ۱۲/۷ ۲۶/۱۹
عِجلاً ۹/۸ ۱۶/۱۲۔

**عَجِلَ** : اس نے جلدی کی۔ اس نے عجلت
کی تعجیل سے جس کے معنی جلدی کرنے کے ہیں
ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب۔ ۱۵/۲۰ ۲۶/۱۱

**عَجِّلْ** : تو جلدی کر تعجیل سے امر کا صیغہ
واحد مذکر حاضر ۳۸/۱۱۔

**عَجِلْتُ** : میں نے جلدی کی (متیم) عَجِلَ

۱ تفسیر کبیر۔ ج ۶۔ ص ۱۵۳ طبع مصر
۲ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر مظہری۔ ج ۶ ص ۱۹۱ طبع دہلی۔

اور عَجَلَۃٌ سے یعنی جلدی کرنے کے ماضی کا صیغہ واحد متکلم۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ آیت شریفہ وَ عَجِلْتُ اِلَیْکَ رَبِّ لِتَرْضٰی (اور میں جلدی آیا تیری طرف اے میرے رب تاکہ تو راضی ہو) میں حضرت موسیٰ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایذکر کیا ہے کہ عجلت گو مذموم ہے مگر اس کا جو داعی تھا وہ امر محمود ہے یعنی طلب رضائے الٰہی۔ ۱۲/۱۲

عَجِلْتُمْ: تم نے جلدی کی۔ تم نے جلد بازی کی عَجَلٌ اور عَجَلَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر ۹/۸

عَجَّلْنَا: ہم نے جلدی کی تَعْجِیْلٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم ۱۵/۲ -

عَجُوْزٌ: بڑھیا۔ پیرزن۔ راغب نے لکھا ہے کہ بڑھیا کو عجوز اس لیے کہتے ہیں کہ بہت سے امور کی انجام دہی سے عاجز ہے۔ علامہ فیومی المصباح المنیر میں لکھتے ہیں: -

• ابن السکیت نے کہا ہے کہ ہا کے ساتھ اس کی تانیث نہیں ہوتی۔ اور ابن الانباری کا بیان یہ ہے کہ تانیث کے مزید اثبات کی غرض سے عَجُوْزَۃٌ ہا کے ساتھ بھی بولا جاتا ہے۔ اور یونس سے مروی ہے کہ میں نے اہل عرب کو عجوزہ بالہا بولتے ہوئے سنا ہے عَجُوْزٌ کی جمع عَجَائِزُ اور عُجُزٌ ہے"

پ ۱۲ ۲۶/۱۹ عَجُوْزًا ۱۹/۱۳ پ ۲۳

عَجُوْلًا: بہت جلد باز، بڑا تاؤلا، بہت زیادہ شتاب کار، عَجَلٌ سے مبالغہ کا صیغہ - ۱۵/۲ -

عَجِیْبٌ: عجیب تعجب کی چیز۔ اچنبھے کی بات راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ جس چیز کی مثل نہ پائی گئی ہو وہ عجیب کہلاتی ہے۔ عَجَبٌ سے بر وزن فَعِیْلٌ مبالغہ کا صیغہ عجائب جمع ۱۲/۷ ۲۶/۱۵ -

## فصل الدال المہملۃ

عَدًّا: شمار کرنا، گننا، گنتی، شمردنی۔ یہ عَدَّ یَعُدُّ کا مصدر ہے۔ مضاعف ہے اور اس کا فعل باب نَصَرَ سے آتا ہے۔ امام راغب لکھتے ہیں: -

بعض اعداد کو بعض کے ساتھ ضم کرنے کا نام عَدٌّ ہے . . . . . . اور مجازاً عَدٌّ کا استعمال کئی طرح پر ہوتا ہے۔ کبھی تو کسی ایسی چیز کے مقابلہ میں کہ جو کثرت کے

Marfat.com

باعث شمار میں نہ آ سکے اور جس کو قرآن پاک میں بِغَیۡرِ حِسَابٍ سے تعبیر فرمایا گیا ہے، کسی تھوڑی سی چیز کو شیئی معدود و محصور بولتے ہیں چنانچہ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدَۃً (مگر گنتی کے چند دن) میں یہی معنی مراد ہیں یعنی تھوڑے سے دن" کیونکہ یہود کا یہ دعویٰ تھا کہ ہمیں تو صرف اتنے ہی دن عذاب دیا جائے گا کہ جتنے دن ہم نے بچھڑے کی پوجا میں گزارے ہیں۔

اور کبھی بالکل اس کے مخالف معنی میں اس کا استعمال ہوتا ہے جیسے جیش عدید کے معنی ہیں لشکر کثیر اور انہم لذو عدد یعنی وہ لوگ اس قدر ہیں کہ کثرت کے باعث ان کا شمار کرنا ضروری ہے۔ اس صورت تقلیل کے لیے شَیۡئٌ غیر معدود آتا ہے یعنی اتنی کم چیز کہ جسے گننے کی ضرورت ہی نہیں اور آیۃ فِی الۡکَہۡفِ سِنِیۡنَ عَدَدًا میں دونوں معنی کا احتمال ہے یعنی برسہا برس کہ جن کو شمار کرنا ضروری ہے یا گنتی کے چند سال یعنی تھوڑے سے برس۔ عرب کا محاورہ ہے ھٰذا غیر معتد بہٖ اسی معنی میں مستعمل ہے یعنی یہ چیز اتنی کم حیثیت یا اتنی کم مقدار میں ہے کہ لائقِ التفات اور قابلِ شمار نہیں "

آیۂ شریفہ اِنَّمَا نَعُدُّ لَہُمۡ عَدًّا (ہم تو ان کے لیے تعداد کا شمار کرتے جاتے ہیں) میں بھی عَدٌّ کا استعمال اظہارِ قلت ہی کے لیے ہے۔ چنانچہ علامہ سید محمود آلوسی روح المعانی میں فرماتے ہیں:

"یعنی ان کے چند دن اور کچھ سانس باقی رہ گئے ہیں کہ جو ہم شمار کر رہے ہیں مطلب یہ کہ بہت تھوڑے سے اور ہیں، جیسا کہ دَرَاہِمَ مَعۡدُوۡدَۃٍ کے متعلق بیان کیا گیا ہے اور یہاں بھی معدودۃ بیانِ قلت کے لیے ہے"[1]

عَدَاوَۃٌ : عداوت، دشمنی۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ

"جب عَدۡوٌ (جس کے معنی تجاوز کرنے اور پیوستگی اور تعلق باہمی کے ختم ہو جانے کے ہیں) کے معنی کا قلب میں اعتبار کیا جائے تو عَدَاوَۃ اور مُعَادَاۃ بولتے ہیں یعنی دل سے تعلق اور وابستگی کا منقطع ہو جانا"

[1] روح المعانی ج ۱۶ ص ۱۳۵ -

سید مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں لکھا ہے کہ عَدَاوَۃٌ، عَدْوٌ سے اسم عام ہے۔

۶/۱۰،۱۳،۱۵ ۷/۲ ۲۴/۱۹ ۲۸/۷

عُدْتُمْ: تم نے پھر کیا۔ تم نے دوبارہ کیا عَوْدٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر عُدْتُمْ میں ادغام متجانسین ہے۔ (ملاحظہ ہو تَعُوْدُنَّ اور عَادَ)

۱۵/۱

عِدَّتِہِمْ: ان کی گنتی، ان کا شمار، ان کی تعداد عِدَّۃَ مضاف ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ (ملاحظہ ہو عِدَّۃ) ۵/۵ ۲۹/۱۵

عِدَّتِہِنَّ - ان کی عدت، عِدَّۃِ مضاف ھِنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب مضاف الیہ (ملاحظہ ہو عِدَّۃ) ۲۸/۱۴

عَـدَدَ: گنتی، شمار، لغۃً عَدَّ یَعُدُّ کا اسم ہے۔ اور کبھی بمعنی معدود (شمار کیا ہوا گنا ہوا) بھی استعمال ہوتا ہے اس صورت میں فَعَلٌ بمعنی مَفْعُوْلٌ ہوگا اَعْدَادٌ جمع۔ راغب اصفہانی رقمطراز ہیں "عَدَدٌ احاد مرکبہ یعنی مرکب اکائیوں کو کہتے ہیں اور بعض نے ترکیب احاد کو" عدد کہا ہے اور یہ دونوں معنی درحقیقت ایک ہی ہیں ارشاد ہے۔ عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابِ (گنتی برسوں کی اور حساب)

اور آیہ کریمہ فَضَرَبْنَا عَلٰٓی اٰذَانِہِمْ فِی الْکَہْفِ سِنِیْنَ عَـدَدًا اور ہم نے تھپک دیئے ہم نے ان کے کان اس کھوہ میں (یعنی سُلا دیا) برس ہا برس میں لفظ عدد کو سالوں کی کثرت پر تنبیہ کرنے کے لیے ذکر کیا ہے"

اور علامہ فیومی المصباح المنیر میں فرماتے ہیں:- عَدَد بمعنے مَعْدُوْد ہے۔ علماء نے کہا ہے کہ عَـدَد وہ مقدار ہے جو اکائیوں سے مرکب ہوتی ہے۔ اس صورت میں لفظ عدد کا استعمال اس کے ساتھ مخصوص ہے کہ جو فی ذاتہٖ متعدد ہو۔ اسی لیے واحد (ایک) عدد نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس میں تعدد نہیں کہ تعدد تو کثرت کا نام ہے۔

اور نحوی یہ کہتے ہیں کہ واحد بھی عدد میں داخل ہے کیوں کہ وہ تو اصل ہی ہے اور اسی پر عدد کی بنا ہے اور یہ بالکل بعید ہے کہ شئے کی اصل اس سے خارج ہو علاوہ ازیں واحد میں فی نفسہٖ کمیت موجود ہے کیوں کہ جب یہ سوال کیا جائے تمہارے پاس کتنے ہیں؟ تو اس کے جواب میں جس طرح تین

وغیرہ اعداد کا بیان کرنا صحیح ہے اسی طرح ایک بتانا بھی درست ہے۔

زجاج نے کہا ہے کہ عدد کا استعمال کبھی مصدر (گننے) کے معنی میں بھی ہوتا ہے جیسے کہ ارشاد الٰہی سِنِیْنَ عَدَدًا (کئی سال گن کر) میں ہے۔ اور علماء کی ایک جماعت کا بیان یہ ہے کہ یہاں بھی اس کے وہی معنے ہیں کہ جس میں اس کا عام استعمال ہے یعنی سِنِین، محدودۃ، عددًا بمعنی مَعْدُوْدَۃً۔

آیہ شریفہ وَاَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا (اور گن لیا ہر چیز کو شمار میں) کے متعلق تاج العروس میں ابن الاثیر سے منقول ہے کہ یہاں عَدَدًا بمعنی معدودًا بھی ہو سکتا ہے اس صورت میں اس کو نصب بر بنائے حال ہوگا۔ اور بمعنی اِحْصَاء بھی اس صورت میں مفعول مطلق ہوگا اور مصدر کے معنے دے گا۔ "عدد" اور "حساب" میں جو فرق ہے اس کو قاضی شوکانی نے ان الفاظ میں واضح کیا ہے۔

"عدد اور حساب میں فرق یہ ہے کہ "عدد" ایک کمیت والی چیز کا اسی جیسی چیز کے ساتھ بار بار شمار کرنا ہے بغیر اس کے کہ کوئی بات نکلے (یعنی محض گن لینا) اور حساب کہتے ہیں کسی کمیت والی چیز کو اسی جیسی چیز کے ساتھ بار بار شمار کرنا بایں طور کہ اس کمیت کے ایک معینہ حصہ سے اس شمار کے ذریعہ ایک معین حد حاصل ہو جائے کہ جس کا خاص نام ہو۔

مثلاً سال پر اگر صرف اس حیثیت سے نظر ڈالی جائے کہ وہ کتنے دن کا ہوتا ہے تو اس کو "عدد" کہیں گے لیکن اگر اس حیثیت سے اس کو دیکھا جائے کہ وہ کتنے مہینے کا ہوتا ہے اور ہر مہینہ کتنے دن کا اور ہر دن کتنے گھنٹوں کا اور ہر گھنٹہ کتنے منٹ کا تو اس کا نام "حساب" ہے"[1]

۱/۲ ، ۱۵/۲ ، ۱/۹ ، عَدَدًا ، ۱۵/۱۲ ، ۲۹/۱۲

عَدَّدَہٗ : اس نے اس کو گن گن رکھا۔ اس نے اس کو بار بار گنا عَدَّدَ، تَعْدِیْدٌ۔ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ۃ ضمیر واحد مذکر غائب، امام ابو جعفر بیہقی نے تاج المصادر

[1] تفسیر فتح القدیر۔ ج ۳۔ ص ۳۰۵۔ طبع مصر سورہ الاسراء۔

Marfat.com

میں تَعْدِیْدَ کے معنی لکھے ہیں "بڑی تعداد میں مال کا جمع کرنا اور نہایت اہتمام سے کسی چیز کا گننا"
علامہ فیومی نے مصباح میں تصریح کی ہے کہ عَدَّدَ بالتشدید کا استعمال مبالغہ کے لیے ہوتا ہے
تفسیر کبیر میں ہے کہ :۔

"ارشاد الٰہی وَعَدَّدَہٗ کے معنی کئی طرح ہو سکتے ہیں :۔

اوّل یہ کہ عُدَّۃٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ذخیرہ کے ہیں چنانچہ اَعْدَدْتُ الشَّیْئَ لِکَذَا اور عَدَّدْتُہٗ کا استعمال ایسے موقع پر ہوتا ہے جب کہ اس غرض کے لیے مال کو روک رکھا جائے اور حوادث زمانہ کے خیال سے اس کا ذخیرہ اور اندوختہ کیا جائے۔

دوم یہ کہ عَدَّدَہٗ کے معنی ہیں اس کو خوب گنا اور تشدید کثرت معدود کے لیے آئی ہے جس طرح کہ کہا جاتا ہے فُلَانٌ یُعَدِّد فضائل فلان (فلاں شخص فلانے کی فضیلتوں کو خوب گنتا ہے) اسی لیے سُدی نے عَدَّدَہٗ کے معنی بیان کیے ہیں احصاہ یعنی اس نے خوب شمار کر رکھا ہے اور گنتا رہتا ہے کہ یہ بھی میرا ہے یہ بھی میرا ہے غرض دن بھر اسی مالی مصروفیت میں ختم ہو جاتا ہے اور رات آتی ہے تو چھپا کر رکھ دیتا ہے۔

سوم یہ کہ عَدَّدَہٗ بمعنی کَثَّرَہٗ ہے یعنی اس کو خوب زیادہ کر لیا۔ محاورہ ہے فی بنی فلان عَدَدٌ یعنی بنو فلاں میں بڑی کثرت ہے
اخیر کی دونوں توجیہوں کا تعلق عدد کے معنی سے ہے اور پہلی کا عُدَّۃ کے معنی سے" [1]

زجاج نے پہلے ہی معنی اختیار کیے ہیں اور ضحاک نے اس کی تفسیر ان لفظوں میں کی ہے اَعَدَّ لہ مالو رثتہ [2] یعنی اپنے وارثوں کے لیے مال کا اندوختہ کیا۔ اس تفسیر پر بھی یہ عُدَّۃٌ ہی سے ماخوذ ہے $\frac{30}{29}$

**عَدَدِسِهَا** : اس کے مسور عدس مسور کو کہتے ہیں، ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ۔ $\frac{1}{2}$

**عَدْلٌ** : عوض، بدلہ، معاوضہ، انصاف برابر امام ابوبکر عزیزی سجستانی، نزہتہ القلوب فی تفسیر غریب القرآن میں لکھتے ہیں :۔

[1] تفسیر کبیر سورۃ الہمزہ۔

[2] فتح القدیر تفسیر سورہ مذکورہ۔

"عَدْلٌ کے معنی فدیہ کے ہیں جیسے وَلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ (اور نہ لیا جاوے اس سے فدیہ میں کچھ) اور وَاِنْ تَعْدِلْ کُلَّ عَدْلٍ لَا یُؤْخَذْ مِنْهَا (اور اگر فدیہ دے ہر فدیہ تب بھی اس سے نہ لیا جائے گا) اور عَدْلٌ کے معنی مثل (یعنی برابر اور یکساں) کے بھی آتے ہیں جیسے ارشاد ہے اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا (یا برابر اس کے روزے) یعنی اس کے

مثل۔ ابو عمر نے کہا ہے کہ عَدْلٌ بمعنی عِدْلٌ صرف ابو عبیدہ کے نزدیک بولا جاتا ہے ابو عمر نے یہ بھی کہا ہے کہ عَدْلٌ بالفتح کے معنی قیمت کے بھی ہیں، فدیہ کے بھی مرد صالح کے بھی اور حق و انصاف کے بھی اور عِدْلٌ بالکسر کے معنی مثل کے ہیں"

اور امام راغب اصفہانی رقمطراز ہیں۔

عَدَالَةٌ اور مُعَادَلَةٌ وہ لفظ ہے جو مساوات کے معنی کو مقتضی ہے اور اس کا استعمال ان چیزوں کے لیے ہوتا ہے کہ جن کا ادراک بصیرت سے ہوتا ہے جیسے کہ احکام میں چنانچہ اسی معنی میں ارشاد ہے اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا اور عَدْلٌ اور عَدِيْلٌ کا استعمال ان اشیاء کے لیے ہوتا ہے کہ جن کا ادراک حاسہ سے ہوتا ہے جیسے کہ موزونات (تولے جانے والی چیزیں) معدودات (شمار کی جانے والی چیزیں) اور مکیلات (ناپے جانے والی چیزیں) میں غرض عَدْل کے معنی ہوئے بالکل برابر سرابر حصہ لگا دینا۔

آیہ شریفہ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ بے شک اللہ حکم کرتا ہے انصاف کرنے کا اور بھلائی کرنے کا، میں "عدل" سے مراد برابر کا بدلہ دینا ہے نیکی کی جزا نیکی کے موافق اور برائی کی سزا برائی کے مطابق۔ اور احسان کے معنی یہ ہیں کہ خیر کا بدلہ زیادہ ہو اور شر کا کم،

عَدْلٌ اصل میں مصدر ہے جیسا کہ ارشاد ہے وَاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ اور گواہ کر لو دو صاحبان عدل کو یعنی ایسے دو شخصوں کو کہ جو صفت عدالت سے موصوف ہوں۔

اور آیہ شریفہ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا میں عَدْل بمعنی مایعادل ہے یعنی اتنے روزے کہ جو فدیہ طعام

کے برابر ہوں اسی طرح غذا کو بھی جب اس میں مساوات کے معنی ملحوظ ہوں گے تو "عدل" کہا جائے گا۔

اور علامہ فیومی مصباح میں یہ فرماتے ہیں۔

"عَدَلَ کے معنی ہیں معاملات میں میانہ روی سے کام لینے کے یہ جور کے خلاف ہے عَدَلَ فِی اَمرِہٖ عدلًا اور عَدَلَ عَلَی القَومِ عَدْلًا باب ضرب سے مستعمل ہے۔ عدل الشیئ بالکسر جو جنس میں یا مقدار میں اس شے کی مثل ہو ابن فارس کہتے ہیں عِدل وہ ہے جو جنس اور مقدار میں برابر ہو اور عَدل بالفتح وہ ہے جو غیر جنس میں اس شئی کا قائم مقام ہو جیسا کہ اَوْعَدْلُ ذٰلِکَ صِیَامًا میں عدل سے یہی مراد ہے یہ بھی دراصل مصدر ہے جب ایک چیز کو دوسری چیز کے مثل اور اس کا قائم مقام کر دیا جائے تو بولا جاتا ہے عَدَلْتُ ھٰذا بِھٰذا (میں نے اس کو برابر کر دیا) اس معنی میں بھی یہ باب ضرب ہی سے آتا ہے"

ب ۱/۱۵:۶، ب ۳/۶، ب ۵/۵، ب ۷/۱۴:۴:۳، ب ۱۴/۱۹:۱۱، ب ۲۶/۱۲

ب ۲۸/۱۴ عَدْلًا انصاف، راستی ۸/۱

**عَدَلَکَ**: تجھ کو برابر کیا تجھ کو اعتدال پہ بنایا (ضرب) عَدَلَ عَدْلٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ک ضمیر واحد مذکر حاضر واضح رہے کہ عَدْلٌ کے معنی برابر کرنے کے بھی آتے ہیں اور لوٹنے اور پھرنے کے بھی چنانچہ یہاں اہل لغت نے دونوں معانی بیان کئے ہیں۔

تفسیر کبیر میں ہے:۔

"کوفہ کے قاریوں نے فَعَدَلَکَ کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے یعنی عَدَّلَکَ تشدید کے ساتھ نہیں پڑھا جیسا کہ قرار سبعہ میں سے بعض کی قراءت ہے، اور اس کی کئی توجیہیں ہیں۔

(۱) ابو علی فارسی کہتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ تیرے بعض اعضاء کو بعض کے ساتھ اس طرح برابر کر دیا کہ سب میں اعتدال آگیا۔

(۲) فراء کہتے ہیں فَعَدَلَکَ کے معنی یہ ہیں جس صورت کی طرف تجھ کو چاہا لوٹا دیا اس کے بعد فراء نے کہا ہے کہ تشدید کی قراءت

زیادہ بہتر ہے کیوں کہ صَرَفتُکَ اِلٰی کَذَا کی طرح عَدَلْتُکَ اِلٰی کَذَا بھی مستعمل ہے لیکن عدلتُک فیہ اور صرفتک فیہ مستحسن نہیں اب پہلی قرأت (یعنی تشدید) پر تو فِیْ اَیِّ صُوْرَۃٍ میں لفظ فِیْ ترکیب کا صلہ ہوتا ہے جو بالکل مناسب ہے اور دوسری قرأت (یعنی صورت تخفیف میں) پر عَدَلَکَ کا صلہ قرار پایا ہے جو ضعیف ہے۔

تاہم یہ معلوم رہے کہ فراء کا اعتراض اس دوسرے معنی پر تو چلتا ہے جو خود ان کے اپنے بیان کردہ ہیں، لیکن پہلے معنے جو ابو علی فارسی نے بیان کیے ہیں اس پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

(۳) قفال نے بعض اہل لغت سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ عَدَلَ اور عَدَّلَ یہ دونوں لغتیں ہیں اور دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔“ [۱]

۳۰/۲

**عَدْن**۔ رہنا بسنا، کسی جگہ مقیم ہونا۔ یہ مصدر ہے اور اس کا فعل باب ضَرَبَ اور نَصَرَ سے آتا ہے۔ جَنّٰتِ عَدْنٍ کے معنی ہیں رہنے بسنے کے باغات یعنی وہ جنتیں کہ جہاں ہمیشہ رہنا ہوگا۔

واضح رہے کہ عدن کو بعض علماء عَلم قرار دیتے ہیں اور بعض صفت، جو لوگ علم کہتے ہیں وہ اس کو جنت میں ایک خاص مقام کا نام بتاتے ہیں اور دلیل میں اس آیت شریفہ کو پیش کرتے ہیں۔

جَنّٰتُ عَدْنِ ِالَّتِیْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَہٗ بِالْغَیْبِ۔ کیونکہ یہاں معرفہ کو اس کی صفت لایا گیا ہے۔ نیز بزار، اور دار قطنی (المختلف والموتلف) میں اور ابن مردویہ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عدن حق تعالیٰ کا (بنایا ہوا) گھر ہے کہ جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی بشر کے دل پر اس کا خیال آیا۔ اس میں انبیاء، صدیقین اور شہداء ان تینوں کے علاوہ اور کوئی نہ رہنے پائے گا اور حق تعالیٰ فرمائیں گے:۔

طُوْبٰی لِمَنْ دَخَلَکَ اے عدن جو تجھ میں داخل ہو اس کے لیے خوبی ہے،

اور جو لوگ عدن کو علم نہیں بلکہ جنت کی صفت بتاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ عدن کے معنی اصل

---

[۱] تفسیر کبیر سورۃ ”الانفطار“

Marfat.com

میں استقرار اور ثبات کے ہیں محاورہ ہے عَدَنَ بالمکان یعنی اس نے اس جگہ قیام کیا اور عدن سے مراد اقامت علی وجہ الخلود ہے یعنی دائمی طور پر رہنا بسنا۔ اور عَدْن کے یہی معنی وہ فرد کامل ہیں جو مقام مدح کے مناسب ہیں یعنی جنات اقامۃ وخلود۔ اس معنی کے لحاظ سے تمام جنتیں "جنات عدن" ہیں۔[1]

امام قرطبی نے لکھا ہے کہ جنتیں سات ہیں (۱) دار الخلد (۲) دار الجلال (۳) دار السلام (۴) جنت عدن (۵) جنت المأویٰ (۶) جنت نعیم (۷) الفردوس[2]

۱۰/۱۵، ۱۳/۹، ۱۴/۱۰، ۱۵/۱۲، ۱۶/۱۲،۷، ۲۲/۱۶، ۲۳/۱۳، ۲۴/۶، ۲۸/۱۰، ۳۰/۲۳۔

**عُدْنَا** ۔ ہم پھر آگئے۔ ہم نے پھر کیا۔ ہم نے دوبارہ کیا۔ عَوْدٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم ملاحظہ ہو تَعُوْدُنَّ اور عَادَ ۹/۱، ۱۵/۱، ۱۸/۶

**عَدْوًا** : زیادتی، تعدی، ظلم و ستم، حد سے بڑھنا۔ زیادتی کرنا۔ مصدر ہے اس کا فعل باب نَصَرَ سے آتا ہے۔ علامہ راغب فرماتے ہیں عَدْوٌ کے معنی ہیں تجاوز کرنا اور وابستگی کا نابود ہونا جب اس کا تعلق قلب سے ہو تو عَدَاوَةٌ اور مُعَادَاةٌ کہا جاتا ہے اور جب چلنے سے ہو تو عَدْوٌ کہلاتا ہے اور جب معاملات میں انصاف کو ہاتھ سے دینے کے متعلق ہو تو عُدْوَان اور عَدْوٌ بولتے ہیں ارشاد ہے فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (پس بُرا کہنے لگیں گے خدا کو زیادتی سے بے سمجھے) ۶/۱۹، ۱۱/۱۴

**عَدُوٌّ** : دشمن، عَدْوٌ سے بروزن فَعُولٌ بمعنی فاعل صیغہ صفت ہے۔ قاضی شوکانی تفسیر فتح القدیر میں لکھتے ہیں۔

عَدُوٌّ، صَدِيقٌ (دوست) کے برخلاف ہے یہ یا تو عَدَا بمعنی ظلم سے ماخوذ ہے چنانچہ ذئب عدوان اس بھیڑیے کو بولتے ہیں جو لوگوں پر ستم ڈھائے۔ اور عُدْوَانٌ کے معنی صریح ظلم کے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ تجاوزات (حد سے بڑھنا اور زیادتی کرنا) سے ماخوذ ہے چنانچہ

---

[1] روح المعانی ج ۱۰ ص ۱۲۶ طبع جدید۔
[2] تفسیر مظہری سورہ توبہ ص ۶۵ طبع قدیم۔

Marfat.com

عَدَّاه بمعنی جَاوَزَہٗ یعنی حد سے بڑھ جانے اور زیادتی کرنے کے معنی میں مستعمل ہے اور دونوں معنی قریب قریب ہیں۔ کیوں کہ ظالم بھی حد سے تجاوز ہی کرتا ہے"[1]

یہ بھی واضح رہے کہ قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال حق تعالیٰ شانہ کے لیے بھی ہوا ہے اب بندے اور خدا کی عداوت میں کیا فرق ہے قاضی صاحب نے دوسری جگہ پر اس فرق کو بھی واضح کیا ہے فرماتے ہیں :-

| | |
|---|---|
| والعداوة من العبد | بندے کی اللہ سے عداوت |
| هی صدور المعاصی | یہ ہے کہ اس سے اللہ کے معاصی |
| منه لله والبغض | صادر ہوں اور وہ اولیاء |
| لاولیاءه والعداوة | اللہ سے بغض رکھے اور |
| من الله للعبد هی | اللہ کی عداوت بندے |
| تعذیبه بذنبه | سے یہ ہے کہ اس کے گناہ |
| وعدم التجاوز عنه | پر اسے عذاب دے اور |
| بالمغفرة [2] | مغفرت کے ذریعے اس سے درگزر نہ فرمائے |

اور علامہ فیومی المصباح المنیر میں مختصر العین سے ناقل ہیں کہ عَدُوٌّ کا استعمال واحد و جمع اور مذکر و مؤنث کے لیے یکساں ہوتا ہے لیکن قاموس میں ہے کہ کبھی تثنیہ، جمع اور مؤنث بھی آتا ہے اور صحاح میں ابن السکیت سے منقول ہے کہ فَعُولٌ جب بمعنی فاعل ہو تو مؤنث میں ة نہیں آتی جیسے کہ رَجُلٌ صَبُورٌ اور امرأة صبور۔ سوائے ایک لفظ کے کہ جس کا استعمال نادر ہے۔ چنانچہ بولتے ہیں هٰذه عَدُوَّةُ اللهِ لیکن فراء نے کہا ہے کہ اس میں جو تا کو داخل کر دیا ہے وہ محض صدیقة کی مشابہت کے لیے کیا ہے کیوں کہ کبھی کسی لفظ کو اس کی ضد کے وزن پر بھی بنا لیا کرتے ہیں[3] اور امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں :-

"مُعَادَاةٌ" (باہم دشمنی کرنا) سے رَجُلٌ عَدُوٌّ (دشمن شخص) اور قَوْمٌ عَدُوٌّ (دشمن قوم) بولا جاتا ہے (یعنی واحد اور جمع دونوں کے لیے آتا ہے) ارشاد ہے بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ اور کبھی اس کی جمع عِدًى اور أَعْدَاء بھی آتی ہے۔ ارشاد ہے وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَاءُ اللهِ (اور جس دن اکٹھے کیے جائیں گے دشمن اللہ کے)۔

[1] تفسیر فتح القدیر۔ ج ا ص ۵۵ [2] ایضاً ص ۹۱ [3] تاج العروس۔

Marfat.com

اور عدو کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو دشمنی کے
مقصد و ارادہ کی بنا پر عدو" قرار پایا ہے جیسے
فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَكُمْ اور اگر
وہ ایسی قوم سے ہو کر جو تمہارے دشمن ہیں) اور
جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ
رکھے ہیں ہم نے دشمن ہر نبی کے گنہگاروں میں
سے) اور دوسری آیت میں ہے عَدُوًّا
شَيَاطِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ
شیطان آدمی اور جن)
اور دوسرا وہ عدو کہ جس کے مقصد اور
ارادہ کو تو دشمنی میں کچھ دخل نہ ہو لیکن اس
کی حالت ایسی ہو کہ جس کی بنا پر اس سے
ویسی ہی اذیت پہنچتی ہو جیسی کہ دشمنوں سے
پہنچا کرتی ہے جیسے ارشاد ہوتا ہے فَإِنَّهُمْ
عَدُوٌّ لِي إِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِينَ (یعنی خدا
کے سوا جن کو بھی تم اور تمہارے اگلے باپ دادا
پوجتے چلے آئے وہ سب معبودان باطل میرے
دشمن اور غنیم ہیں) اور اولاد ازواج کے بارے
میں فرمایا جا رہا ہے اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ
اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُ
یعنی تمہاری جورو میں اور تمہاری اولاد دشمن
ہیں تمہاری سو ان سے بچتے رہو۔ یعنی بیویوں
اور اولاد کے بارے میں محتاط رہو ورنہ بعض
وقت ان کی حالت اس درجہ بگڑ جاتی
ہے کہ جس طرح دشمن سے اذیت پہنچتی
ہے ان سے بھی پہنچنے لگتی ہے"

۱/۱۲،۴ ۲/۵،۹ ۵/۱۰ ۱۸/۹،۴ ۱۰/۴ ۱۱/۳،۴ ۱۲/۱۱
۱۵/۱۹ ۱۶/۱۱،۱۶ ۱۹/۹ ۲۰/۵ ۳۳/۱۳ ۲۵/۱۲ ۲۸/۱۳
عَدُوًّا ۱/۱۲ ۵/۱۲ ۸/۱ ۱۰/۱۷ ۱۵/۹ ۱۹/۰۱
۲۰/۴ ۲۲/۱۳ ۲۸/۱۶

عُدْوَانَ : ظلم، ستم، زیادتی۔ یہ عَدَا يَعْدُوْ
کا مصدر ہے جو باب نَصَرَ سے آتا ہے۔ امام
ابوبکر عزیزی سجستانی لکھتے ہیں
"عُدْوَانٌ کے معنی تعدی اور ظلم کے ہیں آیہ
فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ کے
معنے ہیں فلا جزاء ظلم الا علی ظالم
یعنی ظلم کا بدلہ صرف ظالم ہی سے لیا جائیگا
اور امام راغب فرماتے ہیں:-
وہ "عدوان" کہ جس کی ابتداء کرنی ممنوع ہے
اس آیت میں مراد ہے وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ
وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَ
الْعُدْوَانِ (اور آپس میں مدد کرو نیک کام

Marfat.com

پر اور پرہیزگاری پر اور مدد نہ کرو گناہ اور زیادتی پر) لیکن جو "عدوان" کہ بدلہ کے طور پر ہو اور جس کا اس شخص کے ساتھ برتنا روا ہے کہ جو اس کی پہل کر چکا ہے وہ اس آیت میں مراد ہے فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (تو زیادتی نہیں مگر بے انصاف لوگوں پر)۔

اور تاج العروس میں "عدوان" کے معنی عداوت کو نظر انداز کرنے میں حد سے گزر جانے کے لکھے ہیں اور آیت فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ کی تفسیر کی ہے ای لا سبیل اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ یعنی دار و گیر نہیں مگر ظالموں پر۔ اور بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ "عدوان" کے معنی ہیں بری طرح حد سے بڑھ جانے کے خواہ یہ بات قوت (استعداد) میں ہو یا فعل میں یا حال میں۔ اور اسی معنی میں ارشاد ہے وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا (اور جو کوئی یہ کام کرے زیادتی سے تو ہم ڈالیں گے اس کو آگ میں) پ ۲/۱۰ پ ۲/۸ پ ۵/۳۰، ۱۳

پ ۲۰/۶ پ ۲۸/۸ عُدْوَانًا ۵/۲

عَدُوِّكُمْ: تمہارا دشمن عَدُوٌّ مضاف، ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ پ ۹/۵ پ ۱۰/۴

پ ۱۶/۱۲ پ ۲۸/۷

عُدْوَةِ: کنارہ، ناکہ، جانب، سمت، طرف

امام ابوبکر عزیزی لکھتے ہیں:-

"ارشاد عز و جل ہے اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى

(جس وقت کہ تم تھے ورے کنارے پر اور وہ تھے پرے کنارے پر) عِدْوَۃٌ بکسر العین اور عُدْوَۃٌ بضم العین دونوں کے معنی کنارہ وادی یعنی میدان کے ناکہ کے ہیں اور دُنْيَا اور قُصْوٰى ادنیٰ اور اقصیٰ کی تانیث ہیں"

علامہ فیومی نے مصباح میں تصریح کی ہے کہ قریش عین پر پیش بولتے ہیں اور قیس زبر دیتے ہیں۔ اور سبعہ میں دونوں طرح قراءت کی گئی ہے میدان بدر کے ورلے کنارے کو جو مدینہ منورہ کی جانب تھا اور جہاں لشکر نبوی فروکش تھا قرآن مجید نے "العدوۃ الدنیا" فرمایا ہے اور اس کے پرے کنارہ کو کہ جو مکہ معظمہ کی جانب تھا اور جہاں کفار نابکار پڑاؤ ڈالے تھے "العدوۃ القصویٰ" فرمایا ہے۔

واضح رہے کہ بدر کے اطراف و جوانب میں

Marfat.com

جو پہاڑ ہیں ان کے مختلف حصے مختلف ناموں سے موسوم ہیں ان میں سے جو دو سفید پہاڑیاں دور سے ریت کے دو سفید تودوں کی شکل میں دکھائی پڑتی ہیں اب بھی ان میں سے جو پہاڑی مدینہ منورہ کی جانب ہے اس کا نام العدوۃ الدنیا ہے اور دوسری جو مکہ مکرمہ کی سمت ہے العدوۃ القصویٰ سے موسوم ہے اور جو بہت اونچا سا پہاڑ ان دونوں کے درمیان ہے وہ آج کل جبل اسفل کہلاتا ہے کیوں کہ اسی کے نیچے نیچے ابوسفیان اپنے تجارتی قافلہ کا راستہ کاٹ کر سمندر کے کنارے کنارے گزر گیا تھا۔ جس کا ذکر قرآن پاک میں بایں الفاظ آیا ہے وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنْكُمْ اور کارواں تم سے نیچا تھا، ۱۰/۴۲

عَدُوِّهٖ: اس کا دشمن، عَدُوِّ مضاف ہ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ ۵/۲۰ ۲۳/۳

عَدُوِّهِمْ: ان کے دشمن، عَدُوِّ مضاف هم ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ ۲۵/۱

عَدُوِّيْ، میرا دشمن، عَدُوِّ مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، ۲۸/۱

عُدَّةً: ساز و سامان، اسباب، علامہ راغب نے اس کے معنی لکھے ہیں مال ہتھیار وغیرہ بہت سا ساز و سامان جو تیار کیا جائے۔ فیومی نے لکھا ہے کہ اس کی جمع عُدَدٌ ہے جیسے کہ غُرْفَةٌ کی جمع غُرَفٌ ہے۔ تاج العروس میں ہے۔

"عُدَّةٌ بالضم جو کچھ بھی تم گردش ایام کے لیے تیار کر سکو مال ہو خواہ ہتھیار۔ أُهْبَةٌ کا استعمال جس معنی میں ہوتا ہے ٹھیک اسی معنی میں عُدَّةٌ اور عَتَادٌ بھی آتے ہیں بولا جاتا ہے اخذ للامر عدته و عتاده یعنی اس نے معاملہ کے لیے اپنی تیاری کر لی یا اپنے مقصد کا ساز و سامان لے لیا۔ غرض تینوں لفظوں کے معنی ایک ہی ہیں، یہ اخفش کا بیان ہے اور ابن درید کے الفاظ یہ ہیں العدة من السلاح ما اعتدته۔ یعنی سلاح میں عدۃ اس کو کہتے ہیں جس کو تم نے طیار کر لیا ہو ابن درید کے الفاظ میں تو سلاح کی تخصیص کی ہے معلوم نہیں وہ معنی میں بھی عُدَّةٌ کو سلاح کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں یا نہیں" ۱۰/۱۳

عِدَّةٌ: گنتی شمار۔ عدت

امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں:۔

Marfat.com

عِدَّۃٌ عَدٌّ سے بروزن فِعْلَۃٌ بمعنی مَعْدُودٌ ہے جیسے کہ طِحْنٌ بمعنی مَطْحُونٌ اور اسی بنا پر انسانوں کی گنی ہوئی جماعت کو عِدَّۃٌ کہتے ہیں اور عورت کی عدت بھی اسی معنی میں ہے یعنی اس کے گنے ہوتے دن)"[1]

اور راغب اصفہانی لکھتے ہیں۔

عَدَّۃٌ کے معنی ہیں گنی ہوئی چیز ارشاد ہے۔ وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ (اور نہیں رکھی ہم نے گنتی ان کی) یہاں عِدَّتَهُمْ بمعنی عَدَدُهُم آیا ہے اور فرمایا فَعِدَّۃٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ (تو گنتی چاہیئے اور دنوں سے) یعنی ماہِ رمضان چھوڑ کر دوسرے وقت اتنے ہی گنے ہوئے دن کے روزے رکھے جتنے کہ فوت ہوتے ہیں۔

اور "عدت" سے مراد عورت کی عدت ہے یعنی وہ ایام کہ جن کے گزر جانے پر اس سے نکاح کرنا حلال ہو جاتا ہے ارشاد ہے فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّۃٍ تَعْتَدُّونَهَا (سو نہیں ان پر تمہارے لیے عدت میں بیٹھنا کہ جس کو تم شمار کرنے لگو) فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّۃَ (نو ان کو طلاق دو ان کی عدت پر اور گنتے رہو عدت)"

"عِدَّۃٌ کی جمع عِدَدٌ ہے جیسے کہ سِدْرَۃٌ کی سِدَرٌ۔ تاج العروس میں ہے عِدَّۃٌ عَدٌّ کی طرح سے مصدر ہے اور اس کے معنی جماعت کے بھی آتے ہیں خواہ وہ چھوٹی جماعت ہو یا بڑی۔

اور مطلقہ عورت کی عدت یا جس عورت کا شوہر مر گیا ہو اس کی عدت اس کے حیض یا حمل کے وہ ایام ہیں کہ جن کو وہ گنتی رہے یا چار ماہ دس دن۔ نیز وہ ایام کہ جن کو شوہر کے سوگ میں گزارے اور مہینوں اور حیض اور وضع حمل تک وہ زمانہ کہ جن میں زینت سے مجتنب رہے"

٢/٢ ١٠/١١ ٢٢/٣ ٢٨/١٧

عِدْهُمْ: تو ان سے وعدہ کر۔ تو ان کو وعدہ دے عِدٌ وَعْدٌ سے امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، واضح رہے کہ مثال واوی مجرد کے مضارع مکسور العین معروف کا

[1] تفسیر کبیر ج ۲ ص ۱۴۳ مطبوعہ مصر طبع قدیم؟

واو اصل جو فا کلمہ ہے حذف ہو جاتا ہے چنانچہ وَعَدَ یَعِدُ باب ضَرَبَ یَضْرِبُ سے ہے اس اعتبار سے اس کا مضارع معروف یَوْعِدُ ہونا چاہیے مگر قاعدہ مذکور کی بنا پر یَعِدُ ہو گیا ہے۔ اور مضارع سے واو گرا تو امر جو تابع مضارع ہے اس میں گر یگا اس بنا پر تَعِدُ سے امر کا صیغہ عِدْ ہوگا (ملاحظہ ہو تَعِدَانِنِي اور وَعَدَ) $\frac{15}{4}$

**عَدَّهُمْ**: اس نے ان کو گن رکھا ہے عَدَّ عَدٌّ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب (ملاحظہ ہو عدا) $\frac{16}{9}$

# فصل الذال المعجمة

**عَذَابٌ**: عذاب، سخت سزا، دکھ کی مار۔

علامہ فیومی المصباح المنیر میں لکھتے ہیں:-

"عَذَابٌ تَعْذِيبٌ (سزا دینا) سے اسم (یعنی حاصل مصدر ہے) اصل میں عربی زبان میں اس کے معنی مارنے کے ہیں بعد میں ہر دردناک سزا کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ اور استعارہ کے طور پر امور شاقہ کو بھی عذاب کہنے لگے چنانچہ محاورہ ہے السفر قطعة من العذاب (سفر تو عذاب کا ایک ٹکڑا ہے)

اور امام راغب مفردات القرآن میں رقمطراز ہیں:-

"عذاب کے معنی سخت دکھ دینے کے ہیں۔ اور اس میں اختلاف ہے کہ اس کی اصل کیا ہے بعض کہتے ہیں کہ عَذَبَ الرَّجُلُ فَهُوَ عَاذِبٌ وَعَذُوبٌ سے ماخوذ ہے جس کا استعمال کھانا اور سونا چھوڑ دینے کے لیے ہوتا ہے۔ لہذا تعذیب کے معنی اصل میں یہ ہوئے کہ انسان کو بھوکا رہنے اور جاگنے پر مجبور کیا جائے اور بعض کہتے ہیں کہ اس کی اصل عَذْبٌ (شیرینی اور گوارائی) ہے لہذا عَذَّبْتُهُ کے معنے ہیں اَزَلْتُ عَذْبَ حیاتہ یعنی میں نے اس کی زندگی کی شیرینی اور گوارائی کو زائل کر دیا۔ اس لحاظ سے مَرَّضْتُهُ (میں نے اس کے مرض کا ازالہ کر دیا) اور قَذَّيْتُهُ (میں نے اس کی آنکھ سے قَذًى یعنی تنکا نکال دیا) کے قاعدے پر ہے یعنی اس میں سلب ماخذ ہے۔ اور بعض یہ کہتے ہیں کہ تعذیب کے معنے اصل میں کثرت سے عَذَبَة السَّوط یعنی کوڑے کے پھندے سے مارنے کے ہیں

Marfat.com

اور بعض اہل لغت کا بیان ہے کہ تعذیب کے معنے خود مارنے کے ہیں اور بعض کا قول ہے کہ عرب کے محاورے ماءٌ عَذِبٌ سے ماخوذ ہے "ماء عذب" اس پانی کو کہتے ہیں کہ جس میں کوڑا کرکٹ ہو اور گدلا ہو گیا ہو اس صورت میں عَذَّبْتُہٗ کے معنی ہوں گے کَدَّرْتُ عَلَیْہِ عَیْشَہٗ وَ نَغَّصْتُ حیاتہ (یعنی میں نے اس کی زندگی مکدر کر دی اور اس کا جینا تنگ کر دیا)

اور علامہ سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں فرماتے ہیں :-

"ہمارے شیخ (ابوالطیب فاسی) اہل اشتقاق سے ناقل ہیں کہ عذاب کلام عرب میں عَذْبٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنے روکنے کے ہیں چنانچہ عَذَبْتُہٗ عَنْہُ کے معنی ہیں میں نے اس کو اس سے روک دیا اور عَذَبَ عُذُوْبًا کے معنی ہیں وہ رُک گیا اور آب شیریں کو عذب اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ پیاس کو روک دیتا ہے۔ اور عذاب کو بھی عذاب اسی لیے کہا جاتا ہے کہ سزا یا فتنہ کو دوبارہ اس قسم کے جرم کا ارتکاب کرنے سے روک دیتا ہے اور نہ صرف اسے بلکہ اوروں کو بھی اس کے کرنے سے باز رکھتا ہے۔"

علامہ زبیدی اس کو نقل کر کے فرماتے ہیں "وہو کلام حسن" (یہ عمدہ بات کہی ہے) اور علامہ جار اللہ زمخشری تفسیر کشاف میں ارقام فرماتے ہیں :-

"عَذَابٌ نَکَالٌ کی طرح سے ہے وزن کے لحاظ سے بھی اور معنی کے اعتبار سے بھی چنانچہ جب کوئی شخص کسی چیز سے رُک جاتا تو کہا کرتے ہیں اعذب عن الشیٔ جس طرح سے ٹھیک اسی معنی میں نکل عن الشیٔ بولتے ہیں اور اسی سے عَذْبٌ ہے کیونکہ وہ پیاس کو روک دیتا ہے اور اسے ختم کر دیتا ہے بخلاف مِلْحٌ یعنی آب شور کے کہ وہ پیاس کو اور بڑھا دیتا ہے اور اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ آب شیریں کو نُقَاخٌ بھی بولتے ہیں کیونکہ وہ تشنگی کو توڑتا ہے اور فُرَاتٌ بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ قلب پر سے پیاس کو زائل کرتا ہے۔ بعد میں اس لفظ کے اندر وسعت ہوتے ہوتے

ہر سخت درد و الم کو عذاب کہنے لگے اگرچہ وہ نکال نہ ہو یعنی گو وہ ایسی سزا نہ ہو کہ جو مجرم کو دوبارہ ارتکاب جرم سے باز رکھ سکے[۱] (یعنی اصل میں تو اس کے معنی اس سزا کے ہیں کہ جو ارتکاب جرم سے باز رکھے لیکن بعد کو کثرت استعمال کی بنا پر اس کے معنی سخت دکھ اور درد و الم کے بھی آتے ہیں)

۱/۱، ۲، ۴، ۷، ۱۰، ۱۱، ۱۳، ۱۴، ۱۵ — ۲/۳، ۴، ۵، ۶، ۹

۳/۹، ۱۱، ۱۲، ۱۷ — ۴/۲، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۳ — ۵/۱، ۵

۶/۹، ۱۰، ۱۴، ۱۵ — ۷/۳، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۴، ۱۷

۸/۳، ۷، ۱۱، ۱۵، ۱۷ — ۹/۶، ۱۱، ۱۲، ۱۸ — ۱۰/۳، ۵، ۷

۱۰/۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۸ — ۱۱/۲، ۶، ۷، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۷

۱۱/۱۳، ۱۵، ۱۶ — ۱۲/۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۷

۱۲/۱۳، ۱۴ — ۱۳/۶، ۱۳، ۱۵، ۱۶، ۱۹ — ۱۴/۳، ۱۰، ۱۲، ۱۷

۱۴/۱۳، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱ — ۱۵/۶، ۲۰ — ۱۶/۶، ۸، ۱۱، ۱۲، ۱۴، ۱۶

۱۷/۶، ۸، ۹، ۱۰، ۱۲، ۱۳، ۱۴ — ۱۸/۳، ۷، ۸، ۹، ۱۵ — ۱۹/۲، ۳، ۴، ۱۱، ۱۷

۱۹/۱۲، ۱۴، ۱۵، ۱۶ — ۲۰/۱۰، ۱۳، ۱۵ — ۲۱/۲، ۵، ۷، ۱۲، ۱۷

۲۱/۱۵، ۲۰ — ۲۲/۵، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۹

۲۳/۵، ۶، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۳، ۱۶، ۱۷ — ۲۴/۱، ۲، ۳، ۵، ۶، ۷، ۹، ۱۰، ۱۹

۲۵/۴، ۵، ۶، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷

۲۶/۲، ۳، ۴، ۱۶ — ۲۷/۱، ۳، ۹، ۱۸، ۱۹ — ۲۸/۱، ۳، ۴، ۵، ۷

۲۸/۱۰، ۱۵ — ۲۹/۱، ۲، ۳، ۷، ۹ — ۳۰/۹، ۱۰، ۱۳، ۱۴

عَذَابًا: پ ۳/۱۴ — ۴/۱۴ — ۵/۳، ۱۰، ۱۲، ۱۷ — ۶/۱، ۲، ۴

۷/۵، ۱۳ — ۸/۱۱ — ۹/۱۱ — ۱۰/۱۲، ۱۹ — ۱۴/۱۸ — ۱۵/۱، ۶ — ۱۶/۲، ۱۲

۱۸/۱۷ — ۱۹/۲، ۱۷ — ۲۱/۱۷ — ۲۲/۴ — ۲۳/۱۳ — ۲۴/۱۸ — ۲۶/۱۰، ۱۱

۲۷/۴ — ۲۸/۳، ۱۸ — ۲۹/۱۱، ۱۳، ۲۰ — ۳۰/۱، ۲

عَذَابِكُمْ: تمہارا عذاب۔ عَذَابِ مضاف كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ ۵/۱۸

عَذَابِنَا: ہمارا عذاب، ہماری مار، عَذَابِ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ ۱۹/۱۵ پ ۲۳/۹

عَذَابُهٗ: اس کا عذاب، اس کی مار اس کی عقوبت، عذاب مضاف، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ پ ۱۱/۱۰ پ ۱۵/۶ پ ۳۰/۱۴

عَذَابَهَا: اس کا عذاب، اس کی کلفت عَذَابَ مضاف، هَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ پ ۱۹/۴ پ ۲۲/۱۶

عَذَابُهُمَا: ان دونوں کا عذاب، ان دونوں کا مارنا۔ ان دونوں کی سزا۔ عَذَابُ مضاف هُمَا ضمیر تثنیہ مذکر غائب مضاف الیہ پ ۱۸/۷ ۔

[۱] تفسیر کشاف ج ۱ ص ۱۲۶ طبع قدیم مطبوعہ مصر

Marfat.com

**عَذَابِیْ**: میرا عذاب، میری مار، میری سزا عذابٌ مضاف، ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ

۹/۹، ۱۳/۱۴، ۱۴/۴

**عَذْبٌ**: شیریں، میٹھا، گوارا۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ ماءٌ عَذْبٌ کے معنی عمدہ اور ٹھنڈے پانی کے ہیں۔ عَذُوْبَۃٌ سے جس کے معنی پانی کے خوشگوار اور میٹھے ہونے کے ہیں صفت مشبہ کا صیغہ ہے، عَذَابٌ اور عُذُوْبٌ جمع، ۱۹/۲، ۲۲/۱۴

**عَذَّبَ**: اس نے عذاب کیا، اس نے سزا دی۔ تَعْذِیْبٌ سے جس کے معنی عذاب کرنے اور دردناک سزا دینے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب۔ علامہ راغب لکھتے ہیں "عَذَّبَہٗ تَعْذِیْبًا کے معنی ہیں اکثر حبسہٗ فی العذاب یعنی دیر تک اُسے عذاب میں محبوس رکھا، ارشاد ہے لَاُعَذِّبَنَّہٗ عَذَابًا شَدِیْدًا (میں اس کو سخت سزا دوں گا)، ۱۰/۱

**عَذَّبْنَا**: ہم نے عذاب دیا۔ ہم نے دردناک سزا دی تَعْذِیْبٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم ۲۶/۱۱۔

**عَذَّبْنٰہَا**: ہم نے اس کو عذاب کیا۔ ہم نے اس کو بڑی بھاری سزا دی۔ عَذَّبْنَا ماضی کا صیغہ جمع متکلم اور ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب ۲۸/۱۸

**عَذَّبَہُمْ**: اس نے اُن کو عذاب دیا، اس نے ان کو سخت سزا دی عَذَّبَ تَعْذِیْبٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ۲۸/۴

**عُذْتُ**: میں نے پناہ لی میں نے پناہ پکڑی عَوْذٌ سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم۔ عُذْتُ اصل میں عَوَذْتُ تھا واؤ متحرک ماقبل مفتوح اس لیے الف سے بدلا گیا اور الف اجتماع ساکنین کی وجہ سے حذف ہو گیا۔ پھر واؤ کی رعایت سے عین کو ضمہ دے دیا، ملاحظہ ہو اَعُوْذُ، ۲۴/۸، ۲۵/۱۴

**عُذْرًا**: عذر۔ الزام کو دور کرنا۔ سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں لکھتے ہیں عذر کے معنی معروف ہیں یعنی وہ دلیل کہ جس کے ذریعہ معذرت پیش کی جاتی ہے۔ اور علامہ فیومی مصباح میں فرماتے ہیں کہ یہ عَذَرَ یَعْذِرُ عُذْرًا فَھُوَ مَعْذُوْرٌ سے جو باب ضَرَبَ سے آتا ہے اور جس کے معنے ملامت کو رفع کرنے کے ہیں اسم یعنی حاصل مصدر

Marfat.com

ہے اور اس کی ذال پر ضمہ بھی آتا ہے اور سکون بھی، اور جمع اَعْذَارٌ ہے۔ اور امام راغب مفردات القرآن میں رقمطراز ہیں :-

بعض علماء نے کہا ہے کہ اصل میں عُذْرٌ عَذِرَةٌ سے ہے جس کے معنی نجس شے کے ہیں اور اسی لیے قلفہ (سرِ ذکر کا غلاف جس کو ختنہ میں کاٹ کر پھینک دیتے ہیں) کو عُذْرَةٌ کہتے ہیں۔ اور عَذَرْتُ الصَّبِيَّ کا استعمال بچہ کی ختنہ کرنے کے لیے ہوتا ہے پس جس طرح اس کے معنی یہ ہوئے کہ میں نے اس کو پاک کر دیا۔ اور عذرہ کو زائل کر دیا۔ اسی طرح عَذَرْتُ فُلَانًا کے معنی یہ ہیں کہ میں نے اس شخص کا قصور معاف کر کے اس کے گناہ کی نجاست کا ازالہ کر دیا اور اسی طرح سے غَفَرْتُ لَہٗ کے معنی سترت ذنبہ کے ہیں یعنی میں نے اس کے گناہ کو چھپا دیا۔"

اور ارشاد الٰہی عُذْرًا اَوْ نُذْرًا (الزام اُتارنے کو یا ڈر سنانے کو) کے متعلق علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں کہ "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں مصدر ہوں عُذْرًا لِعَذَرَ سے بمعنی بُرائی کو دور کرنے کے اور نُذْرًا، اَنْذَرَ سے جس کے معنی ڈرانے کے ہیں اور دونوں فُعْلٌ کے وزن پر ہوں جس طرح سے کہ شُکْرٌ اور کُفْرٌ ہیں۔ عُذْرًا کا مصدر ہونا تو ظاہر ہے کیونکہ فُعْلٌ مصادر ثلاثی میں سے ہے البتہ نُذْرٌ کا مصدر ہونا خلاف قیاس ہے کیونکہ اَفْعَلَ کا مصدر قاعدہ کے اعتبار سے اِفْعَالٌ ہونا چاہیے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اسم مصدر ہے جیسے کہ طَاقَةٌ ہے یا اس نَذَرَ کا مصدر ہے جو بمعنی اَنْذَرَ ہے۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں جمع ہی ہوں عُذْرًا تو عَذِيْرٌ کی جمع ہو بمعنی معذرت کے اور نُذْرًا، نَذِيْرٌ بمعنی اِنْذَارٌ (ڈرانا) کی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں صفت ہوں بمعنی عَاذِرِيْنَ (الزام اُتارنے والے) اور مُنْذِرِيْنَ (ڈرانے والے)[1]۔"

اور تفسیر کبیر میں ہے کہ :-

عُذْرًا اور نُذْرًا میں دو مسئلے بحث طلب ہیں۔ پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ اس میں دو قراتیں ہیں ایک تو تخفیف کی یعنی ذال کے سکون کے ساتھ کہ جو ابو عمرو کی اور حفص کی روایت کے

---

[1] ملاحظہ ہو روح المعانی ج ۲۹ ص ۱۸۰ طبع جدید۔

مطابق عاصم کی قرات ہے اور باقی قاریوں
نے اس کو عُذْرًا اَوْ نُذْرًا (بالتثقیل یعنی
ذال کے پیش کے ساتھ) پڑھا ہے۔ تخفیف
کی صورت میں تو اس کے مصدر ہونے میں کوئی
نزاع نہیں ہے۔ اور معنی ہیں اِعْذَارٌ
اور اِنْذَارٌ کے یعنی الزام اُتارنے اور ڈرانے
کے۔ لیکن تثقیل کی صورت میں ابو عبیدہ کا
تو یہ خیال ہے کہ یہ جمع ہے مصدر نہیں۔ اور
اخفش اور زجاج کی یہ رائے ہے کہ یہ مصدر
ہی ہیں اور ضمہ اور سکون دونوں لغتیں ہیں۔
ابو علی بھی اخفش اور زجاج ہی کی تائید کرتے
ہیں ان کا بیان ہے کہ عُذْرٌ اور عَذِیْرٌ
اور نُذْرٌ اور نَذِیْرٌ ایسے ہی ہیں
جیسے کہ نُکْرٌ اور نَکِیْرٌ۔ ابو علی نے یہ بھی کہا
ہے کہ جو لوگ عُذُرًا پڑھتے ہیں۔ ان کی قرأت
پر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عُذُرًا عَاذِرٌ کی جمع
ہو جیسے کہ شُرُفٌ شَارِفٌ کی جمع ہے اور
اسی طرح نُذُرٌ ہو سکتا ہے کہ نَذِیْرٌ کی
جمع ہو ارشاد ہے هٰذَا نَذِیْرٌ مِّنَ النُّذُرِ
الْاُوْلٰی (یہ ایک ڈر سنانے والا ہے پہلے ڈرانے
والوں کا)

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اس کے نصب میں تین
وجہیں ہیں۔ دو وجہیں تو مصدر ہونے کی
صورت میں ہیں۔

(۱) ذِکْرًا سے بدل ہے بنا بر مفعول ہے
(۲) مفعول لہ ہے اور معنی ہیں وَالْمُلْقِیَاتِ ذِکْرًا
لِلْاِعْذَارِ وَالْاِنْذَارِ (یعنی ذکر کا القاء
کرنے والے الزام اتارنے کو اور ڈرانے کو۔
(۳) اور جمع ہونے کی صورت میں نصب
اس بنا پر ہے کہ یہ اِلقاءؔ سے حال ہے اور
تقدیر عبارت یہ ہے فالملقیات ذکرا حال
کونھم عاذرین او منذرین یعنی ذکر کا
القاء کرنے والے دراں حالیکہ وہ الزام اتارنے
والے یا ڈرانے والے ہیں[1] (ملاحظہ ہو تعذر
۱۶/۱ ۲۹/۲۱۔

# فصل الراء المهملة

**عَرَاۤءِ**: چٹیل میدان کہ جس میں گھاس
علامہ فیومی نے مصباح میں اس کے معنی اس
جگہ کے لکھے ہیں کہ جہاں ماوٹ نہ ہو اور امام ال

[1] تفسیر کبیر سورۃ والصفت (

سجستانی عزیزی کے نزہتہ القلوب فی تفسیر غریب القرآن میں یہ الفاظ ہیں۔

"عَرَاء وہ کھلی جگہ ہے کہ جس میں درخت وغیرہ کی آڑ نہ لی جا سکے نیز روئے زمین کو بھی عَرَاء کہتے ہیں"

امام فخر الدین رازی نے اس کے معنی خالی جگہ کے لکھے ہیں اور ابو عبیدہ سے نقل کیا ہے کہ خالی مقام کو عَرَاء اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہاں نہ تو درخت ہوتے ہیں اور نہ اس قسم کی اور کوئی چیز ہوتی ہے کہ جو اس جگہ کو ڈھانپ سکے[1]۔ اس کی جمع اَعْرَاء ہے۔ $\frac{۲۶}{۴}$ $\frac{۲۳}{۹}$ -

**عُرُبًا**: سہاگ والیاں۔ پیار دلانے والیاں محبوبائیں۔ عَرُوْبٌ کی جمع جو بروزن فَعُوْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ ہے جس کے معنی اس عورت کے ہیں کہ جو اپنے ناز و انداز کی وجہ سے اپنے شوہر کی محبوبہ ہو نیز اپنی فراست کی بنا پر اس کی مزاج شناس بھی ہو۔ عَرَبٌ کا مادہ چونکہ اظہار کو بتاتا ہے اس بنا پر امام راغب اصفہانی نے مفردات میں اس کے معنی یہ لکھے ہیں:-

"اِمْرَأَةٌ عَرُوْبٌ وہ عورت ہے کہ جو زبانِ حال سے اپنی عفت اور اپنے شوہر کی محبت کا اظہار کرے۔ عُرُبٌ اسی کی جمع ہے"

امام محمد بن اسماعیل بخاری نے اپنی صحیح میں عُرُبًا کی تفسیر کی ہے اَلْمُتَحَبِّبَاتُ اِلٰی اَزْوَاجِهِنَّ جو اپنے شوہروں کو محبوب ہوں، امام بخاری فرماتے ہیں۔

"عُرُبٌ بالضم ہے اور اس کا واحد عَرُوْبٌ ہے جیسے کہ صَبُوْرٌ اور صُبُرٌ ہیں عَرُوْبٌ کو اہل مکہ عَرِبَةٌ کہتے ہیں اور اہل مدینہ غَنِجَةٌ اور اہل عراق شَكِلَةٌ"[2]

اور ابن ابی حاتم نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے کہ اس کے معنی شیریں کلام کے ہیں اور بطریق جعفر بن محمد عن ابیہ عن جدہ مرفوعاً خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ نقل کیا ہے کہ عُرُبٌ کے معنی ان عورتوں کے ہیں جن کی زبان عربی ہو۔ لیکن حافظ ابن حجر عسقلانی نے تصریح کی ہے کہ یہ روایت ضعیف اور منقطع ہے۔ اور طبری نے تمیم بن حذلم سے عَرِبَةٌ کے معنی ایسی عورت کے نقل کیے ہیں کہ جو شوہر کی

---

[1] تفسیر کبیر۔ ج ۷، ص ۱۶۵

[1] صحیح بخاری کی تفسیر سورہ الواقعہ۔

[2] اور علامہ آلوسی لکھتے ہیں کہ لعل هذا اصح و التفسير بالمتحببات هو الذى عليه الاكثر يعنى میں اسے صحیح نہیں خیال کرتا۔ اور محبوباؤں کی تفسیر پر ہی اکثر علماء ہیں (روح المعانی ج ۲۷۔ ص ۱۳۲ طبع مصر۔

Marfat.com

اطاعت گزار ہو اور فرمانبردار ہو اور عبداللہ بن عبید بن عمیر مکی سے یہ نقل کیا ہے کہ عَرِبَۃٌ وہ عورت ہے جو اپنے شوہر کو چاہے [1]

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر ان الفاظ میں فرمائی ہے:-

العرب العواشق یعنی عُرُبٌ کے معنی ہیں وہ
لازواجھن و عورتیں کہ جو اپنے شوہروں
ازواجھن لھن کی عاشق ہوں اور ان کے
عاشقون۔ شوہر ان کے عاشق ہوں

حافظ ابن کثیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مذکورہ بالا تفسیر کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن سرجس، مجاہد، عکرمہ، ابو العالیہ یحیٰی بن ابی کثیر، عطیہ، حسن البصری، قتادہ اور ضحاک وغیرہ نے بھی یہی کہا ہے [2] $\frac{۲۷}{۱۴}$

عَرَبِیٌّ: عربی۔ جو عرب کی طرف منسوب ہو یا اسم منسوب ہے۔ اور یا اس میں نسبت کے لیے ہے۔ علامہ ناصر بن عبدالسید مطرزی۔ المغرب میں لکھتے ہیں:-

"عَرَبِیٌّ "عرب" کا واحد ہے "عرب" وہ لوگ ہیں جو ملک عرب کے شہروں اور دیہاتوں کے باشندے ہیں"

اور علامہ فیومی مصباح میں ارقام فرماتے ہیں:-

"لفظ "عرب" اسم مونث ہے۔ اسی لیے اس کی صفت بھی مونث آتی ہے چنانچہ بولتے ہیں العرب العاربۃ، العرب العرباء عرب وہ ہیں جو عجم کے سوا ہیں اور "رجل عربی" وہ شخص ہے جس کا نسب عرب میں ثابت ہو گو وہ فصیح نہ ہو"

امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں لفظ عربی کے حسب ذیل معانی سپرد قلم فرمائے ہیں

۱۔ المفصح یعنی وہ شخص جو فصاحت اور صفائی کے ساتھ اظہار مدعا کر سکے۔

۲۔ الفصیح البین من الکلام یعنی وہ کلام جو فصیح اور صاف ہو چنانچہ آیات ذیل میں عَرَبِیٌّ سے یہی مراد ہے قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا، بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ، فُصِّلَتْ اٰیٰتُہٗ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا۔

۳۔ حُکْمًا عَرَبِیًّا کے معنی ہیں وہ صاف اور واضح حکم جو حق کو حق کر دکھائے اور باطل کو باطل

---

[1] ملاحظہ ہو فتح الباری ج۔ ۶ ص ۲۲۸ طبع میریہ مصر۔

[2] تفسیر ابن کثیر ج ۴۔ ص ۲۹۲۔ طبع مصر ۱۳۴۷ھ۔

۱۲/۲۰ ۱۹/۱۵ ۲۴/۱۹ عَرَبِیًّا ۱۲/۱۱ ۱۳/۱۱ ۱۲/۱۵
۲۳/۱۰ ۲۴/۱۵ ۲۵/۲،۷ ۲۶/۲

عُرْجُوْنِ، کھجور کی ٹہنی، شاخ خرما۔ عرجون اصل میں کھجور کے گچھے کی وہ شاخ ہے جس میں اس گچھے کی جڑ ہوتی ہے یہ ٹیڑھی ہوتی ہے اور گچھے کو کاٹ لینے کے بعد درخت پر خشک ہو کر باقی رہتی ہے عَرَاجِیْن۔ جمع۔ علامہ محمود آلوسی فرماتے ہیں:۔

"عُرجُون کا نون جیساکہ زجاج نے بیان کیا ہے زائد ہے اور اس کا وزن فُعلُوْن ہے۔ یہ اِنْعِرَاجْ سے بنا ہے جس کے معنی ٹیڑھے ہونے اور مڑ جانے کے ہیں۔

اور ایک جماعت اس طرف گئی ہے اور یہی راغب اور سمین اور صاحب قاموس کا مختار ہے کہ اس کا نون اصلی ہے اس صورت میں اس کا وزن فُعْلُوْل ہے۔[1]"

۲۴/۲

عَرْش، عرش، تخت شاہی۔ امام ابوبکر عزیزی سجستانی نزہۃ القلوب میں فرماتے ہیں:۔

"عرش کے معنی تخت شاہی کے ہیں چنانچہ آیت ذیل میں عرش سے یہی مراد ہے وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَی الْعَرْشِ (اور اونچا بٹھایا اپنے ماں باپ کو تخت پر) اور فرمایا اَهٰكَذَا عَرْشُكِ (کیا تیرا تخت بھی ایسا ہی ہے)"

اور امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں رقمطراز ہیں۔

"عرش اصل میں مُسَقَّف شئے کو کہتے ہیں اور اس کی جمع عُرُوْش ہے۔ ارشاد ہے وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا (اور وہ اپنی چھتریوں کے بل گرا پڑا تھا) اور اسی اعتبار سے عَرَشْتُ الْكَرْمَ اور عَرَّشْتُ الْكَرْمَ کے معنی انگور کی بیلوں کے لیے ٹٹیاں اور چھتریاں لگانے کے آتے ہیں۔ ارشاد ہے مَعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ (ٹٹیوں پر چڑھائے ہوئے اور بغیر چڑھائے ہوئے) اور مِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ (درختوں میں اور جہاں چھتریاں ڈالتے ہیں) اور وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ میں یَعْرِشُوْنَ کے معنی ابوعبیدہ نے یَبْنُوْنَ کے کیے ہیں یعنی جو عمارتیں وہ بناتے تھے۔

اور بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ کو بھی اسی اعتبار سے عرش کہتے ہیں کہ وہ بلند ہوتی ہے چنانچہ

[1] روح المعانی۔ ج ۲۳۔ ص ۲۰۔

Marfat.com

ارشاد ہے وَرَفَعَ اَبَوَیْہِ عَلَی الْعَرْشِ اَھٰکَذَا عَرْشُکِ نَکِّرُوْا لَھَا عَرْشَھَا۔ اَیُّکُمْ یَاْتِیْنِیْ بِعَرْشِھَا۔

اور کبھی عرش عزت غلبہ اور سلطنت سے بھی کنایہ ہوتا ہے محاورہ ہے فلان ثُلَّ عرشہ۔ یعنی فلاں کی عزت خاک میں مل گئی اور بیان کیا جاتا ہے کہ کسی شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا تو اُن سے پوچھا کہ خدا کا آپ کے ساتھ کیا معاملہ رہا جواب دیا لولا ان تدارکنی اللہ برحمتہ لَثُلَّ عرشی اگر خدا اپنی رحمت سے میری دستگیری نہ فرماتا تو بس میری عزت ختم تھی۔

اور "عرش اللہ" کے متعلق بشر کو بجز نام کے اس کی کچھ حقیقت معلوم نہیں اور عوام کے اوہام اس بارے میں جس طرف جاتے ہیں وہ صحیح نہیں کیوں کہ اس صورت میں عرش ذات باری کا حامل ہوگا نہ کہ محمول، حالانکہ ذات الٰہی اس سے بالاتر ہے (کہ کوئی چیز اُسے اُٹھائے) خود حق تعالےٰ کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰہَ یُمْسِکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا وَلَئِنْ زَالَتَا اِنْ اَمْسَکَھُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْ بَعْدِہٖ (بلاشبہ اللہ تھام رہا ہے آسمانوں کو اور زمین کو کہ ٹل نہ جائیں اور اگر ٹل جاویں تو اس کے سوا کوئی تھام نہیں سکتا)

اور ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ عرش فلک اعلیٰ (آسمان نہم) ہے اور کرسی فلک ثوابت (یعنی آسمان ہشتم) یہ گروہ اس روایت سے استدلال کرتا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ وسلم سے منقول ہے کہ ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہیں جیسے جنگل بیابان میں کوئی انگوٹھی پڑی ہو اور یہی حال کرسی کا عرش کے مقابلہ میں ہے۔

اور یہ جو ارشاد ہے وَکَانَ عَرْشُہٗ عَلَی الْمَآءِ (اور تھا تخت اس کا پانی پر) یہ اس پر تنبیہ ہے کہ "عرش" جب سے وجود میں آیا پانی کے اوپر ہی رہا۔

اور ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدُ (مالک تخت کا بڑی شان والا) اور رَفِیْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ (درجوں کو بلند کرنے والا تخت کا مالک) نیز اسی طرح کی جو اور آیات ہیں ان کے

Marfat.com

متعلق کہا گیا ہے کہ یہ حق تعالیٰ شانہٗ کی سلطنت و مملکت کی طرف اشارہ ہے اور اس کے مستقر کا بیان نہیں ہے کیوں کہ اس کی ذاتِ عالی اس سے بالا ہے"

اور امام ابوبکر احمد بن الحسین البیہقی المتوفی ۴۵۸ھ کتاب الاسماء والصفات میں لکھتے ہیں۔

مفسرین کے اقوال یہی ہیں کہ عرش سے مراد تخت ہی ہے اور یہ ایک جسم مجسم ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے اور فرشتوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اُسے اُٹھائے رکھیں اور اس کی تعظیم اور طواف کے ذریعہ عبادت کو بجا لائیں، جس طرح سے کہ زمین میں اس نے ایک گھر پیدا فرمایا اور بنی آدم کو حکم دیا کہ اس کا طواف کریں اور نماز میں اس کی طرف منہ کیا کریں" [۱]

اور امام عبدالوہاب شعرانی الیواقیت والجواہر فی عقائد الاکابر میں یارقام فرماتے ہیں:۔

اگر تم یہ سوال کرو کہ عَرْش کو عظیم، کریم اور مجید تین ناموں سے موسوم کرنے کی کیا وجہ ہے کیا یہ الفاظ مترادف ہیں یا نہیں۔

تو جواب یہ ہے کہ یہ مترادف نہیں ہیں بلکہ عرش کو اگر اس کے احاطہ کی حیثیت سے دیکھو تو "وہ عظیم" ہے کیوں کہ سب اجسام سے بڑا ہے اور اس حیثیت سے کہ اس کو ان سب پر فوقیت دی گئی ہے کہ جن کا وہ احاطہ کیے ہوئے ہے وہ کریم ہے اور اس حیثیت سے کہ کوئی اور جسم اس کا احاطہ کر سکے اس سے وہ بالا ہے وہ "مجید" ہے۔ [۲]

پ ۸/۱۴ ، پ ۱۱/۶،۵ ، پ ۱۳/۷،۵ ، پ ۱۵/۵ ، پ ۱۶/۱۰ ، پ ۱۷/۲ ، پ ۱۸/۶،۵
پ ۱۹/۱۷،۳ ، پ ۲۱/۱۴ ، پ ۲۴/۷،۹،۵ ، پ ۲۵/۱۳ ، پ ۲۷/۱۲ ، پ ۲۹/۵
پ ۳۰/۱۰،۶

**عَرْشُكِ** : تیرا تخت، عرش مضاف ضمیر واحد مؤنث حاضر مضاف الیہ، پ ۱۹/۱۸

**عَرْشُهٗ** : اس کا عرش عَرْشُ مضاف، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ پ ۱۲/۱

**عَرْشِهَا** : اس کا تخت، عَرْشِ مضاف ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ پ ۱۹/۱۸

**عَرَضٌ** : مال متاع، سامان، اسباب، امام راغب مفردات القرآن میں لکھتے ہیں:

"عَرَض وہ ہے جس کو ثبات نہ ہو متکلمین جو

[۱] کتاب مذکور ص ۲۸۱ طبع انوار احمدی الہ آباد

[۲] کتاب مذکور۔ ج ۱۔ ص ۹۱ طبع مصر

Marfat.com

۔عرض" کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ عرض وہ ہے
جس کا قیام بغیر جوہر کے نہ ہو جیسے کہ رنگ اور
مزہ ہے سو یہ تعریف اسی سے مستعار ہے اور
یہ جو بولا جاتا ہے الدنیا عرض حاضر (جو
مال متاع اب ہے اس کا نام دنیا ہے) یہ بھی
دنیا کی بے ثباتی ہی بتانے کے لیے ہے ارشاد
ہے تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ
يُرِيدُ الْآخِرَةَ (تم چاہتے ہو جنس دنیا کی اور اللہ
چاہتا ہے آخرت) اور فرمایا ۔يَأْخُذُونَ
عَرَضَ هٰذَا الْأَدْنٰى (لیتے ہیں
اسباب اس ادنیٰ زندگی کا) اور لَوْ كَانَ
عَرَضًا قَرِيبًا کے معنی ہیں، اگر کچھ آسان سا
مطلب ہوتا"

اور علامہ سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس من
جواہر القاموس میں ارقام فرماتے ہیں :۔
"عَرَضٌ کے معنی ہیں دنیا کے مٹ جانے
والے مال و متاع کے اور عَرْضٌ سکون را
کے ساتھ سونے چاندی کے علاوہ جو کچھ بھی
دنیوی اثاثہ اور ساز و سامان ہوتا ہے اس کو
کہتے ہیں اور جمع عُرُوضٌ آتی ہے ۔لہٰذا
ہر عَرْضٌ، عَرَضٌ ہے اور ہر عَرَضٌ، عَرْضٌ

نہیں اور جو کچھ بھی تھوڑا بہت مال ہو اس کو
۔عرض الدنیا" بولتے ہیں، صحاح میں شل
نقل کی ہے الدنیا عَرَضٌ حاضِرٌ یاکُلُ
مِنْہُ البَرُّ والفَاجِرُ (دنیا موجودہ مال و متاع
کا نام ہے جس میں سے نیک بھی کھاتا ہے اور
بدکار بھی) لیکن یہ مرفوع حدیث ہے جس کے
راوی حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ
ہیں، ایک اور حدیث ہے لیس الغنی
عن کثرۃ العرض انما الغنی غنی
النفس (غنا دنیوی مال و اسباب کی زیادتی
کا نام نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ "غنا" تو اصل
میں دل کا غنی ہونا ہے) اصمعی نے کہا ہے
کہ دنیا کا ناپائیدار اثاثہ اور جو کچھ انسان دنیا
میں حاصل کر لیتا ہے وہ عرض ہے اور ارشاد
الٰہی يَأْخُذُونَ عَرَضَ هٰذَا الْأَدْنٰى
يَقُولُونَ سَيُغْفَرُ لَنَا (اس دنیا کے دنی
مال و متاع لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری
ضرور مغفرت ہو جائے گی) ان کے فیصلوں کے بارے
میں ان کے رشوت لینے کا بیان ہے اور
ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ جمیع متاع الدنیا
عرض بفتح الراء یعنی عَرَض را کے زبر کے

دنیا کے سارے مال و اسباب کو کہتے ہیں۔
اور لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا میں عَرَض
سے مراد مال غنیمت ہے نیز عَرَض کے معنی طمع
کے بھی آتے ہیں"
دنیوی اثاثہ کو عَرَض کیوں کہتے ہیں اس کی وجہ
قاضی شوکانی نے یہ لکھی ہے۔

وسمی متاع الدنیا عرضا — متاع دنیوی کا نام عرض
لانه عارض زائل — اس لیے پڑا کہ وہ بھی عارضی
غیر ثابت۔ — فانی اور زوال پذیر ہوتی ہے

۵/۱۰، ۹/۱۱، ۱۰/۵، ۱۸/۱۰ عَرَضًا ۱۰/۱۲

عُرِضَ : وہ پیش کیا گیا، وہ روبرو لایا گیا،
عَرْض سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب
(ملاحظہ ہو تُعْرَضُونَ اور عَرْضًا) ۳۲/۱۲

عَرْضًا : روبرو لانا۔ پیش کرنا، عَرَضَ يَعْرِضُ
کا مصدر ہے یہ لازم اور متعدی دونوں طرح
مستعمل ہے یعنی پیش ہونا اور پیش کرنا، لیکن
یہاں یہ متعدی ہے۔ ۱۶/۲

عَرَّضْتُمْ : تم نے پردہ میں بات کی تم نے
اشارتاً کنایتاً کہا۔ تم نے مبہم کہا تعریض سے جس
کے معنی بغیر کھولے بات کہہ دینے کے ہیں ماضی کا
صیغہ جمع مذکر حاضر۔ امام ابوجعفر بیہقی تاج المصادر
میں تعریض کا ترجمہ لکھا ہے "سخن سربستہ
گفتن" اور امام ابوبکر محمد بن عزیز سجستانی
نزہۃ القلوب میں لکھتے ہیں۔

التعریض الایماء — تعریض کے معنی ہیں بغیر
والتلویح من — کھولے اور صاف بتائے
غیر کشف ولا — کسی بات کو ایماء و اشارہ میں
تبیین۔ — کہہ ڈالنا۔

اور علامہ راغب اصفہانی مفردات القرآن
میں فرماتے ہیں:

التعریض کلام — "تعریض" وہ گفتگو ہے جس
له وجهان من — کے دو پہلو ہوں ایک صحیح
صدق وکذب — دوسرا غلط یا ایک ظاہری
او ظاهر وباطن — پہلو ہو اور دوسرا باطنی

اور قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی تفسیر مظہری
میں رقمطراز ہیں۔

التعریض من — "تعریض" وہ کلام ہے جس سے
الکلام ما یفهم به — سننے والا کہنے والے کی مراد
السامع مراد المتکلم — سمجھ جائے حالانکہ لفظ اس
من غیر ان یکون — مراد کے لیے نہ حقیقتاً وضع

له فتح القدیر۔ ج ۱۔ ص ۴۶۴ طبع مصر۔

Marfat.com

اللفظ بوضوحا المرادہ کیا گیا ہو نہ مجاز؟ حقیقۃ ولا مجازا[1]

اور امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں یوں رقم فرماتے ہیں - تعریض لغت میں تصریح کی ضد ہے اور اس کے معنی ہیں اپنے کلام میں ایسی چیز کو لے آنا کہ جو اپنے مقصود پر بھی دلالت کی صلاحیت رکھتی ہو اور غیر مقصود پر بھی مگر جانبِ مقصود کی طرف اس کی رہنمائی زیادہ مکمل اور زیادہ راجح ہو - یہ اصل میں عرض الشیئ سے ماخوذ ہے جس کے معنی جانب اور کنارے کے ہیں - گویا تعریض کرنے والا شخص اپنے مقصد کے گرد گھومتا تو ہے مگر اسے ظاہر نہیں کرتا اس کی مثال یہ ہے کہ ایک حاجتمند شخص ایک شخص سے کہ جو اس کی حاجت برآری کر سکتا ہو کہنے لگے میں تو حضور کے سلام کو حاضر ہوتا ہوں، اور محض آپ کی زیارت کو آیا ہوں اسی معنی میں یہ مصرع ہے - ع

وحسبك بالتسليم منى تقاضيا رتجھ سے تقاضے کو میرا سلام کافی ہے) اور تعریض کو کبھی تلویح سے بھی موسوم کرتے ہیں کیوں کہ (تلویح کے معنی اشارہ کرنے کے ہیں) اور تعریض متکلم کی مراد کی طرف اشارہ ہوتا ہے -

"کنایہ" اور "تعریض" میں فرق یہ ہے کہ کنایہ کسی شے کا اس طرح ذکر کرنا ہے کہ اس کے لوازم کو ذکر کر دیا جائے مثلاً فلاں طویل النجاد (لمبے پر تلے والا) اس کے طویل القامت ہونے سے "کنایہ" ہو اور کثیر الرماد (بڑی راکھ والا) اس کے بڑے مہمان نواز ہونے سے[2] اور "تعریض" یہ ہے کہ تم ایسی بات ذکر کرو جس میں تمہارے مقصود کا بھی احتمال ہو اور غیر مقصود کا بھی مگر تمہارے قرائن احوال اسی بات کے موید ہوں کہ اسے تمہارے ہی مقصود پر محمول کیا جائے[3]"

بعض محققین نے ثابت کیا ہے کہ تعریض اور کنایہ میں عموم خصوص من وجہ ہے[4] چنانچہ حاجتمند کا

---

[1] تفسیر مظہری ج ۱ ص ۳۴۰ طبع دہلی [2] ظاہر ہے کہ جو طویل القامت ہوگا اس کے لیے لازم ہے کہ پر تلا بھی لمبا ہی رکھے، اسی طرح جو بڑا مہمان نواز ہوگا اس کے یہاں کھانا بھی خوب پکے گا جس کا لازمی نتیجہ ہے کہ اس کے چولہوں کی راکھ بھی بہت ہوگی - منہ [3] تفسیر کبیر ج ۲ ص ۲۹۸ طبع قدیم [4] عموم خصوص منہ وجہ کے لیے ملاحظہ ہو لفظ (رسول)

Marfat.com

یہ کہنا کہ جیسے لاسلم علیک (میں آپ کے سلام کو حاضر ہوا ہوں) کنایہ بھی ہے اور تعریض بھی اور نہ یہ طویل النجاد کنایہ ہے تعریض نہیں اور مثلاً ایک شخص تمہیں ایذا دیتا ہے اور تم اس کی موجودگی میں بغیر اس کو مخاطب کیے کہتے ہو آذیتنی فستعرف (تو نے مجھے ستایا ہے مگر اب تجھے پتہ چلے گا) یہ موذی کو تعریض کی صورت میں دھمکی ہے مگر کنایہ یہ نہیں ہے[1]۔

یہاں تعریض سے مراد ہے عورت کو اس کی عدت میں در پردہ اپنے سے نکاح کا پیغام سنا دینا۔ شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی موضح القرآن میں لکھتے ہیں:-

لیعنی عورت ایک خاوند سے چھوٹی ہے اور عدت میں ہے تب تک کسی اور کو روا نہیں کہ اس سے نکاح باندھ لیوے یا صاف وعدہ کر رکھے مگر دل میں نیت رکھے کہ یہ فارغ ہو گی تو میں نکاح کروں گا یا اس کو پردہ میں سنا رکھے تا اس سے پہلے کوئی اور نہ کہہ بیٹھے پردہ (یعنی تعریض) یہ کہ ایک بات کہہ دے مروج سی، مثلاً عورت کو کہے کہ تجھ کو ہر کوئی عزیز کرے گا یا کہے مجھ کو ارادہ نکاح ہے"

$\frac{۲}{۱۴}$

**عَرَضْنَا**: ہم نے پیش کیا، ہم نے روبرو کیا، عَرْضٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم (ملاحظہ ہو عَرْضًا، $\frac{۱۶}{۶}$، $\frac{۲۲}{۶}$)

**عُرِضُوْا**: وہ پیش کیے گئے، وہ روبرو کیے گئے عَرْضٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر غائب

$\frac{۱۵}{۱۸}$

**عُرْضَةً**: نشانہ، ہتھکنڈا، آڑ، علامہ سید محمود آلوسی حنفی روح المعانی میں لکھتے ہیں۔

"عُرْضَةٌ بروزن فُعْلَةٌ بمعنی مفعول ہے جیسے کہ قُبْضَةٌ اور غُرْفَةٌ ہیں اور یہ یہاں یا تو عرض الشیٔ سے ہے جو باب نَصَرَ یا ضَرَبَ سے ہے، اور اس کے معنی ہیں جعلہ معترضا یعنی اس چیز کو آڑ بنا لیا یا عرضہ للبیع عرضا سے جو باب ضَرَبَ سے مستعمل ہے اور جس کے معنی آتے ہیں کسی چیز کو فروخت کے لیے پیش کر دینا، اور سودے کے لیے لا کھڑا کرنا"[2]

اور علامہ ابوبکر بن العربی، احکام القرآن میں

[1] تفسیر روح المعانی ج ۲ ص ۱۵۰

[2] الیضاً ج ۲ ص ۱۲۱

عُرْضَةً کی شرح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"ع۔ ر۔ ض کا مجموعہ عربی زبان میں مختلف معانی میں گردش کرتا رہتا ہے مگر ان سب معانی کا مرجع ہے منع کرنا، کیونکہ جو چیز بھی عارض ہو جاتی ہے وہ مانع بن جاتی ہے چنانچہ آسمان پر جو ابر چھا جاتا ہے اس کو اسی لیے عارض کہتے ہیں کہ وہ آسمان چاند، سورج اور ستاروں کے دیکھنے سے مانع ہوتا ہے۔ محاورہ ہے هٰذَا عُرْضَةٌ یعنی یہ تو تمہارا بہانہ اور ہتھکنڈا ہے جیسے تم پر اس چیز کے لیے کام میں لا سکتے ہو جو تمہیں در پیش ہو" [1]

آیہ شریفہ لَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ (اور اللہ کو اپنی قسموں کے لیے آڑ (یا بہانہ) نہ بناؤ) کی دو تفسیریں کی ہیں ایک یہ کہ کسی اچھے کام کے نہ کرنے پر خدا کی قسم نہ کھا بیٹھو اور جب اس کے کرنے کو کہا جائے تو پھر قسم کی آڑ نہ لو، اس تفسیر پر عُرْضَةً کے معنی ہوئے مانع اور آڑ کے اور دوسری یہ کہ مطلب نکالنے کے لیے بات بات پر اللہ کی قسم نہ کھایا کرو کہ اس صورت میں اللہ کا باعزت نام تمہاری قسموں کا نشانہ بن جائیگا۔ اور تم ہر وقت قسم کے ذریعہ کام نکالنے کی فکر میں لگے رہو گے اس تفسیر پر عُرْضَةً کا ترجمہ ہتھکنڈا، نشانہ اور بہانہ کرنا چاہیئے۔ بہر حال آیہ شریفہ میں دونوں باتوں کی ممانعت ہے۔

۲/۱۲

**عَرْضُهَا** : اس کی وسعت، اس کا چوڑاؤ، اس کا پھیلاؤ، عرضُ مضاف، ھا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، امام ابوبکر سجستانی نے لکھا ہے کہ عَرضُ کے معنی یہاں وسعت کے ہیں اور اس سے مراد وہ عرض نہیں ہے جو طول کے خلاف ہے [2] لیکن امام راغب اصفہانی، مفردات القرآن میں فرماتے ہیں:۔

"آیہ شریفہ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (اور جنت جس کا پھیلاؤ ہے آسمان اور زمین) میں بعض نے تو یہ کہا ہے کہ یہ وہی "عرض" ہے جو طول کے برخلاف ہے اور اس کے تصور کی مختلف صورتوں میں سے ایک یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ جنت کی چوڑائی عالم آخرت میں اتنی ہوگی جتنی کہ اس عالم میں آسمانوں اور زمین کی ہے

---

[1] احکام القرآن، از ابن العربی، ج ۱۔ ص ۴، طبع مصر ۱۳۳۱ھ [2] نزہتہ القلوب۔

Marfat.com

کیوں کہ ارشاد ہوتا ہے یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ (جس روز دوسری زمین بدل دی جاوے گی اس زمین کے علاوہ اور آسمان) اور یہ بالکل ممکن ہے کہ آسمان اور زمین عالم آخرت میں موجود عالم سے بہت بڑے ہوں۔

اور بعض یہ کہتے ہیں کہ عرض سے مراد اس کی وسعت (یعنی گنجائش) ہے لیکن پیمائش کے لحاظ سے نہیں بلکہ مسرت اور خوشی کے اعتبار سے جس طرح سے کہ اس کے بالکل بخلاف مفہوم میں یہ محاورہ مستعمل ہے الدنیا علی فلان حلقۃ خاتم و کفۃ حابل (دنیا فلانے پر انگشتری کے حلقہ اور شکاری کے جال کی طرح تنگ ہو گئی ہے) اور اسی طرح یہ بھی محاورہ ہے سعۃ ھٰذہ الدار کسعۃ الارض (اس گھر کی وسعت تو روئے زمین کی وسعت کے برابر ہے)

اور بعض کہتے ہیں کہ عرض یہاں عرض البیع سے ماخوذ ہے کہ جب کوئی چیز کسی سامان کے عوض بیع ڈال جاتی ہے تو بولتے ہیں بیع کذا بالعرض یعنی یہ چیز اس سودے کے عوض فروخت کی گئی۔ اس صورت میں عرض کے معنی اس کے بدلے اور عوض کے ہوں گے جس طرح کہ بولا جاتا ہے عرضت ھذا الثوب کذا وکذا (اس کپڑے کا معاوضہ یعنی معاوضہ یہ ہے)" $\frac{۴}{۵}$ $\frac{۲۷}{۱۹}$

**عَرَضْنٰهُمْ**: اس نے ان کو پیش کیا۔ اس نے ان کو روبرو کیا۔ اس نے ان کو سامنے کیا۔ عَرَضْ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب (ملاحظہ ہو عَرْضًا) $\frac{۱}{۴}$

**عُرْفٌ**: پسندیدہ کام۔ نیک کام۔ نیکی عَرَفَ یَعْرِفُ سے جس کا استعمال جاننے پہچاننے کے لیے ہوتا ہے بروزن فُعْلٌ اسم ہے بمعنی مَعْرُوْفٌ کے۔ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| العرف والعارفۃ | عُرْفٌ، عَارِفَۃٌ اور مَعْرُوفٌ |
| والمعروف ھو کل | ہر اس امر کو کہتے ہیں جس کے |
| امر عرف انہ لابد | متعلق معلوم ہو کہ اس کا کرنا |
| من الاتیان بہ و | ضروری اور اس کا ہونا |
| ان وجودہ خیر | اس کے نہ ہونے سے |
| من عدمہ لہ | بہتر ہے۔ |

لہ تفسیر کبیر ج ۴ ص ۹۵ مطبوعہ مصر طبع قدیم۔

Marfat.com

قاضی شوکانی نے "عرف" کے معنی لکھتے ہر وہ اچھی خصلت جس کو عقل پسند کرے اور جی اس پر مطمئن ہو"۔ [۱]

$\frac{۹}{۱۴}$

**عُرْفًا**: نیکی، احسان، بخشش، متواتر پے بہ پے "عرف" کا استعمال دو معنی میں ہوتا ہے ایک معنی معروف یعنی نیکی اور نیک کام اور دوسرے معنی پے در پے کے، محاورہ ہے جاء القوم عرفًا عرفًا یعنی لوگ پیاپے اور لگاتار ایک دوسرے کے پیچھے آئے۔ اس معنی میں یہ عُرف الفرس سے ماخوذ ہے "عرف فرس" گھوڑے کے ایال کو کہتے ہیں یعنی جس طرح ایال کے بال لگاتار ایک دوسرے کے پیچھے ہوتے ہیں اسی طرح لوگوں کی آمد ورفت ہوئی۔ آیۂ کریمہ وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا میں ملون معنی کئے گئے ہیں یعنی نیکی اور خوبی کے ساتھ بھیجی ہوئی یا پے در پے بھیجی ہوئی، اس کے منصوب ہونے کی چار وجہیں ہوسکتی ہیں (۱) مفعول لہ ہونے کی بنا پر منصوب ہو یعنی المرسلات لاجل العرف اس صورت میں "عرف" بمعنی خوبی و احسان ہوگا (۲) حال ہو بمعنی متتابعۃ (پیاپے) یعنی اس حال میں بھیجی گئیں کروہ پے بہ پے تھیں (۳) عُرفًا مفعول مطلق ہو بمعنی مصدر اور ارسال کے معنی دے یعنی المرسلات ارسالاً اس صورت میں بھی ارسالاً بمعنی لگاتار اور پیاپے ہی کے ہوگا۔ (۴) منصوب ہو بنزع خافض بمعنی المرسلات بالعرف اس صورت میں عرف بمعنی معروف ہوگا۔ [۲]

$\frac{۲۹}{۲۱}$

**عَرَّفَ**: اس نے جتلا دیا۔ اس نے پہچنوا دیا تعریفٌ سے جس کے معنی آگاہ کرنے، جتلانے اور پہچنوانے کے ہیں۔ ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب۔

$\frac{۲۵}{۱۹}$

**عَرَفٰتٍ**: عرفات، مشہور مقام کا نام ہے جہاں عرفہ کے دن وقوف کرنا حج کا اہم ترین رکن ہے۔ تعجب ہے کہ امام سیوطی نے اپنی کتاب الاتقان فی علوم القرآن کی "النوع التاسع و الستون میں جوان اسماء کے بیان میں ہے کہ جن کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے عرفات کا نام نہیں لیا۔ حالانکہ جمع کا ذکر کیا ہے اور وہ قرآن پاک میں مزدلفہ کے لیے استعمال نہیں ہوا ہے ملا احمد فیومی المصباح المنیر میں لکھتے ہیں کہ اس کے اور مکہ معظمہ کے مابین تقریبًا نو میل کا فاصلہ یا ان

[۱] فتح القدیر۔ ج ۲۔ ص ۲۶۶۔ طبع مصر۔

[۲] ملاحظہ ہو فتح القدیر از قاضی شوکانی ج ۵ صہ ۳۴

کیا جاتا ہے۔ لیکن صاحب قاموس نے تصریح کی ہے کہ عرفات مکہ مکرمہ سے بارہ میل پرہے اور سید مرتضیٰ زبیدی نے اس کی شرح میں لکھا ہے کہ جغرافیہ نویسوں کی بھی یہی تحقیق ہے۔ قاموس میں یہ بھی ہے کہ جوہری نے غلطی سے اس کو منیٰ کا ایک مقام بتایا ہے۔ زبیدی لکھتے ہیں اسی طرح اور لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ یہ مکہ مکرمہ کا ایک مقام ہے یہ بھی غلط ہے ہاں اگر اس سے یہ مقصود ہے کہ منیٰ یا مکہ معظمہ کے قریب ہے تو صحیح ہے۔ عرفات کی وجہ تسمیہ کے بارے میں تاج العروس میں حسب ذیل اقوال مذکور ہیں :-

(۱) چونکہ جنت سے نکلنے کے بعد حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام کا دنیا میں پہلا تعارف اسی مقام پر ہوا تھا اس لیے اس کا نام "عرفات" ہوا۔

(۲) حضرت جبریل علیہ السلام جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مناسک حج کی تعلیم دے چکے تو اسی مقام پر انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ اَعَرَفْتَ اَعَرَفْتَ (کیا تم نے جان لیا، کیا تم نے جان لیا) اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں فرمایا تھا عَرَفْتُ عَرَفْتُ (میں نے جان لیا، میں نے جان لیا)

(۳) چونکہ یہ مقام مقدس اور معظم ہے اس لیے عرفات کہلایا یعنی کہ کَاَنَّھَا عُرِفَتْ گویا وہ خوشبودار کر دیا گیا۔ عُرْفٌ کے معنی عربی میں خوشبو کے بھی آتے ہیں۔

(۴) لوگوں کا اس مقام پر باہم تعارف ہوتا ہے۔

(۵) دعا اور عبادت کے ذریعہ لوگ اللہ تعالیٰ سے متعارف ہوتے ہیں چنانچہ اسی اعتبار سے "عرف ملائیکہ" کے معنی مرغے کی کلغی کے آتے ہیں۔ روح المعانی میں ایک اور وجہ بھی لکھی ہے کہ اس کے علاوہ رفعت کی بنا پر اس کا نام "عرفات" پڑا۔

اس کے بعد علامہ آلوسی مصنف روح المعانی لکھتے ہیں کہ :-

تسمیہ میں جمع کے لفظ کو مبالغہ کے واسطے اختیار کیا گیا ہے گویا ایک "عرفات" نہیں بلکہ وجوہ مذکورہ کی بنا پر متعدد "عرفات" ہیں اور محققین کے نزدیک عرفات قطعی طور پر اسماء مرتجلہ میں سے ہے۔" [1]

---

[1] روح المعانی۔ ج ۲۔ ص ۸۸۔

علامہ ابو مسعود عمادی، اپنی مشہور تفسیر ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم میں رقمطراز ہیں :-

"عرفات جمع ہے اور اسی سے موسوم ہے جس طرح کہ اَذْرِعَاتٌ ہے اور باوجودیکہ اس میں علمیت اور تانیث دونوں باتیں موجود ہیں مگر پھر بھی اس پر تنوین بھی آتی ہے اور کسرہ بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جمع کی تنوین تنوین مقابلہ ہے، تنوین تمکن نہیں ہے اور اسی لیے یہ جمع الف لام کے ساتھ نہیں آتی اور کسرہ کا نہ آنا تنوین نہ آنے کے تابع ہوتا ہے۔ منصرف نہ ہونے کے بدلے میں نہیں ہوتا،

یا یہ وجہ ہے کہ عرفات میں تانیث یا تو تاء مذکور کی بنا پر ہے سو یہ تاء تانیث نہیں ہے بلکہ اپنے ماقبل الف کے ساتھ جمع مؤنث کی علامت ہے۔ یا اس میں تانیث تاء مقدر کی بنا پر ہوگی جس طرح کہ سعاد میں ہے اور اس کی بھی کوئی صورت نہیں بن سکتی کیوں کہ تاء مذکور تاء مقدر کے ماننے سے مانع ہے کہ یہ تو خود اس کا بدل ہے اور بنت کی تاء کی طرح مؤنث کے لیے مخصوص ہے" [1]

قاموس میں ہے :

"عرفات اسم ہے بلفظ جمع۔ اس کی جمع نہیں آتی ہے اور باوجود جمع ہونے کے معرفہ ہے کیوں کہ مقامات اپنی اپنی جگہ پر ہی رہتے ہیں۔ اس لیے وہ بمنزلہ شئے واحد ہی ہیں اور منصرف ہے کیوں کہ تاء اس میں مسلمون اور مسلمین کی یاء اور واؤ کی طرح ہے"

بہر حال جو لوگ عرفات کو غیر منصرف سمجھتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ غیر منصرف تو اس وجہ سے ہے کہ اس میں علمیت اور تانیث موجود ہیں اور اسی لیے اس پر الف لام نہیں آتا باقی رہی اس کی تنوین سو وہ جمع مذکر کے نون کے مقابلہ میں ہے کیونکہ جمع مذکر کا نون اس تنوین کا قائم مقام ہے جو واحد میں ہوتی ہے اور واحد کی تنوین صرف اس کے تمام ہونے کی علامت ہے۔ اسی طرح جمع مؤنث کی تنوین بھی صرف اسم کے تمام ہونے کی علامت ہے پھر اس میں بجز مقابلہ کے

[1] کتاب مذکور۔ ج ۲۔ ص ۲۵۰ مطبوعہ مصر برحاشیہ تفسیر کبیر امام رازی۔

تنوین کے معانی میں سے اور کوئی معنی موجود بھی نہیں ہیں اور غیر منصرف میں ایسی تنوین کا ہونا منع بھی نہیں ہے بلکہ تنوین تمکن کا ہونا منع ہے کیوں کہ وہ فعل سے اسم کے مشابہ نہ ہونے کو بتلاتی ہے۔ رہا کسرہ اس کا نہ آنا مذہب مختار کے مطابق تنوین کے نہ آنے کا تابع ہے، غیر منصرف ہونے کا نتیجہ نہیں۔

اور جو علماء عرفات کو منصرف سمجھتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ اس میں غیر منصرف ہونے کا دوسرا سبب تانیث موجود نہیں ہے کیوں کہ اس کی تا تانیث کی نہیں بلکہ جمع مؤنث کی علامت ہے اور تا تانیث کو یہاں مقدر بھی نہیں مانا جا سکتا کیوں کہ یہ تا جمع مؤنث کے ساتھ مختص ہے اس لیے اب اگر ایک اور تاء تانیث مقدر مانی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تانیث کی دو علامتیں جمع ہو جائیں جو سرے سے غلط ہے۔ عرفات کی تا تو بنت کی تاء کی طرح ہے کہ وہ تانیث کے لیے نہیں بلکہ واو محذوف کے عوض میں ہے اور مؤنث کے ساتھ مخصوص ہے لہٰذا کسی اور تاء کا مقدر ماننا یہاں صحیح نہیں ہے اسی بنا پر مثلاً اگر مسلمات یا بنت کسی مؤنث کا نام رکھ دیا جائے تو وہ منصرف ہوگا۔[1]

فرا نے جو لغت و نحو کے امام ہیں تصریح کی ہے کہ عرفات کا واحد صحت کے ساتھ کوئی نہیں ہے اور لوگ جو یہ بولتے ہیں کہ نزلنا بعرفة ایم عرفہ میں اترے ایہ مولد کے مشابہ ہے اصل عربی نہیں بعض لوگوں نے فرا کے اس بیان پر اعتراض کیا ہے اور دلیل یہ پیش کی ہے کہ حدیث میں آتا ہے الحج عرفة۔ (حج عرفہ کا نام ہے) جواب یہ ہے کہ حدیث میں عرفہ کا لفظ مقام کا نام نہیں بلکہ عرفہ ذی الحجہ کی نویں تاریخ کو کہتے ہیں جیسا کہ راغب، لغوی اور کرمانی نے تصریح کی ہے اور فرا کا جو اعتراض ہے وہ مقام کا نام ہونے پر ہے۔[1]

حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ عرفات کو المشعر الحرام، المشعر الاقصی اور الاول بروزن ہلال بھی کہتے ہیں اور عرفات کے درمیان میں جو پہاڑ ہے اس کا نام جبل الرحمت ہے۔[2] ذی الحجہ کی نویں تاریخ یعنی "عرفہ" کو جو حج کا دن ہے، عرفات میں پہنچنا حج کا سب سے بڑا رکن ہے اگر یہ رہ جائے تو پھر حج ادا نہیں ہوتا۔ [2/9]

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو روح المعانی ج ۲ - ص ۸۱، ۸۸ [2] تفسیر ابن کثیر - ج ۱ - ص ۲۴۲ طبع مصر ۱۳۵۶ھ

**عَرَفْتَهُمْ**: تو نے ان کو پہچان لیا ہے عَرَفْتَ مَعْرِفَةٌ اور عِرْفَانٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر، ھم ضمیر جمع مذکر غائب، علامہ احمد فیومی نے مصباح میں لکھا ہے کہ عِرْفَانٌ کے معنی ہیں کسی شے کو حواس خمسہ میں سے کسی حاسہ کے ذریعہ معلوم کرنا "معرفت" اور "علم" کا جو دقیق فرق، امام راغب اصفہانی نے بیان کیا ہے اس کو ہم تَعَرُّفُ کی تشریح میں تفصیل کے ساتھ سپرد قلم کر چکے ہیں اس فرق کو بیان کرنے کے بعد راغب لکھتے ہیں کہ عِرفان کے اس معنی میں استعمال ہونے کی اصل یہ ہے کہ وہ یا تو عرفت بمعنی اصبت عرفہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں میں نے اس کی خوشبو پائی" اور یا اَصَبْتُ عُرْفَهُ سے ہے جس کے معنی آتے ہیں۔ میں نے اس کی حد کو پالیا (ملاحظہ ہو تَعَرُّفُ) ۲۶/۸

**عَرَفُوْا**: انہوں نے پہچانا۔ انہوں نے جانا مَعْرِفَةٌ اور عِرْفَانٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب ۱/۱۱

**عَرَّفَهَا**: اس نے اس سے شناسا کر دیا، اس نے اس کو پہچنوا دیا۔ اس نے اس کی تعریف کی عَرَّفَ تَعْرِيْفٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ضمیر واحد مؤنث غائب، امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں:۔

"عَرَّفَهُ کے معنی خوشبودار کرنے کے بھی آتے ہیں جنت کے بارے میں جو یہ ارشاد ہو رہا ہے عرفہا لہم اس کے بھی یہی معنی ہیں کہ حق تعالیٰ نے جنت کو اہل جنت کے لیے خوشبودار اور مزین کر دیا۔ اور بعض نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ ان سے اس کا وصف بیان کیا، شوق دلایا اور اس کی طرف رہنمائی کی" ۲۶/۵

**عَرَفَهُمْ**: اس نے ان کو پہچان لیا عَرَفَ عِرْفَانٌ اور مَعْرِفَةٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب اور ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب۔ ۱۳/۲

**عَرِمَ**: تیز و تند، زوردار، سخت، یہ عَرَامَةٌ اور عُرَامٌ سے جن کے معنی بد اخلاق اور سخت و درشت ہونے کے ہوتے ہیں صفت مشبہ کا صیغہ ہے لغت کے اعتبار سے اصل معنی تو عَرِم کے یہی ہیں لیکن بہت سی ان اشیاء کیلئے بھی کہ جن میں یہ وصف نمایاں طور پر پایا جاتا ہے اس کا استعمال ہوتا ہے اسی بنا پر یہاں اہل لغت اور مفسرین نے اس کے بہت سے معانی نقل کیے ہیں جو درج ذیل ہیں:۔

(۱) سخت بارش (۲) بند (۳) بند کا پشتہ (۴) گھونس (۵) اس خاص بند کا نام جو یمن میں

Marfat.com

تعمیر ہوا تھا (۶) ایک وادی کا نام (۷) وہ سیلاب کہ جس کو روکا نہ جا سکے (۸) وہ آڑ کہ جو دو چیزوں کے درمیان میں ہو (۹) وہ سرخ پانی کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے عذاب کی شکل میں اس بند میں بھیج دیا اور اس نے اس بند کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔

یہ بھی بحث ہے کہ عرم جمع ہے یا واحد اور جمع ہونے کی صورت میں اس کا واحد آتا ہے یا نہیں بعض کہتے ہیں یہ جمع ہے اس کا واحد نہیں آتا اور بعض اس کا واحد عرمۃ کو بتاتے ہیں۔ عرمۃ کہتے ہیں تلے اوپر رکھے ہوئے پتھروں کو یا اس پشتہ کو جو وادی کے عرض میں ہو۔

قرآن پاک میں سورہ السباء میں سیل عرم کا ذکر آیا ہے جو قوم سباء پر ان کے کفر کی پاداش اور احکام الٰہی سے روگردانی کی بنا پر عذاب الٰہی کی صورت میں بھیجا گیا تھا سباء امم قحطانیہ کی مشہور ترین شاخ ہے جس نے قدیم زمانہ میں عظیم الشان تمدن کی بنیاد ڈالی تھی جنوب عرب میں یمن کا مشرقی حصہ ان کے تمدن کا اصل مرکز تھا شہر مارب جو صنعاء یمن کا موجودہ پایہ تخت ہے تین منزل پہ ہے ان کا دارالحکومت تھا قبیع الاد وہ ملکہ کہ جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی اور جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے اسی قوم سے تھی۔ ان کا ملک بڑا سرسبز و شاداب تھا مال و دولت کی فراوانی تھی لہلہاتے کھیت طرح طرح کے میوے پھل باغات اور نہروں کی بہتات تھی اور یہ مزے سے داد عیش و عشرت دیتے تھے چنانچہ تورات میں سباء کی دولت و عظمت کا تذکرہ تفصیل سے آیا ہے سباء نے اپنے عروج کے زمانہ میں بہترین قلعے اور عمارتیں بنائی بعض ان میں سے بعض عمارات زمانہ اسلام تک باقی رہیں جن کو مسلمان مورخین نے خود دیکھا ہے اور ان کے حالات اپنی تصانیف میں درج کئے ہیں چنانچہ ہمدانی کی کتاب الاکلیل کا ایک مستقل باب ان ہی عمارتوں کے حالات کے بیان میں ہے۔ اسی طرح نشوان ابن سعید حمیری نے قصیدہ حمیریہ میں پیکیس کے قریب شاہی عمارتوں کا ذکر کیا ہے اور قصر سلحین جو بادشاہ کے رہنے کا محل تھا اس کے نشانات تو اب تک موجود ہیں آب پاشی کی غرض سے بھی سبا نے اندرون ملک میں جگہ جگہ بند بنائے تھے جن کے ذریعہ بارش کے پانی کو روک کر ملک کی زمین کو سیراب کرتے تھے۔ ان میں سب سے مشہور

وہ بند تھا جو سد مارب کہلاتا ہے اور جس کے ٹوٹنے کو قرآن مجید نے سیل العرم سے تعبیر کیا ہے مولانا سید سلیمان ندوی نے ارض القرآن میں اس کے متعلق تفصیلی معلومات مہیا کی ہیں جو ہدیۂ ناظرین ہیں فرماتے ہیں -

"اسی سلسلہ عمارات میں ایک چیز بند آب ہے جس کو عرب حجاز "سد" اور عرب یمن "عرم" کہتے ہیں، عرب کے ملک میں کوئی دائمی دریا نہیں صرف سلسلہ کوہستان ہے - پانی پہاڑوں سے بہ کر ریگستانوں میں خشک ہو جاتا ہے اور ضائع ہو جاتا ہے، زراعت کے مصرف میں نہیں آتا، سبا مختلف مناسب موقعوں پر پہاڑوں اور وادیوں کے بیچ میں بڑے بڑے بند باندھ دیتے تھے کہ پانی رُک جائے اور بقدر ضرورت زراعت کے مصرف میں آئے مملکت سبا میں اس قسم کے سیکڑوں بند تھے ان میں سب سے مشہور سد مارب تھا خود دار الحکومت کے اندر واقع تھا -

شہر مارب کے جنوب میں داہنے بائیں دو پہاڑ ہیں جن کا نام کوہ ابلق ہے دونوں کے بیچ میں وادی اذینہ ہے پہاڑوں سے نیز ادھر ادھر سے پانی جمع ہو کر وادی اذینہ میں ایک دریا جاری ہو جاتا ہے - سبا نے ان دونوں پہاڑوں کے بیچ میں تقریباً ۸۰۰ ق م قبل مسیح میں سد مارب کی تعمیر کی تھی، یہ بند تقریباً ۱۵۰ فٹ لمبی اور ۵۰ فٹ چوڑی ایک دیوار ہے اس کا اکثر حصہ تو اب افتادہ ہے تاہم اس کی ایک ثلث دیوار اب بھی باقی ہے - ارناؤ ایک یورپین سیاح نے اس کے موجودہ حالات پر ایک مضمون فرنچ ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں لکھا ہے اور اس کا موجودہ نقشہ نہایت عمدگی سے طبع کیا ہے - اس دیوار پر جا بجا کتبات ہیں وہ پڑھے گئے ہیں -

عام مسلمان مورخین چونکہ ہر قدیم عمارت کو بنائے سلیمانی" کہنے کے عادی ہیں اس لئے اس سد کا بانی وہ بلقیس ملکہ یمن و حرم سلیمان کو قرار دیتے ہیں لیکن سد مارب کے باقی حصہ پر جو کتبات ہیں ان میں بانیوں کے نام بھی خوش قسمتی سے باقی رہ گئے ہیں میں سے تبع اَمر بین بن نیوف سمہ مکارب سباہ سمہعلی نیوف بن ذمر علی مکارب

...کرب ایل یتین بن ثبع امر مکارب سبا، ذمر علی ذرح
...لک سبا اور یدع ایل وتار کے نام پڑھے گئے
...یں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سد ایک
...زمانہ ممتد میں مختلف سلاطین یمن کے عہد میں تعمیر
...ہوا ہے اس کا پہلا بانی ثبع امر تھا جو آٹھویں صدی
...ق م میں تھا۔ اس سد میں اوپر نیچے تک بہت سی
...کھڑکیاں تھیں اوپر سے نیچے تک کی کھڑکیاں
...حسب ضرورت کھولی اور بند کی جاتی تھیں۔ سد
...کے دائیں بائیں دو بڑے بڑے دروازے تھے
...جن سے پانی تقسیم ہو کر چپ و راست کی تینوں
...زمینوں کو سیراب کرتا تھا۔ اس سد کے
...حالات ہمارے مفسرین نے جو بیان کیے
...ہیں لعینہ ارناؤ کے بیان سے اس کی
...تصدیق ہوتی ہے (تفسیر آیت مذکور
...طبری اور بغوی میں دیکھو۔ حاشیہ ارض القرآن)
اس انتظام آبرسانی سے چپ و راست دونوں
جانب اس ریگستانی اور شور ملک کے اندر ۳۰۰
مربع میل سیکڑوں کوس تک بہشت زار
طیار ہو گئی تھی جس میں انواع واقسام کے
میوے اور خوشبودار درخت تھے ان کی خوشبو
دور تک پھیلی رہتی تھی۔

قرآن مجید ان آیات میں انہی باغوں کی طرف
اشارہ کرتا ہے:۔

| | |
|---|---|
| لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ | سبا کے لوگوں کیلئے خود ان |
| فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ | کے گھر میں قدرت خدا کی ایک عجیب |
| جَنَّتَانِ عَنْ يَمِينٍ | نشانی موجود تھی، دو باغوں |
| وَشِمَالٍ كُلُوا مِنْ | کا سلسلہ داہنے بائیں سبا کے |
| رِزْقِ رَبِّكُمْ وَ | لوگو اپنے پروردگار کی روزی کھاؤ |
| اشْكُرُوا لَهُ بَلْدَةٌ | اور شکر کرو، شہر پاکیزہ |
| طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ | اور پروردگار ہے بخشنے والا۔ |

ہمارے پاس اس جنت زار کے قصے عربوں
کی روایت سے کئی سو سال بعد کے موجود ہیں
لیکن خود ہمارے دشمنوں کے سفینوں میں اس کی
معاصرانہ شہادتیں جو محفوظ ہیں ان کو ایک دفعہ
پھر پڑھو۔
اراٹوستھینس جو ۱۹۴ سنہ ق م سبا کا معاصر تھا
لکھتا ہے۔
"سبا کے لوگ ہیں جن کا دار الحکومت شہر مارب
ہے۔ یہ قطعہ ملک مصر زمین سے بڑا ہے
گرمیوں میں بارش ہوتی ہے اور دریا جاری ہوتے
ہیں جو میدانوں اور تالابوں میں خشک ہو جاتے
ہیں اس سبب سے زمین اس قدر سرسبز

Marfat.com

اور شاداب ہے کہ تخم ریزی وہاں سال میں دو بار
ہوتی ہے سبا کا ملک خوش و خرم ہے"
آغا تھارشیدس، جو ۱۳۵ ق م میں سبا کے زمانہ
وعصر میں تھا بیان کرتا ہے :-
"سبا، عرب کے حصہ سرسبز و آباد میں رہتے ہیں
جہاں اچھے اچھے بے شمار میوے ہوتے ہیں، دریا
کے کنارے جو زمین ہے اس میں نہایت خوبصورت
درخت ہوتے ہیں جو دیکھنے میں بہت بھلے معلوم
ہوتے ہیں اندرون ملک میں بخورات، دار چینی
اور چھوارے کے نہایت بلند درختوں کے گنجان
جنگل ہیں اور ان درختوں سے نہایت شیریں پھیلا
کرتی ہے درختوں کے اقسام کی کثرت اور تنوع
کے سبب سے ہر قسم کا نام و وصف مشکل ہے جو
خوشبو اس میں سے اڑتی ہے وہ جنت کی خوشبو
سے کم نہیں اور جس کی تعریف لفظوں میں ادا نہیں
ہو سکتی جو اشخاص زمین سے دور ساحل سے
گزرتے ہیں وہ بھی جب ساحل کی طرف سے ہوا
چلتی ہے تو اس خوشبو سے محظوظ ہوتے ہیں۔
وہ گویا امبحیات کا لطف اٹھاتے ہیں اور یہ تشبیہ
بھی اس کی قوت و لطافت کے مقابل میں ناقص ہے
آرٹی میڈروس جو سبا کے عہد آخر میں تھا کہتا ہے،
"سبا کا بادشاہ اور اس کا ایوان مارب میں ہے،
جو ایک پُر اشجار پہاڑ پر عیش و مسرت از زمانہ
خوشحالی میں واقع ہے"
خدائے پاک اس کے بعد فرماتا ہے۔

| | |
|---|---|
| فَاَعْرَضُوْا | پھر انہوں نے سرتابی کی تو ہم |
| فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ | نے اُن پر بند (توڑ کر اس کا) |
| سَيْلَ الْعَرِمِ۔ | سیلاب بھیجا۔ |

یہ سیلاب آیا اور ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں لیکن
اس عصر تاریکی میں جب ہر غیر معاصرانہ روایت
قابل شک و اشتباہ ہے، خدائے قرآن نے
اپنے کلام معجز کی صداقت کا نیا سامان پیدا کر لیا
یعنی اس بند کے ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں واقعہ
سیلاب کے مشرح حالات کا کتبہ جو ایک
عیسائی فاتح یمن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے مل
گیا ہے۔ یہ عیسائی فاتح وہی ہے جو اپنے
ہاتھیوں کے بل پر کعبہ کو ڈھانے نکلا تھا لیکن
آج اسی دشمن کعبہ کا سنگی ہاتھ کعبہ بکر میں کی کتاب
مقدس کی تصدیق کے لیے بلند ہے۔

| | |
|---|---|
| وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ | اور ان اعلیٰ باغوں کے بدلے |
| جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ | کے بدلہ معمولی پھول یعنی |
| اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ | پیلو جھاؤ اور کچھ بیری کے |

وَّشَیْءٍ مِّنْ سِدْرٍ — باغ دیدیے یہ ان کے کفران
قَلِیْلٍ ذٰلِکَ جَزَیْنٰہُمْ — کی سزا ہے ہم کفرانِ نعمت
بِمَا کَفَرُوْا وَہَلْ — کرنے والوں ہی کو سزا
نُجٰزِیْٓ اِلَّا الْکَفُوْرَ (سبا) — دیتے ہیں۔

قرآن مجید جب نازل ہو رہا تھا تو اس سزا کو جھاڑ جھنکاڑ کی شکل میں نمودار ہوئی یمن کا ہر باشندہ بچشم خود معائنہ کر رہا تھا لیکن چار سو برس کے بعد بھی رائے العین پر سیاح کو نظر آ رہی تھی، ہمدانی المتوفی ۳۳۰ھ جس کی صداقت بیانی کے نہ صرف سیاحین یورپ بلکہ آثرین دار کیا و حبث ابھی معترف ہیں وہ خود چوتھی صدی کے اوائل میں شہادت عینی پیش کرتا ہے کہ ان باغوں کی جگہ پیلو کے درخت اتنے ہیں کہ کہیں اور نہیں۔ [1] $\frac{۲۲}{۸}$

عُرُوْشِهَا: اس کی چھتیں، اس کی چھتریاں اس کی ٹٹیاں، عُرُوْش۔ عَرْش کی جمع مضاف ہے، ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ عرش البیت کے معنی گھر کی چھت کے آتے ہیں بیل کے چھانے کے لیے جو چھتری اور ٹٹی کھڑی کرتے ہیں۔ اس کو بھی عرش کہتے، امام ابوبکر سجستانی نے نزہۃ القلوب میں خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا کا مطلب لکھا ہے کہ پہلے چھتیں گریں اور اس کے اوپر دیواریں (ملاحظہ ہو عرش)

$\frac{۳}{۳}$ $\frac{۱۵}{۱۷}$ $\frac{۱۷}{۱۳}$

عُرْوَۃٌ: کڑا، حلقہ، کسی چیز کا قبضہ یا دستہ وہ چیز جس کو پکڑا جائے، عُرًی جمع امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں آیہ شریفہ فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی (جو کوئی انکار کرے طاغوت کا اور ایمان لائے اللہ پر اس نے مضبوط حلقہ تھام لیا) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

"اس میں شئے معقول کے لیے شئے محسوس کا استعارہ ہے کیوں کہ جو شخص کسی چیز کو تھامنا چاہتا ہے وہ اس کے دستہ اور حلقے کو پکڑ لیتا ہے اسی طرح جو کوئی اس دین کو تھامنا چاہتا ہے وہ ان دلائل سے وابستہ ہو جاتا ہے جو اس پر رہنمائی کرتے ہیں اب چونکہ اسلام کے دلائل سب سے زیادہ مضبوط اور واضح تر ہیں اس لیے ان کو العروۃ الوثقٰی سے موصوف کیا گیا۔" [2]

اور امام محمد بن احمد انصاری قرطبی الجامع لاحکام القرآن میں لکھتے ہیں:۔

"یہ آیت تشبیہ ہے اور تشبیہ بہ کے بارے میں

[1] ارض القرآن ج ۱ ص ۱۰۵ مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ [illegible] [2] تفسیر کبیر ج ۲ ص ۱۴۷ مطبوعہ مصر طبع قدیم۔

مفسرین کی عبارتیں مختلف ہیں، مجاہد کہتے ہیں عروۃ سے مراد ایمان ہے، سُدی کہتے ہیں اسلام ہے حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سعید بن جبیر اور ضحاک لا الٰہ الا اللہ بیان کرتے ہیں اور ان سب عبارتوں کا مطلب ایک ہی ہے"۔ [1]

حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے قرآن اور سالم ابن ابی الجعد سے حب فی اللہ اور بغض فی اللہ بھی نقل کیا ہے۔ نیز صحیحین میں بھی اس آیت کی تفسیر میں نہیں لیکن حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے ایک خواب کی تعبیر میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی العروۃ الوثقیٰ کی تفسیر "اسلام" ہی منقول ہے۔ [2]

۳/۲ ۲۱/۱۲

عَرِیْضٌ: خوب چوڑی عَرْضٌ سے بروزن صفت مشبہ کا صیغہ جو مبالغہ کے لیے ہے راغب اصفہانی لکھتے ہیں:۔

"عرض وہ ہے جو طول کے خلاف ہے۔ اصل میں تو اس کا استعمال اجسام کے لیے ہی ہونا چاہیے (کیونکہ جسم ہی طول، عرض اور عمق کے ساتھ موصوف ہوتا ہے) لیکن غیر اجسام میں بھی اس کا استعمال ہونے لگا، چنانچہ ارشاد ہے فَذُوْ دُعَاءٍ عَرِیْضٍ (تو خوب لمبی چوڑی دعائیں کرتا ہے)"

اور قاضی شوکانی فرماتے ہیں:

"عریض کے معنی کثیر کے ہیں، عرب طول و عرض کا استعمال مجازاً کثرت کے معنی میں کیا کرتے ہیں چنانچہ محاورہ ہے اطال فلان فی الکلام واعرض فی الدعاء اکثر یعنی کثرت سے باتیں کیں اور خوب دعائیں کیں" [3]

۲۵/۱

# فصل الزاء المعجمہ

عِزًّا: عزت، قوت، یہ عَزَّ یَعِزُّ کا مصدر ہے جس کے معنی قوی ہونے کے ہیں، تاج العروس میں ہے:۔

| | |
|---|---|
| العز فی الاصل | عز کے معنی ہیں اصل میں |
| القوۃ والشدۃ و | قوی ہونا سخت ہونا، غلبہ |
| الغلبۃ والرفعۃ والامتناع | پانا بلند ہونا اور محفوظ ہونا۔ |

[1] تفسیر قرطبی۔ ج ۳۔ ص ۲۸۲ طبع مصر ۱۹۳۶ء

[2] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۱۱ طبع مصر ۱۳۵۶ھ [3] فتح القدیر۔ ج ۴۔ ص ۵۰۸ طبع مصر۔

Marfat.com

اور ابن القطاع نے کتاب الافعال میں اس کے معنی اعانت کرنے کے بھی لکھے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے شاہ عبدالقادر دہلوی نے اس کا ترجمہ یہاں "مدد" کیا ہے۔ ۱۶/۸

عِزَّتِكَ: تیری عزت، عِزَّةٌ مضاف کَ واحد مذکر حاضر مضاف الیہ (ملاحظہ ہو عِزَّۃ)

۲۳/۱۲

عَزَّرْتُمُوْهُمْ: تم نے ان کی مدد کی، تم نے ان کو قوت پہنچائی، تم نے ان کی تعظیم کی۔

عَزَّرْتُمُوْا، تَعْزِيْرٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، واو اشباع کا ہے هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب۔ قاموس میں تَعْزِيْرٌ کے حسب ذیل معانی لکھے ہیں۔ شرع میں کسی حد کی جو سزا مقرر ہے اس سے کم مارنا، یا بہت زیادہ مارنا۔ بزرگ ماننا اور تعظیم کرنا، اسی بنا پر یہ اضداد میں سے ہے (یعنی ایسے دو مختلف معانی میں اس کا استعمال ہوتا ہے کہ جو ایک دوسرے کی ضد ہیں) اعانت کرنا اور یہی معنی عَزْرٌ کے آتے ہیں قوت پہنچانا، مدد کرنا، علامہ سید مرتضیٰ زبیدی شرح قاموس میں لکھتے ہیں۔

عَزَرَهٗ اور عَزَّرَهٗ کے معنی ہیں مدد کرنے کے ارشاد ہے لِتُعَزِّرُوْهُ تفسیر میں اس کے معنی آتے ہیں لِتَنْصُرُوْهُ بِالسَّيْفِ یعنی تلوار کے ذریعہ آپ کی مدد کرو اور عَزَّرْتُمُوْهُمْ کے معنی لکھے ہیں عَظَّمْتُمُوْهُمْ (تم نے ان کی تعظیم کی) ابراہیم بن السری کا بیان ہے کہ یہی معنی حق ہیں واللہ اعلم۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عَزْرٌ کے معنی لغت میں مدافعت کرنے اور روکنے کے ہیں اور عَزَرْتُ فُلَانًا کا استعمال جو تادیب کے لیے ہوتا ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ "میں نے اس کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جو برائی سے اس کو روک دیتا ہے" جس طرح سے کہ نَكَّلْتُ بِهٖ کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے اس کو وہ سزا دی کہ جس کی بنا پر دوبارہ اس کام کو نہیں کرے گا۔ لہذا عَزَّرْتُمُوْهُمْ کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے ان کی مدد کی بایں طور کہ ان کے دشمنوں کی ان سے مدافعت کی، اور اگر تعزیر کا مطلب صرف توقیر ہی ہوتا تو اس کی تشریح لغوی اسی لفظ سے بہت اچھی طرح استغنا ہو جاتا۔ پھر جب نصرت واجب ہوئی تو تعظیم بھی اس میں آگئی کیونکہ انبیاء کی نصرت کے معنی

Marfat.com

یہی ہیں کہ ان کی طرف سے مدافعت کی جائے
اور ان کے دین کی حمایت، اور خود ان کی تعظیم و
توقیر ہو، چنانچہ عربی زبان میں تَعْزِیْر کے معنی
توقیر کرنے اور زبان اور تلوار کے ذریعہ مدد کرنے
کے آتے ہیں۔ حدیث مبعث میں ہے۔

| | |
|---|---|
| قال ورقۃ بن | ورقہ بن نوفل نے کہا کہ |
| نوفل ان بعث | اگر یہ (یعنی آنحضرت صلی |
| وانا حی فاعزرہ | اللہ علیہ وسلم) میرے سامنے |
| وانصرہ۔ | مبعوث ہوئے تو میں ان کی توقیر کروں گا اور ان کو مدد دوں گا |

یہاں تَعْزِیْر کے معنی اعانت توقیر اور بار بار مدد کرنے کے ہیں۔ (ملاحظہ ہو تُعَزِّرُوْہُ) $\frac{6}{4}$

عَزَّرُوْهُ : انہوں نے اس کی تعظیم کی انہوں نے اس کو قوت دی انہوں نے اس کی رفاقت کی۔ عَزَّرُوْا تَعْزِیْر سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب۔ $\frac{6}{4}$

عَزَّزْنَا : ہم نے قوت دی، ہم نے زور دیا تَعْزِیْز سے جس کے معنی قوت دینے کے ہیں ماضی کا صیغہ جمع متکلم۔ $\frac{22}{19}$

عَزَلْتَ : تو نے ایک کنارے کر دیا، تو نے جدا کر دیا، تو نے علیحدہ کر دیا، ضَرَبَ، عَزْلٌ سے جس کے معنی کسی شے کو جدا کرنے، علیحدہ کرنے اور ایک کنارے لگا دینے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر۔ $\frac{22}{3}$

عَزْم : ہمت، پختہ ارادہ، امام راغب لکھتے ہیں "عَزْمٌ اور عَزِیْمَۃٌ کے معنی ہیں کسی کام کے کر گزرنے پر دل کو پکا کر لینا" یہ عَزَمَ یَعْزِمُ کا مصدر ہے اور اس کا فعل باب ضَرَبَ سے آتا ہے یہاں مصدر بمعنی مفعول ہے یعنی عَزْم بمعنی مَعْزُوْم اور اس سے مراد ہے وہ عمل کہ جس کو اس کی خوبی بھلائی اور عزت کی بنا پر ہر ایک کو کرنے کا پختہ ارادہ کر لینا چاہیے یا اس کام کی انجام دہی حق تعالی کی طرف سے بندوں پر پختہ اور مصمم کر دی گئی ہے آیۂ شریفہ لَقَدْ عَهِدْنَا اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا اور ہم نے تاکید کر دی تھی آدم کو اس سے پہلے پھر بھول گیا اور نہ پائی ہم نے اس میں کچھ پختگی، کی تفسیر کرتے ہوئے امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں:
"عَزْم کے معنی ہیں مصمم اور پختہ ہونے کے اور لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا میں یہ بھی احتمال ہے

لہ روح المعانی۔ ج ۴۔ ص ۱۴۸۔ طبع مصر مطبع منیریہ

Marfat.com

کہ عزم سے مراد معصیت پر قائم رہنا ہو۔ اس صورت میں یہ مدح کے زیادہ قریب ہوگا (یعنی ہم نے ان میں معصیت کا پختہ ارادہ نہیں پایا بلکہ بھول کر انہوں نے ایسا کیا) اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ ہم نے ان میں ترک معصیت کا پختہ ارادہ نہ پایا، یا غفلت سے محفوظ رہنے اور اس سے بچنے میں پختگی نہ دیکھی، یا اپنی کوشش میں احتیاط کا پختہ قصد نہ پایا۔ یہ سب معانی اس صورت میں ہیں کہ جب ہم حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی خطاء اجتہادی مانیں" [1]

اور قاضی شوکانی فتح القدیر میں لکھتے ہیں:

"بعض لوگوں نے عزم کے معنی صبر کے بھی کیے ہیں یعنی ہم نے ان میں اس شجر ممنوعہ کے کھانے سے باز رہنے پر صبر نہ پایا۔ یا نحاس نے کہا ہے کہ لغت میں بھی اس کے یہ معنی آتے ہیں چنانچہ بولا جاتا ہے لفلان عزم یعنی فلاں شخص میں معاصی سے بچنے اور ان سے سالم رہنے پر صبر اور ثابت قدمی موجود ہے اور اسی معنی میں یہ آیت بھی ہے كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ کہ یہاں بھی عزم سے صبر ہی مراد ہے" [2]

اور آیہ کریمہ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (تو آپ صبر کیجیے جیسے اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا تھا) کے متعلق روح المعانی میں مرقوم ہے۔

"من اس میں بیانیہ ہے جس طرح کہ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ میں ہے اور مِنَ الرُّسُلِ میں جار مجرور حال کی جگہ ہیں اس صورت میں "اولوالعزم" سارے رسولوں کی صفت ہوگی چنانچہ ابن زید، جبائی اور ایک جماعت اس طرف گئی ہے یعنی آپ بھی اسی طرح صبر سے کام لیجیے جس طرح کہ اور رسولوں نے صبر کیا اور تبلیغ وحی میں برابر اس طرح جدوجہد کرتے رہے کہ نہ کوئی روکنے والا انہیں روک سکا اور نہ جھکانے والا انہیں جھکا سکا اور حق سبحانہٗ تعالیٰ نے جو کچھ ان سے عہد لیا تھا اور بالواسطہ یا بلا واسطہ جو کچھ ان کے حق میں قضاء وقدر کا فیصلہ فرما دیا تھا اس پر ثابت قدم رہے۔

اور عطاء خراسانی، حسن بن الفضل، کلبی، مقاتل

[1] تفسیر کبیر ج ۶ ص ۱۱۲۔ [2] فتح القدیر ج ۳ ص ۲۰۶۔

قتادہ، ابوالعالیہ اور ابن جریج سے یہ مروی ہے
کہ اکثر مفسرین بھی اسی طرف گئے ہیں کہ من
تبعیض کے لئے ہے اور اولوالعزم سے بعض
رسول مراد ہیں، البتہ ان کی تعداد اور تعیین میں
مختلف اقوال ہیں، حسن بن الفضل کا بیان ہے
کہ یہ وہی اٹھارہ پیغمبر ہیں جو نام بنام سورہ انعام
میں مذکور ہیں کیونکہ ان کے ذکر کے بعد ارشاد ہوتا
ہے فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ (سو آپ
ان ہی کے طریق پر چلیے)۔

اور بعض کا قول یہ ہے کہ یہ نو حضرات ہیں
(۱) حضرت نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام
جنہوں نے زمانہ دراز تک اپنی قوم کے سامنے
پر صبر کیا (۲) حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ
الصلوٰۃ والسلام جنہوں نے آگ میں ڈالے جانے پر صبر
کیا (۳) ذبیح یعنی حضرت اسمٰعیل علی نبینا وعلیہ
الصلوٰۃ والسلام جنہوں نے اپنے ذبح ہونے
پر صبر کیا (۴) حضرت یعقوب علی نبینا وعلیہ
الصلوٰۃ والسلام جنہوں نے اپنی اولاد کے گم ہو جانے
پر صبر کیا (۵) حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ
والسلام جنہوں نے کنویں میں ڈالے جانے اور قید
ہونے پر صبر کیا (۷) حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ
الصلوٰۃ والسلام جن سے ان کی قوم نے کہا تھا
اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ (ہم تو پکڑے گئے) اور انہوں نے
فرمایا تھا كَلَّا اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ (کوئی نہیں
میرے ساتھ ہے میرا رب) (۸) حضرت داؤد علی نبینا
وعلیہ الصلوٰۃ والسلام جو چالیس سال تک اپنی خطا
پر روتے رہے (۹) حضرت عیسیٰ علی نبینا
وعلیہ الصلوٰۃ والسلام جنہوں نے دنیا میں کبھی ایک اینٹ
پر دوسری اینٹ نہیں رکھی اور فرمایا کہ یہ دنیا
گزرگاہ ہے اس پر گزر جاؤ اور تعمیر (کے بکھیڑوں)
میں نہ پھنسو)

اور بعض کہتے ہیں کہ یہ سات حضرات ہیں
حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم
حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان
اور حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام
اور بعض ان چھ حضرات کو بتاتے ہیں جن کو دشمنان
خدا سے جنگ کا حکم ملا تھا حضرت نوح، حضرت
ہود، حضرت صالح، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت
سلیمان علی نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام، چنانچہ
ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما
سے یہی نقل کیا ہے اور مقاتل سے بھی چھ
ہی کی تعداد مروی ہے مگر وہ یہ نہیں کہتے کہ یہ

Marfat.com

وہی حضرات ہیں جن کو جہاد کا حکم ملا بلکہ وہ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف اور حضرت ایوب علیٰ نبینا و علیہم الصلوٰۃ والسلام کو بتاتے ہیں اور ابن عساکر نے قتادہ سے یہ روایت کی ہے کہ حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت ابراہیم، حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ علیٰ نبینا و علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں اور اس سے یہ ظاہر ہے کہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ ان کی تعداد پانچ ہے مگر عبدالرزاق عبد بن حمید اور ابن المنذر ان سے یہ نقل کرتے ہیں کہ یہ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا و علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ اور اس روایت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ان کی تعداد چار ہے اور یہی صحیح ترین قول ہے۔

اور جلال الدین سیوطی جو یہ فرماتے ہیں کہ ان سب میں صحیح ترین قول ہے کہ یہ پانچ ہیں چار تو یہی حضرات مذکورین اور پانچویں ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و علیہم اجمعین اور ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی نقل کیا ہے اور یہی ائمہ اہل بیت میں سے ابو جعفر (امام باقر) اور ابو عبداللہ (امام جعفر صادق) سے مروی ہے۔ اور کسی بزرگ نے اس کو نظم بھی کر دیا ہے چنانچہ ان کا شعر ہے:-

اولوالعزم نوحٌ والخلیل الممجد
وموسیٰ وعیسیٰ والحبیب محمدٌ

یہ اسی بنا پر ہے کہ نزول آیت اور ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جن حضرات کی پیروی کا حکم دیا گیا تھا ان کی پیروی کے بعد اب اولوالعزم سے یہی حضرات مراد لیے جاتے ہیں اور سیوطی کا مطلب بالکل نہیں ہے کہ آیت میں صحیح ترین قول کے مطابق یہی پانچوں حضرات (علیہم الصلوٰۃ والسلام) مراد ہیں کیونکہ اس صورت پر یہ لازم آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اپنی طرح سے صبر کرنے کا حکم دیا۔ جو کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا اور یہی مطلب ہے ابو العالیہ کے اس قول کا جس کو عبد بن حمید، ابن جریر اور بیہقی نے شعب الایمان میں نیز ابن عساکر نے روایت کیا ہے کہ یہ تین حضرات ہیں:-

حضرت نوح، حضرت ابراہیم اور حضرت ہود اور
جو تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعلیہم اجمعین
اور شاید آیت میں زیادہ بہتر قول اول ہی ہو گو بعد
میں اولو العزم کا استعمال ان پانچوں حضرات
کے ساتھ ان کی شہرت کی بنا پر مخصوص ہو گیا ہے
جس طرح سے کہ اور اعلام غالبہ کا حال ہے
لہٰذا آیت میں گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ آپ دعوت
حق اور شدائد کے برداشت کرنے میں اسی طرح
پورے طور پر صبر سے کام لیجئے جس طرح کہ آپ سے
پہلے آپ کے بھائی اگلے رسولوں نے کیا ہے[1] علیہ وعلیہم
الصلوٰۃ والسلام،

حافظ عبدالقادر قرشی حنفی نے الجواہر المضیہ
فی طبقات الحنفیہ کے دیباچہ میں پیغمبران اولوالعزم
پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے جو اسی کے
قریب قریب ہے۔ ۳/۴ ۲۱/۱۱ ۲۵/۵ ۲۶/۴

**عَزْمًا** ۱۶/۱۵

**عَزَمَ**: جب مصمم ہو گیا، جب پختہ ہو گیا
عَزْمٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب،
تفسیر کبیر میں ہے،
آیہ شریفہ فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ میں "عزم"
کی نسبت امر کی طرف ہے۔ اس لیے اس کے
معنی ہوں گے "جب صاحب امر نے عزم
کر لیا" چنانچہ زمخشری نے یہی معنے کیے ہیں
اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کو مجاز کہا جائے
جس طرح کہ ہم بولا کرتے ہیں جَاءَ الْأَمْرُ وَوَلّٰی
(امر آیا اور چلا گیا) کیونکہ پہلی صورت میں یہ بھی ہو سکتا
ہے کہ امر کا وقوع ہی نہ ہو لیکن جب معاملہ
آن ہی پڑے اور اسے ناپسند سمجھنے والا اس
کے باطل کرنے سے عاجز ہو جائے تو اس
صورت میں پھر اس کا وقوع ہو کر ہی رہے گا"[2] ۲۱/۴۷

**عَزَمْتَ**: تو پختہ کر چکا۔ تو نے پکا کر لیا، تو نے
عزم کیا۔ عَزْمٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر ۳

**عَزَمُوْا**: انہوں نے پختہ ارادہ کیا۔ عَزْمٌ سے ماضی
کا صیغہ جمع مذکر غائب۔ ۲/۱۲

**عَزَّنِیْ**: اس نے مجھ پر غلبہ کیا، اس نے مجھ سے
زبردستی کی، اس نے مجھے دبا ڈالا۔ عَزٌّ سے ماضی
کا صیغہ واحد مذکر غائب ن وقایہ، ی ضمیر واحد متکلم
امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:۔
عَزَّنِیْ فِی الْخِطَابِ کا مطلب ہے کہ اس نے گفتگو میں
مجھے دبا ڈالا، اور بعض نے اس کے معنی کیے ہیں کہ وہ

[1] روح المعانی ج ۱۶، ص ۳۴، ۳۵ مطبوعہ مصر طبع جدید [2] تفسیر کبیر ج ۷، ص ۵۲۳ طبع قدیم۔

Marfat.com

خطاب کرنے اور جھگڑنے میں مجھ سے زیادہ بالعزت بن بیٹھا" پ ۲۳/۱۱

عِزَّةٌ: عزت، غلبہ، زور، بزرگی، اقبال، یہ عَزَّ یَعِزُّ کا مصدر ہے اور بطور اسم بھی استعمال ہوتا ہے

امام راغب اصفہانی رقمطراز ہیں:-

عزۃ اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان کو مغلوب ہونے سے بچا سکے، یہ ارض عزاز سے ماخوذ ہے جس کے معنی سخت زمین کے ہیں (گویا جس طرح سخت زمین کھدائی سے مانع ہوتی ہے اسی طرح عزت مغلوب بننے سے روکتی ہے)

ارشاد ہے وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (اور زور ہے اللہ کا اور اس کے رسول کا اور ایمان والوں کا) اور سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ (پاک ذات ہے تیرے رب کی جو مالک ہے عزت کا) پھر کبھی عزت کے ذریعہ مدح کی جاتی ہے جیسا کہ آپ نے ان آیات میں ملاحظہ فرمایا اور کبھی اس کے ذریعہ مذمت بھی ہوتی ہے جس طرح کہ کفار کی عزت کے متعلق ارشاد ہوتا ہے بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ (بلکہ جو لوگ کافر ہیں وہ عزت کے گھمنڈ میں ہیں اور مخالفت میں) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جو عزت اللہ اور رسول اور مسلمانوں کی ہے وہ دائمی ہے اور باقی اور وہی حقیقی عزت ہے اور کافر کی جو عزت ہے وہ تو زبردستی کی عزت ہے جو حقیقت میں عزت نہیں بلکہ ذلت ہے۔ چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے كُلُّ عِزٍّ لَيْسَ بِاللّٰهِ فَهُوَ ذُلٌّ (جو عزت اللہ کے ذریعہ سے نہیں وہ تو ذلت ہے) اور اسی معنی میں ارشاد ہے: وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا (اور ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اور معبود تجویز کر رکھے ہیں تاکہ وہ ان کے لیے باعث عزت ہوں) اور عذاب سے روک سکیں۔ اور یہ جو ارشاد ہے مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا (جس کو چاہیے عزت تو اللہ کی ہے عزت ساری) اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی عزت چاہتا ہے اُسے اس بات کی ضرورت ہے کہ اللہ کے یہاں سے عزت حاصل کرے، کیوں کہ عزت تو کل اسی کی ہے اور کبھی بطور استعارہ عزت کا استعمال حمیت بیجا اور مذموم خود داری کے لیے بھی ہوتا ہے جیسے اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ اسے لے آتی ہے حمیت گناہ پر) $\frac{2}{9}$ $\frac{5}{17}$ $\frac{11}{12}$ $\frac{19}{7}$

پ ۲۲ ۱۴، پ ۲۳ ۹ و ۱۰، پ ۲۸ ۱۳

**عُزّٰی**: عُزّٰی ایک بت کا نام ہے مولانا سید سلیمان ندوی ارض القرآن لکھتے ہیں:-

"اَلعُزّٰی اس کے متعلق یہ تو ظاہر ہے کہ یہ (عزّ) سے مشتق ہے جس کے معنی غلبہ کے ہیں "عزّ" کا اسم تفضیل مؤنث عُزّٰی ہے، یعنی بہت غالب آنے والی دیبی" عجب نہیں کہ یہ قریش اور ان کے ہم نسب قبائل کی لڑائی کی دیبی ہو اور غالباً یہی سبب ہے کہ جنگ اُحد میں جب مسلمانوں کو شکست ہوئی اور وہ کوہ اُحد پر چڑھ گئے تو ابوسفیان نے دامن کوہ میں کھڑے ہو کر مسلمانوں کو خطاب کر کے عزیٰ کی جے پکاری تھی کہ لنا العزیٰ ولا عزیٰ لکم ہماری طرف عزیٰ ہے تمہاری طرف کوئی عُزّٰی نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے حضرت عمر نے اس کے جواب میں فرمایا اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم ہمارا آقا اللہ ہے تمہارا کوئی آقا نہیں (صحیح بخاری، غزوہ اُحد)[1]

اور آگے چل کر لکھتے ہیں:-

عُزّٰی ایک درخت تھا اس کے نیچے ایک بُت تھا، چاروں طرف چار دیواری تھی"[2]

اور سیرۃ النبی میں تحریر فرماتے ہیں:-

"عزیٰ ایک درخت تھا، اس کے پاس ایک بُت تھا یہ قبیلہ غطفان کا بت تھا، لیکن قریش بھی اس کی نہایت عزت کرتے تھے اور اس کی زیارت کو جاتے تھے قریش جب کعبہ کا طواف کرتے تھے تو یہ پڑھتے تھے

| | |
|---|---|
| اللات والعزیٰ | لات، عُزّٰی اور تیسرا |
| ومناۃ الثالثۃ | منات یہ بڑے برگزیدہ |
| الاخریٰ انہن | ہیں اور ان کی سفارش |
| الغرانیق العلیٰ | کی خدا کے ہاں اُمید |
| وان شفاعتہن | ہے۔ |
| لترتجی | |

(معجم البلدان لفظ "لات" وکتاب الاصنام للکلبی مطبوعہ دار الکتب المصریہ ۱۳۲۳ھ ص ۱۹)[3]

سید صاحب نے عُزّٰی کے بارے میں جو یہ فرمایا ہے کہ "عجب نہیں کہ جو یہ قریش اور ان کے ہم نسب

[1] ارض القرآن ج ۲۔ ص ۳۵ طبع معارف اعظم گڑھ ۱۳۲۲ھ [2] ایضاً۔ ص ۳۷
[3] سیرۃ النبی۔ ج ۴۔ ص ۱۹۵ طبع معارف اعظم گڑھ ۱۳۵۰ھ۔

قبائل کی لڑائی کی وجہ ہو یہ محض سید صاحب موصوف کا قیاس ہے۔ تاریخ اور تفسیر کی کتابیں اس کے ذکر سے خاموش ہیں۔

تاج العروس میں ابن سیدہ سے منقول ہے کہ عُزّیٰ، اَعَزّ کی تانیث ہے جیسے کہ فُضلیٰ اَفضل کی اس صورت میں اَلعُزّیٰ کا الف لام زائد نہیں بلکہ الحارث اور العباس کی طرح ہے اور قاعدہ کے لحاظ سے زائد ہونا چاہیئے کیوں کہ جس طرح الصغریٰ اور الکبریٰ کا استعمال صفات کے سلسلہ میں سنا ہے اس طرح اَلعُزّیٰ کا نہیں سُنا،،

مشرکین اپنے دیوتاؤں کے نام زیادہ تر مؤنث رکھتے تھے چنانچہ لات عُزّیٰ اور منات تینوں مؤنث ہیں وہ ان کو العیاذ باللہ خدا کے قدوس کی بیٹیاں سمجھ کر پوجتے تھے۔ امام محمد بن جریر طبری المتوفی ۳۱۰ھ نے جو کہ بڑے مشہور مفسر اور مؤرخ گزرے ہیں، عزّیٰ کے متعلق مفسرین سلف سے حسب ذیل اقوال نقل کیے ہیں:۔

مجاہد:۔ یہ کھجور درخت تھے۔

سعید بن جبیر: یہ ایک سفید پتھر تھا۔

ابن زید: یہ طائف کا ایک مسٹھ تھا۔

قتادہ: یہ بطن نخلہ میں تھا۔ [1]

قاموس میں ہے کہ عُزّیٰ ایک کیکر کا درخت تھا جس کی قبیلہ غطفان پوجا کیا کرتا تھا۔ ظالم بن اسعد نے سب سے پہلے اس کی پرستش شروع کی تھی، یہ ذات عرق سے اوپر بستان کی طرف نو میل پر تھا اور علامہ ابو حیان اندلسی نے ابو عبیدہ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ عزّیٰ اور مناۃ کعبہ میں تھے، علامہ موصوف نے ان سب اقوال میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ یہ ممکن ہے کہ طائف، بطن نخلہ اور کعبہ شریف تینوں مقام پر اس کی مورتیاں رکھی ہوں اور ہر ایک نے اپنے علم میں اس نام کا بت جہاں رکھا تھا، اس کو بتایا۔ [2]

اور حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:۔

"عُزّیٰ ایک درخت تھا، جہاں ایک عمارت بنی ہوئی تھی اور اس پر پردے پڑے رہتے تھے یہ مقام نخلہ میں تھا جو طائف اور مکہ مکرمہ کے درمیان ہے۔ قریش اس کی بڑی عظمت کرتے تھے چنانچہ ابو سفیان نے اُحد کے دن کہا تھا لنا العزّیٰ ولا عزّیٰ لکم اور سول اللہ

[1] تفسیر ابن جریر ج ۲۷ - ص ۳۲ [2] البحر المحیط - ج ۸ - ص ۱۶۱ طبع مصر ۱۳۲۸ھ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا جواب دو اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم، بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے قسم کھائی اور اپنی قسم میں واللات والعزیٰ کہا یعنی لات وعزیٰ کی قسم، اُسے چاہیئے کہ لا الہ الا اللہ کہے اور جس نے اپنے ساتھی سے یوں کہا کہ آ جوا کھیلیں، تو صدقہ دے، یہ حکم اس شخص کے بارے میں ہے کہ جس کی زبان سے بے ساختہ یہ کلمات نکل جائیں جس طرح سے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگوں کی زبانوں پر یہ الفاظ چڑھے ہوتے تھے چنانچہ نسائی نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ میری زبان سے لات وعزیٰ کی قسم نکل گئی تو میرے ساتھیوں نے مجھ کو ٹوکا کہ تم نے بُرا کیا اور بیہودہ بات زبان سے نکالی، میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر واقعہ عرض کیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ کہو لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علیٰ کل شیئ قدیر اور تین دفعہ بائیں طرف تھتکار دو، اور

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم پڑھو اور آئندہ کے لیے ایسا نہ کرو"

اس کے بعد ابن اسحٰق کی کتاب السیرۃ سے ناقل ہیں کہ

"اہل عرب نے کعبہ شریف کے علاوہ بھی بہت سے استھان بنا رکھے تھے، چنانچہ متعدد بت خانے ایسے تھے جن کی وہ خانہ کعبہ کی طرح سے تعظیم کرتے تھے ان بت خانوں میں پجاری اور دربان بھی ہوتے تھے اور کعبہ کی جس طرح ہدی جاتی ہے یہاں بھی جاتی تھی، طواف بھی ہوتا تھا اور قربانی بھی ہوتی تھی، حالانکہ وہ ان بت خانوں پر کعبہ کی فضیلت بھی مانتے تھے، کیوں کہ انہیں اس بات کا علم تھا کہ کعبہ حضرت ابراہیم علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کا عبادت کدہ اور آپ کی مسجد ہے۔

چنانچہ مقام نخلہ میں قریش یا اور بنی کنانہ کی دیوی عزیٰ تھی اور اس کے پجاری اور دربان قبیلہ سلیم میں سے بنی شیبان تھے جو بنی ہاشم کے حلیف تھے۔

میں ابن کثیر کہتا ہوں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کو عزیٰ کی طرف بھیجا تھا تاکہ اس کو

Marfat.com

جا کر گرا دیا، گراتے وقت آپ یہ شعر پڑھ رہے تھے

یا عُزّیٰ کفرانک لا سبحانکِ ، انی رأیت اللہ قد اھانکِ

اے عُزّیٰ تیرا انکار ہے، تیری پاکی نہیں۔ میں نے دیکھ لیا کہ اللہ نے تجھے ذلیل کر دیا۔

نسائی حضرت ابو الطفیل رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ شریف کو فتح فرما لیا تو حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کو نخلہ کی جانب بھیجا جہاں عُزّیٰ دیوی رہتی تھی، چنانچہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ وہاں آئے اس مقام پر ببول کے تین درخت تھے آپ نے سب کو کاٹ ڈالا اور اس گھر کو گرا دیا۔ جو اس پہ بنا تھا۔ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت مبارک میں حاضر ہو کر اس کی اطلاع دی تو آپ نے فرمایا واپس جاؤ تم نے کچھ نہ کیا، حضرت خالد رضی اللہ عنہ واپس ہوئے۔

پجاریوں نے جو دربان بھی تھے ان کو آتے دیکھا تو عُزّیٰ کی جے لگاتے ہوئے پہاڑ کے اندر جا گھسے، اب جو حضرت خالد رضی اللہ عنہ یہاں آئے تو ایک عورت کو دیکھا برہنہ، بال بکھرے ہوئے، سر پر خاک اُڑ رہی ہے، آپ نے تلوار اس کے جسم میں اُتار دی اور اُسے قتل کر دیا۔ اور واپس آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع کی تو آپ نے فرمایا کہ عُزّیٰ یہی تھی"۔[1]

یہاں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ ابو المنذر ہشام کلبی نے جو کتاب الاصنام میں یہ لکھ دیا ہے :۔

| | |
|---|---|
| وقد بلغنا ان | اور ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ |
| رسول اللہ صلی | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم |
| اللہ علیہ وسلم | نے ایک روز عُزّیٰ کا ذکر کیا |
| ذکرھا یوما | اور فرمایا کہ میں نے عُزّیٰ پر |
| فقال لقد | ایک خاکی رنگ کی بھیڑ چڑھائی |
| اھدیت للعزّٰی | بھی جبکہ میں اپنی قوم کے دین |
| شاۃ عفراء وانا | پر تھا۔ |
| علی دین قومی[2] | |

سو محض واہیات ہے۔ اوّل تو ہشام کلبی رافضی مشہور دروغ گو ہے اس پر طرہ یہ کہ اس کی کوئی سند

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۲۵۳، ۲۵۲ طبع مصر ۱۳۷۶ھ [2] کتاب الاصنام ص ۱۹ طبع امیریہ قاہرہ ۱۳۳۲ھ ۔

Marfat.com

بھی نہیں بلکہ بلاغ ہے، خدا جانے کس طریقہ سے یہ روایت اس تک پہنچی، اور پھر اس پر تمام اہل حق کا اجماع ہے کہ انبیاء علیہم السلام نبوت سے پہلے بھی شرک و کفر سے معصوم تھے۔

اسی طرح بخاری کی تاریخ صغیر میں ہشام بن عروہ کی زبانی یہ منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صاحبزادہ عبد العزیٰ نامی حضرت خدیجہ کے بطن سے ہوا جو زمانہ اسلام سے قبل فوت ہو گیا۔[1] یہ بھی محض غلط ہے، چنانچہ امام طحاوی، بیہقی، ابن الجوزی، ابن ناصر اور حافظ قطب الدین حلبی وغیرہ بڑے بڑے محدثین نے اس واقعہ کے غلط ہونے کی تصریح کی ہے۔[2]

## ۲۷ - عُزَيْرٌ

عُزَيْرٌ: ایک مشہور اسرائیلی بزرگ کا نام جن کے متعلق عرب کا یہ عقیدہ تھا کہ نعوذ باللہ یہ اللہ تعالیٰ کے فرزند ہیں علامہ ابو حیان اندلسی غرناطی المتوفی ۷۵۴ھ اپنی مشہور تفسیر البحر المحیط میں رقمطراز ہیں:-

"عاصم اور کسائی نے عُزَيْرٌ تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اس خیال سے کہ یہ عربی لفظ ہے اور باقی قراء سبعہ عاذِر، عِیذار اور عزرائیل کی طرح عجمیت اور علمیت کی بنا پر اس کو بغیر تنوین کے غیر منصرف پڑھتے ہیں بہرحال دونوں قراءتوں پر آیت میں لفظ ابن اس کی خبر ہے، اور ابو عبید نے کہا ہے کہ یہ عجمی ہے اور تصغیر کی بنا پر خفیف اس لیے منصرف ہے جیسے کہ نوح، لوط اور ہود ہیں، اور بعض نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ بات اس لیے صحیح نہیں کہ یہ لفظ چار حرفی ہے اور مُصَغَّر نہیں بلکہ عجمی نام ہے جو مصغر کے وزن پر آیا ہے جیسے کہ سلیمان بروزن عثمان ہے مگر مصغر نہیں ہے۔"[3]

عام طور پر مشہور ہے کہ عزیر انبیاء بنی اسرائیل میں تھے لیکن علامہ محمود آلوسی روح المعانی میں لکھتے ہیں:-

واختلف في عزير — اس میں اختلاف ہے
هل هو نبي ام لا — کہ آیا عزیر نبی تھے یا
والاكثرون على — نہیں، اکثر علماء ان کو

---

[1] تاریخ صغیر ص ۳۔ طبع انوار احمدی الہ آباد [2] ملاحظہ ہو شرح الزرقانی علی المواہب اللدنیہ ج ۳ طبع مصر ۱۳۲۶ھ [3] البحر المحیط - ج ۵ - ص ۳۱ طبع مصر ۱۳۲۸ھ

الثانی [1] نبی نہیں مانتے۔
چنانچہ شیخ جلال الدین سیوطی نے بھی الاتقان
فی علوم القرآن میں ان ہی لوگوں میں ان کا
نام لیا ہے جو نبی اور رسول نہ تھے۔[2]
مولانا سید سلیمان ندوی، ارض القرآن میں
لکھتے ہیں:۔

"عزیر سے مراد عزرا کاہن ہیں جنہوں نے
تورات کو اپنے اعجاز سے دوبارہ زندہ کیا
معترضین اسلام کا بیان ہے کہ یہودیوں
میں عزیر کی ابنیت کا کوئی عقیدہ نہیں ہے
اس لیے قرآن کا یہ دعویٰ سراسر خلاف واقع
ہے۔ اس اعتراض کا سرسری جواب تو
جیسا بیضاوی نے لکھا ہے یہ ہے کہ قرآن
نے اپنی یہ آواز مدینہ میں یہودیوں کے مجمع کے
اندر بلند کی، اور کہیں سے اس کی تکذیب
اور خلاف واقعیت کی صدا نہ اٹھی
اس سے یہ معلوم ہوا کہ عرب کے یہودیوں
میں یہ اعتقاد موجود تھا، ابن
جریر طبری نے حضرت ابن عباس
سے روایت کی ہے کہ مدینہ میں اس اعتقاد
کے لوگ موجود تھے۔ ابن حزم نے ملل میں
لکھا ہے کہ یہودیوں کا صدوقی فرقہ جو
یمن میں تھا اسی کا یہ عقیدہ تھا۔
(جلد اول صفحہ ۹۹)

میرے نزدیک اصل یہ ہے کہ یہودیوں
میں ابنیت کا تخیل نہایت قدیم ہے تکوین
کے چھٹے باب میں ہے کہ:۔
"خدا کے بیٹوں نے دیکھا کہ انسان کی
بیٹیاں خوب صورت ہیں"
"ابن اللہ" کے معنی عبرانیوں کے محاورے
میں خدا کے محبوب اور پیارے کے تھے اسی
لیے مسلمانوں کے مقابلہ میں عرب کے یہودیوں
اور عیسائیوں کا دعویٰ تھا:
وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى ہم خدا کے فرزند
نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ۔ ہیں اور اس کے
(مائدہ) چہیتے۔
ایسی حالت میں یہود عرب اگر عیسائیوں
کے مقابلہ میں ان کا غرور توڑنے کے لیے

---

[1] روح المعانی۔ ج ۱۰۔ ص ۸۲۔ طبع منیر مصر۔ [2] ملاحظہ ہو الاتقان فی علوم القرآن کی النوع الرابع والستون (ج ۲ - ص ۱۴۲ طبع جدید مطبوعہ مصر)

حضرت عُزیر کو حضرت عیسیٰ کا مماثل اور ہمسر قرار دیتے ہوں تو کیا عجب ہے قرآن نے بھی اسی موقع پر یہودیوں کے اس قول کو نقل کیا ہے چنانچہ پوری آیت یہ ہے

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ۔ (توبہ)

یہود نے کہا عزیر خدا کا بیٹا ہے، اور نصاریٰ نے کہا مسیح خدا کا بیٹا ہے یہ اُن کا صرف زبانی دعویٰ ہے یہ اگلے کافروں کی بات کی نقل اتارتے ہیں۔

آیت بالا کے اخیر حصہ کا مطلب بیان کرنے میں ہمارے مفسرین مضطرب البیان ہیں کہ ابنیت کے مسئلہ پر یہ کسی اگلی قوم کے عقیدہ کی نقل اتارتے ہیں، درحقیقت یہ تخیل تمام بت پرست قوموں کی میتھالوجی کا جزو رہا ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ عیسائیوں نے جس قوم سے اس عقیدہ کو حاصل کیا وہ اہل مصر ہیں اور یہودی فرقہ نے عیسائیوں کی دیکھا دیکھی یہ کلمہ منہ سے نکالا؎[1]

مولانا شبیر احمد عثمانی نے شیخ الہند کے ترجمہ قرآن مجید کے حواشی پر یہ بھی لکھا ہے کہ:۔

"ہم سے ایک نہایت ثقہ بزرگ حاجی امیر شاہ خاں مرحوم، نے بیان کیا کہ سیاحت فلسطین وغیرہ کے دوران میں مجھے بعض یہود اس خیال کے ملے جن کو اسی عقیدہ کی نسبت سے "عزیری" کہا جاتا ہے"؎[2]

حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں تصریح کی ہے کہ:

"بہت سے علماء نے کہا ہے کہ تورات کا تواتر حضرت عزیر کے زمانہ میں ختم ہو گیا تھا"؎[3]

۱۰
۱۱
**عَزِيْزٌ:** غالب، زبردست، قوی، گرامی قدر، مشاق، دشوار، شاہ مصر و اسکندریہ کا لقب عِزَّةٌ سے فَعِيْلٌ کے وزن پر بمعنی فاعل مبالغہ کا صیغہ ہے۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں

؎[1] ارض القرآن ج ۲۔ ص ۱۹۶ ؎[2] ملاحظہ ہو حواشی سورۂ توبہ ص ۲۴۰ طبع مدینہ پریس بجنور
؎[3] البدایہ والنہایہ ج ۲۔ ص ۴۶ طبع مصر۔

عَزِیْزٌ وہ ہے جو غالب ہو مغلوب نہ ہو، ارشاد ہے هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (وہ زبردست ہے حکمتوں والا) اور يَا اَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا (اے عزیز پڑی ہم پہ) عَزَّ عَلَيَّ كَذَا کے معنی شاق اور گراں گزرنے کے ہیں ارشاد ہے عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ (شاق ہے اس پر یہ کہ تم ایذائیں پڑو) اور عَزَّ الشَّيْءُ کے معنی ہیں کمیاب ہونا، اسی معنی میں جس معنی میں کہ یہ مقولہ ہے کل موجود مملول وکل مفقود مطلوب (ہر موجود چیز سے اکتایا جاتا ہے اور ہر مفقود کو تلاش کیا جاتا ہے) اور یہ جو ارشاد ہے اِنَّهٗ لَكِتَابٌ عَزِيْزٌ (بلاشبہ یہ کتاب ہے نادر) یعنی اس کا حصول اور اس جیسی کتاب کا وجود دشوار ہے" اور سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں رقمطراز ہیں کہ:

عَزِیْزٌ شاہ مصر و اسکندریہ کا بھی لقب ہے جس طرح سے کہ شاہ حبشہ کو نجاشی اور شاہ روم کو قیصر کہتے ہیں۔ چنانچہ آیہ شریفہ يَا اَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ (اے عزیز آپڑی ہم پہ اور ہمارے گھر پہ سختی) میں عَزِیْزٌ کی یہی تفسیر کی گئی ہے

نیز عَزِیْزٌ حق تعالیٰ کی صفات اور اس کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے، زجاج نے اس کے معنی کیے ہیں "الیا زبردست جس پہ کوئی چیز غالب نہ ہو سکے" اور دوسرے لوگوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے "قوی جو ہر شے پہ غالب ہو" اور بعض نے کہا ہے کہ عَزِیْزٌ وہ ہے کہ جس کی مثل کوئی نہ ہو" اور ارشاد الٰہی وَاِنَّهٗ لَكِتَابٌ عَزِيْزٌ لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (اور یہ کتاب ہے نادر اس پر جھوٹ کا دخل نہیں آگے اور نہ پیچھے سے) کا مطلب یہ ہے کہ الحاق سے محفوظ اور بالاتر ہے" اور امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں فرماتے ہیں:-

"حلیمی رحمہ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ عزیز کے معنی ہیں اس ذات کے جس تک رسائی نہ ہو سکے اور نہ کسی نامناسب بات کا عمل دخل اس پر ممکن ہو کیوں کہ عزیز عربی زبان میں عزۃ سے مشتق ہے جس کے معنی صلابت

یعنی سخت ہونے کے ہیں۔ اس لیے اللہ کو "عَزِیْزٌ" کہنے کا مطلب ہے اس کے قدیم ہونے کا اعتراف کرنا اس طرح کہ جس قدرت اور جس قوت کے ساتھ وہ ہمیشہ سے چلا آرہا ہے اس میں ذرا تبدیلی کی گنجائش نہیں جس کا نتیجہ ہے اللہ کو پاک سمجھنا ان تمام باتوں سے کہ جو مخلوق میں ہو سکتی ہیں کیوں کہ وہ اپنی ذات سے قدیم نہ ہونے کے باعث حوادث و تغیرات کا آماجگاہ رہتی ہے۔

اور ابو سلیمان (امام خطابی صاحب معالم السنن شرح سنن ابی داؤد) رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "عَزِیْزٌ ایسا غالب ہے جو مغلوب نہ ہو" عِزٌّ کے معنی کبھی تو غلبہ کے آتے ہیں چنانچہ عَزَّ یَعُزُّ، یَعُزُّ کی عین کے پیش کے ساتھ اسی معنی میں آتا ہے اور کبھی اس کے معنی شدت اور قوت کے ہوتے ہیں اس لیے عَزَّ یَعَزُّ بفتح العین آتا ہے اور کبھی گرامی قدر ہونے کیلئے آتا ہے چنانچہ عَزَّ یَعِزُّ بکسر العین اسی معنی میں مستعمل ہے۔ لہٰذا عَزِیْزٌ کے معنی ہوئے وہ ذات جس کا کوئی عدیل و مثیل نہ ہو" واللہ

اعلم [1]

۱/۱۵ ، ۲/(۹، ۱۱، ۱۲، ۱۵) ، ۳/(۳، ۹، ۱۰، ۱۴) ، ۴/۴ ، ۶/۱۰

۷/(۳، ۴، ۱۸) ، ۹/۱۵ ، ۱۰/(۳، ۴، ۵، ۱۲، ۱۵) ، ۱۱/۵

۱۲/(۶، ۸، ۱۴، ۱۶) ، ۱۳/(۳، ۴، ۱۲، ۱۵، ۱۹) ، ۱۴/۱۳ ، ۱۷/(۱۳، ۱۷)

۱۹/(۵، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶)

۲۰/(۲، ۱۵، ۱۶) ، ۲۱/(۴، ۶، ۱۰، ۱۲، ۱۴) ، ۲۲/(۷، ۹، ۱۳)

۲۲/(۱۵، ۱۶، ۱۸) ، ۲۳/(۲، ۱۰، ۱۴، ۱۵) ، ۲۴/(۱، ۴، ۱۰، ۱۶، ۱۹)

۲۵/(۲، ۳، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۲۰) ، ۲۶/۱ ، ۲۷/(۱۰، ۱۷، ۱۹)

۲۸/(۳، ۴، ۶، ۷، ۹، ۱۱، ۱۲) ، ۲۹/۱ ، ۳۰/۱۰

عَزِیْزًا ۵/۵ ، ۶/(۲، ۳) ، ۲۱/۱۹ ، ۲۶/(۹، ۱۱)

**عِزِیْنَ**: گروہ گروہ، جماعت جماعت، جوق جوق۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:۔ "عِزِیْنَ کے معنی ہیں متفرق جماعتیں اس کا واحد ہے عِزَۃٌ یہ اصل میں عَزْوَۃٌ تھا عَزَوْتُہٗ فَاعْتَزٰی سے ہے یعنی میں نے اس کو نسبت کی تو وہ منسوب ہو گیا گویا عِزَۃٌ وہ جماعت ہوتی کہ جس کا ایک فرد دوسرے کی طرف منسوب ہو ولادت میں یا ایک دوسرے کی پشت پناہی میں، اور اسی سے ہے الاعتزاء فی الحرب یعنی جنگ میں اپنا انتساب بتانا،

---

[1] کتاب مذکور ص ۲۴۳ طبع انوار احمدی الٰہ آباد۔

مثلاً یہ کہنا کہ انا ابن فلان (میں ہوں فلاں کا بیٹا)، انا صاحب فلان (میں ہوں فلاں کا ساتھی)

اور بعض کہتے ہیں کہ عِزِیْنَ عَزَاھُنَا ہُ فَھُوَ عَزٍ سے نکلا ہے جس کے معنی آتے ہیں بتکلف صبر کرنے اور دوسرے کو اسی حال میں دیکھ کر تسلی پانے کے گویا عِزَۃٌ اس جماعت کا نام ہے کہ جو ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر تسلی پاتی رہتی ہے"

اور علامہ ابو حیان اندلسی البحر المحیط میں رقمطراز ہیں :-

عِزِیْنَ جمع ہے عِزَۃٌ کی، ابو عبیدہ نے اس کے معنی متفرق جماعتوں کے بیان کیے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ تین تین چار چار آدمیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں مراد ہیں، اصمعی کا بیان ہے کہ فِی الدَّارِ عِزُوْنَ کے معنی ہیں گھر میں مختلف قسم کے لوگ ہیں۔

عِزَۃٌ کا لام کلمہ محذوف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حرف محذوف واو ہے اور اس کی اصل عِزْوَۃٌ ہے گویا ہر ٹولی اس کی طرف منسوب ہے جس کی طرف دوسری ٹولی منسوب نہیں اور اسی لیے وہ جدا جدا ہیں، کہا جاتا ہے عَزَاہُ یَعْزُوْہُ وہ یعنی اس نے اپنے کو دوسرے کی طرف منسوب کیا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا لام کلمہ ہا ہے اور یہ اصل میں عِزْھَۃٌ تھا۔ اور جس طرح کہ سَنَۃٌ اور اس کے نظائر کی جمع واؤ نون کے ساتھ آتی ہے اسی طرح عِزَۃٌ کی جمع بھی آتی ہے اور جمع میں اس کی عین پر کسرہ اور ضمہ دونوں آتے ہیں" [1] ۲۹/۸

# فصل السین المہملۃ

عُسْرٌ : دشواری، مشکل، سختی، تنگی۔ یُسْرٌ (آسانی) کی ضد ہے، اس کے معنی سخت اور دشوار ہونے کے ہیں یہ مصدر ہے اور اس کا فعل باب کَرُمَ اور کَتَمَ سے آتا ہے، چونکہ فقیری میں بھی تنگی اور سختی ہوتی ہے اس لیے تنگدست ہونے میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ قاموس میں ہے کہ

عُسْرٌ بالضم اور بضمتین یعنی عُسُرٌ اور

[1] البحر المحیط۔ ج ۸۔ ص ۳۲۰

بالتحریک یعنی عَسَرٌ، عُسْرٌ کی ضد ہے"
اور علامہ سید مرتضٰی زبیدی اس کی شرح
تاج العروس میں لکھتے ہیں:-
"عیسٰی بن عمر کا بیان ہے کہ ہر وہ اسم جو سہ
حرفی ہو اور اس کے پہلے حرف پر پیش ہو اور
بیچ کا حرف ساکن ہو اس کو بعض عرب حرکت
دیتے ہیں اور بعض ساکن رکھتے ہیں جیسے عُسُرٌ
اور عُسْرٌ اور حُلُمٌ اور حُلْمٌ، اس کے
معنی تنگی، سختی اور دشواری کے ہیں، اللہ تعالیٰ
فرماتا ہے سَیَجْعَلُ اللّٰہُ بَعْدَ عُسْرٍ یُّسْرًا
(اب کر دیگا اللہ سختی کے پیچھے کچھ آسانی) نیز
ارشاد ہوتا ہے فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ
مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا (سو البتہ مشکل کے ساتھ
آسانی ہے، البتہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے)
حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے
کہ انہوں نے اس آیت کو تلاوت کر کے
فرمایا لن یغلب عسر یسرین (ایک عسر
یسروں پر ہرگز غالب نہیں ہو سکتی) ابو العباس
سے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس قول
کی تفسیر اور اس کی مراد کو دریافت کیا
گیا تھا تو ابو العباس نے کہا کہ فراء نے
بیان کیا ہے کہ عرب جب ایک دفعہ نکرہ
بول کر دوبارہ پھر اسی نکرہ کو لائیں تو وہ دو نکرے
ہو جاتے ہیں اور جب دوبارہ معرفہ کر کے ذکر
کریں تو پھر وہی ایک چیز رہتی ہے چنانچہ یہ
کہا جائے کہ اذا کسبت درھما فانفق
درھما (جب تو ایک درم کمائے تو دوسرا
درم خرچ کر) تو یہاں درم ثانی درم اول کے
علاوہ سمجھا جائیگا لیکن اگر دوسری دفعہ الف
لام کے ساتھ اس کا ذکر ہوگا تو بعینہ وہی درم
مراد ہوگا۔ چنانچہ اگر یہ کہو کہ اذا کسبت
درھما فانفق الدرھم (جب تو ایک
درم کما لائے تو اس درم کو خرچ کر) تو یہاں
درم ثانی سے وہی درم اول مراد ہوگا۔
ابو العباس کہتے ہیں یہی معنی حضرت ابن
مسعود رضی اللہ عنہ کے قول کے بھی ہیں کہ
حق تعالےٰ شانہ نے جب عسر کا ذکر فرما کر
دوبارہ الف لام کے ساتھ اسے ذکر فرما کر
معلوم ہوا کہ اس سے مراد وہی عسر مذکور ہے
اور جب یسر کو ذکر فرما کر بغیر الف لام کے
اس کا اعادہ فرمایا تو معلوم ہوا کہ یسر ثانی
یسر اول کے علاوہ ہے، لہٰذا عسر ثانی

عسر اول ہی رہا اور "یسر ثانی" اس یسر کے علاوہ ہوا کہ جس کا ابتداء میں ذکر آ چکا ہے"

پ ۲/۷ پ ۲۸/۱۱ پ ۳۰/۱۹ عُسْرًا ۱۵/۲۲

**عَسِیْرٌ** : دشوار، سخت، مشکل، عُسْرٌ سے صفت مشبہ کا صیغہ۔ پ ۲۷/۸

**عُسْرَةٌ** : تنگی، تنگدستی، مفلسی، اسم ہے قاضی محمد بن علی شوکانی لکھتے ہیں:۔

العسر تضیق الحال من جهة عدم المال[1] — عسرت کہتے ہیں مال نہ ہونے کے سبب حالت کے تنگ ہونے کو۔

"ساعة العسرة" مشکل کی گھڑی" سے مراد غزوہ تبوک کی سختی کا زمانہ ہے کیونکہ اس وقت سخت قحط اور شدت کی گرمیاں تھیں، پھر کھجور کا موسم اور سفر لمبا، بے سروسامانی کا یہ عالم کہ ایک ایک کھجور پر دو دو سپاہیوں نے گزارہ کیا بلکہ بہت سے مجاہدین نے تو صرف ایک ہی کھجور کو باری باری چوس کر اوپر سے پانی پی لیا اور لشکر خلا دا کیا پھر پانی کی قلت بھی اتنی ہو گئی تھی کہ بعض لوگ اونٹوں کے اوجھ کی آلائش نچوڑ کر پینے پر مجبور ہو گئے ادھر سواری کی کمی کا یہ حال تھا کہ دس دس آدمی ایک ایک اونٹ پر باری باری سے سوار ہو کر چلے آ رہے تھے ایسی مشکلات تھیں جن کی بنا پر اس غزوہ کو "غزوة العسرة" اور اس لشکر کو "جیش العسرة" کہا جاتا ہے، یہ غزوہ ماہ رجب ۹ سنہ ہجری میں پیش آیا تھا۔ پ ۱۱/۳

**عُسْرٰی** : سختی، دشواری، سخت چیز، مشکل کام، عُسْرٌ سے افعل التفضیل کا صیغہ واحد مؤنث اَعْسَر کی تانیث ہے، تاج العروس میں ہے کہ مفسرین نے عُسْرٰی سے عذاب مراد لیا ہے

پ ۳۰/۱۷

**عَسْعَسَ** : رات کا اندھیرا چھا گیا، رات کا اندھیرا چلا گیا، یہ بروزن فَعْلَلَ، عَسْعَسَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے امام ابوجعفر بیہقی تاج المصادر میں لکھتے ہیں:۔ "عسعس اللیل کے معنی ہیں رات کا اندھیرا چھا گیا، نیز رات کا اندھیرا چلے جانے کے لیے" بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے لہٰذا یہ کلمہ اضداد میں سے ہے۔ اسی باب سے یہ آیہ کریمہ ہے وَاللَّیْلِ اِذَا عَسْعَسَ (اور قسم ہے رات کی جب پھیل جاوے یا قسم ہے رات کی جب وہ جانے لگے)

[1] فتح القدیر۔ ج ۱ - ص ۱۶۸ - طبع مصر۔

اور آیت وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ (اور قسم ہے صبح کی جب وہ سانس لیوے) اس بات کو بتلاتی ہے کہ یہاں عَسْعَسَ بمعنے أَدْبَرَ (رات نے منہ پھیرا) کے لینا زیادہ بہتر ہے اور بعض کہتے ہیں کہ سَعْسَعَ کا مقلوب ہے، اور سَعْسَعَ کی ترکیب کسی چیز کے چلے جانے کو بتلاتی ہے اور یہی ابن فارس کا قول ہے"

اور امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں رقمطراز ہیں :-

وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ میں عَسْعَسَ کے معنی أَقْبَلَ اور أَدْبَرَ دونوں کے ہیں (یعنی رات کا اندھیرا چھانے کے بھی اور چھٹ جانے کے بھی) اور یہ کیفیت رات کی ابتدا میں بھی ہوتی ہے اور انتہا میں بھی، لہذا عَسْعَسَةٌ اور عَسَاسٌ کے معنی ہوئے ہلکا ہلکا اندھیرا ہونے کے اور یہ رات کے دونوں اطراف میں ہوتا ہے" ٣٠/٦

**عٓسٓقٓ** : عین، سین، قاف، حروف مقطعات ہیں جن کے معانی کا صحیح علم حق تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے (ملاحظہ ہو الٓمٓ) ٢٥/٢

**عَسَل** : شہد، یہ لفظ مذکر اور مونث دونوں طرح مستعمل ہے، مگر تانیث کا استعمال زیادہ ہے علامہ مجدالدین فیروزآبادی مصنف قاموس نے ایک مستقل رسالہ ترقیق الاسل لتصفیق العسل شہد کے منافع اور اس کے اسماء میں تصنیف کیا ہے۔ ٢٦/٦

**عَسَىٰ** : عنقریب ہے، شتاب ہے، ممکن ہے، توقع ہے، اندیشہ ہے، کھٹکا ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن میں لکھتے ہیں :-

" عَسَىٰ فعل جامد ہے، غیر منصرف اور اسی بنا پر ایک جماعت کا دعویٰ ہے کہ یہ حرف ہے، اس کے معنی پسندیدہ بات میں امید کے اور ناپسندیدہ میں اندیشہ اور کھٹکے کے ہیں اور یہ دونوں معنی اس آیت کریمہ میں جمع ہو گئے ہیں، وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَكُمْ اور توقع ہے کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور وہ بہتر ہو تمہارے حق میں اور خدشہ ہے کہ ایک چیز تم کو بھلی لگے اور وہ بری ہو تمہارے حق میں)

Marfat.com

ابن فارس کا بیان ہے کہ عَسٰی قرب اور نزدیکی کے لیے آتا ہے، جیسے قُلْ عَسٰی اَنْ یَّکُوْنَ رَدِفَ لَکُمْ (تو کہہ کیا بعید ہے جو تمہاری پیٹھ پر پہنچ چکی ہو) اور کسائی نے کہا ہے کہ ہر وہ جگہ جہاں قرآن مجید میں عَسٰی خبر کے لیے آیا ہے بصیغہ واحد آیا ہے جیسا کہ آیت سابقہ میں ہے اور اس کے معنی ہوں گے عسی الامر ان یکون کذا یعنی توقع ہے کہ معاملہ یوں ہو، اور جہاں استفہام کے لیے آتا ہے بصیغہ جمع ہوتا ہے جیسے فَهَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ تَوَلَّیْتُمْ (پھر تم سے یہی اندیشہ ہے کہ اگر تم کو حکومت مل جائے) ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ هَلْ عَسَیْتُمْ بمعنی هَلْ عَرَفْتُمْ ذٰلِكَ (کیا تم نے جان لیا) اور هَلْ اَخْبَرْتُمُوْهُ (کیا تمہیں یہ بتلایا بھی گیا ہے) ہے۔

ابن ابی حاتم اور بیہقی وغیرہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے راوی ہیں کہ قرآن پاک میں ہر جگہ عَسٰی واجبہ یعنی یقینی کیلیے استعمال ہوا ہے اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ عَسٰی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وجوب کے لیے ہے۔ اور ابن الانباری نے کہا ہے بجز دو جگہ کے سارے قرآن میں عَسٰی واجبہ ہے ایک تو عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ (بعید نہیں تمہارے رب سے کہ رحم کرے تم پر) یہ بنی نضیر سے خطاب تھا کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم نہیں فرمایا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے جنگ کی اور ان کو ان کے کیفر کردار تک پہنچایا اور دوسرے عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا (اگر نبی چھوڑ دے تم سب کو تو بھی اس کا رب بدلہ میں دیدے اس کو عورتیں) میں کہ یہاں بھی تبدیلی واقع نہیں ہوئی لیکن بعض علماء نے اس استثناء کو بھی باطل قرار دیا ہے اور قاعدہ کو عام ہی رکھا ہے کیوں کہ رحمت اس شرط کے ساتھ مشروط تھی کہ وہ دوبارہ بدکرداری کے مرتکب نہیں ہوں گے، چنانچہ صاف کر دیا گیا تھا وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا (اگر تم نے دوبارہ شرارت کی تو ہم پھر تمہیں سزا دینگے) لہٰذا جب بنو نضیر نے دوبارہ شرارت شروع کی تو انہیں سزا دینا ضروری تھا

اسی طرح ازدواج کی تبدیلی مشروط تھی اس امر کے ساتھ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو طلاق دیدیتے اور جب آپ نے انہیں طلاق نہیں دی تو پھر تبدیلی بھی ضروری نہ تھی۔

تفسیر کشاف میں سورہ التحریم میں مذکور ہے کہ عسٰی کا لفظ اللہ پاک کی طرف سے اپنے بندوں کو توقع دلانے کے لیے آتا ہے اور اس کی دو وجہیں ہیں ایک یہ کہ باجبروت بادشاہوں کا دستور ہے کہ وثوق اور یقین کے موقع پر بھی جواب عسٰی اور لعلّ ہی سے دیتے ہیں دوسرے یہ کہ اس کا استعمال اپنے بندوں کو یہ سکھلانے کے لیے ہوا ہے کہ وہ بیم ورجا کی حالت میں رہیں۔

اور برہان میں ہے کہ عسٰی اور لعلّ اللہ پاک کی طرف سے تو واجب ہی ہیں یعنی مفید یقین ہی ہیں گو مخلوق کے کلام میں ان کا استعمال امید و توقع کے سلسلہ میں ہوتا ہے کیوں کہ مخلوق کو تو شکوک اور طرح طرح کے گمان پیدا ہوتے رہتے ہیں اور حق تعالیٰ اس سے پاک ہے اور ان الفاظ کے استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ امور ممکنہ میں چونکہ خلق کو تو شک ہوا کرتا ہے اور کسی ہونے والی چیز کا ان کو یقین حاصل نہیں ہوتا اور اللہ پاک کو ہر ہونے والی چیز کا صحیح طور پر علم ہوتا ہے اس لیے ان امور ممکنہ کی دو نسبتیں ہوئیں، ایک نسبۃ الی اللہ جو نسبت قطع و یقین ہے اور دوسری نسبت بجانب خلق کہ جو نسبت شک و ظن ہے بدیں وجہ یہ الفاظ کبھی تو بلفظ الیقین استعمال ہوتے ہیں اس اعتبار سے کہ جس طرح پر ان کا ہونا اللہ تعالیٰ کے یہاں طے ہو چکا ہے جیسے فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ (تو اللہ عنقریب لاویگا ایسی قوم کو کہ اللہ ان کو چاہتا ہے اور وہ اس کو چاہتے ہیں) اور کبھی بلفظ شک ان کا استعمال ہوتا ہے یہ اس نسبت کے اعتبار سے کہ جو خلق کے نزدیک ان کو حاصل ہے جیسے فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ (سو قریب ہے کہ اللہ جلد ظاہر فرمادے فتح یا کوئی حکم اپنے پاس

سے اور فَقُوْلَا لَہٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّہٗ یَتَذَکَّرُ اَوْ یَخْشٰی (سو تم دونوں کہنا اس سے بات نرم شاید وہ سوچے یا ڈرے) حالانکہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ وحضرت ہارون علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام کو فرعون لعین کی طرف بھیجا تھا اس وقت بھی اس کو معلوم تھا کہ فرعون کا انجام کار کیا ہوگا لیکن جو لفظ استعمال ہوا وہ تصویر ہے توقع اور امید کی اس کشاکش کی کہ جوان ہر دو حضرات کے قلب میں برپا تھی۔

نیز چونکہ قرآن پاک اہل عرب کی زبان میں اُترا ہے اس لیے وہ ان کے محاورات کے مطابق اترا ہے۔ اور اہل عرب کا دستور ہے کہ وہ متعدد اغراض کی بنا پر کبھی کبھی یقینی بات مشکوک صورت میں بھی پیش کیا کرتے ہیں۔

ابن الدہان کہتے ہیں کہ عسٰی لفظ اور معنی دونوں کے اعتبار سے فعل ماضی ہے کیوں کہ اس کا استعمال اس توقع کے لئے ہوتا ہے کہ جو آنے والی چیز کے بارے میں حاصل ہو چکی ہے اور کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ لفظ کے اعتبار سے تو ماضی ہے مگر معنی کے لحاظ سے مستقبل ہے کیونکہ یہ اس توقع کی اطلاع ہے کہ جس کے وقوع کا وہ خواہش مند ہے۔

تنبیہ: عسٰی کا استعمال قرآن پاک میں دو طرح پر ہوا ہے ایک اس اسم صریح کا رافع ہو کر کہ جس کے بعد فعل مضارع مقرون بان واقع ہو۔ ایسی صورت میں اس کے اعراب کی نسبت مشہور تر قول یہ ہے کہ وہ فعل ناقص کا صیغہ ماضی ہے اور کان کا سا عمل کرتا ہے۔ لہٰذا مرفوع اس کا اسم ہے اور مرفوع کا مابعد اس کی خبر۔ اور بعض کہتے ہیں کہ وہ فعل متعدی ہے اور عمل میں قارب کی طرح سے ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ فعل قاصر (لازم) ہے اور بمنزلہ قرب من ان یفعل کے ہے اور جار کو محض توسع کے لیے حذف کر دیا گیا ہے چنانچہ سیبویہ اور مبرد کی یہی رائے ہے اور بعض نے یہ کہا ہے کہ قرب کی طرح سے فعل قاصر ہے اور ان یفعل اس کے فاعل سے

بدل اشتمال ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ عسٰی کے بعد ان اور فعل واقع ہو اس صورت میں نحویوں کے کلام سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس وقت میں یہ تامہ ہوتا ہے، ابن مالک کا قول ہے کہ میرے نزدیک یہ ہمیشہ ناقصہ ہی ہوتا ہے اور اگر اس کو وصل کرو گے تو پھر وہ دو جزوں کو قائم مقام ہوگا جیسے کہ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْا میں ہے" [1]

علامہ ابوحیان اندلسی نے البحر المحیط میں یہ بھی تصریح کی ہے کہ عَسٰی کا استعمال رجا میں زیادہ ہوتا ہے اور خوف میں کم۔ [2]

اور امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں رقمطراز ہیں:۔

"عَسٰی کے معنی طَمِعَ اور تَرَجّٰی کے ہیں یعنی توقع اور امید ہے" اور بہت سے مفسرین نے قرآن پاک میں اس کی تفسیر لازم یعنی ضروری اور یقینی سے کی ہے وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالٰی کی نسبت طمع و رجا صحیح نہیں ہوسکتی، لیکن یہ ان کی کوتاہ نظری ہے کیونکہ اللہ پاک نے جو عسٰی کا ذکر کیا ہے تو وہ اس لیے ذکر کیا ہے کہ انسان اللہ تعالٰی سے توقع رکھے نہ یہ کہ خود اللہ تعالٰی توقع رکھے پس عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ (نزدیک ہے کہ رب تمہارا ہلاک کردے تمہارے دشمن کو) کا یہ مطلب ہے کہ تم اللہ سے اس کی توقع رکھو"

صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ "عَسٰی یا مطلقاً فعل ہے یا مطلقاً حرف ہے" اس پر علامہ زبیدی اپنے شیخ ابو الطیب فاسی سے ناقل ہیں کہ:۔

"یہ دونوں باتیں تشنہ ہیں بلکہ عسٰی میں تفصیل ہے، جب یہ ضمیر متصل پر داخل ہوتا ہے جیسے عساہ تو حرفیہ ہوتا ہے جیسا کہ سیبویہ اور ایک جماعت کا مذہب ہے اور جب اسم ظاہر پر داخل ہوتا ہے تو افعال مقاربہ میں سے ایک فعل ہے چنانچہ یہی مبرد اور اخفش وغیرہ کی رائے

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن۔ ج ۱ ص ۱۶۴، ۱۶۵ – طبع مصر ۱۳۷۰ھ

[2] البحر المحیط۔ ج ۲۔ ص ۱۴۴ – طبع مصر ۱۳۲۸ھ

Marfat.com

ہے، اور دونوں طرح استعمال ہونے کے شرائط تسہیل اور اس کی شروح میں مذکور ہیں۔ اور مصنف قاموس کا کلام انتہائی ناقص، نادرست اور تشنہ ہے، لہٰذا قابل اعتبار نہیں"

یہ بھی واضح رہے کہ گو نحوی عَسٰی کا شمار افعال مقاربہ میں کرتے ہیں لیکن درحقیقت یہ افعال مقاربہ میں سے نہیں بلکہ ان افعال میں سے ہے کہ جو رجاء پر دلالت کرتے ہیں جیسے کہ حری اور اخلولق وغیرہ ہیں، اور افعال مقاربہ میں سے ان کا شمار کرنا محض تغلیباً تسمیۃ الکل باسم البعض کے طور پر ہے۔ [۱]

اور شیخ رضی شیعی محمد بن حسن استرآبادی شرح کافیہ میں لکھتے ہیں۔

" عسٰی کی گردان نہیں آتی بلکہ اس سے صرف فعل ماضی مستعمل ہے کیونکہ یہ حرف کے معنی پر مشتمل ہے یعنی انشاء طمع و رجا کے لیے ہے جیسے کہ لَعَلَّ ہے۔ اور انشاءات بیشتر حروف ہی کے معانی ہیں اور حروف کی گردان نہیں آتی ہے رہا فعل جیسے بعت اور جملہ اسمیہ جیسے انت حرٌ سو ان میں انشاء کا ہونا عارضی ہے" [۲]

۲/۱۰ ۴/۱۴ ۵/۸،۱۱ ۶/۱۲ ۹/۵،۳ ۱۰/۹ ۱۱/۲ ۱۲/۱۲ ۱۳/۴
۱۵/۱،۵،۹،۱۲،۱۶ ۱۶/۶ ۲۰/۲،۳،۶،۱۰ ۲۶/۱۴
۲۸/۸،۱۹،۲۰ ۲۹/۲

**عَسَیْتُمْ**: توقع ہے، اندیشہ ہے عَسٰی جو افعال مقاربہ میں سے ہے اس کا ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر۔ قاضی شوکانی نے فتح القدیر میں لکھا ہے کہ اس پر حرف استفہام یعنی ھل، کو امر متوقع کے ثبوت کے لیے داخل کیا ہے یعنی یہ بتلاتا ہے کہ یہ بات ہو کر رہے گی۔ [۳] ۲/۱۶ ۲۷/۷

**عَسِیْرٌ**: سخت، مشکل، بھاری عُسْرٌ سے بروزن فَعِیْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ ۲۹/۱۵ ۱۹/۱

# فصل الشین المعجمہ

**عِشَآءٌ**: اندھیرا پڑے، عشاء کے وقت شبانگاہ۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ:۔

" عشاء نماز مغرب سے لیکر نماز عشاء کے وقت

[۱] ملاحظہ ہو شرح ابن عقیل علی الفیہ ابن مالک ج ۱۔ ص ۱۸۴ طبع مصر ۱۳۵۴ھ

[۲] شرح کافیہ للرضی ج ۲۔ ص ۲۵۲ طبع نول کشور [۳] فتح القدیر ج ۱۔ ص ۲۳۶ طبع مصر ۱۳۴۹ھ

تک کو کہتے ہیں نیز نمازِ عشاء کو بھی عشاء بولتے ہیں"

اور علامہ احمد فیومی نے المصباح المنیر میں اس کے معنی سرِ شام کے اندھیرے کے نقل کیے ہیں اور صاحبِ قاموس ان دونوں معانی کے علاوہ تیسرے معنی یہ بتاتے ہیں کہ زوالِ آفتاب سے لے کر طلوعِ فجر تک عشاء کہلاتا ہے اور نمازِ عشاء کا وقت شفق کے غائب ہونے کے بعد سے لے کر طلوعِ فجر تک ہے ۱۲/۱۲ ۱۸/۱۴

عِشَارٌ: دس مہینے کی گابھن اونٹنیاں، بیاہی ہوئی اونٹنیاں۔ امام ابوبکر محمد بن عزیز سجستانی نزہۃ القلوب میں لکھتے ہیں: ۔

"عشار حاملہ اونٹنیاں ہیں اس کا واحد عُشَراء ہے، عُشَراء وہ اونٹنی ہے جس کو گابھن ہوئے دس ماہ ہو چکے ہوں اور بیاہ دی گئی ہو بلکہ بیاہ جانے کے بعد تک اس کا یہی نام رہتا ہے۔ ایسی اونٹنی عرب کے نزدیک نفیس ترین سمجھی جاتی ہے"

علامہ فیومی نے المصباح المنیر میں تصریح کی ہے کہ اس طرح کے واحد اور جمع کی نظیر صرف نُفَسَاء اور نِفَاس ہی ہیں اور ان دو کے علاوہ تیسری نظیر موجود نہیں ہے ۳۰/۶

عَشْرٌ: دس یہ بغیر ہا کے مؤنث کا عدد ہے جو پہلی دہائی کے لیے مستعمل ہے اور جب اس کے ساتھ اَحَدٌ سے لیکر تِسْعَۃٌ تک کسی لفظ کو ملا کر استعمال کرتے ہیں تو اس صورت میں اس کے شین کو فتحہ دیتے ہیں چنانچہ اَحَدَ عَشَرَ اور ثَلٰثَۃَ عَشَرَ، تِسْعَۃَ عَشَرَ تک بولتے ہیں۔ ۸/۷ ۹/۷ ۱۲/۲ ۳۰/۱۴

عَشْرًا ۲/۱۴ ۱۶/۱۴ ۲۰/۶

عِشْرُوْنَ: بیس۔ اسم عدد ہے اور مذکر و مؤنث دونوں کے لیے یکساں مستعمل ہے اور اس کا اعراب واو اور یاء کے ساتھ آتا ہے یعنی بحالتِ رفع عشرون اور بحالتِ نصب و جر عشرین ۱/۵

عَشَرَۃٌ: دس، اسم عدد ہے اور مذکر کے لیے استعمال ہوتا ہے ۲/۸ ۶/۲

عَشِیٌّ: شام، سورج ڈھلے، دن ڈھلے تیسرے پہر، بعد زوال، دن کا پچھلا وقت

مولانا حمید الدین فراہی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں:

"عشی سورج ڈوبنے سے پہلے کا وقت ہے

جب کہ سورج کی روشنی پھیکی پڑنے لگتی ہے اور جن شہروں میں فضا صاف نہیں ہوتی وہاں دھوپ پیلی پڑ جاتی ہے۔ اور یہی نماز عصر کا وقت ہوتا ہے، اس وقت میں قدیم زمانے سے لوگ نمازیں پڑھتے آئے ہیں چنانچہ قرآن مجید میں انبیا کے بارے میں آتا ہے

وَاذْكُرْ عَبْدَنَا — اور یاد کرو ہمارے بندے
دَاوُدَ ذَا الْاَيْدِ — داؤد قوت والے کو، وہ
اِنَّهٗ اَوَّابٌ اِنَّا — تھا رجوع ہونے والا ہم
سَخَّرْنَا الْجِبَالَ — نے تابع کیے پہاڑ اس کے
مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ — ساتھ پاکی بولتے تھے
وَالْاِشْرَاقِ۔ — شام کو اور صبح کو۔

اور ارشاد ہے :-

وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ — اور دیا ہم نے داؤد کو
سُلَيْمٰنَ نِعْمَ الْعَبْدُ — سلیمان بہت خوب
اِنَّهٗ اَوَّابٌ، اِذْ عُرِضَ — بندہ وہ ہے رجوع ہونے
عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ — والا، جب دکھانے کو
الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ — لائے اس کے سامنے
فَقَالَ اِنِّيْ اَحْبَبْتُ — شام کو گھوڑے خاصے
حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ — تو بولا میں نے دوست
رَبِّيْ حَتّٰى تَوَارَتْ — رکھا مال کی محبت کو

بِالْحِجَابِ رُدُّوْهَا — اپنے رب کی یاد سے یہاں
عَلَيَّ فَطَفِقَ مَسْحًا — تک کہ سورج چھپ گیا
بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ — اور "پھیر لاؤ ان کو
میرے پاس پھر لگا جھاڑنے
ان کی پنڈلیاں اور گردنیں"

علامہ احمد فیومی نے المصباح المنیر میں اہل لغت سے اس کے حسب ذیل معانی نقل کیے ہیں :-

(۱)، زوال کے بعد سے لے کر غروب آفتاب تک اور اسی بنا پر ظہر و عصر کو صلاۃ العشی بولتے ہیں -

(۲) دن کا پچھلا وقت -

(۳) زوال سے لیکر صبح کا وقت

(۴) عَشِيٌّ اور عِشَاءٌ دونوں کے معنی ہیں نماز مغرب سے لیکر عشاء کی نماز تک کا وقت اسی لیے ابن فارس نے العشاان کا ترجمہ مغرب و عشا کیا ہے -

امام راغب اصفہانی نے اس کے معنی زوال سے لیکر صبح تک کے ہی لکھے ہیں اور اتنے عام ہیں کہ اہل لغت نے اس کے جتنے معانی لکھے ہیں وہ سب اس میں آجاتے ہیں -

علامہ ابو حیان اندلسی نے البحر المحیط میں عَشِيٌّ

Marfat.com

کہ عَشِیَّۃٌ کا مفرد بتاتے ہیں جیسے کہ رَکِیٌّ اور رَکِیَّۃٌ ہیں[1]۔ اور امام محمد بن احمد قرطبیؒ اس کے بالکل برخلاف عَشِیٌّ کو عَشِیَّۃٌ کی جمع لکھتے ہیں[2]۔ تاج العروس میں بعض علماء سے منقول ہے کہ عَشِیٌّ بلا ہار کے دن کے آخری حصہ کو کہتے ہیں اور عَشِیَّۃٌ ایک دن کے آخری حصہ کا نام ہے[3]۔ اس لحاظ سے عَشِیٌّ کا ترجمہ شام اور عَشِیَّۃٌ کا ایک شام ہونا چاہیئے۔ ۳/۱۲ ۷/۱۲ ۱۵/۱۶ ۲۳/۱۲۰،۱
۲۴/۱۱ عَشِیًّا ۱۶/۴،۷ ۲۱/۵ ۲۴/۱۰

عَشِیْرٌ: رفیق، ہم صحبت، ساتھی، شریک یہ بروزن فَعِیْلٌ بمعنی مُعَاشِرٌ یعنی میل جول رکھنے والا ہے۔ خواہ رشتہ دار ہو یا دوست جیسے کہ خَلِیْلٌ بمعنی مُخَالِلٌ اور صَدِیْقٌ بمعنی مُصَادِقٌ ہیں[3]۔ ۱۳/۹

عَشِیْرَتُکَ: تیرا کنبہ، تیرا قبیلہ، تیرے ملنے والے، تیرے رشتہ دار، تیری برادری عَشِیْرَۃٌ مضاف لَکَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ، راغب اصفہانی لکھتے ہیں :-

"عَشِیْرَۃُ انسان کے وہ رشتہ دار ہیں کہ جن کے ذریعہ سے کثرت حاصل ہوتی ہے۔ گویا وہ لوگ اس کے لیے عدد کامل کا کام دیتے ہیں کیوں کہ عَشَرَۃٌ عدد کامل ہے ارشاد ہے وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ (اور تمہاری بیویاں اور تمہاری برادری) لہٰذا عَشِیْرَۃٌ انسان کے اُن تمام رشتہ داروں کی ہر اس جماعت کا نام ہوا کہ جن کی وجہ سے اُسے کثرت حاصل ہو"

فیومی لکھتے ہیں کہ عَشِیْرَۃٌ کے معنی قبیلہ کے ہیں اس لفظ سے اس کا کوئی واحد نہیں آتا اور اس کی جمع عَشِیْرَاتٌ اور عَشَائِرُ ہے۔ اور علامہ ابو حیان اندلسی لکھتے ہیں کہ عَشِیْرَۃٌ وہ جماعت ہے جو کسی سبب یا معاہدہ یا دوستی کی بنا پر مجتمع ہو جیسے کہ "عقد عشرہ" ہوتا ہے[4]۔ اور تاج العروس میں ہے کہ :-

"اس لفظ کے ماخذ میں اختلاف ہے بعض اس کا ماخذ عِشْرَۃٌ بتاتے ہیں جس کے معنی معاشرت یعنی باہمی میل جول کے ہیں کیوں کہ یہی ان لوگوں کا نمایاں وصف ہے یا عَشَرَۃٌ سے

[1] البحر المحیط ج ۲ - ص ۳۲۴ طبع مصر [2] ملاحظہ ہو تفسیر قرطبی - ج ۴ - ص ۸۲ طبع مصر
[3] ملاحظہ ہو الفائق للزمخشری [4] البحر المحیط ج ۵ - ص ۴ -

Marfat.com

ماخوذ ہے جو عدد کا نام ہے۔ گویا یہ لوگ بھی اپنے مکمل ہونے میں عدد کامل کی طرح ہیں یا ان کی نسبت کا عقد بھی "عقد عشرہ" کے مانند ہے"

۱۹/۱۵

عَشِيرَتُكُمْ: تمہاری برادری، تمہارا کنبہ، تمہارا قبیلہ عَشِيرَةٌ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، ۱۰/۹

عَشِيرَتَهُمْ: ان کا گھرانہ، ان کا کنبہ، ان کی برادری عَشِيرَةَ مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، ۲۸/۳

عَشِيَّةً: ایک شام عَشَايَا اور عَشِيَّاتٌ جمع، مصباح میں ہے کہ:۔

"ابن الانباری کا بیان ہے کہ عَشِيَّةٌ مؤنث ہے اور بسا اوقات اہل عرب اس کو عَشِيٌّ کے معنی کے اعتبار سے مذکر بھی استعمال کرتے ہیں، اور بعض اہل لغت کہتے ہیں کہ عَشِيَّةٌ واحد ہے اور اس کی جمع عَشِيٌّ ہے"

(ملاحظہ ہو عَشِيّ) ۳۰/۴

# فصل الصّاد المهملة

عَصَاكَ: تیرا عصا، تیری لاٹھی، عصا مضاف، ك ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ امام راغب نے تصریح کی ہے کہ:۔

"عَصَا کی اصل واؤ سے ہے کیونکہ اہل عرب اس کے تثنیہ میں عَصَوَانِ بولتے ہیں اور اس کی جمع میں عُصِيٌّ کہا جاتا ہے"

اور فیومی مصباح میں لکھتے ہیں۔

"عَصَا مقصور ہے اور مؤنث ہے تثنیہ عَصَوان ہے اور جمع أَعْصٍ اور عِصِيٌّ ہے بوزن فُعُولٌ جیسے کہ أَسَدٌ اور أُسُودٌ ہیں، اور قاعدہ کے لحاظ سے اس کی جمع أَعْصَاءٌ ہونا چاہیئے تھی جیسے کہ سَبَبٌ اور أَسْبَابٌ ہیں لیکن یہ جمع منقول نہیں، یہ ابن السکیت کا بیان ہے"

اور صاحب قاموس نے اس کی جمع أَعْصَاءٌ بھی نقل کی ہے چنانچہ انہوں نے اس کی حسب ذیل جمعیں لکھی "أَعْصٍ أَعْصَاءٌ عُصِيٌّ اور عِصِيٌّ" اور تاج العروس میں ہے کہ،

"عَصَا کو عَصَا اس لیے کہتے ہیں کہ اس پر ہاتھ اور انگلیاں دونوں مجتمع ہو جاتی ہیں یہ عرب کے محاورے عَصَوْتُ القَوْمَ أَعْصُوهُمْ سے ماخوذ ہے جس کے معنی لوگوں کو جمع کرنے کے ہیں، یہی اصمعی نے بعض

بصریوں سے نقل کیا ہے اور کہا ہے
کہ یہ مد کے ساتھ درست نہیں اور
نہ تا کا اس پر داخل کرنا صحیح ہے"
اور علامہ ابو منصور ثعالبی ، فقہ اللغہ میں لکھتے
ہیں کہ ۔
"جس لکڑی کو آدمی بطور مشغلہ اپنے ہاتھ میں
رکھتا ہے وہ مِخصرہ (چھڑی) ہے ۔ اور جو ذرا
لمبی ہوتی ہے اور چرواہے ، لنگڑے اور بوڑھے
کے کام میں آتی ہے وہ عَصَا کہلاتی ہے
اور جو مریض اور ضعیف لوگ استعمال کرتے ہیں
وہ مِنسَأَةٌ ہے " ؎١

پ ١/٤ پ ٩/٤،١٠ پ ١٩/٨،١٦ پ ٢٠/٧

**عَصَانِيْ** : اس نے میری نافرمانی کی ، اس
نے میرا کہا نہ مانا ۔ عَصٰی ماضی کا صیغہ واحد مذکر
غائب ۔ ن وقایہ ی ضمیر واحد متکلم ، (ملاحظہ ہو
عَصٰی ) ١٣/١٨

**عَصَاهُ** : اس کی لاٹھی ، اس کا عصا عَصَا
مضاف ، ہُ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ

پ ٩/٣ ١٩/٦،٧

**عَصَايَ** : میری لاٹھی ، میرا عصا ، عَصَا مضاف
ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ ١٦/١٠

**عُصْبَةٌ** : جماعت ، گروہ ، یہ عَصْبٌ سے
ماخوذ ہے ، جس کے معنی جمع ہونے اور گھیرنے کے
ہیں ، علامہ زمخشری لکھتے ہیں : ۔
" عُصْبَةٌ اور عِصَابَةٌ ، دس اور دس سے
زیادہ اشخاص کو کہتے ہیں اور بعض چالیس تک
بتلاتے ہیں ، ان کا یہ نام اس لیے پڑا کہ اتنے
اشخاص سے سب کاموں میں قوت ہوتی ہے
اور وقت پڑے پر یہ لوگ کافی سمجھے جاتے
ہیں " ؎٢

اور امام ابن جریر طبری نے تصریح کی ہے کہ
نَفَرٌ اور رَهْطٌ کی طرح اس کے لفظ سے بھی وا
نہیں آتا ہے ؎٣ ۔ اور مصباح میں ہے کہ عَصَبَہ
مردوں کی جماعت ہے اور اس کی جمع عُصَبٌ ہے جیسے
غُرْفَةٌ کی جمع غُرَفٌ راغب اصفہانی
کہتے ہیں : ۔
" عُصْبَةٌ وہ جماعت ہے جو ایک دوسرے کی
پشتیبان اور مددگار ہو ۔ ارشاد ہے لَتَنُوْٓءُ
بِالْعُصْبَةِ (وہ بھاری ہوتی تھیں پوری جماعت
اور وَنَحْنُ عُصْبَةٌ (اور ہم ہیں پوری جماعت)
یعنی ہماری بات ایک ہے اور ہم ایک دوسرے

؎١ ملاحظہ فقہ اللغہ باب ٢٣ فصل ١١ ؎٢ تفسیر کشاف ج ٢ ص ١٦٥ طبع
مصر ؎٣ تفسیر طبری ج ١٢ - ص ٨٠ طبع مصر ۔

کے یار و مددگار ہیں"

"عصبہ کتنے افراد کی جماعت کا نام ہے اس کے بارے میں علامہ ابو حیان اندلسی نے البحر المحیط میں مفسرین سلف سے حسب ذیل اقوال نقل کیے ہیں:-

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما: دس سے زائد، انہی سے ایک روایت میں دس سے چالیس تک مروی ہے۔

قتادہ: دس سے لے کر چالیس تک

مجاہد: دس سے پندرہ تک

مقاتل: دس

سعید بن جبیر: چھ یا سات

بعض ایک سے دس تک اور بعض ایک سے پندرہ تک بتاتے ہیں۔

فرّا: دس اور دس سے زائد۔

ابن زید، زجاج اور ابن قتیبہ: تین تک نَفَرٌ ہیں اس سے زائد ہوں تو نو تک رَهْطٌ ہیں اس بھی زیادہ ہوں تو پھر عُصْبَۃٌ ہیں اور دس سے کم کم عُصْبَۃ نہیں ہیں [1]

اور علامہ سید مرتضیٰ زبیدی، تاج العروس میں اپنے شیخ سے ناقل ہیں کہ

"اصل میں تو اس کے معنی مطلق جماعت کے ہیں، پھر عرف میں ایک خاص تعداد کے ساتھ مخصوص ہو گیا، بعد کو عرف بھی مختلف ہو گئے، یا اہل لغت سے چونکہ اس کی تعیین میں مختلف بیانات منقول ہیں اس لیے یہ اختلاف ہوا"

۱۲/۱۲ ۱۸/۸ ۲۰/۱۱

عَصْر: زمانہ، وقت عصر۔ امام راغب رقمطراز ہیں:-

عَصْرٌ اور عُصُرٌ کے معنی زمانے کے ہیں، اس کی جمع عُصُورٌ ہے ارشاد ہے وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (قسم ہے زمانہ کی بیشک انسان ٹوٹے میں ہے) نیز "عصر" کے معنی پچھلے پہر یعنی دن کے آخری حصے کے بھی ہیں اور اسی معنی میں نماز عصر ہے۔

صاحب قاموس نے اس کی جمع اَعْصَارٌ، عُصُورٌ، اَعْصُرٌ اور عُصُرٌ نقل کی ہے آیت میں عصر سے بعض نے زمانہ مراد لیا ہے اور بعض نے نماز عصر اور دونوں معنی صحیح ہیں۔ ۳۰/۲۸

[1] البحر المحیط ج ۵ ص ۲۸۲

**عَصْفٌ**: بھس، بھوسا، بھوسی، چھلکا، کھیت کے پتے۔ تفسیر کبیر میں اس کے حسب ذیل[1] معانی لکھے ہیں:-

(۱) بھوسا جو ہمارے مویشی استعمال کرتے ہیں۔
(۲) اس پودے کے پتے کہ جس میں ڈنٹھل ہوں اور اس ڈنٹھل کے اطراف و جوانب میں پتے ہوں جیسے کہ خوشے کے اوپر کے پتے ہوتے ہیں
(۳) کھائے ہوئے پھل کا چھلکا، امام قرطبی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ عَصْفٌ جمع ہے اور اس کا واحد عَصْفَةٌ، عُصَافَةٌ اور عَصِيْفَةٌ ہیں[2]

۲۷/۱۱ ۳۰/۲۰

**عَصْفًا**: آندھی آنا، اس زور سے ہوا کا چلنا کہ چیزوں کو توڑ کر (عصف) بھس بنا دے گویا کہ جو (عصف) کوڑا کرکٹ اڑا کر لاتا ہے یہ مصدر ہے اور اس کا فعل باب ضرب سے آتا ہے (ملاحظہ ہو عَصِفَتْ) ۲۹/۲۱

**عِصَمٌ**: رسیاں، عِصْمَةٌ کی جمع ہے زجاج نے تصریح کی ہے کہ عِصْمَةٌ کے اصل معنی رسی کے ہیں اور یہی معنی محمد بن نشوان حمیری نے ضیاء الحلوم میں لکھے ہیں اور امام ابو بکر عزیزی نزہۃ القلوب میں فرماتے ہیں:-

"عِصَم کے معنی رسیوں کے ہیں اس کا واحد عِصْمَةٌ ہے اور عِصْمَةٌ کے معنی ہیں کسی چیز کو روک رکھنے کے۔ اور آیہ شریفہ وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ (اور نہ رکھو اپنے قبضہ میں ناموس کافر عورتوں کے) کے معنی یہ ہیں کہ ان کافر عورتوں کی رسیاں نہ تھامے رہو یعنی ان سے رغبت نہ رکھو"

اور تاج العروس میں اس آیت کی تفسیر میں ابن عرفہ سے نقل کیا کہ عِصْمَةٌ سے مراد یہاں عقد نکاح ہے، محاورہ ہے بِيَدِهٖ عِصْمَةُ النِّكَاحِ یعنی اس کے ہاتھ میں تو عقد نکاح ہے[3] ۲۸

**عَصَوْا**: انہوں نے نافرمانی کی، انہوں نے اطاعت نہ کی، انہوں نے کہنا نہ مانا، مَعْصِيَةٌ اور عِصْيَانٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب عَصَوْا اصل میں عَصَيُوْا تھا، یا متحرک ماقبل اس کا مفتوح اس لیے اس یا کو الف سے بدل گیا اب واو اور یا دو ساکن جمع ہوئے لہذا الف گر گیا اور عَصَوْا رہ گیا ملاحظہ ہو عَصٰى اور مَعْصِيَةٌ ۲/۳ ۵/۳ ۶/۱۵ ۱۲/۵ ۲۹/۵

---

[1] تفسیر کبیر سورۃ الرحمٰن ج ۸۔ ص ۱۳۔ طبع قدیم [2] تفسیر قرطبی سورہ الفیل [3] ملاحظہ ہو تاج العروس

عَصَوْكَ: انہوں نے تیری نافرمانی کی، انہوں نے تیرا کہا نہ مانا، انہوں نے تیری اطاعت نہ کی
عَصَوْا صیغہ ماضی اور کَ ضمیر واحد مذکر حاضر ہے ۱۹/۱۵

عَصَوْنِی: انہوں نے میری نافرمانی کی انہوں نے میرا حکم نہ مانا، انہوں نے میری اطاعت نہ کی
عَصَوْا صیغہ ماضی، ن وقایہ اور ی ضمیر واحد متکلم ہے۔ ۲۹/۱۱

عَصٰی: اس نے حکم ٹالا، اس نے نافرمانی کی، اس نے کہا نہ مانا، اس نے اطاعت نہ کی
مَعْصِیَۃٌ اور عِصْیَانٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، عَصٰی اصل میں عَصَیَ تھا، ی بعد فتحہ کے واقع تھی اس لیے الف ہو گئی ۱۲/۱۴ ۲۹/۱۳ ۳۰/۳

عَصِیًّا: بڑا نافرمان، بہت بے حکم
مَعْصِیَۃٌ اور عِصْیَانٌ سے بروزن فَعِیْلٌ یا فَعُوْلٌ صفت مشبہ یا مبالغہ کا صیغہ ہے علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں امام کسائی سے نقل کیا ہے کہ عَصِیٌّ اور عَاصٍ دونوں کے معنی ایک ہیں[1]۔ اس صورت میں یہ صفت مشبہ کا صیغہ ہوگا۔ لیکن امام رازی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں کہ عَصِیًّا، عَاصِی سے بلیغ تر ہے جس طرح کہ عَلِیْمٌ عَالِمٌ سے زیادہ بلیغ ہے[2]۔ اس اعتبار سے یہ مبالغہ کا صیغہ ہوگا
علامہ ابوحیان اندلسی کی بھی یہی رائے ہے چنانچہ البحر المحیط میں رقمطراز ہیں:-
"عِصِیًّا کے معنی ہیں" عاصی کثیر العصیان" یعنی ایسا نافرمان جو بڑی نافرمانی کرے۔ یہ اصل میں عَصُوْیٌ تھا بروزن فَعُوْلٌ جو مبالغہ کے لیے ہے، اور اس کا بھی احتمال ہے کہ بروزن فَعِیْلٌ ہو اور یہ بھی مبالغہ کا صیغہ ہے۔" ۱۶/۴۴

عِصْیَانٌ: نافرمانی، گناہ، عدول حکمی، طاعت کی ضد ہے، اصل میں تو عَصٰی یَعْصِی کا مصدر ہے لیکن بطور اسم یعنی حاصل مصدر کے زیادہ مستعمل ہے۔ امام راغب لکھتے ہیں عَصٰی عِصْیَانًا کے معنی ہیں اطاعت سے باہر ہو جانا اصل میں اس کے معنی ہیں ڈنڈے کے زور سے روکنا۔ ۲۶/۱۲

عَصِیْبٌ: سخت، بھاری، عَصَبٌ سے جس کے معنی سخت کسنے باندھنے اور گھیر لینے

---

[1] تفسیر قرطبی ج ۱۱۔ ص ۱۱۱ [2] تفسیر کبیر ج ۵۔ ص ۲۰۷، طبع قدیم۔

Marfat.com

کے ہیں بروزن فَعِيْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ ہے
علامہ سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں
رقمطراز ہیں:۔

قرآن مجید میں ہے هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ
(یہ دن بڑا سخت ہے) فرا کہتے ہیں يَوْمٌ
عَصَبْصَبٌ اور يَوْمٌ عَصِيْبٌ کے معنی
ہیں سخت گرم دن کے یا سخت دن کے اور
یہی معنی لَيْلَةٌ عَصِيْبٌ کے ہیں اور لَيْلَةٌ
عَصِيْبَةٌ نہیں بولتے ہیں کراع نے کہا ہے
کہ عَصَبْتُ الشَّيَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی
باندھنے کے ہیں لیکن یہ معروف نہیں ہے۔

اور ازہری نے یہ کہا ہے کہ یہ عَصَبَ الْقَوْمَ
اَمْرٌ يَعْصِبُهُمْ عَصْبًا سے ماخوذ ہے جس کے
معنے ہیں کسی سخت بات کا پیش آکر لوگوں
کو اکٹھا کر دینا"

اور امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ
"یَوْمٌ عَصِيْبٌ میں عَصِيْبٌ بمعنی شدید
ہے اور یہ فاعل کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے
اور مفعول کے معنی میں بھی یعنی ایسا دن کہ
جس کے اطراف باندھ دیئے گئے ہوں"
جیسا کہ اسی معنی میں عرب کا محاورہ ہے یَوْمٌ

کَکِفَّۃِ حَابِلٍ وَحَلْقَۃِ خَاتَمٍ (یہ دن)
جو شکاری کے جال اور انگوٹھی کے حلقہ
کی طرح تنگ ہے) ۱۲/۷

عَصَیْتُ: میں نے نافرمانی کی، میں نے حکم
نہ مانا، مَعْصِيَةٌ اور عِصْيَانٌ سے ماضی کا
صیغہ واحد متکلم (ملاحظہ ہو مَعْصِيَةٌ) ۸/ب
۱۱/۷ ۲۳/۱۶ ۔

عَصَیْتَ: تو نے نافرمانی کی، تو نے حکم نہ
مانا مَعْصِيَةٌ اور عِصْيَانٌ سے ماضی کا
صیغہ واحد مذکر حاضر۔ ۱۱/۱۴ ۱۴/۱۴ ۔

عَصَیْتُمْ: تم نے نافرمانی کی، تم نے حکم نہ
مانا مَعْصِيَةٌ اور عِصْيَانٌ سے ماضی کا
صیغہ جمع مذکر حاضر ۳/۴

عَصَیْتُہٗ: میں نے اس کی نافرمانی کی میں
نے اس کا حکم نہ مانا، عَصَیْتُ ماضی کا صیغہ
واحد متکلم، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب۔ ۱۲/۹

عَصَیْنَا: ہم نے نہ مانا۔ ہم نے نافرمانی کی
مَعْصِيَةٌ اور عِصْيَانٌ سے ماضی کا صیغہ
جمع متکلم ۱/۱ ۵/۴

عِصِیُّهُمْ: ان کی لاٹھیاں، ان کے عصا
عِصِیٌّ عَصًا کی جمع، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب

Marfat.com

۱۹/۱۶/۱۲

# فصل الضاد المعجمہ

**عَضُدًا**: بازو، قوت بازو، یار و مددگار۔

راغب اصفہانی لکھتے ہیں۔

"عَضُدٌ کہنی سے لے کر کاندھے تک کا درمیانی حصہ ہے... محاورہ ہے عَضُدْتُہٗ یعنی میں نے اس کا بازو تھام لیا، اور اس کو تقویت دی، نیز یَدٌ کی طرح سے عَضُدٌ کا استعمال بھی بطور استعارہ معین و مددگار کے لیے ہوتا ہے"

اور مصباح میں ابو زید سے منقول ہے کہ "اہل تہامہ عَضُدٌ کو مونث استعمال کرتے ہیں اور بنو تمیم مذکر بولتے ہیں، اور اس کی جمع اَعْضُدٌ اور اَعْضَادٌ ہے جیسے کہ اَفْلُسٌ اور اَقْفَالٌ ہیں"

اور تاج العروس میں ہے کہ:۔

قرآن پاک میں آیا ہے وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا (اور میں وہ نہیں کہ بناؤں بہکانے والوں کو اپنا قوتِ بازو) یہاں عَضُدٌ بمعنی اَعْضَادٌ یعنی انصار کے ہیں، اور عَضُدُ الرَّجُلِ کے معنی ہیں اس شخص کے اعوان و انصار۔ اسے یہاں مفرد اس لیے لایا گیا ہے تاکہ اور تمام رؤس آیات کے ساتھ مفرد ہونے میں برابر ہو جائے"

امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں لفظِ عَضُد کے بارے میں حسب ذیل آٹھ لغات نقل کی ہیں

(۱) عَضُدًا، عین پر زبر اور ضاد پر پیش یہی جمہور کی قرأت ہے، اور یہی سب سے زیادہ فصیح ہے۔

(۲) عَضْدًا، عین پر زبر اور ضاد ساکن یہ بنو تمیم کی لغت ہے۔

(۳) عُضُدًا، عین اور ضاد دونوں پر پیش ابو عمرو اور حسن البصری کی قرأت یہی ہے۔

(۴) عُضْدًا عین پر پیش اور ضاد ساکن یہ عکرمہ کی قرأت ہے۔

(۵) عِضْدًا عین پر زیر اور ضاد ساکن، یہ ضحاک کی قرأت ہے۔

(۶) عَضَدًا عین اور ضاد دونوں پر زبر یہ عیسٰی بن عمر کی قرأت ہے۔

(۷) ہارون قاری نے عَضِدًا بھی نقل کیا ہے،

(۸) عِضِدًا یہ ان لوگوں کی لغت ہے، جو کتِف اور فِخِذ بولتے ہیں"[1] ۱۵/۱۹

[1] تفسیر قرطبی، ج ۱۱، ص ۲۰۔

**عَضُدَكَ**: تیرا بازو عَضُدَ مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ ہے۔

**عَضُّوا**: انہوں نے کاٹ کاٹ کھایا، انہوں نے دانتوں میں دبایا۔ سَمِعَ، یہ عَضٌّ سے جس کے معنی دانتوں سے کسی چیز کے پکڑنے کے ہیں۔ ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، دانتوں سے پکڑنا کبھی کسی چیز کو مضبوطی سے تھامنے کے لیے ہوتا ہے اور کبھی کاٹ کھانے کیلئے لہٰذا اس کا استعمال دونوں معنوں میں ہوتا ہے، یہاں غصے کے مارے اپنی انگلیاں چبا ڈالنے کے معنی میں آیا ہے جو انسان غصے میں ندامت کے مارے کیا کرتا ہے، مصباح میں ہے کہ:۔

"اکثر اس کا استعمال باب فَتَحَ سے ہوتا ہے لیکن مصدر ساکن ہے اور باب فَتَحَ سے بھی ایک لغت ہے جو قلیل الاستعمال ہے اور افعال ابن القطاع میں اس کو باب نَصَرَ سے بھی ذکر کیا ہے"

اور امام ابو جعفر بیہقی تاج المصادر میں لکھتے ہیں کہ "یہ متعدی بنفسہٖ بھی ہے اور اس کا تعدیہ علیٰ اور باء کے ساتھ بھی ہوتا ہے نیز فتح بھی اس میں ایک لغت ہے جو شاذ ہے"

۴/۲

**عِضِيْنَ**: پارہ پارہ ٹکڑے ٹکڑے بوٹی بوٹی، عِضَةٌ کی جمع بحالت نصب امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں رقم فرماتے ہیں:۔

"اہل لغت نے عِضِيْنَ کے واحد کے متعلق دو باتیں ذکر کی ہیں:۔

(۱) اس کا واحد عِضَةٌ ہے جیسے کہ عِزَةٌ بُرَةٌ اور ثُبَةٌ ہیں یہ اصل میں عِضْوَةٌ تھا عَضَيْتُ الشَّيْئَ سے جس کے معنی ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے ہیں اور ہر ٹکڑا عِضَةٌ کہلاتا ہے یہ ناقص واوی ہے اور واو جو لام کلمہ تھا حذف ہو گیا ہے تَعْضِيَةٌ کے معنی تجزیہ اور تفریق کے ہیں چنانچہ بولتے ہیں عَضَّيْتُ الجزور والشاة تعضية یعنی میں نے اونٹ بکری کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اور ان کو تقسیم کر دیا۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ لا تعضية فی میراث الا فیما یحتمل القسمة (میراث میں صرف اسی چیز کے ٹکڑے کیے جائیں گے جو تقسیم کے قابل ہو، یعنی جو چیز تقسیم نہ ہو سکے جیسے موتی یا تلوار ہے اس کو تقسیم نہیں کیا جائے گا) پس آیہ شریفہ

جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِیْنَ (انہوں نے قرآن کی بوٹیاں بنائی ہیں) سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے اس کے ٹکڑے اڑا دیئے ہیں چنانچہ کوئی اسے جادو کوئی شاعری کوئی اگلوں کے افسانے اور کوئی خود ساختہ بتاتا ہے۔

(۲) اس کا واحد عِضَۃٌ ہے اور وہ اصل میں عِضَھَۃٌ تھا پھر چونکہ دو ہاؤں کا اکٹھا ہونا ثقیل خیال کیا گیا اس لیے عِضَۃٌ بولنے لگے جس طرح سے کہ شَفَۃٌ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ یہ اصل میں شَفَھَۃٌ تھا جس کی دلیل یہ ہے کہ شَافَھْتُ مُشَافَھَۃً بولتے ہیں اور اسی طرح سے سَنَۃٌ ہے کہ بعض اقوال کی بنا پر اصل میں سَنَھَۃٌ تھا۔

اور یہ عِضَۃٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی جھوٹ کے ہیں اور اسی معنی میں حدیث میں آتا ہے اِیَّاکُمْ وَالْعِضَۃَ (تم جھوٹ سے بچو) اور ابن السکیت نے کہا ہے کہ عِضَۃ کے معنی یہ ہیں کہ انسان بہتان باندھے اور کسی چیز کے متعلق وہ بات کہے جو اس میں نہ ہو۔ اور یہی خلیل کا بھی قول ہے جیسا کہ لیث نے ان سے نقل کیا ہے۔ اس قول پر جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِیْنَ کے یہ معنی ہوں گے کہ انہوں نے اس کو خود ساختہ بتایا۔

اور عِضَۃٌ کی جمع عِضُوْنَ (ذوی العقول کی جمع کے وزن پر) اس لیے آئی کہ اس میں حذف ہوا ہے۔ لہٰذا الف نون کے ساتھ جمع لا کر اس کو حذف کا عوض کر دیا گیا ہے۔"[1] ۱۴/۶

# فصل الطاء المھملۃ

**عَطَاءٌ**، عطا، بخشش، عطیہ، دین، انعام صلہ۔ مغرب میں ہے کہ:-

"جو بخشش کی جائے اس کا نام عطا ہے اور جمع اَعْطِیَۃٌ اور اَعْطِیَاتٌ ہے"

اور امام راغب لکھتے ہیں کہ عَطِیَّۃٌ اور عَطَاءٌ کا استعمال صلہ کے معنی میں مخصوص ہو گیا ہے ارشاد ہے ھٰذَا عَطَاؤُنَا یہ ہے ہمارا انعام۔

اور ابوبکر عزیزی لکھتے ہیں:-

عَطَاءً حِسَابًا کے معنی ہیں وہ عطا جو کافی ہو، بولا جاتا ہے اعطانی ما احسبنی

[1] تفسیر کبیر ج ۵ ص ۲۱۸ مطبوعہ مصر طبع قدیم سورۃ الحجر۔

Marfat.com

(یعنی اس نے مجھے اتنا دیا کہ جو مجھے کافی ہوتا) بعض نے کہا ہے کہ اس کے اصل معنی ہیں ان تعطیہ حتی یقول حسبی یعنی تم کسی کو اتنا دو کہ وہ کہنے لگے بس بس"

اور علامہ سید مرتضیٰ زبیدی، تاج العروس میں جوہری سے ناقل ہیں :-

عَطَاءٌ اِعْطَاءٌ سے اسم ہے اور اس کی اصل عَطَاوٌ یعنی واو کے ساتھ کیوں کہ یہ عَطْوٌ سے بنا ہے مگر اہل عرب کا دستور ہے کہ جب الف کے بعد واو اور یا آتے ہیں تو ان کو ہمزہ بنا لیتے ہیں کیوں کہ ہمزہ ان دونوں کی نسبت حرکت کو زیادہ برداشت کرتی ہے نیز واو اور اسی طرح یا پر کبھی وہ وقف کو ثقیل سمجھتے ہیں عَطَاءٌ کی مثل رِدَاءٌ ہے جو اصل میں رِدَایٌ تھا۔ پھر جب ان کے آخر میں ہا ملاحق کرتے ہیں تو بعض تو واحد کے وزن کا خیال رکھتے ہوئے اس میں بھی ہمزہ لاتے ہیں یا اور عَطَاءَةٌ اور رِدَاءَةٌ بولتے ہیں اور بعض اس کو اصل کی طرف لوٹا کر عَطَاوَةٌ اور رِدَایَةٌ کہتے ہیں اور اسی طرح تثنیہ میں بھی عَطَاءَانِ اور رِدَاءَانِ اور عَطَاوَانِ اور رِدَایَانِ بولا جاتا ہے۔

پ ۱۲/۹ پ ۱۵/۱۲ پ ۳۰/۲

**عَطَاؤُنَا** : ہماری بخشش، ہمارا انعام، ہمارا عطیہ، ہماری دین، عَطَاءٌ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ ۲۳/۱۲

**عِطْفِہٖ** : اس کا شانہ، اس کا پہلو، عِطْفِ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ عِطْفٌ کے معنی ہیں جانب اور پہلو کے اور اس کی جمع اَعْطَافٌ ہے جیسے کہ حِبْلٌ کی جمع اَحْبَالٌ ہے۔ امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں فرماتے ہیں :-

عِطْفَا الانسان سر سے لے کر سرین تک انسان کے دونوں جانب یعنی پہلو ہیں اور یہ بدن کا وہ حصہ ہے جس کو وہ موڑ سکتا ہے اور ثنی عطفہ کا استعمال ہوتا ہے منہ موڑنے اور سختی برتنے کیلئے جیسے کہ نَاٰی بِجَانِبِہٖ (اس نے پہلو تہی کی) اور صَعَّرَ بِخَدِّہٖ (اس نے اپنا گال پھلایا) وغیرہ الفاظ اسی معنی میں بولے جاتے ہیں اور جب اس کا لفظ یہ بذریعہ علیٰ ہوتا ہے تو پھر لطور استعارہ اس کا استعمال شفقت اور میلان کے معنی میں ہوتا ہے، چنانچہ بولا جاتا ہے عَطَفَ عَلَیْہِ وہ اس پر مہربان ہوا

Marfat.com

ثناہ عَاطِفَۃُ جَمِیم (اس کو جذبہ رحم نے مائل کر دیا)

ظَبْیَۃٌ عَاطِفَۃٌ عَلٰی وَلَدِھَا (ایسی ہرنی جو اپنے بچہ پر مائل ہو)

نَاقَۃٌ عَطُوْفٌ عَلٰی وَلَدِھَا (ایسی ناقہ جو اپنے بچہ پر بڑی شفقت رکھتی ہے)

اور جب بذریعہ عن اس کا تعدیہ ہوتا ہے تو پھر اس کے بالکل مخالف معنی میں آتا ہے جیسے عَطَفْتُ عَنْ فُلَانٍ (میں نے فلاں سے منہ موڑ لیا اور اس سے بے رخی کی)

١٧/٨

**عُطِّلَتْ** : یوں ہی چھوڑ دی گئی، وہ بیکار چھوڑ دی گئی تَعْطِیْلٌ سے جس کے معنی یوں ہی چھوڑ دینے، دیکھ بھال نہ کرنے اور بے زیور کر دینے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب یہاں نفع نہ اُٹھانا اور یوں ہی بے کار چھوڑ دینا مراد ہے ٣٠/٦

# فصل الظاء المعجمۃ

**عِظَامٌ** : ہڈیاں، عَظْمٌ کی جمع جیسے کہ سِہَامٌ سَہْمٌ کی جمع ہے، ٣/٢ ١/١ ٢٣/٤

**عِظَامًا** ١٥/١١،٥ ١٨/٥،٣ اور ٢٣/٦،٥ ٢٧/١٥ ٣٠/٣

**عِظَامَہٗ** : اس کی ہڈیاں عِظَامَ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ ٣٠/١٧

**عَظْمٌ** : ہڈی، جمع اَعْظُمٌ اور عِظَامٌ جیسے اَسْہُمٌ اور سِہَامٌ ہیں ١٦/٥

**عِظُوْھُنَّ** : تم ان (عورتوں کو نصیحت کرو) تم ان کو سمجھاؤ (ضَرَبَ) عِظُوْا وَعْظٌ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر اور ھُنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب صحاح میں وعظ کے معنی لکھے ہیں النصح والتذکیر بالعواقب (نصیحت کرنا اور انجام کو بتا دینا) اور ابن فارس کہتے ہیں الوعظ ھو التخویف والانذار (وعظ کے معنی خوف دلانے اور ڈرانے کے ہیں (ملاحظہ ہو تَعِظُوْنَ ٥/٢

**عِظْھُمْ** : تو ان کو نصیحت کر عِظْ وَعْظٌ سے امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر اور ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ٥/٩

**عَظِیْمٌ** : بزرگ، بڑا، یہ عَظَمَۃٌ سے جس کے معنی بڑا اور بزرگ ہونے کے ہیں یہ بروزن فَعِیْلٌ صفت کا صیغہ ہے، امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں فرماتے ہیں:

عَظُمَ الشَّیْءُ کے معنی ہیں اصل میں کَبُرَ عَظْمُہٗ یعنی اس کی ہڈی بڑی ہو گئی (اسلیے

Marfat.com

عَظِیْمٌ کے اصلی معنی ہوتے بڑی ہڈی والا، پھر بطور استعارہ ہر کبیر کیلئے اس کا استعمال ہونے لگا اور بجائے کبیر کے عَظِیْمٌ بولنے لگے خواہ وہ شے محسوس ہو یا معقول، عین (ذات) ہو یا معنی (مفہوم)، ارشاد ہے۔ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (ایک بڑے دن کا عذاب)، قُلْ هُوَ نَبَؤٌ عَظِیْمٌ (تو کہہ کہ یہ ایک بڑی خبر ہے) عَمَّ یَتَسَاءَلُوْنَ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ کیا بات پوچھتے ہیں لوگ آپس میں، پوچھتے ہیں اس بڑی خبر سے) وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ اور کہتے ہیں کیوں نہ اترا یہ قرآن کسی بڑے مرد پر ان دونوں بستیوں میں کے)۔

اور عَظِیْمٌ کا استعمال جب اعیان کے بارے میں کیا جائے تو قاعدہ کی رو سے اجزاء متصلہ میں تو عَظِیْمٌ کا لفظ لانا چاہیئے اور اجزاء منفصلہ میں کثیر کا، لیکن کبھی کبھی منفصل میں بھی عَظِیْمٌ بول دیتے ہیں جیسے جَیْشٌ عَظِیْمٌ (بڑا لشکر) اور مَالٌ عَظِیْمٌ (بڑا مال) مگر ان دونوں جگہ عظیم کے معنی کثیر ہی کے ہیں“

اور علامہ زمخشری تفسیر کشاف میں رقمطراز ہیں کہ ”عَظِیْمٌ اور کَبِیْرٌ میں فرق یہ ہے کہ عَظِیْمٌ حَقِیْرٌ کی نقیض ہے اور کَبِیْرٌ، صَغِیْرٌ کی، لہذا عظیم کبیر سے بڑھ کر ہے جس طرح سے حقیر صغیر سے کمتر ہے اور ان دونوں الفاظ کا استعمال اجسام اور اعراض دونوں کے لیے ہوتا ہے“ ؎۱

اور تاج العروس میں ہے کہ:۔

”عظیم حق تعالی شانہ کی صفات میں سے بھی ہے جو بمعنی کَبِیْرٌ ہے اور یہ دونوں مترادف الفاظ ہیں“ اور فخر الدین رازی کہتے ہیں کہ کبیر وہ ہے جو ذاتی طور پر بڑا ہو اور عظیم وہ جس کو دوسرے بڑا سمجھیں اسی لیے اللہ تعالےٰ کے وصف میں بجائے عظیم کے کبیر کا استعمال زیادہ ہے“

اور امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں لکھتے ہیں کہ:۔

حلیمی رحمہ اللہ نے العظیم کے معنی میں یہ بیان کیا ہے کہ ”عظیم“ وہ ذات ہے جس پر

---

؎۱ تفسیر کشاف ج ۱۔ ص ۲۳۔ طبع مطبع شرقیہ مصر۔

Marfat.com

کسی قسم کی پابندی نہ ہو سکے، کیونکہ "عظیم القوم" اس کو کہتے ہیں جو لوگوں کے معاملات کا مالک ہو اور لوگوں کو اس کے خلاف نہ تاب مقاومت ہو نہ اس کے حکم سے مجال سرتابی اور بلاشبہ گو اس کی اصلی شان یہی ہے تاہم بہت سی آفتیں ایسی بھی پیش آ جاتی ہیں کہ جن کے باعث وہ اپنے اختیارات میں عاجز ہو کر اس درجہ بودا اور ضعیف ہو جاتا ہے کہ اب اس کی مقاومت درکنار اس کو مغلوب اور ختم بھی کیا جا سکتا ہے لیکن اللہ تعالےٰ جل شانہٗ ایسی قدرت والا ہے کہ اس کو کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی اور یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کو دبا کر یا مغلوب کر کے اس کی نافرمانی یا عدول حکمی کی جا سکے لہٰذا حقیقی اور واقعی طور پر تو عظیم وہی ہے اور اس کے ماسوا کے لیے جو یہ لفظ آتا ہے تو وہ محض مجاز ہے۔

اور ابو سلیمان خطابی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عظیم کے معنی ہیں عظمت و جلال والا اور اس معنی کا تعلق عظمت و شان اور جلالت قدر سے ہے اور یہ وہ عظیم نہیں ہے کہ جو اجسام کی صفات میں آتا ہے کہ جس کے معنی بڑے ڈیل ڈول اور جثے والے کے ہیں۔" [1]

۱/۱،۲،۱۳ ۔ ۲/۲،۱۶ ۔ ۴/۲،۹،۱۳ ۔ ۶/۶،۹،۱۰ ۔ ۷/۶،۸ ۔ ۸/۱۵

۹/۳۴،۱۷،۱۸ ۔ ۱۰/۵،۹،۱۴،۱۵،۱۶ ۔ ۱۱/۲،۴،۵،۷،۱۲

۱۲/۱۳ ۔ ۱۳/۱۳ ۔ ۱۴/۶،۱۹،۲۰ ۔ ۱۶/۵ ۔ ۱۷/۶،۸ ۔ ۱۸/۵،۸،۹

۱۹/۸،۱۱،۱۲،۱۳،۱۷ ۔ ۲۰/۱۱ ۔ ۲۱/۱۱ ۔ ۲۳/۶،۷،۱۳،۱۶ ۔ ۲۴/۶،۱۹

۲۵/۲،۹،۱۶،۱۷ ۔ ۲۶/۳،۱۲ ۔ ۲۷/۱۵،۱۶،۱۸،۱۹،۲۰

۲۸/۱۰،۱۱،۱۵،۱۶ ۔ ۲۹/۳،۵،۶ ۔ ۳۰/۱،۸

عَظِیْمًا ۵/۲،۳،۴،۵،۶،۷،۱۰،۱۳،۱۸ ۔ ۶/۲

۱۵/۴ ۔ ۲۱/۲۰ ۔ ۲۲/۲،۴،۶ ۔ ۲۶/۹،۱۲

## فصل الفاء

**عَفَا**: اس نے معاف کیا، اس نے بخش دیا اس نے گناہ مٹا دیئے عَفْوٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب واضح رہے کہ عَفْوٌ کا استعمال جب کسی جرم کو معاف کرنے کے لیے ہوتا ہے تو اس کا تعدیہ بذریعہ عن ہوتا ہے (ملاحظہ ہو عفو) ۲/۲ ۔ ۴/۲ ۔ ۷/۳،۴

۱۰/۱۳ ۔ ۲۵/۵

**عِفْرِیْتٌ**: دیو، راکشس، قوی ہیکل تہمتن

[1] کتاب الاسماء والصفات ص ۳۴ مطبوعہ الانوار احمدی الہ آباد ۱۳۱۳ھ

امام ابوبکر عزیزی نزہۃ القلوب میں لکھتے ہیں:

| | |
|---|---|
| العفریت من الجن | جن وانس میں "عفریت" |
| والانس | وہ ہے جو بڑھا چڑھا ہو |
| الفائق المبالغ | دون کی لیتا ہو اور |
| الرئیس۔ | سرغنہ ہو۔ |

اور راغب اصفہانی رقمطراز ہیں:۔

"ارشاد ہے عِفْرِیْتٌ من الجِنِّ جنوں میں سے عِفْرِیْتٌ اس کو کہتے ہیں جو موذی اور خبیث ہو اور جس طرح انسان کو کبھی کبھی شیطان بھی کہہ دیتے ہیں اسی طرح استعارہ کے طور پر اسے عِفْرِیْتٌ بھی کہہ دیا کرتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے عِفْرِیْتٌ نِفْرِیْتٌ نفریت عفریت کا تابع مہمل ہے یعنی دیو دیو) اور ابن قتیبہ نے عِفْرِیْتٌ کا ترجمہ کیا ہے اَلْمُوَثَّقُ الْخَلْقِ یعنی تہمتن، مضبوط ہاڑ کا اور بڑے ڈیل ڈول والا"

اور امام ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں اس کے معنی سرغنہ سرکش اور قوی کے لکھے ہیں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اہل عرب کی اس میں دو لغتیں ہیں ایک عِفْرِیْتٌ دوسرے عِفْرِیَۃٌ عِفْرِیَۃٌ کی جمع عَفَارِی اور عِفْرِیْتٌ کی عَفَارِیْتُ ہے[1]، اور سید محمود آلوسی[2] تصریح کی ہے کہ مشہور قول کے مطابق عِفْرِیْتٌ میں "ت" مبالغہ کے لیے ہے[2] لیکن علامہ ابن الاثیر نہایہ میں لکھتے ہیں کہ اس میں "ت" قِنْدِیْلٌ سے الحاق کے لیے ہے، یعنی اس لیے ہے تاکہ فِعْلِیْلٌ کے وزن پر ہو جائے۔

**عَفْوٌ**: آسان، حاجت سے زیادہ، معاف کر دینا۔ یہ عَفَا یَعْفُوْ کا مصدر ہے اور اسم بھی۔ امام عزیزی نزہۃ القلوب میں رقمطراز ہیں:۔ "عَفْوٌ کے معنی ہیں، القدر طاقت جو بن آسکے محاورہ ہے خذ ما عفا لک یعنی جو تجھے بآسانی بغیر مشقت ملے وہ لے لو۔ نیز عفو کے معنی بچے ہوئے مال کے بھی ہیں۔ چنانچہ بولا جاتا ہے عفا الشیئی یعنی وہ چیز زیادہ ہو گئی اور بچ رہی اور ارشاد ہے وَیَسْئَلُوْنَکَ مَا

[1] تفسیر ابن جریر۔ ج ۱۹۔ ص ۹۳۔ طبع مصر [2] روح المعانی۔ ج ۱۹۔ ص ۲۰۲ طبع منیریہ مصر۔

[3] علامہ زمخشری نے تفسیر کشاف میں سورہ بقرہ اور سورہ اعراف دونوں جگہ تصریح کے ساتھ لکھا ہے کہ عفو جُہْدٌ کی ضد ہے۔ اور جہد کے معنی ہیں مشقت میں پڑنا اور طاقت سے زیادہ بوجھ اٹھانا۔ اس اعتبار سے عفو کا ٹھیک ٹھیک وہی ترجمہ ہوگا کہ جو امام عزیزی نے کیا ہے۔

مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ (اللہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا
خرچ کریں کہہ دے جو بچے اپنے خرچ سے) یعنی
آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ صدقہ میں کیا دیں
تو آپ کہہ دیجیے کہ عفو یعنی وہ دو جو تمہارے
مال میں سے بچ رہا ہے اور اس چیز کو خیرات کرو
کہ جو تمہارے اور تمہاری عیال کے نفقہ سے
زائد ہو،

لیکن امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں
یہ فرماتے ہیں کہ:-

"عفو کے معنی ہیں کسی چیز کے لینے کا ارادہ
کرنا چنانچہ بولا جاتا ہے عَفَاهُ وَاعۡتَفَاهُ
یعنی جو کچھ اس کے پاس تھا اس کو لینے کا ارادہ
کیا اور عَفَتِ الرِّیۡحُ الدَّارَ (ہوا نے
گھر کے نشانات مٹا دیئے) یعنی ہوا نے گھر کا
رخ کیا اس کے آثار کو لیتے ہوئے، اور
اسی معنی میں شاعر کہتا ہے ع اخذ البلی
ایاتہا (بوسیدگی نے اس کی نشانیاں
لے لیں) اور عَفَتِ الدَّارَ کا مطلب یہ
ہے کہ گویا خود گھر نے بوسیدگی کا ارادہ کیا
اور عَفَا النَّبۡتُ وَالشَّجَرُ کے معنی ہیں پودے
نے اور درخت نے بڑھنے کا ارادہ کیا جیسے
کہ یہ محاورہ ہے اخذ النبت فی الزیادۃ (پودے
نے بڑھنا شروع کیا)۔

اور عَفَوۡتُ عَنۡهُ کے معنی ہیں قصدت ازالۃ
ذنبہ صارفا عنہ۔ یعنی میں نے اس
سے درگزر کرتے ہوئے اس کے گناہ مٹانے
کا ارادہ کر لیا۔ یہاں درحقیقت مفعول مذکور
نہیں ہے اور عن کا تعلق مضمر سے ہے
پس عفو کے معنی ہوئے گناہ سے درگزر
کرنا چنانچہ ارشاد ہے فَمَنۡ عَفَا وَاَصۡلَحَ
(پھر جو کوئی معاف کرے اور بات کو سنوارے)
اور وَاَنۡ تَعۡفُوۡۤا اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی (اور اگر تم مرد درگزر
کرو تو قریب ہے پرہیزگاری سے) اور ثُمَّ عَفَوۡنَا عَنۡكُمۡ (پھر معاف
کیا ہم نے تم کو) اور اِنۡ نَّعۡفُ عَنۡ طَآئِفَةٍ
مِّنۡكُمۡ (اگر ہم معاف کر دیں گے تم میں سے بعضوں کو)
اور فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ (سو معاف کر ان کو)
اور خُذِ الۡعَفۡوَ (عادت کر درگزر کی) میں
عفو سے مراد ہے مایسہل قصدہ وتناولہ
یعنی جس کا ارادہ کرنا اور حصول سہل ہو۔ اور بعض
نے اس کے معنی لوگوں سے درگزر کرنے کے
بھی کیے ہیں۔ اور آیہ وَیَسۡـَٔلُوۡنَكَ مَاذَا
یُنۡفِقُوۡنَ قُلِ الۡعَفۡوَ میں عفو میں مراد وہ چیز

Marfat.com

ہے جس کا خرچ کرنا آسان ہو"

اور علامہ ابو الفتح ناصر بن عبد السید مطرزی حنفی المغرب فی ترتیب المعرب میں یوں رقم فرماتے ہیں:۔

"صاحب مقائیس نے اس ترکیب یعنی عفو کے مادہ کو دو چیزوں پر دلالت کرنے والا قرار دیا ہے، ایک ترک دوسرے طلب پر لیکن عفو کا استعمال اس شخص کے متعلق ترک عقوبت میں غالب ہو گیا ہے کہ جو مستحق عقوبت ہو اور اعفاء کا غالب استعمال مطلق ترک میں ہوتا ہے اور بحوالہ لغت کہتے ہیں کہ عفو کے معنی ہیں فضل یعنی بچا ہوا اور زائد کے، یہ صحیح ہی ہے کیونکہ جب کسی چیز کو چھوڑ دیا جاتا ہے تو وہ بچی ہوئی اور زائد ہو جاتی ہے۔"

علامہ موصوف نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ عفو کا تعدیہ مجرم اور جرم دونوں کی طرف بذریعہ عن ہوتا ہے جیسے عفا عنہ اور عفا عن ذنبہ اور جو یہ دونوں ایک ساتھ مذکور ہوں تو پھر مجرم کی طرف اس کا تعدیہ بذریعہ لام اور جرم کی طرف بذریعہ عن ہوتا ہے جیسے عفوت لفلان عن ذنبہ۔

اور امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں یہ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عفو کے اصل معنی لغت میں زیادہ ہونے کے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے خُذِ الْعَفْوَ یعنی جو زیادہ ہو وہ لے لو اور دوسری جگہ فرمایا حَتّٰی عَفَوْا یعنی حیوان کی تعداد یعنی اس سے زیادہ ہو گئے اور قفال نے کہا ہے کہ عفو کے معنی ہیں جو سہل ہو اور کلفت سے زائد میسر ہو چنانچہ مجاہد و خذ ما عفا لک یعنی جو میسر ہو جائے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ عفو عن الذنب یعنی گناہ معاف کرنے کے معنی بھی اسی سہولت اور آسانی ہی کی طرف راجع ہوں گے۔[1]

اور علامہ سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں اپنے شیخ محمد بن طیب فاسی شارح قاموس سے ناقل ہیں:۔

"عفو کا بغیر گناہ کے ہونا گو عرف میں مشہور ہو گیا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ عفو بمعنی عدم لزوم الازم نہ ہونا بھی ہوتا ہے اس کے اصل معنی ترک کے ہیں اور اسی پر اس کے سارے معانی گھومتے رہتے ہیں چنانچہ ہر مقام پر اسی کی مناسبت سے ترجمہ کیا جاتا ہے کہیں سزا نہ دینے کے معنی ہو گئے کہیں مثلاً لازم نہ کرنے کے مفسرین اور حکایت نگاروں کے کلام میں بھی اسی طرف لیا پایا جاتا ہے اور عبد الباسط بلقینی نے عفو اور صفح کے فرق میں ایسی گفتگو کی ہے جس کا کوئی خاص فائدہ ظاہر نہیں ہوتا۔ اسی جگہ سید موصوف لکھتے ہیں کہ:۔

"صفح کے معنی ہیں سرزنش کو چھوڑ دینے کے اور یہ عفو سے ابلغ ہے کیونکہ کبھی انسان سزا تو معاف کر دیتا ہے مگر سرزنش نہیں چھوڑتا اور عفو کے معنی ہیں کسی شے کے حاصل کرنے کا ارادہ کرنا اور یہی اس کے اصلی معنی ہیں اور اسی پر اس کے سارے معانی گردش کرتے رہتے ہیں جیسا کہ راغب وغیرہ کی تحقیق ہے نہ کہ ہمارے شیخ نے بیان کیا ہے کہ اس کے اصل معنی ترک کے ہیں"

لیکن ناظرین پر واضح ہے کہ شیخ ابن طیب فاسی نے جو اس کے اصل معنی بیان کئے ہیں یہی معنی علامہ مطرزی کی وساطت سے صاحب مقاییس اللغۃ یعنی ابن فارس سے

[1] تفسیر کبیر ج ۲۔ ص ۳۳۲ طبع قدیم۔

Marfat.com

نقل کیے ہیں اور عزیزی اور ابن فارس دونوں لغت عربیت کے اکابر اشخاص ہیں۔ ۲/۱۱ ۹/۱۴

**عَفَوْا**: وہ بڑھ گئے، وہ زیادہ ہو گئے، اتنصرا، عَفْوٌ سے جس کے معنی زیادہ ہونے کے ہیں ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، علامہ عزیزی غریب القلوب میں لکھتے ہیں کہ۔

عَفَوا بمعنے کثروا ہے جب کوئی چیز زیادہ اور گھنی ہو جاتی ہے تو کہتے ہیں عفا الشیئ نیز عفا الشیئ کے معنی بوسیدہ اور ختم ہونے کے بھی آتے ہیں اور یہ اضداد میں سے ہے۔"

علامہ قرطبی نے شرح صحیح مسلم میں بھی یہی لکھا ہے کہ:-

"عفا اضداد میں سے ہے زیادہ ہونے کے معنی میں بھی آتا ہے اور کم ہونے کے معنی میں بھی نیز مٹنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور بوسیدہ ہونے کے معنی میں"[۱]

**عَفُوٌّ**: بہت چھوڑنے والا، بڑا درگزر کرنے والا، بڑا معاف کرنے والا۔ جوہری صحاح میں لکھتے ہیں:-

"عَفُوٌّ بروزن فَعُولٌ، اس کے معنی ہیں بہت زیادہ معاف کرنے والا، اور یہ اللہ عزوجل کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے۔"

الامام بیہقی، ابو سلیمان خطابی سے ناقل ہیں:-

عَفُوٌّ بروزن فَعُولٌ عَفْوٌ سے ہے اور مبالغہ کا صیغہ ہے عَفْو کہتے ہیں گناہ سے درگزر کرنے کو اور بعض کہتے ہیں کہ عَفْو عفت الریح الاثر سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں ہوا نے نشان مٹا دیا تو گویا گناہ معاف کرنے والا بھی گناہ سے درگزر کرکے اس کو مٹا دیتا ہے۔[۲] ۴/۴۳ عَفُوٌّ ۵/۱۱۲ ۶/۱

**عَفَوْنَا**: ہم نے معاف کیا، ہم نے درگزر کیا، عَفْوٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، امام عزیزی فرماتے ہیں:-

عَفَوْنَا عَنْکُم کے معنی ہیں ہم نے تمہارے گناہ مٹا دیئے اور یہی معنی عَفَا اللّٰہُ عَنْکَ کے ہیں یعنی اللہ نے تیرے گناہ مٹا دیئے" ۲/۶ ۹/۴

**عُفِيَ**: اُسے معاف کیا گیا، اسے سہولت دی گئی، عَفْوٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب۔ ۲/۶

# فصل القاف

**عِقَاب**: مار، عذاب، سزا، عقوبت، سزا دینا، عَاقَبَ يُعَاقِبُ کا مصدر ہے۔ راغب نے لکھا ہے کہ عُقُوبَۃٌ، مُعَاقَبَۃٌ اور عِقَابٌ تینوں الفاظ عذاب کے لیے مخصوص ہیں۔ اور علامہ ابو ہلال عسکری الفروق اللغویہ میں رقمطراز ہیں:-

عذاب اور عقاب میں فرق یہ ہے کہ عقاب سزا کے استحقاق کو تبلاتا ہے چنانچہ عقاب کو عقاب اسی لیے کہا جاتا ہے کہ مرتکب جرم جرم کے عقب ہی میں اس کا مستحق ہو جاتا ہے اور عذاب "استحقاق اور بغیر استحقاق دونوں طرح ہو سکتا ہے۔

"عقاب" کے معنی اصل میں پیچھے ہو لینے کے ہیں چنانچہ بولتے ہیں

---

[۱] ملاحظہ ہو تاج العروس۔ [۲] کتاب الاسماء والصفات ص ۱۳ طبع انوار احمدی الہ آباد۔

Marfat.com

عَقِبَ الثّانی الاوّل (دوسرا پہلے کے پیچھے ہو لیا)
اور عَقِبَ اللیل النہار (رات دن کے پیچھے چلا)۔
اس اعتبار سے عقاب وہ سزا ہوئی جو جرم
کے پیچھے دی جاتی ہے۔ لہٰذا اس کا ترجمہ
پاداشِ جرم کرنا چاہیے۔ ۲/۸،۱۰ ۳/۱۰ ۶/۵
۶/۳ ۸/۶ ۹/۱۱،۱۶،۱۷ ۱۰/۲،۳ ۱۳/۶
۲۴/۸،۱۹ ۲۸/۴

عِقَابِ: میری (طرف سے) سزا۔ یہ اصل
میں عِقَابِی تھا، عِقَابِ مضاف، ی ضمیر واحد متکلم
مضاف الیہ، ی اخیر سے حذف ہو گئی ہے ۱۳/۱۱ ۳۸/۱۰
۴۰/۶

عُقْبًا: بدلہ، جزا، انجام، عاقبت، ثواب، علامہ
احمد فیومی نے المصباح المنیر میں تصریح کی ہے کہ
عُقْبٌ عاقِبَۃٌ ہی کی تخفیف ہے اور امام
راغب نے مفردات میں لکھا ہے کہ عُقُبٌ اور
عُقْبٰی دونوں کا استعمال ثواب کے ساتھ مخصوص
ہے۔ ۱۵/۱۸

عَقَبَۃٌ: گھاٹی، پہاڑ میں چڑھائی کا جو دشوار
گزار راستہ ہوتا ہے اس کو عَقَبَۃ کہتے ہیں اس
کی جمع عُقَبٌ اور عِقَابٌ ہے ۳۰/۱۵

عَقِبِہٖ: اس کی اولاد، عَقِبِ مضاف

ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، امام راغب اصفہانی
لکھتے ہیں:۔
عَقِبٌ پاؤں کے پچھلے حصے (یعنی ایڑی) کو
کہتے ہیں اور بعض عَقْبٌ بولتے ہیں اس کی جمع
اَعْقَابٌ ہے۔ حدیث میں مروی ہے وَیْلٌ
للاعقاب من النار (ایڑیوں کے
لیے آتشِ دوزخ سے افسوس ہے) اور بطور مفعول
عَقِبٌ کا استعمال بیٹے اور پوتے کے
لیے بھی ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے وَجَعَلَہَا
کَلِمَۃً بَاقِیَۃً فِیْ عَقِبِہٖ (اور یہی بات پیچھے
چھوڑ گیا اپنی اولاد میں) ۲۵/۹

عُقْبٰی: عاقبت، بدلہ، انجام۔ علامہ ابو
حیان اندلسی البحر المحیط میں لکھتے ہیں:

العقبی خاتمۃ الشیٔ — "عقبٰی کے معنی ہیں کسی
وما یجیٔ من الامور — چیز کا انجام اور جو باتیں کسی
علیٰ عقبہٖ لہ — چیز کے پیچھے پیش آئیں۔
اور قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی تفسیر مظہری
میں فرماتے ہیں:۔
"عُقْبٰی کے معنی ہیں کام کی جزا کے، قاموس
میں ہے کہ اَعْقَبَہٗ کے معنی جزا دینے کے ہیں

لہ ملاحظہ ہو تفسیر سورۃ الشمس۔

Marfat.com

جزا رفعل کا نام عُقْبیٰ اس لیے قرار پایا کہ وہ فعل کی انجام رہی کے بعد ملتی ہے لیکن عُقْبٌ عُقْبیٰ اور عَاقِبَۃٌ کا استعمال ثواب اور نیکی کی بہتر جزا کے ساتھ مخصوص ہے جس طرح سے کہ عُقُوبَۃٌ، مُعَاقَبَۃٌ اور عِقَابٌ کا استعمال عذاب اور بُرائی کی سخت سزا کے لیے خاص ہے اللہ فرماتا ہے خَیْرٌ ثَوَابًا وَّخَیْرٌ عُقْبیٰ دبہتر ہے انعام کے اعتبار سے اور بہتر ہے ثواب کے لحاظ سے) اور فرمایا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَی الدَّارِ (ان لوگوں کے لیے ہے عاقبت کا گھر یعنی وہاں کا ثواب) اور فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (سو خوب ملا گھر عاقبت کا) اور ارشاد ہے وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (اور آخر میں بھلائی ہے ڈرنے والوں کے لیے)۔

اور عذاب کے بارے میں ارشاد ہے فَحَقَّ عِقَابِ (پھر ثابت ہوئی میری طرف سے سزا) اور شَدِيْدُ الْعِقَابِ (سخت عذاب دینے والا)۔ اور فرمایا وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ (اور اگر بدلہ لو تو بدلہ اسی قدر جس قدر تم کو تکلیف پہنچائی جائے) اور وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ (اور جس نے بدلہ لیا جیسا کہ اس کو دکھ دیا گیا تھا)، لیکن اضافت کے ساتھ عَاقِبَۃٌ کا استعمال عُقُوْبَۃٌ میں بھی ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى (پھر ہوا انجام برا کرنے والوں کا بُرا) اور وَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِى النَّارِ (پھر انجام دونوں کا یہی کہ وہ دونوں ہیں آگ میں) اب عَاقِبَۃٌ کا استعمال اس معنی میں یا تو اس لیے ہو کہ وہ دونوں معنی میں مشترک ہے یا یہ اپنی ضد یعنی مخالف معنی میں بطور استعارہ مستعمل ہے جیسا کہ ارشاد باری فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (سو خوشخبری سنا دے ان کو عذاب دردناک کی) میں عذاب کے لیے بشارت کا لفظ استعمال ہوا ہے"[1]

عُقْبیٰ کے بارے میں قاضی صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ اس کا استعمال ثواب کے لیے خاص ہے، یہی امام راغب اصفہانی نے بھی تحریر فرمایا ہے لیکن خود قرآن مجید کی حسب ذیل

[1] تفسیر مظہری۔ ج ۵ سورۂ رعد ص ۲۳ طبع دہلی۔

آیت میں اس کا استعمال ثواب اور عذاب دونوں کے لیے ہوا ہے ارشاد ہے تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ یہ جزا ہے اُن کی جو ڈرتے ہیں اور سزا منکروں کی آگ ہے، اور امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں "واحدی نے کہا ہے کہ عُقْبٰی (معنی میں، عَاقِبَۃ کی طرح ہے) اور یہ مصدر بھی ہو سکتا ہے جیسے کہ شُوْرٰی اور قُرْبٰی اور رُجْعٰی ہیں اور اس قسم کے مصادر کبھی فَعْلٰی کے وزن پر بھی آتے ہیں جیسے کہ نَجْوٰی اور دَعْوٰی ہیں اور کبھی فِعْلٰی کے وزن پر بھی جیسے کہ ذِکْرٰی اور حِیْزٰی ہیں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اسم ہو" [1]

۱۳/۹، ۱۱، ۱۲

**عَقِبَيْهِ** : اس کی دونوں ایڑیاں عَقِبَي مضاف، ہِ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ عَقِبَی اصل میں عَقِبَيْنَ تھا عَقِبٌ کا تثنیہ اس کا نون اضافت کے سبب گر گیا ہے عَقِبٌ ایڑی کو کہتے ہیں اس کی جمع اَعْقَابٌ ہے۔ ۲/۱، ۴/۶، ۱۰/۲

[1] تفسیر کبیر، ج ۵ ۔ص ۲۹۴ - طبع قدیم

**عُقْبٰهَا** : اس کا انجام، اس کی پاداش اس کی عاقبت، عُقْبٰی مضاف ھَا ضمیر واحد مونث غائب مضاف الیہ یہاں بھی عُقْبٰی کا استعمال ثواب کے لیے نہیں ہوا ہے۔ ۳۰/۱۲

**عُقَدِ** : گرہیں، عُقْدَۃٌ کی جمع جس کے معنی گرہ کے ہیں۔ آیت شریفہ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ (اور بدی سے ان عورتوں کی جو گرہوں میں پھونک ماریں) عُقَدِ سے مراد وہ گرہیں ہیں جن کو جادوگرنیاں ڈوریوں پر افسوں پڑھ کر پھونکنے کے بعد لگایا کرتی ہیں اسی لیے عربی میں ساحر کو مُعَقِّدٌ بھی کہتے ہیں۔ ۳۰/۲۸

**عَقَدَتْ** : اس نے باندھا عَقْدٌ سے جس کے معنے باندھنے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مونث غائب۔ تاج المصادر میں عقد کے حسب ذیل معانی لکھے ہیں گرہ دبیع بستن وسوگند خوردن و پیمان کردن" اور راغب اصفہانی لکھتے ہیں :-

عَقْدٌ کے معنی ہیں کسی چیز کے اطراف کو آپس میں جمع کر دینا، اس کا استعمال سخت اجسام میں بھی ہوتا ہے جیسے عَقْدُ الْحَبْلِ

رسی میں گرہ لگانا۔ عَقْدُ الْبِنَاءِ مکان کو مضبوط کرنا اور بطور استعارہ معانی کے لیے بھی بولا جاتا ہے جیسے عقد البیع و العہد یعنی بیع منعقد کرنا اور عہد باندھنا"

اور تاج العروس میں ہے کہ:۔

"ائمہ اشتقاق نے جو کچھ اس بارے میں تصریح کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ اصل میں حَلّ کی ضد ہے (جس کے معنی کھولنے کے ہیں) بعد کو اس کا استعمال بیع دین اور دیگر معاملات میں بھی ہونے لگا۔ ازاں بعد اس کو یقین کی پختگی اور اعتقاد جازم کے لیے بھی بولنے لگے"

آیہ شریفہ وَالَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ (اور جن سے قرار باندھا تم نے) میں "عقد یمین" سے مراد عہد و پیمان کی پختگی ہے۔ $\frac{۵}{۲}$

عَقَدْتُمْ: تم نے گرہ باندھی، تم نے مضبوط کیا، تم نے پختہ کیا، تَعْقِیْدٌ سے جس کے معنی گرہ لگانے اور معاملہ کو پختہ کرنے کے ہیں ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر $\frac{۵}{۲}$

عُقْدَةٌ: عقد، گرہ، رکاوٹ، لکنت بندش۔ راغب لکھتے ہیں:۔

"نکاح، پیمان وغیرہ جس چیز کو باندھا جائے اس کا نام "عقدہ" ہے، ارشاد ہے وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ (اور نہ ارادہ کرو عقد نکاح کا) اور عُقِدَ لِسَانُہٗ کے معنی ہیں اس کی زبان پر گرہ لگا دی گئی، اور فِی لِسَانِہٖ عُقْدَةٌ کے معنی ہیں اس کی زبان میں لکنت ہے، ارشاد ہے وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ (اور میری زبان کی گرہ کھول دے)۔

$\frac{۲}{۱۴،۱۵}$ $\frac{۱۶}{۱۱}$

عَقَرَ: اُس نے کونچیں کاٹ دیں (ضرب) عَقْرٌ سے جس کے معنی کونچیں کاٹنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، کونچیں کہتے ہیں پاؤں کے پٹھوں کو جو پیچھے کی طرف ایڑی کے پاس ہوتے ہیں، عرب میں دستور تھا کہ اونٹ کو حلال کرنا ہوتا تو پہلے اس کی کونچیں کاٹتے تاکہ بھاگ نہ جائے۔ پھر اس کو نحر کرتے فیومی نے مصباح میں لکھا ہے کہ عُقْرٌ کا استعمال نحر کو نچیں کاٹنے کے لیے ہوتا ہے اور کبھی کبھی نحر کے معنی میں بھی آتا ہے، ازہری نے اس کی وجہ بھی یہی لکھی ہے کہ چونکہ نحر عام طور پر عُقْرٌ کے بعد

ہی ہوا کرتا ہے اس لیے اس سے نحر کرنا بھی مراد لے لیتے ہیں۔ [1] ۲۷/۹

عَقَرُوا : انہوں نے کونچیں کاٹ دیں، عَقْرٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب ۵/۱۴

عَقَرُوهَا : انہوں نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں، عَقَرُوا صیغہ ماضی، هَا ضمیر واحد مؤنث غائب ۱۴/۹ ۱۹/۱۲ ۳۰/۱۶

عَقَلُوهُ : انہوں نے اس کو سمجھ لیا عَقَلُوا عَقْلٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب اور ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب۔ مجمع میں ہے کہ، عَقْل حُمْق کی ضد ہے۔ صاحب قاموس نے "عقل" کے حسب ذیل معانی نقل کیے ہیں:-

"(۱) علم (۲) صفات اشیاء یعنی ان کی اچھائی برائی، کمال اور نقصان کو جاننا، (۳) دو بہتر چیزوں میں زیادہ بہتر کو اور دو بری چیزوں میں زیادہ بدتر کو جاننا (۴) مطلق امور کا علم (۵) اس قوت کو کہتے ہیں کہ جس سے برائی اور بھلائی میں تمیز ہوتی ہے (۶) ان معانی مجتمع فی الذہن کا نام ہے کہ جن کے ذریعہ اغراض و مصالح کی درستی حاصل ہوتی ہے (۷) انسان کی وہ اچھی ہیئت جو اس کی حرکات سکنات اور بول چال میں پائی جاتی ہے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:-

حق یہ ہے کہ یہ ایک روحانی نور ہے جس کی بدولت نفس علوم ضروریہ و نظریہ کا ادراک کیا کرتا ہے۔ اور اس کے وجود کی ابتداً اسی وقت سے شروع ہونے لگ جاتی ہے جب کہ بچہ ماں کے پیٹ میں جنم لیتا ہے اور پھر برابر وہ بڑھتی رہتی ہے تا آنکہ سن بلوغ میں جاکر تکمیل کو پہنچ جاتی ہے"

صاحب قاموس نے عقل کے جتنے معانی لکھے ہیں اس کے متعلق شارح قاموس علامہ سید مرتضیٰ زبیدی بلگرامی فرماتے ہیں:-

| | |
|---|---|
| هذه الاقوال التى | یہ جتنی باتیں مصنف نے |
| ذكرها المصنف كلها | ذکر کی ہیں سب کی سب |
| فى مصنفات المعقولات | معقولات کی کتابوں میں مذکور |
| ولم يعرج عليها ائمة | ہیں مگر ائمہ لغت نے |
| اللغة۔ | ان کی طرف التفات نہیں |

(تاج العروس) کیا ہے۔

علامہ ابن الہمام نے التحریر میں لکھا ہے:

[1] بلا حظہ ہو تاج العروس۔

۔عقل کو عقل اس لیے کہتے ہیں کہ عقل کے معنی منع کرنے کے ہیں چونکہ عقل عاقل کو ناز یبا باتوں سے روکتی رہتی ہے اس لیے اس کا نام عقل ہوا۔ یا عقل مَعْقِلٌ سے ماخوذ ہے معقل کہتے ہیں جائے پناہ کو، اور چونکہ عقلمند کو عقل کے ملنے ہی پناہ ملتی ہے اس لیے اس کو عقل کہنے لگے " ۵ا

ع ق د

عُقُود: قول و قرار۔ عہد و پیمان، عَقْدٌ کی جمع ہے، عَقْد کہتے ہیں ایک چیز کو ایک چیز میں مضبوطی کے ساتھ باندھنے اور گرہ لگانے کو یہاں اس سے مراد وہ تمام تکالیف خبر عیہ اور احکام دینیہ ہیں کہ جن کی تعمیل بندوں پر لازمی اور ضروری ہے اور اسی میں داخل ہیں امانات اور معاملات کے میثاق عہد و پیمان کہ جن کا پورا کرنا واجب ہے۔

ع ق م

عَقِيمٌ: بانجھ، بے خیر، منحوس، اس لفظ کا استعمال مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے ہوتا ہے جب مرد کے لیے آئیگا تو اس کی جمع عُقَمَا اور عِقَامٌ ہوگی اور جب عورت کے لیے آئیگا

تو عَقَائِمُ اور عُقُمٌ ۔ امام عزیزی نزہتہ القلوب میں لکھتے ہیں:۔

" عَاقِرٌ اور عَقِيمٌ دونوں کے معنی ایک ہیں یعنی وہ عورت کہ جو بانجھ ہو اور وہ مرد کہ جس کے اولاد نہ ہوتی ہو۔

اور عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيمٍ میں یوم عقیم سے وہ دن مراد ہے کہ جو اس سے بانجھ ہو چکا ہے کہ اس میں کافروں کے لیے کسی قسم کی خیر پیدا ہو"

اور امام راغب رقمطراز ہیں:۔

" عُقْمٌ اصل میں اس خشکی کو کہتے ہیں کہ جو اثر قبول کرنے سے مانع ہو چنانچہ محاورہ ہے عَقِمَتْ مَفَاصِلُهُ (اس کے جوڑ خشک ہو گئے) اور دَاءٌ عُقَامٌ کہتے ہیں لاعلاج مرض کو، اور جو عورتوں میں عَقِيمٌ اس کو بولتے ہیں جو مرد کے نطفہ کو قبول نہیں کرتی چنانچہ بولا جاتا ہے عَقِمَتِ الْمَرْأَةُ (عورت بانجھ ہو گئی) اور عَقِمَتِ الرَّحِمُ (رحم دانی خشک ہو گئی) اور ارشاد ہے فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوزٌ عَقِيمٌ (پھر اپنا منہ پیٹ لیا اور کہنے لگی بڑھیا بانجھ)

۵ا تاج العروس۔

الریح العقیم میں "عقیم" بمعنی فاعل بھی ہو سکتا ہے یعنی وہ ہوا کہ جو نہ بادل کو لے کر آئے نہ کسی درخت میں پھل لائے اور بمعنی مفعول بھی، جیسے کہ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ہے یعنی وہ ہوا کہ جو کسی خیر کا اثر قبول نہ کرے اور چونکہ وہ نہ کسی چیز کو قبول کرتی ہے نہ کسی چیز سے اثر لیتی ہے اس لئے نہ کچھ دیتی ہے نہ اپنا اثر چھوڑتی ہے ارشاد ہے

اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ

جب بھیجی ہم نے ان پر ہوا خیر سے خالی اور

يَوْمٍ عَقِيْمٍ سے مراد وہ دن ہے کہ جس میں کوئی فرحت نہ ہو"

اور مصباح میں یوم عقیم کے معنی لکھے ہیں وہ دن کہ جس میں ہوا نہ ہو اور سخت گرم ہو عذاب دہ ہے کہ عَذَابَ يَوْمٍ عَقِيْمٍ میں بعض نے اس سے قیامت کا دن مراد لیا ہے اور بعض نے بدر کا دن۔ قیامت کا دن مراد لینے کی صورت میں اس کے معنی ہوں گے ایسا دن کہ جس کے بعد کوئی اور دن نہ ہو یعنی جس طرح ہر دن کے بعد دوسرا دن پیدا ہوتا رہتا ہے یہ بات قیامت کے دن میں نہ ہوگی اس لئے وہ عقیم یعنی بانجھ ہے کہ اس کے بعد کوئی اور دن نہیں اور بدر کا دن مراد لینے کی صورت میں اس کو عقیم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس دن بہت سی عورتوں کی اولاد قتل کر دی گئی تو گویا وہ بانجھ ہو گئیں کہ ان کے اولاد ہی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ۱۷/۱۴ ۲۶/۱۹ ۲۷/۱

عَقِيْمًا ۲۵/۹

# فصل اللام

**عَلَا**: وہ چڑھ گیا، اس نے چڑھائی کی، وہ غالب آیا۔ عُلُوٌّ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، (ملاحظہ ہو عُلُوًّا) ۱۵/۵ ۲۰/۶

**عَلَّامُ**: خوب جاننے والا، عِلْمٌ سے بروزن فَعَّالٌ مبالغہ کا صیغہ ہے، قرآن مجید میں عَلَّامُ الْغُيُوْبِ کا استعمال حق تعالیٰ شانہ کی صفات کے سلسلہ میں ہوا ہے۔ جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس سے کوئی پوشیدہ سے پوشیدہ چیز بھی چھپی نہیں رہ سکتی۔ امام ابوبکر بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں لکھتے ہیں،

"اس کے معنی ہیں ایسا زبردست جاننے والا، جو ہر طرح کی معلومات کا ان کے گوناگوں ہونے کے باوجود علم رکھتا ہو چنانچہ جواب

موجود ہے اُسے بھی جانتا ہے اور جو آئندہ ہوگا اسی طرح جو چیز ہونے والی نہیں اس کا بھی اسے علم ہے اور اس کا بھی کہ اگر وہ ہوتی تو کس طرح ہوتی "۔ ۱؎

ت ۷/۶،۵ ت ۱۰/۱۲ ت ۲۲/۱۲

**عَلٰمٰتٍ** : نشانیاں، پتے، عَلَامَۃٌ کی جمع جس کے معنی نشان اور پتہ کے ہیں۔ ت ۱۴/۸

**عَلَانِیَۃً** : کھلم کھلا، ظاہر، آشکار، علانیہ قاموس میں ہے کہ یہ عَلَنَ یَعْلِنُ کا مصدر ہے جس کے معنی ظاہر اور آشکارا ہونے کے آتے ہیں مگر مصباح میں اس کو اسم لکھا ہے۔ اور امام راغب لکھتے ہیں:

عَلَانِیَۃٌ سِرّ کی ضد ہے اور اس کا استعمال بیشتر معانی میں ہوتا ہے اعیان میں نہیں ہوتا "

ت ۳/۶ ت ۱۳/۱۰،۹ ت ۲۲/۱۶

**عَلَقٍ** : لہو کی پھٹکیاں، جما ہوا خون جو خشک نہ ہوا ہو۔ امام راغب لکھے تو اس کے معنی صرف جمے ہوئے خون کے لکھے ہیں لیکن قاموس میں ہے کہ:۔

"عَلَق کے معنی ہیں عام خون یا وہ خون کہ جو بہت زیادہ سُرخ ہو، یا جما ہوا خون "

ت ۳۰/۲۱

**عَلَقَۃً** : جمے ہوئے خون کی ایک پھٹکی۔ خون کی وہ پھٹکی جو منی سے پیدا ہوتی ہے اس کی جمع عَلَقٌ ہے۔ امام قرطبی نے تصریح کی ہے کہ علقہ جمے ہوئے خون کو کہتے ہیں اور جب وہ بہتا ہو تو مسفوح کہلاتا ہے۔ اور علقہ کو علقہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اس رطوبت کے ساتھ جو اس میں لگی رہتی ہے معلق ہوتا ہے چنانچہ جب وہ رطوبت خشک ہو جاتی ہے تو پھر علقہ نہیں کہلاتا، ۲؎ ت ۱۴/۸ ت ۱۸/۱ ت ۲۴/۱۲ ت ۲۹/۱۸

**عِلْمٌ** : علم، دانش، جاننا، یہ عَلِمَ یَعْلَمُ کا مصدر ہے۔ علامہ احمد فیومی المصباح المنیر میں لکھتے ہیں:۔

" علم کہتے ہیں یقین کو، چنانچہ عَلِمَ یَعْلَمُ کا استعمال کسی بات کے یقین کرنے کے لیے ہوا کرتا ہے نیز علم کے معنی معرفت کے اور معرفت کے معنی علم کے بھی آیا کرتے ہیں

۱؎ کتاب الاسماء والصفات۔ ص ۳۳ طبع انوار احمدی الہ آباد۔
۲؎ تفسیر قرطبی۔ ج ۲۰۔ ص ۱۱۹۔ طبع دار الکتب المصریہ ۱۳۶۹ھ

Marfat.com

چونکہ علم اور معرفت دونوں مسبوق بالجہل ہونے میں باہم شریک ہیں اس لیے ان میں سے ہر ایک دوسرے کے معنی پر متضمن ہے اور علم کا حصول اگرچہ کسب کی بنا پر ہوتا ہے مگر یہ کسب جہالت کے بعد ہی ہوتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ (اس وجہ سے کہ انہوں نے یقین کر لیا حق بات ہیں) عَرَفُوا بمعنی عَلِمُوا ہے اور لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (تم ان کو نہیں پہچانتے اللہ ان کو پہچانتا ہے) بمعنی لا تعرفونهم الله يعرفهم ہے۔ اور زہیر کہتا ہے:-

واعلم علم اليوم والامس قبله
ولكنني عن علم ما في غد عمي

(میں آج کی بھی معرفت رکھتا ہوں اور آج سے پہلے کل کی بھی لیکن کل کیا ہوگا اس کی معرفت سے میں نابینا ہوں)۔

اس شعر میں بھی اعلم بمعنی اعرف ہے معرفت کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر کبھی ہوتا ہے کیوں کہ وہ بھی علم ہی کی ایک قسم ہے رہا علم اور معرفت کا باہمی فرق سو وہ اصطلاحی اور اپنے متعلقات کے اختلاف پر مبنی ہے، ہاں ذات باری سبحانہ و تعالیٰ جہل و اکتساب سے منزہ ہے کیوں کہ جو کچھ ہو چکا اور جو کچھ آئندہ ہوگا اسے سب معلوم ہے اور جو نہ ہوگا اس کے متعلق بھی اس کو یہاں تک علم ہے کہ اگر وہ ہوتا تو کیوں کر ہوتا۔ علم حق ایک صفت قدیم ہے جو ازل سے ذات الٰہی کے ساتھ قائم ہے لہٰذا جہل کا ہونا اس کے حق میں محال ہے علم کے معنی جب یقین کے آتے ہیں تو متعدی بدو مفعول ہوتا ہے اور جب معرفت کے معنی دیتا ہے تو متعدی بیک مفعول ہوتا ہے۔ اور کبھی "شعور" کے معنی پر بھی متضمن ہوتا ہے۔ اس صورت میں اس کا تعدیہ بذریعہ ب بھی ہوتا ہے جیسے علمت اور علمت بہ"

اور امام راغب نے لکھا ہے کہ

"ایک حیثیت سے تو علم کی دو قسمیں ہوتی ہیں، نظری اور عملی۔ نظری تو وہ جو صرف علم ہی سے مکمل ہو جاتے جیسے کہ عالم کا علم ہے اور عملی وہ جو بغیر عمل کے تکمیل نہ پاتے جیسے کہ عبادات کا علم ہے اور دوسری حیثیت

سے اس کی دو قسمیں عقلی اور سمعی بھی ہوتی ہیں"
اور قاموس میں ہے کہ:-

" عَلِمَ بر وزن سَمِعَ عِلْمًا بالکسر بمعنی عَرَفَ ہے"

علامہ سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں اس کی شرح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

"صحاح اللغۃ بہت سی امہات لغت میں بھی اسی طرح مذکور ہے اور مصنف نے [illegible] عَرَفَ کے ساتھ حق المعرفۃ کے الفاظ اور زیادہ کیے ہیں اب یہاں نیز آگے چل کر جو مصنف نے یہ لکھا ہے کہ علم ب۔ بر وزن بمعنی شعر ہے" یہ اس بارے میں بالکل صریح ہے کہ علم معرفت اور شعور سب کے ایک ہی معنی ہیں اور پہلے (یعنی معرفت کے معنی میں) یہ متعدی بنفسہ ہے اور جب شعور کے معنی میں آتا ہے تو اس کا تعدیہ بذریعہ ب ہوتا ہے لیکن یہ بیشتر سلف لغویوں کے کلام سے ملتی جلتی ہے مگر اکثر محققین ان سب میں باہم فرق کرتے ہیں اور علم ان کے نزدیک ان تینوں اوصاف میں بالاتر ہے یہی وجہ ہے کہ وہ علم کا اطلاق تو اللہ تعالیٰ پر جائز سمجھتے ہیں مگر صحیح تر قول کے بموجب نہ اس کو عارف کہتے ہیں نہ شاعر اور ان کے باہم جو فرق ہے وہ اہل اشتقاق کی تصانیف میں مذکور ہے البتہ خود علم کے بارے میں اس قدر سخت اختلاف ہے کہ ایک جماعت تو یہ کہتی ہے کہ اس کی کوئی تعریف ہی نہیں کی جاسکتی کیونکہ یہ بالکل ظاہر اور بدیہیات میں سے ہے اور دوسری جماعت اس کی قائل ہے کہ دشواری اور دقت کی بنا پر اس کی تعریف کرنا ممکن نہیں اور دوسرے کچھ اور بھی کہتے ہیں:-

چنانچہ اس بحث کو مع مالہ وما علیہ کے امام ابوالحسن الیوسی نے قانون العلوم میں قلمبند کر دیا ہے اور الدر المصون میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ب کے ذریعہ اس کی تعدیہ کی وجہ یہ ہے کہ اس میں کبھی کبھی احاطہ کے معنی بھی ملحوظ ہوتے ہیں۔

اور مناوی التوقیف میں لکھتے ہیں کہ علم وہ پختہ اور جازم اعتقاد ہے کہ جو واقع کے مطابق ہو، یا علم وہ صفت ہے جو اس تمیز کو ضروری کر دیتا ہے کہ جس میں اس

Marfat.com

کی نقیض کا احتمال تک نہ ہو یا علم کہتے ہیں عقل میں کسی شئے کی صورت کے حاصل ہونے کو اور پہلی تعریف زیادہ خاص ہے۔

اور لبصائر میں ہے کہ "معرفت" کہتے ہیں کسی شئے کے نشانات پر غور و فکر کر کے اس کے ادراک کرنے کو، اور یہ علم سے اخص ہے معرفت اور علم میں لفظی اور معنوی طور پر متعدد وجوہ سے فرق ہے لفظی تو یہ کہ "معرفت" کا فعل ایک مفعول کو چاہتا ہے اور علم کا فعل دو مفعولوں کو، اور جب "علم" کا ایک ہی مفعول مذکور ہوگا تو وہ بمعنی "معرفت" ہی ہوگا۔ اور معنوی حیثیت سے ان دونوں میں حسب ذیل وجوہ سے فرق ہے (۱) "معرفت" کا تعلق ذات شے سے ہوتا ہے اور "علم" کا اس کے احوال سے (۲) "معرفت" اکثر اس چیز کی ہوا کرتی ہے کہ جس کا ادراک پہلے سے قلب میں موجود تھا اور بعد میں جاتا رہا۔ چنانچہ اب دوبارہ جو اس کا ادراک ہوگا وہ "معرفت" کہلائیگا برخلاف علم کے کہ اس میں یہ بات نہیں ہوتی، لہذا "معرفت" نام ہے ذکر نفسی کی نسبت کا یعنی اس چیز کا حضور کہ جو ذاکر سے غائب تھی۔ یہی وجہ ہے کہ "معرفت" کی ضد "انکار" ہے اور علم کی ضد جہل (۳) "معرفت" کسی شے کی ذات کا ایسا تفصیلی علم ہے جو اس کو ماسوا سے الگ کر دے لیکن "علم" کا تعلق کسی شے سے اجمالی بھی ہو سکتا ہے نیز اس کے علاوہ اور بھی فرق ہیں"

---

امام راغب نے تصریح کی ہے کہ آیت شریفہ یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَیَقُولُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا (جس دن اللہ جمع کریگا سب پیغمبروں کو پھر کہیگا تم کو کیا جواب ملا تھا وہ کہیں گے ہم کو خبر نہیں) میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس روز ان حضرات کی عقلیں بھی دنگ ہو گئیں اور قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ (بولا وہ شخص جس کے پاس تھا ایک علم کتاب کا) میں "علم" سے مراد وہ علم خاص ہے کہ جو بشر سے مخفی ہوتا ہے والّٰذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (اور جن کو علم دیا گیا ہے ان کے درجے اللہ بلند فرماتا ہے) میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس امر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ علم اور اہل علم کے درجات د

مراتب مختلف ہیں، (ملاحظہ ہو اَعْلَمُ)

۱/۴،۱۴ ، ۲/۱،۱۹ ، ۳/۹،۱۰،۱۴،۱۵ ، ۶/۲ ، ۷/۵،۸،۱۴ ،
۸/۱،۳،۴،۵،۸،۱۲ ، ۱۱/۱۵ ، ۱۲/۲،۴ ، ۱۳/۲،۳،۱۱،۱۲ ،
۱۴/۹،۱۰،۱۵ ، ۱۵/۴،۱۰،۱۱،۱۳ ، ۱۶/۶ ، ۱۷/۸،۱۴،۱۹ ،
۱۹/۱۸ ، ۲۰/۱۱،۱۳ ، ۲۱/۱،۷،۹،۱۰،۱۱،۱۲،۱۳ ،
۲۳/۱۴ ، ۲۴/۲،۱۰،۱۴ ، ۲۵/۱،۳،۸،۱۲،۱۳،۱۵،۱۶ ، ۲۵/۱۹ ،
۲۶/۱،۳،۶،۱۱ ، ۲۷/۶،۷ ، ۲۷/۶،۷ ، ۲۸/۲ ، ۲۹/۲ ، ۳۰/۲۷

عِلْمًا: ۷/۱۵ ، ۹/۱ ، ۱۲/۱۳ ، ۱۵/۲۱ ، ۱۶/۱۴،۱۵ ،
۱۷/۶،۵ ، ۱۹/۱۷ ، ۲۰/۳،۵ ، ۲۶/۶ ، ۲۸/۱۸

عَلِمَ: اس نے جان لیا، اس نے پہچان لیا، اس نے معلوم کرلیا، وہ واقف ہوگیا، عِلْمٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب،
۱/۷ ، ۲/۲،۱۴ ، ۹/۱۰،۱۷ ، ۱۰/۵ ، ۱۸/۱۲ ، ۲۵/۱۷ ، ۲۶/۱۱ ، ۲۹/۱۴ -

عَلَّمَ: اس نے سکھایا، اس نے تعلیم دی تَعْلِیْمٌ سے جس کے معنی سکھانے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ:-

"اصل میں تو اِعْلَامٌ اور تَعْلِیْمٌ کے معنی ایک ہی ہیں مگر اعلام مخصوص ہے جلدی سے بتا دینے کے لیے اور تعلیم مخصوص ہے بار بار اور کثرت سے بتانے کے لیے تاکہ متعلم کے ذہن میں اس کا ایک اثر پیدا ہو اور بعض نے کہا ہے کہ تعلیم کہتے ہیں معانی کے تصور کے لیے نفس کے متوجہ کرنے کو اور تعلم کہتے ہیں اس تصور کی طرف نفس کے متوجہ ہونے کو اور کبھی تعلیم" کا استعمال اعلام کے معنی میں بھی ہوتا ہے جبکہ اس میں بھی تکرار کے معنی موجود ہوں جیسے اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰہَ بِدِیْنِکُمْ (کیا جتلاتے ہو اللہ کو اپنی دینداری)

آیہ شریفہ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا (اور سکھلا دیے آدم کو نام سب چیزوں کے) میں "تعلیم اسماء" سے مراد یہ ہے کہ ان کو وہ قوت عطا فرمائی کہ جس کی بدولت وہ گویا ہوئے اور انہوں نے اشیاء کے نام وضع فرمائے اور یہ سب کچھ ان کے اندر القاء ربانی سے عمل میں آیا۔ جس طرح سے کہ اللہ تعالیٰ نے حیوانات میں ہر ایک کو اس کا ایک مستقل کام سکھلایا کہ جس کو وہ انجام دیتا رہتا ہے اور ایک مستقل آواز عنایت کی کہ جس کو وہ نکالتا رہتا ہے۔ اور یہ جو ارشاد ہے و۔ ق
عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا قَالَ لَهٗ مُوْسٰی

هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا "اور سکھلایا تھا اس کو اپنے پاس سے ایک علم، کہا اس کو موسٰی نے کہے تو تیرے ساتھ ہوں اس بات پر کہ مجھ کو سکھلا دے کچھ جو تجھ کو سکھلائی ہے بھلی راہ) اس کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ اس سے ایک خاص علم مراد ہے جو بشر سے مخفی ہوتا ہے اور جب تک اللہ تعالےٰ اس سے واقف نہ فرمائے لوگوں کے نزدیک وہ قابل انکار ہی ہوتا ہے، کیوں کہ جب حضرت موسٰی علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ ہوئے تو جب تک اس علم کی حقیقت سے باخبر نہ ہوتے جو دیکھا اس پر انکار ہی فرماتے رہے"

۱/۴ ، ۲۷/۱۱ ، ۳۰/۲۱

**عُلَمٰٓؤُا** : علماء، عالم لوگ، قرآن پاک میں اس کا رسم الخط سورۂ شعراء، اور سورۂ فاطر دونوں جگہ میم کے بعد واؤ کے ساتھ ہے جس پر ہمزہ ہے اور واؤ کے بعد الف بھی لکھا جاتا ہے مگر پڑھنے میں نہیں آتا، علامہ احمد فیومی نے المصباح المنیر میں لکھا ہے کہ "علیم کی جمع علماء اور عالم کی جمع عالمون آتی ہے، لیکن صاحب قاموس نے علماء کو عالم اور علیم دونوں کی جمع بتایا ہے اور علامہ سید مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں ابن جنی سے اس کی یہ وجہ نقل کی ہے کہ:۔ "علم" کا وصف چونکہ مزاولت اور گہرے تعلق کے بعد پیدا ہوتا ہے اس لیے یہ وصف بمنزلہ طبیعت کے ہے اور ابتدائی طور پر علم میں داخل ہونے سے نہیں ہوا ہے کیوں کہ اس صورت میں وہ متعلم کہلاتا ہے نہ عالم لہٰذا جب یہ وصف طبیعت کے معنی لیکر باب سمع میں آیا تو عالم بمعنی علیم ہوا اور اسی لیے اس کی جمع بھی اسی کی طرح مکسر آئی اور بعد کو اس کی ضد کو بھی اسی پر محمول کیا گیا، چنانچہ علماء کی طرح جہلاء بھی بولنے لگے"

۱۹/۱۵ ، ۲۲/۱۶

**عَلِمْتَ** : تو جان چکا، تو نے جان لیا۔ عِلْمٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر ہے ۱۲/۱۵ ، ۱۴/۵

**عَلِمْتُ** : میں نے جانا عِلْمٌ سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم۔ ۲۳/۹ ، ۳۰/۶,۷,۶

**عُلِّمْتَ** : تو سکھلایا گیا، تجھے تعلیم دی گئی تَعْلِیْمٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر حاضر

Marfat.com

(ملاحظہ ہو عَلَّمَ ، پ ۱۵/۲۱)

عَلَّمْتُكَ : میں نے تجھے تعلیم دی عَلَّمْتُ تَعْلِیْمٌ سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم اور كَ ضمیر واحد مذکر حاضر پ ۷/۵

عَلِمْتُمْ : تم نے جانا تم جان چکے، عِلْمٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر پ ۱/۸ پ ۱۳/۴،۳ پ ۸/۱۰ پ ۲۷/۱۵

عَلَّمْتُمْ : تم نے سکھلایا، تم نے تعلیم دی تَعْلِیْمٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر ملاحظہ ہو عَلَّمَ ) پ ۶/۵

عُلِّمْتُمْ : تم سکھلائے گئے، تم کو تعلیم دی گئی تَعْلِیْمٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر حاضر۔ پ ۷/۱۶

عَلِمْتُمُوْهُنَّ : تم نے ان (عورتوں) کو جانا عَلِمْتُمْ ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، واؤ اشباع کا اور هُنَّ ضمیر جمع مذکر حاضر پ ۲۸/۸

عَلَّمْتَنَا : تو نے ہمیں سکھایا، تو نے ہم کو تعلیم دی عَلَّمْتَ تَعْلِیْمٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر۔ نا ضمیر جمع متکلم پ ۱/۴

عَلَّمْتَنِیْ : تو نے مجھ کو سکھلایا، تو نے مجھ کو تعلیم دی عَلَّمْتَ تَعْلِیْمٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر، ن وقایہ، ی ضمیر واحد متکلم پ ۱۳/۵

عَلِمْتَهٗ : تو اس کو جان چکا، تجھے وہ معلوم ہے عَلِمْتَ عِلْمٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر، ہ ضمیر واحد مذکر غائب، پ ۷/۶

عَلَّمَكَ : اس نے تجھ کو سکھلایا۔ اس نے تجھے تعلیم دی، عَلَّمَ، تَعْلِیْمٌ سے صیغہ ماضی اور كَ ضمیر واحد مذکر حاضر پ ۵/۱۴

عَلَّمَكُمْ : اس نے تم کو سکھلایا۔ اس نے تم کو تعلیم دی، عَلَّمَ تَعْلِیْمٌ سے صیغہ ماضی اور کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر پ ۲/۱۵ پ ۶/۵ پ ۱۶/۱۲ پ ۱۹/۷

عَلِمْنَا : ہم نے جانا، ہم کو معلوم ہے سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم پ ۱۲/۱۷ پ ۱۳/۴ پ ۱۴/۲ پ ۲۲/۳ پ ۲۶/۱۵

عُلِّمْنَا : ہم سکھلائے گئے ہمیں تعلیم دی گئی، تَعْلِیْمٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع متکلم پ ۱۹/۱۷

عَلَّمْنٰهُ : ہم نے اس کو سکھلایا، ہم نے اس کو تعلیم دی، عَلَّمْنَا تَعْلِیْمٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، ہ ضمیر واحد مذکر غائب۔ پ ۱۳/۲

Marfat.com

ب ۱۵/۲۱ ب ۱۷/۶ ۲۳/۴

**عَلَّمَنِیْ**: اس نے مجھے سکھلایا، اس نے مجھے تعلیم دی عَلَّمَ تَعْلِیْمٌ سے صیغہ ماضی ن وقایہ ی ضمیر واحد متکلم ب ۱۲/۱۵

**عَلِمُوْا**: انہوں نے جان لیا۔ عِلْمٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب ب ۱/۱۲ ب ۲۰/۱۰

**عَلِمَہٗ**: اس نے اس کو جان لیا عَلِمَ عِلْمٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب اور ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب آیہ شریفہ یَعْلَمُہُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَہٗ مِنْهُمْ (تو جان لیتے اس کو جو تحقیق کرنے والے ہیں ان میں سے) میں عَلِمَہٗ کے معنی واحد کی بجائے جمع کے کیے جائیں گے کیوں کہ عربی میں قاعدہ ہے کہ فاعل جب اسم ظاہر ہو تو فعل کو واحد لاتے ہیں چنانچہ یہاں بھی اَلَّذِیْنَ جو فاعل ہے جمع ہے اس لیے صیغہ فعل واحد آیا۔ ب ۵

**عَلَّمَہٗ**: اس نے اس کو سکھلایا، عَلَّمَ تَعْلِیْمٌ سے صیغہ ماضی، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب

ب ۲/۱۷ ب ۳/۷ ۲۷/۱۱۶۵

**عِلْمِہٖ**: اس کا جاننا، اس کا علم، مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ۔ ب ۳/۴ ب ۲/۳ ب ۱۱/۹ ۲۴/۱۴ ۲۵/۱

**عِلْمُهَا**: اس کا علم، اس کا جاننا عِلْمٌ مضاف، ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ ب ۹/۱۴ ب ۱۲/۱۱ ۲۲/۵

**عِلْمُهُمْ**: ان کا جاننا، ان کا علم عِلْمٌ مضاف، ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ

ب ۲۰/۱

**عِلْمِیْ**: میرا علم، میرا جاننا عِلْمِ مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ۔ ب ۱۹/۱

**عَلَوْا**: وہ غالب آئے عُلُوٌّ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب۔ ب ۱۵/۱

**عُلُوًّا**: بلند ہونا، سرکشی کرنا، کسی کام پر قوی ہونا، کسی چیز پر زبر ہونا، کسی شخص پر غلبہ کرنا، یہ عَلَا یَعْلُوْ کا مصدر ہے اور اس کا فعل باب نَصَرَ سے آتا ہے۔ امام ابو جعفر بیہقی تاج المصادر میں مذکورہ بالا معانی نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

والترکیب یدل علی السمو والارتفاع مع کثرتہ۔ — اس مادہ کی ترکیب دلالت کرتی ہے بکثرت بلندی اور رفعت پر۔

امام راغب اصفہانی، مفردات القرآن

Marfat.com

میں فرماتے ہیں:-

عُلُوٌّ سِفْلٌ کی ضد ہے، اور عُلْوِیٌّ اور سُفْلِیٌّ ان ہی دونوں کی طرف منسوب ہیں عُلُوٌّ کے معنی بلند ہونے کے ہیں، گردان آئی ہے، عَلَا یَعْلُو عُلُوًّا وھو عَالٍ نیز عَلِیَ یَعْلٰی عَلَاءً فھو عَلِیٌّ بھی مستعمل ہے مگر عَلَاءٌ بالفتح کا استعمال امکنہ اور اجسام کے بارے میں زیادہ ہے، ارشاد ہے عَالِیَھُمْ ثِیَابُ سُنْدُسٍ (ان کے اوپر کی پوشاک ان کے کپڑے ہیں باریک ریشم کے) اور بعض نے کہا ہے کہ عَلَاءٌ کا استعمال قابل مدح اور قابل مذمت دونوں کے لیے ہوتا ہے مگر عُلِیَ صرف قابل مدح ہی کے لیے بولا جاتا ہے.

آیہ شریفہ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا کَبِیْرًا (وہ پاک ہے اور برتر ہے ان کی باتوں سے بہت زیادہ) میں عُلُوًّا، تَعَالٰی کا مصدر نہیں ہے جس طرح سے کہ اَنْبَتَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا میں نَبَاتًا، اَنْبَتَکُمْ کا اور تَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا میں تَبْتِیْلًا تَبَتَّلْ کا مصدر نہیں ہے"

۱۵/۵،۱ ۱۹/۱۶ ۲۰/۱۲

**عَلٰی** (پر، اوپر) امام جلال الدین سیوطی الاتقان فی علوم القرآن میں فرماتے ہیں:-

"علیٰ حرف جر ہے جس کے متعدد معانی ہیں اور ان میں سب سے زیادہ مشہور "استعلا" (یعنی اظہار بلندی و برتری) کے معنی ہیں، خواہ استعلا حسی ہو یا معنوی، جیسے وَعَلَیْھَا وَعَلَی الْفُلْکِ تُحْمَلُوْنَ (اور ان پر اور کشتیوں پر تمہیں سوار کرایا جاتا ہے) کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ (جو کوئی ہے زمین میں فنا ہونے والا ہے) فَضَّلْنَا بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ (فضیلت دی ہم نے ان میں بعض کو بعض پر) وَلَھُمْ عَلَیَّ ذَنْبٌ (اور ان کو مجھ پر ہے ایک گناہ کا دعویٰ)[۵]

(۲) مع کی طرح مصاحبت (یعنی معیت) کے لیے جیسے وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ای مع حبہ یعنی اس کی محبت کے ساتھ مال بھی دے وَاِنَّ رَبَّکَ لَذُوْ مَغْفِرَۃٍ لِّلنَّاسِ عَلٰی ظُلْمِھِمْ (تیرا رب معاف

۵ پہلی دو مثالیں استعلاء حسی کی ہیں اور دوسری دو استعلاء معنوی کی ۔

Marfat.com

بھی کرتا ہے لوگوں کو باوجود ان کے ظلم کے)
ای مع ظلمہم (۳) مِنْ کی طرح سے ابتداء
کے لیے جیسے اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ
(جب ناپ کر لیں لوگوں سے) بمعنی مِنَ
النَّاسِ ہے۔ اسی طرح لِفُرُوْجِهِمْ
حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ (اپنی
شہوت کی جگہوں کو تھامتے ہیں مگر اپنی بیویوں
سے) میں بھی عَلٰی بمعنی مِنْ ہے اور
اس کی دلیل یہ حدیث ہے (احفظ
عورتك الا من زوجتك تو اپنی شرمگاہ
کی حفاظت کر مگر اپنی بیوی سے) (۴) لام کی
طرح سے تعلیل یعنی بیان سبب و علت
کے لیے جیسے وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا
هَدٰىكُمْ (تاکہ تم بڑائی کرو اللہ کی اس
بات پر کہ تم کو ہدایت کی) یعنی چونکہ اللہ نے
تم کو ہدایت فرمائی اس لیے تم اس کی بڑائی
بیان کرو۔ (۵) فِی کی طرح سے ظرفیت
کے لیے جیسے وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى
حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا (اور آیا شہر کے
اندر جس وقت بے خبر ہوئے تھے وہاں کے
لوگ) کہ یہاں علٰی حین بمعنی فی حین

ہے یعنی جس وقت میں کہ وہ بے خبر تھے اور
وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ
سُلَيْمٰنَ (اور پیچھے ہو لیے اس علم کے جو
پڑھتے تھے شیطان سلیمان کی بادشاہت
کے وقت میں) کہ یہاں علٰی ملک سلیمٰن
بمعنی فی زمن ملکہ ہے (۶) ب کے معنی
میں جیسے حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى
اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ (قائم اس بات پر کہ نہ
کہوں اللہ کی طرف سے مگر جو سچ ہے) کہ یہاں
علیٰ ان، باَن کے معنی میں ہے چنانچہ
حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کی
یہی قراءت ہے۔
فائدہ:۔ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ
(اور بھروسہ کر اس زندہ پر کہ جس کو موت
نہیں آتی) اور اسی قسم کی آیات میں علٰی بمعنی
اضافت ما اسناد ہے " ای اضف تو
کلک و اسندہ علیہ" یعنی اپنے توکل کو اسی کی
طرف لگا اور اسی سے متعلق کر چنانچہ بعض نے
یہی بیان کیا ہے لیکن میرے نزدیک اس
میں علٰی با استعانت کے معنی میں ہے
اور كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (اس نے

لکھی ہے اپنے ذمہ مہربانی) جیسی آیات میں عَلٰی ذاتِ الٰہی پر رحمت کے ایجاب و استحقاق کے لیے نہیں بلکہ محض اس کے فضل کی تاکید کے واسطے ہے، اور اسی طرح ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (بیشک ہمارا ذمہ ہے ان سے حساب لینا) کی طرح آیات میں عَلٰی محض تاکید مجاوزات کے لیے ہے۔

تنبیہ: عَلٰی جیسا کہ اخفش نے بیان کیا ہے اسم بھی واقع ہوتا ہے جبکہ اس کا مجرور اور اس کے متعلق کا فاعل دونوں ضمیریں ہوں جیسے کہ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ[1] (رہنے دے اپنے پاس اپنی بیوی کو[2])

اور علامہ لغوی سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس شرح قاموس میں رقمطراز ہیں:

(علیٰ ایک حرف ہے[3] جو حروفِ اضافت یعنی حروفِ جارہ میں سے ہے، ان حروف کو حروفِ اضافت اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ فعل یا شبہ فعل کو اس اسم سے لگا دیتے ہیں کہ جو اس سے متصل ہو اور جار بردی کہتے ہیں کہ چونکہ یہ معانی افعال کی اضافت اسماء کی طرف کرتے ہیں، اس لیے حروفِ اضافت سے موسوم ہیں، پھر بعض حروف تو فقط حرف ہی رہتے ہیں اور بعضے کبھی حرف ہوتے ہیں اور کبھی اسم اور بعضے کبھی حرف ہوتے ہیں اور کبھی فعل (اور سیبویہ کا بیان ہے کہ عَلٰی اسم ہے جو استعلا کے لیے آتا ہے) اور حرف مِنْ بھی اس پر آتا ہے اور اس صورت میں یہ بمعنی فوق ہوتا ہے، جیسے آیہ شریفہ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ

اور صحاح میں ہے کہ عَلٰی حرف جار ہے اور کبھی اسم بھی واقع ہوتا ہے، اور اس پر حرف مِن آتا ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے

غدت من عليه تنفض الطل بعدما
رأت حاجب الشمس استوى فترفعا

کہ یہاں من علیہ بمعنی من فوقہ ہے کیونکہ حرف جر پر حرف جر نہیں آیا کرتا، اور مبرد نے کہا کہ لفظ عَلٰی اسم، فعل، حرف تینوں کے لیے

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن - ج ۱ - ص ۱۴۴ - طبع مصر ۱۳۷۰ھ [2] کہ یہاں علیٰ اسم ہے کیونکہ اس کا مجرور ک بھی ضمیر ہے اور اس کے متعلق یعنی اَمْسِكْ کا فاعل اَنْتَ بھی ضمیر مستتر ہے۔ [3] بین القوسین متن یعنی قاموس کا ترجمہ ہے۔

مشترک ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو اسم ہے
وہی حرف یا فعل بھی ہے بلکہ یہ بتلانا ہے کہ
کبھی کسی لفظ میں اسم اور حرف دونوں جمع
ہو جاتے ہیں، چنانچہ دیکھو جب تم عَلٰی زَیْدٍ
ثَوْبٌ (زید پر کپڑا ہے) بولو گے تو عَلٰی یہاں
حرف ہوگا، اور عَلَا زَیْدًا ثَوْبٌ (زید کے
اوپر کپڑا آگیا) میں عَلٰی فعل ہے کیونکہ یہ عَلا
یعلو سے ہے...... اور سیبویہ نے کہا ہے
کہ اس کا الف واؤ سے بدلا ہوا ہے اور ضمیر
کے ساتھ یہی واؤ یاء سے بدل جاتا ہے جیسے
علیک ہے اور بعض عرب اس صورت میں
میں بھی اس کو علیٰ حالہ چھوڑ دیتے ہیں چنانچہ
راجز کہتا ہے۔ ۶

طاروا علاھن فطر علاھا

اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ بلحرث بن کعب
کی یہی لغت ہے (انتھی) اور سبکی نے کہا ہے
کہ زیادہ صحیح یہی ہے کہ کبھی اسم بھی ہوتا ہے
بمعنی فوق کے مگر ایسا کم ہوتا ہے اور بیشتر
اس کا استعمال حرف ہو کر ہی ہے"

۱
۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵

۲
۱، ۲، ۳، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۵، ۱۶، ۱۷

۳
۱، ۲، ۳، ۴، ۷، ۸، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۶، و ۱۷

۴
۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، و ۱۴

۵
۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۸، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۶، ۱۷

۶
۲، ۳، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵ و

۷
۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵ و

۷
۱۶، ۱۸، ۱۹

۸
۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۱۰، ۱۱، ۱۲ و

۸
۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶

۹
۱، ۲، ۳، ۶، ۷، ۱۱، ۱۲، ۱۵، ۱۶ و

۹
۱۸

۱۰
۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲ و

۱۰
۱۳، ۱۴، ۱۸

۱۱
۱، ۲، ۳، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴ و

۱۱
۱۵، ۱۷

۱۲
۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۸، ۱۰، ۱۱ و

۱۲
۱۲، ۱۳، ۱۵

۱۳
۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۱۱

۱۳
۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۸

۱۴
۴، ۶، ۷، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳ و

۱۴
۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲

۱۵
۲، ۵، ۶، ۷، ۹

۱۵
۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۲۰ و

۱۵
۲۱

۱۶
۲، ۴، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۶ و

۱۶
۱۷

۱۷
۲، ۵، ۷، ۸، ۹، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۶ و ۱۷

۱۸
۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳ و ۱۴ و

۱۸
۱۵، ۱۶، ۱۷

۱۹
۱، ۲، ۳، ۴، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵

۱۹
۱۷ و ۲۰

۲۰
۲، ۴، ۵، ۶، ۷، ۱۱، ۱۴، ۱۵، ۱۶

۲۱
۲، ۳، ۸، ۹، ۱۰، ۱۲، ۱۴، ۱۷، ۱۸، ۱۹ و ۲۰

ھ۔ یہ ایک قبیلہ کا نام ہے۔

Marfat.com

۲۲

۲،۳،۴،۶،۷،۸،۹،۱۲،۱۳،۱۴،۱۵،۱۷ و ۱۸

۲۳

۱،۲،۳،۴،۶ و ۷،۸،۹،۱۰،۱۱،۱۲،۱۵ و ۱۷

۲۴

۱،۲،۳،۵،۶،۷،۸،۹،۱۲،۱۴،۱۶ و ۱۹

۲۵

۱،۲،۳،۴ و ۵،۷،۸،۹،۱۰،۱۴،۱۵،۱۸ و ۱۹

۲۶

۲،۴ و ۵،۶،۷،۹،۱۰،۱۱،۱۲،۱۳،۱۷ و ۱۸

۲۷

۳،۵،۸،۱۰،۱۳،۱۵،۱۷ و ۱۹ و ۲۰

۲۸

۱،۲،۳،۴،۶،۸،۹،۱۰،۱۳،۱۵،(۱۶)،۱۷،۱۸،۱۹،۲۰

۲۹

۱،۲،۳،۵،۶،۸،۱۰،۱۱،۱۲،۱۳،۱۵،۱۷،۱۸ و ۱۹

۳۰

۸،۱۰،۱۱،۱۴،۱۶،۲۱،۲۵ و ۲۹،۳۲

**عَلَيَّ**: مجھ پر کلا حرف جار۔ ی ضمیر واحد متکلم مجرور۔ ۵/۷، ۱۲/۳، ۱۴/۳، ۱۵/۷، ۱۶/۵، ۱۹/۱،۲،۶، ۲۰/۵،۶، ۲۶/۲،۱۴

**عُلٰى**: اونچے بلند۔ عُلیا کی جمع، ۲۶/۱۰،۱۲

**عَلِيٌّ**: بلند رتبہ، سب سے اوپر، عالیشان برتر، یہ عُلُوٌّ سے جس کے معنی بزرگ ہونے کے ہیں، بروزن فَعِیْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں: ۔

"عَلِیٌّ کے معنی ہیں، رفیع القدر یعنی بلند مرتبت کے۔ یہ عَلِیَ سے ہے اور جب یہ اللہ تعالیٰ کی صفت واقع ہو جیسے هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (وہی ہے عالی شان بڑا) اور اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا (بیشک اللہ ہے سب سے اوپر بڑا) تو اس کے معنی ہوں گے اس ذات کے جو اس سے کہیں برتر ہے کہ وصف بیان کرنے والوں کا وصف بلکہ عالموں کا علم بھی اس کا احاطہ نہ کر سکے"

اور تاج العروس میں ہے کہ: ۔

" اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے عَلِیٌّ اور مُتَعَالِی بھی ہیں، سو عَلِیٌّ کے معنی ہیں اس ذات کے کہ جس کے اوپر کوئی نہیں جو ساری خلق پر غالب ہے اور جس نے سب کو اپنی قدرت سے مغلوب کر رکھا ہے"

۳/۲، ۱۶/۱۵، ۲۱/۱۲، ۲۲/۹، ۲۴/۷، ۲۵/۲،۳،۶،۷

**عَلِيًّا**: ۵/۳، ۱۶/۶،۷

**عُلْيَا**: سب سے اوپر، اَعْلٰی کی تانیث عُلُوٌّ سے افعل التفضیل کا صیغہ واحد مؤنث

عُلٰی جمع، ۱۰/۱۲

**عَلَيْكَ**: تجھ پر، تیرے اوپر، عَلٰی حرف جار کَ ضمیر واحد مذکر حاضر مجرور ہے ۲/۱۶، ۳/۵،۹،۱۰،۱۴، ۴/۲، ۵/۱۴، ۶/۳، ۷/۵،۷،۱۰،۱۲، ۹/۳، ۱۱/۴،۹،۱۰،۱۱، ۱۳/۱۲، ۱۴/۳،۱۴،۱۷،۱۸،۲۱، ۱۵/۲،۱۰،۱۴، ۱۶/۲،۱۰،۱۱،۱۴، ۲۰/۴،۶،۱۲، ۲۱/۱، ۲۲/۲،۳

پ ۲۳/۱۴، پ ۲۴/۱ و ۳، پ ۲۵/۶ و ۱۷، پ ۲۶/۹ و ۱۴، پ ۲۸/۷
پ ۲۹/۱۳، ۲۰، پ ۳۰/۵

**عَلَیْكِ**: تجھ پر، تیرے اوپر، عَلیٰ حرف جر کَ ضمیر واحد مؤنث حاضر مجرور، پ ۱۶/۵

**عَلَیْكُمْ**: تم پر، تمہارے اوپر، عَلیٰ حرف جار۔ کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مجرور

پ ۱/۵، ۶، ۸، ۹، ۱۰، ۱۳ و ۱۵، پ ۲/۱، ۲ و ۵ و ۶، ۷ و
پ ۲/۸، ۹، ۱۰، ۱۳، ۱۴ و ۱۵ و ۱۶، پ ۳/۷ و ۱۳
پ ۴/۱، ۲، ۳ و ۷ و ۱۲، ۱۵، پ ۵/۱، ۲، ۸، ۹ و ۱۰ و ۱۲ و
پ ۵/۱۶ و ۱۷، ۱۸، پ ۶/۵، ۶ و ۸، پ ۷/۳، ۴ و ۵ و ۱۲، ۱۴، ۱۱
پ ۷/۱۵، ۱۹، پ ۸/۱، ۳، ۶، ۱۰، ۱۱ و ۱۲، ۱۳، ۱۵ و ۱۶
پ ۹/۱۴، ۱۶، پ ۱۰/۶، ۷، ۸ و ۹، ۱۰، پ ۱۱/۵، ۷، ۱۲، ۱۳، ۱۶، ۱۷
پ ۱۲/۳، ۵، ۷، ۸، پ ۱۳/۴، ۹، ۱۳، ۱۶، پ ۱۴/۲، ۱۷ و ۱۹، ۲۱
پ ۱۵/۱، ۷، ۱۵، پ ۱۶/۲ و ۱۳، پ ۱۷/۱۱ و ۱۷، پ ۱۸/۲، ۴، ۵، ۷، ۸، ۹
پ ۱۸/۱۰، ۱۳، ۱۴، پ ۱۹/۱۱، پ ۲۰/۹ و ۱۰، پ ۲۱/۱۲، ۱۷، ۱۸
پ ۲۲/۳، ۴، پ ۲۳/۶، پ ۲۴/۵، ۹، ۱۷، پ ۲۵/۱۳ و ۲۰، پ ۲۶/۳، ۱۴
پ ۲۷/۳، پ ۲۸/۲، ۸، ۱۸، پ ۲۹/۲، ۳، ۹، ۱۳، ۱۴، پ ۳۰/۷

**عَلَیْكُمَا**: تم دونوں پر، تم دونوں کے اوپر عَلیٰ حرف جار، کُمَا ضمیر تثنیہ مذکر حاضر مجرور، پ ۲۰/۱۲

**عَلِیْمٌ**: بڑا دانا، خوب جاننے والا، علم سے بروزن فَعِیْلٌ مبالغہ کا صیغہ، عُلَمَاءُ جمع

امام راغب فرماتے ہیں:-

"آیہ شریفہ وَفَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ (اور ہر جاننے والے کے اوپر ہے ایک جاننے والا) میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عَلِیْم سے اشارہ ایسے انسان کی طرف ہو کہ جو دوسرے کی نسبت علم میں بڑھا ہوا ہو اور لفظ عَلِیْمٌ جو مبالغہ کے لیے آتا ہے اُسے خاص طور پر اس امر پر متنبہ کرنے کے لیے لایا گیا ہو کہ یہ اپنے اگلے کی بہ نسبت زیادہ عالم ہے گو اوپر والے کی نسبت سے ایسا نہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عَلِیْمٌ اگرچہ نکرہ لایا گیا ہے مگر اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہو کیوں کہ حقیقت میں صفت علیم سے موصوف وہی ذات بزرگ و برتر ہے۔ اس صورت میں فَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ میں ذِیْ عِلْمٍ سے مراد اوّل سے آخر تک پوری کی پوری اہل علم کی جماعت ہوگی (یعنی جتنے بھی ذی علم ہیں اللہ تعالیٰ ان سب سے زیادہ عالم ہے) اور پہلی صورت میں ہر ایک ذی علم کے اوپر اس سے زیادہ علم رکھنے والا

موجود ہے۔"

واضح رہے کہ عَلِیْمٌ اسماء الٰہی میں سے بھی ہے اور قرآن پاک میں اس کا بیشتر استعمال اللہ تعالیٰ کی صفت ہی میں ہوا ہے کیوں کہ اصل علم اسی کا ہے

۱/ ۳، ۴، ۱۱، ۱۴، ۱۵، ۱۶ — ۲/ ۳، ۶، ۱۰، ۱۲، ۱۳، ۱۶
۳/ ۳، ۴، ۵، ۷، ۱۲، ۱۴، ۱۶ — ۴/ ۱، ۳، ۴، ۷، ۱۳
۵/ ۲ — ۶/ ۴، ۶، ۱۲، ۱۴ — ۷/ ۳، ۸، ۱۲، ۱۸، ۱۹
۸/ ۱، ۲، ۳ — ۹/ ۴، ۱۴، ۱۶ — ۱۰/ ۱، ۳، ۴، ۶، ۸، ۱۰، ۱۳، ۱
۱۰/ ۱۴ — ۱۱/ ۱، ۲، ۳، ۹، ۱۲، ۱۳، ۱۷ — ۱۲/ ۱۱، ۱۲
۱۲/ ۱۴، ۱۷ — ۱۳/ ۱، ۳، ۴، ۵ — ۱۴/ ۲، ۵، ۶، ۱۰، ۱۵
۱۶/ ۱، ۴، ۱۲، ۱۷ — ۱۸/ ۴، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۴، ۱۵
۱۹/ ۱، ۱۵، ۱۹ — ۲۰/ ۲، ۱۳ — ۲۱/ ۲، ۹، ۱۳ — ۲۳/ ۲، ۴، ۷
۲۴/ ۶، ۱۶، ۱۹ — ۲۵/ ۳، ۴، ۶، ۷، ۱۳، ۱۴ — ۲۶/ ۱۳، ۱۴، ۱
۲۶/ ۱۹ — ۲۷/ ۱۷ — ۲۸/ ۲، ۳، ۱۷، ۱۵، ۱۶، ۱۹ — ۲۹/ ۱

عَلِیْمًا ۴/ ۱۳، ۱۴ — ۵/ ۱، ۲، ۳، ۶، ۱۰، ۱۲، ۱۳، ۱۷
۵/ ۱۸ — ۶/ ۱، ۳ — ۲۱/ ۱۷ — ۲۲/ ۲، ۳، ۴، ۱۷ — ۲۶/ ۹، ۱۱
۲۹/ ۲۰

عَلَیْنَا : ہم پر، ہمارے اوپر، عَلٰی حرف جار نا ضمیر جمع متکلم

۱/ ۸، ۱۱، ۱۵ — ۲/ ۱۲، ۱۷
۳/ ۴، ۱۲، ۱۷ — ۵/ ۸ — ۷/ ۵ — ۸/ ۷، ۱۷، ۱۳ — ۹/ ۴، ۱۸
۱۱/ ۱۵ — ۱۳/ ۴، ۱۲، ۱۵، ۱۷، ۱۸ — ۱۶/ ۱۱ — ۱۷/ ۷

۱۸/ ۶ — ۱۹/ ۱، ۱۱، ۱۴ — ۲۰/ ۱۱ — ۲۱/ ۸ — ۲۲/ ۱۹ — ۲۳/ ۶
۲۴/ ۱۸، ۱۹ — ۲۵/ ۱۳ — ۲۶/ ۱۷ — ۲۷/ ۳ — ۲۹/ ۴، ۶، ۱۷
۳۰/ ۱۳، ۱۷

عِلِّیُّوْنَ : علیین، اوپر والے، اوپر ہی اوپر

امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں:-

"یہ اشرف الغرف یعنی عِلِّیِّیْنَ ہیں بعض تو عِلِّیِّیْنَ کو سب سے اعلیٰ جنت کا نام بتاتے ہیں جس طرح سے کہ سِجِّیْنَ سب سے بدتر دوزخ کا نام ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ درحقیقت وہاں کے رہنے والوں کا نام ہے اور عربیت کے لحاظ سے یہی معنی زیادہ قریب ہیں کیونکہ یہ جمع ذوی العقول کے ساتھ مخصوص ہے یہ لوگ اس کو عِلِّیٌّ بروزن بِطِّیْخٌ کی جمع بتاتے ہیں اور معنی یہ بیان کرتے ہیں کہ ابرار بھی ان ہی لوگوں کے زمرہ میں ہوں گے، اس مقصد میں یہ آیت فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّہَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ سو وہ ان کے ساتھ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا یعنی نبی اور صدیق اور شہید اور نیک بختوں کے ساتھ کی طرح سے ہوگی"

Marfat.com

اور علامہ ابوحیان اندلسی، البحر المحیط میں رقمطراز ہیں:۔

"عِلِّیُّوْنَ جمع ہے اور اس کا واحد عِلِّیٌّ ہے جو عُلُوٌّ سے مشتق ہے اور مبالغہ کے لیے ہے یہ یونس اور ابن جنی کا بیان ہے اور ابوالفتح نے کہا ہے کہ قاعدہ کے لحاظ سے اس کو عِلِّیَّۃٌ کہنا چاہیے تھا جس طرح سے کہ بالاخانہ کو بھی عِلِّیَّۃٌ کہتے ہیں مگر چونکہ اس کی تاء حذف کر دی گئی ہے اس لیے اس کے عوض میں اس کی جمع واؤ نون کے ساتھ لائی گئی ہے اور بعض کہتے ہیں چونکہ یہ ملائکہ کی صفت ہے اس بنا پر واؤ نون کے ساتھ جمع آئی ہے اور فراء کا بیان یہ ہے کہ یہ اسم ہے جو جمع کے وزن پر وضع کر لیا گیا ہے مگر اس کے لفظ سے کوئی واحد نہیں آتا جیسے کہ عِشْرِیْنَ اور ثَلَاثِیْنَ میں اور عرب کا دستور ہے کہ جب وہ کوئی ایسی جمع بنائیں کہ جس کے واحد اور تثنیہ کا کوئی صیغہ نہ ہو تو وہ مذکر اور مؤنث دونوں میں واؤ نون کے ساتھ میں بولا کرتے ہیں۔ اور زجاج نے کہا ہے کہ اس اسم کا اعراب جمع کے اعراب کی طرح ہے ہے جیسے ھٰذِہٖ قِنَّسْرُوْنَ اور رَاَیْتُ قِنَّسْرِیْنَ ہے۔

اور عِلِّیُّوْنَ سے مراد یا تو فرشتے ہیں یا بلند مقامات یا پھر یہ نیکی کے رجسٹر کا نام ہے کہ جس میں وہ تمام چیزیں مدون ہیں کہ جو فرشتے اور تمام صلحائے جن وانس انجام دیا کرتے ہیں یا اس کے معنی ہیں دوگنی چوگنی بلندی پر بلندی یہ تین اقوال ہیں جو زمخشری نے بیان کیے ہیں" [1]

**عَلَيْهِ**: اس پر اس کے اوپر عَلٰی حرف جر ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مجرور۔

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ١/٣ | ٢/٣،٤،٥،٦،٨،٩ | ٣/٢،٦،٩،١٢ | ٤/٩ | ٥/١٠ |
| ٦/٥،١٠،١١،١٣،١٤ | ٧/٤،٧،١٠،١٥،١٦ | | | |
| ٨/٤،١٣،١ | ٩/١٢ | ١٠/٢،١٨ | ١١/٣،٥،٧،١٣،١٤ | |
| ١٢/[illegible] | ١٣/[illegible] | | | |

[1] کہ یہ اسم عدد ہیں اور جمع کے وزن پر ہیں مگر جمع نہیں ہیں کیونکہ عِشْرِیْنَ اگر جمع ہوتا تو کم از کم تین عشر یعنی تیس کے لیے بولا جاتا، حالانکہ اس کے معنی بیس کے ہیں، اسی طرح ثَلَاثِیْنَ اگر ثلاث کی جمع ہوتا تو اس کے معنی کم از کم نو کے ہوتے حالانکہ اس کے معنی تیس کے ہیں [1] البحر المحیط ج ۸ ص ۴۴۲ طبع مصر۔

Marfat.com

۱۲ / ۱، ۲ و ۱۱ — ۱۶ / ۱، ۲، ۴، ۱۰، ۱۳، ۱۴ و ۱۶ — ۱۷ / ۶ و ۸
۱۷ / ۹ و ۱۵ — ۱۸ / ۲، ۵، ۷، ۸، ۱۳، ۱۵ و ۱۶ — ۱۹ / ۱، ۲، ۳ و ۴
۱۹ / ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴ و ۱۸ — ۲۰ / ۴، ۵، ۶ و ۱۶ — ۲۱ / ۱، ۶، ۸ و ۱۰
۲۱ / ۱۲، ۱۸ و ۱۹ — ۲۲ / ۲، ۴، ۸ و ۱۷ — ۲۳ / ۷، ۸، ۹، ۱۰ و ۱۱
۲۳ / ۱۲، ۱۴ و ۱۶ — ۲۴ / ۱ و ۹ — ۲۵ / ۳، ۴، ۷، ۸، ۱۱، ۱۲ و ۱۷
۲۶ / ۷ و ۱۹ — ۲۷ / ۱، ۷، ۹ و ۱۵ — ۲۸ / ۴، ۱۷ و ۱۹ — ۲۹ / ۲، ۳، ۱۱ و
۲۹ / ۱۲ — ۳۰ / ۸، ۱۴ و ۱۵

عَلَیْہِ : اس پر، اس کے اوپر، عَلٰی حرفِ جر، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مجرور، آیۂ شریفہ بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهُ اللّٰهَ میں عَلَیْهِ کی ہا پر واو کو حذف کرنے کے بعد ضمہ اس لیے رہنے دیا تاکہ اللہ کا لفظ پُر کر کے پڑھا جائے، اصل میں ضمیر ہُ، ھُوَ تھی، ۲۶ / ۹

عَلَیْہَا : اس پر، اس کے اوپر، عَلٰی حرفِ جر، ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب مجرور، ۲ / ۱، ۳ / ۲ و ۱۲
۶ / ۲ و ۱۵ — ۷ / ۱۹ — ۸ / ۳، ۷ و ۱۰ — ۱۰ / ۱۱ و ۱۴ — ۱۱ / ۸ و ۱۶ — ۱۲ / ۷ — ۱۳ / ۶
۱۴ / ۱۴ — ۱۵ / ۲، ۱۳ و ۱۷ — ۱۶ / ۵، ۱۰ و ۱۷ — ۱۷ / ۸ و ۱۲ — ۱۸ / ۱ و ۷ — ۱۹ / ۲، ۴ و ۱۴
۲۱ / ۷ — ۲۳ / ۶ — ۲۴ / ۱، ۲، ۱۰، ۱۴، ۱۹ و ۲۰ — ۲۵ / ۶، ۹ و ۱۸
۲۶ / ۱۱ — ۲۷ / ۱۲ و ۱۴ — ۲۸ / ۱۹ — ۲۹ / ۳ و ۱۵ — ۳۰ / ۵، ۱۰ و ۱۱

عَلَیْہِمْ : ان پر، ان کے اوپر، عَلٰی حرفِ جر، ہِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مجرور۔

۱ / ۱، ۲، ۴، ۷، ۸، ۱۰، ۱۳ و ۱۵ — ۲ / ۳، ۴ و ۱۶
۳ / ۴، ۶ و ۱۷ — ۴ / ۳، ۴، ۷، ۸، ۱۲ و ۱۴ — ۵ / ۳، ۶ و ۱۸
۵ / ۹ و ۱۳ — ۶ / ۲، ۸، ۹، ۱۱، ۱۴ و ۱۹ — ۷ / ۴، ۶، ۷ و ۱۱
۷ / ۱۲ و ۱۹ — ۸ / ۱، ۳، ۵، ۸، ۱۰، ۱۱ و ۱۷ — ۹ / ۲، ۶، ۹ و
۹ / ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۵ و ۱۸ — ۱۰ / ۸، ۱۲، ۱۴ و ۱۶
۱۱ / ۱، ۲، ۳، ۷، ۱۲، ۱۳ و ۱۵ — ۱۳ / ۳، ۸، ۹ و ۱۰
۱۴ / ۱، ۳، ۵، ۶، ۱۰، ۱۸، ۲۰ و ۲۲ — ۱۵ / ۱، ۶، ۷، ۱۱ و
۱۵ / ۱۲، ۱۴ و ۱۵ — ۱۶ / ۷، ۸ و ۹ — ۱۷ / ۴ و ۱۶ — ۱۸ / ۴، ۹، ۱۲ و ۱۴
۱۹ / ۵، ۹، ۱۳، ۱۵ و ۱۹ — ۲۰ / ۲، ۳، ۸، ۹، ۱۰ و ۱۱
۲۱ / ۱، ۷، ۸، ۱۸ و ۱۹ — ۲۲ / ۳، ۷، ۸، ۱۱، ۱۴، ۱۶ و ۱۸
۲۳ / ۶ و ۸ — ۲۴ / ۱، ۶، ۷، ۱۸ و ۱۹ — ۲۵ / ۲، ۳، ۵، ۶، ۱۰ و ۱۳
۲۵ / ۳ و ۱۹ — ۲۶ / ۱، ۲، ۵، ۹، ۱۱ و ۱۷ — ۲۷ / ۱، ۳، ۸، ۹ و ۱۴
۲۷ / ۱۸ و ۲۰ — ۲۸ / ۳، ۴، ۸، ۱۱، ۱۳ و ۲۰ — ۲۹ / ۵ و ۱۹
۳۰ / ۸، ۹، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۲۹ و ۳۰

عَلَیْہِمَا : ان دونوں پر، ان دونوں کے اوپر، عَلٰی حرفِ جر، ہِمَا ضمیر تثنیہ مذکر و مؤنث غائب مجرور، ۲ / ۱۲ و ۱۴، ۵ / ۱۶، ۶ / ۸، ۸ / ۹، ۱۶ / ۱۶، ۲۳ / ۸

عَلَیْہِنَّ : ان عورتوں پر، ان عورتوں کے اوپر، عَلٰی حرفِ جر، ہِنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب مجرور، ۲ / ۱۲، ۴ / ۱۴، ۵ / ۳، ۱۲ / ۱۴، ۱۸ / ۱۴، ۲۲ / ۳، ۴ و ۵، ۲۸ / ۱۷۔

Marfat.com

**عِلِّیِّیْنَ**: علیین، اوپر والے اور بہت اوپر، بجائے جمع اس کا اعراب واو نون کے ساتھ آتا ہے اور بحالتِ نصب و جر یا اور نون کے ساتھ، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو عِلِّیُّوْنَ، پ ۳۰

# فصل المیم

**عَمَّ**: کس چیز سے، زجاج کا بیان ہے کہ یہ اصل میں عَنْ مَا تھا، نون کا میم میں ادغام کر دیا گیا ہے کیوں کہ نون اور میم دونوں غنے میں شریک ہیں، اور مَا کا الف اس غرض سے حذف کیا گیا ہے تاکہ مَا استفہامیہ اور مَا خبریہ میں تمیز باقی رہے، جس طرح سے کہ فِیْمَ اور مِمَّ وغیرہ میں ہوا ہے۔[۱] پ ۳۰

**عَمَّا**: جس چیز سے، اصل میں عن ما تھا حسب قاعدۂ سابق اس میں ادغام ہوا اور الف کو اس لیے حذف نہیں کیا گیا کہ ما موصولہ ہے

پ ۱ / ۹، ۱۰، ۱۶ — پ ۲ / ۱، ۲ — پ ۴ / ۱ — پ ۶ / ۱۱، ۱۴ — پ ۷ / ۱۲، ۱۸ — پ ۸ / ۳
پ ۹ / ۱۴، ۱۸ — پ ۱۰ / ۱۱ — پ ۱۱ / ۷، ۱۳ — پ ۱۲ / ۱۰ — پ ۱۳ / ۱۴، ۱۶ — پ ۱۴ / ۴، ۷، ۱۳، ۱۶ — ۱۵ / ۵
پ ۱۷ / ۲، ۸ — پ ۱۸ / ۳، ۵ — پ ۲۰ / ۱، ۲، ۱۰، ۱۳ — پ ۲۱ / ۷ — پ ۲۲ / ۱۱ — پ ۲۳ / ۹
پ ۲۴ / ۴ — پ ۲۵ / ۱۲ — پ ۲۶ / ۱ — پ ۲۷ / ۴ — پ ۲۸ / ۹

**عَمّٰتِكَ**: تیری پھوپھیاں، عَمّٰاتٍ، عَمَّۃٌ کی جمع، مضاف ہے اور کَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ، عَمَّۃٌ کے معنی پھوپھی کے ہیں۔ ۲۲ / ۲

**عَمّٰتِكُمْ**: تمہاری پھوپھیاں، عَمّٰاتِ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ۔ ۴ / ۱۵ — ۱۸ / ۱۴

**عِمَادِ**: ستون، علامہ احمد فیومی المصباح میں لکھتے ہیں: "عماد" وہ چیز جس کا سہارا لیا جائے اس کی جمع عَمَدٌ بفتحتین ہے، امام راغب نے بھی یہی معنی لکھے ہیں مگر قاموس میں عِمَادٌ کے معنی بلند عمارتوں کے بیان کیے ہیں اور اس کو عِمَادَۃٌ کی جمع بتایا ہے، اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ یہ مؤنث بھی استعمال ہوتا ہے "تاج العروس" میں ہے کہ

"ارم ذات العماد" میں بعض نے "ذات العماد" کے معنی دراز قامت بیان کیے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد ستونوں والی بلند عمارت والے ہیں اور اس کی جمع عَمَدٌ ہے، فراء نے کہا ہے کہ ذات العماد ان کو اس لیے کہا گیا کہ وہ لوگ خیموں والے تھے جہاں سبزہ زار ہوتا وہیں منتقل ہو جاتے اور

[۱] ملاحظہ ہو فتح القدیر از قاضی شوکانی۔ ج ۵۔ ص ۳۵۲۔ طبع مصر۔

پھر اپنی زندگاہوں پر واپس آجاتے تھے اور لیث کا بیان ہے کہ ان خیمہ نشین لوگوں کو جو ڈیروں اور خیموں کے علاوہ اور کہیں نہیں رہتے، اهل عمود اور اهل عماد بولتے ہیں - ۳۰/۱۴

**عِمَارَةٌ**: بسانا، آباد کرنا، بسنا، آباد ہونا یہ عَمَرَ یَعْمُرُ کا مصدر ہے اور لازم و متعدی دونوں طرح مستعمل ہے، امام راغب نے لکھا ہے کہ عِمَارَةٌ، خَرَابٌ کی ضد ہے - ۱/۹

**عَمَدٍ**: ستون، عُمُودٌ اور عِمَادٌ کی جمع

۱۳/۲ ۲۱/۱۰ ۳۰/۲۹

**عُمُرٌ**: عمر، زندگی، قاموس میں ہے کہ عَمْرٌ عُمْرٌ اور عُمُرٌ تینوں کے معنی زندگی کے ہیں امام راغب لکھتے ہیں:

عُمْرٌ اور عُمُرٌ زندگی سے ملک کے آباد رہنے کا نام ہے، یہ معنی میں بَقَاءٌ سے فروتر ہے چنانچہ جب طال عمرہ بولتے ہیں تو اس کے معنی روح سے بدن کے آباد رہنے کے ہوتے ہیں، لیکن طال بقاءہ اس معنی کا متقاضی نہیں کیونکہ بقاء، فناء کی ضد ہے اور چونکہ لفظ بقاء کو لفظ عمر پر فضیلت ہے بدیں وجہ حق تعالیٰ کو بقا کے ساتھ تو موصوف کیا کرتے ہیں مگر عمر کا استعمال اس کے وصف میں بہت کم ہوتا ہے -

۱۴/۱۵ ۱۷/۴ ۱۹/۹ ۲۰/۸ عُمْرًا ۱۱/۲

**عِمْرَانَ**: ایک شخص کا نام ہے واضح رہے کہ تاریخ مقدسین میں اس نام کے دو شخص گزرے ہیں ایک حضرت موسیٰ علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پدر بزرگوار اور دوسرے حضرت مریم علی نبینا و علیہا الصلوٰۃ والسلام کے والد ماجد اور دونوں کے صاحبزادوں کا نام ہارون ہے، چنانچہ حضرت موسیٰ علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کے برادر محترم حضرت ہارون بن عمران علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام تو مشہور پیغمبر گزرے ہیں اور حضرت مریم علی نبینا و علیہا الصلوٰۃ والسلام کے برادر بزرگوار کا تذکرہ اس آیت مبارکہ میں ہے یَا اُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا اے ہارون کی بہن نہ تو تیرا باپ ہی برا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی بدکار تھی، ان دونوں حضرات کا تذکرہ ان شاء اللہ اپنے اپنے مقام پر آئے گا - ۳/۱۲ ۲۸/۲۰

**عَمْرُكَ**: تیری جان، تیری زندگی، عَمْرٌ

Marfat.com

مضاف، كَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ۔ امام راغب نے تصریح کی ہے کہ

عُمُرٌ اور عَمْرٌ اگرچہ دونوں ایک ہی ہیں لیکن قسم عَمْرٌ کے ساتھ مخصوص ہے، اس وقت عُمُرٌ نہیں بولتے جیسے لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِیْ سَكْرَتِهِمْ یَعْمَهُوْنَ (قسم تیری جان کی وہ اپنے نشے میں مدہوش ہیں)۔"

قسم فتح عین کے ساتھ اس لیے مخصوص ہوئی کہ فتح اخف الحرکات ہے اور عرب کی زبان پر چونکہ لَعَمْرِیْ اور لَعَمْرُكَ کثرت سے چڑھا ہوا ہے اس لیے خفت اختیار کرنے کے لیے صرف فتحہ کا استعمال ہوتا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بجز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی پیغمبر کی قسم نہیں کھائی ہے۔ ۱۴/۵

عُمُرِكَ: تیری عمر، تیری زندگی عُمُرِ مضاف كَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ ۱۷/۴

عَمَرُوْهَا: انہوں نے اس کو بسایا، انہوں نے اس کو آباد کیا۔ عَمَرُوْا عِمَارَةٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، هَا ضمیر واحد مؤنث غائب (ملاحظہ ہو عِمَارَةٌ) ۲۱/۴

عُمُرِهٖ: اس کی عمر، اس کی زندگی، عُمُرِ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ ۲۲/۱۴۔

عُمْرَةٌ: عمرہ، زیارت بیت اللہ کے سلسلہ میں ایک مخصوص عبادت کا نام ہے جو حج کی طرح خاص وقت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، ہاں عمر بھر میں ایک دفعہ اس کا بجالانا بشرط استطاعت سنت موکدہ ہے، مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی موضح قرآن میں فرماتے ہیں:

"عمرے" کا طریق یہ کہ احرام باندھے جن دنوں چاہے اور طواف کعبہ کرے اور صفا اور مروہ کے بیچ دوڑے پھر حجامت کرا کر احرام اتار دے" ۲/۸

عَمِّكَ: تیرا چچا عَمِّ مضاف، كَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ عَمٌّ کے معنی عربی میں چچا کے ہیں۔ ۲۳/۳

عَمَلٌ: عمل، محنت، کام۔ امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں رقم فرماتے ہیں

Marfat.com

"عمل ہر وہ فعل ہے جو کسی جاندار سے بالقصد صادر ہو یہ فعل سے اخص ہے کیوں کہ فعل کی نسبت کبھی ان حیوانات کی طرف بھی ہوتی ہے کہ جن سے بلا ارادہ فعل سرزد ہوتا ہے، نیز کبھی جمادات کی طرف بھی فعل کو منسوب کر دیا جاتا ہے مگر عمل کی نسبت ان چیزوں کی طرف بہت ہی کم ہے جیوانات کے لیے تو اس کا استعمال صرف البقر العوامل (وہ بیل کہ جن سے کام لیا جائے یعنی جو رہٹ چلانے اور کھیتی کرنے میں کام آتے ہیں) میں ہے۔ نیز عمل کا استعمال اچھے اور بُرے دونوں قسم کے اعمال میں ہوتا ہے"

۴/۱۱ ۷/۲ ۱۱/۴،۱۲،۱۳ ۱۲/۴ ۱۹/۱۰ ۲۰/۵ ۲۲/۱۴

**عَمَلاً** ۱۱/۱۱ ۱۲/۴ ۱۵/۱۳،۱۶ ۱۶/۳ ۱۷/۶

۱۹/۴ ۲۹/۱

**عَمِلَ**: اس نے عمل کیا، اس نے کام کیا، اس نے کیا (سمیع)، عَمَلٌ سے جس کے معنی عمل کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب

۱/۸ ۶/۱۴ ۷/۱۲ ۱۴/۱۹ ۱۶/۲،۷،۱۲،۱۳ ۱۹/۴ ۲۰/۱۰،۱۱

۲۱/۸ ۲۲/۱۱ ۲۴/۱۰،۱۹،۲۰ ۲۵/۱۸

**عَمِلَتْ**: اس نے کیا، اس نے عمل کیا، اس نے کام کیا، اس نے بنایا، عَمَلٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب (ملاحظہ ہو بُنتَ)

۳/۱۱ ۱۴/۲۱ ۲۳/۴ ۲۴/۴

**عَمِلْتُمْ**: تم نے کیا، تم نے عمل کیا، عَمَلٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر۔ ۲۸/۱۵

**عَمِلَتْهُ**: اس نے اس کو بنایا، عَمِلَتْ عَمَلٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، "عمل" سے مراد یہاں کسی چیز کو عمل میں لانا یعنی اس کا بنانا ہے (ملاحظہ ہو بُنتَ) ۲۲/۲

**عَمَلُكَ**: تیرا عمل، عَمَلٌ مضاف، كَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ ۲۲/۴

**عَمَلُكُمْ**: تمہارا عمل، تمہارا کام، عَمَلٌ مضاف، كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ [illegible] ۱۹/۱۳

**عَمِلُوا**: انہوں نے کیا، انہوں نے عمل کیا عَمَلٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب ۱/۲،۹

۳/۶،۱۴ ۵/۱۵،۱۵ ۶/۴،۶ ۷/۲ ۸/۳،۱۲ ۹/۹ ۱۱/۶

۱۲/۲ ۱۳/۱۰،۱۶ ۱۴/۱۰،۲۱ ۱۵/۱۶،۱۸ ۱۶/۳،۹ ۱۸/۹،۱۰،۱۴

۱۸/۱۱،۱۳،۱۵ ۱۹/۵،۱۵ ۲۰/۱۲،۱۳ ۲۱/۲،۵،۸،۱۰،۱۲ ۲۱/۵،۱۵

۲۲/۷،۱۲،۱۳ ۲۳/۱۱،۱۲ ۲۴/۱۰،۱۱،۱۵ ۲۵/۱،۴،۸،۲۰

۲۶/۲،۵،۹،۱۲ ۲۷/۶ ۲۸/۲،۲،۱۸

Marfat.com

پ ۳۰ / ۹، ۱۰، ۱۰، ۲۳، ۲۸

**عَمَلِهٖ** : اس کا عمل، اس کا کام، اس کی محنت۔ عَمَلُ مضاف، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ۔ پ ۶/۵، ۲۲/۱۴، پ ۲۴/۹، پ ۲۶/۶، پ ۲۸/۲۰

**عَمَلِهِمْ** : ان کا عمل، ان کا کام عَمَل مضاف، ھِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ پ ۷/۱۹، پ ۲۷/۳

**عَمَلِيْ** : میرا عمل، میرا کام عَمَلِ مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ پ ۱۱

**عَمُوْا** : وہ اندھے ہو گئے (عمو) عَمًى سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب (ملاحظہ ہو عَمًى) پ ۶/۱۴

**عَمُوْنَ** : کور دل۔ دل کے اندھے عَمٍ کی جمع بحالت رفع عَمٍ عَمًى سے بروزن فَعِلٌ صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ یہ اصل میں عَمِىٌ تھا چونکہ ناقص یائی میں صفت مشبہ کا ی حذف ہو جاتا ہے اس لیے یا حذف ہو گئی اور عَمٍ رہ گیا۔ پ ۲۰/۱

**عَمِيَ** : وہ اندھا ہو گیا۔ عَمًى سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب۔ یہاں کور دل ہونا مراد ہے۔ پ ۷/۱۹

**عَمًى** : نابینا ہونا، اندھا ہونا، کور دل ہونا، یہ عَمِىَ يَعْمٰى کا مصدر ہے جو باب سَمِعَ سے مستعمل ہے علامہ احمد فیومی المصباح المنیر میں لکھتے ہیں۔

"عَمًى کا استعمال دونوں آنکھوں کی بینائی جاتی رہنے کے لیے ہوتا ہے۔ نیز بطور استعارہ کور دل ہونے کے لیے بھی آتا ہے، جو ضلالت سے کنایہ ہے اور ہر دو معانی میں باہم علاقہ راہ نہ پانے کا ہے، دل کے اندھے کو عَمِيَ اور اعمی القلب بولتے ہیں"

(ملاحظہ ہو اعمٰی) پ ۲۴/۱۶، ۱۹

**عُمْيٌ** : اندھے، کور دل اَعْمٰى کی جمع اَعْمٰى کا استعمال آنکھوں کے اندھے اور دل کے اندھے دونوں کے لیے ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں جہاں بھی اندھوں کی مذمت ہے اس سے کور دل مراد ہیں۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ آیہ کریمہ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا (اور اٹھائیں گے ہم اُن کو دن قیامت کے چلیں گے منہ کے بل اندھے اور گونگے اور بہرے) میں بصر و بصارت دونوں سے اندھے ہونے کا بھی احتمال ہے پ ۱/۲، پ ۲/۵، پ ۱۱/۱۰، پ ۴/۲، پ ۲۱/۸، پ ۲۵/۱۰ عُمْيًا ۱۵/۱۱

**عُمْيَانًا** : اندھے کور دل، یہ بھی اَعْمٰی کی جمع ہے۔ ۱۹/۴

**عَمِيَتْ** : وہ سجھائی نہ دی، وہ مشتبہ ہو گئی۔ وہ نظر دل سے اوجھل ہو گئی، عَمًی سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، علامہ احمد فیومی نے مصباح میں عَمِیَ الخَبَرُ کے معنی خبر کے پوشیدہ ہو جانے کے لکھے ہیں۔ اور امام راغب فرماتے ہیں۔

"عَمِیَ علیہ کے معنی ہیں کسی چیز کا ایسا مشتبہ ہو جانا کہ آدمی اس کے لحاظ سے اندھا ہو جائے اور وہ چیز اسے بالکل سجھائی نہ دے، ارشاد ہے فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْبَاءُ يَوْمَئِذٍ ریعنی سجھائی نہ دیں گی ان کو باتیں اس روز نیز وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ (اور اس نے بھیجی مجھ پر رحمت اپنے پاس سے پھر وہ تمہاری نظروں سے اوجھل کر دی گئی"

(ملاحظہ ہو بُصِّرَتْ) ۲۰/۱

**عُمِّيَتْ** : وہ چھپا دی گئی، وہ نظر دل سے اوجھل کر دی گئی تَعْمِيَةٌ سے جس کے معنی اندھا کر دینے اور چھپا دینے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب۔ ۱۲/۱۳

**عَمِيْقٍ** : دور دراز بعید عُمْقٌ سے بروزن فَعِيْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ عُمْقٌ کے معنی اصل میں تو گہرا ہونے کے ہیں مگر دور و دراز ہونے کے لیے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ ابن الاعرابی نے جو لغت و عربیت کے امام ہیں تصریح کی ہے کہ عُمْقٌ کا استعمال جب راستے کے لئے ہو تو دور و دراز ہونے کے معنی ہیں اور جب کنویں کے متعلق ہو تو اس کے معنی گہرا ہونے کے ہیں۔[1] ۱۷/۱۱

**عَمِيْنَ** : اندھے، کور دل عَمٍ کی جمع بحالت نصب وجر (ملاحظہ ہو عَمُوْنَ) ۸/۱۵

# فصل النون

**عَنْ** : سے، حرف جر ہے، امام جلال الدین عبدالرحمٰن سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن میں فرماتے ہیں:-

"عن حرف جر ہے جو متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے (۱) مجاوزت کے لیے جو اس کے مشہور ترین معنے ہیں جیسے فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖ سو ڈرتے رہیں وہ

[1] تاج العروس

Marfat.com

لوگ جو خلاف کرتے ہیں اس کے حکم کا (یعنی جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے تجاوز کرتے اور دور رہتے ہیں (۲) بدلے کے لیے جیسے لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا (کام نہ آئے کوئی کسی کے بدلے میں کچھ بھی (۳) تعلیل یعنی بیان سبب کے لیے جیسے وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ (اور نہ تھا بخشش مانگنا ابراہیم کا اپنے باپ کے واسطے مگر ایک وعدہ کے سبب سے) یہاں عَنْ مَّوْعِدَةٍ بمعنے اجل موعدۃ ہے اور وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِیْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ (اور ہم نہیں چھوڑنے والے اپنے معبودوں کو تیرے کہنے سے) اس میں عَنْ قَوْلِكَ بمعنے لِقَوْلِكَ ہے (۴) بمعنی جیسے فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ (تو حقیقت میں خود اپنے سے بخل کرتا ہے) کہ اس میں عَنْ نَّفْسِهٖ بمعنے علی نفسہ ہے (۵) بمعنی من جیسے یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ (وہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے) یہاں عَنْ عِبَادِهٖ بمعنے مِنْ عِبَادِهٖ ہے) اور اس کی دلیل یہ ہے فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا

(آسمان میں سے ایک سے قبول کر لی گئی)[1] (۶) بمعنی بعد جیسے یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (وہ الفاظ کو اپنی جگہوں سے پھیرتے ہیں) اس کے بمعنی بعد ہونے کی دلیل یہ ہے کہ دوسری آیت میں ارشاد ہے مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ اور جیسے لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (تمہیں ضرور چڑھنا ہے ایک منزل کے بعد دوسری منزل میں) کہ یہاں مراد ایک حالت کے بعد دوسری حالت ہے

تنبیہ: جب اس پر مِنْ آجاتا ہے تو اس وقت یہ اسم ہوتا ہے ابن ہشام نے اس کی مثال میں آیت ذیل کو پیش کیا ہے ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِّنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَیْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ (پھر ان پر میں ٹوٹ پڑوں گا ان کے آگے سے اور پیچھے سے اور دائیں سے اور بائیں سے) ابن ہشام نے کہا ہے کہ اس کو مجرور من پر معطوف مانا جائیگا۔ اور من اور اس کے مجرور پر نہیں" اور رضی استرآبادی نے شرح کافیہ میں لکھا ہے

---

[1] ملاحظہ ہو الاتقان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۱۶۴ طبع مصر ۱۳۷۰ھ

Marfat.com

عن مجاوزت کے لیے ہے یعنی کسی چیز کو عن کے
مجرور سے اس مصدر کے وجود میں آنے کے
سبب سے کہ جس کا تعدیہ بذریعہ عن ہوا ہے،
دور کرنے کے لیے آتا ہے جیسے رمیت عن
القوس (میں نے تیر کمان سے چلایا) یعنی
رمی (چلانے) کے سبب سے تیر کمان سے دور
ہو گیا، اور اسی طرح اطعمتہ عن الجوع
کا مطلب یہ ہے کہ کھانا کھلانے کے سبب سے
اسے بھوک سے دور کر دیا۔ اور ایسے ہی ادیت
الدین عن زید (میں نے زید کا قرض ادا
کر دیا) ہے اور یہ جو محاورہ ہے رویت عنہ
علما (میں نے اس سے علم کی روایت کی)
اور اخذت عنہ العلم (میں نے اس سے
علم اخذ کیا) یہ مجاز ہے گویا علم کو اس سے منتقل
کیا اور جلست عن یمینہ کا مطلب یہ ہے
کہ میں بیٹھنے میں اس کی داہنی طرف ہٹ کر
بیٹھا، اور ارشاد الٰہی يُخَالِفُونَ عَنْ اَمْرِهٖ
یتجاوزون کے معنی پر متضمن ہے، اور طبقًا
عَنْ طَبَقٍ کے معنی میں وہ درجہ کہ جو سختی میں اس
دوسرے درجہ سے متجاوز ہے کہ جو
اس سے شدت کے اعتبار سے کم تھا۔ اس صورت
میں ہر درجہ اپنے پہلے درجہ سے شدت اور سختی
میں بڑھ کر تھا۔ اور عَنْ طَبَقٍ طَبَقًا کی صفت
ہے اور فقط دو ہی درجے مراد نہیں بلکہ بہت سے
درجے مراد ہیں کہ جن میں ہر ایک دوسرے سے
بڑھ کر ہے، غرض یہ بھی ویسا ہی ہے جیسا
کہ لبیک میں تثنیہ اور آیہ مبارکہ میں کہ تین
ہے کہ ان سب میں مراد کثرت اور تکرار ہے
اور اس کو تکرار کے اقل درجے یعنی دو میں کہ
جو اس کا حقیقت میں اقل درجہ ہے، مختصر
کر دیا ہے . . . . . ابو عبیدہ نے آیہ کریمہ
وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (وہ اپنی خواہش سے
نہیں بولتے) میں عن کو بمعنی ب لیا ہے
یعنی بالھوی اور اولیٰ یہی ہے کہ یہاں بھی
عن اپنے ہی معنی میں ہے اور جار مجرور مصدر
کی صفت ہے یعنی نطقا صادرا عن الھوی
(یعنی وہ گفتگو کہ جو خواہش نفس کی بنا پر ہو)
عن ایسے مقام پر سببیت کا فائدہ دیتا ہے
جیسے کہ قلت ھذا عن علم (یہ تو میں نے
اپنے علم کی بنا پر کہا ہے)[1]

| ۳ | ۲ | ۱ |
|---|---|---|
| ۱و۲و۳و۵ | ۸و۱۱و۱۲و۱۳ | ۱۴و۱۵و۱۶ |

۱؎ ملاحظہ ہو رضی شرح کافیہ ج ۲ ص ۲۸۷

پ ۴/ ۸، ۱۰، ۱۲ — پ ۵/ ۲، ۴، ۱۲، ۱۳ — پ ۶/ ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۱۱

پ ۶/ ۱، ۳، ۴، ۱۱، ۱۵ — پ ۷/ ۲، ۴، ۱۷، ۱۹ — پ ۸/ ۱، ۵، ۶، ۷، ۹

پ ۸/ ۱۲، ۱۷، ۱۸ — پ ۹/ ۷، ۹، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۸

پ ۱۰/ ۲، ۸، ۱۰، ۱۱، ۱۴، ۱۵ — پ ۱۱/ ۱، ۲، ۳، ۴، ۶، ۸

پ ۱۱/ ۱۲، ۱۴، ۱۵ — پ ۱۲/ ۲، ۵، ۷، ۹، ۱۰، ۱۳، ۱۴، ۱۶

پ ۱۳/ ۹، ۱۱، ۱۳، ۱۷ — پ ۱۴/ ۴، ۵، ۶، ۱۲، ۱۸، ۱۹، ۲۱، ۲۲

پ ۱۵/ ۸، ۱۰، ۱۴، ۱۹، ۲۱ — پ ۱۶/ ۱، ۴، ۶، ۱۴، ۱۵، ۱۶

پ ۱۷/ ۲، ۳، ۸، ۱۰، ۱۲ — پ ۱۸/ ۱، ۴، ۱۱، ۱۲، ۱۵ — پ ۱۹/ ۱، ۲

پ ۲۰/ ۴، ۱۱، ۱۲، ۱۳ — پ ۲۱/ ۱، ۴، ۸، ۱۰، ۱۱، ۱۳، ۱۵، ۱۶، ۱۸

پ ۲۲/ ۵، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱ — پ ۲۳/ ۱۲، ۱۵ — پ ۲۴/ ۹، ۱۱ — پ ۲۵/ ۴، ۵، ۱۰، ۱۵

پ ۲۶/ ۱، ۲، ۳، ۵، ۸، ۹، ۱۴ — پ ۲۷/ ۱، ۵، ۶، ۹ — پ ۲۸/ ۲، ۳، ۴، ۱۳

پ ۲۸/ ۱، ۲، ۳، ۵، ۸، ۹، ۱۰، ۱۶ — پ ۲۹/ ۳، ۴، ۱۱، ۱۶ — پ ۳۰/ ۱، ۴، ۸، ۹

پ ۳۰/ ۲۷، ۳۲

**عَنَّا**: ہم سے، عَنْ حرف جر، نا ضمیر جمع متکلم مجرور۔ پ ۲/ ۸ — پ ۳/ ۱۱ — پ ۴/ ۱۱ — پ ۹/ ۶ — پ ۱۳/ ۱۵ — پ ۱۹/ ۴ — پ ۲۲/ ۱۶ — پ ۲۴/ ۱۰، ۱۳ — پ ۲۵/ ۱۴

**عِنَبٌ**: انگور، امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں: "عنب" انگور کو بھی کہتے ہیں اور اس کے درخت کو بھی اس کا واحد عِنَبَۃٌ ہے اور جمع اَعْنَابٌ اور علامہ فیومی نے مصباح میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب تک یہ تازہ رہتا ہے عِنَبٌ کہلاتا ہے اور جب خشک ہو جاتا ہے تو زَبِیْبٌ بولتے ہیں پ ۱۵/ ۱ عِنَبًا پ ۳۰/ ۵

**عَنَتًا**: گناہ، بدکاری، زنا، تکلیف، علامہ ابن الاثیر نے اس کے حسب ذیل معانی لکھے ہیں: مشقت، فساد، ہلاکت، گناہ، غلطی، خطا، زنا۔ صاحب تاج العروس نے اس پر جحود و اذیت کا اضافہ کیا ہے، یہ عَنِتَ یَعْنَتُ کا مصدر ہے جو باب سَمِعَ سے آتا ہے۔ امام ابو جعفر بیہقی تاج المصادر میں لکھتے ہیں:-

"عَنَتٌ کے معنی ہیں گنہگار ہونا، کسی ایسے کام میں پڑنا کہ جس سے نکل نہ سکے، کسی چیز سے ہڈی ٹوٹ جانا، ارشاد باری اَلْعَنَتَ مِنْکُمْ میں عنت سے مراد زنا اور بدکاری ہے اور یہ مادہ مشقت کے معنی پر دلالت کرتا ہے"

اور علامہ ابو السعود عمادی اپنی مشہور تفسیر ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم میں ارقام فرماتے ہیں:-

"عنت اصل میں کہتے ہیں ہڈی کے جڑے پیچھے ٹوٹ جانے کو۔ مگر بعد کو ہر اس مشقت اور ضرر کے لیے کہ جو حالت سنورے پیچھے انسان کو لاحق ہو اس کا استعارہ کر لیا گیا ہے" [1]

[1] ملاحظہ ہو کتاب مذکور۔ ج ۳۔ ص ۲۹۴ بر حاشیہ تفسیر کبیر امام رازی۔

Marfat.com

اور علامہ ابو حیان اندلسی البحر المحیط میں اس لفظ کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"عَنَتٌ سے مراد زنا ہے چنانچہ حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) مجاہد ابن جبیر، ضحاک عطیہ عوفی اور عبدالرحمٰن بن زید نے یہی بیان کیا ہے، عَنَتٌ کے معنی اصل میں مشقت کے ہیں اور زنا کا نام بھی عنت اسی مشقت کی بنا پر پڑا ہے کہ جو دنیا و آخرت میں زانی کو اس فعل کے نتیجہ میں اٹھانی پڑتی ہے مبرد کا بیان ہے کہ اصل میں عَنَتٌ یہ ہے کہ عشق اور شہوت آدمی کو زنا پر مجبور کرے اور پھر آخرت میں اس کی سزا پائے اور دنیا اس پر حد لگائی جائے، اور ابو عبیدہ اور زجاج نے عنت کے معنی ہلاکت کے کئے ہیں اور کچھ لوگوں نے اس کا ترجمہ حد کیا ہے اور کچھ نے ایسے گناہ کا کہ جو غلبہ شہوت کی بنا پر صادر ہو" [1]

اور امام ابوبکر عزیزی سجستانی نے نزہۃ القلوب میں بسند متصل مبرد سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ اہل عرب کے نزدیک عنت کے معنی طاقت سے زیادہ تکلیف اٹھانے کے ہیں اور امام ابن جریر طبری اس کی تفسیر میں اختلاف اقوال نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:۔

۔ صحیح قول اس بارے میں یہ ہے کہ ارشاد الٰہی ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ میں عنت سے مراد دینی اور بدنی ضرر ہے کیونکہ عنت کہتے ہیں اس چیز کو جو انسان کو ضرر پہنچائے، چنانچہ عنت فلان فهو يَعْنَتُ عَنَتًا کا استعمال ایسا کام کرنے کے لیے ہوتا ہے کہ جو دین یا دنیا میں ضرر رساں ہو اور اسی معنی میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ (وہ خوش ہیں تمہیں جس قدر تکلیف پہنچے) اور معزت رسانی کے لیے أَعْنَتَنِي فُلَانٌ فهو يُعْنِتُنِي بولا جاتا ہے، اور بعض نے عنت کے معنی ہلاکت بھی کیے ہیں، بہر حال جو لوگ اس کی تاویل میں زنا کے معنی لیتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ زنا ایک دینی ضرر ہے جو عنت میں داخل ہے اور جو لوگ اس کی توجیہ میں گناہ کا ترجمہ کرتے ہیں وہ یہ بیان کرتے ہیں

[1] البحر المحیط۔ ج۔۳۔ ص ۲۲۴ طبع مصر ۱۳۲۸ھ

Marfat.com

کہ گناہ سب کے سب چونکہ دین کے لیے مضر ہیں اس لیے عنت ہیں اور مجاہد اس کی تشریح میں عقوبت کے معنی بیان کرتے ہیں یعنی وہ حد شرعی کہ جو بدن کو ضرر پہنچاتی ہے وہ یہ بتاتے ہیں کہ چونکہ حد محدود کے بدن کے لیے ضرر رساں ہے اس لیے وہ عنت ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے جو لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ فرمایا ہے، اس میں عنت جمیع معانی کو عام ہے اور یہ سب معانی زنا میں موجود ہیں کیوں کہ زانی کو دنیا میں اس کی وجہ سے ایسی شدید سزا ملتی ہے جو اس کے بدن کے لیے سخت ضرر رساں ہے اور پھر دین و دنیا میں اس کا گناہ اور مضرت علیحدہ، نیز تمام مفسرین کا کہ جو تفسیر کے اہل ہیں اس امر پر اتفاق ہے کہ یہاں عنت کے معنی زنا ہی کے ہیں اس لیے کہ زنا کو ذاتی طور پر لذت اور قضاء شہوت ہے لیکن چونکہ وہ عنت کا سبب ہے لہٰذا اس کے ارتکاب کو عنت کی طرف منسوب اور اس سے موصوف قرار دیا گیا"[1]

**٥/٤**

**عَنَتِ**: جھک گئے، ذلیل ہو گئے (اگر دیے) (نَصَرَ) عُنُوٌّ سے جس کے معنی عاجزی و فروتنی کرنے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب اس کا ترجمہ بصیغہ جمع اس لیے کیا کہ اس کا فاعل وجوہ ہے۔ (ملاحظہ ہو بُنْتُ، ١٦/١٥)

**عَنِتُّمْ**: تم کو مضرت پہنچی تم کو ایذا پہنچی عَنَتٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر۔

**٤/٢ ١١/٥ ٢٦/١٣**

**عِنْدَ**: نزدیک، قریب، پاس، امام راغب فرماتے ہیں:-

"عِنْدَ وہ لفظ ہے جو قرب کے لیے وضع کیا گیا ہے اس کا استعمال کبھی تو مکان یعنی جگہ کے لیے ہوتا ہے اور کبھی اعتقاد کے بارے میں اور کبھی قرب و منزلت کے سلسلے میں چنانچہ آیات ذیل میں یہی قرب و منزلت کے معنی مراد ہیں بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ (بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس، اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (بے شک جو تیرے رب کے نزدیک ہیں وہ

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری۔ ج ۵۔ ص ۱۶۔ طبع مصر۔

Marfat.com

تکبر نہیں کرتے) اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ (سو جو لوگ تیرے رب کے پاس ہیں پاکی بولتے رہتے ہیں اس کی رات اور دن) رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ (اے رب بنا میرے واسطے اپنے پاس ایک گھر بہشت میں) اور اسی معنی میں بولا جاتا ہے اَلْمَلٰٓئِكَةُ المقربون عند الله یعنی وہ فرشتے جو اللہ کے یہاں قرب و منزلت رکھتے ہیں۔ اور آیہ کریمہ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (تو وہ لوگ اللہ کے یہاں وہی ہیں جھوٹے) اور تَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ (اور تم سمجھتے ہو اس کو ہلکی بات اور یہ اللہ کے یہاں بہت بڑی ہے) نیز اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ (اگر یہی دین حق ہے تیری طرف سے) ان تینوں مقامات پر عند بمعنی حکم الٰہی ہے"

اور علامہ جلال الدین سیوطی الاتقان فی علوم القرآن میں رقمطراز ہیں:-

"عند ظرف مکان ہے جو حضور و قرب کے لیے استعمال ہوتا ہے خواہ وہ دونوں حسی ہوں جیسے فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ (پھر جب دیکھا اس کو دھرا ہوا اپنے پاس) سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى (سدرة المنتہٰی کے پاس اس کے پاس ہے بہشت آرام سے رہنے کی) خواہ دونوں معنوی جیسے قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ (بولا وہ شخص جس کے پاس تھا ایک علم کتاب کا) وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ (اور وہ سب ہمارے نزدیک ہیں چنے ہوئے) فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ (بیٹھے سچی بیٹھک میں نزدیک بادشاہ کے جس کا سب پر قبضہ ہے) اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ (زندہ ہیں اپنے رب کے پاس) اِبْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ (بنا دے میرے لیے اپنے پاس ایک گھر بہشت میں) کہ ان سب آیات میں شرف قرب و رفعت منزلت مراد ہے۔

اور یہ یا تو ظرف ہو کر مستعمل ہے اور یا صرف مِنْ کے ذریعہ مجرور ہو کر جیسے فَمِنْ عِنْدِكَ (تو وہ تیری طرف سے ہی) وَلَمَّا

Marfat.com

جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ (اور جب پہنچا ان کے پاس رسول اللہ کی طرف سے)" [1]

اور علامہ احمد فیومی المصباح المنیر میں رقمطراز ہیں:-

"عِنْدَ ظرف مکان ہے لیکن جب زمان کی طرف مضاف ہو تو ظرف زمان بھی ہوتا ہے جیسے عند الصبح (صبح کے قریب) عند طلوع الشمس (سورج نکلنے کے قریب) اس پر حروف جر میں سے مِن کے علاوہ کوئی اور حرف نہیں آتا۔

عِنْدَ کی عین پر کسرہ ہے اور یہی فصیح لغت ہے جس کو اہل فصاحت استعمال کرتے ہیں، اور یوں فتحہ اور ضمہ بھی اس کے متعلق نقل کیا جاتا ہے، اور اصل میں اس کا استعمال اس شے کے متعلق ہوتا ہے کہ جو تمہارے پاس موجود ہو، یا تمہارے قریب ہو، خواہ وہ کسی طرف سے بھی ہو۔ اور کبھی دوسرے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ عندی مال (میرے پاس مال ہے) اس مال کے لیے بھی بولا جائیگا جو ساتھ موجود ہے اور اس مال کے لیے بھی کہ جو غائب ہو کیونکہ یہاں عند کے معنی ملکیت اور قبضہ میں ہونے کے ہیں، اور اسی وجہ سے اس کا استعمال معانی (یعنی صفات) میں بھی ہوتا ہے چنانچہ بولا جاتا ہے عندہ خیر اس کے پاس بھلائی ہے) اور ما عندہ شر (اس کے پاس شر نہیں ہے) کیونکہ معانی کی جہات متعین نہیں ہوتیں۔ اور اسی معنی میں ارشاد ہے فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ (اگر تم نے دس برس پورے کر دیے تو یہ تمہاری مہربانی ہے) یہاں مِنْ عِنْدِكَ بمعنی من فضلک ہے، نیز حکم کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے ھٰذا عندی افضل من ھٰذا (یہ میرے نزدیک اس سے بڑھ کر ہے) یہاں عندی بمعنی حکمی ہے یعنی میری رائے اور فیصلہ میں یہ اس سے بڑھ کر ہے"

اور علامہ ازہری نے تہذیب میں تصریح کی ہے کہ عند کے معنی قرب کے انتہائی حدود کے

[1] الاتقان۔ ج ا۔ صہ ۱۶۵۔

ہیں الا اسی لیے اس کی تصغیر نہیں آتی، نیز یہ ظرف مبہم ہے بدیں وجہ غیر متمکن یعنی غیر منصرف اور لازم الظرفیت ہے۔

۱/۶،۸،۹،۱۰،۱۱،۱۲،۱۳ ، ۲/۸،۹،۱۱۰ ، ۳/۴،۶،۷،۹،۱۰
۳/۱۲،۱۴،۱۶ ، ۴/۴،۸،۱۱ ، ۵/۸،۱۰،۱۶ ، ۶/۱۳ ، ۷/۱۹
۸/۱۰،۱۲ ، ۹/۹،۱۳،۱۴،۱۵،۱۷،۱۸ ، ۱۰/۳،۸،۹،۱۱
۱۱/۱،۶،۷،۱۲ ، ۱۲/۷،۱۲،۱۵ ، ۱۳/۱۸،۱۹ ، ۱۴/۱۹
۲۰/۸،۹،۱۴ ، ۲۱/۱،۷،۱۵،۱۷ ، ۱۹/۱۹ ، ۲۲/۱۴،۵،۶،۱۰،۱۱
۲۳/۱۷ ، ۲۴/۱،۹،۱۹ ، ۲۵/۳،۴،۵،۹ ، ۲۶/۱،۳،۹،۱۳،۱۴
۲۷/۱،۵،۱۰،۱۸ ، ۲۸/۹،۱۲،۱۳ ، ۲۹/۲،۴،۱۴ ، ۳۰/۶،۲۳

**عِنْدَكَ**: تیرے پاس، تیری رائے، تیرا فیصلہ، تیری مہربانی عِنْدَ مضاف كَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ ۵/۸ ۹/۱۲،۱۶ ۱۵/۳
۲۰/۶ ۲۵/۱۱ ۲۶/۶ ۲۸/۲۰

**عِنْدَكُمْ**: تمہارے پاس عِنْدَ مضاف كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ۔
۵/۸ ۱۱/۱۲ ۱۴/۱۹

**عِنْدَنَا**: ہمارے پاس، ہمارے نزدیک عِنْدَ مضاف، نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ
۴/۸ ۱۱/۱۳ ۱۴/۱ ۱۵/۲۱ ۱۷/۶ ۲۰/۸ ۲۳/۱۱

۲۳/۹،۱۱،۱۲،۱۳ ، ۲۴/۸ ۲۵/۱۴ ۲۶/۱۵ ، ۲۷/۹

**عِنْدَهٗ**: اس کے پاس، اس کے نزدیک عند مضاف، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ ۱/۱۶ ۳/۱،۲،۱۹ ۴/۱۱ ۶/۱۲ ۷/۷،۱۳ ۱۰/۹،۱۳ ۱۲/۳
۱۳/۳،۸،۱۲ ۱۴/۲ ۱۸/۱۱،۱۴ ۱۹/۱۸ ۲۰/۷ ۲۱/۱۳
۲۲/۹ ۲۵/۱،۱۳ ۲۷/۷ ۲۸/۱۶ ۳۰/۱۷

**عِنْدَهَا**: اس کے پاس، اس کے نزدیک عِنْدَ مضاف، هَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ۔ ۳/۱۲ ۱۶/۲ ۲۷/۵

**عِنْدَهُمْ**: ان کے پاس، ان کے نزدیک عِنْدَ مضاف، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ ۵/۱۷ ۶/۱۰ ۹/۹ ۲۳/۶،۱۰ ۲۴/۱۹ ۲۷/۴
۲۸/۴ ۲۹/۴

**عِنْدِیْ**: میرے پاس، میرے نزدیک عِنْدِ مضاف، ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ
۷/۱۱،۱۲ ۱۲/۳ ۱۳/۲ ۲۰/۱۱

**عُنُقِكَ**: تیری گردن عُنُقِ مضاف كَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ۔ علامہ احمد فیومی المصباح المنیر میں رقمطراز ہیں۔
"عُنُق کے معنی گردن کے ہیں، یہ مذکر ہے مگر اہل حجاز اس کو مؤنث بولتے ہیں، نیز

Marfat.com

حجاز کی زبان میں اس کا نون مضموم ہے اور بنو تمیم کی زبان میں ساکن، اس کی جمع اَعْنَاقٌ ہے۔"

بعض علماء نے لکھا ہے کہ جو لوگ اس کے نون کو ضمہ دیتے ہیں وہ اس کو مونث بولتے ہیں اور جو اس کے نون کو ساکن رکھتے ہیں وہ اسے مذکر استعمال کرتے ہیں ۱۵/۲

عُنُقِہٖ: اس کی گردن عُنُقِ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ ۱۵/۲

عَنْكَ: تجھ سے عن حرف جار کَ ضمیر واحد مذکر حاضر مجرور ۱/۱۴ ۵/۶ ۷/۵ ۱۳/۱۲ ۶/۱۶ ۱۸/۲۵ ۱۶/۲۶ ۱۹/۳۰

عَنْكَبُوْت: مکڑی۔ اس کا اطلاق واحد، جمع اور مذکر و مونث سب پر یکساں ہوتا ہے لیکن بیشتر مونث مستعمل ہے۔ اس کی تَ "طاغوت" کی طرح سے ہے۔ اور جمع عَنَاكِب اور عَنْكَبُوتَاتٌ ہے۔

سیبویہ نے تصریح کی ہے کہ جب نون کلمہ میں حرف ثانی واقع ہو تو اس کو بغیر کسی پختہ ثبوت کے زائد نہیں قرار دیا جائیگا۔ سیبویہ کی یہ تصریح جوہری نے لفظ عندلیب کی تشریح میں نقل کی ہے لیکن اس کے باوجود خود انہوں نے عنکبوت کو عکب ہی کے مادہ میں ذکر کیا ہے، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اس کے نون کو زائد مانتے ہیں اور علامہ ابن ہشام نے بصراحت لکھا ہے کہ عنکبوت میں نون کا زائد ہونا ہی صحیح ہے اور یہی سیبویہ کا مذہب ہے کیونکہ اس کی جمع عناکب آتی ہے۔

اس صورت میں اس کا وزن فَنْعَلُوْتٌ ہوگا اور نون کو زائد ماننے کی شکل میں فَعْلَلُوْتٌ اور علامہ سید مرتضیٰ زبیدی نے لکھا ہے کہ سیبویہ نے اس کی جمع ایک مقام پر تو عَنَاكِبُ بروزن فَنَاعِلُ لکھی ہے اور دوسری جگہ عَنَاكِبُ بروزن فَعَالِلُ بتلائی ہے مگر تمام نحوی عنکبوت کو بروزن فَعْلَلُوْتٌ بیان کرتے ہیں۔[۱] ۱۶/۲۰

عَنْكُمْ: تم سے عَنْ حرف جر، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مجرور ۹/۱ ۷/۲ ۵/۳ ۷/۴ ۲/۵ ۶،۶/۷ ۱۲/۷ ۱۲/۸ ۱۸،۱۶/۹ ۱۰،۵/۱۰ ۲/۱۳ ۱۳/۱۴ ۶/۱۵ ۱/۲۲ ۱۵/۲۳ ۷/۲۵ ۱۱/۲۶ ۲۰/۲۸

عَنْہُ: اس سے عَنْ حرف جار، ہُ ضمیر واحد مذکر غائب مجرور ۵،۴/۵ ۲/۶ ۱۸،۶/۷ ۹ -

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاج العروس۔

۹/۱۶،۱۷ ۱۱/۷،۱۲ ۱۲/۱۴،۸ ۱۳،۱۴،۱۵ ۱۳/۲ ۱۵/۶ ۱۲/۱۲ ۱۹/۵
۳۰/۹ ۲۲/۹،۱۰ ۲۳/۱۳،۱۰ ۲۵/۱۴ ۲۶/۱۲ ۲۸/۲،۳،۴ ۲۸/۱۵،۱۷
۲۹/۶ ۳۰/۵،۱۷،۱۳،۳۶

**عَنْهَا**: اس سے، عَنْ حرف جر ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب مجرور ۱/۴ ۵/۱۵ ۷/۴،۷
۸/۱۲،۱۷،۷ ۹/۱۳،۷،۶ ۱۳/۴ ۱۴/۶ ۱۵/۱۹،۲۰ ۱۶/۱۰،۲۳
۱۷/۷ ۱۸/۷ ۲۱/۱۵ ۲۳/۲،۶ ۲۷/۱۴ ۳۰/۷

**عَنْهُمْ**: ان سے عَنْ حرف جر هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مجرور ۱/۱۰ ۲/۳ ۳/۱۰،۱۶ ۴/۳،۷،۱۰،۱۷
۵/۶،۸،۱۳،۱۷ ۶/۷،۱۰،۱۳ ۷/۶،۹ و ۱۲،۱۴،۱۶ ۸/۱۳،۱۶
۹/۶،۹ ۱۱/۲۰،۸،۱۵ ۱۲/۱،۲،۹ ۱۳/۳،۴ ۱۴/۶،۱۸
۱۵/۱۳،۱۶ ۱۹/۱۵،۱۷ ۲۰/۱۰،۱۳ ۲۱/۱۲ ۲۲/۱۶
۲۳/۹،۱۳ ۲۴/۱۰،۱۲،۱۴ ۲۵/۱۱،۱۳،۱۶ ۲۶/۳،۲ [illegible]
۲۶/۱۱،۱۶ ۲۷/۲،۴،۸ ۲۸/۳ ، ۳۰/۲۳

**عَنْهُمَا**: ان دونوں سے، عن حرف جر هُمَا ضمیر تثنیہ غائب مجرور ۲/۱۲ ۸/۹،۱۰ ۲۸/۲۰

**عَنِّیْ**: مجھ سے، عَنْ حرف جار، ن وقایہ ی ضمیر واحد متکلم مجرور ۲/۲ ۱۲/۲،۱۴ ۲۳/۱ ۲۹/۵

**عَنِیْدٍ**: عناد رکھنے والا، مخالف، ضدی امام ابوبکر عزیزی لکھتے ہیں عَنِیْدٌ وہ شخص ہے جو تمہارے ساتھ مخالف پیش آئے، اور امام راغب نے اس کا ترجمہ کیا ہے المعجب بما عِنْدَہٗ یعنی جو کچھ اپنے پاس موجود ہے اُس پر اترانے والا اور علامہ ناصر بن عبد السید مطرزی نے اس کے معنی "اس شخص کے لکھے ہیں جو حق کو جانتے پہچانتے مکر جائے" یہ عُنُوْدٌ سے جس کے معنی راستے سے ادھر اُدھر ہٹ جانے کے ہیں بروزن فَعِیْلٌ بمعنی فاعل صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ اس کی جمع عُنُدٌ ہے۔ ۱۲/۵ ۱۳/۱۵ ۲۶/۱۶

عَنِیْدًا ۱۹/۱۵

# فصل الواو

**عَوَانٌ**: میانہ عمر، عورتوں اور مویشیوں میں جو درمیانی عمر کی ہو اس کو عَوَانٌ کہتے ہیں اس کی جمع عُوْنٌ ہے۔ قاعدہ کے اعتبار سے تو جمع کے واو پر ضمہ ہونا چاہیئے تھا مگر تخفیف کی بنا پر اس کو ساکن کر دیا ہے۔ ۱/۸

**عِوَجٌ**: کجی، ٹیڑھا پن، یہ عَوِجَ یَعْوَجُ سے جس کا استعمال ٹیڑھا اور کج ہونے کے لیے ہوتا ہے اسم ہے، ابوزید نے جو لغت کے مشہور امام ہیں تصریح کی ہے کہ جو کجی آنکھوں سے نظر آئے اس کے لیے عَوَجٌ بالفتح آتا ہے

اور جو آنکھ سے نہیں بلکہ عقل و شعور سے سمجھ میں آتے اس کے لیے عِوَجٌ بکسر العین آتا ہے $\frac{۱۶}{۱۵}$

$\frac{۲۳}{۱۷}$ عِوَجًا $\frac{۴}{۱}$ $\frac{۸}{۱۲، ۱۸}$ $\frac{۱۲}{۲}$ $\frac{۳}{۱۳}$ $\frac{۱۵}{۱۲}$ $\frac{۱۶}{۱۵}$

عَوْرٰتٍ: چھپی باتیں، پردہ کی باتیں عَوْرَۃٌ کی جمع، علامہ فیومی نے مصباح میں لکھا ہے کہ عَوْرَۃٌ کی جمع عَوْرَاتٌ تخفیف کی غرض سے ہے ورنہ قاعدہ کے لحاظ سے اس کے واو پر اسم ہونے کی وجہ سے فتحہ ہونا چاہیئے تھا، چنانچہ ہذیل کی یہی بولی ہے۔ $\frac{۱۸}{۱۰، ۱۴}$

عَوْرَۃٌ: کھلے، غیر محفوظ، خالی، علامہ مجد الدین فیروزآبادی نے قاموس میں اس کے حسب ذیل معانی لکھے ہیں:-

(۱) سرحد وغیرہ میں خلل پڑنا (۲) چھپانے کی جگہ (۳) مرد اور عورت کی شرمگاہ (۴) وہ وقت جو بے پردہ ہونے کا ہو۔ اور یہ تین اوقات ہیں فجر سے پہلے، دوپہر کے وقت، اور نماز عشاء کے بعد (۴) ہر وہ بات جس کے ظاہر ہونے سے آدمی شرمائے۔

اور امام راغب لکھتے ہیں:-

"عَوْرَۃٌ انسان کی شرمگاہ کو کہتے ہیں، جو کنایہ ہے اور اصل میں یہ عار سے ہے کیوں کہ شرمگاہ کے کھلنے میں عار محسوس ہوتی ہے اور عورتوں کو بھی عَوْرَۃٌ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ ان کے بھی غیر مردوں کے سامنے آنے سے عار آتی ہے،

اور عَوَارٌ اور عَوْرَۃٌ اس شگاف کو بھی کہتے ہیں کہ جو کپڑے یا گھر وغیرہ کسی چیز میں پڑ جاتا ہے، ارشاد ہے اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَۃٌ وَ مَا هِيَ بِعَوْرَۃٍ (ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں حالانکہ وہ کھلے نہیں پڑے) یعنی ان میں جگہ جگہ سے گھسنے کی جگہ موجود ہے کہ جو چاہے چلا آئے۔ اور آیہ کریمہ اَلَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَاءِ (جو عورتوں کی پردے کی بات سے آگاہ نہیں) سے مراد نابالغ بچے ہیں"

اور امام ابوبکر سجستانی نزہۃ القلوب میں آیہ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَۃٌ میں لفظ عَوْرَۃٌ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"عَوْرَۃٌ کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے گھروں پر چوروں کی آمد و رفت کے بہت مواقع ہیں، محاورہ ہے۔ اعورث بیوت القوم

Marfat.com

یعنی لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر چل دیتے اور اب دشمن یا جس کا جی چاہے وہاں گھس سکتا ہے۔" پ ۲۱/۱۸

عُوْقِبَ: اُسے ایذا دی گئی، اسے تکلیف پہنچائی گئی، وہ ستایا گیا عِقَابٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو عِقَاب، پ ۱۷/۱۵)

عُوْقِبْتُمْ: تمہیں ایذا دی گئی، تمہیں ستایا گیا عِقَابٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر حاضر۔ پ ۱۴/۲۲

# فصل الہاء

عَهْدٌ: عہد، قول، قرار، پیمان، معاہدہ عُهُوْدٌ جمع، امام راغب فرماتے ہیں:۔ "عہد اللہ" یعنی خدائی عہد و پیمان کبھی تو اس طرح ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اس بات کو ہماری عقلوں میں بٹھا دیتا ہے، اور کبھی یہ شکل ہوتی ہے کہ اس کے پیغمبر کتاب و سنت کے ذریعہ اس بات کا ہم کو حکم دیتے ہیں، اور کبھی خود اپنے التزام کی بنا پر ایک شے جو اصل شرع کے اعتبار سے پہلے ہم پر لازم نہ تھی اب لازم ہو جاتی ہے جیسے کہ نذر وغیرہ۔ چنانچہ آیات ذیل میں یہ عہد کی آخری قسم ہی مراد ہے وَمِنْهُمْ مَنْ عٰهَدَ اللّٰهَ (اور ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ کے ساتھ قول کیا تھا)، اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ (کیا جب کبھی کوئی قول کر لیتے ہیں تو ان کا کوئی نہ کوئی فریق اس کو اٹھا کر رکھ دیا کرتا ہے)، وَلَقَدْ كَانُوْا عٰهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ (حالانکہ پہلے خدا سے عہد کر چکے تھے)"

(ملاحظہ ہو اَعْهَدْ، پ ۱/۳، پ ۳/۱۶، پ ۸/۶، پ ۹/۳، پ ۱۰/۸، پ ۱۳/۹، پ ۱۴/۱۹، پ ۱۵/۴، پ ۱۶/۱۳، پ ۲۱/۱۸

عَهْدًا و پ ۱/۱۲، پ ۱۶/۸، ۹)

عَاهَدَ: اس نے تاکید کی، اس نے عہد لیا اس نے قرار کیا (سَمِعَ) عَهْدٌ سے جس کے معنی تاکید کرنے اور عہد کرنے اور دیکھتے رہنے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب امام ابو جعفر بیہقی نے تاج المصادر میں مذکورہ بالا ہر سہ معانی نقل کرنے کے بعد تصریح کی ہے کہ یہ باب کسی چیز کی نگرانی اور اس کی دیکھ بھال کرتے

Marfat.com

رہنے پر دلالت کرتا ہے یہ بھی واضح رہے کہ پہلے معنی کی صورت میں اس کا تعدیہ بذریعہ الیٰ ہوتا ہے چنانچہ امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں فرماتے ہیں :-

عَہِدَ فُلَانٌ اِلیٰ فُلَانٍ کے معنی آتے ہیں کسی سے عہد لینے اور اس پر قائم رہنے کی تاکید کرنے کے، ارشاد ہے وَلَقَدْ عَہِدْنَا اِلیٰ اٰدَمَ (اور ہم نے عہد لیا تھا آدم سے)، اَلَمْ اَعْہَدْ اِلَیْکُمْ (کیا میں نے تاکید نہ کی تھی تم کو)"

پ ۲/۱۰ پ ۹/۶ ۲۵/۵

**عَہْدِکُمْ** : تمہارا عہد، تمہارا اقرار عَہْدِ مضاف، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ

۱/۵

**عَہِدْنَا** : ہم نے عہد لیا، ہم نے تاکید کر دی عَہْدٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم پ ۱/۱۵ ۱۶/۱۵

**عَہْدَہٗ** : اس کا اقرار، اس کا عہد عَہْدِ مضاف، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ

پ ۱/۹ ۳/۱۶ ۱۱/۲

**عَہْدِھِمْ** : ان کا اقرار، ان کا عہد- عَہْد مضاف، ھُمْ ضمیر مذکر غائب مضاف الیہ

پ ۲/۶ ۱۰/۸،۷،۳،۲ پ ۱۸/۱ ۲۹/۷

**عَہْدِیْ** : میرا اقرار، میرا عہد عَہْد مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ پ ۱/۱۵،۵

**عِہْنٌ** : رنگین اون عہن لغت میں رنگین اون کو کہتے ہیں جو مختلف رنگوں میں رنگی ہوئی ہو عُہُوْنٌ جمع ۲۹/۷ ۳۰/۲۶

# فصل الیاء

**عِیْدًا** : عید خوشی کا دن، امام راغب فرماتے ہیں :-

"عید وہ ہے جو بار بار عود کرے (یعنی لوٹ لوٹ کر آئے) اور شریعت میں لفظ "عید الفطر" اور "عید قربان" کے لیے خاص ہے اور چونکہ شرعی طور پر یہ دن مسرت کے قرار دیے گئے ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے ایام اکل وشرب وبعال (کہ یہ دن کھانے پینے اور وصل کا لطف اٹھانے کے ہیں) بدیں وجہ لفظ عید کا استعمال ہر اس دن کے لیے ہونے لگا کہ جو مسرت اور خوشی کا دن ہو چنانچہ ارشاد الٰہی ہے اَنْزِلْ عَلَیْنَا

Marfat.com

مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ تَکُوْنُ لَنَا
عِیْدًا (اُتار ہم پر خوان بھرا ہوا آسمان سے
کہ وہ دن عید رہے ہماری) میں عید
سے یہی مسرت کا دن مراد ہے"
اور امام ابوبکر عزیزی نزہۃ القلوب میں لکھتے
ہیں :-
"ہر اجتماع کا دن "عید" ہے اور بعض کہتے
ہیں یوم العید کے معنی ہیں وہ دن کہ
جس میں فرحت و سرور عود کر آئے"
عِیْدٌ اصل میں عِوْدٌ تھا، عین کے کسرہ کی وجہ
سے واو کو یاء سے بدل لیا ہے، فیومی نے
لکھا ہے کہ :-
"اس کی جمع واحد کے لفظ پر اعیاد آتی
ہے تاکہ عُوْدٌ (بمعنی لکڑی) کی جمع اَعْوَادٌ
اور اس میں فرق رہے اور بعض یہ کہتے ہیں
کہ چونکہ اس کے واحد میں یا لازمی
تھی اس لیے جمع میں بھی لازمی ہوئی"

عِیْرٌ : قافلہ کا اونٹ، یہ مونث ہے اور
عَارَ یَعِیْرُ سے مشتق ہے جس کے معنی چلنے
کے ہیں علامہ ناصر بن عبدالسید مطرزی المغرب
میں لکھتے ہیں:-
"عیر وہ گدھے یا اونٹ ہیں جو غلہ کی بار
برداری میں کام آتے ہیں، بعد کو ہر قافلہ
کے لیے اس لفظ کا استعمال عام ہو گیا"
اور امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:-
"عِیر وہ لوگ جو اپنے ساتھ غلہ لادے
ہوں، یہ غلہ لادنے والے مردوں اور اونٹوں دونوں
کا نام ہے مگر کبھی اس کا استعمال صرف ایک
کے لیے بھی ہوتا ہے یعنی کبھی اس سے
صرف غلہ بار کرنے والے مرد یا صرف
غلہ لادنے والے اونٹ بھی
مراد ہوتے ہیں"
عَیَرَات اور عِیَرَاتٌ جمع $\frac{۱۲}{۵ ,۴ ,۳}$
عِیْسٰی : علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام
مشہور و معروف جلیل القدر پیغمبر کا نام نامی، علامہ
ابوحیان اندلسی البحر المحیط میں رقمطراز ہیں:
"عیسیٰ عجمی نام ہے جو علمیت اور عجمیت
کی بنا پر غیر منصرف ہے، سیبویہ کے نزدیک
اس کا وزن فِعْلٰی ہے اور یاء اس میں
وہ ہے جو رباعی کے ساتھ ملحق ہوتی ہے
جیسے کہ معزیٰ کی یاء ہے، اور یا سے

مراد یہاں الف ہے چونکہ اس کی کتابت بشکل یاء ہوتی ہے اس لیے اس کو یاء کہتے ہیں، ابو علی نے کہا ہے کہ یہ یاء تانیث کی نہیں ہے جس طرح سے ذکریٰ میں ہے کیوں کہ جب یہ نکرہ ہوتا ہے تو اس کو منصرف کر لیتے ہیں، اور حافظ ابو عمرو عثمان بن سعید دانی کہ جو فن قراءات میں صاحب تصانیف ہیں اور عثمان بن سعید صیرفی وغیرہ اس طرف گئے ہیں کہ اس کا وزن فِعْلَلٌ ہے لیکن اُستاذ ابو الحسن بن الباذش نے اس کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ یاء اور واو رباعی میں اصلی نہیں ہوا کرتے۔

اور ہمارے بعض اصحاب نے کہا ہے کہ یہ عجمی نام ہے اور جس عجمی نام کو اہل عرب استعمال کرتے ہیں تو نحوی اس کے احکام تصریحی پر اسی حد تک کلام کیا کرتے ہیں کہ جس حد تک عربی زبان سے اس کا تعلق ہوتا ہے، چنانچہ عیسیٰ بھی اسی قسم میں داخل ہے (انتہیٰ کلامہ) اور جس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ عَیَسٌ سے مشتق ہے اور عَیَسٌ کہتے ہیں اس سپیدی کو جو مائل بسرخی ہو اس نے غلطی کی کیوں کہ عربی اشتقاق عجمی ناموں میں نہیں چلا کرتا" [1]

اور علامہ سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں فرماتے ہیں:-

"عیسیٰ بالکسر حضرت مسیح صلوات اللہ علی نبینا و علیہ وسلم کا نام نامی ہے جوہری کا بیان ہے کہ یہ عبرانی یا سریانی ہے اور لیث کہتے ہیں کہ یہ ایشوع سے معدول ہے چنانچہ سریانی زبان کے جاننے والے یہی بتاتے ہیں"

اور علامہ سید محمود آلوسی روح المعانی میں ارقام فرماتے ہیں:-

"عیسیٰ کی اصل عبرانی میں ایشوع ہے اس ہمزہ کے ساتھ جس کا امالہ یین ہے یا ہمزہ پر کسرہ ہے، اس کے معنی سید یعنی سردار کے ہیں اور بعض نے اس کا ترجمہ مبارک کیا ہے بعد کو اس کی تعریب کر کے

---

[1] البحر المحیط ۱/۳۷ ص ۲۹۰ طبع مصر ۱۳۲۸ھ

عیسیٰ کر لیا گیا، اور جب اس لفظ کی طرف نسبت کی جاتی ہے تو عِیْسِیٌّ اور عِیْسَوِیٌّ بولتے ہیں"[۱]

حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت باسعادت اور آپ کی پیغمبرانہ سیرت کا تفصیلی تذکرہ قرآن پاک میں جابجا نہایت بسط سے مذکور ہے، یہ بھی واضح رہے کہ قرآن شریف میں اگرچہ پچیس ۲۵ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ذکر ہے مگر ان میں صرف چار حضرات کے میلاد مبارک کا بیان ہے۔ جس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ان حضرات کی ولادت باسعادت عام طریقے سے بالکل جداگانہ محض کرشمۂ ربانی اور قدرت الٰہی کے نظاہر کے لیے خرق عادت کے طور پر واقع ہوئی تھی، ان چاروں حضرات کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں۔ حضرت آدم حضرت اسحاق اور حضرت یحییٰ علیٰ نبینا و علیہما الصلوٰۃ والسلام کی مائیں بانجھ تھیں اور پھر ولادت ایسے وقت میں ہوئی جبکہ والدین بڑھاپے کی آخری منزلوں میں پہنچ کر اولاد کی کوئی توقع نہیں رکھتے تھے حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے اور حضرت آدم صلی اللہ علیٰ نبینا و علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے بغیر ماں باپ کے مٹی ہی سے پیدا فرما دیا تھا۔

امام نسائی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اور بیہقی نے حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیدائش بیت لحم میں کھجور کے درخت کے نیچے ہوئی تھی[۲]

اور مسند امام احمد اور صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی نوزائیدہ بچہ ایسا نہیں ہوتا کہ جس کو شیطان اس کی ولادت کے وقت نہ چھوتا ہو، پھر وہ شیطان کے چھونے سے زور سے چلا اٹھتا ہے، مگر حضرت مریم علیہا السلام اور ان کے بیٹے

[۱] روح المعانی ج ۱ ص ۳۱۶ طبع منیریہ مصر۔
[۲] ملاحظہ ہو البدایہ والنہایہ از حافظ ابن کثیر ج ۲ ص ۶۶ ۔ امام بیہقی نے اپنی روایت کی تصحیح کی ہے، اور حافظ ابن کثیر نے نسائی کی اسناد کے متعلق فرمایا ہے لا باس بہ۔

Marfat.com

(حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ہاتھ نہیں لگایا۔ لہ

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شب اسرا میں حضرت عیسےٰ (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) سے میری ملاقات ہوئی تھی، آپ نے ان کا حلیہ بھی بیان فرمایا کہ میانہ قامت سُرخ سپید تھے گویا حمام سے نکل کر آرہے ہیں (یہ آپ کے چہرۂ مبارک کی طراوت اور تازگی کا بیان ہے)، صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی زبانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ ایک دفعہ حضرت عیسیٰ (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) نے ایک شخص کو چوری کرتے دیکھا تو اس سے فرمایا کیا تو نے چوری کی وہ کہنے لگا نہیں صاحب میں قسم کھاتا ہوں اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں اس پر حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا میں اللہ پہ ایمان لایا اور میں نے اپنی آنکھ کو جھوٹا جانا۔ یہ حضرت کا کمال اخلاق اور انتہائی حسن ظن تھا کہ اس کے حلف کو اپنے مشاہدہ پر مقدم رکھا اور جب اس نے قسم کھا کر بیان کیا تو آپ کو یقین آگیا کہ واقعی ایماندار چوری نہیں کرتا بلکہ میری آنکھ نے خطا کی، غالباً آپ نے یہ خیال فرمایا ہوگا کہ اس مال میں اس کا بھی کچھ حق ہوگا یا کوئی اور وجہ ہوگی، حسن ظن کے واسطے بہت سے احتمالات نکل سکتے ہیں۔

ابن ابی حاتم نے بایں اسناد حدثنا احمد بن سنان حدثنا ابومعاویۃ عن الاعمش عن المنهال بن عمرو عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما نقل کیا ہے کہ جب اللہ تعالےٰ نے حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو آسمان پر اٹھانے کا ارادہ فرمایا تو آپ اپنے اصحاب کے پاس

---

لہ البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۵۰، حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو شیطان نے اس واسطے ہاتھ نہیں لگایا کہ حضرت مریم علیٰ نبینا وعلیہا السلام کی والدہ ماجدہ رضی اللہ عنہا نے ان کے اور ان کی اولاد کے لیے خدا سے دعا مانگی تھی کہ شیطان کا ان پر دخل نہ ہو چنانچہ قرآن پاک سورۂ آل عمران میں وہ دعا مذکور ہے حق تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی تھی۔ لہ ملاحظہ ہو صحیح بخاری کتاب الانبیاء: ذکر عیسیٰ علیہ السلام۔

Marfat.com

تشریف لائے اس وقت ان اصحاب میں سے گھر کے اندر بارہ حواری موجود تھے، چنانچہ آپ کمرہ سے باہر تشریف لائے۔ سر اقدس سے پانی کے قطرات ٹپکتے جاتے تھے آپ نے فرمایا تم سے بعض ایسے ہیں جو مجھ پر ایمان لانے کے بعد بارہ دفعہ میرا انکار کریں گے اس کے بعد فرمایا تم میں سے کس پر میری شبیہ ڈالی جائے جو میری بجائے قتل ہو اور پھر (جنت میں) میرے ساتھ میرے درجہ میں ہو۔ اس پر ایک جوان جو سب میں نو عمر تھا اٹھ کھڑا ہوا آپ نے فرمایا بیٹھ جاؤ دوبارہ پھر آپ نے یہی فرمایا اور پھر وہی جوان کھڑا ہوا تیسری مرتبہ بھی یہی ہوا تب آپ نے فرمایا کہ ہاں تم وہی ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آپ کی شبیہ اس پر ڈال دی گئی اور آپ کو گھر کے روشندان سے آسمان پر اٹھا لیا گیا، اس کے بعد یہود کی دوڑ آئی اور انہوں نے اس شبیہ عیسیٰ کو گرفتار کر کے قتل کیا اور سولی پر چڑھا دیا۔ اور ان حواریوں میں سے بعض نے آپ پر ایمان لانے کے بارہ دفعہ آپ کا انکار بھی کیا۔

حافظ ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں اس روایت کو نقل کر کے فرماتے ہیں :۔

| | |
|---|---|
| وھٰذا اسناد صحیح الی ابن عباس علی شرط مسلم ورواہ النسائی عن ابی کریب عن ابی معاویۃ بنحوہ ورواہ ابن جریر عن مسلم بن جنادۃ عن ابی معاویۃ وھکذا ذکرہ غیر واحد من السلف۔ | یہ اسناد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما تک صحیح ہے اور مسلم کی شرط پر ہے، اور نسائی نے بھی ابو معاویہ سے بواسطہ ابو کریب اس اسناد سے ایسا ہی نقل کیا ہے اور ابن جریر نے ابو معاویہ سے بواسطہ مسلم بن جنادہ اس کو روایت کیا ہے اور ایسا ہی سلف میں سے |

(ج ۲۔ ص ۹۲) بہت سے علماء نے ذکر کیا ہے

اور امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، انبیاء سوتیلے بھائی ہیں کہ ان کا دین ایک اور مائیں (یعنی شریعتیں) الگ الگ ہیں، اور میں سب لوگوں سے زیادہ عیسیٰ بن مریم (علیہ وعلی نبینا الصلوٰۃ والسلام) سے تعلق رکھتا ہوں کیونکہ میرے اور ان کے درمیان کوئی نبی نہیں وہ نازل ہونے والے ہیں جب تم ان کو دیکھو تو

Marfat.com

تو پہچان لینا کیوں کہ وہ ایسے شخص ہیں جن کا رنگ سُرخ سپید ہے اور بال سیدھے آپ کے سر سے ایسا معلوم ہوگا کہ بغیر پانی لگے قطرات ٹپک رہے ہیں آپ دو زرد رنگ کے کپڑوں میں ہوں گے آپ صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے جزیہ اُٹھا دیں گے اور سب مذاہب کو ختم کر دیں گے کہ بجز اسلام کے کوئی مذہب آپ کے عہد میں باقی نہیں رہے گا۔ حق تعالیٰ آپ ہی کے زمانہ میں مسیح دجال کذاب کو ہلاک کرے گا اور زمین پر ایسا امن ہو جائیگا کہ اونٹ اور شیر چیتے اور گائے بیل، بھیڑیے اور بکریاں ایک ساتھ چرتے ہوں گے اور بچے اور لڑکے سانپوں کے ساتھ کھیلتے ہوں گے مگر کوئی کسی کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچائیگا۔ اور جب تک اللہ چاہے گا آپ رہیں گے پھر آپ کی وفات ہو جائے گی، تب مسلمان آپ کی نماز جنازہ ادا کریں گے اور آپ کی تدفین کریں گے یہ حدیث سنن ابو داؤد میں بھی موجود ہے حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس کی اسناد کو صحیح کہا ہے[1]۔ جامع ترمذی میں روایت ہے کہ آپ کی تدفین حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پہلو میں ہوگی۔ ابو مودود نے جو اس روایت کے ایک راوی ہیں، تصریح کی ہے کہ ابھی روضۂ اطہر میں ایک قبر کی جگہ باقی ہے۔[2]

آخیر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا آسمان سے نازل ہونا متواتر احادیث سے ثابت ہے اور قرآن پاک کی بعض آیات میں بھی اس طرف اشارہ موجود ہے اور تمام امت کا اس پر اجماع ہے۔

حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات اور متنبی قادیان علیہ ما علیہ کی خرافات کا اگر تفصیلی مطالعہ مطلوب ہو تو علامہ محدث سید محمد انور شاہ کشمیری کی کتاب عقیدۃ الاسلام فی حیات عیسیٰ علیہ السلام کا مطالعہ کرنا چاہیے جو عربی زبان میں اس موضوع پر بے نظیر کتاب ہے۔ اور اردو میں مولانا محمد سلیمان منصور پوری مصنف رحمۃ للعالمین کی کتاب غایۃ المرام اور حضرت الاستاذ علامہ محمود حسن خان ٹونکی مصنف معجم المصنفین کی احوال توارث، معیار السنۃ لختم النبوۃ اور تصدیق السنۃ دہرسہ تصانیف

[1] فتح الباری۔ ج ۶۔ ص ۳۵۰۔ طبع میریہ۔

[2] جامع ترمذی ابواب المناقب عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اس موضوع پر بہترین کتابیں ہیں، اور پروفیسر محمد الیاس برنی کی کتاب "قادیانی مذہب" کو متنبی قادیان اور اس کی امت کی ہفوات و خرافات کا انسائیکلوپیڈیا کہنا چاہیے (ملاحظہ ہو مسیح اور توفّی کی بحث دیکھنا ہو تو تفہیم)

۱/۱۱،۱۶ ۳/۱۳،۱۴،۱۰ ۶/۳۰،۲ ،۱۴،۱۵ ۷/۵،۲،۱۰،۶

۱۶/۵ ۲۱/۱۴ ۲۵/۱۳،۳ ۲۷/۲۰ ۲۸/۹،۱۰

**عِیۡشَۃٍ**: زندگانی، گزران، یہ عَاشَ یَعِیۡشُ کا مصدر ہے جو باب ضَرَبَ سے آتا ہے اور جس کے معنی جینے کے ہیں۔ علامہ نظام الدین حسن بن محمد نیشاپوری نے اپنی تفسیر غرائب القرآن و رغائب الفرقان میں لکھا ہے کہ یہ بروزن فِعۡلَۃٌ، عَیۡشٌ سے بیان نوع کے لیے ہے۔[1] امام راغب فرماتے ہیں کہ عَیۡش اس زندگی کو کہتے ہیں جو حیوان کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ حیاۃ سے اخص ہے کیونکہ حیاۃ کا استعمال حیوان، باری تعالیٰ اور فرشتہ سب کے لیے ہوتا ہے۔ ۲۹/۵ب ۳۰/۲۶

**عَیۡلَۃً**: فقر، احتیاج، مفلسی، یہ عَالَ یَعِیۡلُ کا مصدر ہے جو باب ضَرَبَ سے آتا ہے اور جس کے معنی فقیر ہونے کے ہیں۔ ۱۰/ب

**عَیۡنٌ**: آنکھ، چشم، چشمہ، کنڈ۔ قرآن پاک میں اس لفظ کا استعمال ان ہی دو معنی میں ہوا ہے ورنہ یہ بہت سے مختلف معانی میں مستعمل ہے امام راغب کے نزدیک اس کے اصل معنی آنکھ کے ہیں اور دیگر معانی میں اس کا استعمال بطور استعارہ ہے چنانچہ ان کے خیال میں چشمہ کو جو عین کہتے ہیں وہ اسی تشبیہ کی بنا پر کہتے ہیں کہ جس طرح آنکھ سے قطرات اشک ابلتے ہیں اسی طرح چشمہ سے پانی ابلتا ہے، اس کی جمع اَعۡیُنٌ اور عُیُوۡنٌ ہے ۳/۱۰ب ۶/۱۱ ۱۶/۲ ۲۰/۴ ۲۲/۸ب ۳۰/۱۳،۲۶ عَیۡنًا ۱/ب ۹/۱۰ب ۱۶/۵ ۲۹/۱۹

۳۰/ب۸

**عِیۡنٌ**: بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں والیاں، زنان فراخ چشم، عَیۡنَاءُ کی جمع جس کے معنی بڑی اور خوبصورت آنکھوں والی کے ہیں۔

۲۳/۲ ۲۵/۱۶ ۲۷/۱۳،۱۴

**عَیۡنٰکَ**: تیری دونوں آنکھیں، عَیۡنَا عَیۡنٌ کا تثنیہ بحالت رفع مضاف ہے کَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ۔ یہ اصل میں

[1] کتاب مذکور، ج ۲۹ - ص ۳۴ بر حاشیہ تفسیر ابن جریر مطبوعہ مصر۔

عَیْنَایِکَ تھا تثنیہ کا نون باضافت کے سبب حذف ہوگیا ہے ۔ ۱۵/۱۶

عَیْنَانِ : دو چشمے عَیْنٌ کا تثنیہ بحالت رفع ۔ ۲۷/۱۳

عَیْنَاہُ : اس کی دونوں آنکھیں عَیْنَا عَیْنٌ کا تثنیہ مضاف ، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ نون تثنیہ اضافت کی وجہ سے حذف ہوگیا ہے ، ۱۳/۴

عَیْنُہَا : اس کی آنکھ ، عَیْنٌ مضاف ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ ۲۰/۴ ۱۶/۱۱

عَیْنِیْ : میری آنکھ ، عَیْنِ مضاف یٖ ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ ، امام راغب نے لکھا ہے کہ وَلِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ (اور تاکہ تو تیار ہو میری آنکھ کے سامنے) میں عَلٰی عَیْنِیْ سے مراد میری حفاظت و نگہداشت ہے ۔ ۱۶/۱۱

عَیْنَیْکَ : تیری دونوں آنکھیں عَیْنَیْ عَیْنٌ کا تثنیہ بحالت نصب مضاف ہے کَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ ، اصل میں عَیْنَیْنِکَ تھا ، نون تثنیہ اضافت کے سبب گر پڑا ۔ ۱۴/۶ ۱۶/۱۷

عَیْنَیْنِ : دو آنکھیں عَیْنٌ کا تثنیہ بحالت نصب ۳۰/۱۵

عُیُوْنٌ : چشمے عَیْنٌ کی جمع ۱۴/۴
۱۹/۸، ۱۱، ۱۲، ۱۲ ۲۳/۲ ۲۵/۱۴، ۱۶ ۲۶/۱۸ ۲۹/۲۲

عُیُوْنًا ۲۷/۸

عَیِیْنَا : ہم تھک گئے ، ہم عاجز ہوگئے ، درماندہ ہوگئے عَیٌّ سے جس کے معنی تھکنے اور عاجز ہونے کے ہیں ماضی کا صیغہ جمع متکلم ۔ امام راغب لکھتے ہیں اِعْیَاءٌ کہتے ہیں اس عاجزی کو جو چلنے سے بدن کو لاحق ہوتی ہے اور عَیٌّ کہتے ہیں اس درماندگی کو جو کسی کام کے انجام دینے یا بولنے سے پیش آتی ہے ۔

۲۶/۱۵

تم المجلد الرابع من لغات القرآن

بحمد اللہ سبحٰنہٗ

مدرسہ العلم دار العلوم مجددیہ
نور آباد فتح گڑھ ۔ سیالکوٹ

Marfat.com

Marfat.com